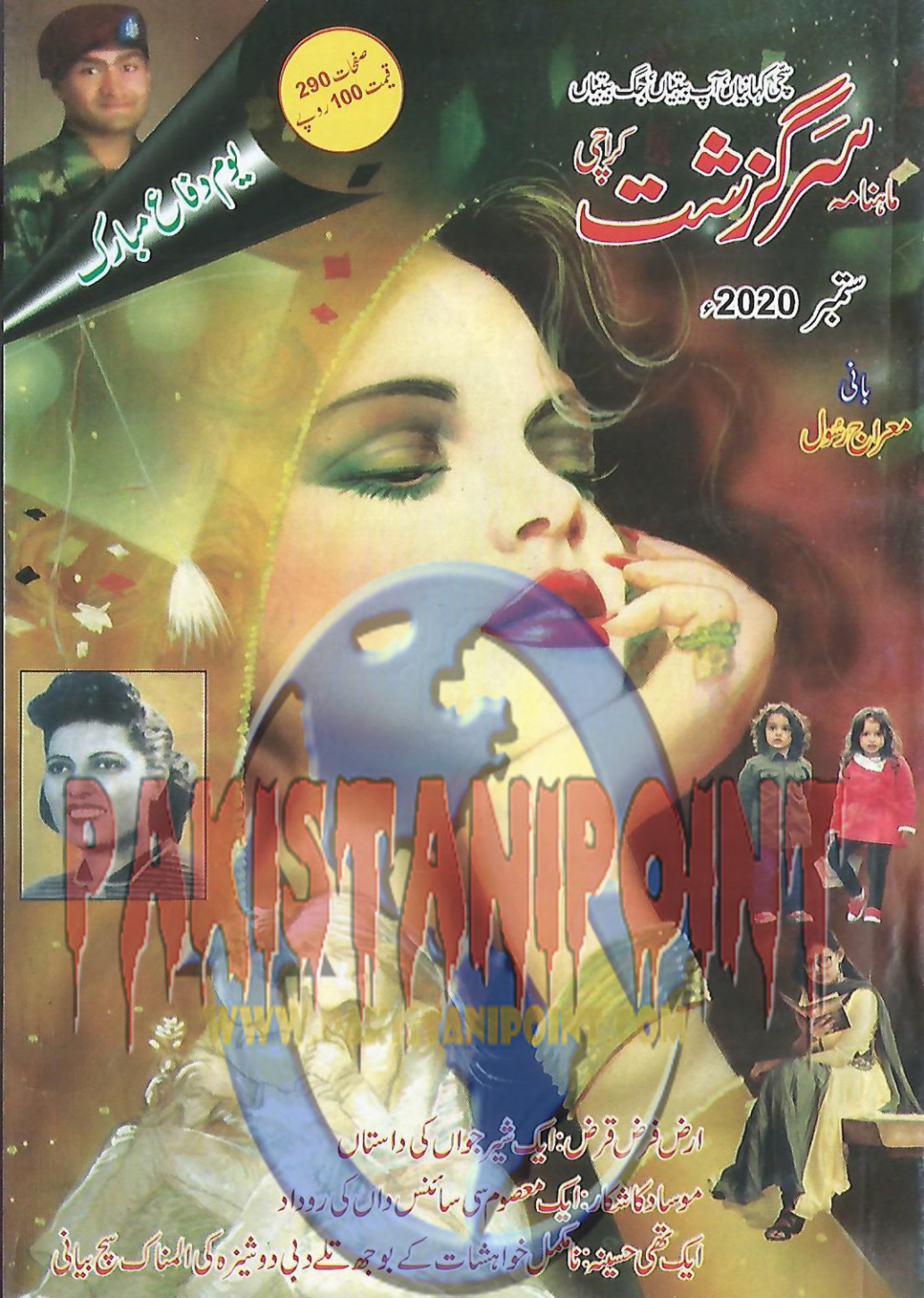

PAKISTANIPOINT
WWW.PAKISTANIPOINT.COM

آپ کی باتیں، آپ کے
مشورے اور آپ کے سوال

ایک صفحہ میں مکمل، مختصر مختصر
ایک نادرِ روزگار کا تعارف

اسرائیل نے بالآخر اس
سائنسدان کو قتل کرا دیا

فوجیوں کی زندگی
کتنی دشوار ہوتی ہے

الفاظ کی جادوبیانی کا شہکار
ایک انگ انداز کی سفر کہانی

کراچی کی فلمی صنعت
کی کئی ان کہی داستان

ایک شوریدہ سر نوجوان
کی جنوں خیزی

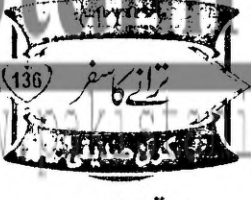


ہمارا قومی ترانہ
کیسے تخلیق ہوا؟

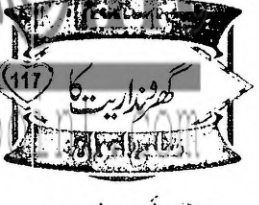


ناصحانہ انداز میں
ایک دلچسپ روداد

ماہنامہ سرگزشت میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے جملہ حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں، کسی بھی فرد یا ادارے کے لئے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورتِ دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔
❁ تمام اشتہارات نیک نیتی کی بنیاد پر شائع کئے جاتے ہیں۔ ادارہ اس معاملے میں کسی بھی طرح ذمے دار نہ ہوگا۔

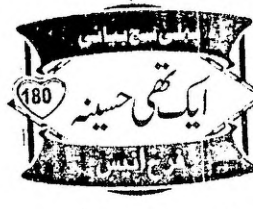


ایک معصوم سی لڑکی
کی آنسو بھری روداد

زندگی کی راہ میں کچھ ایسے
مقامات بھی آتے ہیں

بیٹی کی زندگی سنوارنے
کے لیے اس نے کیسا قدم اٹھایا

تین تین بیویوں کا وہ
اکلوتا شوہر کہلایا

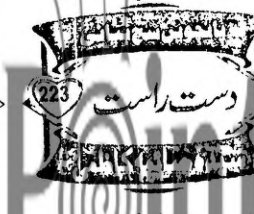

اس کے سامنے دو راہیں تھیں جن
میں سے ایک منتخب کرنا تھیں

توکل کا پھل کتنا
مزیدار ہوتا ہے

افسانوی انداز میں لکھی
گئی سچ بیانی

گناہ کا ڈول ایک
نا ایک دن بھرتا ضرور ہے

پاکستان کے دشمن کیسے کیسے
روپ میں پھر رہے ہیں

PakistaniPoint
www.pakistanipoint.com

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہذا جن صفحات پر ایات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

جلد 30 ❖ شمارہ 7 ❖ ستمبر 2020ء

ماہنامہ
کراچی

مدیرۂ اعلیٰ : عذرا رسول
مدیر : پرویز بلگرامی
نائب مدیرہ : نبیلہ اظہر

◈◈◈

منیجر اشتہارات
محمد شہزاد خان
0333-2256789

◈◈◈

سرکولیشن منیجر
سید منیر حسین
0333-3285269

◈◈◈

قیمت فی پرچہ 100 روپے ❖ زرِ سالانہ 1500 روپے

پبلشر و پرنٹر: عذرا رسول
مقامِ اشاعت: C-63، فیز II ایکس ٹینشن
ڈیفنس سوسائٹی ایریا، ین ورنگی روڈ،
کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن
مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس
ہاکی اسٹیڈیم کراچی

خط و کتابت کا پتا ❖ پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قارئین کرام!
السلام علیکم!

دنیا کی آبادی بڑھتی جارہی ہے۔ اندازے کے مطابق آٹھ ارب کے قریب ہے اور اس میں ہر دس منٹ پر اضافہ ہورہا ہے اور ان کی غذائی ضروریات کے لیے اجناس کم ہوتے نظر آرہے ہیں کیونکہ کیمیکل وغیرہ کی وجہ سے زمین اپنی پیداوار کی صلاحیت کھو رہی ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ جنگل کٹتے جارہے ہیں جس کا سیدھا اثر یہ ہے کہ بارش کا نظام بگڑ رہا ہے۔ ہزار ہا بیماریاں پیدا ہورہی ہیں۔ قدرت کے کاموں میں مداخلت کا نتیجہ یہی نکلتا ہے۔ پیڑ کٹنے، کیمیکل کا اثر کُل ملا کر آنے والے وقت کی تصویر بہت بھیانک ہے پھر بھی ہم اس خطرے سے نمٹنے کے لیے سنجیدہ کوششوں سے دور ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ وقت آجائے کہ آکسیجن صرف سلنڈروں میں ملے۔ اس خطرے کا آسان حل شجر کاری ہے۔ اگر ہم نے ابھی اس پر توجہ نہ دی تو یہ کرۂ ارض موت گھر بن جائے گا۔

# ٹائیگر

وہ صوفیائے کرام کے شہر ملتان میں 8 اکتوبر 1938ء کو پیدا ہوئے۔ لاہور کے گورنمنٹ کالج سے فارغ ہونے کے بعد پشاور میں قانون کی تعلیم حاصل کرنے چلے گئے، مگر کوئی نہ کوئی ایسی چیز تھی جو ان کے اندر ہل چل پیدا کرتی تھی، وہ سمجھ نہیں پاتے تھے کہ آخر یہ کیا ہے، وہ راتوں کو سوتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ جاتے، انہیں یوں لگتا تھا کہ انہیں کوئی آواز دے رہا ہے، کوئی بلا رہا ہے۔ آخر ایک صبح وہ اٹھے، قانون کی تعلیم کو خیر باد کہا، اور فوج میں اپلائی کر دیا، 1963ء میں پاکستان ملٹری اکیڈمی سے ایک بہترین افسر بن کر پاس آؤٹ ہوئے۔ فوج نے انہیں کمانڈو تربیت دی، اور تربیت مکمل کر کے وہ ایس ایس جی کمانڈوز کی پہلی بٹالین میں شامل ہو گئے۔ 1965ء میں انہیں امریکا میں ہونے والے ایک ایڈوانس اسپیشل کورس کے لیے منتخب کیا تھا کہ پاک بھارت جنگ شروع ہو گئی، وہ اپنے کمانڈر کے سامنے پیش ہوئے اور احترام کے ساتھ امریکا جانے سے انکار کر دیا، انہوں نے کہا کہ اب وہ وعدہ نبھانے کا وقت آ گیا ہے جو یہ خاکی وردی پہننے سے پہلے میں نے اپنے وطن سے کیا تھا، کمانڈر اپنی کرسی سے اٹھا، ان کے کاندھے پہ تھپکی دے کر وکٹری کا نشان بنایا تو ان کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی 1965ء کی جنگ میں انہوں نے داستانِ شجاعت رقم کی، وہ اس بے جگری اور حکمت عملی سے لڑے کہ دشمن دنگ رہ گیا، 1965ء کی جنگ میں بے مثال بہادری پر انہیں ستارہ جرأت سے نوازا گیا۔ 1970ء میں انہیں میجر کی رینک پر ترقی دی گئی، 1971ء کی جنگ میں انہوں نے دوبارہ شجاعت کے جوہر دکھائے، جہاں دشمن فوج کو لاشوں کے ڈھیر ملتے وہ سمجھ جاتے کہ یہاں سے کسی شیر جواں کا گزر ہوا ہے۔ 1971ء کی جنگ کے بعد فوج نے انہیں ستارہ بسالت سے نوازا، 1974ء میں انہیں لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے پر ترقی دی گئی، اس وقت بھی ایک انجان آواز انہیں بلاتی تھی، وہ اب بھی راتوں کو اٹھ کر بیٹھ جاتے تھے، وہ شیر کی طرح دشمن پر جھپٹتے تھے پھر بھی وہ آواز انہیں بلاتی رہتی، وہ مزید بے جگری سے لڑتے، فوج نے ان کی خدمات دیکھتے ہوئے دوبارہ 1977ء میں انہیں ستارہ بسالت سے نوازا۔ 1982ء میں بریگیڈیر کے عہدے پر ترقی کے بعد انہیں ایس ایس جی کمانڈوز کا کمانڈنٹ تعینات کیا گیا، یہی وہ وقت تھا جب پاکستان اور بھارت کے مابین سیاچن کا تنازع زور پکڑ چکا تھا، پاک فوج نے سیاچن گلیشئر واپس حاصل کرنے کے لیے ٹائیگر کی خدمات حاصل کیں اور ٹائیگر نے اپنی ٹیم کے ساتھ برف پوش پہاڑوں میں دنیا کے بلند ترین محاذ جنگ پر بھارت کی فوج کو بتا دیا کہ شیر جب برف پوش پہاڑوں میں جھپٹتے ہیں تو شکار کیے بغیر واپس نہیں لوٹتے۔ بھارتی فوج سیاچن سے بھاگ کھڑی ہوئی، اور 1984ء میں ٹائیگر نے ان برف پوش پہاڑوں پر سبز ہلالی پرچم لہرا دیا، فضا اللہ اکبر کے نعروں سے گونج اٹھی۔ 5 ستمبر 1986ء کو کراچی ائرپورٹ پر ایک مسافر بردار امریکی طیارہ ہائی جیک کر لیا گیا، 360 افراد کی جان خطرے میں تھی، طیارے کو ہائی جیکرز سے چھڑانے کے لیے ان کی ٹیم کی خدمات لی گئیں۔ انہوں نے ایس ایس جی کمانڈوز کی ٹیم کے ساتھ ان پر ہلا بول دیا، ہائی جیکرز نے ایس ایس جی کمانڈوز پر فائر کھول دیے مگر وہ نہیں جانتے تھے کہ ان کے مدمقابل کون ہے تھوڑی ہی دیر بعد سب ہائی جیکرز گرفتار ہو کر، ان کے قدموں میں تھے، یہ پہلا موقع تھا جب پاکستانی قوم کو ان کے بارے میں پتا چلا۔ وہ دشمن کی انٹیلی جنس کی نظر میں آ چکے تھے مگر کسی کی مجال نہ تھی کہ ان کے نزدیک آنے کی ہمت کرتا، بھارت کے خفیہ ادارے اس حد تک خوف زدہ تھے کہ بھارتی وزیراعظم راجیو گاندھی کو ہر ہفتے ان کے بارے میں رپورٹ دی جاتی تھی اور بھارت اس جرم کے لگائے گئے زخموں کا بدلہ لینے کی تلاش میں تھا، اس معاملے پر پاکستان کی خفیہ ایجنسی بھی بے خبر نہ تھی، انہوں نے رپورٹ دی کہ بھارت ان کو قتل کرنے کے درپے ہے جس کے بعد ان کی سیکیورٹی سخت کر دی گئی، ان معاملات پر وہ صرف مسکرایا کرتے تھے۔ انہوں نے بے شمار آپریشن میں حصہ لیا، بے مثال شجاعت اور بہادری کی داستانیں رقم کیں۔ یہ 29 مئی 1989ء کا دن تھا گوجرانوالہ کے نزدیک رہوالی میں آرمی ایوی ایشن کی پاسنگ آؤٹ تھی، وہ ایس ایس جی کمانڈوز کی پیراٹروپنگ ٹیم کو لیڈ کر رہے تھے، فوج کا ایم آئی 17 ہیلی کاپٹر ان کو اور ٹیم کو لے کر فری فال کے لیے ہوا میں بلند ہو چکا تھا، جیسے ہی ہیلی کاپٹر مقررہ بلندی تک پہنچا، وہ جست لگانے کے لیے اٹھے، ٹیم کی طرف وکٹری کا نشان بنایا اور ہیلی کاپٹر سے کود گئے، مگر جب مقررہ حد پر پہنچ کر پیراشوٹ کھولنا چاہا تو پیراشوٹ نہ کھلا، انہیں احساس ہو چلا تھا، کہ اب اللہ کی امانت واپس کرنے کا وقت آ چکا ہے سو اس جری نے خود کو خدا کے سپرد کر دیا، اور دھرتی کا بیٹا دھرتی کے آغوش میں سما گیا۔ اگلا دن پاکستانی قوم کے لیے سوگ کا دن تھا، اخباروں میں خبر آئی تھی کہ پاکستانی کمانڈو بریگیڈیئر طارق محمود ٹائیگر فری فال کا مظاہرہ کرتے ہوئے پیراشوٹ نہ کھلنے پر شہادت پا گئے۔ آپ طارق محمود کی بجائے ٹائیگر کے نام سے پہچانے جاتے تھے۔

☆☆☆

# شہرِ خیال

☆ اعجاز حسین سنبھار کا تجزیہ نور پور تھل سے۔ ''پرچہ کی اچانک اور جلد آنے کی بڑی خوشی ہوتی ہے لیکن اپنا تبصرہ نہ دیکھ کر حیرت بلکہ دھچکا لگا، لیٹ ملنے والے خطوط میں بھی نام شامل نہیں یہ الگ پریشانی کی بات ہے (آپ کا وہ خط پہنچا ہی نہیں ہے) محفل میں سب دوست لوٹ آئے ہیں۔ ندیم اقبال نے بھرپور شرکت کی ہے۔ عاطر شاہین، زویا اعجاز اور انجم فاروق ساحلی نے انٹری دی ہے جو خوش آیند ہے۔ ممتاز کنول کا خط رلا گیا۔ صدمہ بہت بڑا ہے، ویسے آج کل پیارے ملک میں سانحات، حادثات کا شمار نہیں لیکن صبر کے سوا کوئی راستہ نہیں۔ ''مارگلہ کا تیندوا'' میں جنگل کی زندگی اور جانوروں کی نفسیات، عادات، بھوک میں کیفیت اور بریڈنگ کے اوقات پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے لیکن ہم خوا مخواہ ان کے آرام اور فطری زندگی میں دخل دیتے ہیں جس کی وجہ سے ناخوشگوار واقعات جنم لیتے ہیں۔ طارق عزیز خان نے ہر پہلو پر کھل کر روشنی ڈالی ہے لیکن انسان شیر، چیتا، تیندوا، گیدڑ اور حتیٰ کہ لومڑی تک کو اپنا دشمن جانتے ہوئے مارنے پر اتر آتا ہے حالانکہ جیسا اس مضمون میں بتایا گیا ہے کہ کئی جانور بے ضرر، شرمیلے اور انسان دوست ہیں وہ اپنی زندگی جینا چاہتے ہیں لیکن ہم خوف میں آکر یا جوش میں جانے، پرکھے بغیر جنگلی حیات اور فطری حسن کے درپے ہیں۔ واقعی یوں کئی جانوروں، پرندوں کی نسل ختم ہو جائے گی۔ بڑے حوصلے سے سوچ کر قدم اٹھانے کی ضرورت ہے، کتنی قابلِ توجہ بات بھائی طارق عزیز خان نے لکھی ہے کہ ہم لاکھوں کروڑوں کی کوٹھی، بنگلا بنا لیتے ہیں لیکن بالکونی یا دیوار میں مناسب جگہ پر پرندوں کے لیے چھوٹے چند گھر بنا ڈالیں تو حسن بڑھ جائے اور بچوں کو تفریح بھی مل جائے کیا خوب نظارہ ہوگا۔ تھوڑا غور کرنے اور گنجائش نکالنے کی بات ہے۔ ''پردہ نشیں'' میں کتنے ہنرمند اداکار، فلمی دنیا کی شخصیات اور ابتداء تا آخر کے حالات سنا کر ہمارے اس شعبہ سے متعلق تجسس کو کھلا پلا کر وقتی طور پر تھپک کر سلا دیا۔ سینکڑوں کی زندگی کا مختصر نامہ، اتفاقات، صلاحیتوں کا استعمال اور مقدر کی کارستانیاں سامنے آئی ہیں۔ سینما گھروں کی ابتداء، انتہا اور موجودہ حالت اور لوکیشن سے آگاہی قابلِ داد ہے، گواداکاروں کے رومانس، جذبات اور دل جڑنے، ٹوٹنے کے حسکے سے محروم رہے لیکن اگر ذہن کی تختی پر ریکارڈ محفوظ رکھا جا سکے تو نادر معلومات ملتی ہیں۔ اتنی محنت، عرق ریزی، کانٹ چھانٹ اور قلم کے ساتھ دماغ کی مشقت کے لیے ممنون ہیں۔ ''سفر پہلا پہلا'' میں دلچسپی، رومانس، تجسس اور قربتوں کا احوال چھایا رہا، ہلکی پھلکی گفتگو، مزاح، دل لبھانا، حال پہنچانا، بہانے سے آنکھیں ملانا اور محبوب کے بھائی ظاہر سے دل بہلانا ادھر ہماری دھڑکنیں بھی بے ترتیب کر رہا ہے۔ دو تین دہائی پرانی باتیں مکمل ترتیب اور جزویات کے ساتھ یادداشتوں کے سہارے مزے لے لے کر سنانا بھائی ندیم اقبال کا کمال ہے۔ ایسی لفاظی، جذبات نگاری، منظر کشی اور ہر گزرگاہ، گوشے اور پڑاؤ کا حال سنانا کہ سننے والا پورا لطف لے، دلچسپی سے سنے اور اش اش کر اٹھے، یہ کسی تجربہ کار کے حصے میں آتا ہے۔ اب ندیم اقبال سب پر بھاری دکھائی دے رہے ہیں جس کے صلہ میں میرے حوصلہ افزائی کے ساتھ نیک جذبات قبول کریں۔ اب سچ بیانیوں کی طرف آتے ہیں کہ حالات کا یہی تقاضا ہے۔ ''کریہہ چہرہ'' میں عامر کتنے غلیظ کردار کا مالک رہا، اپنی عاقبت خراب کرتا رہا اور مرنے سے پہلے قبر کا ایندھن اکٹھا کر لیا تاکہ اس کے انجام پر کسی کو شک نہ رہے۔ راشدہ کو ماں کا مرتبہ ملا، خاوند نیک اور اپنے حال میں مست رہنے والا تھا کوئی روک ٹوک نہ تھی لیکن اسے جہنم جانے کا شوق تھا۔ یہاں بھی جوڑ توڑ کی زندگی گزاری، ہر طرح ذہن میں خباثت بھری رہی۔ مرنے کے بعد الگ عذاب سے سامنا رہے گا۔ سائرہ نے یہاں دکھ دیکھے، ظلم اور ناانصافی برداشت کی۔ حقوق پامال ہوتے رہے لیکن احتجاج نہ کیا بلکہ صبر سے اچھے وقت کا انتظار کیا۔ ہر محرومی اور تنگی کا معاوضہ مل گیا۔

دل وروح کو سکون مل گیا اور کردار کی بلندی کی وجہ سے جنت کی حق دار ٹھہرائی جائے گی۔ سچی اور کھری بات یہی ہے کہ نیک اعمال عمر بھر ساتھ چلتے اور حصار میں لیے رکھتے ہیں اور کئی شیطانی چالیں ناکام بناتے ہیں بس تھوڑا صبر اور یقین کی ضرورت ہے۔ کنیز زہرہ معاشرہ سدھار تحریریں ہمارے ذوق مطالعہ کی نذر کرتی رہتی ہیں جس کے لیے ہم ان کے شکر گزار ہیں۔ ''آ بگینے'' پڑھ کر احساس ہوا کہ محترم و مقدم رشتے کتنے مشکوک ہوگئے ہیں۔ انسان کی اس درندگی، شیطانیت اور غیر یقینی رویوں نے جوان بیٹیوں کے والدین کو دہلا کر رکھ دیا ہے پھر قریبی لوگ عزت بچانے کے لیے کیسے پردے ڈالتے اور ضد پکڑتے ہیں کہ مظلوم صفائی دیتے عمر گزار دے یا علاقہ، ملک چھوڑ کر اجنبی ماحول میں جا بسے، یہ دوسرا ظلم اور زیادتی ہے، حیرت ہے جھوٹ بول کر، دھوکا دے کر اور ضمیر کے خلاف مزاج کو قابو کر کے کیسے خوش و مطمئن رہ سکتے ہیں۔ ایسی دوغلی پالیسی کہاں چین لینے دیتی ہوگی وہ کتنا خوش نصیب ہوگا جو دوسروں کے انجام سے سبق سیکھ کر اپنا دامن خوشیوں سے گلزار بنا لے۔ ''تھپڑ'' میں نوشین کو سجدہ شکر ادا کرنا چاہیے کہ پوتڑوں کا بگڑا سکندر راہ راست پر آ گیا اور اس نے کامیابی کا زینہ طے کر لیا، ماحول نئی شادی میں دیکھنے کو ملا تھا تو مجھے سارا نظام بگڑتا اور گھر جڑتا نظر آیا یہ نوشین نے عقل مندی کی انتاج کیے بغیر سال ڈیڑھ گزار دیا پھر خود بخود حالات پر کنٹرول کھڑی ہوئی تو حالات گرفت میں آتے گئے اور چار دیواری کے اندر خوشگواریت لوٹ آنے پر آمادہ ہوئی، ساس، نندیں شکر گزار ہوگئیں یہ مذاج اس نے فتح کر لیا اور سکندر کو احساس ذمے داری ہوگیا۔ ثمینہ چالاک نہیں بلکہ معاملات کو سمجھنے والی لڑکی تھی جس نے فہیم کو اونچ نیچ سمجھائی، نوشین کو نیک نیتی سے گھر سے باہر نکلنے اور کمانے کا مشورہ دیا اور خود سہولیات کے حصول کے لیے الگ گھر جا بسی، یوں سب کو ذمے داریاں ملیں تو صلح کے ماحول میں سارے معاملات خیر اسلوبی سے سلجھ گئے اور اللہ کی مدد شامل حال رہی تو یہ گھرانا خوشیوں کا مرکز بن گیا ہے اور اپنے کردار کے حوالے سے ہم سب اپنا چہرہ دیکھ سکتے ہیں جسے سنوارنا ہر ایک کی مرضی پر منحصر ہے۔''

☆ سدرہ نعمان ناگوری کا خط کراچی سے جس کے مندرجات سے پتا چلتا ہے کہ کافی پہلے پوسٹ کیا گیا ہے۔ ''تپتی گرمی، آگ برساتا سورج، کرونا کی موجودہ صورتحال، لوڈ شیڈنگ کا عذاب اور نئی زندگی کی نئی مصروفیات، ایسے میں نہ کچھ پڑھنے کا دل چاہے اور نہ کچھ لکھنے کا، مگر جوں ہی میگے سے آئے ڈھیروں تحفوں میں دہانتی مسکراتی دوشیزہ سے سجا سنورا سرگزشت نظر آیا دل مچل گیا اور فوراً ہی کاغذ قلم اٹھاتے ہی بنی، شہر خیال میں جہاں نئے دوستوں سے ملاقات ہوئی وہیں پرانے دوستوں کی کمی شدت سے محسوس کی۔ اپنے ہر دلعزیز ندیم اقبال بھائی کو بڑے سنیتے اور سلجھے ہوئے انداز میں براجمان پایا اور ساتھ ہی شادی کی مبارکباد بھی وصول کی۔ ندیم بھائی بڑی معذرت کے ساتھ کہ میں آپ کا یہ سفر نامہ پڑھ نہ سکی۔ مجھ سے پچھلی ساری اقساط "Miss" ہوگئیں۔ حالانکہ دل بہت چاہتا تھا کہ کچھ اور نہ سہی صرف سفر نامہ ہی پڑھ لوں مگر مصروفیات کے سبب موقع ہی نہ مل سکا۔ اب کوشش یہی ہے کہ مجھے پرانے شمارے کہیں سے مل جائیں ورنہ مجھے اسی آدھے ادھورے سفر سے شروع کرکے ''سفر پہلا پہلا'' کو کتابی شکل میں ڈھالنے کا انتظار کرنا پڑے گا، ابھی صرف انور فرہاد کی فلم نگری اور سچ بیانیاں ہی پڑھ پائی ہوں۔''

☆ آفتاب احمد نصیر اشرفی کا تبصرہ کراچی سے۔ ''ممتاز کنول کے نوعدد پیاروں کی شہادت شہر خیال کی فضا کو سوگوار کر گئی۔ بلڈرز مافیا کی بے حسی پہلے بھی کئی گھرانوں میں ماتم بپا کر چکی ہے لیکن اس مرتبہ تو حد ہی ہوگئی۔ کاش ہماری ریاست قانون کی پاسداری کا گہوارہ بن سکے۔ مجرموں کو عبرتناک سزائیں ہی واحد حل ہے معصوم جانوں کو اذیت سے بچانے کا۔ کنول صاحبہ خدا آپ کو صبر دے اور شہداء کو درجات کی اعلیٰ بلندی سے سرفراز کرے۔ (آمین) ہم آپ کی گڑیا اور ہم سب کی حنا کے بارے میں مزید جاننا چاہیں گے۔ روبینہ نفیس صاحبہ سے بھی لیاقت نفیس صاحب کی رحلت پر تعزیت اور ان کے لیے ایصال کا تحفہ، معراج رسول صاحب کو بھی بچھڑے ہوئے بیس ماہ ہونے کو ہیں خدا انہیں بھی اعلیٰ درجات سے نوازے۔ (آمین) شہر خیال میں ایک ساتھ اتنے سارے اپنے بیروز کو دیکھ کر ہمارا فشار خون مدوجزر کی تمام حدیں پار کر گیا۔ ندیم اقبال کی میزبانی میں سید امتیاز حسین بخاری، عاطر شاہین، زویا اعجاز، ابصار احمد، رانا محمد شاہد، انجم فاروق ساحلی اور زرین قمر جیسے اعلیٰ مہمانوں کی موجودگی نے شہر خیال کو جگمگا دیا۔ پہلی مرتبہ ادبی قوس قزاح کے اتنے سارے رنگ ایک ساتھ دیکھ کر ہماری آنکھیں خیرہ ہوگئیں۔ خیرگی کے بعد جب وہ اپنے مدار میں واپس آئیں تو پاس کی کیفیت میں چلی گئیں وجہ یہ تھی کہ صغیر احمد جیمی، قیصر خان اور روبینہ نفیس صاحبہ کے تبصرے تو پھر بھی الفاظوں کی جادوگری کے درمیان اپنے اپنے منتروں کے ساتھ خاص نظر آ رہے تھے لیکن ہمیں اپنا تبصرہ اس مزارعے یا کی کی طرح لگا جو چوہدریوں یا وڈیروں کی کسی محفل میں مسکین سی صورت بنائے کھڑا ہوا اور شرمندہ ہو رہا ہو کہ اس کا یہاں کیا کام لیکن پھولے بھی نہ سما رہا ہوں کہ عزت افزائی ہوگئی۔ اس مرتبہ ندیم اقبال کی موجودگی میں سفر پہلا پہلا کرنے میں بہت مزہ آیا۔ ہم کئی مرتبہ بتا چکے ہیں کہ عشق تو ہم سے بھی بہت سرزد ہو چکے ہیں لیکن ندیم اقبال کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ نا نگا پربت کا عقاب ہو یا ششماں

سے ٹورنٹو تک کی یاترا یا اب سفر پہلا پہلا کی روداد، جادو بیانی کی زنبیل ہے ان کے پاس، فہم وفراست کی پرتوں میں کب کیا نکل آئے پڑھ کر آنکھیں ششدرہ جاتی ہیں۔ اپنی بشری کمزوریوں کا برملا اظہار اور خواتین کے معاملے میں بے دردی سے بولا گیا سچ اس سے قبل نہیں پڑھا۔ سفرداستان گو حضرات کی کھوج اور دنیا کی جغرافیہ جاننے کا ضبط ہمیں ان کی ڈھونڈ میں بے چین رکھتا ہے۔ اگر اغیار کو چھوڑ کر اپنے پاکستانی سفرگردوں کی بھی بات کریں تو ہمیں اپنی ذات کی بخیہ گیری ندیم اقبال کے ہاں جتنی نظر آتی ہے کہیں اور نہیں ملتی۔ ابن انشاء، ممتاز مفتی، علی سفیان آفاقی، مستنصر حسین تارڑ جیسے جید سفری داستان گوؤں کے ادبی پایہ رکاب بننے کے بعد ندیم اقبال کا جداگانہ اور منفرد انداز دلوں میں اس لیے گھر کر رہا ہے کہ وہ سماجی اور معاشرتی ضرورتوں کو بھی زندہ رکھ رہے ہیں۔ سطر سطر دلچسپی کا تانا بانا بنے رکھتی ہے۔ کنول سے رومانی اٹکھیلیاں ہوں یا اس کے والد کو اپنی معلومات عامہ سے متاثر کرنا ہو یا لطیف کے ذریعے ڈھونگی اور جعلی پیروں سے کنول کی ماں کو خبردار کرنا ہو اور ساتھ ہی اصفیاء کرامؒ کی پاکیزگی اور تقدس کو اجاگر کرنے کی ذمے داری خود پر لے لینا کمال نہیں تو کیا ہے۔ ندیم اقبال تو ہم پرستی اور ضیف الاعتقادی کی مزید لاچاریاں نہ کھول سکے تو چھیڑے ہوئے اس حساس موضوع سے انصاف نہ ہوگا۔ چاچا شفیع اور سائیں کے کردار گزشتہ دو اقساط کی جان ہیں۔ زویا اعجاز کا قاتل اعظم تاریخ کا مقبول کردار ہے۔ بربریت اور سفاکیت و دہشت اس پر ختم ہو چکی۔ چین جیسی ہزاروں سالہ پرانی تہذیب کو تہہ تیغ کرنے کے بعد مسلمانوں کی طرف متوجہ ہونا اور ان کا فاتح بن جانا اس کی بربریت سے زیادہ مسلمانوں کی بے عملی اور سہل وعشرت پسندی کا ہونا ہے۔ خوارزم شاہ کی کمزور سیاست نے اس سے تجارتی معاہدہ کیا اس کو جانے بغیر اور اس کے عاقبت نا اندیش ماموں کی لالچ چنگیز خان کے چار سو تاجروں کے قتل عام کا سبب بن کر لاکھوں مسلمانوں کی خونریزی کا سبب بنی۔ زویا اعجاز نے خونخوار چنگیز خان کے کئی مثبت پہلوؤں کو اجاگر کر کے سچی قلم کار ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ سچ لکھنے کا شکریہ۔ ایک تاریخی حقیقت یہ بھی ہے کہ اسی چنگیز خان کے دیگر دستوں سے نبرد آزمائی کے بعد انہیں شکست فاش دے کر کچھ ترک قبائل کے اتحاد نے عظیم سلطنت عثمانیہ کی بنیاد بھی رکھی تھی۔ اگر ہماری یہ ذہین اور مہم جو کھوجی اس بارے میں تفصیلی آگاہی دے دیں تو نوازش ہوگی۔ جنگجو دوشیزہ نے تو کمال ہی کر دیا۔ ایک بلوچ گل بی بی اور اس کے شوہر شہسوار نے فرنگی جنرل ڈائر کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔ بدترین دشمن کے مطیع ہونے کی یہ مثال پہلی مرتبہ ہماری نظر سے گزری ہے۔ حاضر دماغ نے دماغ پکا دیا۔ ابوالفرح ہمایوں کیا ہو گیا ہے آپ کو کیوں سست پڑ رہے ہیں کھوجیے میں۔ شیراز خان نے کالے میگھا میں ثابت کیا کہ خدا سے بارش مانگنے کا سب سے بہتر طریقہ نماز استسقا ہی ہے۔ گائیڈ اے کے نارائن کے تصوراتی شہر کے پس منظر میں بنی خوبصورت فلم تھی۔ اس میں بھی بارش کو ہی موضوع بنایا گیا تھا۔ سوامی اور دوست نامی یہ ناول جس پر فلم بنی ہندی ادب میں شاہکار مانا جاتا ہے۔ پردہ سیمیں انور فرہاد کی کراچی کی فلم و فنکاروں پر سیر حاصل بحث تھی مزہ آیا پڑھ کر۔ اس مرتبہ شکیل صدیقی فلمی تاریخ میں بازی لے گئے۔ فلم سازی ہالی ووڈ، بالی ووڈ، لالی ووڈ اور اگر اس جملہ پر اعتراض نہ ہو تو بنگالی ووڈ ہونا چاہیے جسے ڈولی ووڈ کہا جا رہا ہے۔ بہرحال چاروں فلمی صنعتوں کا کمال نچوڑ نکال کر دریا کوزے میں بند کر دیا گیا۔ بہت ہی شاندار تحریر تھی جو کسی خاص نمبر میں لگا دی جاتی تو چار چاند لگ جاتے۔ اسی طرح کوثر اسلام کی زندہ موت کو بھی خراج تحسین جس نے شہر خیال کی طرح اس شمارے کو بھی شہکار بنا دیا۔ جتنی تعریف کی جائے کم ہے، عاطر شاہین کی موجودگی نے روسیاہ پڑھنے کا مزہ دوبالا کر دیا۔ اسماعیل شاہد چوہدری ساجد ہی ہو ضروری نہیں، یہ الماس حیدر کا بلف بھی ہو سکتا ہے۔ بے چارہ علی بہت مشکل میں ہے تفصیلی بحث پھر کبھی سہی۔ کریہہ چہرہ، خضر راہ اور خواب سچ بیانیوں میں بالترتیب تھیں جبکہ کھیڑا اور آئینے بھی اچھی تھی۔ آپ کا ادارہ ہمیں ہماری قومی ذمے داری کا احساس دلا رہا تھا جبکہ محقق ہمیں اپنی کم عملی کا کہ ان کی کسی تصنیف سے ہم واقف نہیں ہیں۔ آخر میں اراکین ادارہ کا اس مرتبہ سال رواں کا بہترین شمارہ تیار کرنے پر شکریہ۔ واقعی دو ماہ کی غیر حاضری کی کسر پوری ہو گئی ہے۔''

☆ رازق بخش ذکی آہیر نے جلال پور پیر والا سے لکھا ہے۔ ''اگست 2020ء کے سرگزشت کی لازوال داستان ''جنگجو دوشیزہ'' گل بی بی نے انگریزوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا آخر کار انگریز جنرل ڈائر نے اپنی شکست تسلیم کی دس سالہ جنگ کے خاتمے کا اعلان کیا اور خاش شہر کو ہمیشہ کے لیے الوداع کہا۔ گل بی بی سے جب شہسوار کی محبت ہو گئی تو اس نے شہسوار سے کہا کہ میں کسی اور کی وارثت میں ہوں، وہ دست بردار ہو جائے تو پھر بات ہو سکتی ہے۔ اس کے منگیتر نے دست برداری کے بدلے شہسوار سے شہر کا قلعہ مانگ لیا تو شہسوار نے باپ دادا کی نشانی قلعہ دے دیا، تو پھر گل بی بی کو منگیتر سے نفرت اور شہسوار سے محبت ہو گئی، پھر دونوں کی شادی ہو گئی اور وہ قلعہ کی بجائے ایک جھگی میں منتقل ہو گئے۔ وطن سے اپنا پیار نبھاتے رہے۔ گل بی بی نے انگریز کو تو جھکا دیا لیکن خود اپنے شہر کے جنگجو ساتھی سے شکست کھا گئی لیکن محبت جیت گئی۔ اپنا شہر محفوظ کر گئی۔ ایسی کہانیاں شامل کیا کریں سلسلہ وار کہانیاں ''سفر پہلا پہلا''

طویل ہونے کے باوجود دلچسپ ہے اور ''روسیاہ'' کے واقعات بدلنے سے کہانی حیران کن اور پُرلطف ہوگئی ہے اور اب سچ بیانی ''کریہہ چہرہ'' کی سائرہ صابر اور ہمت والی جس نے آیا سے جاب شروع کی محنت اور تعلیم حاصل کرنے کے بعد ہیڈ مسٹریس بن گئی اور عامر سے چھٹکارا کے بعد اخلاق سے شادی کر کے سکھی ہوگئی۔ ''سرپرائز'' کی نورین نے امجد کو ایسا سرپرائز دیا کہ امیر غریب کا فرق یاد دلا دیا۔ اس کے علاوہ بڑے گھر کی بیٹی، خضر راہ، کون بہتر اور دوسری سچ بیانیاں بھی اچھی ہیں اور اس بار بھی سرگزشت کی آخری سچ بیانی جنون عشق بہترین ہے اور سبق آموز ہے۔''

☆ انجم فاروق ساحلی کا تجزیہ لاہور سے۔ ''اگست کا شمارہ منفرد اور جاذب نظر ٹائٹل کے ساتھ منظر عام پر آیا۔ شہر خیال اس بار جگمگا رہا تھا۔ معروف ادیبوں نے عمدہ تبصرہ جات قلم بند کیے۔ اس میں شبہ نہیں کہ جس طرح مدیر سرگزشت مرحلہ وار تحریروں اور مضامین کی وضاحت اور راہ نمائی کرتے ہیں وہ صرف انہی کا ہی خاصہ ہے۔ قاتل اعظم، جنگجو دوشیزہ، حاضر دماغ، گائیڈ، زندہ موت، خوب ہیں۔ روسیاہ ہنگامہ خیزی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ آبگینے، بڑے گھر کی بیٹی، جنون عشق اچھی آب بیتیاں ہیں۔ مارگلہ کا تیندوا معلومات اور جغرافیائی حدود کو بھرپور انداز میں پیش کیا گیا مگر شکاری ایڈونچر کی کمی تھی۔ باقی تحریریں زیر مطالعہ ہیں۔ انور فرہاد نے فلمی نگری خوب لکھی۔ بشیر نیاز کا تذکرہ بھی ٹھیک ہوا۔ ''پردہ سیمیں'' میں صفحہ نمبر 108 کے شروع میں من موہن ڈیسائی اور امیتابھ بچن کا تذکرہ ہوا۔ کامیاب ترین فلم شعلے کا ذکر بھی ہوا۔ یہاں شعلے کے ڈائریکٹر رامیش سپی کا تذکرہ بہتر تھا کیونکہ توجہ من موہن ڈیسائی کی طرف تھی۔ دوسرے پیراگراف میں امیتابھ کی چند مشہور فلموں کا ذکر کیا گیا ہے۔ کچھ اور مشہور فلمیں بھی ہیں۔ شرابی، ڈان، آخری راستہ، یارانہ، قلی، نصیب، مقدر کا سکندر، شہنشاہ۔ صفحہ نمبر 102 سے پانچ بار آسکر ایوارڈ ملا۔ میرے خیال میں اسٹیون اسپیل برگ کی بجائے فرانسس کپولا کو پانچ آسکر ایوارڈ ملے تھے۔ مجھے ریکارڈ کا ایک بار پھر جائزہ لینا پڑے گا۔ صفحہ نمبر 101 میکناز گولڈ گنز آف نیوران پر بازی لے گئی۔ (میکناز گولڈ گنز آف نیوران سے پیچھے ہے)''

☆ عطاء اللہ شاہ، وانڈھی میاں والی سے رقم طراز ہیں۔ ''سرگزشت کا جون، جولائی 2020ء کا مشترکہ شمارہ زیر مطالعہ ہے۔ اپریل، مئی کا شمارہ نہیں لے سکا۔ سخت لاک ڈاؤن تھا۔ دکانیں بند تھیں۔ بعد میں متعلقہ دکان دار نے سبزی کی ریڑھی لگالی۔ کھانے پینے کی اشیاء کی خرید و فروخت کی اجازت تھی۔ کئی لوگوں نے پیشے بدلے اور روزی کمانے کے جتن کیے۔ اب کہا جا رہا ہے کہ کرونا کیسز میں اسی فیصد کمی آئی ہے۔ اعداد و شمار کی ژالہ باری بھی تھمنے لگی ہے۔ ہمیں کہا گیا کہ کرونا سے ڈرنا نہیں لڑنا ہے اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ منہ نقابوں میں چھپا کر گھروں میں بند رہنا ہے۔ ہم نے اسی جنگی حکمت عملی پر عمل کیا تب کہیں منہ دکھانے کے قابل ہوئے۔ اس سے پہلے ملک میں کئی جان لیوا بیماریاں موجود تھیں جن کا کرونا نے خاتمہ کر دیا اور میڈیا پر ان کا نام بھی نہیں لیا جاتا۔ ابتداء میں کہا گیا کہ نوول کرونا سے متاثرہ 97.5 فیصد صحت یاب ہو جاتے ہیں۔ یہ تعداد 98 بھی بتائی گئی۔ اعداد و شمار کے اس ترازو کے دو پلڑوں میں سماجی فاصلہ اتنا زیادہ ہے کہ دونوں پلڑے نظر سے اوجھل ہو گئے ہیں ابھی تک حالات غیر یقینی ہیں۔ معلوم نہیں سرگزشت کا اگلا شمارہ کب آئے گا۔ قدم سے قدم ملانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اگست آزادی کا مہینہ ہے۔ 14 اگست 1947ء کو ہمیں آزاد وطن نصیب ہوا تھا جس کی ہم نے قدر نہ کی اور آدھا ملک کھو دیا۔ آج نئی نسل کی اکثریت یہ بھی نہیں جانتی کہ موجودہ بنگلہ دیش کبھی مشرقی پاکستان تھا۔ آزادی کی قدر و قیمت مقبوضہ جموں و کشمیر اور مقبوضہ فلسطین کے مسلمانوں سے پوچھیے جہاں ظلم و ستم کا بازار گرم ہے۔ مہرا میاں عبدالعزیز پاکستانی بننے کو جی چاہتا ہے جس کی آنکھوں میں سچے خواب تھے۔ وہ خواب حقیقی معنوں میں آج تک شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے۔ ''اودھ کی بیٹی'' بہت شوق سے پڑھی۔ ایک نوخیز رقاصہ محمدی خانم، سبز پری، مہک پری، کہلاتے کہلاتے جب بیگم حضرت محل کہلائی تو سرفروش مجاہدہ کے روپ میں ابھری۔ اس کے گھنگرو ؤں میں تلواروں کی جھنکار ہے۔ خواتین کی فوج بنانے کا تصور آج بھی ناممکن دکھائی دیتا ہے۔ اس خاتون کی جرأت کو سیلوٹ جو فرنگی فوج کے سامنے میدانِ کارزار میں سربکف ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ واجد علی شاہ نے اپنے بیٹے برجیس قدر کی ولادت پر جو نظم کہی وہ فکر و فن کا شاہکار ہے۔ آسمان زبان میں ایسی عمدہ تصویر کشی پر بے اختیار ان کو داد دی۔ ان کا شعری ذوق واقعی بلند تھا۔ جہاں تک رقص و سرور کا تعلق ہے وہ آج ہر گھر میں جاری و ساری ہے۔ پری خانے پوری دنیا میں آباد ہیں۔ سیاحت اور ثقافت کی وزارتیں ان کی سرپرستی کرتی ہیں۔ جدید پری خانے واجد علی شاہ دیکھتے تو اپنے ہاں کا پری خانے بند کرا دیتے۔ ان پر انگلی اٹھانے کی کم از کم مجھ میں ہمت نہیں۔ ''تعلیم کا مزدور'' زین مہدی کی مختصر مگر پُراثر تحریر ہے۔ عقیل عباس جعفری کی ''باسکلوپ کی ملکہ'' دل کو لگی۔ انور فرہاد ''بے مثال'' لکھ کر میرے دل میں اتر گئے وہ ایسے ہی پرانے فنکاروں اور ہنرمندوں پر لکھتے ہیں۔ ندیم اقبال کا سفرنامہ پڑھا۔ تحریر بدستور شگفتہ ہے۔ شوخیاں سلامت رہیں۔ رانا محمد شاہد کی تحریر ''درختوں کی دنیا'' شیراز خان کی ''عالمی وبا'' معلوماتی اور دلچسپ تھیں۔ ''دوہری خوشی'' گوارا رہی اداریہ نوٹ پڑھ کر میں بھی اداس ہوا۔ احباب شہر خیال کے نام

دیکھیے خوشی ہوئی سلام کہتا ہوں۔ تمام قلم کار میرے دل میں بستے ہیں۔ زریں قمر صاحبہ آئندہ بھی تاریخ کے اوراق الٹتی رہیں۔ ان کا شکریہ۔ مطالعہ جاری ہے۔''

☆ قیصر خان کی آمد بھکر سے۔ ''اس بار اداریہ بہت پھیکا سا لگا۔ محقق علامہ میر غلام کو آج پڑھا۔ واقعی وہ اعلیٰ درجہ کے محقق تھے اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند کرے۔ (آمین) کرسی صدارت پر رسالہ کی شان سفرنامہ کے بادشاہ انکل ندیم اقبال سے شاندار تبصرہ پڑھنے کو ملا ہے۔ نسرین کی خیریت بتا کر مطمئن کر دیا واقعی اس کردار سے ہم کو دلی ہمدردی تھی۔ ان کے ساتھ بہترین تبصرے شامل تھے۔ سید امتیاز بخاری، صغیر احمد جیمہ، عاطر شاہین، زویا اعجاز، ابصار احمد، رانا محمد شاہد سے لے کر ڈاکٹر روبینہ نفیس، انجم فاروق ساحلی، خلیفہ اشرفی صاحب، زرین قمر جیسی عظیم شخصیت کی رائے نے دل خوش کر دیا تھا۔ ممتاز کنول کے خط نے دل کو دکھوں سے بھر دیا۔ ان کا خط نہیں ایک نامکمل کہانی تھی۔ ''کالے میگھا'' بارش برسانے پر دنیا کے عجیب طریقہ پڑھ کر حیرت ہوئی۔ انور فرہاد صاحب اس بار بھی کمال کا مضمون لائے واقعی کراچی کی فلم انڈسٹری کے بارے میں پہلے معلوم نہ تھا۔ بہت اعلیٰ تحریر تھی۔ ''قلم سازی'' تشکیل صدیقی نے تو اس بار پورے رسالہ کو ناپ کیا ہے، تحریر تحقیق کے ساتھ دل کو چھونے والی تھی۔ ندیم انکل کا سفرنامہ پر تبصرہ یا رائے دینے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ وہ ایک مکمل تحریر ہے پڑھ کر کافی وقت تک ساتھ گھومتے اور محسوس کرتے رہتے ہیں۔ فرنامہ میں رومانس بھی اتنا زیادہ ہے کہ ناول بن جاتا ہے اور جگہ کی وضاحت سے محسوس ہوتا ہے کہ ہم نے بھی جگہ دیکھی ہوئی ہے۔ تمام پنج بیانیاں اچھی لگیں ان میں آبگینے، تھپیڑ، سرپرائز، کون بہتر، جنون عشق میں جو واقعات تھے ان کو پڑھ کر محسوس ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہم سب پر اپنا کرم کرے۔ (آمین)''

☆ محمد ذاکر کی آمد ملتان سے۔ ''اس بار کا شہر خیال بہت بہت دلچسپ رہا۔ ہمارے وہ تمام پسندیدہ مصنفین موجود تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ایک کہکشاں سجی ہوئی ہو۔ میں اس بار کے شہر خیال کو سال بلکہ کئی سال کا بہترین شہر خیال قرار دینے پر مجبور ہوں اس لیے مخمصے میں ہوں کہ کس کے خط کو کس پر ترجیح دوں۔ تمام کے تمام خطوط اعلیٰ تھے۔ یہی بات دیگر تحریروں کے لیے بھی ہے۔ اس بار کی تمام تحریریں اپنی جگہ نگینے کی طرح جڑی ہوئی ہیں۔ زویا اعجاز نے چنگیز خان پر خوب لکھا مگر بیربر کارمل جمالی کی ''جنگجو دوشیزہ'' بھی خاصے کی تحریر ہے۔ ہم اپنے ہی ''ہیرو'' سے غافل ہیں۔ گل بی بی اور شہسوار کے کردار کو مزید مستحکم کیا جاتا تو اور زیادہ لطف آتا۔ پردہ سیمیں بھی لاجواب تحریر ہے۔ بقیہ کا انتظار ہے، فلم سازی تو کمال کی تحریر ہے۔ پوری تاریخ ایک چھوٹی سی تحریر میں سمو دی ہے۔ سفر پہلا پہلا کی تو بات ہی کچھ اور ہے۔ یہ میرا پسندیدہ سلسلہ ہے اور سب سے پہلے اسے ہی پڑھتا ہوں، اسے پڑھتے ہوئے میں کھو سا جاتا ہوں۔ ندیم اقبال الفاظ کے ذریعے سحر طاری کرنے کا فن جانتے ہیں۔ کوثر اسلام کی ''زندہ موت'' بھی بہت عمدہ تحریر ہے۔ عالمی مجرم کی پوری زندگی سمیٹ دی ہے۔ روسیاہ بھی اچھی جا رہی ہے۔ کنیز زہرہ کی ''سریہہ چہرہ'' لاجواب سچ بیانی ہے۔ اتنی اچھی تحریر پر مصنفہ مبارک باد کی مستحق ہیں۔ سمیل کی آبگینے، اختر از سلیم وصلی کی خواب اور مونا شہزاد کی خضر راہ بھی پسند آئی۔ جنون عشق تو بے مثل سچ بیانی ہے۔''

☆ نوشین عارف کوئٹہ سے آئی ہیں۔ لکھتی ہیں۔ ''اس بار کی سچ بیانیوں نے بہت محظوظ کیا۔ کنیز زہرہ کی سچ بیانی کریہہ چہرہ بہت پسند آئی، بڑے گھر کی بیٹی از محمد جمشید اور تھپڑ از ایم زیڈ انصاری بھی سبق آموز تھی۔ خضر راہ از مونا شہزاد بھی بہت اچھی تحریر ہے۔ جنون عشق اور سرپرائز بھی پسند آئی۔ زویا اعجاز خوب لکھ رہی ہیں۔ ان کی تحریر کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ مستقبل کی بڑی قلمکار کہلائیں گی۔ سفر پہلا پہلا میرا پسندیدہ سفرنامہ ہے۔ بہت خوبصورت انداز میں کہانی آگے بڑھ رہی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ان کی داستان محبت ہم آس پاس کہیں کھڑے اپنی نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ جنگجو دوشیزہ جیسی تحریر تواتر سے لگائیں۔ یہ سب ہمارے ہیرو ہیں ان کے کارنامے آتے رہنا چاہیے۔''

☆ محمد جمشید نے فیصل آباد سے لکھا ہے۔ ''سب سے پہلے میری سچ بیانی اگست کے شمارے میں شامل کرنے کا شکریہ۔ میرے دوست انعام الدین نے اپنے چچا کی روداد پڑھنے، دوستوں کو دکھانے کے لیے پانچ پانچ رسالے خرید لیے ہیں۔ دیگر دوستوں کو بھی یہ تحریر پسند آئی ہے۔ یعنی کہ میں بھی مصنف بن گیا ہوں۔ اب آتے ہیں اس بار کے شمارے کی طرف، قاتل اعظم اچھی تحریر ہے، چنگیز خان کی داستان پڑھ کر اندازہ ہوا کہ وہ کس قسم کا انسان تھا۔ جنگجو دوشیزہ کی حالات زندگی بھی پسند آئی۔ سفر پہلا کی تعریف کرنا سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ سچ بیانی کریہہ چہرہ اور آبگینے بہت پسند آئی۔ گول میز بھی اچھی تحریر ہے، ''کون بہتر'' نے تو دل ہلا دیا۔ کیا کتا تھا کہ ملکن کو کس طرح بچا لیا۔ جنون عشق بھی اچھی کہانی ہے۔''

☆ ناصر خان نیازی، گجرات سے لکھتے ہیں۔ ''اس بار سرگزشت کی دستیابی نے جان عذاب میں ڈال دی تھی۔ جب بھی بک اسٹال پر پہنچتا جواب ملتا ابھی آیا نہیں ہے۔ خدا خدا کر کے پرچہ ہاتھ میں آیا اور جیسے ہی شہر خیال کھولا دنگ رہ گیا۔ زیادہ تر خطوط ان لوگوں کے تھے جن کی تحریریں ہم پڑھتے رہتے ہیں۔ ندیم اقبال نے تو قیامت کر دی ان کا خط بھی سفرنامے کی طرح کمال کا خط ہے۔ لاجواب، اس لیے ان کے خط کو میں نے سو میں سے سو نمبر دیا۔ سید امتیاز حسین بخاری سرگودھا کا خط بھی بہت اعلیٰ تھا۔ خوب لکھا، صغیر احمد جیمہ تو ہیں ہی اعلیٰ درجے کے قلمکار، زویا اعجاز نے بھی خوب لکھا۔ روبینہ نفیس انصاری اور آفتاب نصیر اشرفی کے خطوط بھی لاجواب تھے۔ گویا اس بار کے تمام خطوط بہت اعلیٰ تھے۔ اب آتے ہیں تحریروں کی طرف زویا اعجاز کی قاتل اعظم اے ون رہی۔ بیرک کارپل جمالی کی جنگجو دوشیزہ بھی خوب رہی۔ پردہ سیمیں بھی اچھی تھی مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی۔ پھر بھی انور فرہاد خوب لکھ رہے ہیں۔ فلم سازی بھی اچھی تحریر تھی۔ سفر پہلا پہلا تو اپنی مثال آپ ہے۔ روسیاہ بھی اچھی جا رہی ہے۔ سچ بیانیوں میں کریہہ چہرہ آبگینے بڑے گھر کی بیٹی، خضر راہ، خواب اور گول میز زیادہ پسند آئی۔ دیگر سچ بیانیاں بھی اچھی تھیں۔ اس بار کا سلیکشن بہت عمدہ ہے۔''

☆ مہناز خالق نے بہاولپور سے لکھا ہے۔ ''سرگزشت کی سچ بیانیاں مجھے پسند ہیں۔ کیا میں بھی کچھ لکھ کر بھیج سکتی ہوں، (ضرور بھیجیں)''

☆ رانا محمد شاہد بورے والا سے۔ ''اداریہ اہم نقطے پر تھا۔ اصل میں ہمارا سب سے بڑا مسئلہ کہہ لیں یا المیہ یہی ہے کہ حکومت ہو یا ادارے ہم ہمیشہ دوسروں کی طرف دیکھتے ہیں۔ اگر ہم اپنا انفرادی کردار بھی ادا کریں، معاشی صورتحال کی بہتری کے لیے جو کر سکتے ہیں کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ اس مشکل صورتحال کا مقابلہ نہ کر سکیں۔ مشکل وقت گزر جاتا ہے مگر ہمارے انفرادی کردار کا امتحان لینے ضرور آتا ہے۔ ہم آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اس کا بہتر جواب تلاش کر سکتے ہیں کہ ہم نے ہمیشہ ملکی صورتحال میں کیا مثبت کردار ادا کیا ہے اور کیا کر سکتے تھے۔ شہر خیال کی صدارت پر موجود ندیم اقبال سرگزشت سے اپنی محبت کا اظہار کر رہے تھے۔ ویسے پوسٹ آفس والے سرگزشت پہنچانے کے اتنے دن تو لگاتے ہوں گے مگر یہ کون سی کوریئر ہے جو تیسرے دن رسالہ پہنچا دیتی ہے... کیونکہ ہمارے ہاں جتنے بھی کوریئر ہیں۔ بیرون ملک پارسل یا ڈاک پہنچانے میں انہیں کم از کم ایک ہفتہ تو لگتا ہے۔ (تینوں بڑے کوریئر تیسرے دن پہنچا دیتے ہیں) عاطر شاہین! واقعی ملتان میں سرگزشت لیٹ پہنچ رہا ہے۔ زویا اعجاز آپ نے صحیح لکھا کہ تحقیق آسان ہے اور نہ ہی کوئی مقام حاصل کرنا، مگر یہ بھی سچ ہے کہ ماضی کی نسبت آج ہمیں بہت سی سہولیات حاصل ہیں۔ ماضی میں تحقیق کے لیے ہمیں لائبریری جانا پڑتا تھا اور کئی قسم کی مشکلات کا سامنا رہتا تھا، مگر انٹرنیٹ کے آنے سے ان مشکلات کا بہت حد تک ازالہ ہوا ہے۔ روبینہ نفیس انصاری! شکر کریں کہ سرگزشت دو ماہ کا ملاپ ہیں تو اپریل سے جولائی تک کئی رسالوں کا صرف ایک شمارہ آیا اور بہت سے تو شائع بھی نہیں ہوئے۔ سرگزشت بہر حال اس حوالے سے کامیاب رہا۔ جس کے لیے سرگزشت کی ٹیم مبارکباد کی مستحق ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کے بھائی کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔ (آمین) دکھ درد کا بہترین حل اللہ کی یاد اور مصروفیت ہوتی ہے۔ آپ جتنا مصروف رہیں گی اتنا ہی پُرسکون رہیں گی۔ آفتاب احمد نصیر اشرفی، گزشتہ چند مہینوں میں بہت سی نابغہ روزگار ہستیاں ہم سے بچھڑ گئیں کہ بہر حال جدائی کا دکھ تو ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا۔ تحریر کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ زرین قمر بھی شہر خیال کا حصہ تھیں یہ نئی تبدیلی بھی اچھی ہے کہ سرگزشت کے رائٹرز تبصرہ نگار کے روپ میں سامنے آ رہے ہیں۔ زرین صاحبہ سے یہی کہیں گے کہ وہ اچھا لکھتی ہیں مگر بہتری کی گنجائش تو بہر حال ہر تحریر میں ہوتی ہے۔ زیادہ مطالعہ زیادہ تحقیق آپ کی تحریر کو بہتر سے بہترین بنا دیں گے کہ کسی بھی اچھی تحریر کے لیے یہ بنیادی جزو ہیں۔ سید امتیاز حسین بخاری، قیصر خان اور ابصار احمد کے تبصرے بھی اچھے تھے۔ شہر خیال کے آخر میں ممتاز کنول کا تبصرہ پڑھ کر دل دکھ سے بھر گیا۔ ان کے لیے صبر کا لفظ بھی چھوٹا محسوس ہوتا ہے کہ جس گھر کے 9 افراد ایک ساتھ دنیا چھوڑ جائیں۔ اس کی کیفیت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ اللہ ان کے پیاروں کو اپنی جوار رحمت میں جگہ دے۔ (آمین) اور ان بلڈرز کو برباد کرے جو ذرا سے فائدے کے لیے دوسروں کی زندگیوں سے کھیل جاتے ہیں۔ اس دفعہ طویل سرگزشت ظالم ترین جنگجو چنگیز خان کے بارے میں تھی۔ منگولوں کے ظلم و سفاکیت کی داستانیں تاریخ کی کتابوں میں موجود ہیں۔ اس سفاکیت کے بہت سے من ظر ہم نے مشہور ترک ڈرامہ سیریل ''ارطغرل غازی'' میں بھی دیکھے ہیں کہ منگول جنگ کے دوران بچوں، بوڑھوں اور خواتین کو بھی نہیں چھوڑتے تھے۔ حالانکہ اسلام ہمیں درس دیتا ہے کہ جنگ کے دوران بچوں، بوڑھوں اور خواتین کا احترام کیا جائے اور جو امان حاصل کرنا چاہے اسے

امان دیا جائے۔ ویسے تاریخ میں چنگیز خان کے جو ظلم درج ہیں ڈرامے میں تو شاید دکھائے بھی نہیں جا سکتے تھے۔ زویا اعجاز کی تحریر کا آخری پیراگراف حیران کرنے کے لیے کافی تھا کہ چنگیز خان تو سفاک تھا اس نے یہ سفاکیت اپنے سپاہیوں میں منتقل کر دی تھی کہ جنہوں نے 40 عورتوں اور 40 گھوڑوں کو ذبح کر کے اس کی قبر پر چڑھا دیا۔ ''جنگجو دوشیزہ'' ایک دلچسپ داستان تھی۔ گل بی بی واقعی ایک بہادر خاتون تھی کہ جس نے جنرل ڈائر (جلیانوالہ باغ میں سفاکیت کا مظاہرہ کرنے والا) جیسے شخص کے خلاف جنگ لڑی اور اپنے کردار و عمل سے ثابت کیا کہ وہ ایک جنگجو خاتون تھی۔ ببرک کارمل جمالی اچھا لکھتے ہیں۔ طارق عزیز خان کی ''مارگلہ کا بیندوا'' ایک دلچسپ اور معلوماتی تحریر تھی۔ شیراز خان کی ''کالے میگھا'' ایک منفرد موضوع پر تحریر تھی۔ دنیا بھر میں بارش کے لیے کیسے کیسے عجیب ٹوٹکے اختیار کیے جاتے ہیں۔ یہ سب حرکتیں واقعی عقل کو حیران کر دینے والی ہیں۔ منظر امام کہانیوں کے ایک مجموعے کا تذکرہ کر رہے تھے جس پر بعد میں ڈراما سیریلیز اور فلمیں بھی بنیں۔ یہ حقیقت ہے کہ کہانی ہو یا ناول، اگر لکھنے والے کا انداز کچھ الگ ہو تو قارئین کے دلوں میں جگہ بنا ہی لیتا ہے۔ انور فرہاد اور شکیل صدیقی کی تحریریں فلمی دنیا کی کئی شخصیات اور فلموں کے حوالے سے بھرپور معلومات پر مبنی تھیں۔ ندیم اقبال کا سفرنامہ سیاحت کے ساتھ ساتھ انسانی نفسیات و احساسات کا بھی بھرپور احاطہ کر رہا ہے۔ کوثر اسلام کی ''زندہ موت'' ایک انوکھی تحریر تھی۔ پابلو اسکوبار جرائم کی دنیا کا ڈان تھا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ انسان اپنے قریبی رشتوں کے سامنے ہار جاتا ہے۔ اپنی ننھی بیٹی کو سردی سے بچانے کے لیے اس نے ایک رات میں 26 کروڑ پاکستانی روپے جلا دیئے۔ جس سے ظاہر ہوا کہ وہ جتنا بڑا مجرم تھا اتنا ہی بڑا باپ بھی تھا۔ ویسے جرائم کے اس بے تاج بادشاہ کی کہانی تجسس سے بھری تھی۔ کوثر اسلام کو اس انوکھی کھوج پر مبارکباد۔''

☆ بشریٰ افضال کا خط بہاولپور سے۔ ''اُمید ہے کہ خیریت سے ہوں گے ٹائٹل گرل کسی گہری سوچ میں گم ہیں کہ صنف کرخت کو کیا ہوا؟ لگتا ہے ہری مرچ کھالی ہے۔ کافی لمبی غیر حاضری پر Sorry میری غیر حاضری کس کس نے محسوس کی۔ لگتا ہے مجھے سب ساتھی بھول گئے ہیں۔ میں نے دنیا سے تو اوپر کوچ نہیں کیا۔ مصروفیت کی وجہ سے غیر حاضری ہوگئی۔ رانا محمد شاہد، آفتاب احمد نصیر بھائی آپ لوگ کیسے ہیں۔ یہ سال ہمیں راس نہیں آیا۔ آگے خدا خیر کرے ان شاء اللہ اگلے ماہ وقت پر اپنی حاضری لگاؤں گی اس محفل میں کافی نئے لوگ نظر آئے سب کو Welcome۔ بشریٰ افضل نے اپنی انٹری دے دی آپ لوگ بھی اب واپس آجائیں اور محفل کو چار چاند لگائیں ہمارے دم سے ہی محفل میں رونق ہے۔''

☆ روبینہ نفیس بھکر سے رقمطراز ہیں۔ ''سرگزشت کا سرورق بہت اچھا لگا۔ حسینہ مجھے ترچھی نظروں سے ایسے دیکھ رہی ہے جیسے میں نے کچھ چرا لیا ہو۔۔۔۔ بی بی نظریں گھماؤ جو تم سوچ رہی ایسا بالکل نہیں ہے، دیکھنے کا اتنا ہی شوق ہے تو پاکستان کے حالات کو دیکھو..... ہائے رے بیچارہ پاکستان کا کیا حشر نشر ہو گیا۔ ہر طرف پانی ہی پانی۔ لوگ دربدر ہو رہے ہیں۔ پہلے ہی کھانے کو کچھ نہیں سونے پہ سہاگا بارشیں رکنے کا نام نہیں لے رہیں۔ حکمران میرا، تیرا کے چکروں میں مدہوش ہیں۔ کراچی میں پانی سے لاشیں نکل رہی ہیں، لوگوں کے گھر اجڑ گئے۔ پنجاب میں بھی بہت برے حالات ہیں۔ فصلیں تباہ ہوگئیں۔ سیلاب نے تباہی مچادی مگر یاد رہے یہ پانی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت لایا گیا ہے۔ ہماری سائٹ پہ بھی بہت سی زمینیں زیر آب آگئی ہیں۔ اللہ پاک پاکستان اور اس کے مسلمانوں پر رحم فرمائے اور اپنی رحمت میں سب کو جگہ دے۔ (آمین) شہر خیال میں آئی تو زویا اعجاز مجھے دعائیں دیتی نظر آئیں۔ بہت شکریہ جی۔ رانا ایم شاہد، ان شاء اللہ جب تک زندگی ہے تو ضرور سرگزشت میں آتی جاتی رہوں گی۔ مرگی تو آپ سب لوگ مغفرت کی دعائیں ضرور کر دیجیے گا۔ سرگزشت اعزازی بھیجنے پر آپ نے حوصلہ افزائی کی بہت شکریہ۔ مگر آپ لوگوں نے یہ نہیں بتایا کہ شہر خیال کے کن کن افراد کو اور کس کس خوبی کی بنیاد پر مزید پرچے دینے چاہیے۔ آفتاب احمد نصیر خیر مبارک۔ بہت شکریہ۔ ممتاز کنول کا تبصرہ پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔ کسی بھی گھر کا ایک فرد ہی دنیا سے رخصت ہو جائے تو قیامت کا سماں نظر آتا ہے، آپ کے تو 9 جنازے ایک ساتھ..... یقین کریں مجھے دل سے بہت دکھ ہوا اللہ پاک ان سب کو جنت الفردوس کے اعلیٰ مقام میں جگہ عطا فرمائے۔ (آمین) بلڈرز کو تو عبرت ناک سزا ہونی چاہیے۔ کہانیوں میں ''ٹنچ پٹر'' نے بہت متاثر کیا۔ یہ تو کھلی حقیقت اور سچ ہے کہ جس کے پاس دولت ہے سب اسی کے ہیں سب چڑھتے سورج کو سلام کرتے ہیں۔ سورج ڈوبا، تو کون میں کون..... سکندر کو ٹھوکریں کھانے کے بعد عقل تو آئی جو یقیناً نوشین کی خوش نصیبی ہے۔ اور ہاں ایک بات کہنا چاہوں گی کہ پہلے لاک ڈاؤن کی وجہ سے بہت سے لوگ بے روزگار ہو گئے اور جن کا روزگار تھا وہ بھی بہت برے حالات میں زندگی گزار رہے ہیں اور اب مسلسل بارشیں، سیلاب، آندھی، زلزلے جیسی آفات نے زندگی کا پہیا روک کر رکھ دیا ہے۔ لوگ بھیک مانگنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ جسے اللہ پاک نے اپنی نعمتوں سے نوازا ہے تو برائے مہربانی بے آسرا اور بے روزگار

افراد کی جہاں تک ہوسکتا ہے امداد کریں۔ سب کے لیے بہت سی دعاؤں کے ساتھ پھر آؤں گی۔''

☆ حافظ عبدالغفور توحیدی کی سرگودھا سے فرمائش۔ ''ضلع بھکر سے حاجی اعجاز حسین سٹھار ماہنامہ سرگزشت کے مستقل قاری ہیں اور ان کی تحریریں بھی سرگزشت میں چھپا کرتی ہیں۔ مجھے ان سے ایک ضروری کام ہے اس سلسلے میں ان کو لیٹر لکھنا ہے۔ ان کے ایڈریس سے مطلع فرمائیں۔ (حاجی اعجاز سٹھار نور پور تھل سے خطوط لکھتے ہیں بھکر سے نہیں۔ پہلی بات یہ کہ ہم کسی کا فون نمبر یا ایڈریس بغیر اجازت کسی کو نہیں دیتے۔ دوسری بات یہ کہ ان کا فون نمبر یا ایڈریس ہمارے پاس نہیں ہے)''

☆ ارباب خان کا تبصرہ ہنگو سے۔ ''اس بار کا سرگزشت سال کا سب سے بہتر رسالہ ثابت ہوا۔ شہر خیال میں وہ تمام مصنفین موجود تھے جنہیں ہم پسند کرتے ہیں۔ جن کی تحریریں ہمیں اسیر کرتی ہیں۔ بطور تبصرہ نگار اپنے درمیان انہیں دیکھ کر خوشی ہوئی۔ شہر خیال عبور کر کے کہانیوں تک پہنچے تو ہر تحریر جداگانہ نظر آئی۔ ایسا لگا جیسے یہ خاص نمبر ہو، ہر تحریر دوسرے پر سبقت حاصل کرنے والی ہے۔ ''کریہہ چہرہ'' نے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اف، کیسی ہولناک داستان ہے۔ گول میز مختصر اور پراثر تھی۔ جنون عشق بھی بہت پسند آئی، تھپڑ اور خواب یہ دونوں بھی دلچسپ تھی۔ خضر راہ اور بڑے گھر کی بپتا بھی خوب تھی۔ ابتداء کی تحریروں میں جنگجو دوشیزہ بہت پسند آئی۔ یہ ہماری نالائقی ہے کہ ہمیں اپنے ان اہمیت کے حامل افراد سے واقف نہیں جنہوں نے تاریخ ساز کارنامہ انجام دیا۔ ایک اتنی اہم شخصیت اور ہم ان سے ناواقف۔ ایسی ہستیوں کو ڈھونڈ کر لانا سرگزشت کا کمال ہے۔ فلم سازی معلومات سے لبالب تحریر تھی۔ کوثر اسلام کی تحریر زندہ موت بھی اچھی تھی۔ اب آتے ہیں اپنی پسندیدہ تحریر سفر پہلا پہلا کی جانب۔ یہ سفر نامہ ہے یا داستانِ محبت، اسے سفر نامہ سمجھ کر پڑھتا ہوں تو محبت بھری کہانی کا لطف آتا ہے۔ خوب ہی نہیں بہت خوب تحریر ہے۔''

☆ ممتاز اسدی لاہور سے رقمطراز ہیں۔ ''اس بار کا اداریہ مختصر ہوتے ہوئے بھی اہم ہے۔ پوری دنیا کی بڑے بڑے، ترقی یافتہ ممالک کی معیشت ہل کر رہ گئی ہے۔ پوری دنیا میں ڈاؤن سائزنگ کی چھری سے روزگار کو ذبح کیا گیا بلکہ یہ کام جاری ہے۔ بڑی بڑی صنعتیں بند ہوگئیں۔ خود میرے کئی عزیز آج بے روزگاری کا عذاب سہہ رہے ہیں۔ زویا اعجاز نے چنگیز خان کی زندگی کا خوبصورت انداز میں احاطہ کیا۔ بہت عمدہ لکھا۔ بیبرک کارمل جمالی نے بھی خوب لکھا۔ گل بی بی کی شخصیت کو سامنے لایا لیکن سرگزشت ہمیشہ بھرپور کہانی پیش کرتا ہے لیکن گل بی بی کی کہانی ادھوری لگی۔ اس کی زندگی کو مزید عیاں کرنا چاہیے تھا۔ زندہ موت بھی دلچسپ تھی۔ اب تک اس بدکار کے متعلق صرف پڑھا سنا تھا۔ پہلی بار اس کا چہرہ بھی دیکھ لیا۔ سچ بیانیوں میں آبگینے، بڑے گھر کی بپتا، تھپڑ اور خواب، اعلیٰ درجے کی تحریر تھیں۔ خضر راہ، سرپرائز، گول میز، کون بہتر اور جنون عشق بھی اچھی تھیں لیکن کریہہ چہرہ کا جواب نہیں۔

☆ نعمان احمد مصطفوی نے فیصل آباد سے لکھا ہے۔ ''کافی عرصے بعد سرگزشت کی اس دلچسپ محفل میں شرکت کر رہا ہوں۔ عملی زندگی میں آنے کے بعد وقت کی اہمیت کا احساس ہوتا ہے۔ اب نہ راتیں اپنی ہیں اور نہ دن۔ کام کام اور کام یہی اب زندگی ہے پھر بھی سرگزشت کی محبت کم نہیں ہوئی ہے۔ اب بھی اسی دلچسپی سے پڑھتا ہوں لیکن خط لکھنے سے رہ جاتا ہوں۔ جب پرانے ساتھیوں کو پُرجوش انداز میں شہر خیال میں دیکھتا ہوں تو خود پر ہنسی آتی ہے کہ ایک میں ہوں جو..... خیر جانے دیں۔ شہر خیال کی رونق دیکھ کر دل باغ باغ ہوگیا۔ اتنے معروف لوگ شہر خیال میں جلوہ گر تھے۔ انہیں دیکھ کر ہی میں نے قلم سنبھالا ہے اور امید ہے اب تواتر سے تبصرہ لکھا کروں گا۔ خطوط میں ندیم اقبال صاحب کا خط واقعی ایسا تھا کہ اسے سراہا جائے۔ سید امتیاز بخاری کا تجزیہ بھی اے ون تھا۔ زویا اعجاز بھی خوب لکھ گئیں۔ روبینہ نفیس نے بھی خوب لکھا۔ عاطر شاہین اور رانا محمد شاہد بھی اچھا لکھ گئے لیکن ممتاز کنول کے خط نے دل غموں سے بھر دیا۔ ہائے ہائے قیامت سی قیامت کا سامنا ہوا ہوگا۔ کیسے کیسے حادثات کا سامنا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بہنا ممتاز کنول کو صبر عطا کرے۔ اب چلتے ہیں سچ بیانیوں کی جانب، کریہہ چہرہ نے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کیا ہے۔ بڑے گھر کی بپتا، لالچی والدین کے چہرے پر طمانچہ ہے۔ جنون عشق بھی کمال کی تحریر ہے۔ خضر راہ بھی اچھی تحریر ہے۔ تھپڑ اور خواب کا جواب نہیں، سرپرائز بھی مزہ دے گئی۔ آبگینے بھی اچھی تحریر ہے۔''

تاخیر سے موصول خطوط:

خالد محمود، کراچی۔ رانا فیصل، گوجرانوالہ۔ محسن خان، بنوں۔ عرفان، کراچی۔ عامر خان، کوئٹہ۔ دانش ظہیر قریشی، کراچی۔ شگفتہ منیر، وہاڑی۔ سید ذوالفقار نقوی، رحیم یار خان۔ سید مصور حسین شاہ، لاہور

# ارض فرض قرض

زویا اعجاز

یہ غازی یہ تیرے پُراسرار بندے
جنہیں تو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی
دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا
سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی
شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

علامہ اقبال کے یہ اشعار ان جری جوانوں کے لیے ہے جو اپنے لہو سے اس کی تفسیر مسلسل لکھ رہے ہیں۔ وہ بھی دل میں یہی جذبہ لیے کمانڈو بنا تھا اور اس نے اپنے ہر عمل سے ثابت کیا کہ وہ شہادت کا مرتبہ حاصل کرنے کے لیے پیدا ہوا تھا۔

وہ مختصر سا خاندان تین سال قبل پاکستان سے بحرین منتقل ہوا تھا۔

ان کی زندگی میں قدرت نے بے بہا سکون اور نعمتیں عطا کر رکھی تھیں۔ تعلیم، دولت، گھریلو سکون، مضبوط خاندانی پس منظر، ذہانت، قابلیت، جرأت، ہمدردی، معاملہ فہمی، مردم شناسی، ازدواجی خوشحالی، ذہنی ہم آہنگی، اولاد نرینہ، عہدہ، شہرت، قدرو منزلت غرضیکہ ایسا کیا تھا جو ان کے پاس نہیں تھا۔ خاندان کے سربراہ کا نام آفتاب ربانی تھا۔ بلحاظ پیشہ وہ ایک ڈاکٹر تھے۔ بحرین میں بہت اچھی ملازمت ملی ہوئی تھی۔ علم کی پیاس تو خیر اب بھی برقرار تھی اسی لیے ملازمت کے ساتھ ساتھ پڑھائی کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ پیشہ وارانہ زندگی کے مصائب اور بھاگ دوڑ تھکاوٹ میں مبتلا کرتے تو اہلیہ کی پُرخلوص رفاقت، روشن مسکراہٹ اور نرم آہٹ بھرے الفاظ تریاق ثابت ہوتے۔ سوا سالہ بیٹے دانش کو گود میں لیتے ہی اپنے وجود میں توانائی کا ایک ذخیرہ محسوس ہونے لگتا۔ انہی دنوں قدرت کی مہربانی سے، ان کے خوبصورت گلشن میں ایک اور پھول کھلنے کی نوید بھی مل گئی۔ ڈاکٹر آفتاب اور ساجدہ کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ ہی نہ تھا۔ وہ پروردگار کی ان نعمتوں اور کرم فرمائی پر سجدہ شکر بجالاتے نہ تھکتے۔ زندگی کسی بھی مصور کی حسین ترین اور شاہکار تصویر سے بھی زیادہ شاندار تھی۔ سب کچھ ہموار اور معاملات نہایت پُرسکون تھے کہ یک لخت بین الاقوامی افق پر ایسی تبدیلی پیدا ہوئی جس نے انفرادی زندگیوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

کیلنڈروں پر انیس سو نوّے کا ہندسہ جگمگاتے ابھی آٹھواں ماہ ہی ہوا تھا کہ عراق کے صدر صدام حسین نے کویت پر حملہ کر دیا۔ اس کا مؤقف تھا کہ کویت عراقی تیل کے ذخائر چوری کرتا ہے۔ حملہ کے بعد امریکا بہادر کے دل میں روایتی ہمدردی جاگ گئی۔ سارے جہاں کا درد پیچاسام کے دل میں

ERHAN
PAK ARMY

تھا۔اس کے ہزاروں فوجیوں کے ساتھ سامان حرب بھی زنگ آلود ہونے لگا تھا اس لیے کویت کی مدد کے لیے اپنی فوج اور عسکری مدد بھیج دی۔ ہمسایہ ملک ہونے کے ناتے بحرین بھی اس صورتِ حال سے بری طرح متاثر ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر آفتاب کے لیے ان حالات میں پُرسکون رہنا ممکن ہی نہ تھا۔ ان کی یہ پریشانی اور تناؤ اہلیہ سے بھی بھلا کس طرح پوشیدہ رہ پاتا۔ ساجدہ نے شوہر سے حتمی بات چیت کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

''کچھ دنوں سے آپ بہت اپ سیٹ لگ رہے ہیں۔ ایسا پہلے تو کبھی نہیں ہوا۔''

''ٹھیک کہہ رہی ہو۔ ایسے حالات بھی تو پہلے کبھی نہیں دیکھے۔'' وہ ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے بولے۔

''لمحۂ فکریہ تو بہرحال ہے کہ ایک مسلم ملک نے دوسرے برادر ملک پر حملہ کردیا ہے۔ مسلمانوں کا یہ باہمی نفاق اغیار کو غالب آنے کا موقع دے گا۔ پروردگار امت مسلمہ کو اس مشکل گھڑی میں سرخروئی عطا فرمائے۔'' ساجدہ نے خلوص دل سے دعا کی۔

''میں بھی اکثر یہی سوچتا ہوں کہ ان دو ممالک میں کسی کی بھی شکست کی صورت میں مسلم قوم ہی یہ داغ پیشانی پر سجائے گی۔ میری آنکھیں اس وقت بہت سی تبدیلیاں رونما ہوتے دیکھ رہی ہیں۔ عراق اور کویت کی یہ جنگ تو محض نقطۂ آغاز ہے۔ ابھی معاملات بہت دور تک جائیں گے۔ چچا سام جنگ کے یہ شعلے کبھی سرد نہیں ہونے دے گا۔ اس کی یہی کوشش ہوگی کہ یہ آگ خلیج سے نکال کر بقیہ مسلم ممالک میں بھی پھیلا دے۔'' ڈاکٹر آفتاب نے اپنے خدشات بیان کیے۔

''آپ کی بات بالکل بجا ہے۔ اب وہ مسئلہ بھی بتا دیجیے جو اس وقت آپ کو الجھائے ہوئے ہے۔'' ساجدہ نے پوچھا۔

''میں چاہتا ہوں کہ تم دانی کے ساتھ پاکستان لوٹ جاؤ۔''

''آپ کو اچھی طرح اندازہ ہے کہ میں آپ کو یہاں تنہا چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔'' انہوں نے دوٹوک کہا۔

''میرے ذمے ابھی یہاں کچھ کام ہیں۔ انہیں نمٹاتے ہی میں بھی تم لوگوں کے پاس چلا آؤں گا۔ بس کچھ ہی وقت کی بات ہے۔'' ڈاکٹر آفتاب نے اہلیہ کو یقین دلایا۔ ساجدہ نے شوہر کی بات تسلیم کرلی اور بہت سے وعدے لیے اپنے والدین کے گھر گوہر آباد منتقل ہوگئی۔

گوہر آباد، ایبٹ آباد کا ایک نواحی علاقہ ہے۔ جدید ترین سہولیات سے قدرے دور سہی لیکن سکون اور امن میں اس چھوٹے سے علاقہ کا کوئی جواب نہیں۔

ڈاکٹر آفتاب نے اپنا وعدہ ایفا کیا اور سبھی ذمے داریاں نبھا کر پاکستان منتقل ہوگئے۔ اپنے وطن میں اپنے لوگوں کے ساتھ رہنے جیسا سکون بھلا اور کہاں میسر ہوتا ہے؟ بحرین میں وقتی پریشانیوں کے بعد زندگی ایک بار پھر سابقہ ہموار ڈگر پر لوٹ آئی۔ اس امن وسکون میں مزید اضافہ اس وقت ہوا جب ساجدہ نے 'دو اکتوبر' کے روشن اور خنک دن میں ایک اور بیٹے کو جنم دیا۔ نھیال بھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ فوری طور پر دودھیال میں بھی خبر پہنچادی گئی۔ ڈاکٹر آفتاب اپنی والدہ کو لیے نومولود سے ملنے دوڑے آئے۔ بچے کو سینے سے لگا کر محبت بھرے بوسے دیتے ہوئے انہیں اپنے وجود میں سرشاری کی لہریں موجزن محسوس ہو رہی تھیں۔

''بچہ کچھ کمزور نہیں ہے؟'' کسی رشتہ دار خاتون نے پُرسوچ انداز میں کہا۔

''بالکل بھی نہیں۔ میرا بیٹا ابھی سے بہت ایکٹو ہے۔'' ڈاکٹر آفتاب کے لہجے میں اس وقت پدرانہ محبت وشفقت کے علاوہ ایک طبیب کا برس ہا برس کا تجربہ بھی جھلک رہا تھا۔ نومولود کی آنکھیں حقیقتاً بہت غیر معمولی تھیں۔ روشن، گہری اور پُرکشش ان آنکھوں میں جھانکنے والا کوئی بھی شخص متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ ڈاکٹر آفتاب بھی اس وقت انہی ننھی آنکھوں کے سحر میں مبتلا تھے۔

''ٹھیک ہے بھئی! ٹھیک ہے۔ بیٹے کا کوئی نام بھی سوچا ہے کہ نہیں؟'' وہ رشتہ دار خاتون خوشدلی سے مسکرائیں۔ حقیقت تو یہ تھی کہ دانش کے 'جوڑی دار' کی پیدائش نے خاندان میں سبھی کو خوش اور پُرجوش کر رکھا تھا۔

''بالکل سوچ رکھا ہے۔ میرے بیٹے کا نام آکاش ہو گا۔ آکاش آفتاب ربانی۔'' نومولود کے اس نام کا سبھی نے خیر مقدم کیا۔ حیران کن بات یہ تھی کہ ننھے دانش نے بھی عام بچوں کے برعکس چھوٹے بھائی کو بہت جلد دلی طور پر قبول کر لیا۔ وہ اس کم عمری میں ہی بھائی کے لیے بہت حساس تھا۔ ڈیڑھ سالہ دانش کی بھرپور کوشش ہوتی تھی کہ وہ آکاش کو اپنی گود میں اٹھالے لیکن والدہ کی جانب سے ہر بار یہ کوشش ناکام ہونے پر وہ اپنی مخصوص زبان دانی میں صدائے احتجاج بلند کرکے رہ جاتا۔ دانش کے یہ احتجاجی مظاہرے والدین اور دیگر اہلخانہ کو بہت محظوظ کرتے۔ کم وزنی، قدرے لاغر صحت اور دیگر چھوٹے موٹے مسائل کے ساتھ آکاش کی بھرپور

انداز میں پرورش جاری رہی۔ اگلے چند ماہ میں اس کی صحت کافی بہتر ہوگئی۔ بھرے بھرے سرخ و سفید رخسار ہر دیکھنے والے کو بے اختیار گدگداتے اور وہ ان رخساروں پر چٹکیاں بھرنے پر مجبور ہوجاتے۔

سرما کے چار ماہ گوہر آباد میں گزارنے کے بعد ساجدہ دونوں بچوں کے ساتھ ایبٹ آباد منتقل ہوئیں تو آکاش کی عمر پانچ ماہ ہوچکی تھی۔ ان میاں بیوی کے دلوں میں دانش کی جانب سے ایک ازلی فطری رویئے اور جبلی حسد کا خدشہ موجود تھا لیکن وہ حقیقتاً حیران کن رویئے کا مظاہرہ کررہا تھا۔ وہ اپنی ذات سے بڑھ کر چھوٹے بھائی سے محبت کرتا اور اس کا خیال رکھتا تھا۔ آکاش کی ہر ایک حرکت' شرارت اور جنبش کے بارے میں والدہ کو لمحہ بہ لمحہ 'اپ ڈیٹ' کرنا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ آکاش بھی بڑے بھائی کی سنگت میں بہت خوش رہتا۔ وہ دونوں اس کم عمری میں ہی ایک دوسرے کو دیکھ کر جینے لگے تھے۔ والدین اور دانش کی محبت و نگہداشت کے سائے میں آکاش کی پرورش کا سلسلہ جاری رہا۔ آکاش نے گھٹنوں کے بل چلنا سیکھا تو ہر ایک شے کو الٹ پلٹ کر دیکھنے کی کوشش کرنے لگتا۔ آئے روز مختلف چوٹیں لگوانا اس کا معمول بن چکا تھا۔ چلنے کا آغاز ہوا تو گھر بھر میں ایک بھونچال کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ ایک لمحہ کے لیے وہ گھر کے ایک کونے میں ہوتا تو اگلے ہی پل کسی دوسرے کونے میں اپنی کسی دریافت کا سلسلہ شروع کیا ہوتا۔ مختلف آرائشی اشیاء اٹھا کر فرش پر پھینکنا' دیواروں پر نصب سوئچ بورڈز میں انگلیاں گھسانا' سیڑھیاں چڑھنے کی کوششوں میں ہلکان رہنا' فرش پر چیزیں پھینک کر بعد میں انہیں اٹھا کر منہ میں ڈال لینا اسے بہت مرغوب تھا۔ اہلخانہ اسے ان کوششوں سے باز رکھنے میں دگنا ہلکان ہوچکے تھے۔ سوئچ بورڈز پر ٹیپ چڑھادی گئی۔ آرائشی اشیاء کے ٹھکانے بدل دیئے گئے لیکن آکاش ان نئی 'ترتیبات' میں بھی کوئی نہ کوئی سیندھ لگانے میں کامیاب ہوجاتا۔ ساجدہ دن بھر کی یہ روداد شوہر کو سنا کر بہت خوشی محسوس کیا کرتیں۔ ڈاکٹر آفتاب کے لیے بھی بچوں کی ذہانت بھری شرارتوں کا احوال جاننا بہت سرشار لمحے ہوتے لیکن ایک روز جب یہ علم ہوا کہ ڈیڑھ سالہ آکاش اچانک گم ہوگیا تھا تو یہ سرشاری خوف میں تبدیل ہوگئی۔

''کیا؟ یہ کیا کہہ رہی ہو بھئی تم؟ کیسے گم ہوگیا تھا کاشی؟ کیا وہ گھر سے باہر کہیں گیا تھا؟'' انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

''نہیں! آپ کو علم ہے کہ میں اسے اکیلا گھر سے باہر کسی صورت نہیں جانے دیتی۔''

''تو پھر یہ سب ہوا کیسے؟'' وہ مزید حیران ہوئے۔

''گھر میں کافی دیر سے خاموشی طاری تھی۔ کہیں کسی جانب سے کاشی کی کوئی آواز تو کیا آہٹ بھی نہ تھی۔ میں پریشان ہوگئی۔ اسے آوازیں دیتے ہوئے ہر ایک کونا دیکھ لیا لیکن کاشی کہیں بھی موجود نہیں تھا۔''

''مائی گڈنیس! تو پھر کہاں تھا وہ؟ کہیں چھت پر تو نہیں چلا گیا ہوا تھا؟ آج تو موسم بھی بے حد خراب تھا۔'' ڈاکٹر آفتاب ۔۔۔ شی کے ایک اور پسندیدہ 'رون' سے واقفیت کے تحت بولے۔

''نہیں! وہ باہر برآمدے میں موجود تھا۔ تیز ہواؤں کے جھکڑ اور درختوں کے جھولنے سے ایسا لگ رہا تھا کہ جانے کتنی بدروحیں مل کر شور مچا رہی ہیں۔ میرا تو دل گھبرا رہا تھا لیکن ہمارا کاشی اس منظر میں ایسے کھویا ہوا تھا جیسے کسی پسندیدہ قدرتی منظر یا پینٹنگ کو دیکھ کر لطف اندوز ہورہا ہے۔'' ساجدہ نے بتایا۔

''یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ وہ کسی خوف یا دہشت کے زیر اثر وہاں بیٹھا ہو۔''

''نہیں! ایسا ہرگز نہیں تھا۔'' ساجدہ نے شدومد سے سر ہلایا۔ ''اس وقت کاشی کے چہرے پر دکھائی دینے والی سنجیدگی اور بے نیازی میں کوئی بھی خوف نہیں تھا۔ مجھے اس لمحے اپنے بچے میں ایک عجیب مضبوطی نظر آئی تھی جو میری نظروں کا دھوکا یا واہمہ بالکل نہیں ہوسکتی۔'' وہ پُریقین تھیں۔ ڈاکٹر آفتاب کسی سوچ میں گم دکھائی دینے لگے۔

''یہ بات تو خیر میں بھی شروع سے محسوس کررہا ہوں کہ ہمارا بچہ غیر معمولی ہے۔ میرا دل کہتا ہے کہ کاشی کی یہ خوبیاں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مزید نمایاں ہوں گی۔ ہمیں اس کی پرورش میں بہت احتیاط کرنی ہوگی۔ کاشی جیسا انمول خزانہ قسمت والوں کو ملا کرتا ہے اور ہم دونوں ہی اس خزانہ کی بھرپور حفاظت کریں گے۔'' انہوں نے عزم ظاہر کیا۔ ساجدہ نے بھی مکمل اعتماد سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

وقت کسی خاموش اور دھیمی رفتار کی ندی سا بہہ رہا تھا۔ آکاش کی عمر دو سال سے زائد ہوچکی تھی۔ اس روز ساجدہ باورچی خانہ میں مشغول تھیں کہ انہیں ایک مترنم سی آواز سنائی دی۔

''اے بی سی ڈی ای ایف۔جی ایچ آئی جے کے۔''

وہ ٹھٹک کر باہر نکلیں۔آکاش نہایت مگن انداز میں انگریزی زبان کے یہ حروف تہجی پڑھ رہا تھا۔

''کاشی بیٹا! یہ آپ نے کیسے پڑھے؟'' انہوں نے خوشگوار حیرت سے دریافت کیا۔آکاش نے اپنی مخصوص زباندانی میں انہیں جو کچھ بتایا اس کا لب لباب یہ تھا کہ دانی کو پڑھائی اور سکھائی جانے والی گنتی' الف ب اور اے بی سی اسے بھی کافی حد تک یاد ہو چکی تھی۔ساجدہ کی آنکھوں میں خوشی سے آنسو آ گئے۔انہوں نے دانش کے ساتھ آکاش کو بھی مزید بنیادی لوازمات سکھانے کا ارادہ کر لیا جس میں وہ کافی حد تک کامیاب بھی رہیں۔اس خوشگوار مرحلہ میں جھنجلاہٹ نما کیفیت اس وقت پیدا ہوئی جب ساڑھے تین سالہ دانش کو نرسری کلاس میں داخلہ ملتے ہی آکاش نے بھی بھائی کے ساتھ اسکول جانے کی رٹ لگا دی۔

''میرے چاند! ابھی آپ چھوٹے ہو ناں۔تھوڑے اور بڑے ہو جاؤ پھر میں آپ کو بھی بھائی کے ساتھ ہی اسکول بھیج دیا کروں گی۔'' وہ اسے پیار سے بہلاتیں۔پہلے پہل تو وہ بہل جاتا لیکن پھر صورتِ حال بے قابو ہونے لگی۔

''میں چھوٹا نہیں ہوں امی! میں بھی بڑا ہوں۔مجھے اسکول جانا ہے۔میں وہاں نہیں روؤں گا۔'' وہ اپنی ضد پر اٹل تھا۔اس کم عمری میں ہی وہ اپنے ارادوں اور سوچ میں پختہ کار دکھائی دینے لگا تھا۔ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اسے اپنا ہر کام جلدی جلدی کر لینے کی خواہش ہے۔ڈاکٹر آفتاب اور ساجدہ اسے دانی کے اسکول لے گئے جہاں حسبِ توقع انتظامیہ نے اڑھائی سالہ بچے کو داخل کرنے سے انکار کر دیا۔انہوں نے اپنے اصول وضوابط واضح طور پر ان دونوں کے سامنے رکھ دیئے۔

''میں آپ کی بات سمجھ رہی ہوں لیکن آکاش کوئی معمولی بچہ نہیں ہے۔وہ آپ کے لیے کبھی پرابلم نہیں بنے گا۔'' ساجدہ نے یقین دہانی کروائی۔انہیں علم تھا کہ اسکول داخلہ کے لیے بچے کی زباندانی میں فصاحت' حوائج ضروریات کے متعلق بتانے کی سکت کے علاوہ مزید ضوابط ہر ادارہ میں لازم ہوا کرتے ہیں۔

''اپنا بچہ تو سبھی والدین کو ہی غیر معمولی لگتا ہے میم! لیکن ہم نے تو بہرحال اپنے اصول وضوابط پر عمل کرنا ہوتا ہے ناں! آپ دونوں ماشاء اللہ تعلیم یافتہ ہیں۔آپ ہی ہماری بات نہیں سمجھیں گے تو کیسے چلے گا؟'' انتظامیہ نے متانت سے سمجھایا۔

''آپ کی بات بالکل بجا ہے لیکن میں چاہتا ہوں کہ آکاش سے ایک چھوٹا سا اورل ٹیسٹ لے کر دیکھ لیجیے۔اگر آپ کو تسلی نہ ہوئی تو ہم دوبارہ کوئی بات نہیں کریں گے۔'' ڈاکٹر آفتاب سے بیٹے کی افسردہ صورت دیکھی ہی نہیں جا رہی تھی۔ان کے اصرار اور بھرپور اعتماد نے انتظامیہ کو سوچ میں مبتلا کر دیا۔انہوں نے آکاش سے معلومات عامہ کے چند بنیادی سوالات کے علاوہ انگریزی' اردو کے حروف تہجی دریافت کیے۔گنتی کے بارے میں پوچھا۔آکاش کے لیے یہ سب بھلا کہاں مشکل تھا۔اس نے فرفر جوابات دے کر اسکول انتظامیہ کو انگشت بدنداں کر دیا۔

''حیران کن! مجھے اب بھی یقین نہیں ہو رہا کہ یہ بچہ صرف اڑھائی سال کا ہے۔'' اس بے ساختہ توصیف نے ساجدہ اور ڈاکٹر آفتاب کے سر فخر سے بلند کر دیئے۔اسکول انتظامیہ ان کے کاشی کو اپنے اصول وضوابط کے خلاف داخلہ دینے پر مجبور ہو گئی تھی۔آکاش کی خوشی بھی دیدنی تھی۔وہ یونیفارم پہن کر اسکول جاتے ہوئے کسی بھی مرحلہ میں تنگ نہیں کرتا تھا۔اس کا شخصی تاثر' طور طریقے اور رکھ رکھاؤ اس کم عمری میں ہی نہایت نفیس اور دلکش تھے۔عام بچوں کے برعکس وہ بہت جلد اسکول کے ماحول میں رچ بس گیا۔دیگر ہم عمروں کی طرح اس کا یہ شوق وقتی نہیں تھا بلکہ وہ مکمل خلوص اور ذمے داری سے یہ مرحلہ نبھا رہا تھا۔اسی دوران ڈاکٹر آفتاب اور ساجدہ کے گلشن میں دو پھولوں کے بعد ایک ننھی کلی کا اضافہ ہو گیا۔سرخ وسفید رنگت' تیکھے نقوش اور موٹی آنکھوں والی وہ بچی بڑی ہی من موہنی تھی۔شہزادیوں کی سی آن بان رکھنے والی اس ننھی کلی کا نام 'لویل' رکھا گیا۔ساجدہ کی مصروفیات میں یکدم ہی کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔دانش اور آکاش نے چھوٹی بہن کی پیدائش پر بڑی بردباری اور متانت کا مظاہرہ کیا۔اس ننھی پری میں ان کی جان بستی تھی۔ساجدہ اس صورتِ حال پر بہت مطمئن تھیں۔

اس سکون واطمینان میں خلش کا پہلا کانٹا اس وقت بے چین کرنے لگا جب انہیں آکاش کی پڑھائی میں پہلے جیسی روانی محسوس نہ ہوئی۔وہ یکدم ہی کورا کاغذ بن کر رہ گیا تھا۔ساجدہ نے حسبِ سابق یہ سارا معاملہ شوہر کے گوش گذار دیا۔

''حیرت انگیز! ہمارا کاشی تو بہت ذہین اور 'فاسٹ لرنر' ہے۔'' ڈاکٹر آفتاب حیران تھے۔

''یہی بات تو مجھے بھی سمجھ نہیں آ رہی۔دانی بھی اب اس

لے ساتھ نہیں جاتا ورنہ اسی سے کوئی کلیول گیا ہوتا۔ وہ شروع سے ہی مجھے کاشی کے متعلق ہر ایک بات سے 'اپ ڈیٹ' رکھتا ہے۔'' ساجدہ مضطرب تھیں۔

''خیر! اس معاملہ کی کھوج تو لگانی ہی پڑے گی۔ دیکھ لیتے ہیں اگر کوئی ٹھوس وجہ سامنے نہ آئی تو کسی سائیکاٹرسٹ سے رجوع کرلیں گے۔'' ڈاکٹر آفتاب نے اہلیہ کو تسلی دی۔ کسی خصوصی اہتمام کی بہرحال ضرورت ہی نہ پڑی۔ آکاش کو درپیش مسئلہ بہت جلد سامنے آگیا۔

اصل میں ہوا یہ تھا کہ وہ اسکول میں اپنی صحت' شخصیت' رکھ رکھاؤ اور انداز گفتگو کی وجہ سے بہت مقبول ہو چکا تھا۔ وہ کمرائے جماعت میں بہت کم وقت گذارتا۔ کبھی کھیل کے میدان میں چلا جاتا تو کبھی فری پیریڈز کے دوران ٹیچرز اسے اسٹاف روم میں بلوا لیتیں۔ اس کا دلکش انداز گفتگو اور برجستہ جوابات خواتین اساتذہ کو بہت محظوظ کرتے۔ وہ اپنا مقام ومنصب فراموش کیے آکاش کے ساتھ کھیل کود میں مصروف ہو جاتیں۔ اساتذہ کی جانب سے اس پیشہ وارانہ خیانت' انتظامیہ کی غیر ذمے دارانہ روش اور انتظامی معاملات میں سقم نے ان دونوں کو ہی طیش میں مبتلا کردیا۔ وہ اگلے ہی روز پرنسپل کے پاس جا پہنچے اور اسے سخت سست سنائیں۔

''ہم دلی طور پر معذرت خواہ ہیں۔ آپ کو آئندہ شکایت کا کبھی موقع نہیں ملے گا۔'' پرنسپل نے ندامت سے کہا۔

''معذرت کے الفاظ ادا کردینا آپ کے لیے کس قدر آسان ہے ویسے۔ اتنی بڑی انتظامی غفلت کو محض معذرت کے پردے سے نہیں ڈھانپا جاسکتا۔'' ساجدہ برہم ہوئیں۔

''آپ کی بات بالکل بجا ہے میم! ہم ذمے داروں کے خلاف سخت ایکشن لیں گے۔'' پرنسپل نے یقین دہانی کروائی۔

''وہ آپ کا دردسر ہے۔ آپ خود ہی کھوج لگائیں کہ مزید کتنے بچوں کی بنیادیں کھودی جارہی ہیں۔ ہم بہرحال آکاش کو یہاں نہیں پڑھائیں گے۔'' ڈاکٹر آفتاب نے دوٹوک انداز میں کہا۔ پرنسپل کی پیشانی ندامت سے عرق آلود تھی۔

آکاش کو دوسرے اسکول میں منتقل کردیا گیا۔ ماحول کی تبدیلی اور پیشہ وارانہ کاملیت ملتے ہی اس کی زنگ آلود ہوتی صلاحیتیں ناقابل یقین رفتار سے نکھرتی چلی گئیں۔ وہ اسکول کی نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں کا لازم جزو بن گیا۔ اس بار والدین نے بھی خصوصی توجہ دینے کا عزم کیا ہوا تھا۔

ساجدہ تو خیر منحنی لویل کی نگہداشت میں بے طرح مصروف تھیں لہٰذا یہ ذمے داری ڈاکٹر آفتاب نے اٹھالی۔ وہ اپنی پیشہ وارانہ مصروفیات سے فارغ ہوتے ہی دونوں بیٹوں کو خود پڑھانے بیٹھ جاتے۔ اس کا نتیجہ بھی خاطر خواہ برآمد ہوا۔ اسکول کے روزمرہ ٹیسٹ کے علاوہ ہر سہ ماہی امتحان میں بھی آکاش کی نمایاں پوزیشن ہوتی۔ وہ ذہانت اور شرارتوں کا ایک مکمل 'پیکج' بن چکا تھا۔ ہر امتحان میں پہلی تین پوزیشنز میں کسی ایک پر قابض ہونے والا کاشی اپنی شرارتوں سے بھی والدین کے ناک میں دم کیے رکھتا۔ بازار جاتا تو ہاتھ چھڑوا کر ہجوم میں ادھر اُدھر غائب ہوتا اور جب والدین سراسیمگی کی انتہا پر پہنچ جاتے تو جانے کس کونے کھدرے سے نکل کر دوبارہ ان کا ہاتھ تھامتا اور 'بیبے' بچوں کی طرح ایسے متانت سے چلنے لگتا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

شرارتوں کا یہ سلسلہ ہر گذرتے دن کے ساتھ بڑھتا ہی جارہا تھا۔ آکاش کی عمر اب آٹھ سال ہو چکی تھی۔ انہی دنوں ڈاکٹر آفتاب کو سعودی عرب میں ملازمت مل گئی۔ فیملی ویزا لگوانے میں ابھی کچھ ماہ کا عرصہ درکار تھا۔ اب 1998ء کے اس دور میں موبائل فون کی بھرمار تو کیا ہونی تھی؟ پی ٹی سی ایل فون کا استعمال بھی خاصا مہنگا ثابت ہوا کرتا تھا۔ اس وقت خطوط کے ذریعہ نصف ملاقات کرنا نہایت دلکش اور خوشگوار مرحلہ ہوتا۔ کورے کاغذ پر الفاظ کے سہارے حالِ دل بیان کرکے اسے ڈاک کے سپرد کرنا اور پھر خط کے جواب میں انتظار کی میٹھی میٹھی سی لذت کا کوئی مول ہی نہ تھا۔ دانش اور آکاش بھی اس دلفریب تجربہ سے گذرنے لگے۔ وہ اپنے والد کو دن بھر کی روداد لکھنے کی اس نئی مصروفیت سے بہت خوش تھے۔ ساجدہ اور تینوں بچوں کی روانگی ذی الحجہ کے مہینے میں مارچ 1999ء کو ممکن ہوسکی۔ اس وقت تک آکاش کی تیسری جماعت کا سالانہ نتیجہ بھی آچکا تھا جو حسبِ سابق بہت شاندار تھا۔ جہاز کا سفر ایک اور انوکھا تجربہ تھا۔ آکاش کے ذہانت بھرے سوال ساجدہ کو مسکرانے پر مجبور کررہے تھے۔ اس سفر کے دوران انہیں اندازہ ہوا کہ آکاش کی قوت مشاہدہ بہت غیر معمولی ہے۔ وہ کسی بھی چیز کو مکمل گہرائی میں جانچتا اور محسوس کرتا ہے۔ سعودی عرب پہنچ کر والدسے ملنے کی خوشی کا بھی کوئی عالم نہ تھا۔ وہ تینوں گویا ایک ہی سانس میں والد کو اپنے دل میں موجود سبھی باتیں کہہ دینا چاہتے تھے۔ ڈاکٹر آفتاب ان کے سوالات اور روداد کا حتی الامکان ردِعمل دیتے ہوئے گھر لے آئے۔ ان کی نئی رہائش گاہ ایک خوبصورت سی

کالونی میں واقع تھی۔ مکانات کی تعمیر تقریباً یکساں تھی۔ اس کے علاوہ بچوں کے لیے جھولوں سے آراستہ کھیل کا میدان بھی موجود تھا۔ بچے بہت خوشی خوشی یہاں رہنے لگے۔ ایک ہفتہ خریداری اور گھر میں سامان ونظام ترتیب دینے میں بیت گیا۔ اب بارگاہِ الٰہی میں حاضری کا وقت آ گیا تھا۔ احرام باندھتے ہوئے ساجدہ کی آنکھیں بار بار خوشی سے نم ہو رہی تھیں۔ دانش اور آکاش کا روپ ہی نرالا تھا۔ احرام کا سفید لباس بالخصوص آکاش کو بہت الوہی روپ دیئے ہوئے تھا۔ اس منفرد تجربہ کے موقع پر آکاش کی زبان بھلا کہاں رکنے والی تھی۔ اس کے سوالات کا 'ٹیپ ریکارڈر' بجنا شروع ہو گیا۔

''احرام کیوں باندھتے ہیں ابو جی؟''

''آپ ایسا سمجھ لیں کہ اس دنیا میں سب سے مقدس جگہ پر جانے کے لیے یہ ایک اسپیشل یونیفارم ہے۔''

''اگر یہ کھل گیا تو؟'' اس نے پہلے سوال کے جواب سے مطمئن ہو کر اگلا نکتہ اٹھایا۔

''نہیں کھلے گا میرے چاند! یہ کبھی بھی نہیں کھلے گا۔'' ساجدہ نے یقین دلایا۔

''یہ ہمارے عام کپڑوں جیسا کیوں نہیں ہے؟''

''کیونکہ ہم کسی عام جگہ نہیں جا رہے ہیں۔ ہم اس کائنات کے شہنشاہ کے در پر حاضر ہونے والے ہیں اس لیے کپڑے عام کیسے ہو سکتے ہیں بھلا؟'' اس جواب سے آکاش کافی حد تک مطمئن ہو گیا۔ اب اس کا دھیان ایک بار پھر شرارتوں کی جانب مبذول ہو گیا۔ انہیں بذریعہ سڑک مکہ مکرمہ پہنچنا تھا۔ انہوں نے رستے بھر میں کھیل کود سے کبھی کو محظوظ کیے رکھا۔ اپنے بیگانے سبھی اس بچے کی پُرکشش آنکھوں اور ہنستی مسکراتی شخصیت سے متاثر ہو جاتے۔

خانہ کعبہ کی زیارت تینوں بچوں کے ساتھ والدین کے لیے بھی ایک منفرد تجربہ تھا۔ انہیں حج اکبر کی سعادت نصیب ہوئی تھی۔ دیارِ خدا کی عظمت و ہیبت ان کی آنکھوں میں نمی ختم ہی نہ ہونے دے رہی تھی۔ ڈاکٹر آفتاب نے لوہل کو اپنے کندھوں پر اٹھا رکھا تھا۔ دانش اور آکاش البتہ پیدل ہی اس سفر میں ہمنوا تھے۔ ان کی شرارتوں کا سلسلہ بھی ہنوز رواں تھا۔ انہی شرارتوں میں مگن وہ کبھی پیچھے رہ جاتے تو کبھی والدین سے آگے نکل جاتے۔ اسی دوران آکاش کہیں غائب ہو گیا۔ ایک جم غفیر میں کسی ساڑھے آٹھ سالہ بچے کا نظروں سے اوجھل ہو جانے کا مطلب وہی لوگ بخوبی سمجھ سکتے ہیں جنہوں نے اس عظیم فریضہ کی ادائیگی سرانجام دے رکھی ہو۔ ڈاکٹر آفتاب اور ساجدہ کی بھی جان پر بن آئی تھی۔ پریشانی اور خوف نے گویا پل بھر میں ہی انہیں ادھ موا کر دیا تاہم آکاش تھوڑی دیر بعد خود ہی کسی کونے سے کھیلتا کودتا برآمد ہو گیا۔ ڈاکٹر آفتاب اسے دیکھ کر اپنا ضبط کھو بیٹھے اور بیٹے کو ڈانٹ ڈپٹ کی اچھی خاصی 'خوراک' دے ڈالی۔ اس طریقہ علاج کا اس پر خاطر خواہ اثر ہوا اور بقیہ سفر نہایت خفگی اور سنجیدگی سے کٹ گیا۔

اس فریضہ کی ادائیگی کے کچھ دن بعد تینوں بچے بالترتیب پنجم، چہارم اور اوّل جماعت میں ایک بین الاقوامی اسکول کا حصہ بن گئے۔ کچھ وقت مزید گذرا تو ساجدہ نے بھی اسی ادارے میں بحیثیت معلمہ شمولیت اختیار کر لی۔ وہ سبھی ایک ساتھ ہی اسکول جایا کرتے۔ مختلف اقوام کے بچوں پر مشتمل اس ادارے میں ہر سو ذہانت اور قابلیت کا دور دورہ تھا۔ ہر بچہ دوسرے سے بڑھ کر ہی تھا۔ ایسے ماحول میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوانا ہرگز آسان نہیں تھا لیکن آکاش نے یہ میدان بھی بہت جلد سر کر لیا۔ اس نے نہایت اعتماد اور لگن سے نصابی اور ہم نصابی سرگرمیوں میں حصہ لیا اور بہت قلیل عرصہ میں اساتذہ کے ساتھ ساتھ انتظامیہ کی آنکھوں کا تارا بھی بن گیا۔ بیٹے کو ملنے والی بے پایاں محبت اور تحسین دیکھ موجود ساجدہ کا خون سیروں کے حساب سے بڑھا دیتی۔ اسکول سے آنے کے بعد وہ کچھ دیر آرام کرتے اور پھر کالونی میں واقع پارک میں کھیلنے چلے جاتے۔ پڑوسی بچوں سے بھی اچھے مراسم استوار ہو گئے تھے۔ ان کی صورت میں آکاش کو بھی 'کرائم پارٹنرز' مل گئے تھے۔ وہ سب کا گینگ لیڈر بن کے انہیں نت نئی شرارتوں پر مائل کر لیتا۔ مختلف گھروں کی گھنٹی بجا کر بھاگ جانا اور اپنے اس 'جرم' کا کوئی سراغ نہ چھوڑنا ان کے لیے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ دروازہ کھول کر کسی کو موجود نہ پانے کی جھنجلاہٹ میں مبتلا فرد کی دید سے وہ ہنس ہنس کر بے حال ہو جاتے۔ ان تخریبی سرگرمیوں کے علاوہ تعمیری شوق بھی بالکل مساوی صورت میں رواں تھے۔ وہ اپنے والد کے ساتھ روزانہ چہل قدمی پر جایا کرتا 'شطرنج کھیلنا' پنجہ آزمائی کا کھیل کھیلتا۔ ڈاکٹر آفتاب دانستہ طور پر اسے جیت جانے کا موقع فراہم کرتے تو خوشی اور جوش سے اس کے بھرے بھرے گلابی رخسار مزید سرخ ہو کر چمکنے لگتے۔

سعودی عرب میں ان کا قیام زیادہ طویل ثابت نہ ہوا۔ وہ ڈیڑھ سال تک مختلف اقوام کے بچوں سے دوستانہ مراسم استوار کرنے اور باہمی سیکھنے سکھانے کے عمل سے گذرنے کے

بعد پاکستان لوٹ آئے۔ آکاش نے اپنے سبھی دوستوں پر شخصیت اور مثبت کردار کی گہری چھاپ چھوڑی تھی۔ دنیا کے مختلف خطوں سے تعلق رکھنے والے وہ بچے اس پاکستانی دوست کی روانگی پر بہت افسردہ تھے۔

☆☆☆

سعودی عرب سے واپسی کے بعد آکاش کو 'سینٹرل پبلک اسکول' کی جماعت ششم میں داخل کروادیا گیا۔ پاکستان آمد سے ان تینوں بہن بھائیوں کو ماحول میں رچنے بسنے میں کچھ وقت تو لگا تاہم انہوں نے یہ میدان بھی کسی طرح سر کر ہی لیا۔ سینٹرل پبلک اسکول میں داخلہ آکاش کی زندگی کا اہم ترین موڑ ثابت ہوا۔ اس ادارے کا ماحول نہایت منظم تھا۔ اسکول کے بعد شام کے اوقات میں بچوں کے لیے کوچنگ کلاسز کا بھی خصوصی بندوبست تھا تاکہ ان کی پڑھائی اور دہرائی میں کسی قسم کا کوئی خلل پیدا نہ ہو۔ اس ماحول میں آکاش جیسے فطری ذہین بچے کی صلاحیتیں کیسے نہ نکھر پاتیں۔ اس کی ذہانت و قابلیت کی چمک نظریں خیرہ کرنے لگی تھی۔ جماعت میں برتری کے بعد ہم نصابی سرگرمیوں میں مختلف ٹرافیاں اور شیلڈز گھر آنے لگیں۔ خاندان بھر میں اسی کی ذہانت کے چرچے تھے۔ اس کے ہم عمر بچے کھیل کود، شرارتوں اور مختلف مقامات پر گھومنے پھرنے کے رسیا تھے اور دوسری جانب آکاش تھا جو اس کم عمری میں شاعر مشرق علامہ اقبال کو ازبر کیے مختلف مواقع پر ان کے اشعار کے حوالے دینے لگا تھا۔ عزیز و اقارب رشک میں مبتلا ہو کر اپنے بچوں میں بھی ایسی ہی جملہ صفات پروان چڑھتی دیکھنے کے خواب دیکھا کرتے۔

عزیز و اقارب کی یہ حیرت اور رشک تو ایک طرف رہے، ساجدہ اور ڈاکٹر آفتاب بھی بیٹے کی یہ خوبیاں دیکھ کر خوشی اور بے یقینی کا شکار ہو جاتے۔ وہ پروردگار کے عطا کردہ اس انمول خزانے پر شکرانہ ادا کرتے نہ تھکتے۔ آکاش کی پڑھائی کا سلسلہ بہت ہمواری سے جاری تھا۔ فارغ اوقات میں دادا، دادی کے ساتھ وقت بسری کرنا اسے کافی مرغوب ہو چلا تھا۔ ایک سال کا عرصہ پلک جھپکنے میں گذر گیا۔ دانش کا داخلہ 'ایبٹ آباد اسکول اینڈ کالج' میں ہو چکا تھا، اس لیے کسی غیر تحریری آئین کے مطابق اب آکاش نے بھی جماعت ہفتم میں وہیں داخل ہونا تھا۔ مذکورہ اسکول میں داخلہ ہرگز آسان نہیں تھا اور آکاش ربانی کو آسانیاں پسند بھی کہاں تھیں۔ اس نے ششم جماعت کے سالانہ امتحانات سے قبل ہی داخلہ کی تیاری شروع کردی۔ آکاش کی یہ محنت رنگ لائی۔ ایبٹ آباد پبلک اسکول کے انٹری ٹیسٹ میں بیٹھنے والا آکاش آفتاب ربانی اس معتبر تعلیمی ادارے کا حصہ بنا تو ایک اور مشکل اس کا امتحان لینے کے لیے تیار کھڑی تھی۔ اس اسکول میں بچے بطور 'ڈے اسکالر' بھی تعلیم حاصل کرلیا کرتے تھے لیکن 2002 میں یہ اصول تبدیلی کی زد میں آگیا جس کے تحت ہر بچہ بورڈنگ میں ہی رہنے کا پابند تھا۔ ایبٹ آباد اسکول اینڈ کالج میں طلبہ کو قیام کے لیے ہاسٹل کی سہولت میسر تھی۔ اس ہاسٹل کو 'ہاؤس' کہا جاتا ہے۔ آکاش کو 'نشتر ہاؤس' کا حصہ بنایا گیا۔ ڈاکٹر آفتاب اور ساجدہ بیٹے کو چھوڑنے خود وہاں آئے تھے۔ شعبہ اردو سے منسلک سینئر پروفیسر سلیم اقبال اس معصوم صورت اور پُراعتماد بچے سے پہلی ہی نظر میں کافی متاثر ہو گئے تھے۔ وہ آکاش اور اس کے والدین کو کمرے تک لے آئے۔ اس مختصر کمرے میں سنگل بیڈ، میز، میز پوش اور الماری موجود تھیں۔ کمرے میں گہرے نیلے رنگ کا استعمال زیادہ تھا۔ سلیم اقبال انہیں چھوڑ کر باہر گئے تو ساجدہ کو اپنے دل پر منوں بوجھ محسوس ہونے لگا۔ انہیں سمجھ ہی نہیں آرہی تھی کہ بیٹے کو تنہا چھوڑ کر کس طرح واپس جائیں گی۔ آنسو ضبط کا بندھن توڑے کسی بھی لمحے پلکوں کی باڑ پھلانگنے کے لیے تیار تھے۔ ڈاکٹر آفتاب سے اہلیہ کی یہ حالت اور ذہنی کیفیت پوشیدہ نہیں تھی۔ وہ اپنی آنکھوں کے خفیف اشارے سے انہیں مسلسل ضبط کی تلقین کررہے تھے۔ ساجدہ نے ہر ممکن حوصلہ کا مظاہرہ کیا لیکن جب صبر کا پیمانہ لبریز ہوا تو آکاش کو بہانے سے کمرے سے باہر بھیجا اور بوجھل دل لیے گھر چلی آئیں۔

آکاش اپنے کمرے میں لوٹا تو والدین کو موجود نہ پا کر الجھ گیا، اس وقت تک اسے یہی اُمید تھی کہ اہلیانہ ممکنہ کام سے عمارت کے کسی دوسرے حصہ میں موجود ہوں گے۔ وہ دیوانہ وار انہیں تلاشنے کی کوشش کرتا رہا لیکن وہ وہاں ہوتے تو ملتے ناں۔ اپنی اس کوشش میں ناکامی کے بعد آکاش کو حلق میں آنسوؤں کا پھندا محسوس ہونے لگا۔ اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اسے علم ہو گیا تھا کہ والدین اسے ہاسٹل چھوڑ کر جا چکے ہیں۔ یک لخت اسے ایسا لگا کہ ٹانگیں بدن کا بوجھ سہارنے سے قاصر ہو جائیں گی۔ اسے اپنے سامنے ایک مسجد نظر آرہی تھی۔ آنکھوں میں امڈتے آنسوؤں درد کی سے رگڑ کر وہ مسجد میں جا کر بیٹھ گیا۔ اس لمحہ ضبط کے سبھی بندھن ٹوٹ گئے۔ آکاش آفتاب ربانی بری طرح رو رہا تھا۔ اسے اپنے والدین سے سخت گلہ تھا کہ انہوں نے بیٹے کو اتنا کمزور کیونکر سمجھ لیا کہ اس

سے ملے بغیر ہی واپس چلے گئے۔ اللہ کے در پر ڈھیروں آنسو بہا کر وہ اپنے آپ کو بہت پُرسکون محسوس کرنے لگا۔ اسے اپنے اعصاب کافی ہلکے پھلکے محسوس ہونے لگے تھے۔ اس مسجد میں بیٹھے آکاش نے ایک عہد کیا کہ اس ادارہ میں رہتے ہوئے وہ اپنے والدین کے لیے ایسا کوئی موقع نہیں آنے دے گا جس سے وہ دوبارہ اس قسم کی صورتِ حال کا شکار ہوں۔

گذرتے وقت میں آکاش نے اپنا یہ عہد بھی بھرپور انداز میں نبھایا۔ اس نے ناقابل یقین انداز میں حالات کا سامنا کیا۔ دانش چونکہ ڈے اسکالر تھا اس لیے روزانہ ہی دونوں کی ملاقات ہوجاتی۔ بڑے بھائی سے یہ نکرا دا فسردگی کا سبب بھی بن جایا کرتا تھا لیکن اس نے اپنے عہد کا بھرم برقرار رکھا۔ ساجدہ اپنے کاشی کے لیے کھانے کی کوئی نہ کوئی چیز دانش کے توسط بھجوا دیا کرتیں۔ آکاش اس کھانے میں والدہ کی خوشبو اور محبت محسوس کر کے سرشار ہوجاتا۔ وہ گھر سے آئی ہوئی ہر چیز دوستوں کے ساتھ مل بانٹ کر کھانے کا عادی تھا۔ غالباً اس طرح وہ انہیں بھی 'ہوم سک نیس' سے بچاؤ کی اپنی سی کوشش کیا کرتا تھا۔ نشتر ہاؤس میں آکاش آفتاب ربانی ایک مثال بنتا جارہا تھا۔ اکثر طلبہ کو ٹائی' شرٹ' بالوں' جوتوں اور ناخنوں کی تراش خراش کے حوالے سے کسی نہ کسی مسئلہ کا سامنا رہتا تھا۔ آکاش کے معاملہ میں کبھی کسی کو شکایت کا موقع نہ ملا۔ وہ اپنا کام نہایت سلیقہ سے کیا کرتا تھا۔ والدہ کے نام روزانہ ایک خط لکھ کر اسکول میں دانش کو دینا بھی ایک معمول بن چکا تھا۔

وقت تھوڑا اور آگے سرکا تو آکاش کی شرارتوں کا سلسلہ بھی دوبارہ شروع ہوگیا۔ ان شرارتوں میں 'تخلیق' کا عنصر پہلے سے زیادہ ہوگیا تھا۔ ایک بار اس کے دوست کو بھوک نے بہت ستایا۔ پیٹ میں دوڑنے والے چوہے کرکٹ' ہاکی' فٹ بال اور کبڈی سمیت جانے کتنے کھیلوں کا 'ورلڈ کپ' کھیل چکے تھے۔ برداشت کا پیمانہ لبریز ہوا تو آکاش تھوڑی دیر کے لیے کہیں غائب ہوگیا۔ واپس آتے ہی وہ دوست کو لیے کیفے ٹیریا چلا گیا۔ اس کی آنکھوں میں شرارت اور چہرے پر بے پناہ چمک تھی۔

''جو دل چاہے آرڈر کرو۔ آج کی یہ دعوت میری طرف سے ہے۔'' آکاش نے شاہانہ انداز سے کہا۔

''پیسے کہاں سے آئیں گے یار؟ تیرے پاس کچھ ہے اور نہ ہی میرے پاس۔'' دوست نے آئینہ دکھایا۔

''فکر کیوں کرتے ہو؟ کہہ رہا ہوں ناں جو دل چاہے آرڈر کردے۔ بھروسا رکھ مجھ پر۔'' آکاش کی بے نیازی عروج پر تھی۔ دوست نے کندھے اچکائے اور پسندیدہ چیزوں کا ایک انبار اپنے سامنے جمع کروالیا۔ دونوں نے خوب ڈٹ کر کھایا۔ آکاش نے بل چکایا تو وہ ایک بار پھر پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

''اب تو بتادے کہ یہ پیسے کہاں سے آئے ہیں؟'' اس کے استفسار پر آکاش کی ہنسی قابلِ دید تھی۔

''بس یہ نہ پوچھو باقی خیر ہے..... ویسے یہ بھی بتادوں یہ پیسے ہمارے تھے، ہم انسانوں کے اور بالکل صحیح جگہ خرچ ہوئے ہیں۔'' کہہ کر وہ بات ٹال گیا۔

پڑھائی اور شرارتوں کے علاوہ آکاش کی دلچسپی کرکٹ' فٹ بال اور باسکٹ بال میں کافی بڑھ گئی تھی۔ ہاسٹل کے پہلے ہی سال اسے فٹ بال ٹیم میں شمولیت کا شوق چرانے لگا۔ وہ اپنی عمر اور جماعت دونوں اعتبار سے ہی ٹیم میں کھیلنے کے لیے ناموزوں تھا۔ اسکول کی فٹبال ٹیم گیارہویں اور بارہویں جماعت کے لڑکوں پر مشتمل ہوتی تھی۔ آکاش کا اصرار کم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ کپتان نے اس کے سامنے ایک شرط رکھ دی کہ وہ ان کے ہاؤس کے سامنے موجود جھاڑی کو پھلانگنے میں کامیاب ہوگیا تو اسے ٹیم میں شمولیت کا پروانہ تھما دیا جائے گا۔ آکاش نے کپتان کا یہ چیلنج قبول کرلیا اور پانچ فٹ اونچی اس جھاڑی کو پھلانگنے کے درپے ہوگیا۔ نصف درجن کے قریب کوششوں میں ناکامی کے بعد وہ جھاڑی تو نہ پھلانگ سکا تاہم اس کا عزم و ہمت دیگر طلبہ کے لیے ایک واضح مثال بنتا جارہا تھا۔

☆☆☆

ایبٹ آباد پبلک اسکول اینڈ کالج میں آکاش آفتاب ربانی کا سفر جماعت نہم تک آپہنچا۔

اس نے اپنے بڑے بھائی کی طرح سائنسی مضامین کا ہی انتخاب کیا تھا۔ کرکٹ' فٹ بال سے شغف بھی پڑھائی کے ساتھ ہی جاری تھا۔ نہم جماعت میں آنے والے اکثر بچوں کی طرح وہ کسی بھی نفسیاتی تناؤ کا شکار نہیں ہوا تھا۔ عام طور پر یہی دیکھنے میں آتا ہے کہ نہم میں آتے ہی پڑھائی اور بہترین گریڈز کے حصول کے لیے انتخابہ اور اساتذہ کی جانب سے طلبا شدید دباؤ میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ اچھے خاصے ذہین طلبا بھی اپنی صلاحیتوں کے متعلق شبہات میں پڑ جاتے ہیں۔ آکاش کے ساتھ ایسا کوئی مسئلہ نہ تھا۔ اس کی خود اعتمادی ہی

ان کا اصل ہتھیار تھی۔اس نے کھیل کود گھر ملاقات کی صورت میں ہم عمر کزنز سے میل ملاپ اور پڑھائی میں نظم وضبط اور ایک باقاعدہ نظام الاوقات کے تحت بہترین توازن قائم کر رکھا تھا۔توازن کی یہ خوب صورتی درحقیقت اس نے اپنے والد ڈاکٹر آفتاب سے سیکھ رکھی تھی۔ان کی ذہنی تربیت اور شخصیت سازی میں والد ہی کی ہمہ گیر اور متوازن شخصیت نے بہت اہم کردار ادا کیا تھا۔آکاش کی یہ محنت اور لگن رنگ لائی۔ نہم میں آکاش نے بہت اچھے نمبر حاصل کیے لیکن اس کے باوجود وہ اپنے نتیجے سے خوش نہیں تھا۔اسے علم تھا کہ قدرت نے اسے اس سے کہیں زیادہ قابلیت عطا کر رکھی ہے لہٰذا اس نے دہم میں مزید اچھے نمبر حاصل کرنے کے لیے کمر کس لی۔ وہ پڑھائی کو پہلے سے کہیں زیادہ وقت دینے لگا۔نیند کا دورانیہ بہت کم رہ گیا تھا جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ وہ کمرائے جماعت میں ہی سو جاتا۔اساتذہ کی جانب سے اس نئے معمول پر کئی بار ڈانٹ بھی پڑی لیکن اس کے باوجود وہ انتظامیہ اور اساتذہ کی گڈ بکس میں ہی تھا۔ہر قسم کے نصابی سوال کا مدلل اور منطقی جواب دیا کرتا تھا۔اسی محنت اور لگن میں دہم کے امتحان سر پر آپہنچے۔آکاش نے شب و روز محنت کی اور بالآخر 1100 میں سے 920 نمبر حاصل کر کے ایبٹ آباد پبلک اسکول میں تیسری پوزیشن حاصل کی۔

''آئی ایم پراؤڈ آف یو مائی سن! کمال کر دیا تم نے۔'' ساجدہ نے خوشی سے معمور لہجے میں بیٹے کو مبارک باد دی۔

''کیا خاک کمال کیا امی جی؟'' آکاش نے منہ بنایا۔

''تم خوش نہیں ہو کیا؟'' وہ حیران ہوئیں۔

''اتنا نہیں جتنا ہونا چاہیے تھا۔اس وقت تو مجھے ایک ہی بات کھائے جا رہی ہے کہ تھوڑی محنت اور کر لیتا تو فرسٹ بھی آسکتا تھا۔کاش کر ہی لیتا مزید محنت۔''

''اچھا! اب یہ تو بتاؤ کہ فیوچر کے لیے تمہارے کیا ارادے ہیں؟ تمہارے ابو چاہتے ہیں کہ تم بھی ان کی اور دانی کی طرح میڈیکل پڑھو۔لویل کے لیے بھی ان کی یہی خواہش ہے اور خود لویل کا ارادہ بھی میڈیکل کا ہی ہے۔''

''امی جی! کیا میڈیکل ہی ترقی اور کامیابی کی اصل ضمانت ہے؟ کچھ کام انسان اپنی خوشی اور سکون کے لیے بھی تو کرتا ہے۔'' وہ خلاف مزاج سنجیدگی سے بولا۔

''تم خوشی اور کامیابی کے سمجھتے ہو میرے چاند؟'' ساجدہ نے بڑی شفقت سے دریافت کیا۔

''بتاؤں گا۔وقت آنے پر وہ بھی بتاؤں گا۔ابھی ایف ایس سی پر فوکس کرنا چاہتا ہوں۔'' اس نے مبہم سے انداز میں کہا۔وہ اپنے مستقبل کے عزائم یا کوئی بھی منصوبہ بندی قبل از وقت ظاہر نہیں کرتا تھا۔

''ٹھیک ہے۔میں انتظار کروں گی۔اس دفعہ مزید محنت کر کے اپنی ٹاپ کرنے کی خواہش بھی پوری کر لینا۔'' انہوں نے محبت سے بیٹے کے بال سہلائے تو آکاش بھی مسکرا کر خاموش ہو گیا۔اس کی آنکھیں کسی گہری سوچ میں گم دکھائی دے رہی تھیں۔

فرسٹ ایئر تک آتے ہوئے آکاش کی زندگی میں کافی تبدیلی آچکی تھی۔ملک گیر تباہی مچانے والے زلزلے نے ایبٹ آباد اسکول اینڈ کالج، ہاسٹل کی عمارت کو بھی کافی نقصان پہنچایا تھا۔سوئے اتفاق ان دنوں طلبہ چھٹیاں گذارنے کے لیے اپنے آبائی علاقوں اور گھروں میں تھے لہٰذا جانی نقصان تو نہ ہوا البتہ انتظامیہ نے مقامی طلبہ کی ڈے اسکالر حیثیت ختم کر کے انہیں اپنے والدین کے ساتھ رہنے کی اجازت دے دی۔آکاش بھی دانش کی طرح گھر رہنے لگا۔اس کی داخلی کیفیات بھی ایک انوکھی تبدیلی کی زد میں تھیں۔بچپن سے دیکھا جانے والا ایک خواب بانہیں کھولے اسے اپنے پاس طلب کرتا تھا۔اس کی پکار میں ایسی شدت آچکی تھی کہ آکاش کے لیے مزاحمت بالکل ممکن ہی نہ رہی تھی اور حقیقت تو یہ تھی کہ وہ مزاحمت کرنا ہی نہیں چاہتا تھا۔

اسی دوران ایف ایس بھی اپنے اختتام کو پہنچ گئی۔انہی دنوں عید کے موقع پر اس کے سبھی کزنز ملاقات کے لیے ایبٹ آباد اکٹھے ہو گئے۔عید کی خوشیاں دوبالا کرنے کے بعد جب انہوں نے واپسی کا ارادہ کیا تو آکاش نے بھی اپنی خالہ کے ساتھ پشاور جانے کا منصوبہ بنالیا۔اس اچانک فیصلہ پر ڈاکٹر آفتاب حیران رہ گئے۔

''یہ اپنے کاشی کو کیا ہو گیا ہے بھئی؟ اپنی خالہ کے ساتھ پشاور جانے پر اتنا مصر کیوں ہے؟ تم سے کوئی ذکر تو کیا ہی ہو گا اس نے۔'' انہوں نے ماں بیٹے کی بے مثال ذہنی ہم آہنگی کے پیش نظر ساجدہ سے دریافت کیا۔

''نہیں! مجھے تو خود اس بارے میں کوئی علم نہیں ہے۔'' وہ بھی حیران تھیں۔آکاش نے اس طرح پشاور جانے کا اعلان کر کے انہیں پریشان کر دیا تھا۔ایسا خلاف توقع اور خلاف مزاج فیصلہ والدین کو ادھیڑ بن میں ہی مبتلا کر سکتا تھا۔

''مجھے جانے ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ اس کے دل میں ضرور کوئی بات پوشیدہ ہے۔کوئی ایسی بات جس سے ہمارا

واقف ہونا بھی ضروری ہے۔'' ڈاکٹر آفتاب نے زور دیا۔

''میں اس سے ایک بار بات کروں گی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ کچھ نہ کچھ ضرور بتادے گا۔'' ساجدہ پُراعتماد تھیں۔ انہوں نے بیٹے پر کافی زور دیا تو انکشاف ہوا کی وہ پاک فوج کا حصہ بننے کے لیے مکمل ذہن سازی کرچکا ہے۔ بچپن میں ایبٹ آباد کے فوجی تربیتی اداروں کے متعلق حسرت و جوش کا اظہار کرنے والے آکاش کے دل میں فوجی بننے کی حسرت بے حد مضبوط ہوچکی تھی۔ آرمی ٹیسٹ کے لیے پشاور سینٹر منتخب کرنے کی وجہ سے ہی وہ خالہ کے ساتھ اس شہر میں جانا چاہتا تھا۔ ڈاکٹر آفتاب اس نئی صورت حال پر حیران تھے۔

''مجھے تو ایسا لگتا تھا کہ میرے سمجھانے پر وہ جس طرح خاموش ہوگیا تھا اس کے بعد میڈیکل میں ہی داخلہ لے گا۔'' ڈاکٹر آفتاب نے ماضی قریب میں چند ایک بار ہونے والے بحث و مباحثہ کا حوالہ دیا۔

''لگتا تو مجھے بھی ایسا ہی تھا لیکن اب میں یہ سوچنے پر مجبور ہوگئی ہوں کہ کاشی ہمارے احترام میں خاموش ضرور ہوا تھا۔ قائل ہرگز نہیں ہوا تھا۔'' ساجدہ نے تجزیہ کیا۔ ڈاکٹر آفتاب نے مزید کسی بحث میں پڑنے کی بجائے بیٹے کو اپنے پاس طلب کرلیا۔

''تو برخوردار نے یہ فیصلہ کرہی لیا ہے کہ آپ میڈیکل نہیں کریں گے۔''

''نہیں ابو جی! مجھے آرمی کا ہی حصہ بننا ہے۔ یہی میرا خواب' تمنا اور جنون ہے۔'' اس نے نہایت ادب سے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے! تم اپنی زندگی کے بارے میں کوئی بھی فیصلہ کرنے کے لیے آزاد ہو۔'' انہوں نے متانت سے جواب دیا۔ ''لیکن اگر ایسا کوئی ارادہ کر رکھا تھا تو یہ لاابالی پن کا مظاہرہ کیوں؟ آرمی ٹیسٹ کوئی بچوں کا کھیل ہے کیا؟ تم نے کوئی تیاری نہیں کر رکھی۔ یوں کھیل کود' ہنسی مذاق کرتے ہوئے ٹیسٹ دیا جاتا ہے کیا؟''

''مجھے اپنی کامیابی کا پورا یقین ہے ابو جی!'' وہ اعتماد سے بولا۔

''یہ آرمی کا معاملہ ہے کاشی بیٹا! آرمی کا حصہ بننا اتنا ہی آسان ہے کیا کہ بس ارادہ کیا اور بغیر کسی تیاری کے چل پڑے۔ تم اس بار کی بجائے اگلے سال بہترین تیاری کے ساتھ میدان میں اترنا۔'' انہوں نے دوٹوک انداز میں کہا۔

''میں آپ کو یقین دلاتا ہوں ابو جی کہ میں ناکام نہیں لوٹوں گا۔ مجھے اسی سال یہ ٹیسٹ دینا ہے۔ میرے پاس وقت بہت کم ہے۔''

''جب میں نے کہہ دیا ہے کہ تم اگلے برس مکمل تیاری کے ساتھ میدان میں اترو گے تو بحث کی کوئی گنجائش ہی نہیں بچتی۔'' وہ بھی اپنی ضد پر قائم تھے۔ غالباً ایک سال کی مہلت لے کر اور آکاش کی تیاری نہ ہونے کا عذر بنا کر وہ اسے قائل کرنے کے لیے مزید مہلت حاصل کرنا چاہتے تھے۔ آکاش کی بھرپور مزمت سماجت بھی ان کا مؤقف تبدیل نہیں کرپا رہی تھی۔

''بھائی صاحب! آکاش کی بات مان لیجیے۔ بچہ ہی تو ہے۔ اسے ایک بار اپنی خواہش پوری کرلینے دیجیے۔'' اس کی خالہ اور ماموں سے بھانجے کی اتری ہوئی صورت اور اضطراب دیکھا نہ گیا۔

ڈاکٹر آفتاب نے طویل بحث و مباحثہ کے بعد اسے روانگی کی اجازت دی تو آکاش کی خوشی کا کوئی ٹھکانا ہی نہ تھا۔ اس نے فوری طور پر خالہ کے ساتھ روانگی کی تیاری شروع کردی۔ ٹیسٹ اگلے روز ہی تھا جس میں حصہ لینے کے بعد اس سے اگلے روز وہ گھر لوٹ آتا۔ آکاش آفتاب ربانی نے اپنی مکمل لگن' خلوص اور دیانت داری سے یہ مرحلہ سر کیا۔ ایبٹ آباد واپسی کے بعد رزلٹ کے انتظار کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ اس کا زیادہ تر وقت والدہ کے ساتھ اسکول اور بورڈنگ میں گذارے گئے لمحات' دوستوں اور اساتذہ کے متعلق یادگار واقعات سناتے ہوئے بیت جاتا۔ انتظار کی تڑپ اور نتائج جاننے کی خلش و اضطراب مزید ستانے لگے تو اس نے اپنے ذہن کو مصروف رکھنے کی ایک راہ ڈھونڈلی۔ آکاش کے میڈیکل کالج کے انٹری ٹیسٹ ہوتے ہی اسے کوہاٹ طلب کرلیا گیا۔ وہ لمحہ نہایت یادگار تھا۔ آکاش نے ایسی خوشی اور جوش پہلے کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ اس کی تیاری مکمل تھی۔ چھٹیوں کے دوران وہ روزانہ ہی ایبٹ آباد میں PT اسکول میں ورزش کرکے اپنی جسمانی چستی میں اضافہ کرچکا تھا۔ خود اعتمادی اور ہتھیاروں سے لیس وہ اگلا مرحلہ سر کرنے کے لیے تیار تھا۔

''امی جی! میرے لیے دعا کرتی رہیے گا۔ میرا یہ خواب پورا ہوجائے بس۔''

''اللہ پاک تمہیں اپنی حفظ و امان میں رکھے میرے بچے! اور تمہاری ہر جائز خواہش پوری فرمائے۔ ویسے کاشی! ایک بات بتاؤ گے مجھے؟ تمہارے والد اور بڑے بھائی کے

میڈیکل میں ہونے کے باوجود تم نے اس شعبہ میں قسمت کیوں نہیں آزمائی؟''

''میری پیاری امی! خدمتِ خلق کا ڈیپارٹمنٹ ابو اور آپ کی کے پاس رہنے دیجیے ناں۔ میں ملک کی خدمت اور حفاظت کرنا چاہتا ہوں۔ یہ وطن ہی تو ہماری شناخت اور سب کچھ ہے۔ پاکستان ایک شجر ہے جس کی حفاظت ہمیں کرنی ہے اور دعا ہے کہ پروردگار ہمیں یہ سعادت وتوفیق عطا فرمائے۔''

اس کے جذبہ نے ساجدہ کا دل مزید گداز کردیا۔ انہوں نے اسے دعاؤں اور محبت کی چھاؤں میں رخصت کردیا۔

کوہاٹ میں قسمت کی دیوی آکاش پر بہت مہربان نظر آئی اس کے سبھی 'ٹاسک' بہترین انداز میں مکمل ہوئے۔ اپنے دو انٹرویوز میں اس نے متعلقہ افراد کو خاصا متاثر کیا۔ آکاش کے لیے واحد اعتراض صرف زیادہ وزن کا تھا بصورت دیگر وہ اس کے تعلیمی نتائج' کارکردگی اور اب تک کے سبھی مراحل سے بہت مطمئن تھے۔ وزن کم کرنے کی ہدایت پر آکاش کافی سنجیدہ ہوگیا تھا۔ اس نے بھرپور لگن سے اپنی یہ 'کمی' ختم کرنے کا آغاز کردیا۔ اگلے 'بلاوے' پر افسران اسے دیکھ کر خوشگوار حیرت میں مبتلا تھے۔ اس کا وزن طے شدہ ہدف سے بھی زیادہ کم ہوچکا تھا۔ اب فوج میں تقرری کا پروانہ ملنے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ وہ آکاش کی زندگی کے حسین ترین لمحات تھے۔ فوج جیسے معتبر ادارے کا حصہ بن کر اس کی قلبی کیفیات پل بھر میں ہی تبدیل ہوگئی تھیں۔ وہ اپنے وجود میں ایک عجیب ہی سنجیدگی' متانت' ٹھہراؤ اور ذمے داری محسوس کرنے لگا۔ اب وہ ایک عام انسان نہیں رہا تھا۔ وہ 'کیڈٹ آکاش آفتاب ربانی' بن چکا تھا۔ ملک وقوم کا قیمتی سرمایہ اور وقت اس کی تربیت پر صرف ہونے والا تھا جس کے بعد کروڑوں عوام کی ذمے داری اس کے کندھوں پر بھی ہوتی۔ کروڑوں مائیں اپنے بچوں کی حفاظت سے بے فکر ہوتیں' باپ اپنے بیوی بچوں کو گھروں میں چھوڑ کر کام کاج پر جاتے کیونکہ انہیں یہ یقین ہونا تھا کہ آکاش اور اس جیسے لاکھوں جانبازان کی حفاظت کے لیے مامور ہیں۔ ان نئی کیفیات نے اس کی سوچ اور نظریہ میں ایک انوکھی پختگی پیدا کرنی شروع کردی اور یا الآخر الملخانہ کی دعاؤں کے سائے تلے اپنے چچا' والد' بھائی اور دادا جی کے ہمراہ بیس مئی 2009 کو 'کاکول' روانہ ہوگیا۔ ایک ایسی جگہ جہاں دنیا کی بہترین فوج تیار ہوتی ہے' جذبے جوان چڑھتے ہیں' جسم فولاد بنتے ہیں اور سرحدوں کی حفاظت کے لیے سیسہ پلائی ہوئی دیواریں تشکیل پاتی ہیں۔ جہاں زندگی کا دوسرا نام نظم وضبط ہے اور جہاں ذاتی غرض' نفسانفسی صرف اور صرف ملی حمیت میں ڈھل جاتی ہے۔

ملٹری اکیڈمی کے شب وروز عام شہری زندگی سے بالکل مختلف اور کٹھن ہے۔ یہاں ناز ونعم میں پروردہ' غریب' ذہین' صوبائی شناخت سے بالاتر ہوکر سبھی کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکا جاتا ہے اور ایک ذرا سی غلطی مزید مشقت کا پیش خیمہ بن جاتی ہیں۔ آکاش کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ کیڈٹس کے لیے Kick Off نامی ایک خصوصی مشق ہوتی ہے جس میں ان سبھی کیڈٹس کو صبح سے شام تک بیس کلو وزن اٹھا کر چلنا ہوتا ہے۔ اس وزن میں پندرہ کلو کا بیگ پیک اور بقیہ پانچ کلو کی رائفل ہوتی ہے۔ کیڈٹس اس وزن کو کسی لاڈلے بچے کی طرح اٹھائے ہر قسم کے نشیب وفراز پر مشتمل رستوں کی تسخیر کرتے ہیں۔ اس بیس کلو کے علاوہ ہر پلاٹون کے پاس گیارہ کلو وزنی 6 L M G بھی ہوتی ہے۔ ایک پلاٹون میں تقریباً اٹھائیس یا انتیس کیڈٹس ہوتے ہیں اور ہر کیڈٹ کے پاس یہ ایل ایم جی پانچ پانچ منٹ کے لیے منتقل ہوتی رہتی ہے۔ اس مشق کے دوران انہیں ایک گھنٹے بعد صرف پانچ منٹ کا وقفہ ملتا ہے۔ اس کے علاوہ نگراں افسران کی جانب سے خصوصی معائنہ کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے۔ کسی بھی کیڈٹ کے پاس سامان کی ذرا سی کمشدگی نئی سزا کا موجب بن جاتی ہے۔

آکاش کے بیگ پیک میں جانے کب اور کس طرح پلاٹون کے compass کی برآمدگی پر آکاش کو خوب لتاڑا اور دو ایل ایم جی اٹھا کر چلنے کی سزا دے دی۔ تینتالیس کلو وزن کے ساتھ سزا پوری کرنے والے آکاش آفتاب ربانی نے بڑی جوانمردی کا مظاہرہ کیا۔ وہ اپنی محنت اور لگن سے افسران کے دلوں میں سیندھ لگا رہا تھا۔ ایبٹ آباد پبلک اسکول اینڈ کالج میں فٹ بال ٹیم کے لیے کی گئی محنت کا پھل اکیڈمی میں ملنے لگا۔ فٹ بال ٹیم میں جگہ بنانے اور نمایاں کارنامے دکھانے پر طلائی تمغہ بھی ملا لیکن آکاش کے مزاج میں کسی ایک مقام پر ٹکے رہنا شامل ہی نہ تھا۔ فٹ بال کے میدان میں جھنڈے گاڑنے کے بعد اسے مکابازی کا شوق چرانے لگا۔ اس نے قلیل عرصہ میں ہی اس شعبہ میں بھی مہارت حاصل کرلی۔ آکاش کی یہ مہارت سیکنڈ ٹرم کے باکسنگ مقابلوں میں کام آئی۔ اس وقت مختلف پلاٹونز اور کمپنیوں کے کیڈٹس کے باہمی مقابلے ہوا کرتے ہیں۔ ٹرافی کے حصول کی اس جنگ میں فتح ہر کیڈٹ کی آنکھوں کا خواب ہوتی ہے۔ آکاش کے مقابلہ پر آنے والا کھلاڑی کافی پھرتیلا اور ماہر تھا۔ اس کی نسبت آکاش

اتنا پھرتیلا تو نہ تھا البتہ اسے حواس کی مضبوطی کا فائدہ ضرور حاصل تھا۔ آکاش کی جملہ خوبیوں میں ایک صفت یہ بھی تھی کہ اسے اپنے اعصاب پر مکمل ضبط حاصل تھا۔ وہ مشکل ترین حالات میں بھی کسی قسم کی گھبراہٹ یا الجھن میں مبتلا نہیں ہوتا تھا۔ اس نے خود سے زیادہ تجربہ کار کھلاڑی کو چاروں شانے چت کر دیا۔

اس مقابلہ کے بعد چھٹی پر گھر آ کر اس نے البخانہ کو اپنی ویڈیو دکھا کر حیرت زدہ کر دیا۔ وہ آکاش کو لگنے والی چوٹیں اور میچ کے دوران اس کے چہرے پر نظر آنے والا جنون دیکھ کر اپنی ہی نظروں پر یقین نہیں کر پا رہے تھے۔

''ٹھیک ہی کہتے تھے اپنے میجر سعید صاحب۔'' ڈاکٹر آفتاب نے گہری سانس لے کر گفتگو کی ابتداء کی۔

''کیا کہتے تھے ابو جی وہ؟'' آکاش متجسس ہوا۔ میجر صاحب کا نام سنتے ہی اس کا جوش بھی دیدنی تھا۔ وہ ڈاکٹر آفتاب کے بہت اچھے دوست تھے۔ میجر صاحب کی شخصیت' رکھ رکھاؤ' بذلہ سنجی' وقار' قوت ارادی اور نفیس اطوار آکاش کو شروع سے ہی بہت پسند رہے تھے۔ فوج میں جانے کی خواہش میں کہیں نہ کہیں میجر صاحب کی شخصیت کا انس بھی شامل تھا۔ وہ انہیں اپنا 'آئیڈیل' سمجھتا تھا۔

''کہتے تھے کیا بلکہ اب بھی یہی کہتے ہیں۔ پاکستان ملٹری اکیڈمی دنیا کی وہ واحد جگہ ہے جہاں جذبے پیدا ہوتے ہیں۔ آپ دنیا میں کہیں بھی فوجی تربیت کے ادارے دیکھ لیں۔ وہ ہتھیاروں کا استعمال' جنگی فنون اور سازشیں تو سکھا سکتے ہیں لیکن PMA کی طرح جذبے' محبت اور جنون کوئی نہیں سکھا سکتا۔''

''ان کی بات بالکل ٹھیک ہے ابو جی!'' آکاش نے تصدیق کی۔ ''ہماری فوج دنیا کی بہترین فوج اس لیے بھی ہے کہ والدین بھی اس جذبہ کو عبادت سمجھ کر پروان چڑھاتے ہیں۔''

''کچھ روز پہلے میجر صاحب سے بات چیت ہوئی تھی۔ تمہاری ٹریننگ کے متعلق ہر بات سے واقف رہتے ہیں وہ۔ کہہ رہے تھے آکاش کو میرا ایک پیغام دینا کہ ملٹری اکیڈمی میں ایسے وقت گذارے جو بعد میں آنے والے کیڈٹس کے لیے مثال بنا رہے۔ اپنی قوت ارادی اور محنت کے دائمی نقوش چھوڑ کر آنے ہیں وہاں اور 'اعزازی شمشیر' تو کسی بھی دوسرے کیڈٹ کے پاس جانی ہی نہیں چاہیے ناں۔'' انہوں نے بیٹے کو کہا۔

''انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا ابو جی! میری آنکھوں میں بھی انہی کے یہ خواب بسیرا کیے ہوئے ہیں۔'' آکاش نے ایک جذبہ کے عالم میں کہا۔ اسے اپنے وجود میں توانائی کا ایک نیا ذخیرہ محسوس ہو رہا تھا۔ اپنے انہی جذبوں اور توانائی کی بدولت اس کی قوت ارادی پہلے سے کئی گنا مضبوط ہو چکی تھی۔ اکیڈمی کی زندگی ہر گذرتے دن کے ساتھ سخت سے سخت تر ہوتی جا رہی تھی۔

سیکنڈ ٹرم میں درپیش 'مشق ریموک' میں بھی آکاش کی کارکردگی لاجواب تھی۔ عالمی فوجی تربیت کی کٹھن ترین مشقوں میں شمار ہونے والا یہ مرحلہ زیر تربیت افراد کو ناکوں چنے چبوا دیا کرتا ہے۔ کیڈٹس چار روز تک ڈیڑھ سو کلومیٹر کا فاصلہ پیدل طے کرتے ہیں۔ بھاری بھرکم سامان اور ایل ایم جی اٹھائے خار دار جھاڑیوں' کھائیوں' بلند پہاڑوں' گہرے گڑھوں' ندی نالوں سنگی گھاٹیوں سمیت ان گنت ناقابل عبور راستے تسخیر کرتے ہیں۔ مشق ریموک میں آکاش کے ایک ساتھی کی طبیعت خراب ہو گئی۔ عین ممکن تھا کہ وہ اس مشق سے دست بردار ہو کر اپنے جونیئرز کے ساتھ یہ مرحلہ طے کرتا لیکن آکاش نے اس کی ایک نہ چلنے دی۔ اس نے احسن کی بھرپور مدد اور حوصلہ کے ذریعہ اسے کامیابی کا سہرا سجا ہی دیا۔

آکاش کے متعلق ہر افسر کو یہی یقین تھا کہ وہ فوج کے کسی بھی 'آرم' میں نمایاں مقام حاصل کر لے گا۔ اس کی دیانت داری' لگن اور اکیڈمک ریکارڈ دیکھتے ہوئے ساتھی کیڈٹس کو یقین تھا کہ اس بار اعزازی شمشیر کا حقدار اور فاتح بھی وہی ہوگا لیکن آکاش کی ایک غلطی نے اس کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہونے دیا۔ ہوا یہ تھا کہ سینئرز کی جانب سے اسے گراؤنڈ کے دو چکر لگانے کا حکم ملا۔ اس موقع پر آکاش اپنی طبیعت و مزاج کی اس سستی کے زیر اثر آ گیا جو بسا اوقات اس پر بے سبب اور بے طرح غلبہ پا لیا کرتی تھی۔ اس سستی کی وجہ صرف اتنی سی تھی کہ وہ شروع سے ہی کاموں کی دہرائی سے جان چراتا تھا۔ اسے نئی چیزوں کی دریافت اپنی جانب مائل کیے رکھتی۔ آکاش نے گراؤنڈ کا صرف ایک چکر لگا کر رپورٹ کر دی کہ وہ دو چکروں کا حکم پورا کر آیا ہے۔ اس کی یہ 'سمجھداری' زیادہ دیر پوشیدہ نہ رہ سکی۔ پلاٹون کمانڈر نے حسب دستور اس پر integrity کا کیس بنا دیا۔ اس سزا کا 'دھبا' ہی اعزازی شمشیر کے حصول میں سب سے بڑی رکاوٹ ثابت ہوا۔

☆☆☆

آخری ٹرم کا آغاز ہو چکا تھا۔ اب وہ وقت زیادہ دور نہیں تھا کہ جب یہ تمام کیڈٹس پاسنگ آؤٹ پریڈ کے بعد عملی زندگی کا حصہ بن جاتے۔ اسی آخری ٹرم کے دوران کیڈٹس بی اے کے امتحانات دے کر گریجویشن کی ڈگری بھی حاصل کر لیتے۔ آکاش کی گریجویشن آرٹس میں تھی۔ کیڈٹس کو سائنسی مضامین سے آشنائی ہونے کے مرحلہ میں اسے میٹرک اور انٹر سائنس کا بہت فائدہ ہوتا رہا۔ مستقبل میں وہ انٹرنیشنل ریلیشنز میں ماسٹرز کرنے کا خواہشمند بھی تھا لیکن یہ سب باتیں فی الحال قبل از وقت تھیں۔ ابھی تو انہیں پاسنگ آؤٹ پریڈ میں حصہ لینا تھا۔ کیڈٹس کے لیے یہ مرحلہ ہمیشہ ہی متضاد کیفیات کا حامل ہوا کرتا ہے۔ ایک طرف تو وہ عملی زندگی میں شمولیت پر خوش ہوتے ہیں تو دوسری جانب اکیڈمی سے جدائی کا خیال دل افسردہ کر دیا کرتا ہے۔ بوقت رخصت وہ تشنہ نظروں سے ان در و دیوار، پیڑ پودوں اور طویل روشوں کو دیکھ کر ہر ایک اینٹ کالمس اپنی پوروں سے روح میں اتارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ آکاش کا بھی کچھ ایسا ہی حال تھا۔ اس سے قبل تقسیم اسناد کی تقریب کا اہتمام اپریل 2011 میں ہوا تھا۔ گریجویٹ ہونے والے طلبہ کو اسناد عطا کی گئیں۔ پاسنگ آؤٹ پریڈ چند روز بعد ہونا تھی۔ اس وقت آرمی چیف کی آمد سے کیڈٹس کا حوصلہ آسمان چھو رہا تھا۔ پریڈ کے بعد آکاش نے والدین کو اپنے دوستوں کے اہلخانہ سے متعارف کروایا۔ انہیں اپنے کمرے میں بھی لے کر گیا۔ اس تمام مرحلہ میں چہرے پر مسکراہٹ کے باوجود اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی اداسی جھلک رہی تھی۔ ساجدہ سے عزیز از جان بیٹے کی یہ کیفیت پوشیدہ رہ ہی نہیں سکتی تھی تاہم وہ یہی گمان کرتی رہیں کہ اکیڈمی سے دو سالہ محبت و رفاقت کے بعد آکاش افسردگی محسوس کر رہا ہے۔ واپسی کے سفر میں بھی وہ خلاف مزاج خاموشی سے گاڑی کے باہر بھاگتے دوڑتے مناظر دیکھتا رہا۔

گھر پہنچنے کے بعد عزیز و اقارب کی آمد اور مبارکباد کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔ وہ اسی افسردہ مسکراہٹ سے سب کے تہنیتی پیغام وصول کرتا رہا۔ رات گئے جب ملاقاتیوں کی آمد میں تعطل آیا تو ساجدہ بیٹے سے استفسار کیے بغیر نہ رہ سکیں۔

''تھک گیا ہوں امی جی! اور تو کوئی بات نہیں۔'' اس نے والدہ کو ٹالنا چاہا۔

''تینتالیس کلو وزن اٹھا کر چلنے والا' مشقِ ریموک میں اپنے ساتھ دوست کی بھی مشق مکمل کروانے والا' ہلکی پھلکی سحری کے بعد روزہ کی حالت میں جان توڑ مشقتیں کرنے والا میرا فوجی بیٹا گھر میں چند مہمانوں سے مل کر تھک گیا ہے۔ کیا تمہیں اپنی ماں اتنی ہی بے وقوف لگتی ہے کاشی کہ وہ اس بچگانہ عذر پر یقین کر لے گی۔'' ساجدہ کی یہ بات سن کر وہ ساکت رہ گیا اور پھر والدہ کے مزید اصرار پر بتانے لگا کہ اکیڈمی میں پاسنگ آؤٹ پریڈ سے قبل کیڈٹس کو سوالنامہ پر مشتمل ایک فارم دیا جاتا ہے جس میں وہ اپنی پسندیدہ 'یونٹ' کا اظہار کرتے ہیں۔ بعد ازاں ضابطہ کی کارروائی مکمل کر کے کیڈٹس کو مختلف یونٹس میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ آکاش کی اوّلین پسند 'آرمر' تھی۔ اسے قوی اُمید تھی کہ وہ فوج کی قابل ترین' جنگی مہارت عملی کرنے والی یونٹ کا ہی حصہ بنے گا لیکن اس کی آرزوؤں کا یہ شیش محل 'آرٹلری' میں شمولیت کا پروانہ لے کر زمین بوس ہو گیا۔ اب ایسا بھی ہرگز نہیں تھا کہ یہ کسی لحاظ سے کمتر تھا۔ اصل مسئلہ تو صرف سودائے جنوں کا تھا۔ آکاش کا اوّلین عشق آرمر یونٹ تھی اور وہی اسے ہجر کا زخم دے گئی تھی۔

''اللہ پاک کے ہر کام میں بہتری ہوتی ہے کاشی۔ اس تقرری میں بھی تمہارے لیے کوئی بھلائی ہی ہوگی۔'' ساجدہ نے اسے تسلی دی۔

''بے شک ہوگی لیکن بس میرا یہ دل.....'' وہ گہری سانس بھر کر خاموش ہو گیا۔ اس کی پہلی پوسٹنگ کھاریاں میں ہوئی تھی اور اس سے قبل وہ دس روز کے لیے ہی گھر آیا تھا۔ اپنے رویئے کے متعلق والدین کی تشویش محسوس کر کے اس نے اپنے ایک کزن کے ساتھ راولپنڈی اور مری گھومنے کا منصوبہ بنا لیا۔ اس کے پیش نظر صرف ایک ہی خیال تھا کہ اپنی افسردگی و آمادگی کی یہ جنگ وہ تنہا لڑے۔ راولپنڈی کی سیاحت کے دوران وہ میجر سعید سے بھی ملا جو اس کی 'آرٹلری' میں تعیناتی سے بہت خوش تھے۔ میجر سعید کا تعلق چونکہ خود بھی آرٹلری سے ہی رہا تھا اس لیے وہ نہایت جوش و جذبہ اور خلوص سے آکاش کی ذہنی گتھیاں سلجھانے لگے۔ وہ اس کی اکیڈمی میں کارکردگی سے بھی بہت خوش اور مطمئن تھے۔ اس ملاقات کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ آکاش میجر کی بذلہ سنجی' تجربہ [illegible] دانہ تجربات کے خلوص سے اپنے وجود میں توانائی اور مثبت تحریک محسوس کرنے لگا۔ افسردگی اور خاموشی کہیں رفع ہو چکی تھی۔ آکاش آفتاب ربانی نے مطمئن ہو کر یونٹ میں جانے کی تیاری شروع کر دی۔

☆☆☆

یہاں کے شب و روز بھی بہت مصروف تھے۔ آکاش

کے کمانڈنگ آفیسر کی تجربہ کار نگاہیں اس نئے لڑکے میں بہت قابلیت دیکھ رہی تھیں۔ انہوں نے اپنی انتظامیہ کو آکاش کے بارے میں مکمل چوکس رہتے ہوئے اس پر مزید محنت کرنے کا حکم جاری کردیا۔ نتیجتاً میجر عدنان اور لیفٹیننٹ عارف نے آکاش کو دن اور رات کا فرق ہی بھلا دیا۔ پیشہ وارانہ زندگی میں ملنے والی اس اہمیت اور تحریک سے آکاش بھی خلوص دل اور خوشی سے محنت کرتا رہا۔ اس خوشی اور پُرسکون معاملات میں پہلا جذباتی تلاطم دادا کی وفات کی خبر سن کر ہوا۔ غم وصدمہ کے باوجود وہ گھر آتے ہی والد اور دیگر اہلخانہ کو بڑے ضبط وتحمل سے دلاسہ دیتا رہا۔ وہ لمحات ایک فوجی کی تربیت اور حوصلہ کا کڑا امتحان تھے اور آکاش آفتاب ربانی نے کسی بھی امتحان میں ناکام ہونا سیکھا ہی کب تھا؟

دادا جی کی میت آبائی گاؤں لے جائی جانی تھی۔ آکاش نے دانش کے ساتھ مل کر سبھی انتظامات سنبھالے رکھے۔ دادا جی کی تدفین شایانِ شان طریقہ اور پُروقار انداز میں انجام کو پہنچی لیکن آکاش کی سنجیدگی' متانت اور تحمل میں بالکل فرق نہ آیا۔ روح کی گہرائیوں میں طوفان برپا تھا پر مجال ہے ایک آنسو نے بھی ضبط کی توہین کی ہو۔ وہ پاک فوج کا دلیر اور جانباز سپاہی تھا اور سپاہی ہر محاذ پر یونہی دلیری کا مظاہرہ کرتے ہیں تیسرے روز رسم قل سے فراغت پا کر اس نے بمشکل نصف گھنٹا آرام کیا اور کپڑے تبدیل کیے بغیر اہلخانہ سے دعائیں لے کر لوٹ گیا۔ آکاش کی یونٹ نے بھی اس کا حوصلہ بڑھانے اور غم غلط کرنے میں پُرخلوص ساتھ دیا۔ وطن کے وہ سبھی بہادر سپوت ایک خاندان کی طرح ایک دوسرے کا دل بہلایا کرتے تھے۔ وہ کلمہ کی ڈور سے بندھے' حب الوطنی کے جذبہ سے گندھے' ہم نی اعصاب کے مالک جوان ایک دوسرے کی طاقت تھے۔ وہ پاکستانی فوج کا حصہ تھے۔ اخوت ان کا ایمان اور ایثار ان کا خمیر تھا۔ وہ سبھی 'منتخب' افراد تھے اور ان کا ہر کام رضائے الٰہی کے لیے ہی ہوتا تھا اسی لیے تو ان کی ہر ایک کوشش میں الوہی برکت پیدا ہوجایا کرتی تھی۔ آکاش آفتاب ربانی نے بھی اس صدمہ پر بہت جلد غلبہ پالیا۔

☆☆☆

رمضان المبارک کا بابرکت مہینا اختتام پذیر ہوچکا تھا۔ افسران میں 'جونیئر ترین' عہدہ پر فائز ہونے کی وجہ سے آکاش کو عید کی چھٹیاں نہیں ملی تھیں۔ اس نے بڑی خوشدلی سے اس فیصلہ کا خیر مقدم کیا۔ وہ پہلی بار اہلخانہ سے دور کوئی تہوار منا رہا تھا۔ نماز عید سے فراغت پا کر گھر فون کیا تو مختصر بات ہی کی۔ اسے علم تھا کہ والدین اور بہن بھائی اس کی غیر موجودگی میں فطری طور پر ہی بہت اداس ہوں گے۔ عید کا پہلا روز لیفٹیننٹ عارف کے ہمراہ گپ شپ اور کھانے کی ضیافت میں بیت گیا۔ دوسرے دن آکاش تنہا ہی رہا۔ تیسرے دن ڈاکٹر آفتاب' ساجدہ' دانش اور لویل اس سے ملنے پہنچ گئے۔ آکاش کے قدم گویا ہواؤں میں تھے۔ اس نے بڑے سلیقہ اور نظم وضبط سے اہلخانہ کی خاطر مدارت کی' بہترین جگہ پر کھانا کھلایا اور دورانِ گفتگو انہیں اپنے چٹکلوں سے خوب محظوظ کرتا رہا۔ اس خوشگوار ماحول کے زیر اثر آکاش نے ساجدہ کو مخاطب کرتے ہوئے بے نیازی سے کہا۔

''مجھے لگتا ہے کہ اب ہمیں دانی کی شادی کردینی چاہیے۔'' اس کی تجویز پر کھانا کھاتے سبھی افراد کے ہاتھ ساکت رہ گئے۔

''اتنی جلدی کس بات کی ہے کاشی؟ ابھی اسے سیٹل تو ہونے دو۔'' ساجدہ حیرت کے ابتدائی جھٹکے سے سنبھل کر کہنے لگیں۔

''مجھے تو دال میں کچھ کالا لگ رہا ہے۔'' دانی نے شرارت سے اسے دیکھا۔ ''کہیں ایسا تو نہیں کہ اس نے اپنی شادی کروانی ہے اس لیے میرے کندھے پر بندوق رکھ کر چلا رہا ہے۔ اس کے لیے لڑکیاں دیکھنی شروع کردیں امی جی آپ!''

''میں نے تو اپنی دلہن ڈھونڈ لی ہے۔ آپ کو بالکل بھی زحمت نہ ہوگی۔'' آکاش کے اس انکشاف پر وہ سب ایک بار ساکت ہوگئے۔ ساجدہ کے چہرہ پر 'مجھے بھی لاعلم رکھا' کا بہت بڑا سوالیہ نشان درج تھا۔

''کون ہے وہ؟ فیملی سے ہے یا آؤٹ آف فیملی؟ نام تو بتایئے۔ تصویر ہے تو وہی دکھادیں۔'' لویل نے جھٹ پوچھا۔

''میری دلہن سے آپ سب بھی بہت اچھی طرح واقف ہیں۔ اس کا نام ہے 'شہادت'۔ میری صرف اتنی سی تمنا ہے کہ رضائے الٰہی کے تحت اپنی پاک سرزمین کی حفاظت کرتے ہوئے شہید کا رتبہ حاصل کرلوں۔''

آکاش کی اس بات پر ساجدہ یکدم جھرجھرا گئیں اور ان کی زبان سے بلا ارادہ بے ساختہ الفاظ برآمد ہوئے۔

''کیسی باتیں کررہے ہو کاشی؟''

ساجدہ کے اس ردِعمل نے سبھی افراد کو چونکا دیا۔

''میرا کہنے کا مطلب تھا کہ اتنی جلدی کس بات کی ہے

بھلا؟ ستر اسی سال کی عمر میں ہو جانا شہید۔ ابھی تو بہت عمر پڑی ہے۔'' وہ سنبھل کر بولیں۔ آکاش نے کوئی جواب نہ دیا۔

ڈاکٹر آفتاب نے موضوع گفتگو تبدیل کر دیا۔ ماحول بظاہر تبدیل ہو گیا لیکن آکاش کے چہرے پر بے یقینی اور اداسی واضح طور پر جھلک رہی تھی۔ ساجدہ کا دل کٹ کر رہ گیا۔ انہیں علم تھا کہ ان کا کاشی اس رویے سے بہت مایوس ہوا ہے لیکن وہ بھی کیا کرتیں؟ ایک ماں کی جبلی فکر' محبت اور تشویش سے فرار ان کے لیے بھی کہاں ممکن تھا؟ کھاریاں سے واپسی پر وہ کتنی ہی دیر بیٹے کو اپنے گلے لگائے اس کی خوشبو اپنے اندر سموتی رہیں اور پھر دل کڑا کر کہنے لگیں۔

''کاشی! میری دعا ہے کہ پروردگار تمہیں ہر ارادے میں کامیاب فرمائے۔''

یہ سنتے ہی آکاش کا چہرہ کھل اٹھا۔ اس نے والدہ کے گرد اپنی گرفت مضبوط کی اور خوشی سے کھنکتے لہجے میں بولا۔

''شکریہ امی جی! بہت بہت شکریہ۔''

ساجدہ بوجھل دل لیے بیٹے کی پُروقار' خوش باش شبیہہ آنکھوں میں قید کیے واپس لوٹ آئیں۔

☆☆☆

آکاش کی پیدائش سے قبل عراق اور کویت میں ہونے والی جنگ کے دوران ڈاکٹر آفتاب نے ایک پیشگوئی کی تھی کہ چچا سام کی لگائی ہوئی اس آگ کے شعلے وہ خود ہی بہت اہتمام سے دیگر خطوں میں بھی بھڑکا دے گا۔ اس وقت یہی ہو رہا تھا۔ اس خلیجی جنگ کے اکیس سال بعد وہی شعلے اپنا سفر طے کرتے ہوئے پاکستان تک آ پہنچے تھے۔ ملکی حالات تشویشناک حد تک خراب ہو چکے تھے۔ ملک کے طول و عرض میں دہشت گردی' ٹارگٹ کلنگ' بم دھماکوں اور لاقانونیت کا بازار گرم تھا۔ جنگل کے قانون سے بدترین حالت دیکھی جانے لگی۔ سبھی مذاہب کے عبادت خانے' عوامی و تفریحی مقامات اس آگ کی تپش میں جھلستے نظر آتے۔ گھر سے کام کاج کے لیے نکلنے والوں تک کو اپنی واپسی کی کوئی اُمید نہ ہوا کرتی۔ بے یقینی' افسردگی اور اضطراب کی ان کیفیات نے آکاش کو بھی بے چین کر رکھا تھا۔ ہر محبِ وطن پاکستانی کی طرح وہ بھی ان شر پسند عناصر سے ملک کو پاک کر دینا چاہتا تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ تنہا ہی ان تخریب کاروں کا قلع قمع کر دیتا۔

انہی دنوں وہ 'ینگ آفیسر کورس' پر جانے سے پہلے چھٹیوں کے لیے گھر آیا ہوا تھا۔ ٹی وی پر مسلسل انہی خبروں نے دل بوجھل کیا ہوا تھا۔ اس نے اپنا لیپ ٹاپ سنبھال لیا۔ اسی اثناء میں ساجدہ بھی اس کے پاس آ بیٹھیں۔ بیٹے کی چھٹیوں کے دوران ان کی اوّلین کوشش یہی ہوتی تھی کہ وہ اس کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گذارا کریں۔ آکاش والدہ کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے فیس بک وال پر دکھائی دینے والی مختلف دوستوں کی سرگرمیاں دیکھ رہا تھا۔ یکا یک کسی خاتون کی تصویر پر اس کی انگلی نے جنبش روک دی۔

''یہ دیکھیے امی!'' اس نے چمکتی آنکھوں سے لیپ ٹاپ کی اسکرین کا رخ ساجدہ کی طرف کیا۔ ''یہ شہید کرنل ہارون اسلام کی والدہ ہیں۔''

آکاش کے اس انکشاف پر ساجدہ خاموشی سے اس عظیم خاتون کو دیکھنے لگیں جن کے چہرے کو حزن' ملال' وقار' استقلال' کرب اور فخر کی کیفیات نے ایک الگ ہی روپ دے رکھا تھا۔ اسی لمحہ فضاء میں مغرب کی اذانیں گونج اٹھیں۔

اپنی مختصر سی ساڑھے تیئیس سالہ زندگی میں آکاش نے ہر رشتہ کے حقوق بھی بھرپور طریقہ سے ادا کیے۔ ملٹری ٹریننگ کے دوران بھی وہ والدین اور بہن بھائی کی سالگرہ یا والدین کی شادی کی سالگرہ کبھی نہ بھولا۔ تحائف دینے کا فن بھی گویا اسی پر ختم تھا۔ اس کی یہ عادت دیکھ کر کئی ساتھیوں میں بھی اہلخانہ کے لیے ایسے ہی تحفے تحائف کا تبادلہ کرنے کی تحریک پیدا ہو گئی۔

.....☆.....☆.....

ملٹری اکیڈمی میں آکاش کا ایک دلچسپ معمول تھا کہ وہ 'لوئر اسٹاف' کے توسط اپنی اور ساتھیوں کی افطاری کے لیے من پسند اشیاء منگوایا کرتا تھا اور اس چیز کا بدلہ بہت شاندار انداز میں چکاتا۔ کسی بھی اسٹاف کی بیماری کی صورت میں ایک کاغذ پر پیغام لکھنے کے بعد انہیں اپنے والد ڈاکٹر آفتاب ربانی کے پاس مفت علاج کے لیے روانہ کر دیتا۔

.....☆.....☆.....

آکاش کا فارغ وقت کتب بینی میں بسر ہوتا تھا۔ عظیم عالمی رہنماؤں' حکمرانوں اور سپہ سالاروں کے حالاتِ زندگی پڑھنا اسے بہت مرغوب تھا۔ اس کے لیے مثالی شخصیت صرف حضرت محمد ﷺ کی تھی۔

.....☆.....☆.....

''انہیں اپنے بیٹے کی شہادت پر بہت فخر ہے۔''
آکاش نے والدہ کو مزید بتایا۔ ''میری شہادت پر آپ بھی فخر کریں گی ناں امی؟ آپ کو میرے یونیفارم اور جھنڈے کے علاوہ دوسری باقیات بھی دی جائیں گی۔ وہ بڑا یادگار لمحہ ہوگا امی! آپ کی آنکھوں میں آنسوؤں کے ساتھ ایک فخر بھی ہوگا کہ آپ کے بیٹے نے وطن کی حفاظت کے لیے اپنی جان قربان کردی ہے۔'' آکاش کے لہجے میں جانے ایسی کیا بات تھی کہ ساجدہ بے اختیار بول اٹھیں۔

''مجھے علم ہے کہ شہید کا بہت اعلیٰ مقام ہے۔ مجھے یہ بھی پتا ہے کہ شہادت ہی ایک مومن کا مطلوب و مقصود ہوا کرتی ہے۔ میں یہ بھی مانتی ہوں کہ پروردگار اپنے بہت خصوصی بندوں کو یہ رتبہ عطا کرتا ہے۔ لیکن میں کیا کروں آکاش؟ میں بھی کیا کروں؟ ایک ماں ہوں..... بہت کمزور ہوں..... مجھ میں بشری کمزوریاں زیادہ ہیں۔ اپنی ان باتوں سے میرا امتحان لے کر مجھے اپنی ہی نظروں میں شرمندہ نہ کیا کرو۔''

''میں تو مذاق کررہا تھا امی! اچھا سوری! آئندہ ایسی کوئی بات نہیں کروں گا۔ وہ سنجیدگی و افسردگی سے والدہ کو تسلی دینے لگا۔ ساجدہ کی آنکھوں میں تیزی سے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ جانتی تھیں کہ آکاش محض ان کا دل رکھنے کے لیے ایسا کہہ رہا تھا۔ بہرحال آکاش اپنی اس بات پر کاربند رہا۔ اس نے والدہ کے سامنے تو دوبارہ ایسا کوئی ذکر نہ کیا البتہ بہن بھائیوں اور دوستوں کے سامنے اپنی اس تمنا کے اظہار اور شہادت کی سعادت مل جانے کی دعا کروائے بغیر رہ بھی نہ پاتا۔ ساجدہ آکاش کی اس روش سے آگاہ تھیں۔ ان کے پاس حالات میں بہتری' آکاش جیسے ہزاروں بیٹوں کی سلامتی اور اپنے ظرف و قلب کی مضبوطی کے لیے دعائیں مانگنے کے سوا کوئی اور چارہ نہ تھا۔''

☆☆☆

جنوری 2012 کا آغاز پیشہ وارانہ مصروفیات کے ایک انبار سے ہوا۔ آکاش نے 'آرٹلری اسکول' میں Basic Artillery کا کورس کرنا تھا۔ اس شش ماہی کورس میں 'ایک سو پینتیس' افسران نے شرکت کی۔ آکاش چند ہی روز میں اپنی سادہ لوح طبیعت' ملنساری اور خوش مزاجی کے باعث ان کے دلوں میں گھر کرگیا۔ وہ تھوڑی دیر پڑھ کر کبھی گھنٹوں کی پڑھائی کا حق ادا کردیتا' گیمز میں حصہ لیتا اور ان ساتھیوں کی مدد کرتا جو توپ خانہ کے اس کورس میں کافی مشکلات کا سامنا کررہے تھے۔ آرٹلری درحقیقت سبھی 'آرمز کورسز' میں دشوار ترین شمار کیا جاتا ہے۔ اس کی 'تکنک' سے اپنی ہاتھ کی لکیروں جیسی واقفیت اپنے آپ میں ایک مکمل سائنس اور انجینئرنگ تھی۔ اس میں ایک ذرا سی کوتاہی بھاری نقصان کا سبب بن جایا کرتی ہے۔ میٹرک اور انٹر آرٹس والے ساتھیوں کی مشکلات اور پریشانی بالکل فطری تھی۔ اس کے برعکس آکاش سائنسی مضامین میں ماہر تھا۔ اس کی ریاضیات میں مہارت قابل رشک تھی۔ کچھ ہی روز میں نوبت یہاں تک آپہنچی کہ ساتھی افسران اس کے کمرا میں جمع ہوکر 'ٹیوشن کلاسز' لینے لگے۔ کچھ ہی روز میں یہ سلسلہ رات بھر چلنے لگا لیکن اس کی پیشانی پر ناگواری یا عدم برداشت کی ایک بھی شکن پیدا نہ ہوئی۔ وہ تین' تین، چار چار لڑکوں کے گروپس کی ذہنی الجھنیں اور مشکلات کا خاتمہ کرکے ہی روانہ کرتا تھا۔ سولہ جون 2012 کو ختم ہونے والا یہ کورس آکاش آفتاب ربانی کے لیے یادگار رہا۔ اس نے تیسری پوزیشن لے کر کانسی کا تمغہ حاصل کیا تھا۔ ساتھی افسران آکاش کی اس کامیابی اور اس کی بھرپور مدد پر بے حد خوش اور اس کے لیے دعاگو تھے۔

آرٹلری کورس کے بعد چھٹیاں اہلخانہ کے ساتھ گذار کر وہ واپس چلا گیا۔ کچھ ہی عرصہ بعد اسے دوسرے یونٹ میں پوسٹنگ کے احکامات مل گئے جہاں اگلے چھ ماہ کا آغاز ہی اس کی یونٹ کے لیے بہت ہولناک رہا۔ اس منتقلی کے بعد یونٹ کو صاف پانی اور ماحول میسر نہ آسکا۔ وہاں کا کھارا پانی ان کے معدوں پر ایک قیامت بن کر ٹوٹا۔ آکاش کو بھی طبیعت میں گرانی محسوس ہونے لگی تھی۔ اس نے فوری طور پر 'میس اسپتال' میں معائنہ کروایا تو 'ہیپا ٹائٹس اے' کے مرض کا انکشاف ہوا۔ اہلخانہ بھی یہ خبر سن کر تشویش زدہ ہو گئے۔ پروفیسر آف میڈیسن اور جنرل فزیشن ڈاکٹر آفتاب ربانی نے بیٹے کی رپورٹس فوری طور پر منگوائیں۔ انہیں شدید بے چینی لاحق ہوچکی تھی۔ ڈاکٹر آفتاب نے آکاش کی چھٹی کے لیے درخواست بھی کی لیکن اسپتال کے کچھ قواعد و ضوابط کے مطابق اسے ابھی چھٹی نہیں دی جاسکتی تھی۔ نقاہت نے اس کے وجود" مکمل پنجے گاڑ رکھے تھے۔ رنگت میں گویا زردی گھلی تھی۔ کچھ بھی کھانے پینے کا دل ہی نہ کرتا۔ بیماری کی نقاہت کے بعد کھانے پینے کی اس کمی نے اسے مزید لاغر اور والدین کو کئی گنا تشویش زدہ کردیا۔ خدا خدا کر کے اس کے Alanine Transaminase ٹیسٹ کے نتائج بہتر آئے اور اسے گھر جانے کا پروانہ مل گیا۔ اہلخانہ نے اس کی تیمارداری میں دن رات کا فرق ہی بھلا دیا۔ آکاش آفتاب

ربانی کو بھی اپنی اس بیماری سے جلد از جلد صحت یابی درکار تھی۔ اسے خود سے زیادہ ٹریننگ کی فکر تھی جس میں وہ ساتھیوں کو 'کیموفلاج' کی تکنیک سکھاتا۔ آکاش کی تخلیقی صلاحیتوں کے باعث اس کا بنایا کیموفلاج دیکھ کر اعلیٰ افسران ہمیشہ ہی انگشت کراٹھتے تھے۔ وہ اپنی بیماری سے دیوانہ وار لڑ رہا تھا۔ اس کے حوصلے بلند اور عزم توانا تھے کیونکہ اسے یہی چیز تو سکھائی گئی تھی۔ اپنے لیے جینا تو ایک مدت سے ترک ہو چکا تھا۔

آکاش آفتاب ربانی کی زندگی اب ایک امانت تھی۔ اس کی فوج کے جوانوں کی امانت جن کی تکنیکی تربیت کا وہ ذمے دار تھا۔ اس کی یونٹ کی امانت جس کا سر اسے فخر سے بلند کرنا تھا۔ اس کے ملک و قوم کی امانت جن کے لیے اسے اپنا وجود ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار بننا تھا۔ ان ارادوں میں بھلا کسی بیماٹائمس اے کا کیا کام تھا؟ اسے تو شکست ہونی ہی تھی کیونکہ مقابل کوئی عام شخص نہیں بلکہ دنیا کی بہترین فوج کا ایک مخلص اور فرض شناس سپاہی تھا اور پھر وہ جوان مرض کو پچھاڑ کر ارض پاک کے لیے فرض کی پکار پر لبیک کہتے ہوئے واپس روانہ ہو گیا۔ اہلخانہ اور خاص طور پر ساجدہ کو بالکل بھی علم نہ تھا کہ وہ جس آکاش کی نقاہت' مرض اور پھر بیس کے ماحول اور کھارے پانی پر تشویش زدہ ہو رہے ہیں وہ آکاش اپنے دل میں ایک ایسی 'فورس' منتقلی کا فیصلہ کیے بیٹھا ہے جو کسی بھی فوجی کے لیے بیک وقت خواب اور حسرت ہوا کرتی ہے۔ 'اسپیشل سروس گروپ' میں سوچ و تصورات سے بالاتر 'تربیت' ہر کسی کے خواب کو شرمندہ تعبیر ہونے ہی کہاں دیتی تھی۔ آکاش کو اب کسی بھی قیمت پر اس تاریخی فوج کا حصہ بننا تھا۔

☆☆☆

آکاش کی جانب سے ایس ایس جی میں شمولیت کی خبر ملتے ہی پلاٹون میٹس کا ردِعمل بہت فطری تھا۔

''اچانک ہی یہ دھماکا کیوں بھئی؟'' ساتھیوں نے پوچھا۔

''خیر! اچانک تو نہیں ہے۔ یہ میرا ایک دیرینہ خواب تھا۔'' آکاش نے مسکرا کر جواب دیا۔ وہ اپنا کوئی بھی خواب' ارادہ یا فیصلہ بالکل عملی روپ میں ڈھال کر ہی اہلخانہ اور دوستوں کے سامنے لاتا تھا۔ اس سے قبل وہ اپنے دلی جذبات کسی کے سامنے بھی بیان ہی نہیں کرتا تھا۔

''اپنی یونٹس میں پوزیشن ہولڈر افراد کی جانب سے ایسا فیصلہ تو کم ہی دیکھنے میں آتا ہے۔'' ایک ساتھی نے آرٹلری کورس میں اس کی تیسری پوزیشن کا حوالہ دیا۔

''مجھے اپنے لیے آسانیاں پسند ہی نہیں ہیں۔ میں خطروں کو آگے بڑھ کر خود گلے لگانا چاہتا ہوں۔ انہیں بتانا چاہتا ہوں کہ ایک مسلمان اور پاکستانی فوجی کے لیے 'ایمان' ہی سب سے بڑی قوت ہے۔ اس قوت کے سامنے ہر خطرہ کو خود اپنے وجود پر شرمندہ ہونا ہوگا۔'' اس کے جذبہ اور عزائم نے ہر ایک کو گنگ کر دیا۔

''پروردگار تجھے ہر مقصد میں کامیاب کرے۔'' ساتھیوں نے دعا کی۔

''یہ بھی دعا کیا کرو کہ اللہ پاک نہ صرف مجھے مومن کا 'مطلوب و مقصود' عطا فرمائے بلکہ اسے اپنی بارگاہ میں قبول و منظور بھی فرمالے۔'' دل کا گداز اس کی آنکھوں میں نمی لے آیا۔

ساتھیوں کے بعد اس کے کمانڈنگ آفیسر نے بھی اسے چند حقائق سے آگاہ کرنا ضروری سمجھا۔

''میرا خیال ہے کہ تمہیں اپنے اس فیصلہ پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔'' اس نے دوستانہ انداز میں کہا۔

''جبکہ میرا خیال ہے کہ فوجی کو اپنے کسی فیصلہ پر نظر ثانی کی ضرورت پڑے تو وہ فوجی ہی کیا؟'' آکاش کے پُراعتماد انداز نے سی او کو مسکرانے پر مجبور کر دیا۔

''تم بنیادی طور پر 'مطالعہ' والے بندے ہو۔ پڑھائی کے بل بوتے پر ہی یہاں تک آئے ہو۔ ایس ایس جی میں تمہیں اپنی روش تبدیل کرنی پڑے گی۔''

''کرلوں گا سر! کمانڈو بننے کے لیے میں کچھ بھی کرنے اور سہنے کے لیے تیار ہوں اینڈ آئی ریئلی مین اٹ سر!'' اس کا عزم دیدنی تھا۔

''بار بار ایکسر سائز بھی کرنی پڑے گی اور تمہیں تو دہرائی پسند ہی نہیں۔'' سی او نے مسکراتے ہوئے اسے ایک اور چٹکی بھری۔

''مجھے خود سے لڑائی ہی تو زیادہ پُرجوش کر رہی ہے سر! اپنی عادات' مزاج اور طبیعت کے خلاف پہلی جنگ جیت کر ہی خود کو کمانڈو بننے کا اہل سمجھوں گا۔'' سی او کو ایسے ہی جواب اور چٹانی عزم کی توقع تھی۔ وہ آکاش جیسا افسر اپنی یونٹ سے جانے ہی نہیں دینا چاہتے تھے لیکن آکاش آفتاب ربانی کا ارادہ اٹل تھا اور اسی عزم و ارادے کا ہی کمال تھا کہ اسے کمانڈو کورس کی ٹریننگ کے لیے منتخب کر لیا گیا۔ آکاش نے یہ خبر اہلخانہ کو بہت خوشی اور جوش سے سنائی۔

''تو بالآخر میرے کاشی نے اپنا لوہا منوا ہی لیا۔'' ساجدہ

نے کہا۔

''لوہا تو ابھی منوانا ہے امی جی! میں اس وقت خود کو کسی قابل سمجھوں گا جب اس ٹریننگ کی سختیاں برداشت کرلوں گا۔'' اس کے لہجے میں جذبوں کی حدت تھی۔

''مجھے اسی وقت سمجھ لینا چاہیے تھا جب سی ایم ایچ میں تم نے مجھے ایک ایس ایس جی افسر دکھایا تھا۔'' ساجدہ کو یکدم کچھ یاد آیا۔

''جی امی! ان کا یونیفارم' وقار' مشن اور' وژن' امیزنگ جسٹ امیزنگ۔ ایس ایس جی میں شمولیت کسی بھی اعزاز سے کم کہاں ہے امی جی! ہماری فوج کا ہر ایک جوان یہ کورس کرنے کے لیے مچلتا ہے لیکن یہ بھی بہت بڑی حقیقت ہے کہ تکمیل کے لیے بڑے دل گردے کی ضرورت ہوتی ہے۔ دعا کیجیے گا امی! میری کامیابی کے لیے بس دعا کیجیے گا۔'' اس کے ہر ایک انداز میں تڑپ اور ولولہ تھا۔

''میری دعائیں ہمیشہ سے ہی تمہارے ساتھ ہیں کاشی! اور آیندہ بھی رہیں گی۔ پروردگار تمہیں دنیا اور آخرت کے ہر امتحان میں سرخرو فرمائے۔'' ساجدہ نے خلوص دل سے دعا کی۔

☆☆☆

ایس ایس جی کے اس کمانڈو کورس کے لیے آکاش آفتاب ربانی کا نام لسٹ میں آچکا تھا لیکن ایڈوانس کورس میں منتخب کیے جانے سے پہلے اسکریننگ ہوتی ہے۔ اس دوران اگر کسی کی رضامندی میں تبدیلی آئے تو کورس کے باقاعدہ آغاز سے قبل ہی اعلیٰ افسران کو آگاہ کرسکتا ہے۔ یہ کورس کلی طور پر رضاکارانہ ہوتا ہے۔ اس کا انتخاب ذاتی صوابدید پر ہی ہوتا ہے۔ اس تربیتی کورس میں انسانی ہمت' برداشت اور ظرف ایسی حدود تک جانچا جاتا ہے جس کے متعلق عام انسانی ذہن تصور کا پہلا حروف بھی محسوس نہیں کر سکتا۔

ابتدائی 'اسکریننگ' میں بنیادی ٹیسٹ جسمانی و نفسیاتی ہوتے ہیں۔ اُمیدوار کی ذہنی و جسمانی تندرستی اور آمادگی بہرصورت درکار ہوا کرتی ہے۔ آکاش آفتاب نے اسکریننگ کے لیے کیمپ میں رپورٹ کی۔ یہ تربیت گاہ بلند و بالا پہاڑوں پر واقع ہے۔ اُمیدوار اسکریننگ کے تین دن اور پھر کمانڈو کورس کے ابتدائی دو ماہ یہیں بسر کرتے ہیں۔ یہ سفر کسی بھی گاڑی یا سواری پر نہیں کیا جاتا بلکہ پہاڑوں کے خطرناک اور گہری کھائیوں سے اٹے راستوں پر رات کی تاریکی میں پاپیادہ طے کیا جاتا ہے۔ ٹریننگ آفیسر آکاش کے بیچ کو اسکریننگ کے لیے اپنے ہمراہ لے کر پہنچا تو ان سبھی امیدواروں کو سینے کے بل لٹا کر ڈنڈوں سے آؤ بھگت کی گئی۔

''ہاں بھئی جوان! کیا نام ہے تمہارا؟ ذرا اپنا تعارف تو کرواؤ!'' ان سبھی سے فرداً فرداً پوچھا گیا۔

''کیپٹن آکاش آفتاب ربانی سر!'' اس نے مخصوص دبنگ آواز میں کہا۔ ہاں وہ بات الگ تھی کہ یہ آہنگ اگلے ہی لمحہ ڈنڈوں کی زوردار آواز میں دب کر رہ گیا۔ ہر ضرب پر اس کے حلق سے بھیانک صدائیں برآمد ہوتیں۔ اس شب آکاش نے ستائیس ڈنڈے 'تناول' کیے تھے۔ رات کی ہڈیوں میں گودا جماتی سردی سے بے نیاز لگ بھگ گیارہ بجے گیٹ تک پہنچتے وہ پسینے سے شرابور ہو چکا تھا۔ قبر جیسا ہولناک اندھیرا' جنگلی جانوروں کی اعصاب شکن پُرہول آوازیں ان کے لیے ایک اور امتحان ثابت ہو رہی تھیں۔

''نعرہ تکبیر..... اللہ اکبر.....'' ایک روح پرور صدا سماعت میں پڑتے ہی لہو گرما گیا اور جسم تن گئے۔ وہ ٹریننگ آفیسر کی آواز کے گھن گرج کی جانب سراپا سماعت بن گئے تھے۔

''جانتے ہو یہ جگہ کون سی ہے؟ یہاں مردوں کا کمانڈو بنایا جاتا ہے۔'' اس نے لفظ 'مردوں' پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''یہ کورس صرف 'مرد' ہی کر سکتے ہیں۔ میں آپ کا ٹریننگ آفیسر ہوں۔ آپ فوج سے ڈسپلن سیکھ کر آئے ہیں لیکن یہاں کا ڈسپلن الگ ہے۔ مجھے یہاں کوئی پیدل چلتا ہوا دکھائی نہ دے۔ آپ سب کو دوڑنا ہے۔ دوڑنا ہے اور بس دوڑتے رہنا ہے۔ اس دوڑ میں جانباز' جانباز' من جانبازم کا نعرہ کسی کو سونے کا سوچنے بھی نہ دے۔ یہاں آپ کے بہترین ساتھی صرف تاریک رات اور خراب موسم ہوں گے۔ اگر کسی کو نرم گرم بستر والی نیند کی طلب ہے تو ابھی اسی لمحہ یہاں سے لوٹ جاؤ! یہ جگہ ان لوگوں کے لیے بنی ہے جو آسمان کو چادر و کمبل' زمین کو بستر اور پتھروں کو تکیہ بنانے کی ہمت رکھتے ہیں۔ ہے کسی میں یہ ہمت؟ ایک بات سبھی جان لو! کمانڈو بننا ایک امتحان ہے لیکن اس کے بعد کمانڈو بنے رہنا اس سے بھی کٹھن امتحان ہوتا ہے۔ کسی میں ہمت ہے اس امتحان میں سرخرو ہونے کی؟'' ٹریننگ آفیسر کے ان الفاظ نے وہاں کئی وجود ساکت کر دیئے۔

''کمانڈو بنے رہنا اس سے بھی کٹھن امتحان ہوتا ہے۔'' اس کی سماعت میں گونجتی یہ صدا اس عہدہ کا اصل تقدس

عیاں کررہی تھی۔

''میں ہر مشکل کو گلے لگانے کے لیے تیار ہوں۔ میں کمانڈو بنوں گا اور کمانڈو ہی کی حیثیت سے جام شہادت نوش بھی کروں گا۔'' آکاش نے ایک عزم سے خود کلامی کی۔ وہاں موجود جوانوں کی اکثریت اسی جیسے جذبہ سے سرشار تھی۔ وہ 'منتخب' افراد تھے۔ اپنی اس خوش قسمتی پر نازاں اس اہم ترین ادارے کے حساس ترین 'عہدہ' پر فائز ہونے آئے تھے۔ اب واپسی کی کوئی صورت ممکن ہی نہ تھی۔ اب تو بس آگے بڑھتے ہوئے اس حسین محبوبہ دلنواز سے جاملنا تھا جو ہر مسلمان کی شدید تمنا ہوا کرتی ہے۔ انہیں دشمنوں کی تباہی یا شہادت کے سوا زندگی میں کوئی تیسری راہ درکار ہی نہ تھی۔

☆☆☆

اگلی صبح بہت کٹھن تھی۔ شب بھر جاگتے رہنے کے بعد انہیں 'فزیکل ٹیسٹ' کے لیے دھر لیا گیا۔ آکاش کے بیچ کی اکثریت یہ ٹیسٹ پاس کرنے میں ناکام رہی۔ آکاش کو کامیابی تو ملی لیکن وہ نتیجہ سے کلی طور پر مطمئن نہیں تھا۔ وہ اپنے وجود اور کارکردگی سے ہلکی سی کمزوری بھی جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دینا چاہتا تھا۔ فزیکل ٹیسٹ کے بعد 'انٹیلی جنس' کی آزمائش کا مرحلہ آگیا۔ اس موقع پر انہیں کسی بھی قیدی کی تفتیش کا ہدف دیا جاتا ہے۔ اندرونی جانب قیدی کے پاس بھیجتے ہوئے ایک فرضی کہانی گوش گذاری جاتی ہے۔ زیر امتحان افراد قیدی کی کسی بھی قسم کی مار پیٹ کے بغیر تفتیش کے مجاز ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ انہیں یہ بات خصوصی طور پر باور کروائی جاتی ہے کہ قیدی دماغی طور پر غیر متوازن ہے لہٰذا حالات کو سمجھداری سے سنبھالنے کی ذمے داری صرف انہی پر عائد ہوتی ہے۔ ان جوانوں کو جو بات نہیں بتائی جاتی وہ یہ ہوتی ہے کہ اندر کوئی اصل قیدی نہیں بلکہ اس کے روپ میں کمانڈو ہی گھات لگائے بیٹھا ہے۔ وہ اپنے پاس آنے والے جوانوں کے چہرے کا جغرافیہ ہی تبدیل کرکے رکھ دیتا ہے۔ آکاش کا چہرہ بھی کسی نئے دریافت شدہ براعظم کے سے خدوخال اختیار کرگیا۔

اس مرحلہ کے بعد شام ڈھلے ایک اور آزمائش کا سامنا تھا ..... وہ رات سردی اور تاریکی میں اپنی مثال آپ تھی۔ آکاش سمیت ان سبھی جوانوں کے کندھوں پر بڑے پتھر لدوا کر برہنہ پا پہاڑی کی ایک چوٹی کی طرف ہانک دیا گیا۔ چوٹی پر پہنچ کر ان کے بدن سے کپڑے اتروا کر آنکھوں پر سیاہ پٹی اور ہاتھوں کو پشت پر ہتھکڑی سے باندھ دیا گیا۔ اس کے بعد انہیں نوکدار پتھریلی بجری پر برہنہ گھٹنوں کے بل کھڑا کردیا گیا۔ وہ ضبط اور آزمائش کا ایک ہولناک امتحان تھا۔ تند سرد ہواؤں میں برچھیوں کی طرح گھس رہی تھی اور نوکیلی بجری تو اس قدر پیاسی تھی کہ جوانوں کا گرم تازہ لہو پی کر بھی اس کی تشنگی ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ اس اعصاب شکن مرحلہ میں آکاش کی سماعت نے ایک ایسی آواز سنی جس نے اسے بے طرح تڑپا کر رکھ دیا۔

''کیپٹن آکاش بے ہوش ہوگیا ہے۔ اس نے unwill کردیا ہے۔''

''نہیں! میں ابھی اپنے پورے ہوش وحواس میں ہوں۔ میں یہاں سے کامیاب ہوئے بغیر نہیں جاؤں گا۔'' اس نے چیخ کر صدا دی۔

نیم برہنہ وجود کو چیرنے والی سرد ہوا کے تھپیڑے کھانے اور نوکیلی بجری کو خون سے سیراب کرنے کے بعد ان جوانوں کو ایک خصوصی آلہ 'گیارہ نمبر چھتر' کی رونمائی کرائی گئی۔ شٹاک کی آواز کے بعد بدن پر ایک کوڑا سا رسید ہوتا محسوس ہوتا۔ اس کے ساتھ سردی کا احساس تو کم ہوجاتا البتہ ایک بھرپور نشان بھی کسی تمغہ کی طرح جگمگانے لگتا۔ اس خاطر تواضع کے بعد رات نے اپنے سر سمیٹ لیے تو اگلی صبح مزید امتحانات کے ساتھ طلوع ہوگئی۔

☆☆☆

صبح کی ابتداء تلاوت کلام پاک اور نعت رسول مقبول ﷺ سے ہوا کرتی ہے۔ مسجد کے طاقتور اسپیکرز سے پھوٹتی یہ آوازیں پہاڑوں سے ٹکرا کر پہاڑوں میں اپنی گونج پھیلاتی ہیں۔ نعت کے بعد لہو گرمانے والے ملی نغمے جسمانی تربیت ختم ہونے تک چلتے رہتے ہیں۔ اس سے جوانوں کا حوصلہ بلند رکھنے کا اہتمام بھی متوازی طور پر چلا کرتا ہے۔ اس روز انہیں ٹریننگ کے بعد ایک کھلے احاطے میں لے جا کر ناشتے کے طور پر 'آنسو گیس' کا میپو پیش کیا گیا۔ اس چبھنے والی گیس میں جوانوں کو چھوڑ کر احاطہ کا دروازہ بند کردیا گیا تاکہ وہ طبیعت کی سیری کے مطابق اس ناشتے سے لطف اندوز ہوتے رہیں۔ کمرے سے باہر آنے والے جوانوں کی آنکھیں لہو کی مانند سرخ ہوچکی تھیں۔ کھانسی اور چھینکوں کی شدت کا یہ عالم تھا کہ ہانپتے ہوئے زمین کی طرف سر جھکانے سے ناک اور منہ سے نکلنے والا پانی کسی فوارے کی دھاروں کی طرح زمین پر اپنے نقوش بنا رہا تھا۔ سینے کی جلن انہیں شدت کرب سے کراہنے پر مجبور کرنے لگی۔

دوپہر کا مینیو اس سے بھی شاندار تھا۔ انہیں survival ریچ کا دورہ کروایا گیا۔ وہاں پر مختلف رکاوٹیں نصب تھیں۔ جوانوں کو ان رکاوٹوں سے بچاؤ کے طریقے بھی بتائے گئے۔ یہ رکاوٹیں درحقیقت دشمن کو اپنے شکنجہ میں جکڑنے کے لیے استعمال ہوتی تھیں۔ آکاش کی بدقسمتی ہی تھی کہ اس کا پاؤں ایک رسی میں پھنس گیا۔ رسی نے خودکار طریقہ سے اسے جکڑا اور قریبی درخت کے ساتھ الٹا لٹکا دیا۔ اصول وضوابط کے تحت کسی بھی ایسے 'ٹریپ' میں پھنسنے والے جوان کو مزید سزا بھی دی جاتی تھی۔ آکاش کو فوری طور پر کیچڑ آلود گندے بدبودار پانی میں ایسی ڈبکیاں دی گئیں کہ بعد میں خود اس کے لیے اپنا چہرہ پہچاننا مشکل ہو رہا تھا۔

شام کا مینیو قدرے مختلف اور اسکریننگ کا اہم ترین حصہ تھا۔ ان جوانوں کو آنکھوں پر پٹی باندھ کر ایک ایسی سرنگ سے گذارا گیا جہاں سے عجیب وغریب آوازیں آیا کرتیں۔ آنکھوں پر یہ پٹی آزمائش کا صرف ایک معمولی سا حصہ ہوتی ہے۔ اصل امتحان تو اس وقت شروع ہوتا ہے جب جسم برہنہ کروا کے سرنگ میں مختلف مقامات پر ڈنڈے برسائے جاتے ہیں۔ جسمانی برداشت کا یہ سلسلہ رات کے گھور اندھیرے میں ایک اور مقام پر ہوا، سب جوانوں کو یکے بعد دیگرے کمرے میں لے جایا گیا جہاں سے برآمد ہونے والی رونے اور چیخ و پکار کی آوازیں بڑے بڑوں کا پتا پانی کر دیتیں۔ آکاش بھی اپنے اعصاب میں ایک عجیب تناؤ اور سنسنی محسوس کر رہا تھا۔ کچھ ہی وقت گذرا تھا کہ ایک اسٹاف ممبر کی آمد ہوئی۔ اس نے اپنا چہرہ آکاش کے قریب کیا اور سرگوشیانہ انداز میں کہنے لگا۔

''سب اُمیدواروں نے عدم رضامندی ظاہر کر دی ہے۔ بس آپ اکیلے ہی رہ گئے ہیں۔'' آکاش کے بدن میں ایک زوردار جھٹکا محسوس ہوا پیدا ہوگئی۔ وہ اسٹاف ممبر کی اس بات کا بین السطور مطلب بھی سمجھ رہا تھا۔ وہ اسے یہی سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ بقیہ جوانوں کی طرح تم بھی اپنا رستہ ناپو۔ آکاش کے وجود میں مزاحمت کی ایک بلند وبالا لہر اٹھی اور اس نے مضبوط لہجہ میں جواب دیا۔

''جو بھی ہو جائے۔ میں unwill نہیں کروں گا۔ چاہے میری جان ہی کیوں نہ نکل جائے۔ میں اپنے اس خواب سے دست بردار نہیں ہوں گا۔''

اسٹاف نے اس کی بات پر ہنستے ہوئے اسے کسی جلاد کی طرح اٹھایا اور کمرے میں لے گئے۔ آنے والے لمحوں کی چاپ ہی بہت بھیانک تھی۔ خود سے پہلے اندر جانے والے جوانوں کی چیخیں اور تڑپ' پر مبنی صدائیں اسے اب اپنے حلق سے برآمد ہونے کا بھرپور یقین تھا لیکن اس یقین میں ایک میٹھی میٹھی سی سرشاری اور فرحت بھی تھی۔ اس امتحان میں کامیاب ہو جانے کی صورت میں وہ اپنی منزل کی جانب ایک قدم اور آگے بڑھ جاتا۔ منزل زیادہ نہ سہی' تھوڑی تو قریب آ ہی جاتی۔ انہی جذبوں کی حدت میں آکاش نے گیارہ نمبر خصوصی آلہ اور ڈنڈوں سے اس قدر مار برداشت کی کہ اس کی کمر نیلگوں اور سیاہ دھبوں سے اٹ گئی۔ ایسے زخموں کی موجودگی میں وہ کسی بھی پہلو سونے سے قاصر تھا۔ آنے والے ہفتوں میں تھکاوٹ اور درد کے علاوہ بھوک اور نیند اعصاب کا علیحدہ امتحان ثابت ہونا تھیں۔

اسکریننگ کے تیسرے دن کا آغاز ہوا تو ان جوانوں کو ہیڈ کوارٹر لے جا کر مختلف مراحل سے جانچا گیا، اس کے بعد پوری تربیتی ٹیم نے بطور پینل جوانوں کو فرداً فرداً بلوا کر انٹرویو لیا۔ اسی مقام پر انہیں جوانوں کی اصل ذہنی قابلیت کا اندازہ ہونا تھا۔ اسکریننگ کے اس پورے عمل میں آکاش سمیت 'ساٹھ' افسران کمانڈو کورس کے لیے منتخب ہو سکے۔ خوشی اور شکرانے کے وہ جذبات ناقابلِ بیان تھے۔ وہ اپنی منزل کا ایک بڑا ڈیوٹر عبور کر چکا تھا۔ جسمانی اذیت اور کرب خوشی وفرحت کی لہروں تلے خوابیدہ محسوس ہونے لگی تھیں۔ تین روزہ اسکریننگ کا مرحلہ مکمل ہوتے ہی انہیں چھٹی دے دی گئی۔ اب ایک ماہ بعد رپورٹ کرنی تھی۔

☆☆☆

آکاش اور بقیہ انسٹھ افسران 'انیس اپریل' کو وہاں موجود تھے۔ اس موقع پر اسٹاف اپنی ڈانٹ ڈپٹ' ہولناک حقائق کے انکشافات اور بے رحم رویے سے مسلسل ان کے حوصلے آزما رہا تھا۔ ان سبھی افسران کو لاکر نمبر' دے دیئے گئے۔ کپڑے پر لکھے ہوئے ان نمبروں کو اپنے سینے پر بھی باندھا جاتا۔ آکاش کی پہچان 'چار نمبر' بن گئی۔ گو ماہ کے اس تربیتی کورس میں ہر ایک لمحہ گذشتہ سے زیادہ سخت اور ناقابلِ برداشت تھا۔ پہلی ہی صبح ضربات اور تشدد سے ان کا جسم چور چور کر دیا گیا۔ ان کی وردیاں پسینے سے شرابور ہو چکی تھیں اور ستم ظریفی یہ تھی کہ اس پورے کورس میں انہیں ایک ہی وردی میں رہ کر اپنے علاوہ ساتھیوں کی بدبو بھی برداشت کرنی تھی۔

صبح کے اوقات میں ملنے والی یہ اذیت دوپہر میں 'کورس آفیسر' (آفیسر انچارج) کے خطاب نے لمحوں میں ہی

ہوا کردی۔ سی او کے الفاظ وانداز نے انہیں اپنے مقام و منصب کا اعادہ کروا کے نئی روح محسوس کرنے پر مجبور کردیا۔ انچارج نے انہیں واضح طور پر بتادیا تھا کہ یہ مقام ایسے افراد کا مسکن ہے جنہیں قدرت کے تخلیق کردہ ہر خطرے کا مقابلہ کرنا سکھایا جاتا ہے۔ انہیں دہشت اور موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جینا سکھایا جاتا ہے۔ یہاں کی زندگی بیرونی دنیا اور 'فوج' سے بھی بالکل مختلف ہے۔ یہاں چستی' سخت کوشی اور غیر معمولی نکتہ سے کہیں بالاتر لگن سے ہی بقاء حاصل کی جا سکتی ہے۔ یہاں کے اپنے اصول وضوابط ہیں۔ عام دنیاوی زبان میں اسے 'غیر انسانی' ہی قرار دیا جاسکتا ہے۔ یہاں کے ضوابط برداشت کر جانے والا شخص عام انسان کا درجہ بھول جاتا ہے۔ وہ ایس ایس جی کا جانباز کمانڈو بن جاتا ہے اور کمانڈو تو بنتا ہی وہی ہے جس کی برداشت اور ظرف خاص سے بھی خاص الخاص ہو۔ کمانڈو بن جانا آسان ہے لیکن کمانڈو بنے رہنا آسان نہیں ہے۔ انہیں مشکلات سے خود آگے بڑھ کر بغلگیر ہونا پڑتا ہے۔ خطرات کی پرتپش آگ میں کسی بھی سوال کے بغیر اپنا وجود جھونک دینا ہوگا۔ کمانڈو کے پاس زندگی کے صرف دو راستے ہوتے ہیں فتح یا شہادت۔ اس کے علاوہ تیسرا کوئی راستہ ہی نہیں۔ آفیسر انچارج کے یہ الفاظ آکاش کے زخمی وجود پر مسیحائی کی ٹھنڈی پھوار ثابت ہو رہے تھے۔ اس لمحہ وہ ایس ایس جی کے مخصوص نعرہ 'The Few,The Proud' کا مطلب مکمل 'معنی' کے ساتھ سمجھ گیا۔ آکاش آفتاب ربانی کروڑوں عوام میں سے ایک منتخب شدہ فرد تھا۔ اسے ایک مشکل زندگی جی کر ہی کروڑہا افراد کی حفاظت کرنی تھی۔ یہ زندگی میں سرشاری ولطف تھا اور موت کی صورت میں شہادت کا اعزاز..... ایک ابدی ومثالی زندگی حاصل کرنے کی وہ خوش قسمتی جس کے لیے بڑے بڑے جید صحابہؓ ترساں رہتے تھے۔ دونوں صورتیں ہی تو مثالی تھیں۔

آکاش آفتاب ربانی کی سماعت میں آفیسر انچارج کے الفاظ مزید رس گھولنے لگے۔ وہ اپنے خطاب کا اختتام کرتے ہوئے نہایت دبنگ انداز میں کہہ رہا تھا۔

''اونچی اونچی ناموں کی تختیاں جلا دینا
ظلم کرنے والوں کی ہستیاں مٹا دینا
موت سے جو ڈر جاؤ تو زندگی نہیں ملتی
جنگ جو جیتنا چاہو کشتیاں جلا دینا''

☆☆☆

اس یادگار مقام پر وہ جذبے بہت یادگار تھے۔ اب

کیپٹن آکاش کی شہادت کے بعد بہادری اور جرأت کی یادگار میں 'ستارہ بسالت' سے نوازا گیا۔

.....☆.....☆.....

مردان میں 'کیپٹن آکاش شہید کیڈٹ کالج' قائم کیا گیا ہے۔

.....☆.....☆.....

آکاش آفتاب زندگی کی رعنائیوں سے بھرپور تھا۔ وہ چھوٹی سے چھوٹی خوشیاں منایا کرتا۔ اس نے یوٹیوب پر ایک گانا بھی اپلوڈ کر رکھا تھا جس کے بول کچھ یوں تھے۔ جو بھی قدم اٹھاؤ گے میں یاد آؤں گا۔ جب تنہا راہوں میں جاؤ گے میں یاد آؤں گا۔

.....☆.....☆.....

واپسی کا تصور ہی شرمناک تھا۔ اگلے ہفتے فائرنگ کی خصوصی تربیت دینی شروع کی گئی۔ اب یہ تربیت تو پہلے بھی حاصل ہو چکی تھی۔ اس مرحلہ پر اعادہ کی کیا ضرورت تھی بھلا؟ نہیں! ضرورت تو تھی۔ یہ تربیت مشکل ترین حالات کے لیے سکھائی جا رہی تھی۔ اس میں استعمال ہونے والے ہتھیار نہایت غیر معمولی تھے' تکنیک مختلف تھی۔ آغاز بہرحال پسٹل فائر سے ہی ہوا اور اس مرحلہ میں آکاش کی standing position ساتھ افسران میں بہترین تھی۔

تیسرے ہفتہ کو Hell Week کے نام سے منسوب کیا جاتا تھا۔ اس کے نام میں ہی اصل معنویت پوشیدہ ہے۔ ہمت اور اعصاب کے تار اس قدر جھنجھنا جاتے کہ کسی بھی وقت ٹوٹ جانے کا خدشہ غالب آنے لگتا لیکن اسے ٹوٹنا ہی تو نہیں تھا۔ آکاش نے سرخرو ہو کر واپس جانا تھا' اسے وہ سیاہ وردی پہننی تھی جس کا سحر ایک عرصے سے اس پر طاری تھا۔ اسے اس وردی کا حق ادا کرنا تھا۔ اس ہفتے کی مشقیں اذیت کی ایک نئی انتہا تھیں۔ کمبٹ ڈریس کے ساتھ تقریباً ستر پاؤنڈ وزن لاد کر روزانہ پندرہ سے بیس کلومیٹر چلنا ایک معمولی بات تھی۔ اس مشق میں کسی چار دیواری میں جانا یا کھلے آسمان تلے سونا ان کے لیے گویا حرام تھا۔ زیر تربیت وہ افراد چلتے چلتے نیند پوری کرنے کے مجاز تھے۔ اگر ایسا نہ ہو سکے تو پھر قیلولہ کر کے اپنی یہ جبلی ضرورت پوری کرلیں۔ ایسا بھی نہیں کر سکتے تو نہ سہی پھر نیند جیسی طاقتور ترین جبلی ضرورت سے حالتِ جنگ میں ہی رہیں۔

نیند کے بعد کھانے کی طلب بھی اسی طرح ختم کر دینی

ہوتی۔ اس ہفتے کی سختیاں سہتے ہوئے آکاش کے ایک ساتھی نے کورس سے عدم رضامندی ظاہر کردینے کا ارادہ کرلیا۔ وہ اسے بھی یہی فیصلہ کرنے کی تحریک دینے لگا تو ان پہاڑیوں نے ڈاکٹر آفتاب ربانی کے اس مہذب، نفیس اور شائستہ مزاج بیٹے آکاش آفتاب کی زبان سے مغلظات کی بھرپور گھن گرج سنی۔ اس موقع پر وہ فطری مناظر اور فضائیں بالکل بھی حیران نہ تھے۔ ایک سچے اور شیر دل انسان سے کمانڈو بننے کا خواب بیچ راہ میں چھوڑ دینے کی بات بھی کردینے سے ایسی ہی تڑپ سامنے آیا کرتی ہے۔

وہ ہر ساتھی کے اس انفرادی فیصلہ پر بے پناہ افسردہ رہتا تاہم اپنی ہمت کبھی ٹوٹنے نہ دی۔ وہ ڈٹا رہا اپنے خواب کی جستجو کے اس سفر میں جتا رہا۔ زخم زخم وجود اور نیل زدہ چہرہ دیکھ کر اسے اپنے سفر کے لیے مزید تحریک ملتی تھی لیکن اسے یہ بھی علم تھا کہ قریبی خونی رشتے خاص طور پر والدین اس کی یہ حالت برداشت نہیں کرپائیں گے۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے پہلی بار چھٹی ملنے پر گھر والوں سے یہ عذر کردیا کہ افسران کی کمی کے باعث انفرادی ذمے داریاں بہت بڑھ جاتی ہیں جس کی وجہ سے وہ گھر آنے سے قاصر ہے۔ سیاہ ہوچکے رنگ، آبلہ پا وجود اور چہرے کا تبدیل شدہ جغرافیہ لیے ان کے سامنے جانا ممکن ہی نہ تھا۔ عین ممکن تھا کہ وہ کورس چھوڑ دینے کے لیے مصر ہو جاتے۔ آکاش ان کا اصرار کسی بھی قیمت پر ٹال تو دیتا لیکن اس سے بدرجہا بہتر یہی تھا کہ وہ ایسی صورت حال پیدا ہی نہ ہونے دے۔ اہل خانہ سے ملاقات مڈٹرم کی چھٹیوں میں ممکن ہوپائی۔ اس وقت تک آکاش کی جسمانی حالت میں بہتری تو آچکی تھی لیکن ٹائیفائیڈ بخار نے بہت بری طرح اپنے شکنجہ میں جکڑ لیا تھا۔ کسی بھی عمر، رنگ و نسل کا کوئی عام شہری اس حالت میں ہفتوں بستر سے ہلنے کی ہمت نہ کرپاتا لیکن ایس ایس جی کا وہ زیر تربیت کمانڈو اس بیماری میں بھی سخت جسمانی مشقیں کیا کرتا تھا۔ وہ اپنی گھریلو، زمانہ طالب علمی کی زندگی میں بارش کا شیدائی ہوتا تھا۔ آسمان پر کالی گھٹائیں چھاتے ہی والدہ سے پکوڑے کھانے کی فرمائش داغ دیا کرتا لیکن اب مزاج میں اس قدر تبدیلی آگئی تھی کہ بارش اپنے درشن نہ ہی کروایا کرے کیونکہ بھیگے ہوئے یونیفارم سمیت مشقیں کرنا زخموں کو مزید اذیت ناک بنا دیا کرتا تھا۔ بارش تو وہی تھی، گھٹاؤں سے پیدا ہونے والی ترنگ بھی وہی تھی لیکن اب وہ کوئی عام انسان نہیں تھا۔ آکاش آفتاب ربانی ایک 'منتخب' شخص تھا اور اب اس کی ترجیحات صرف اور صرف اپنی کمانڈو فورس اور پاکستان کی سلامتی تھی۔ اس ملک کی سلامتی کے لیے ہر ذاتی آرام و سکون حرام تھا۔ اس نے روانگی سے قبل والد سے ہیوی ڈوز انجیکشن لگوائے اور ادویات لینے کے بعد ٹائیفائیڈ کو پچھاڑ کر واپس لوٹ گیا جہاں عشق کے ابھی اور بھی امتحان باقی تھے۔

☆☆☆

مطلوبہ مدت گذارنے کے بعد اگلا مرحلہ پیرا کی سیکھنے کا تھا۔ زیر تربیت کمانڈوز کو اپنے مکمل یونیفارم، جوتوں اور بھاری ترین اسلحہ کے ساتھ تندی سے رواں اور کھڑے پانی میں پیراکی کے رموز کی مشق کروائی جاتی۔ آکاش کی بدقسمتی یہ تھی کہ اسی دوران اسے کان میں انفیکشن ہوگیا۔ اسے پانی سے مکمل طور پر احتیاط کرنی تھی۔ یہ صورت حال اس کے لیے بہت دل شکن تھی۔ ٹیسٹ کی حتمی تاریخ کا اعلان ہوچکا تھا۔ وہ ٹیسٹ ابھی نہ دے پاتا تو کورس مزید طوالت اختیار کرلیتا۔ ساتھیوں کو مشق میں مصروف دیکھ کر اسے مزید افسردگی ہوتی۔ ٹیسٹ کا روز اور بھی کٹھن تھا۔ اس کے سامنے سب ساتھی ایک ایک کرکے امتحان میں کامیابی حاصل کررہے تھے اور آکاش ایک کنارے پر بیٹھا خالی نظروں سے سب کو دیکھتے رہنے پر مجبور تھا۔ وہ ایک انقلابی لمحہ تھا۔ آکاش آفتاب ربانی کے وجود میں مزاحمت اور جوش کی وہی لہر اٹھی جو اس سے ناقابل یقین فیصلے کروالیا کرتی تھی۔

''میرا ابھی ٹیسٹ لے لیجیے سر!'' وہ مضبوط قدموں سے چلتا ہوا انسٹرکٹر کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

''کیپٹن! آپ کی طبیعت پہلے ہی ٹھیک نہیں ہے انفیکشن بڑھ بھی سکتا ہے۔'' انسٹرکٹر نے تحمل سے سمجھایا۔

''یہ انفیکشن میرے کرب اور اس اذیت سے زیادہ نہیں ہوسکتا جو میں فی الوقت محسوس کررہا ہوں۔''

''بلاوجہ خطرہ مول نہ لو آکاش! تھوڑے ہی وقت کی بات ہے۔ فٹ ہوتے ہی ٹیسٹ دوبارہ دے لینا۔'' ساتھیوں نے سمجھانا چاہا۔

''آج یا کبھی نہیں۔ انفیکشن ہی بڑھے گا ناں! اتنی سی بیماری سے مروں گا نہیں میں۔ مجھے یقین ہے کہ میرا رب جہاں مجھے اتنے کٹھن حالات سے گذار کر یہاں تک لایا ہے وہ مجھے ایک معمولی انفیکشن کی بھینٹ نہیں چڑھنے دے گا۔ مجھے اب کوئی یہ بھی نہ کہے کہ کافی دن سے مشق بھی نہیں کی لہٰذا ناکام ہوجاؤں گا۔ ٹیسٹ تو میں آج اور ابھی ہی دوں گا۔'' وہ اپنے مؤقف پر قائم رہا اور اجازت لے کر ہی ٹلا۔ یونیفارم

جوتوں اور اسلحہ سے لیس ہو کر وہ اپنے ہدف کی طرف لپک اٹھا۔ ناکامی اور مزید خرابی طبیعت کی پیشگوئی کرنے والے بھی ساتھیوں اور انتظامی افسران کے دعوؤں کے برعکس آکاش نے اپنے ہدف تک رسائی طے شدہ وقت سے بھی پہلے حاصل کر لی۔ آکاش آفتاب ربانی اپنی منزل کی جانب ایک قدم اور بڑھ چکا تھا۔

☆☆☆

ایس ایس جی کے اس کورس میں ٹریننگ صرف اسی تربیت گاہ تک ہی محدود نہ تھی بلکہ اس دوران انہیں سندھ کے ریگستان 'چھور' میں بھی لے جایا گیا۔ اس مقام پر انہیں ایسی صورت حال میں رکھا گیا گویا وہ کسی بیابان یا صحرا میں اپنی منزل کا نشان کھو چکے ہیں۔ اس ریگستان میں ایک لکڑی اور بوتل کی مدد سے 'پدھم' جیسے خطرناک سانپ قید کیے۔ یہ مرحلہ مکمل ہوا تو اگلی آزمائش اس سے بھی سوا تھی۔ زیر تربیت کمانڈوز کو بہتر گھنٹے نیند اور بھوک سے جنگ لڑنی تھی۔ یہ دونوں جبلی کیفیات ایسی ہوتی ہیں کہ جسمانی مزاحمت اور قوت ارادی کسی نہ کسی مقام پر مفلوج کر دیا کرتی ہیں۔ نیند اور بھوک سے نبرد آزما ان افسران کو ایک مخصوص آزمائش سے گذارا جاتا۔ ان سے ایک خصوصی انداز میں تفتیش کی جاتی تھی جس میں ان کی شناخت کے بارے میں سوالات کیے جاتے۔ کمانڈوز کو ہر ممکن طریقہ سے اپنی اصل شناخت' رتبہ اور منصب پوشیدہ رکھنا ہوتی تھی۔ بلی اور چوہے جیسے اس کھیل میں تشدد کی نت نئی لہریں انہیں چٹان کی طرح پیس کر رکھ دیتیں۔ آنکھیں اور ہاتھ پٹیوں سے باندھ کر سر کو پانی میں ڈبکیاں دلوائی جاتی ہیں۔ اسی پر موقوف نہیں مقابل کی دونوں ٹانگیں زنجیروں سے باندھ کر اوپری جانب لٹکا دیا جاتا اور عقبی سمت سے ڈنڈوں ہی نہیں بلکہ گیارہ نمبر کے خصوصی آلہ سے جسم کی کھال نہایت اہتمام سے ادھیڑنی شروع کر دی جاتی۔ اس مرحلہ سے زیر تربیت افسر کی قوت برداشت کا اندازہ ہوتا۔ اس کے بعد تفتیشی سوالات کی باری آتی۔ آکاش کا نمبر آیا تو تشدد کے مراحل سے گذارنے کے بعد اس سے شناخت پوچھی جانے لگی۔ درد سے اینٹھتے ہوئے جسم کو بل دیتے اور ہانپتے ہوئے آکاش ایک ہی رٹ پر قائم تھا کہ وہ پنجاب کی سکھ برادری سے تعلق رکھنے والا ایک معمولی ڈاکٹر ہے۔ اس کا نام تو گبر سنگھ ہے لیکن ہمدردی اور انسان دوستی سے اس قدر مالا مال ہے کہ لوگوں کا علاج مفت ہی کر دیتا ہے۔ اس کے والد البتہ ایک کسان ہیں۔ زمینوں پر اپنا خون پسینا ایک کر کے فصلیں کاشت کرتے ہیں۔ آکاش کے یہ جوابات اور ہٹ دھرمی اس کے ساتھیوں کو رشک میں مبتلا کر رہے تھے۔ اور کرتے بھی کیوں نا؟ وہ سبھی اس امتحان میں ثابت قدم نہ رہ پائے تھے۔ انہوں نے اپنی شناخت ظاہر کر دی تھی۔ دوسری جانب آکاش کا یہ عالم تھا کہ آنکھوں کے گرد گہرے حلقوں' بھوک اور نیند کی شدید طلب کے باوجود خوشگواریت اور افسران سے شرارتیں اپنے عروج پر تھیں۔

تین روز کی اس جاں گسل تربیت کے بعد ان افسران کو برہنہ پا دس کلومیٹر فاصلہ طے کر کے قلعہ تک پہنچنا تھا۔ قلعہ پہنچتے ہی ان سب نے درختوں کے پتے کھانے شروع کر دیئے۔ بہتر گھنٹے بعد خوراک کے نام پر یہ واحد شے تھی جو ان کے حلق سے نیچے اتری تھی۔ اب سوکھے چمڑے کی طرح تالو سے لگی زبان اور حلق میں پڑے کانٹے شدت سے کسی مشروب کے طلبگار تھے۔ اس کا بندوبست بھی پہلے سے کیا جا چکا تھا۔ ہر ایک افسر نے اپنے پاس موجود چوزے کا منہ سر میں لیے اسے دانتوں سے ذبح کیا اور بہتا ہوا حیوانی لہو بڑی اشتہا سے غٹاغٹ پینا شروع کر دیا۔ اس کے علاوہ ٹریننگ آفیسر نے دو بکرے بھی ذبح کروا رکھے تھے۔ ان بکروں کا خون ایک ہی تھال میں جمع کر لیا گیا اور آکاش کو سب سے پہلے یہ امرت نوش کرنے کے لیے دیا۔ جسم و جان میں توانائی پیدا ہوتے ہی آکاش نے بھی کسی درندے کی مانند چوزے کی کھال نوچ کر اتاری اور گوشت کو ہلکی آنچ پر بھون کر چٹ کر ڈالا۔ تربیت کے اس مرحلے میں انہوں نے نیام سے خنجر نکال کر زہریلے سانپ کی گردن کاٹی اور اندرونی گودا نکال کر صاف کر دیا۔ اس سانپ کو تین مزید حصوں میں تقسیم کر کے گوشت کچا کھانا تھا۔ اس موقع پر بھی آکاش نے ہی اپنے حصہ کا سانپ سب سے پہلے تناول کر کے ٹریننگ آفیسر ہی نہیں بلکہ آفیسر انچارج کو بھی بے ساختہ توصیفی کلمات ادا کرنے پر مجبور کر دیا۔ حیوانی گوشت اور لہو سے میدان جنگ میں بقاء حاصل کرنے کے یہ اسرار و رموز سیکھنے کے بعد انہیں دشمن کے علاقہ میں بھیس بدل کر رہنے اور خود کو تفویض کردہ کام مکمل کرنے کی اہلیت کا مظاہرہ کرنا تھا۔ اس مرحلے کو 'گوریلا وار فیئر' کا نام دیا گیا تھا۔ آکاش کو ملنگ بننے کا ہدف ملا ہوا تھا۔ اس کی مہارت اور تکنیکی خوبصورتی کا یہ عالم تھا کہ وہ دن بھر پھٹے پرانے کپڑوں میں عوام کے درمیان رہتا۔ اسی دوران ایک روز وہ کسی ہوٹل میں کھانا کھانے میں مصروف تھا کہ اسے ٹریننگ آفیسر کے راؤنڈ پر آنے کی اطلاع ملی۔ آکاش نہایت سکون و اطمینان سے اٹھا

اور سڑک کے عین وسط میں جا بیٹھا۔ اس کی اداکاری لاجواب تھی۔ ٹریننگ آفیسر کی گاڑی آتے ہی وہ اٹھا اور اسے رکوا کر دیوانوں کی گوگنوں سی زبان میں بے معنی الفاظ بولنے شروع کر دیئے۔ ٹریننگ آفیسر نے اسے حقیقی پاگل سمجھتے ہوئے خیرات کے پیسے تھمائے اور گاڑی آگے بڑھا دی۔ اس کے جانے کے بعد بھی آکاش کی اداکاری میں رتی بھر فرق نہ آیا۔ وہ دن بھر اپنے اس حلیہ اور انداز سے تقریباً پانچ سو کما لیا کرتا تھا جس کے بعد شام ڈھلے لذیذ پکوان کھا کر خوب لطف اندوز ہوتا۔

☆☆☆

ایس ایس جی کے اس نو ماہ تربیتی عرصہ میں آکاش کا کسی نہ کسی طور پر ایلخانہ سے مواصلاتی رابطہ برقرار رہتا تھا۔ کورس کے اختتامی ہفتہ کے دوران اس کے عزیز از جان خالہ زاد بھائی کی شادی آ پہنچی۔ آکاش مہندی اور برات پر تو شریک نہ ہو سکا البتہ ولیمہ میں شمولیت کا ایک رستہ نکال ہی لیا۔ ولیمہ والے روز ان کی پچاس میل طویل دوڑ کا ایک ٹیسٹ تھا۔ دن بھر اور پھر ساری رات ان کمانڈوز نے دوڑتے ہوئے گذاری۔ ٹیسٹ ہوتے ہی باقی سب تو اپنے کمروں میں ہوش وحواس سے بیگانہ ہو کر سو گئے لیکن آکاش نے اس مختصر مہلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بذریعہ بس ولیمہ پر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے والدہ کو کچھ روز پہلے ہی سوٹ ساتھ لانے کا کہہ رکھا تھا۔ گھر آمد سے پہلے کسی حمام میں غسل کرنے کے بعد چہرے کا فیشل کروایا اور تیار ہو کر ارسلان کے پاس جا پہنچا۔ وہ حسب توقع آکاش سے بہت خفا تھا۔ آکاش نے خوشدلی سے معذرت کر لی۔ اس کے تر و تازہ چہرے، مسکراتی ہوئی چمکدار آنکھوں اور لبوں پر پھوٹتی ہنسی سے کسی کو اندازہ نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ کس قدر جاں گسل لمحات سے گذر کر یہاں تک آیا ہے۔ کھانا کھاتے ہی اس نے اپنی روانگی کے متعلق ساجدہ کو مطلع کیا اور ان کے پیار بھرے گلے شکووں کو اپنی محبت سے ٹال کر اپنی اسی دنیا میں واپس چلا آیا جہاں کا ہر ایک لمحہ اسے اپنے خواب اور منزل سے نزدیک تر کر رہا تھا۔

بیس دسمبر 2013 کا وہ روشن دن آکاش آفتاب ربانی کے خوابوں کی حسین ترین تعبیر لیے طلوع ہوا۔ اس روز ایس ایس جی کمانڈوز کی پاسنگ آؤٹ پریڈ تھی۔ ڈاکٹر آفتاب، ساجدہ، لویل اور دانش وقت سے پہلے ہی وہاں پہنچ گئے۔ پاسنگ آؤٹ پریڈ کے مناظر نا قابلِ بیان سرشاری تھے۔ پریڈ کے اختتام پر کمانڈوز سے حلف نامہ پر انہی کے خون سے مہر لگوا کر ملک وقوم کے لیے قربانی کے جذبہ سے سرشار رہنے اور کسی بھی قیمت پر فرض کی ادائیگی کا حلف لیا گیا۔ آکاش اس مقام کو بہت نہارتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ یہاں بیتے کٹھن شب و روز اب ایک مسکراہٹ اور یادگار جذبہ میں ڈھل چکے تھے۔ وہ اپنے والدین کو ایک ایک کونے پر بکھری یادوں سے متعارف کرواتا وسیع ہال نما کمرے میں لے گیا۔ اس کمرے کی دیواریں ایس ایس جی کے شہداء کی تصاویر سے آراستہ تھیں۔ وہ ایک تصویر کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اس کے تنے ہوئے وجود آنکھوں سے چھلکتے جذبوں اور دل و دماغ میں برپا اضطراب ایک ہی دعا میں مگن تھا کہ کاش اس تصویر کے بعد کیپٹن آکاش آفتاب ربانی کا نام بھی اس عظیم فورس کے شہید کمانڈوز کے ساتھ شامل ہو جائے۔ دل میں ارمانوں کی جوت جگائے وہ بیس روزہ چھٹی پر گھر چلا آیا جہاں یادگار وقت گذارنے کے بعد اسے اپنی ڈیوٹی پر تبیلا منقل ہو جانا تھا۔

☆☆☆

2014ء کا ایک تہائی حصہ مکمل ہو چکا تھا۔ ملکی حالات تشویشناک حد تک خراب تھے۔ خودکش بم دھماکے، فسادات، انتشار اور بے یقینی کی کیفیات کا دور دورہ تھا۔ ملکی تاریخ کی چھ دہائیوں سے زائد سفر میں ایسا پہلے صرف ایک بار ہوا تھا جب حالات سرحدوں پر نہیں بلکہ ملکی حدود میں درگرگوں تھے۔ اس وقت بھی یہ مسائل اس حد تک بڑھ گئے تھے کہ ملک دو حصوں میں تقسیم ہو کر رہ گیا اور اب بھی کم و بیش ایسی ہی صورت حال پیدا کر دی گئی تھی۔ قاتل و مقتول، ظالم و مظلوم کا تعلق کلمہ کی ڈور سے ہی تھا۔ دشمن اپنائیت و منافقت کے نقاب تلے پوشیدہ فضائیں اور دل زہر آلود کر چکا تھا۔ حالات بالکل ہی بے قابو ہوئے تو حسب روایت ملک کے بااعتماد ترین ادارہ 'فوج' کی طرف نظریں جمالی گئیں۔ اس وقت صرف یہی پُرخلوص اور سرفروش ادارہ ملک کو بدترین بحران سے نکال سکتا تھا۔

ساجدہ کی شب و روز یہی دعا تھی کہ آپریشن کی نوبت نہ آئے اور مذاکرات کے ذریعہ ہی یہ مرحلہ خوش اسلوبی سے طے ہو جائے لیکن ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔ ان دنوں وہ آکاش سے ملاقات کے لیے آئی ہوئی تھیں۔ بیٹے کے ساتھ یادگار وقت گذاری کرتے ہوئے اچانک ہی اطلاع ملی کی شر پسند عناصر کے خلاف آپریشن کی منظوری کے بعد آکاش کی یونٹ کا انتخاب بھی کر لیا گیا ہے۔ انہیں ایک روز بعد آپریشن کے لیے بہر صورت روانہ ہونا تھا۔

''میری پیاری امی! فکر کیوں کرتی ہیں۔ ایسے آپریشنز تو ہوتے ہی رہتے ہیں اور ہم جیسے جوان سلامتی سے واپس بھی

آجایا کرتے ہیں۔'' اس نے بھرپور تسلی دی۔

''کاشی! میرے بچے..... تم.....'' ساجدہ کے لب کپکپا گئے۔

''امی جی! میں آپ کا بچہ ہوں۔ آپ میری سلامتی کے لیے فکرمند رہتی ہیں۔ یہ سب باتیں بالکل بجا.... لیکن یہ شرپسند عناصر اور دہشت گرد ہمارے ملک کے طول وعرض میں درندگی پھیلا کر ہزاروں معصوم بچوں کو موت کے گھاٹ اتارتے ماؤں کی گود اجاڑ رہے ہیں۔ ان ماؤں کے بارے میں بھی تو ایک ماں ہی بن کر سوچیے ناں! دہشت گردی کی اس آگ کا ابھی خاتمہ نہ کیا گیا تو اس کی لپٹیں ہمارے گھروں تک چلی آئیں گی۔ خدانہ کرے یہ گلشن ان شعلوں کی زد میں آ جائے۔'' آکاش کے ہر ایک لفظ سے متفق ہونے کے باوجود ساجدہ اپنی ممتا کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس کی فکر کرنا چھوڑ ہی نہیں سکتی تھیں۔ وہ اس کی بحفاظت واپسی کے لیے دعا گو تھیں۔ آنسو کسی ندی کی طرح بہہ رہے تھے۔

''آکاش! اگر تم چاہو تو میں تمہیں میڈیکل سرٹیفکیٹ بنا دیتا ہوں۔ تمہاری امی کی حالت سنبھل جائے تو بے شک پھر چلے جانا۔ ابھی رک جاؤ!'' ڈاکٹر آفتاب نے سنجیدگی سے تجویز دی۔

''کیا ابو جی؟ اتنی طویل جدوجہد کے بعد تو خود کو ایسے ہی کسی موقع کے لیے تیار کیا تھا۔ اس وقت وطن کو میری ضرورت ہے تو میں جھوٹ کا سہارا لے کر جنگ سے پیٹھ پھیرتا اچھا لگوں گا کیا؟ آپ ایک بزدل کے والدین کہلائے جانا پسند کریں گے کیا؟ تربیتی کیمپ کی ان تاریک' سرد سنگلاخ پہاڑیوں میں اپنے بدن پر لگنے والی ہر ایک ضرب' ہر ایک آبلے اور بہتے لہو کی ہر ایک بوند سے وعدہ کیا تھا کہ میں مٹی کا قرض چکاؤں گا۔ اب اس موقع پر وعدہ خلافی کرلوں کیا؟'' اس نے والدین کو مکمل طور پر گھیر لیا۔ ان حقائق کے سامنے مزید انکار یا اصرار کی تاب کسی میں بھی نہ تھی۔ آکاش آفتاب ربانی اپنے والدین' بھائی اور بہن کی دعاؤں کے سائے میں شمالی وزیرستان کے اس مقام پر روانہ ہو گیا جہاں دہشت کا راج تھا اور گلی کوچوں میں گولہ بارود کی تال پر موت ہمہ وقت رقص کرتی دکھائی دیتی تھی۔

☆☆☆

ان دنوں شمالی وزیرستان شرپسند کارروائیوں کا 'ہیڈ کوارٹر' بن چکا تھا۔ یہاں دہشت گردوں کی محفوظ پناہ گاہیں موجود تھیں۔ حکومتی احکامات کی رتی بھر بھی کوئی اہمیت نہ تھی۔

دہشت' ہتھیار اور ذاتی پسند ناپسند ہی سب سے بڑا قانون تھا جسے وہ عناصر خود ہی لاگو کرتے اور پھر خود ہی اپنے احکامات پر عمل درآمد کرواتے۔ اسلحہ اور بارودی مواد اشیائے خورد و نوش سے بھی زیادہ تعداد میں نظر آتا۔ کسی معمولی سی دشمنی' نظریاتی اختلاف' حکومتی اہلکاروں یا غیر ملکی افراد سے کیا جانے والا سلوک انسانیت سوزی کی بدترین مثال ہوتا تھا۔ وہ اپنے دشمنوں کو عید قربان کے جانوروں سے بھی زیادہ اہتمام سے ذبح کرتے اور اس سارے عمل کی ویڈیوز انٹرنیٹ کے ذریعہ دنیا بھر میں پھیلا دی جاتیں... اور یہی دشمنان وطن چاہتے تھے تاکہ پاکستان ہی نہیں پوری امت مسلماں کو بدنام کیا جا سکے۔ بیرونی ممالک میں انسانی سروں سے فٹبال کھیلے جانے کے مناظر' قصاب کی دکانوں کے باہر لٹکے سر بریدہ جانوروں کی طرح انسانی لاشیں دیکھ کر عالمی سطح پر پاکستان کا تاثر بے حد منفی اور بھیانک ہو چلا تھا کیونکہ غیر ممالک میں باہر سے آئے ان دہشت پسندوں کو پاکستانی سمجھا جاتا تھا۔ اس علاقے پر قابض ان مخصوص عناصر نے زیر زمین عقوبت خانے بنا رکھے تھے۔ ان کے 'دشمنوں' پر کیا جانے والا تشدد اس قدر بھیانک ہوتا تھا کہ وہ خود اپنی زبان سے موت طلب کرتے پروردگار سے اپنی یہ مشکل آسان کر دینے کی دعائیں مانگتے۔ موت' دہشت اور بربریت کے اسی کھیل میں اپنی اننگز کھیلنے کے لیے کیپٹن آکاش یونٹ کے ہمراہ کوچ کر گیا۔

ان کا ابتدائی قیام علاقے کے سرکٹ ہاؤس میں تھا۔ آپریشن کا آغاز تا حال نہیں ہوا تھا۔ یونٹ کے جوان اپنے اہلخانہ سے مواصلاتی رابطہ برقرار رکھے ہوئے تھے۔ وقت گذاری کے لیے فٹ بال کھیلنے کے علاوہ دوسری یونٹوں کے سپاہیوں کو خصوصی مشقیں کروائی جاتیں۔ آنے والے دنوں کا تصور ان کا لہو گرمائے ہوئے تھا۔ وطن عزیز میں پھیلے اس ناسور کا خاتمہ کرنے کے لیے رگوں میں چنگاریاں دوڑتیں۔ ان کے سامنے فتح یا شہادت کے سوا کوئی رستہ نہ تھا۔ وقت تیز رفتاری سے گذرتا رہا۔ چند روز بعد اعلیٰ سطح پر آپریشن کی منصوبہ بندی اور منظوری کے مراحل مکمل کر لیے گئے۔ اس عسکری کارروائی کو 'ضربِ عضب' کا نام دیا گیا۔ اس نام کی بڑی خصوصی وجہ تھی۔ عضب کا مطلب ہے 'تلوار سے کاٹنا'۔ سرور کائنات ﷺ کی تلوار کا نام بھی عضب ہی تھا۔ ضرب عضب (کاٹ ڈالنے والی ضرب) کے ذریعہ وہ اس ناسور کا قلع قمع کر دینا چاہتے تھے۔

اس موقع پر پہلی کارروائی کا ذمہ آکاش کی یونٹ کو ملا

تھا۔ ابتدائی طور پر آرٹلری نے باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت گولہ باری سے ایسے مکانات ڈھیر کردیئے تھے جہاں شرپسند عناصر کی موجودگی کا ہلکا سا بھی شبہ پایا جارہا تھا۔ آکاش کی یونٹ نے سب سے پہلے میران شاہ کی طرف بڑھ کر اس علاقہ کی 'تطہیر' کرنی تھی۔ حکومت کی جانب سے ملنے والے احکامات کے تحت عوام نے اپنی رہائش گاہیں خالی کرکے محفوظ علاقوں میں نقل مکانی کرلی۔ سنسنی خیز گھڑیاں اب قریب سے قریب تر آرہی تھیں۔ اس انتہائی خطرناک مقام پر ان جوانوں کی جانب سے اسنائپرز تعینات کرکے اپنے ارادوں کو عملی جامہ پہنانا شروع کردیا۔ دشمن کی جانب سے پہلی نقل وحرکت بارہ جون کو دیکھنے میں آئی۔ اصولی طور پر آکاش نے فوری طور پر سی او کو منتقل کرنا تھا اور اس نے ایسا ہی کیا۔ سی او نے اسے حالات کے مطابق کوئی بھی فیصلہ کرنے کی اجازت دے دی۔ آکاش کی رگوں میں لہو کی بجائے بجلیاں دوڑنے لگیں۔ اس نے ایک دہشت گرد کی موجودگی بھانپ لی تھی۔ اس کے اشارے پر اسنائپرز نے تین ساتھی فوراً مار گرائے۔ مقابل کیمپ میں بوکھلاہٹ اور انتشار لازم تھا۔ ردِعمل کے طور پر انہوں نے بھی فائرنگ کا آغاز کردیا۔ آکاش نے مختلف مقامات پر جوان متعین کیے جو نہایت مہارت سے دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتارنے لگے۔ آپریشن ضرب عضب کی اس پہلی کارروائی نے ہی دشمن کے کیمپ میں صف ماتم بچھادی۔ کیپٹن آکاش اور یونٹ کے جوان اس وقت تک وہیں ڈٹے رہے جب تک وہ شرپسند عناصر پسپا ہوکر اپنی کمین گاہوں میں دبکنے پر مجبور نہ ہو گئے۔ جنگ کا میدان گرم ہوچکا تھا۔ اب خاموشی' سکون' آرام یا بے فکری کا کوئی پل میسر نہیں آسکتا تھا۔ اب تو بس آگے بڑھ کر اس علاقے کی 'تطہیر' کرنی تھی۔

اسی دوران انہیں خبر ملی کہ مقابل کا ایک اہم کمانڈر اپنے خصوصی اہلکاروں سے ملاقات کے لیے آرہا ہے۔ مذکورہ کمانڈر کی موت فوج کے ابتدائی اہداف میں سے ایک تھی۔ اس موقع سے فائدہ نہ اٹھانے کی حماقت وہ کسی بھی صورت نہیں کرسکتے تھے۔ ایک خصوصی اجلاس میں اعلیٰ عہدیدار سر جوڑ کر بیٹھ گئے اور قرعہ فال کیپٹن آکاش کے نام نکل آیا۔ آکاش کے لیے تو یہ موقع بلی کے بھاگوں چھیکا ٹوٹنے جیسا تھا۔ وہ تو پہلے ہی خطرات میں کودنے اور دشمنوں کو اپنے وجود پر شرمندہ کرنے کے لیے تیار تھا۔ اس نے فوری منصوبہ بندی تشکیل دی اور اپنے ہمراہ ایک اسنائپر لیے طے شدہ مقام پر پہنچ گیا۔ اسنائپر اس کے حکم پر زمین پر لیٹ گیا۔ آکاش نے خود اس کے ہتھیار کے پیچھے اپنی پوزیشن سنبھالی ہوئی تھی۔ انہیں زیادہ دیر انتظار نہ کرنا پڑا۔ کمانڈو کی گاڑی جلد ہی ان کے سامنے موجود تھی۔ اس کے ساتھ تین محافظ بھی تھے۔ آکاش کے لبوں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔ موت کا کاروبار کرنے والے یہ افراد خود اپنی حفاظت کے لیے کس قدر فکرمند تھے۔ کمانڈر نے گاڑی سے باہر قدم ہی رکھا تھا کہ آکاش کے ہتھیار سے نکلنے والی گولی نے اسے عدم کا پروانہ تھمادیا۔ اسنائپر نے تینوں محافظوں کو پل بھر میں ہی ان کے آقا کے ساتھ سفر پر روانہ کردیا۔ کیپٹن آکاش کے اعلیٰ افسران اس کی مہارت' منصوبہ بندی اور کامیابی پر اش اش کر اٹھے۔ انہیں اپنے دشمن کی عیاری اور کم ظرفی کا اچھی طرح علم تھا۔ شرپسند عناصر کو بھی یہ حقیقت بخوبی معلوم تھی کہ دنیا کی اس بہترین فوج کا زیادہ دیر مقابلہ کرنا ان کے بس کی بات ہی نہیں تھی اسی لیے انہوں نے متبادل انتظامات کے طور پر اوچھے ہتھکنڈے تیار کر رکھے تھے۔ وہ اپنی موت یا پسپائی کی صورت میں بھی فوج کا ہی نقصان کرنا چاہتے تھے۔ اسی مقصد کے لیے اس علاقے میں ذاتی ٹھکانوں کے علاوہ مساجد' مدارس' شفاخانوں اور دکانوں تک میں improvised explosive devices نصب کروا رکھی تھیں۔ یہ دیسی ساختہ بم ہلاکت خیزی اور تباہی میں اپنی مثال آپ تھے۔ صرف چھونے سے ہی پھٹ جاتے۔ فوجی دستوں کے لیے یہ ایک کٹھن صورتِ حال تھی۔ آکاش ایسے کسی بھی موقع پر خود آگے رہتا۔ اس کے لیے اپنے جوانوں کی حفاظت اپنی ذات سے بھی زیادہ اہم تھی۔ کسی بھی احاطہ میں داخل ہونے سے پہلے وہ داخلی دروازے یا کسی دوسری جگہ کی بجائے دیوار اڑا دینے کو ترجیح دیتے۔ اس کے بعد اپنی جان ہتھیلی پر رکھے آگے بڑھتے چلے جاتے۔ اس مرحلہ پر انہیں اہلخانہ یاد ہوتے' نہ ہی کوئی عزیز و اقارب یا دلی رشتہ۔ ان کے پیشِ نظر صرف اور صرف ملکی سلامتی اور دشمن کو جہنم واصل کرنا ہوتا تھا۔ ان چھوٹے چھوٹے اہداف کو کامیابی سے نمٹالیا تو انہیں 'آدم خور بازار' اپنے قابو میں کرنے کا حکم ملا۔

آدم خور بازار اس علاقہ میں بربریت اور سفاکی کا دوسرا نام سمجھا جاتا تھا۔ ازبک علاقوں سے آئے شرپسندوں نے اسے اپنا خصوصی ٹھکانہ بنا رکھا تھا۔ ظالم ہمیشہ بزدل ہی ہوا کرتا ہے اور یہ ازبک دہشت گرد بھی بزدل ہی تھے۔ وہ ایس ایس جی کمانڈوز اور پاک فوج کی جانبازی کا زیادہ دیر مقابلہ نہ کرسکے۔ آدم خور بازار ان کی موجودگی سے پاک ہوگیا۔

افواج نے ieds بنانے والے کارخانے تلاش کر لیے۔ ان کارخانوں میں ہزاروں کلو بارودی مواد مستقبل میں 'ملکی حالات' کا ایک چھوٹا سا عکس دکھانے کے لیے کافی تھا۔ اسلحہ ایسا جدید کہ کمانڈوز بھی دیکھ کر حیران ہوا کرتے۔ فوج کے پاس ایسا اسلحہ موجود ہی نہ تھا۔ بازار کی تلاشی کے دوران حساس معلومات پر مشتمل کاغذات ملے۔ یہ معلومات اگلی کارروائیوں کا پیش خیمہ تھیں۔ بازار کے بعد ایک رہائشی کالونی میں ایسا مدرسہ اپنے قبضہ میں کرنا تھا جہاں ملک گیر تباہی کے لیے دہشت گردوں کی فوج تیار ہوتی تھی۔ کچے ذہن کے مالک افراد کو یہاں لانے کے بعد انہیں اپنے 'نظریات' سکھائے جاتے۔ اسلحہ کا استعمال' ieds بنانے کا طریقہ' خودکش جیکٹس کی تیاری' استعمال کے بعد شہادت کا رتبہ پا کر جنت کا باطل تصور ان کے ذہنوں میں ٹھونسا جا رہا تھا۔ یہاں ایسے نوجوانوں کی مکمل کھیپ تیار کی جاتی تھی جو ان آقاؤں کے ایک اشارے پر اپنے سگے خونی رشتوں کو موت کے گھاٹ اتار دینے پر تیار ہو جاتے تھے۔ ملکی حالات میں انتشار پیدا کرنا تو ان کے لیے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ پچیس کمروں پر مشتمل اس مدرسہ کی عمارت کسی بھی عام رہائشی علاقہ کی درجنوں عمارتوں سے بھی بڑی تھی۔ ہر ایک کمرا ieds سے آراستہ تھا۔ کیپٹن آکاش کی قیادت میں ایک ٹیم نے کمروں سے بم برآمد کر کے ناکارہ بنائے' کئی ہزار ٹن بارودی مواد' گمراہ کن لٹریچر' خودکش جیکٹس' دستاویزات اور مستقبل قریب میں مختلف پاکستانی علاقوں کی تباہی کے منصوبے عیاں کرتے نقشے اپنے قبضے میں لیتے ان سبھی جوانوں نے اپنی جان ہتھیلی پر رکھی ہوئی تھی۔ ایک لمحے کی غلطی' اندازے کی کوئی کوتاہی یا کسی غلط سمت میں حرکت سروں پر منڈلاتی موت کو انہیں دبوچنے کے لیے مدعو کر دیتی۔ مدرسہ پر قبضہ کا مرحلہ کسی بھی جانی نقصان کے بغیر کامیابی سے مکمل ہوا۔ اب اگلی باری اس کمانڈر کے احاطہ کو زیر کرنا تھا جس نے ماضی قریب میں کراچی سمیت سندھ کے کئی علاقوں میں اہم تنصیبات کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا رکھا تھا۔ مذکورہ احاطہ 313 بریگیڈ کے نام سے مشہور' دہشت پسندوں کا تربیتی مرکز اور ایک منفرد طرز کا زیر زمین عقوبت خانہ بھی تھا۔ اپنے نظریہ اور مقصد کی حفاظت کے لیے خواتین اور بچوں کو اغوا کر کے شرمناک مظالم روا رکھے جاتے۔ انہیں زندہ رکھنے کے لیے تاوان وصول کیا جاتا۔ 313 بریگیڈ پر قبضہ سابقہ اہداف سے زیادہ مشکل تھا۔ گذشتہ مہمات میں دشمن کا خاتمہ پہلے ہی ہو چکا تھا اور عمارات کو اپنے تسلط میں کرنا تھا۔ اس بار دشمن بنفس نفیس


ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

سرما کی ابتدائی نرمیاں
اکتوبر کی خمار آلود کہانیاں

**اولین صفحات**

پیمانۂ محبت کے جام میں ڈوبی کہانی کے نشیب و فراز..... بہکتے قدموں، لرزتے ہاتھوں زندگی کو تمام کر دینے والے کرداروں کی داستان عشق.....

**زویا اعجاز** کے قلم سے

**انا گیر**

سنہری ریت کے سرابوں میں بھٹکتے خوابوں کے سوداگر کی دل فگار داستان ..... **امجد جاوید** کے زور آور قلم کا امتحان .....

**الاؤ**

مسیحاؤں کے بھیس میں شاطر مجرموں کا کھیل..... زندہ انسانوں کے لیے دہکتے الاؤ کی صورت موت تیار کی جا رہی تھی ... **ڈاکٹر عبدالرب بخشی** کے قلم سے نیا سنسنی خیز سلسلہ

**سروں کے رنگ**

**پہلا رنگ**

ساز پر خوشی کے نغمے گونجتے ہیں..... مگر وہ ساز مرگ تھا..... چشم تر میں بھیگی کہانی

**دوسرا رنگ**

اغوا ہو جانے والے خاندان کی سنسنی خیز کہانی کے حیرت انگیز موڑ

**چٹی لکھ چٹی**

آپ کے تبصرے... مشورے... محبتیں... شکایتیں... اور نئی نئی دلچسپ باتیں... کتھائیں

وہاں ان کا استقبال کرتا جس کا مطلب یقینی موت کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔

کیپٹن آکاش نے اعلیٰ عہدیداران کے اعتماد کو خوش دلی سے قبول کیا۔ اس نے اپنی مدد کے لیے چند دوسرے دستے بھی طلب کر لیے۔ کارروائی کا آغاز حسب سابق ایک دیوار اڑانے کے بعد کیا گیا۔ آکاش کے ساتھ موجود دستوں نے منصوبہ کے مطابق آگے بڑھنا اور ایک دوسرے کو 'کور' کرنا شروع کر دیا۔ ان کی آمد پر دشمن نے اپنے اسلحہ کی نمائش میں گھنٹوں تک فائرنگ کی۔ آکاش نے اپنے جوانوں کو بلاوجہ گولہ بارود ضائع کرنے سے منع کر رکھا تھا۔ ان کے پاس دشمن کی طرح اندھا دھند ذخیرہ نہیں تھا۔ ان کے اسلحہ کی ایک ایک گولی کروڑوں عوام کا خون پسینا تھی جسے وہ کامیابی سے استعمال کرنا چاہتے تھے۔

موت کا رقص شروع ہو چکا تھا۔ دستوں کے جوان جانتے تھے کہ دشمن کی اس فائرنگ سے ieds کسی بھی وقت پھٹ سکتے تھے۔ وہ کسی سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح اپنی جگہ اور اپنے مضبوط ارادوں پر قائم تھے۔ آکاش نے اپنی حکمت عملی کے تحت فائرنگ رکوا دی۔ وہ مقابل کو اپنے فرار کا تاثر دینا چاہتا تھا۔ اس کے بعد جب وہ ذرا سی بھی حرکت کرتے تو ان پر فائر کھول دیئے جاتے۔ یہ حکمت عملی کامیاب ثابت ہوئی۔ تھوڑی ہی دیر میں وہاں لاشوں کے ڈھیر لگ گئے۔ آکاش نے ستونوں کی آڑ میں اپنے جوانوں کو آگے بڑھایا اور ایک ٹیم کو بم ناکارہ کرنے کی ذمے داری سونپ دی۔ یہ مرحلہ مکمل کرنے میں کافی وقت صرف ہوا۔ اس کے بعد وہ اس کمرے کی جانب بڑھنے لگے جہاں دہشت گردوں نے کمین گاہ بنا رکھی تھی۔ آکاش کے خفیف اشارہ پر ایک جوان نے ٹانگ مار کر دروازہ کھولا اور فوراً ایک آڑ میں ہو گیا۔ مقابل کی طرف سے خاموشی کے سوا کوئی ردِعمل سامنے نہ آیا۔ آکاش نے اس خاموشی کو فوراً 'ڈی کوڈ' کر لیا اور دبنگ انداز میں بولا۔

''ہتھیار پھینک دو گے تو جان بچا لو گے ورنہ ہماری گولیاں تمہارے لہو سے پیاس بجھانے کے لیے بے تاب ہیں۔''

اس اعلان کے نصف منٹ بعد ہی پانچ افراد ہاتھ اٹھائے باہر نکل آئے۔ آکاش نے فوری ردِعمل سے گریز ہی کیا۔ ان کے پاس خودکش جیکٹ یا کوئی بھی بارودی مواد ہو سکتا تھا۔ دو جوانوں نے ان کا مکمل معائنہ کیا اور اسلحہ کی برآمدگی کے بعد ہتھکڑیوں میں جکڑ لیا۔ کسی بھی تاخیر کے بغیر یہ دہشت گرد پاک فوج کے حوالے کر دیئے گئے۔ آکاش اب باقی کمروں کی 'تطہیر' کی جانب متوجہ ہو چکا تھا۔ مشکلات میں کمی کی بجائے لمحہ بہ لمحہ اضافہ ہی ہو رہا تھا۔ توپ خانہ کی گولہ باری سے وہاں بجلی کا نظام تباہ ہو چکا تھا۔ شام ہوتے ہی بقیہ آپریشن میں اندھیرے نے رکاوٹیں حائل کرنی شروع کر دیں۔ سوچ بچار کے بعد رات وہیں بسر کرنے کا منصوبہ بنایا گیا۔ دن بھر کی اعصاب شکن کارروائی کے بعد رات بھی کسی کڑے امتحان سے کم نہ تھی۔ ایک ٹیم نے نیند پوری کرنی تھی تو دوسری پہریداری پر مامور ہوتی۔

اگلی صبح بظاہر کامیابی کی مکمل نوید ثابت ہوئی۔ وہاں سے ملنے والی دستاویزات رونگٹے کھڑے کر دینے کے لیے کافی تھیں۔ اس کے باوجود دشمن ہار ماننے کے لیے تیار نہ تھا۔ عمارت کے مکمل تسلط کے بعد جوانوں کی نیند کے دوران انہوں نے بھاری بھرکم تعداد میں ایک بار پھر ہلہ بول دیا۔ آکاش اور اس کے جوانوں نے بڑے منظم انداز میں اپنی پوزیشنز سنبھالیں اور اندھا دھند فائرنگ کا جواب اپنے مخصوص انداز میں دینے لگے۔ اس دوطرفہ فائرنگ میں ایک جوان کی ٹانگ بری طرح زخمی ہو گئی۔ آکاش نے بلا تاخیر گولیوں کی اس بوچھاڑ کے باوجود کسی نہ کسی طرح آڑ لیتے ہوئے اسے محفوظ مقام تک پہنچا دیا تاکہ وہ ابتدائی طبی امداد حاصل کر سکے۔ اس زخمی کے علاوہ وہ دیگر کسی بھی نقصان سے محفوظ رہ کر دشمن کو شدید ضربات لگانے میں کامیاب ہوئے تھے۔ اعلیٰ انتظامیہ آکاش کی اس کارکردگی پر بے حد خوش اور مطمئن تھی۔

☆☆☆

313 بریگیڈ کے بعد اگلا ہدف ایک زیرِ زمین لیبارٹری کا تسلط تھا جہاں جدید اسلحہ' ieds' خودکش جیکٹس اور میزائل تک تیار ہوا کرتے۔ جوان دو روزہ آرام کے بعد بھرپور تازہ دم ہو کر میدان میں اترے۔ اس بار خطرہ پہلے سے بھی زیادہ تھا کیونکہ کسی بھی غلطی کی صورت میں بارودی مواد ان کے پرخچے اڑا دیتا۔ لیبارٹری میں رات گئے تک پاک فوج کے یہ جوان اور کمانڈوز آپریشن کرتے رہے۔ دشمن نے ایک بار رات کی تاریکی کا فائدہ اٹھا کر ہلہ بولنے کی کوشش کی تاہم بھرپور خاطر تواضع کے بعد اپنے زخمیوں کو سنبھالتے پسپا ہونے پر مجبور ہو گئے۔ اگلے روز لیبارٹری مکمل طور پر ان کے قبضے میں آ گئی۔ برآمد شدہ دستاویزات اس قدر اہم تھیں کہ کیپٹن آکاش کی کمپنی کو حکومتی سطح پر بہت پذیرائی ملی۔

اس کے بعد بٹ مارکہ تسخیر کرنا تھا۔ یہ دشمن کا اہم

ترین تربیتی مرکز تھا۔ اسلحہ اور دیگر گولہ بارود کی تربیت بھی یہیں فراہم کی جاتی۔ اس آپریشن کی کمانڈ میجر طارق نعیم کے پاس تھی۔ انہیں کیپٹن آکاش کی صلاحیتوں پر مکمل اعتماد تھا۔ ان کے کہنے پر آکاش نے علاقہ کی اچھی طرح 'ریکی' کی اور خطرات سے بغلگیر ہو کر انہیں صفحۂ ہستی سے ہی مٹا دیا۔ اس آپریشن میں پاک فوج کے صرف تین جوان زخمی ہوئے۔ اس ناقابل یقین کامیابی سے جوانوں کے حوصلے آسمان چھونے لگے۔ کیپٹن آکاش بہادری' معاملہ فہمی اور کامیاب قیادت کی مثال بنتا جا رہا تھا۔

بٹ مارکہ کے بعد میران شاہ کا بازار 'رزمک اڈا' کی طرف پیش قدمی ہوتی۔ کمپنی کمانڈر، کیپٹن آکاش کو کچھ دن اعصابی سکون اور آرام فراہم کرنا چاہتا تھا۔ یہ ذمے داری کسی اور کمانڈر کو سونپنے کی تیاریاں کی جا رہی تھیں۔ آکاش کو یہ خبر ملی تو وہ تڑپ ہی اٹھا۔ اس نے فوری طور پر کمپنی کمانڈر سے اگلے سبھی آپریشنز اس کے سپرد کر دینے کی التجا کر دی۔ کمپنی کمانڈر نے اسے گذشتہ پانچ آپریشنز کے بعد ذہنی دباؤ کو پُرسکون کرنے کی تلقین کی، بصورت دیگر وہ تھکاوٹ میں بھی مبتلا ہو سکتا تھا لیکن آکاش کا ایک ہی مؤقف تھا کہ وہ یہاں آرام کرنے کے لیے نہیں آیا ہے۔ یہ وقت تو فوج اور ایس ایس جی کی خصوصی تربیت کا قرض چکانے کا تھا۔ ارض پاک پر کٹھن ترین وقت تھا ایسے حالات میں وہ فرض کی پکار پس پشت ڈالتا تو یہ قرض کیونکر ادا ہو پاتا۔ کمپنی کمانڈر اس کے جذبات سے بخوبی واقف ہی نہیں بلکہ قدر دان بھی تھا۔ اس نے آکاش کو قیادت کی اجازت دے دی۔

دہشت پسندوں کی عمارات پر قبضہ بھی زیادہ مشکل ثابت نہ ہوا۔ وہ دشمن کی ہر حکمت عملی سے واقف ہو چکا تھا لہٰذا بڑی سہولت سے جوابی منصوبہ بندی تیار کر کے کم سے کم نقصان اٹھائے کامیابی حاصل کر لیتا۔ ان عمارات کے بعد رزمک اڈا بازار کی طرف پیش قدمی ہوئی۔ اس علاقہ میں ایک طرف دشمن کی سفاکی اور بربریت کا یہ عالم تھا کہ معتوب افراد کو قتل کے بعد سر عام چوک میں لٹکا دیا جاتا تھا تو دوسری جانب بزدلی کا بھی یہ حال تھا کہ 4 کمانڈو بٹالین کی آمد کا سنتے ہی ان کے چھکے چھوٹ گئے۔ اس بٹالین کے ہاتھوں اٹھایا جانے والا شدید نقصان ان کے لیے شدید نفسیاتی خوف بن چکا تھا۔ انہوں نے پاک فوج کے جوانوں کے پہنچنے سے قبل ہی علاقہ خالی کر دیا لیکن خطرہ تو اب بھی پوری آب و تاب سے برقرار تھا۔ بازار کی تمام دکانیں شٹر گرا کر بند کی گئی تھیں۔ اب فوج کے لیے دہری کشمکش تھی۔ دکانوں کے تالے توڑ کر کھولے جاتے تو اندر دہشت گرد بھی موجود ہو سکتے تھے۔ اسلحہ کا استعمال کرتے تو گیس سلنڈرز پھٹنے کی صورت میں ہونے والا جانی نقصان ناقابل تلافی ہوتا۔ قدرت کو ان کی زندگی مقصود تھی اس لیے کسی بھی نقصان کے بغیر اس بازار کا اسلحہ اور بارودی مواد قبضہ میں لے کر فوج کے حوالے کر دیا۔ اس کے فوری بعد 'رزمک چوک' میں موجود مدرسہ پر دھاوا بولا گیا۔ یہ مدرسہ بھی درحقیقت دہشت گردوں کا تربیتی مرکز تھا۔ یہاں بھی اسلحہ کا انبار اور مفید معلوماتی دستاویزات تھیں۔ ان کامیابیوں کے بعد 'میران شاہ' مکمل آزاد ہو گیا۔ دہشت گردوں کا اب وہاں کہیں بھی نام و نشان نہ تھا۔ ظلم، جبر، بربریت اور پاکستان کو عالمی سطح پر بدنام کرنے والے اس علاقہ پر محض سترہ روزہ کارروائیوں کے بعد پاکستانی پرچم لہرا دیا گیا۔ روزے کی حالت میں آپریشن کرنے والے وہ بھی جوان اب اپنے گھروں میں رابطہ کرنے کے لیے بھی آزاد تھے۔ میران شاہ کی مکمل صفائی کے بعد میڈیا کو برآمد شدہ اسلحہ اور بارودی مواد دکھانے کی ذمے داری بھی کیپٹن آکاش کو ہی سونپی گئی۔ اگلے چار، پانچ روز جوانوں نے باہمی موج مستی میں بسر کیے۔ میدان جنگ میں جان ہتھیلی پر رکھنے والے ان جوانوں کے لیے یہ لمحات بہت یادگار رہوتے تھے۔ وہ چھوٹی سے چھوٹی بات سے بھی بھرپور لطف اندوز ہوا کرتے۔ زندگی اس طرح جیتے کہ یہی آخری پل ہیں اور موت کا سامنا اس طرح کرتے کہ خطرات بھی دم بخود رہ جاتے۔ ان آپریشنز میں شریک کمانڈو بٹالین' فوج کی انفنٹری' آرٹلری اور آرمر یونٹس نے بہادری کی لازوال مثالیں قائم کیں۔ انہیں کسی بھی قیمت پر اپنی سرزمین کو دہشت گردی کے ناسور سے نجات دلوانی تھی۔ اگر اس رہائی کی قیمت اپنی 'جان' بھی ہوتی تو یہ سودا مہنگا ہرگز نہیں تھا۔ جان دی کہ دی ہوئی تو اسی کی تھی ناں۔ حق تو یہ تھا کہ حق ادا ہی نہیں ہو سکتا تھا۔

☆☆☆

کوٹ کلے گاؤں کی صفائی کے بعد مٹھا شاہین کمپنی کی اگلی منزل میران شاہ سے دس کلومیٹر دور ایک علاقہ 'علی خیل' تھا۔ یہاں کے حالات بھی کافی مخدوش تھے۔ اس صبح ایک کمپنی پر ایک گھر سے فائرنگ شروع کر دی گئی۔ اس گھر میں دہشت گردوں کی کمین گاہ تھی۔ 30 سندھ کے جوانوں نے بھرپور جوابی کارروائی کے بعد دشمن کو دریائے ٹوچی کی طرف فرار ہونے پر مجبور کر دیا۔ ان کا تعاقب کرتے ہوئے دو فوجی

جوان اس علاقہ تک جا پہنچے جہاں شرپسندوں کی اکثریت پہلے سے ہی موجود تھی۔ نتیجہ بھرپور مقابلہ اور جوانوں کی شہادت کے سوا اور کیا ہوسکتا تھا؟ زخم خوردہ ناگ کی طرح تلملائے ہوئے دشمن نے شہداء کی نعشیں لینے کے لیے آنے والی کمانڈو پٹالین پر بھی اندھادھند فائرنگ کی۔ اس فائرنگ کی زد میں آکر حوالدار مصطفیٰ بری طرح زخمی ہوگیا۔ اسے فوری طور پر سی ایم ایچ اسپتال منتقل کردیا گیا۔ (بعدازاں حوالدار مصطفیٰ نے بھی جام شہادت نوش کیا تھا۔)

آکاش کے لیے یہ صورتِ حال بہت تشویشناک تھی۔ اپنے شہداء کے جسد خاکی دشمن کے قبضہ میں ہونے کا مطلب ان کی شرمناک بے حرمتی کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ آکاش کی غیرت کو یہ سب گوارا نہ تھا۔ وہ میجر طارق سے یہ مشن حاصل کرنے کے لیے اصرار کرنے لگا۔ اسے اس بات کی بھی پرواہ نہیں تھی کہ اس دفعہ دشمن کا سامنا کسی عمارت یا احاطہ میں نہیں ہوگا۔ وہ ایک کھلے میدان میں آمنے سامنے ہوتے۔ کسی بھی وقت کوئی بھی گولی اس کی زندگی کا چراغ گل کرسکتی تھی لیکن کیپٹن آکاش کی لغت میں 'خوف' کا لفظ ہی نہیں تھا۔ وہ بے جگری سے دو اسنائپرز اور چند جوانوں کو ساتھ لیے اس پُرخطر مقام کی طرف روانہ ہوگیا جہاں گولیوں کی بوچھاڑ میں پیٹ کے بل آگے بڑھنا پڑتا تھا۔ دشمن کی عیاری اور مہارت گذشتہ ہر مقابلہ سے کہیں زیادہ تھی۔ وہ رینگتے ہوئے قریبی جھاڑیوں تک آپہنچا تھے۔ ان کی موجودگی سب سے پہلے آکاش نے ہی محسوس کی۔ اس نے بلاتامل فائر کھول دیئے۔ ایک لمحہ کی تاخیر بھی ان سب کو دشمن کا نشانہ بنادیتی۔ اس آنکھ مچولی میں وہ دریائے ٹوچی کے کنارے پہنچ گئے۔ کیپٹن آکاش کے مٹھی بھر جوانوں کے مقابلہ میں دہشت گردوں کی اس فوج کا کوئی شمار ہی نہیں تھا۔ چالیس سے پچاس کلومیٹر کے فاصلہ سے ہونے والی فائرنگ نے ہر ایک کو اپنی بارودی چنگاریوں سے روشن کر رکھا تھا۔ آکاش اور جوانوں کی مؤثر فائرنگ کے باوجود دہشت گردوں کی تعداد کم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ یہ علاقہ کلی طور پر ان کے تصرف میں تھا اس لیے ہلاک ہونے والے شرپسندوں کی جگہ لینے کے لیے اتنے ہی افراد کہیں نہ کہیں سے مزید برآمد ہوجاتے۔ آکاش کے لیے پسپائی اختیار کرنے کا اب کوئی سوال ہی نہ تھا۔ اس نے جارحانہ حکمت عملی اپنا رکھی تھی۔ دہشت گردوں کے تھوڑے سے پیچھے ہٹتے ہی وہ دیوانہ وار آگے بڑھ گیا۔ اسی لمحہ عقب میں وقار نامی ایک ساتھی سپاہی دشمن کی گولیوں سے زمین بوس ہوگیا۔

آکاش فوری طور پر اسے 'کور' دینے کے لیے آگے چلا آیا۔ یہی وہ پل تھا جب دہشت گردوں کے ہتھیاروں نے آگ اگلی اور کیپٹن آکاش کے جسم میں 'نو' گولیاں پیوست ہوگئیں۔ اس کی ہمت اور جوانمردی نے ابھی بھی ہتھیار نہیں ڈالے تھے۔ آکاش کے یہ ارادے بھانپ کر دشمن کیمپ کے کسی اسنائپر نے اس کے دماغ میں دو گولیاں داغ دیں۔ کیپٹن آکاش آفتاب ربانی کے جسم کو ایک جھٹکا لگا اور سانسوں کی الجھی ڈور کلمہ کا ورد کرتی ہوئی ہمیشہ کے لیے ٹوٹ کر ایک ابدی زندگی شہادت سے بغلگیر ہوگئی۔

☆☆☆

پندرہ جولائی کی اس صبح ساجدہ کی طبیعت بوجھل اور دل و دماغ پر ایک عجیب گھٹن طاری تھی۔ انہیں چند دنوں سے عجیب و غریب خوابوں کا سلسلہ بھی بے خوابی میں مبتلا کیے ہوئے تھا۔ دھیان کی لڑی تو صرف آکاش ہی کی طرف پروئی ہوئی تھی۔ مشن پر ہونے کے سبب اس سے کوئی رابطہ بھی نہیں ہو پا رہا تھا۔ ظہر کی نماز شروع کی تو پہلے رکوع میں جھکتے ہی تصور نے کفن میں لپٹے آکاش کی جھلک دکھا دی۔ وہ دل و جان سے لرز اٹھیں۔ کسی بھی ماں کا ذہن ایسا منظر از خود تو تخلیق نہیں کرسکتا۔ یہ ضرور قدرت ہی کا کوئی اشارہ تھا۔ ساجدہ نے سجدہ میں سر جھکا دیا۔

نماز مکمل ہونے کے بعد انہیں گھر کی فضا میں بے چینی سی محسوس ہونے لگی۔ ڈاکٹر آفتاب سے ملنے کوئی مرکزی دروازہ پر آیا۔ لویل نے بھی فون پر کسی سے بات کی۔ وہ دونوں ہی خاموش اور الجھے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ساجدہ سے دانستہ طور پر کوئی بات چھپائی جا رہی ہے۔ لویل نے ماں کے بہت اصرار پر صرف اتنا ہی بتایا کہ آکاش کی یونٹ کسی مسئلہ کا شکار ہوگئی ہے۔ ساجدہ کا دل کسی نے مٹھی میں بھینچ لیا۔ اس لمحہ ان کا وجدان گواہی دے رہا تھا کہ مسئلہ یونٹ کا نہیں صرف آکاش کا ہے اور وہی ہوا۔ شام تک ٹی وی اور سماجی روابط کی ویب سائٹس پر ایک ہی خبر گردش میں تھی کہ کیپٹن آکاش آفتاب ربانی شہید ہوگئے ہیں۔ اس کے بعد فون کالز کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ ڈاکٹر آفتاب اور دانش ایک دوسرے کے گلے لگ کر اپنے گھر کے انمول ہیرے کی خوش قسمت موت پر فطری تڑپ سے بلکتے ہوئے آنسو بہانے لگے۔ ساجدہ کو سکتہ طاری ہوچکا تھا۔ لویل اپنی عمر سے زیادہ بردباری کا مظاہرہ کرتے والدہ کو سنبھالتے ہوئے عزیز و اقارب کا سامنا بھی

کر رہی تھی۔

آکاش کا جسد خاکی اگلے روز صبح نو بجے ہیلی کاپٹر میں لایا گیا۔ جنازہ میں شرکت کے لیے اس قدر جم غفیر تھا کہ بیٹھنے کے لیے نشستیں اور گاڑیوں کے لیے پارکنگ کم پڑ گئی۔ فوجی جوانوں نے اس موقع پر بھرپور انتظام وانصرام سنبھالے رکھا۔ دوپہر بارہ بجے آکاش کا جسد خاکی آخری سفر پر جانے کے لیے تیار تھا۔ ساجدہ نے آکاش کی شہادت کی خبر سننے کے بعد سے اب تک بے مثال اور ناقابل یقین ضبط کا مظاہرہ کیا تھا۔ انہیں خود بھی اس بات کا یقین نہیں ہو رہا تھا کہ ان کے آکاش کی جدائی نے دل کو دھڑکنا کیوں نہیں بھلایا؟ سانسوں کی مالا ابھی تک کیسے سلامت ہے؟ وہ خاموش اور ساکت تھیں لیکن جنازہ اٹھتے ہی ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے۔ وہ اس قدر بلک کر روئیں کہ در و دیوار کو بھی اپنا کلیجہ پھٹتا محسوس ہونے لگا۔

جنازہ قبرستان لے جانے کے لیے فوج اور پولیس نے ٹریفک بند کروادی۔ سڑک کے دونوں اطراف میں عوام کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر اپنی درخشاں روایات کے 'وارث' کو الوداع کہنے کے لیے موجود تھا۔ نماز جنازہ 'ایف ایف سی' گراؤنڈ میں ہوئی۔ جنازہ کے شرکاء میں صرف مقامی لوگ ہی نہیں بلکہ اسلام آباد، پشاور، لاہور، مانسہرہ، اوگی، بٹگرام اور دیگر علاقوں سے ہر عمر، رنگ اور نسل کے افراد بھی شامل ہونے آئے۔ ایبٹ آباد میں اس روز کافی گرمی تھی لیکن قدرت کی کرنی ایسی تھی کہ نماز جنازہ کے وقت میت کے پاس بادل چھانے سے ہلکی پھوار پڑنے لگی جبکہ باقی گراؤنڈ میں ویسے ہی دھوپ تھی۔

جنازہ میں یونٹ کے اسٹیشن کمانڈنٹ کے علاوہ کئی سیاسی شخصیات بھی شریک تھیں۔ ابتدائی ردعمل کے بعد ڈاکٹر آفتاب نے بھی صبر اوڑھ لیا تھا۔ شہید کے والد کا رتبہ قدرتی طور پر ہی مکمل وقار کے ساتھ انہیں اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے تھا۔ قبرستان پہنچنے کے بعد قریبی رشتہ داروں اور میڈیا کے افراد کے سوا کسی کو بھی اندر نہ آنے دیا گیا۔ فوج اور پولیس کا نظم وضبط مکمل ہم آہنگ تھا۔ اس موقع پر ساجدہ کو بھی بیٹے کے آخری دیدار کے لیے بلوایا گیا۔ آکاش کا جسد خاکی ایمبولینس سے اتارتے ہی اسے ایک فوجی دستے کی جانب سے سلامی دی گئی۔ تدفین کے یہ مراحل میڈیا کے ذریعہ عالمگیر سطح پر دکھائے جا رہے تھے۔ ساجدہ کے گم صم وجود میں ایک نائب صوبیدار کا تصور بھی ابھرنے لگتا جس نے انہیں آکاش کا اے ٹی ایم کارڈ دیتے ہوئے بتایا تھا کہ اس کے چھٹیوں پر آنے سے قبل آکاش نے یہ کارڈ حوالدار خالق کو دیتے ہوئے کہا تھا کہ وہ اس کے ذمے سارے بل چکا دے۔ ساجدہ کے دل میں ایک خلش بیدار ہونے لگی۔ چھوٹی سے چھوٹی بات بھی ماں سے بانٹنے والا آکاش اپنی موت کی آہٹیں محسوس کر رہا تھا۔ ان سے ایک بار بھی کوئی ذکر نہ کیا۔ کوئی اشارہ بھی نہ دیا لیکن اگر وہ اپنے جذبات عیاں کر بھی دیتا تو کیا ساجدہ یہ سب سہہ پاتیں؟ سوالات در سوالات کا یہ سلسلہ انہیں بے حال کیے ہوئے تھا۔ پاکستان ملٹری اکیڈمی کے کمانڈنٹ میجر جنرل نذیر بٹ نے ساجدہ کو آکاش کی ایس ایس جی کی وردی 'ٹوپی' میڈلز اور سبز ہلالی پرچم دیا۔ آنسوؤں کا ایک سیلاب امڈنے کے لیے بے تاب تھا لیکن سماعت میں بیٹے کے الفاظ گونج رہے تھے جو وہ اکثر چھٹیوں میں ماں کے ہاتھوں کا بنا لذیذ کھانا تناول کرتے کہتا تھا کہ وہ ایک کمانڈو کی والدہ ہیں اور انہیں اسی وقار سے ظرف کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔

''الوداع میرے کاشی! تم نے اس تئیس سالہ زندگی میں ہمیں جینے کا ایک نیا ڈھنگ سکھا دیا۔ الوداع میرے جگر گوشے! الوداع اے مرد مجاہد! پروردگار تمہاری یہ قربانی قبول فرمائے اور ملک کے طول وعرض میں ایسی بہاریں لے آئے جس کے بعد کسی ماں کا کاشی اس کے سامنے قبر میں نہ جا سوئے۔''

چند آنسو بے اختیار پلکوں کی باڑ پھلانگنے میں کامیاب ہوگئے۔ میڈیا کے افراد والدین اور بھائی کے تاثرات جاننے کے لیے بے چین تھے لیکن ساجدہ کی نظریں اسی قبر پر مرکوز تھیں جس پر فوج کی مختلف یونٹوں نے پھولوں کی اس قدر چادریں ڈالی تھیں کہ وہ قبر مکمل طور پر 'گلزار' بن گئی تھی۔ اس گلزار کی ہر ایک کلی سے ایک ہی صدا برآمد ہوتی سنائی دے رہی تھی۔

قفس میں لے چکی گردش ایام اے وطن والو!
گر ہو وطن میں اندھیرا تو گھر ہمارا جلا لینا

**ماخذات:**

ماں کا آکاش.....از: ساجدہ آفتاب ربانی
انٹرنیٹ اور اخباری مضامین

اس دوشیزہ کا جرم یہ تھا کہ وہ مسلمان تھی۔ حب الوطنی سے سرشار تھی۔ سائنسداں تھی اگر اس کی تحقیق مکمل ہوجاتی تو نیوکلیئر سائنس کا رخ بدل جاتا۔ یہی جرم اس کے گلے کا پھانس بن گیا۔ امریکا پہنچتے ہی کئی اسلام دشمن قوتیں اس کے خلاف میدان میں آگئیں۔ وہ معصوم سی دوشیزہ جس کی آنکھوں میں منگیتر کی زندگی میں کلی طور پر آجانے کا خواب تھا، تحقیق مکمل ہونے کا انتظار تھا کہ ایک پُراسرار لڑکی اس کے گرد منڈلانے لگی اور پھر وہ زندہ گھر نہ لوٹ سکی۔

# موساد کی شکار؟

زرین قمر

**کہانی اس دوشیزہ کی رہی سرچ مکمل ہوجاتی**

رات گہری ہوگئی تھی کچھ ہی دیر پہلے سمیرا کو اس کی ملازمہ نے کھانا کھلا دیا تھا جبکہ وہ کھانے کے لیے بالکل تیار نہیں تھی اور اپنے والد موسیٰ کا انتظار کررہی تھی جو کسی کام سے باہر گئے تھے اور ابھی تک واپس نہیں آئے تھے۔ اس کی عمر پانچ سال تھی اور وہ اپنی عمر سے زیادہ سمجھدار نظر آتی تھی۔ اس کی باتیں بڑے بوڑھوں جیسی ہوتیں۔ اس وقت بھی وہ اپنی ملازمہ قدسیہ سے سوالات پہ سوالات کررہی تھی اور قدسیہ بڑی دل جمعی سے ان کے جوابات دے رہی تھی۔

''بابا کچھ تو بتا کر گئے ہوں گے؟'' اس نے پوچھا۔

''وہ تو مجھے صرف یہ کہہ گئے تھے کہ کچھ سامان لینے جارہے ہیں جلد واپس آجائیں گے۔'' قدسیہ نے کہا ''آؤ تم اپنے بیڈ پر لیٹ جاؤ..... میں تمہیں کہانی سناتی ہوں۔''

''ہاں..... تاکہ میں سوجاؤں اور بابا سے پوچھ بھی نہ سکوں کہ وہ کہاں گئے تھے اور انہیں اتنی دیر کیوں لگی؟''

''ایسی بات نہیں ہے میری شہزادی..... میں تو یہ چاہتی ہوں کہ آپ پریشان نہ ہوں۔'' ملازمہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''آپ کو پتا ہے، اسکول میں میرا داخلہ ہوئے چند ہی دن ہوئے ہیں اگر میرا ہوم ورک نہیں ہوا تو کل ٹیچر مجھے ڈانٹیں گی۔''

''میں آپ سے کہہ تو رہی تھی کہ میں آپ کا ہوم ورک کروادیتی ہوں۔''

''نہیں، وہ تو مجھے بابا ہی کروائیں گے..... انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ وہ ہمیشہ مجھے ہوم ورک خود کروایا کریں گے۔'' سمیرا نے ضدی لہجے میں کہا، اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی اور قدسیہ نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ سمیرا بھی بھاگتی ہوئی دروازے تک آئی تھی اور پھر اپنے بابا کو دیکھ کر ان سے چمٹ گئی تھی۔

''تم اب تک جاگ رہی ہو سمی۔'' اس کے بابا نے اسے بانہوں میں اٹھاتے ہوئے کہا، وہ .... پیار سے اسے سمی کہتے تھے۔

''میں کیا کروں آپ جو نہیں آئے تھے، آپ کا انتظار کررہی تھی۔'' سمیرا نے بڑوں جیسے انداز میں کہا تو وہ مسکرادیے۔

''اب میں ہوم ورک کب کروں گی؟'' سمیرا نے پوچھا۔

''کل کرلینا۔''

''لیکن کل تو وہ لیٹ ورک ہوجائے گا ٹیچر ڈانٹیں گی۔''

''نہیں، وہ نہیں ڈانٹیں گی کیونکہ اب ہم یہاں سے جارہے ہیں، اب آپ اس اسکول میں نہیں پڑھ سکیں گی۔'' موسیٰ نے بتایا۔

''کیوں؟ کیا یہ اسکول اچھا نہیں ہے؟''

''یہ بات نہیں ہے سمی بیٹا، میں نے یہ گھر فروخت کردیا ہے اور ہم قاہرہ جارہے ہیں۔''

''کیوں؟ میں یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گی۔ یہ میرا گھر ہے۔ آپ نے اسے کیوں فروخت کیا ہے؟'' سمیرا نے روہانسی ہوکر کہا۔

''میں 3 کام کرنا چاہتا ہوں، وہ یہاں ممکن نہیں ہے۔ تم چھوٹی ہو ابھی، یہ باتیں تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گی جاؤ، جاکر سوجاؤ۔ میں تھک گیا ہوں اب صبح بات کریں گے۔'' موسیٰ نے... کہتے ہوئے قدسیہ کو اشارہ کیا کہ وہ اسے وہاں

سے لے جائے سمیرا نے بھی کوئی سوال نہیں کیا اور اداسی سے آیا کا ہاتھ تھامے وہاں سے چلی گئی تھی۔

موسیٰ مصر کے شہر غربیا میں رہتا تھا اور خوشگوار زندگی گزار رہا تھا اس نے اپنی پسند کی شادی کی تھی اور اس کی واحد اولاد سمیرا ہی تھی سمیرا کی پیدائش کے بعد اسے پتا چلا تھا کہ اس کی بیوی کو کینسر ہے، اس نے بیوی کا بہت علاج کروایا لیکن اسے کوئی افاقہ نہ ہوا اور جب سمیرا چار سال کی تھی تب کینسر سے اس کا انتقال ہو گیا۔ سمیرا نے اپنی والدہ کی بیماری میں ان کی نازک حالت دیکھی تھی وہ چھوٹی ضرور تھی لیکن اپنی ماں کی تکلیف اس کے ذہن پر چھا گئی تھی وہ نہیں جانتی تھی کہ کینسر کس بیماری کا نام ہے لیکن اپنی والدہ کی حالت دیکھنے کے بعد اتنا سمجھ گئی تھی کہ وہ کوئی بہت تکلیف دینے والی بیماری ہے۔ وہ اکثر موسیٰ سے اس کے بارے میں پوچھتی تھی لیکن کبھی بھی پورے طور پر اسے سمجھ نہ پائی تھی۔ بس اسے اپنی ماں کے اپنے پاس نہ ہونے کا شدید دکھ تھا۔ موسیٰ نے کوشش کی تھی کہ اس کی تنہائی اور ماں سے محرومی کو کم کر سکے چنانچہ اس نے قدسیہ کو آیا کے طور پر اپنے ساتھ رکھ لیا تھا۔ وہ اسے ماہانہ تنخواہ، علاوہ کھانا اور لباس بھی مہیا کرتا تھا جواب میں قدسیہ نے بھی کبھی اسے شکایت کا موقع نہیں دیا تھا۔

موسیٰ اپنے علاقے Gharbia میں ایک مشہور سیاستدان کے طور پر جانا جاتا تھا لیکن اب اسے سیاست سے زیادہ فکر سمیرا کی تھی۔ وہ اس پر زیادہ توجہ دینا چاہتا تھا چنانچہ اس نے اپنا غریبا والا گھر بیچ دیا تھا اور سمیرا کے ساتھ قاہرہ جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ وہاں کاروبار کرنے کا ارادہ رکھتا تھا اور عراق میں اسے سمیرا کے لیے اچھے اسکول بھی مل سکتے تھے۔

چند روز بعد وہ ''الحسینی'' منتقل ہو گیا تھا اور وہاں ایک خوبصورت سا گھر خرید لیا تھا۔ وہ قدسیہ کو اپنے ساتھ ہی وہاں لے گیا تھا کیونکہ وہ بھی تنہا تھی اور اسے بھی سہارے کی ضرورت تھی پھر سمیرا کی دیکھ بھال کے لیے موسیٰ کو قدسیہ کی ضرورت بھی تھی۔

الحسینی کے علاقے میں موسیٰ نے ایک چھوٹے ہوٹل میں اپنا پیسا لگایا تھا تاکہ مہینے وار رقم ملتی رہے جس سے وہ گھر کے اخراجات اور سمیرا کی تعلیم کا خرچ اٹھا سکے۔ سمیرا کا داخلہ ایک قریبی پرائمری اسکول ''قصر الشوق پرائمری اسکول'' میں کروا دیا تھا جو قاہرہ کے پرانے اور اچھے اسکولوں میں سے

ایک تھا۔ سمیرا کو بھی وہ اسکول بہت پسند آیا تھا اور اس کا دل بھی پڑھائی میں لگ گیا تھا۔

ہر سال سمیرا اچھے نمبروں سے پاس کرتی ہوئی آگے بڑھتی چلی گئی تھی۔ اس کی پرائمری تعلیم مکمل ہونے کے بعد موسیٰ نے اس کا داخلہ ''بنت الاشرف اسکول'' میں کروادیا تھا جو اس نے خود ہی بنوایا تھا اس اسکول کا مالک تھا۔

سمیرا نے ہمیشہ ہر کلاس بہت اچھے نمبروں سے پاس کی تھی چنانچہ اس کا یہی ریکارڈ قائم رہا اور اس نے سیکنڈری تعلیم بھی بہترین گریڈز کے ساتھ حاصل کی، آگے وہ انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کرنا چاہتی تھی لیکن اس کے والد اسے تنہا کہیں دور دراز علاقے میں بھیجنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

''تم یہاں رہ کر بھی پڑھ سکتی ہو سمی۔'' موسیٰ نے اسے سمجھایا۔ جب وہ الحسینی سے باہر جا کر تعلیم حاصل کرنے کی ضد کررہی تھی۔

''لیکن میں صرف تعلیم حاصل کرنا نہیں چاہتی۔'' سمیرا نے کہا۔

''کیا مطلب؟ تم اور کیا کرنا چاہتی ہو؟'' موسیٰ نے پوچھا۔

''میں مقابلہ کرنا چاہتی ہوں دنیا کا..... میں سب کو پیچھے چھوڑ دینا چاہتی ہوں۔ سب سے آگے نکل جانا چاہتی ہوں۔''

''وہ تو تم اب بھی کررہی ہو۔'' موسیٰ نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ہاں، وہ تو میں کررہی ہوں لیکن یہاں میرا مقابلہ میرے ہی لوگوں سے ہے، مقامی لوگوں سے۔''

''پھر؟''

''میں دنیا کا مقابلہ کرنا چاہتی ہوں۔ بین الاقوامی سطح پر.....'' سمیرا نے ہوا میں ہاتھ لہراتے ہوئے کہا۔

''پھر کیا ہوگا؟''

''میں مشہور ہوجاؤں گی؟''

''لیکن سمی بیٹا تعلیم مشہور ہونے کے لیے نہیں بلکہ قابلیت بڑھانے کے لیے حاصل کی جاتی ہے۔'' موسیٰ نے اسے سمجھایا۔

''آپ ٹھیک کہتے ہیں، مگر میرا خیال ہے کہ میں کسی بڑے ادارے سے تعلیم حاصل کروں، جہاں جدید سہولتیں ہوں تاکہ میں زیادہ فائدہ اٹھا سکوں۔''

''ٹھیک ہے میں سوچوں گا فی الحال تم انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کرو۔'' اس کے والد نے اسے سمجھایا پہلے تو وہ مان گئی لیکن پھر اس نے قاہرہ یونیورسٹی ہی کے شعبہ سائنس کو مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے منتخب کرلیا۔

1939ء جنوری کی ایک صبح سمیرا اپنے کلاس فیلو سرمد سلطان کے ساتھ شعبہ سائنس کے ڈپارٹمنٹ میں لگے لان میں بیٹھی اگلا پیریڈ شروع ہونے کا انتظار کررہی تھی۔ اس کے آگے گھاس پر اس کا جرنل کھلا ہوا تھا جس میں لکھے فارمولوں کو وہ دل ہی دل میں دہرا رہی تھی اور سرمد نیم وا آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ ڈپارٹمنٹ میں نیا آیا تھا، اسے بھی زندگی میں کچھ کر دکھانے کا جنون کی حد تک شوق تھا۔ وہ اور سمیرا اکثر پڑھائی کے دوران پیش آنے والی مشکلات کو ایک دوسرے سے بحث کر کے حل کیا کرتے تھے یا پھر ایسے موقعوں پر وہ ڈپارٹمنٹ کے چیئرمین ڈاکٹر مصطفیٰ مشرفہ سے مشورہ کرتے، ڈاکٹر مصطفیٰ شعبہ کلیدی سائنس کے سربراہ بھی تھے اور سمیرا کو ایک اچھی اور ہونہار طالبہ کے طور پر پسند کرتے تھے۔

''سمیرا تم نے اپنی آگے کی زندگی کے بارے میں کیا سوچا ہے؟'' سرمد نے اس سے پوچھا اور وہ اس کے سوال پر چونک گئی۔

''کیا مطلب؟ بھئی ظاہر ہے میں نے اپنے لیے جو شعبہ منتخب کیا ہے اس کو دیکھتے ہوئے کوئی بھی کہہ سکتا ہے کہ میں آئندہ بھی کلیدی سائنس ہی کو اپنی زندگی کا محور بناؤں گی۔'' سمیرا نے ہنستے ہوئے کہا۔

''میں یہ بات جانتا ہوں مگر میرا اشارہ گھریلو زندگی سے تھا۔'' سرمد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''گھریلو زندگی؟ بھلا ہم جیسے لوگوں کی گھریلو زندگی کیا ہوسکتی ہے؟ جب کوئی بھی شخص وہ لڑکی ہو یا لڑکا اپنی زندگی میں کسی مثبت کام یا کسی بڑے کام کو اپنا مقصد زندگی بنالیتا ہے تو پھر اس کی گھریلو زندگی قانونی حیثیت اختیار کرلیتی ہے۔'' سمیرا نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''یعنی تمہارا ابھی شادی وادی کا کوئی ارادہ نہیں؟'' سرمد نے دوٹوک پوچھا۔

''نہیں۔ فی الحال میں کچھ نہیں کہہ سکتی، میں نے اس بارے میں ابھی کچھ سوچا ہی نہیں۔''

''تمہارے والد، وہ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟'' سرمد نے پوچھا تو سمیرا رجسٹر چھوڑ کر اس کی طرف بغور دیکھنے لگی۔

''کیا دیکھ رہی ہو؟''

''یہی کہ اس سے پہلے تو کبھی تم نے اس بارے میں کوئی بات نہیں کی، یہ آج اچانک میری شادی کا خیال کیسے آ گیا۔''

''سمیرا، میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میرے والد کا انتقال ہو چکا ہے اور والدہ شدید بیمار ہیں، ان کی خواہش ہے کہ میں جلد از جلد شادی کرلوں تاکہ وہ سکون سے سفرِ آخرت پر رخصت ہو سکیں۔''

''عجیب منطق ہے، بھلا ان کے اس دنیا سے جانے اور تمہارے شادی کرنے کا کیا تعلق ہے؟''

''انہوں نے میرے والد کے انتقال کے بعد میری اور میری بہن نادیہ کی پرورش بہت مشکلوں سے کی ہے اور یہاں تک تعلیم دلوانے کے لیے بہت جدوجہد کی ہے۔ وہ چاہتی ہیں کہ اپنی ہی زندگی میں میری شادی بھی کروادیں۔ وہ اسے اپنا فرض اوّلین سمجھتی ہیں ورنہ میرا تو ابھی خود بھی شادی کا کوئی ارادہ نہیں لیکن ان کی خواہش کے سامنے مجبور ہوں۔'' سرمد نے کہا۔

''تو تم شادی کرلو، اس سے میرا کیا تعلق؟'' سمیرا نے ہنستے ہوئے کہا۔ حالانکہ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اظہار نہ کرنے کے باوجود سرمد نے بہت سی باتوں سے اس پر ظاہر کر دیا تھا کہ وہ اسے چاہتا ہے۔

''تم سے یہ تعلق ہے سمیرا کہ میں تمہیں پسند کرتا ہوں اور تمہی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' سرمد نے بالآخر اظہار کر ہی دیا۔

''لیکن، تمہیں معلوم ہے میں نے اپنی زندگی کا ایک اور مقصد چنا ہوا ہے، میری والدہ کینسر کے موذی مرض کا شکار ہوگئی تھیں۔ میرے والد چاہنے کے باوجود انہیں نہیں بچا سکے تھے کیونکہ اس خطرناک بیماری کا اب تک کوئی علاج دریافت نہیں ہوا ہے اور میں نے یہ عزم کیا ہوا ہے کہ میں اس بیماری کا علاج دریافت کرکے رہوں گی تاکہ پھر کبھی کوئی غریب اس موذی مرض میں ہلاک نہ ہو۔''

''یہ بہت بڑا کام ہے سمیرا، تم لڑکی ذات اکیلے یہ سب نہیں کر سکتیں۔'' سرمد نے کہا۔

''مجھے افسوس ہے سرمد کہ تم اس طرح سوچتے ہو، انسان اگر ٹھان لے تو وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن تم تو لڑکی.....''

''لڑکی؟ بھلا لڑکی اور لڑکے میں کیا فرق ہے؟ اگر عزم ہو تو دونوں ہی ہر مشکل کام کو انجام دے سکتے ہیں اور اگر ہم میں سے ہر شخص اپنے اوپر کوئی بھی ذمے داری لے لے تو وہ ضرور کامیاب ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ بھی نیتیں دیکھ کر ہی ہماری مدد کرتا ہے۔'' سمیرا نے ایک عزم سے کہا۔

''کیا شادی اس راستے میں حائل ہوتی ہے؟'' سرمد کا موڈ بھی بحث کرنے کا تھا۔

''ہوتی بھی ہے اور نہیں بھی۔''

''ذرا وضاحت کرو۔''

''اگر تم میرے ساتھ تعاون کرو اور وعدہ کرو کہ کبھی میرے راستے میں رکاوٹ نہیں ڈالو گے بلکہ میرا مقصد حاصل کرنے میں میری مدد کرو گے تو اس موضوع پر سوچا جا سکتا ہے لیکن شادی میں ابھی نہیں کروں گی۔'' سمیرا نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔

''کیا تمہارا کوئی آئیڈیل ہے؟''

''نہیں، میں نے اب تک اس بارے میں نہیں سوچا۔''

''تو پھر مجھ سے شادی کے لیے رضامند کیسے ہوگئیں؟''

''اس لیے کہ اس موضوع پر زیادہ سوچنا ہی نہیں چاہتی تم اگر میرا مقصد مجھے مل گیا تو پھر دیکھیں گے۔''

''اچھا، کیا تم مجھے اپنے والد سے ملوا سکتی ہو؟''

''ہاں، لیکن وہ بھی وہی کریں گے جو میں چاہوں گی وہ کبھی میری کوئی بات نہیں ٹالتے۔''

''تم ملواؤ تو سہی۔'' سرمد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اوکے..... ملوا دوں گی۔'' سمیرا نے اپنی کتابیں سمیٹتے ہوئے کہا۔ اگلے پیریڈ کی بیل ہوگئی تھی اور وہ کتابیں اٹھا کر اپنے کلاس روم کی طرف بڑھ گئی تھی۔ سرمد بھی اس کے پیچھے ہی کلاس میں داخل ہوا تھا۔

ایک ہفتے بعد سمیرا نے سرمد کو اپنے گھر شام کی چائے پر بلایا تھا تاکہ اپنے والد سے اسے ملوا سکے اور سرمد اپنے ساتھ اپنی والدہ کو لے کر آیا تھا۔ سمیرا انہیں دیکھ کر حیران رہ گئی تھی کیونکہ سرمد سے اس کی کوئی بات نہیں ہوئی تھی کہ وہ اکیلا آئے گا یا والدہ کو لائے گا۔

''السلام علیکم۔'' سمیرا نے جلدی سے سرمد کی والدہ کو سلام کیا تھا اور انہوں نے مسکرا کر جواب دیا تھا۔

''آیئے آنٹی..... ادھر.....'' اس نے ڈرائنگ روم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''آؤ سرمد۔'' ساتھ ہی وہ

سرمد کو دیکھتی جارہی تھی جو خاصا تیار ہوکر آیا تھا۔ اس نے گرے کلر کا سوٹ پہنا ہوا تھا جبکہ سمیرا نے کوئی خاص تیاری نہیں کی تھی، وہ اپنے گھر کے لباس میں ہی تھی۔

''آپ بیٹھیں آنٹی، میں ابھی آتی ہوں۔'' کہتے ہوئے سمیرا ڈرائنگ روم سے نکل گئی تھی، وہ اپنے والد کو سرمد کی امی کی آمد کے بارے میں بتانا چاہتی تھی۔

''بابا..... وہ..... سرمد اپنی والدہ کو بھی ساتھ لایا ہے۔'' اس نے موسیٰ کے کمرے میں داخل ہوتے کہا۔

''یہ تو اچھی بات ہے، ایسے موقع پر اچھے بچے بزرگوں کو اہمیت دیتے ہیں اور ان کی مرضی سے ہی فیصلے کرتے ہیں۔'' اس کے بابا نے ذومعنی بات کہی تھی۔

''آپ کو پتا ہے نا میرا ذہن ابھی شادی کے لیے تیار نہیں۔'' سمیرا نے کہا۔

''ہاں مجھے پتا ہے لیکن اگر لڑکا مجھے پسند آیا تو فی الحال بات تو پکی کی جاسکتی ہے۔'' اس کے والد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''بابا۔'' سمیرا نے تبھی آواز میں کہا تو موسیٰ ہنسنے لگا۔

کچھ دیر بعد وہ سب ڈرائنگ روم میں بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ سرمد کی والدہ نے اپنی پچھلی زندگی کے بارے میں تفصیل سے اس کے والد کو بتایا تھا اور انہوں نے بھی اپنے بارے میں سرمد کی امی کے ہر سوال کا جواب دیا تھا پھر شاید وہ دونوں ایک دوسرے سے مطمئن ہو گئے تھے کیونکہ انہوں نے دوسرے موضوعات چھیڑ دیئے تھے اور سمیرا، سرمد کے ساتھ وہاں سے اٹھ کر گھر کے پیچھے بنے چھوٹے سے باغیچے میں آگئی تھی۔

''پھر سمیرا تم نے کیا فیصلہ کیا؟'' سرمد نے پوچھا۔

''میرا فیصلہ روز نہیں بدلا کرتا میں تمہیں جو بتا چکی ہوں اسی پر قائم ہوں۔'' سمیرا نے کہا۔

''میری امی نے تمہیں پسند کرلیا ہے اور میں تو پہلے ہی تمہارا دیوانہ ہوں۔''

''دیوانوں کی ہر بات نہیں مانی جاتی۔'' سمیرا نے بھی ہنستے ہوئے کہا۔

سمیرا کے والد نے سرمد اور اس کی امی کو رات کے کھانے کے لیے روک لیا تھا اور یہ طے پا گیا تھا کہ کچھ وقت گزرنے کے بعد کوئی مناسب موقع دیکھ کر وہ سمیرا اور سرمد کی منگنی کردیں گے۔

1939ء کے آخر میں سمیرا نے شاندار کامیابی کے ساتھ بی ایس سی ریڈیالوجی کا امتحان پاس کرلیا تھا اور پھر ایکسرے کے تابکاری اثرات کو اپنی تحقیق کا ذریعہ بنالیا تھا جس میں کلیدی سائنس کے سربراہ ڈاکٹر مصطفیٰ اس کو گائیڈ کررہے تھے، انہیں پوری توقع تھی کہ سمیرا کامیاب ہونے کے بعد تدریس کے شعبے کو اپنا کر، فیکلٹی سے بطور استاد وابستہ ہونے کے بعد دوسرے نوجوانوں کے ذہنوں کی آبیاری میں مدد دے گی، اور پھر ایسا ہی ہوا تھا وہ اپنے استاد کی توقعات پر پوری اتری تھی۔ وہ قاہرہ یونیورسٹی کی کلیدی سائنس ڈپارٹمنٹ کی پہلی خاتون اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئی تھی۔ یہ اس جامعہ میں تدریس کے منصب پر کسی عورت کی پہلی تقرری تھی اور یہ سلسلہ اس وقت عروج پر پہنچ گیا جب وہ جوہری تابکاری کے مضمون سے پی ایچ ڈی کی تعلیم مکمل کرکے اس شعبے میں پہلی خاتون سائنس داں قرار پائی۔

تقریباً ایک ہفتے تک ملک کے اخبارات و رسائل میں یہ تعلیمی رزلٹ موضوع بنا رہا، سب سے نمایاں نمبروں میں جوہری تابکاری مضمون میں کامیابی نے سمیرا موسیٰ کو شہرت کی بلندیوں پر پہنچادیا۔ کئی رسائل میں اس کے انٹرویوز شائع ہوئے۔ اس کے والد کی خوشی تو دیکھنے والی تھی۔ جس شام رزلٹ آیا اسی شام سرمد اپنی والدہ کے ساتھ مٹھائی کا ڈبا لیے سمیرا کے گھر پہنچ گیا۔ وہ اتنا اہم موقعہ ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ سمیرا اسے اچانک دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔

''اوہ آنٹی آپ؟ سرمد تم؟ تم نے آنے کی اطلاع نہیں دی..... بہت خوشی ہوئی تمہیں دیکھ کر۔'' سمیرا بولے جارہی تھی، اسے اپنے جذبات پر قابو نہیں تھا۔

سب لوگ ڈرائنگ روم میں جا بیٹھے تھے تبھی سمیرا کے والد کمرے میں داخل ہوئے۔

''مبارک ہو موسیٰ صاحب، بیٹی کی بہترین کامیابی کا سہرا تو آپ کے سر جاتا ہے۔'' سرمد کی والدہ نے تعریفی انداز میں کہا۔

''جی ہاں..... لیکن آپ سب کی اور اس کے اساتذہ کی محنت بھی بھلائی نہیں جاسکتی، سرمد نے بھی ہر موقع پر سمیرا کا ساتھ دیا ہے۔'' موسیٰ نے کہا۔

کچھ ہی دیر میں سمیرا نے کئی لوازمات کے ساتھ چائے کا انتظام کرلیا تھا۔

''اب آگے کیا سوچا ہے سمیرا۔'' سرمد نے اس سے پوچھا وہ باورچی خانے کے دروازے میں کھڑا اسے چائے کی چیزیں ٹرے میں سجاتے دیکھ رہا تھا۔

''میں اب ریڈیائی تابکاری کے ذریعے لوگوں کا علاج کروں گی، میں حکومت اور یونیورسٹی کے تعاون سے مختلف اسپتالوں میں اس کا تجربہ کروں گی اور مجھے یقین ہے کہ مجھے کامیابی ہوگی۔''

''لیکن آج تک کسی نے بھی نیوکلیئر پاور کو انسانیت کے مفاد میں استعمال کرنے کے بارے میں نہیں سوچا بھلا یہ کیسے ممکن ہوگا۔ یہاں تو سائنسدان بم پہلے بنانے کا تجربہ کرتے ہیں۔'' سرمد نے کہا۔

''اور میں اسی سوچ کی نفی کرنا چاہتی ہوں، میں چاہتی ہوں کہ نیوکلیئر پاور انسانیت کو ختم کرنے کی بجائے انسانیت کو بچا دینے کے لیے استعمال ہو۔''

''کیا تمہیں اس کی اجازت مل جائے گی؟''

''ہاں، میرا خیال ہے نہ تو میرے والد کو اعتراض ہوگا نہ تمہیں اور نہ آنٹی کو اور نہ ہی ان مریضوں کو جن کے کینسر کا علاج نہیں اور انہیں کوئی زندگی کی اُمید دینے والا نہیں۔ وہ بھی چاہیں گے کہ میں ان پر تجربہ کروں ممکن ہے ان کی زندگی بچائی جائے جس کا مجھے پختہ یقین ہے۔''

''تو میرا خیال ہے پہلے تو اس سلسلے میں ڈاکٹر مصطفیٰ سے بات کرتے ہیں۔'' سرمد نے کہا

''ہاں..... ضرور۔''

''سنو۔'' سرمد نے کہا وہ چائے کی ٹرے اٹھا کر ڈرائنگ روم میں جانے ہی والی تھی کہ وہ مڑی۔

''ہوں.....''

''امی..... منگنی کی انگوٹھی لائی ہیں۔'' سرمد نے محبت بھری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''ابھی نہیں سرمد۔'' سمیرا نے نظریں جھکا کر کہا۔ میری زندگی کے ساتھی تم ہی ہو اطمینان رکھو لیکن ابھی نہیں۔ میری منزل بہت دور ہے، مسافت لمبی ہے۔ میں تمہارا ساتھ کھونا نہیں چاہتی ہوں کیونکہ تم میری طاقت ہو لیکن ابھی زندگی کی راہ میں مزید مصروفیات نبھا نہیں سکوں گی۔''

''ٹھیک ہے سمیرا..... میں تمہارا انتظار کروں گا تم کبھی خود کو تنہا نہیں پاؤ گی۔''

''شکریہ سرمد۔'' سمیرا نے دھیرے سے کہا اور سرمد کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

اگلے روز یونیورسٹی میں سرمد اور سمیرا نے ڈاکٹر مصطفیٰ سے ملاقات کی تھی۔ انہوں نے سمیرا کو کئی اچھے مشورے دیئے تھے اور بتایا تھا کہ یونیورسٹی میں سائنس فیکلٹی کی جانب سے ایک شاندار تقریب کا انعقاد کیا جا رہا ہے جس میں ملک کی نامور شخصیات شرکت کر رہی ہیں اور اہم حکومتی شخصیات کے بھی آنے کی خبر ہے خاص طور سے اس تقریب کی روح رواں سمیرا ہوگی۔

''سر۔ آپ کا بہت شکریہ میں نے جو کامیابی حاصل کی ہے وہ آپ کی کاوشوں کا حصہ ہے آپ نے بھی ہمارے ساتھ بہت محنت کی ہے۔''

''یہ تو میرا فرض تھا سمیرا، اور تمہارے بارے میں تو مجھے پہلے ہی یقین تھا کہ تم اس یونیورسٹی میں ایسی کامیابی حاصل کرنے والی پہلی خاتون ہو تمہیں یونیورسٹی کی جانب سے اسسٹنٹ لیکچرر کے عہدے کی پیشکش کی جاتی ہے۔'' مصطفیٰ مشرفہ کی آواز خوشی سے لبریز تھی۔ اس کا لیٹر تمہیں آئندہ ہونے والی تقریب میں دیا جائے گا۔''

''میں اس کامیابی کے لیے اپنے پروردگار کی شکر گزار ہوں سر، ایک وقت تھا کہ میں سوچنے لگی تھی کہ مجھے اپنے ملک کے علاوہ کسی بڑے بیرونی ملک میں جا کر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہیے، شاید وہاں مجھے زیادہ ماڈرن اور اچھی سہولیات میسر آسکیں گی اور میں بین الاقوامی معیار کے مطابق کامیابی حاصل کر سکوں گی لیکن پھر میں نے فیصلہ کیا کہ میں اپنے ہی وطن میں رہ کر تعلیم حاصل کروں۔ نئی تحقیقات اور ریسرچ کروں اور اپنی قابلیت بڑھانے کے ساتھ ساتھ اپنے ملک کا نام روشن کروں پھر میں نے باہر جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور اب مجھے احساس ہوتا ہے کہ میرا فیصلہ درست تھا۔''

''مجھے تمہارے اس فیصلے سے خوشی ہوئی ہے سمیرا۔'' مصطفیٰ مشرفہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''تم میں نہ صرف علم کی محبت بلکہ اپنے علم سے غریبوں کو فیض یاب کرنے کا جذبہ اور اپنے وطن کا پیار موجود ہے۔''

''اس کے لیے میں اپنے والد کی مرہون منت ہوں جنہوں نے بہت پیار سے مجھے یہ بات سمجھائی ہے کہ دوسروں کا احسان لینے سے بہتر ہے کہ میں اپنے ملک پر ہی انحصار کروں اور اپنی کامیابیوں سے اپنے ملک کو فائدہ پہنچاؤں۔''

تمہارے والد کا یہ جذبہ قابل ستائش ہے دو روز بعد یہاں کیمپس میں جو تقریب ہونے والی ہے وہ تمہارے لیے تمہارے ملک میں ترقی کی نئی راہیں کھول دے گی۔''

''انشاء اللہ سر۔'' سمیرا نے پُر اُمید انداز میں کہا۔

☆☆☆

دو روز بعد قاہرہ یونیورسٹی کے گراؤنڈ میں تقریب کے

لیے اسٹیج سجایا گیا تھا۔ یونیورسٹی میں جگہ جگہ سمیرا کی تصویروں کے ساتھ بڑے بڑے بینر لگے ہوئے تھے جن پر لکھا تھا۔

''مصر کی پہلی خاتون سائنسدان برائے جوہری توانائی۔''

جگہ جگہ لگے درختوں کو قمقموں سے سجایا گیا تھا اور اسٹیج دلہن کی طرح خوبصورتی سے سنوارا گیا تھا پنڈال میں حکومتی افسران کے، صحافیوں کے اور اساتذہ کے بیٹھنے کے لیے الگ الگ نشستوں کا انتظام تھا یونیورسٹی کے گیٹ سے پنڈال تک کے راستے کو قالینوں اور لائٹوں سے سجایا گیا تھا۔

تقریب کے آغاز پر قاہرہ یونیورسٹی کی تاریخ، مقاصد اور کامیابیاں مختصر طور پر بیان کی گئی تھیں اس کے بعد شعبہ جوہری توانائی کے بارے میں ایک مضمون پڑھا گیا تھا اور پھر سمیرا کا تعارف پیش کرنے کے بعد اسے اسٹیج پر بلایا گیا تھا جہاں اسے اعزازی سند پیش کی گئی تھی اس کے والد، سرمد کی والدہ سرمد کے ساتھ مہمانوں میں بیٹھی تھیں سمیرا نیلے رنگ کا گاؤن پہنے اسٹیج پر آئی تھی اس نے مہمان خصوصی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے سند وصول کی تھی اور مائیک کی طرف بڑھ گئی تھی کیونکہ اس سے اپنے جذبات بیان کرنے کی فرمائش کی گئی تھی۔

''معزز مہمانِ خصوصی، محترم اساتذہ اور میرے طالب علم ساتھیو!

آج میں آپ لوگوں کے درمیان خود کو بہت خوش قسمت سمجھ رہی ہوں، مجھے آپ جیسے چاہنے والے ساتھی اور اساتذہ ملے آپ جیسے ساتھیوں کے بغیر میں کبھی بھی ہرگز یہ کامیابی حاصل نہیں کرسکتی تھی خاص طور سے میں شعبہ جوہری توانائی کے سربراہ ڈاکٹر مصطفیٰ مشرفہ کی مشکور ہوں جنہوں نے اپنے قیمتی وقت سے مجھے بہت سے لمحات دیئے اور میری آبیاری کی جس کی بدولت مجھے اس شعبے میں پہلی خاتون سائنسدان ہونے کا اعزاز حاصل ہوا میں جوہری طاقت کے پُرامن استعمال پر یقین رکھتی ہوں اور مستقبل میں اسے انسانیت کی بہتری کے لیے استعمال کرنا چاہتی ہوں۔ میرا ارادہ ہے کہ میں مصر کے مختلف اسپتالوں میں اپنی رضا کارانہ خدمات پیش کروں گی اور خاص طور سے کینسر کے مریضوں کو صحت مند کرنے کے لیے اس توانائی کو استعمال کروں گی جس میں خود میری والدہ بھی زندگی کی بازی ہار گئی تھیں۔ اس کے علاوہ میری کوشش ہوگی کہ جوہری توانائی سے فراہم کیا جانے والا علاج اتنا آسان اور سستا ہو جیسے کوئی بھی غریب شخص سر درد کی گولی ''اسپرین'' خرید سکتا ہے۔'' (سمیرا کے اس قول کو بعد میں بہت شہرت حاصل ہوئی)۔

عراق یونیورسٹی سے اپارٹمنٹ لیٹر ملنے کے بعد سمیرا نے اسسٹنٹ پروفیسر کے طور پر وہاں پڑھانا شروع کردیا تھا۔ اس کے علاوہ وہ فارغ اوقات میں مختلف دھاتوں کو توڑ کر ان کا ایک سستا استعمال کھوجنے میں لگی رہتی تھی پھر اس نے مصر کے کئی اسپتالوں میں اپنی رضا کارانہ خدمات بھی پیش کردی تھیں جہاں وہ تجرباتی طور پر مریضوں کو جوہری توانائی سے علاج فراہم کرتی تھی اور سرطان سے جنگ میں فتح حاصل کرنا چاہتی تھی۔

آہستہ آہستہ سمیرا موسیٰ کی یہ خدمات رنگ لائیں اور جوہری توانائی کے شعبے میں اس کی کامیابی کی شہرت دور دور تک پہنچ گئی اور اسے بیرونی ممالک سے دعوت نامے آنے لگے لیکن سمیرا نے ان پر توجہ نہ دی آخر 1950ء میں اسے امریکی حکومت کی طرف سے Full Bright اسکالر شپ کی آفر آئی۔

''سمیرا، مبارک ہو..... کیا تم اس اسکالرشپ کے لیے جارہی ہو؟'' سرمد نے اس سے پوچھا۔

''نہیں سرمد، تم جانتے ہو میں اپنے ملک کو اہمیت دیتی ہوں۔'' سمیرا نے کہا۔

''لیکن اس طرح تمہیں وہاں کی اعلیٰ یونیورسٹیز میں تحقیق اور ریسرچ کا موقع ملے گا۔'' سرمد نے سمجھایا۔

''ہاں۔ ایک وقت تھا جب میری یہ شدید خواہش تھی اور میں وہاں جانا چاہتی تھی تب میرے والد نے مجھے سمجھایا تھا اور مجھے مصر ہی میں تعلیم مکمل کرنے کے لیے رضا مند کرلیا تھا۔''

''لیکن اب تو قدرت تمہیں موقع دے رہی ہے اسے مت گنواؤ، اس سے فائدہ اٹھاؤ۔'' سرمد نے سمجھایا اور سمیرا نے سرمد سے اس موضوع پر سوچنے کا وعدہ کرلیا پھر اپنے والد سے ایک ہفتے تک اس موضوع پر بات کرتے رہنے کے بعد اس نے یہ اسکالرشپ قبول کرلی تھی اور امریکا جانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

''سمیرا تم بہت یاد آؤ گی۔'' سرمد نے یونیورسٹی میں سمیرا کے آخری دن اس سے کہا، وہ بہت اداس تھا جانتا تھا کہ اب سمیرا اس سے بہت دور جارہی ہے۔ اب اس کی خوش قسمتی ہی سمیرا کو اس کے پاس واپس لاسکتی تھی ورنہ سمیرا کے لیے تو نئی دنیاؤں کے بہت سے دروازے کھل گئے تھے۔

''سرمد تم اداس کیوں ہو؟ دیکھو میری کامیابی پر سب

خوش ہیں۔'' سمیرا نے کہا۔

''سب اس لیے خوش ہیں سمیرا کہ تمہارا اور ان کا ساتھ یہاں تک ہی تھا لیکن تمہاری اور میری کہانی تو ادھوری ہے یہ تو ابھی شروع ہی ہوئی تھی کہ ختم ہونے جارہی ہے۔'' سرمد نے اداسی سے کہا اور سمیرا نے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

''یوں نہ کہو سرمد..... تم جانتے ہو میں نے اپنی زندگی میں صرف تعلیم کو اہمیت دی ہے ورنہ مجھے اپنے والد کے علاوہ کسی قریبی رشتے کا پیار نہیں ملا نہ ہی والدہ کا اور نہ ہی کسی بہن بھائی کا کیونکہ میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ بچپن آیا کی نگرانی میں اور جوانی تعلیم کے حصول میں صرف ہوگئی لیکن یقین کرو جب میں واپس آؤں گی تو ہماری شاندار زندگی شروع ہوگی۔ میری غیر موجودگی میں میرے والد کا خیال رکھنا وہ بوڑھے ہوگئے ہیں اور میری جدائی انہیں اداس کردے گی۔ تم ان کے پاس آتے جاتے رہنا اور مجھ سے بھی رابطے میں رہنا۔ وہ خط لکھنے کے معاملے میں بہت بے پرواہ ہیں تو تم مجھے ان کی خیریت کے بارے میں آگاہ کرتے رہنا۔''

''ہاں ضرور سمیرا۔ میں ایسا ہی کروں گا اور خدا سے دعا کروں گا کہ تم جلد از جلد کامیاب ہو کر واپس آجاؤ۔'' سرمد نے اداسی سے کہا۔

سمیرا کی اگلی اور آخری ملاقات سرمد سے ائرپورٹ پر ہوئی تھی جب وہ اپنی والدہ اور سمیرا کے والد کے ساتھ اسے رخصت کرنے آیا تھا۔

''سمیرا بیٹا اپنا خیال رکھنا۔'' اس کے والد نے اسے پیار سے گلے لگاتے ہوئے کہا۔

''اور اپنی خیریت سے آگاہ کرتی رہنا، تم دور جارہی ہو تمہاری یاد آتی رہے گی۔'' سرمد کی والدہ نے بھی اسے گلے سے لگاتے ہوئے کہا پھر سرمد روانگی کے لاؤنج تک اس کے ساتھ آیا تھا اور جیب سے ایک چھوٹی سے انگوٹھی کی ڈبیہ نکال کر اس کی طرف بڑھادی تھی جسے سمیرا نے نہیں لیا تھا بلکہ ایک ٹک اس کی طرف دیکھتی رہ گئی تھی اور پھر اپنا سیدھا ہاتھ اس کے سامنے کردیا تھا۔

''لو سرمد۔ آج میں تمہیں اجازت دیتی ہوں تم اپنی محبت کی یہ نشانی خود مجھے پہنا دو۔'' اس نے اداس مسکراہٹ کے ساتھ کہا اور سرمد نے ڈبیہ سے انگوٹھی نکال کر اس کی انگلی میں پہنادی تھی۔

''خود کو اکیلا مت سمجھنا تمہیں یہ انگوٹھی یاد دلاتی رہے گی کہ تمہارا جیون ساتھی تمہارا منتظر ہے۔'' سرمد نے کہا۔

''ہاں، شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔ میں پہلی بار اپنے بابا سے دور جارہی ہوں اور وہاں پردیس میں میرے ساتھ کوئی میرا نہیں ہوگا تب تم لوگوں کی بہت یاد آئے گی۔

''جب میری یاد آئے تو اس انگوٹھی کو چوم لینا سمیرا۔'' سرمد نے وارفتگی سے کہا۔ سمیرا کی فلائٹ روانہ ہونے کا وقت ہوگیا تھا اور وہ الوداعی انداز میں ہاتھ ہلاتی اس سے رخصت ہوگئی تھی۔

☆☆☆

اسے امریکی شہر مسیوری میں وہاں کی یونیورسٹی سینٹ لوئیس کے پروفیسر ڈیوڈ نے ائرپورٹ پر ریسیو کیا تھا۔ ان کے ساتھ عملے کے دو اور بھی افراد تھے جنہوں نے بڑی گرمجوشی سے سمیرا سے مصافحہ کیا تھا اور اسے کار میں بٹھایا تھا۔

''بس ہم کچھ ہی دیر میں کیمپس پہنچ جائیں گے جہاں شعبہ جوہری توانائی کے لوگ آپ کے منتظر ہیں۔'' پروفیسر ڈیوڈ نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا اور سمیرا نے سر کو اثبات میں جنبش دی۔

ائرپورٹ سے کیمپس تک کے راستے میں پروفیسر ڈیوڈ اس سے مختلف قسم کے سوالات پوچھتے رہے تھے جن کے وہ مختصر جوابات دیتی رہی تھی۔

''ابھی ہم کیمپس جارہے ہیں جہاں شعبے کے دوسرے لوگوں سے آپ کا تعارف کروایا جائے گا پھر آپ ان کے ساتھ ناشتا کریں گی اور اس کے بعد مسٹر فرینک آپ کو آپ کے ہاسٹل چھوڑ دیں گے جہاں آپ کی رہائش کا انتظام کیا گیا ہے۔ کل صبح ٹھیک نو بجے آپ کو گاڑی کیمپس لے آئے گی جہاں آپ کو آپ کی مزید مصروفیات کے بارے میں بتایا جائے گا۔ مسٹر فرینک آپ کے امریکا میں قیام کے دوران آپ کے اسسٹنٹ ہوں گے۔ انہیں آپ کی دیکھ بھال کی ذمے داری سونپی گئی ہے۔'' پروفیسر ڈیوڈ نے اپنے ساتھ آئے ہوئے دونوں افراد میں سے ایک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جس کا قد کچھ لمبا تھا اس نے سمیرا کی طرف دیکھ کر مسکرا کر سر ہلایا تھا اور سمیرا نے بھی اسی انداز میں اس کا جواب دیا تھا۔

یونیورسٹی پہنچتے ہی اسے ایک بڑے ہال میں پہنچا دیا گیا جہاں ایک بڑی سی میز کے گرد کچھ افراد بیٹھے ہوئے تھے جن سے تعارف کے بعد سمیرا کو بھی ان سے متعارف کروایا

گیا تھا۔ سمیرا نے اپنے بارے میں مختصراً بتایا تھا اور اسے اسکالرشپ دینے پر یونیورسٹی اور حکومتی انتظامیہ کا شکریہ ادا کیا تھا جس کے بعد چائے پیش کی گئی تھی۔ مسٹر ڈیوڈ اور فرینک مستقل اس کے ساتھ تھے جنہوں نے بعد میں اسے ہاسٹل میں چھوڑ دیا جہاں ایک خاص کمرے میں اس کے قیام کا انتظام کیا گیا تھا۔ ہاسٹل کی انتظامیہ نے جب رات کو اسے کھانا پیش کیا تھا تب اس سے صبح کے ناشتے کے بارے میں بھی پوچھ لیا تھا کہ وہ کیا لینا چاہے گی۔

دوسری صبح ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد اس نے اپنے سوٹ کیس سے نیا لباس نکال کر بدلا تھا اور کیمپس جانے کے لیے تیار ہوگئی تھی ٹھیک نو بجے گاڑی اسے پک کرنے آگئی تھی اور وہ روانہ ہوگئی تھی۔ اسے تمام ضروری سہولتیں یونیورسٹی کی طرف سے فراہم کی گئی تھیں۔ اس کے کمرے میں بھی فون، ٹی وی سب موجود تھا اس کی لانڈری کا انتظام ہاسٹل کی انتظامیہ کے ذمے تھا اسے کسی قسم کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

''ہیلو سمیرا کیسی ہو بیٹھو۔'' مسٹر فرینک نے اس سے کہا جو اپنے کمرے میں بیٹھے تھے اور سمیرا کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔

''آپ چائے لیں گی یا کافی؟'' انہوں نے اخلاقاً پوچھا۔

''میں ناشتا کر چکی ہوں۔'' سمیرا نے جواب دیا۔

''آپ شاید مجھے یہاں کی میری آئندہ مصروفیات کے بارے میں بتانے والے تھے۔''

''جی ہاں، بس مسٹر ڈیوڈ آنے ہی والے ہیں ہم کچھ ہی دیر میں تمام تفصیلات آپ کے گوش گزار کر دیں گے۔''

پھر مسٹر ڈیوڈ کے آنے پر اسے فیکلٹی میں اس کی ٹائمنگ کے بارے میں بتایا گیا تھا اور آئندہ اس کی ریسرچ کی بنیاد کن چیزوں پر ہوگی اس کی وضاحت بھی کی گئی تھی۔

''کیا یہ ممکن ہے کہ میں یہاں جوہری توانائی کے بارے میں ایک امن کانفرنس کر سکوں۔''

''ہاں بالکل ممکن ہے بلکہ میں تو چاہتا ہوں کہ جس طرح آپ کی آپ کے ملک میں پذیرائی کی گئی ہے اسی طرح بلکہ اس سے بھی اچھی طرح ہم دنیا کو آپ کے جوہری توانائی کے بارے میں پُرامن خیالات کے بارے میں بتائیں اور ہم یہ بھی بتانا چاہتے ہیں کہ دنیا کو یہ بھی پتا چلے کہ ہم مستحق طلبا کو اپنے خرچ پر ان کے شعبے میں اسکالرشپ دیتے ہیں۔ انہیں ماہانہ وظیفہ ملتا ہے جس سے وہ اپنے اخراجات پورے کرتے ہیں جبکہ تعلیمی اخراجات ہماری حکومت خود اٹھاتی ہے۔''

''جی ضرور۔ ہر اچھے کام کے بارے میں دنیا کو پتا ہونا چاہیے۔'' سمیرا نے کہا۔ اس کے بعد مسٹر فرینک نے اسے امریکن یونیورسٹی کا وزٹ کروایا تھا خاص طور سے وہ اسے سب سے پہلے جوہری توانائی لیب دکھانے لے گئے تھے جس میں سمیرا نے خاص دلچسپی لی تھی۔

سینٹ لوئیس یونیورسٹی کی طرف سے جس امن کانفرنس کا انعقاد کیا گیا تھا اس میں اخبار ورسائل کے صحافیوں نے بڑی تعداد میں شرکت کی تھی۔ اس کانفرنس کا مقصد دنیا کو سمیرا کی قابلیت اور اس کے عزائم سے آگاہ کرنے کے ساتھ ساتھ امریکا کے اس اقدام کا پرچار کرنا بھی تھا کہ اس طرح یہ کانفرنس بین الاقوامی جوہری توانائی امن کانفرنس کے طور پر منعقد کی گئی تھی اور میڈیا نے اس کی خوب تشہیر کی تھی۔ اس موقع پر بھی سمیرا نے اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ سب سے پہلی بات اس نے یہی کہی تھی کہ وہ چاہتی ہے کہ کینسر کا علاج عام لوگوں کے لیے اتنا سستا کر دے جیسے وہ سر درد کے لیے ''اسپرین'' کی گولی خریدتے ہیں۔ اس تصور کو عملی جامہ پہنانے کے لیے سمیرا نے سخت محنت کی۔ وہ سارا سارا دن لیبارٹری میں تحقیقی سرگرمیوں میں مصروف رہتی پھر اس نے سستی دھاتوں کے جوہر توڑ کر ستا بم بنانے کا طریقہ بھی ایجاد کر لیا تھا جس سے ان کے خیال میں تیسری دنیا کے استحصال زدہ ملکوں کو اسٹکام مل سکتا تھا اور وہ ایٹمی بم کے حملے سے محفوظ رہ سکتے تھے اور دوسری طرف طاقتور ملکوں کے خلاف خطرے کی گھنٹی ثابت ہو سکتے تھے۔

اس کے علاوہ اس کانفرنس میں جوہری توانائی کے خطرات کے بچاؤ کے لیے بہت سی سفارشات مرتب کی گئی تھیں اور ایک کمیٹی ترتیب دی گئی تھی جس کی قیادت سمیرا کے ذمے تھی۔ اس موقع پر اسے امریکی شہریت بھی دی گئی تھی اور کیلیفورنیا کی کچھ جوہری تجربہ گاہوں کے دورے کی دعوت بھی دی گئی تھی۔ وہ پہلی غیر ملکی تھی جو امریکا کے ان حساس مقامات تک رسائی حاصل کر رہی تھی۔ یہ بات بعض حلقوں میں پسند نہیں کی جا رہی تھی اور امریکا میں نسل پرستانہ منفی رویہ دیکھنے میں آ رہا تھا۔ سمیرا کو کئی موقعوں پر اس مخالفت کا سامنا کرنا پڑا تھا اور وہ دلبرداشتہ ہوگئی تھی پھر اس نے ان حالات سے پریشان ہو کر ایک موقع پر سرمد کو خط لکھا اور اس سے

مشورہ طلب کیا۔

''میری زندگی کے ساتھی

سرمد!

اُمید ہے تم خیریت سے ہوگے، یہاں آئے ہوئے کافی دن ہوگئے لیکن مصروفیت کی وجہ سے تمہیں خط نہ لکھ سکی۔ میں بہت خوش ہوں کہ مجھے اپنے خواب کو حقیقت میں بدلنے کا موقع ملا اب منزل مجھ سے زیادہ دور نہیں۔ میں نے اپنے سستی دھاتوں کے جوہر کے توڑنے کا فارمولا ایجاد کرلیا ہے۔ اب مزید آگے میں ان سے کینسر جیسی مہلک بیماری کا علاج دریافت کرنا چاہتی ہوں لیکن کچھ لوگ چاہتے ہیں کہ اس سے جوہری بم (جو سستا ہو) بناؤں اور اس ایجاد کا ذکر صرف اور صرف اس ملک ہی کے نام سے کیا جائے جو مجھے سہولیات فراہم کررہا ہے۔ مجھے ایسا اندازہ ہورہا ہے کہ شاید میں یہاں آزادی سے کام نہ کرسکوں اس کے علاوہ ایک مخالف گروپ بھی ہے جو پسند نہیں کرتا کہ ان کی اہم جگہوں تک کسی غیر ملکی کو رسائی دی جائے۔ میں واپس آنے کے بارے میں سوچ رہی ہوں اور یہی کام اپنے ملک کے لیے کرنا چاہتی ہوں۔ تمہارے جواب کا شدت سے انتظار رہے گا۔''

''تمہاری سمیرا''

اس خط کو لکھنے کے دو دن بعد سمیرا کی ملاقات ایک نئی لڑکی سے ہوئی جس کا نام رافیہ ابراہیم تھا۔ اس کا تعلق بھی مصر سے تھا اور وہ مصر کی صف اوّل کی اداکارہ تھی۔ رافیہ سے اس کی ملاقات ایک پریس کانفرنس کے دوران ہوئی تھی اور ان دونوں میں جلد ہی دوستی ہوگئی تھی وہ یہودی تھی لیکن اس کے اندر نسلی تعصب بالکل نہیں تھا پھر چند ملاقاتوں میں وہ سمیرا کے بہت قریب آگئی تھی اور اکثر اس کی چھوٹی چھوٹی پریشانیوں پر اسے کارآمد مشورے دیتی تھی۔

''سمیرا تم خوش قسمت ہو کہ اتنی کم عمر میں تم نے سائنسی میدان میں ایک اہم مقام حاصل کرلیا ہے۔'' رافیہ نے ایک روز اس سے کہا جب وہ دوپہر کے لنچ پر ایک ہوٹل میں ملی تھی۔

''ہاں۔ تم ٹھیک کہتی ہو لیکن اس کے لیے میرے والد اور میں نے بہت جدوجہد کی ہے۔'' سمیرا نے جواب دیا جس کے بعد رافیہ نے اس سے کئی ذاتی سوالات کیے تھے اس نے اسے اپنے بچپن سے اب تک کی ساری کہانی سنادی تھی کہ کس طرح بچپن میں اس کی والدہ کینسر سے ہلاک ہوگئیں اور پھر اسے اس کے والد نے کیسے پالا کیسے رہائش تبدیل کی اس کے بعد کس علاقے میں گئے اور کیسے سمیرا کو آگے تعلیم دلوائی۔ اس نے سمیرا کو سرمد کے بارے میں بھی بتایا۔

''وہ بہت اچھا ہے، میرا بہت خیال کرتا ہے۔ یہ اس کی محبت ہی ہے کہ وہ میری کامیابی تک میرا انتظار کرنے کا وعدہ کرچکا ہے۔'' سمیرا نے اپنی انگلی میں پڑی انگوٹھی کو پیار سے سہلاتے ہوئے کہا۔

''اوہ..... دکھاؤ.....'' رافیہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سامنے کرلیا اور انگوٹھی دیکھنے لگی۔ ''واقعی بہت خوبصورت ہے..... بالکل تمہاری طرح۔''

''شکریہ۔'' سمیرا نے مختصر سا جواب دیا۔

''تمہیں کیسا لگتا ہے سمیرا اس بیسویں صدی میں جبکہ لوگ سائنسدان البرٹ آئن اسٹائن اور انریکو فرمس کو پسند کرتے ہیں تم بھی اپنی پہچان بنا سکی ہو اور نیوکلیئر فزکس میں خاتون سائنسدان کے طور پر تمہاری شناخت ہوتی ہے۔''

''مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔''

''تمہیں پتا ہے تمہاری اسی خاصیت نے مجھے مجبور کیا کہ میں تمہیں اپنا دوست بناؤں۔ میں بہت مشکل سے کسی کو دوست بناتی ہوں؟'' رافیہ نے ایک انداز بے اعتنائی سے کہا۔

''یہ میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے تم جیسی اچھی دوست مل گئی ہے۔'' سمیرا نے خوشدلی سے کہا۔

''میں نے سنا ہے کہ تم واپس مصر جانا چاہتی ہو؟'' رافیہ نے پوچھا۔

''ہاں، میں سوچ تو رہی ہوں۔'' سمیرا نے جواب دیا وہ کئی لوگوں کے سامنے پہلے ہی یہ بات کرچکی تھی۔

''لیکن تم ایسا کروگی تو غلط کروگی تمہیں یہاں اتنی سہولتیں میسر ہیں ماہانہ وظیفہ بھی ملتا ہے تمہیں امریکا کے لیے کام کرنا چاہیے۔'' رافیہ نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

''نہیں، میرا خیال ہے کہ میرے وطن کو میری ضرورت ہے۔ اگر ہم ہی اپنے ملک کی ترقی کے لیے کام نہیں کریں گے تو کون کرے گا؟'' سمیرا نے کہا۔

''لیکن تمہارے اوپر انویسٹمنٹ تو امریکا کررہا ہے مصر نہیں۔'' رافیہ نے جتایا۔

''اس کے لیے میں نے امریکا سے مدد نہیں مانگی تھی انہوں نے اپنی خدمات رضا کارانہ پیش کی تھیں اور بغیر کسی شرط کے کی تھیں۔''

''لیکن کچھ اخلاقی ذمہ داریاں بھی تو ہوتی ہیں۔''

''ہاں..... بالکل..... اس کے لیے میں جب مناسب سمجھوں گی امریکا کے لیے کچھ نہ کچھ خدمت ضرور انجام دے دوں گی۔''

''ٹھیک ہے..... چلو میں تمہیں تمہاری رہائش گاہ تک چھوڑتی ہوئی آگے چلی جاؤں گی۔'' رافیہ نے کہا اس روز سمیرا نے یونیورسٹی کی طرف سے ملنے والی گاڑی کی سہولت استعمال نہیں کی تھی کیونکہ اسے اس کے گھر سے رافیہ ہی نے پک کیا تھا اور واپس ڈراپ کرنے کا بھی وعدہ کیا تھا۔ وہ دونوں کچھ ہی دیر بعد ہوٹل سے نکل گئی تھیں۔

واپسی پر ہاسٹل میں اپنے کمرے کا لاک کھول کر سمیرا کمرے میں داخل ہوئی تھی اور سیدھی کچن کی طرف بڑھ گئی تھی۔

''تھوڑی دیر بیٹھو میں کافی بناتی ہوں پی کر جانا۔'' سمیرا نے کہا اور اس کے جاتے ہی رافیہ نے ٹیبل پر رکھی کمرے کی چابی اٹھائی اور غسل خانے میں گھس گئی پھر اس نے صابن پر چابی کا نقش لے لیا تھا اور صابن واپس اپنے پرس میں ڈال لیا تھا جو اس نے پہلے سے اسی ارادے کے تحت پرس میں رکھا ہوا تھا پھر وہ باہر آکر ایک صوفے پر نیم دراز ہوگئی تھی اور چابی کو واپس ٹیبل پر رکھ دیا تھا۔

سمیرا کافی کے دو مگ لیے ہوئے کمرے میں داخل... ہوئی تو رافیہ سگریٹ کے کش لے رہی تھی۔

''تم اسموکنگ بھی کرتی ہو؟'' سمیرا نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں، کبھی کبھی۔'' رافیہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

کچھ دیر سمیرا کے پاس رکنے کے بعد رافیہ چلی گئی تھی اور سمیرا آرام کے غرض سے لیٹ گئی تھی۔ اسے سرمد کے خط کے جواب کا شدت سے انتظار تھا لیکن ابھی تک سرمد کا جواب نہیں آیا تھا۔ پہلے وہ رافیہ کے ہوتے ہوئے پریشان نہیں ہوتی تھی لیکن آج کل وہ اس سے جتنے سوالات کر رہی تھی انہوں نے اسے پریشان کر دیا تھا لیکن وہ اسے ایک دوست کی حیثیت ہی دیتی رہی تھی۔

☆☆☆

رافیہ ابراہیم بظاہر مصر کی ایک مشہور اداکارہ تھی لیکن اس کا تعلق ایک انتہا پسند صیہونی ایجنسی سے تھا اور وہ اس کے لیے ہی کام کرتی تھی۔ وہ ایک پروگرام کے تحت سمیرا کی دوست بنی تھی اور اس کے قریب سے قریب تر رہنے کی کوشش کرتی تھی۔ سمیرا نے کبھی اس پر شک نہیں کیا تھا کیونکہ اس کی تربیت ایک گھریلو ماحول میں ہوئی تھی اس کی توجہ صرف اور صرف اپنی تعلیم اور اپنی منزل پر پہنچنے کی خواہش پر تھی بچپن سے جوانی تک ہمیشہ اسے صرف لوگوں کی تعریفی باتیں ہی سننے کو ملی تھیں جو اس کی کامیابیوں پر اسے سراہتے تھے کبھی کسی نے اس کی مخالفت نہیں کی تھی اور نہ ہی زبردستی اس پر اپنی مرضی کو ٹھونسنے کی کوشش کی تھی خود اس کے والد اور سرمد بھی اس کی رائے کو زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ رافیہ سے بات کرنے کے بعد اس کے دل کو خاصا سکون ملتا تھا اور وہ اسے ایک مخلص دوست کے علاوہ اور کچھ نہیں سمجھتی تھی۔ جبکہ رافیہ آہستہ آہستہ اس کے قریب آتی جا رہی تھی اور اس کے ساتھ زیادہ وقت گزارنے کے ساتھ ساتھ اہم سوالوں کے جوابات بھی حاصل کرتی جا رہی تھی اور آخر کار وہ اس کے کمرے کی چابی کا نقش حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی تھی۔ یہ کام اسے اس کے ایجنسی کے ساتھیوں کی طرف سے دیا گیا تھا۔ چابی کا وہ نقش اس نے انہیں دینا تھا جو خود رافیہ کی ان کے ساتھ وفاداری کی سند سمجھی جاتی۔

چند روز بعد پھر رافیہ نے سمیرا سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی

''خیریت؟ آج کیا پروگرام ہے؟'' سمیرا نے اس سے فون پر ہی پوچھا۔

''تمہیں یہ جان کر خوشی ہوگی کہ آج میری سالگرہ ہے..... تمہیں پتا ہے میں بھی تمہاری طرح اکیلی رہتی ہوں چنانچہ چاہتی ہوں کہ آج رات تمہارے ساتھ جشن مناؤں۔'' رافیہ نے کہا۔

''جشن منانے کی حد تک ٹھیک ہے رافیہ لیکن ساری رات نہیں..... تم جانتی ہو میرا کام مجھے اتنی مہلت نہیں دیتا کہ میں ساری ساری رات جشن مناسکوں مجھے علی الصبح ہی لیبارٹری کے لیے روانہ ہونا ہوتا ہے۔'' سمیرا نے وضاحت کی۔

''اچھا تو ایسا کرو کہ میرے ساتھ رات کا شو دیکھ لو بہت اچھی فلم لگی ہے۔ میں تمہیں واپسی پر گھر چھوڑ دوں گی اور تمہیں سات بجے پک کرلوں گی کیونکہ ہم کھانا اکٹھے کھائیں گے اور سالگرہ بھی سیلیبریٹ کریں گے۔'' رافیہ نے کہا۔

''او کے ٹھیک ہے۔''

ٹھیک سات بجے رافیہ ہاسٹل آگئی تھی اور سمیرا کو دیکھ کر

حیران رہ گئی تھی جس نے بہت خوبصورت گلابی رنگ کی میکسی زیب تن کی تھی۔ بال کھلے تھے اور چہرے پر ہلکا سا میک اپ بھی تھا۔

''واؤ..... ایسا لگ رہا ہے جیسے سالگرہ تو تمہاری ہے۔'' رافیہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

''تمہیں..... میرا لباس پسند آیا؟'' سمیرا نے پوچھا۔

''ہاں، بہت..... بہت پسند آیا۔''

''یہ مجھے سرمد نے دیا تھا۔'' سمیرا نے ہنستے ہوئے کہا۔

''میری سالگرہ پر۔''

''اوہ..... بہت خوب۔''

اس روز وہ دونوں شہر کے بہترین ہوٹل میں گئیں جہاں رافیہ نے اپنی سالگرہ کے لیے صرف ایک میز بک کروائی تھی اور اس کی مہمان صرف سمیرا تھی ان کے وہاں پہنچنے کے کچھ ہی دیر بعد ایک خوبصورت کیک لایا گیا تھا جس پر موم بتیاں لگی تھیں اور ان کی میز پر رکھ دیا گیا تھا۔

''اوہ رافیہ، اگر مجھے پہلے پتا ہوتا کہ تم مجھے اتنی اہمیت دیتی ہو کہ تمہاری سالگرہ میں صرف میں ہی تمہاری واحد مہمان ہوں تو یہ سالگرہ میری طرف سے ہوتی۔'' سمیرا نے فرطِ جذبات سے کہا۔

''یہ حقیقت ہے تم اب بھی ایسا ہی سمجھ سکتی ہو۔'' رافیہ نے کہا۔

آرکسٹرا ہال میں دھیمے دھیمے سروں میں موسیقی بکھیر رہا تھا سمیرا نے میز پر رکھے کیک پر لگی شمعوں کو روشن کیا اور رافیہ کی طرف محبت بھرے انداز میں دیکھتے ہوئے اسے کیک کاٹنے کا اشارہ کیا۔ رافیہ نے جھک کر ایک ہی پھونک سے شمعیں بجھا دیں اور چھری پکڑ کر کیک کاٹ دیا۔

''تمہیں سالگرہ بہت مبارک ہو رافیہ۔'' سمیرا نے اپنا بیگ کھولتے ہوئے کہا اور اس میں سے ایک جیولری کا ڈبا نکال کر جو سرخ رنگ کا تھا وہ اس نے رافیہ کی طرف بڑھا دیا تھا۔

''یہ لو، یہ تمہاری سالگرہ کا تحفہ ہے ایک اچھی دوست کی طرف سے۔''

''اوہ سمیرا اس کی کیا ضرورت تھی۔ میں تو بس تمہارے ساتھ چند خوشی کے لمحے گزارنا چاہتی تھی۔'' رافیہ نے جیولری کا ڈبا پکڑتے ہوئے کہا پھر اس نے اسے کھولا تھا۔ اندر ایک خوبصورت نیکلس اور آویزے دیکھ کر خوش ہو گئی تھی۔

''اوہ سمیرا یہ تو بہت قیمتی لگتا ہے۔'' اس نے حیرت

## ملک ملک کے دلچسپ قوانین

☆ کیرولینا میں عدالت کی سیڑھیوں پر اتوار کے دن اپنی بیوی کو مارنا جائز ہے۔ یہ کوئی جرم نہیں سمجھا جاتا (میرا خیال ہے کہ بہت سے دل جلے شوہر اتوار کے دن کا انتظار کر کے کسی نہ کسی بہانے بیوی کو عدالت کی سیڑھیوں تک لے جاتے ہوں گے)

☆ ٹیکسی میں گہری نیند کے عالم میں گاڑی چلانا جرم ہے۔ (ان سے پوچھنا پڑے گا کہ نیند کے عالم میں گاڑی چلانے کا کیا طریقہ ہو سکتا ہے؟)

☆ نیویارک میں بلند عمارت سے کودنا جرم ہے۔ اس پر جرمانہ ہو جاتا ہے۔ (اگر وہ زندہ رہا تب تو)۔

☆ پنسلوانیا ہی کا ایک دلچسپ قانون۔ ہم میں اکثر نے اپنے بچپن میں یہ کھیل کھیلا ہو گا۔ نوٹ کو دھاگے سے باندھ کر سڑک پر ڈال دیتے ہیں اور دھاگے کا دوسرا سرا لے کر کہیں چھپ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اگر کوئی شخص نوٹ کو دیکھ کر اس کو اٹھانے کے لیے آگے بڑھتے تو دھاگے کو کھینچنا شروع کر دیتے ہیں۔ یاد آیا؟ تو وہاں بھی ایسا ہی ہوتا ہے لیکن فرق یہ ہے کہ اگر آپ نے نوٹ کو کھینچنا شروع کیا تو یہ جرم ہے۔ اس کو اٹھانے دیں کیوں کہ یہ اس کا حق ہے۔

☆ نیویارک کے ریسٹوران میں اگر سینڈوچ چکن، میونیز کا بنا ہوا ہے تو آپ اسے بیف سینڈوچ نہیں کہہ سکتے۔ یہ ایک جرم ہے۔ (شاید یہ دھوکا دہی میں آتا ہو)۔

☆ سان فرانسسکو میں آپ اپنی گاڑی کے شیشے اس انڈر ویئر سے صاف نہیں کر سکتے جس کو آپ استعمال کر چکے ہیں۔

☆ فرانس میں غیر انسانی چہروں کی گڑیائیں اور گڈے فروخت کرنا جرم ہے۔ جیسے ای ٹی ڈول، وغیرہ۔

☆ لوسیانا میں اگر جھگڑے کے دوران میں آپ نے اگر کسی کو اپنے فطری یعنی پیدائشی دانتوں سے کاٹ لیا تو یہ کوئی اتنا بڑا جرم تصور نہیں کیا جاتا لیکن اگر آپ نے مصنوعی دانتوں سے کاٹا ہے تو یہ ایک بڑا جرم ہے۔ (انتباہ۔ نقلی دانتوں والے لوسیانا جا کر جھگڑا نہ کریں)

☆ سوئیزرلینڈ میں رات دس کے بعد کسی شخص کا کسی جگہ اپنے آپ کو ریلیکس کرنا منع ہے۔

☆ فلوریڈا میں شام چھ بجے کے بعد کسی عوامی مقام پر جماہی لینا منع ہے۔ سوائے جمعرات کے۔

☆ میساچوسٹس میں اگر کوئی شخص نہائے بغیر بستر پر لیٹ جائے تو کوئی بھی پولیس کو فون کر کے اس کو گرفتار کروا سکتا ہے۔

مرسلہ: فہیم الدین عطاری۔ فیصل آباد

سے کہا۔

''تمہاری دوستی سے زیادہ قیمتی نہیں ہے محترمہ۔'' سمیرا نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''اب کبھی خود کو تنہا مت کہنا۔''

''نہیں کہوں گی۔'' رافیہ نے کیک کا ایک ٹکڑا کاٹ کر پلیٹ میں رکھا اور پلیٹ اسے پیش کردی۔

''لو۔ کیک چکھو۔''

''ہاں۔ بہت مزیدار ہے۔'' سمیرا نے کیک کا ایک ٹکڑا منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔

''رافیہ، دراصل میری عادت نہیں ہے کہ میں کسی کے ذاتی معاملات میں دخل دوں یہی وجہ ہے کہ آج تک میں نے تم سے کبھی تمہاری تنہائی کے بارے میں نہیں پوچھا لیکن آج یوں اکیلے سالگرہ مناتے دیکھ کر میرے دل میں خیال آتا ہے کہ تم سے پوچھوں کہ تمہارے ساتھ ایسی کون سی مجبوری ہے کہ تم اکیلے رہنے پر مجبور ہو؟''

''تم جانتی ہو میں مصر میں ہی رہتی ہوں اور میں نے دوسری جنگِ عظیم کے دوران وہیں ایک مسلمان انجینئر مصطفیٰ والی سے شادی بھی کی تھی لیکن کچھ ہی عرصے بعد اس سے میری علیحدگی ہوگئی لیکن اس سے میرا ایک بیٹا عمر موسیٰ ہے۔'' رافیہ نے بتایا۔ ''اب تم بھی کچھ ایسا بتاؤ جو بہت کم لوگوں کے علم میں ہے۔''

''دوسری جنگِ عظیم میں جب ناگاساکی اور ہیروشیما پر بم گرائے گئے تب میں دنیا کو یقین دلا رہی تھی کہ نیوکلیئر ٹیکنالوجی کو نقصان پہنچانے کے لیے نہیں بلکہ انسانیت کے فائدے کے لیے استعمال کرنا چاہیے، اس کے ذریعے بھی کینسر کی بیماری کا علاج دریافت کیا جانا ضروری ہے اور اب بھی میں اسی جدوجہد میں لگی ہوں، میں اس خواب کو تعبیر ضرور دوں گی۔'' سمیرا نے کہا۔

''میں جانتی ہوں..... میں نے اخبارات میں اس بارے میں پڑھا تھا۔'' رافیہ نے کہا۔

''میں لوگوں Attomicenry for Peace کی بات کرتی تھی میں نے انگلینڈ کی گورنمنٹ سے بات کی تھی کہ ایک ایڈوائزری کونسل بنائی جائے جو انڈسٹری کو تحفظ فراہم کرے اور لوگوں کی بھلائی کے کام کرے۔''

''ہاں۔ یہ وہ وقت تھا جب اٹامک انرجی گورنمنٹ کے چند افسران کے ہاتھ میں تھی۔'' رافیہ نے جواب دیا۔

''تم اس بارے میں بڑی معلومات رکھتی ہو؟'' سمیرا نے تعجب سے کہا۔ ''حالانکہ تمہارا اس شعبے سے کوئی تعلق نہیں، تم تو ایک اداکارہ ہو۔''

''ہاں۔ لیکن میں ذاتی طور پر لوگوں کے لیے کیے جانے والے بھلائی کے کاموں پر یقین رکھتی ہوں اس کی زندہ مثال میری اور تمہاری دوستی ہے۔''

اس روز کھانے سے فارغ ہونے کے بعد رافیہ اور سمیرا نے فلم بھی دیکھی تھی۔ سمیرا کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے رافیہ اس کے ساتھ زیادہ وقت گزارنا چاہتی ہو رات کا شو ختم ہونے کے بعد اس نے سمیرا کو اس کے ہاسٹل چھوڑا تھا۔

''کیا میں تمہارے ساتھ تمہارے کمرے تک چلوں؟''

''کیوں؟'' سمیرا نے حیرت سے پوچھا کیونکہ رافیہ نے پہلے کبھی ایسی پیش کش نہیں کی تھی۔

''یونہی، آج میں نے تمہارا بہت وقت لیا ہے..... تھک گئی ہوگی۔''

''نہیں ایسی بات نہیں ہے..... تم جاؤ..... میں بھی اب آرام کروں گی۔'' سمیرا نے کہا اور کار سے اتر کر ہاسٹل کے گیٹ کی طرف بڑھ گئی تھی۔

جب وہ اپنے کمرے میں پہنچی تو اسے کمرے کا دروازہ ان لاک ملا تھا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ جاتے وقت وہ خود دروازہ بند کر کے گئی تھی اور جب اس نے اندر قدم رکھا تو کمرے کا سامان الٹا پلٹا ہوا تھا۔ الماری کھلی تھی۔ اس میں سے کپڑے باہر تک بکھرے تھے میز پر رکھی چیزیں بکھری تھیں اور میز کی دراز میں رکھی اس کی اٹامک انرجی ریسرچ کی فائل میز کے باہر بکھری پڑی تھی۔

''اوہ میرے خدا.....؟ یہ سب کیا ہے؟ بھلا یہ کون ہوسکتا ہے؟ میں تو محض ایک تعلیمی ریسرچ کر رہی ہوں بھلا اس میں کسی کا کیا فائدہ یا نقصان جو یوں چوروں کی طرح میرے فلیٹ کی تلاش لی گئی ہے۔'' وہ آہستہ آہستہ فکرمند لہجے میں خود سے باتیں کرتی جا رہی تھی اور بکھری ہوئی چیزوں کو سمیٹتی جا رہی تھی۔

دوسری صبح اس نے یونیورسٹی میں ڈاکٹر ڈیوڈ اور مسٹر فریبک کو اس بارے میں بتایا تھا تو انہوں نے اسے ہوشیار رہنے کی تاکید کی تھی۔

''لیکن بھلا کوئی میرا دشمن کیوں ہوسکتا ہے نہ تو میں کوئی دولت اکٹھی کر رہی ہوں اور نہ ہی کسی کو نقصان پہنچانے کے لیے کوئی کام کر رہی ہوں بھلا میرے ریسرچ ورک سے کسی کو کیا خطرہ ہوسکتا ہے۔؟''

''تم بہت بھولی ہو۔ جانتی ہو اس وقت دنیا میں

جوہری توانائی پر جگہ جگہ ریسرچ ہورہی ہے۔ ہر کوئی ایک دوسرے سے بازی لے جانا چاہتا ہے۔ اسی طرح ممالک بھی ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی اس دوڑ میں شامل ہیں۔ اس میں تمہاری ذاتی دوستی یا دشمنی کا تعلق نہیں ہے بلکہ یہ ملکوں کے ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی جنگ ہے۔''

''ڈاکٹر ڈیوڈ ٹھیک کہہ رہے ہیں سمیرا، تمہیں احتیاط سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ تم یہاں ریسرچ کے سلسلے میں آئی ہو اپنے کام سے کام رکھو ہر کسی سے زیادہ دوستی مت بڑھاؤ تم یہاں کسی کے بارے میں کچھ نہیں جانتیں یہ جو رافیہ ہے اسے تم کب سے جانتی ہو؟''

''محض چند ہفتوں سے۔'' سمیرا نے جواب دیا۔

''اور تم اس کے ساتھ یوں گھومتی پھر رہی ہو جیسے تمہارا اور اس کا برسوں کا ساتھ ہو؟''

''وہ بہت اچھی ہے جناب..... مخلص دوست۔'' سمیرا نے کہا اور مسٹر ڈیوڈ نے فرینک کی طرف دیکھا۔

''پتا کرو فرینک ہاسٹل میں معمول کے علاوہ کون آیا تھا وہاں رجسٹر میں لکھا ہوگا اور اگر کوئی نہیں آیا تو ان کے کمرے میں کیا ہوا۔ کوئی بھی جو اس گڑبڑ کا ذمے دار ہے کمرے میں کیسے داخل ہوا اسے چابی کہاں سے ملی۔

''میرے کمرے کی چابی تو میرے ہی پاس ہے وہ ہر وقت پرس میں ہوتی ہے۔''

''ٹھیک ہے..... میں ذمے دار اداروں سے رابطہ کرتا ہوں یہ بات معلوم کرنا بہت ضروری ہے کہ تمہارے کمرے میں اور دستاویزات میں کون دلچسپی رکھتا ہے۔ تمہاری سیکیورٹی کے لیے بھی یہ معلوم کرنا ضروری ہے؟''

''جی بہتر۔'' سمیرا نے جواب دیا۔

اسی شام سمیرا کی ملاقات پھر رافیہ سے ہوئی تھی وہ اس سے ملنے یونیورسٹی آئی تھی اور یونیورسٹی کے کیفے میں بیٹھ کر سمیرا نے اسے بتایا تھا کہ کل رات اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔

''گویا جب میں تمہیں چھوڑ کر گئی تب یہ سب ہوا تھا؟'' رافیہ نے پوچھا۔

''اس سے پہلے ہو چکا تھا جب میں واپس کمرے میں پہنچی تب میں نے دیکھا تھا۔'' سمیرا نے وضاحت کی۔

''شاید کسی کو معلوم تھا کہ میں گھر پر نہیں ہوں گی لیکن ہاسٹل میں کوئی اجنبی یوں نہیں آسکتا..... بھلا یہ کام کون کرسکتا ہے اور پھر میرے کمرے کا لاک بھی اس نے کھول لیا گویا اس کے پاس میرے کمرے کے دروازے کی چابی بھی تھی؟''

''اوہ سمیرا، یہ تو بہت خطرناک بات ہے مجھے لگ رہا ہے کہ تم محفوظ نہیں ہو۔'' رافیہ نے کہا۔

''میں؟..... بھلا کیوں؟''

''تم جو کام کررہی ہو وہ بہت اہم ہے، اور لوگ بھی اس پر کام کررہے ہیں ممکن ہے ان میں سے کوئی چاہتا ہو کہ وہ تم سے آگے نکل جائے؟''

''لیکن مجھ سے کسی کی دشمنی نہیں۔ میں تو یہاں اجنبی ہوں۔ زیادہ کسی کو جانتی بھی نہیں۔''

''دیکھو سمیرا، تم یہاں اسکالرشپ پر آئی ہو اور جس ملک نے تمہیں یہ سہولت دی ہے اس کا ہی تمہارے اس ریسرچ کی کامیابی پر حق ہے تم یہاں رہ کر کام کرو تجربات مکمل کرواور جیسا تم سے کہا جائے ویسا کرو۔''

''کیا مطلب!''

''مطلب یہ کہ جو ملک تم پر انویسٹ کررہا ہے فائدہ بھی اسی کو ہونا چاہیے۔''

''ہاں تو پھر؟''

''پھر یہ کہ تم تو شاید واپس جانے کا ارادہ رکھتی ہو اس طرح تم پر جو انویسٹ کی گئی ہے وہ تو ضائع ہو جائے گی۔''

''تم کہنا کیا چاہتی ہو..!. میں سمجھی نہیں۔''

''میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ تم اگر یہاں سے کامیاب واپس لوٹنا چاہتی ہو..... تو یہاں رہ کر یہاں کے لوگوں کو فائدہ پہنچاؤ اور اپنے ہم وطنوں کو بھول جاؤ۔''

''نہیں رافیہ ایسا نہیں ہوسکتا اگر ایسا ہوا تو یہ میرے وطن سے غداری ہوگی جس کا میں تصور بھی نہیں کرسکتی۔ میرا ملک میرا انتظار کررہا ہے میں وہاں جاکر یہ کام کروں گی تاکہ میرے ملک کو فائدہ حاصل ہو۔''

''ایک کام کرو..... اگر مجھے دوست سمجھتی ہو تو کل مجھ سے ملو میں تمہیں سمجھانے کی ایک اور کوشش کرکے دیکھ لیتی ہوں ممکن ہے تمہاری سمجھ میں بات آجائے۔''

''لیکن کل تو میں کیلیفورنیا کی ان جوہری تجربہ گاہوں میں جارہی ہوں جہاں مجھے مزید تجربات کرنا ہیں۔ چند ماہ میں سے بہت قریب پہنچ گئی ہوں۔ رافیہ میں خوش قسمت ہوں انہوں نے مجھے ایسے حساس مقامات پر بھی جانے کی اجازت دے دی ہے جہاں عام طور پر کسی اجنبی کو نہیں جانے دیا جاتا۔''

''اوہ سمیرا، میری بات کو سمجھو، تم واپس مت جاؤ۔ یوں کرو کل میں نہیں آؤں گی کل میں تمہیں پک کرنے کے لیے اپنی گاڑی بھیجوں گی تم کیلیفورنیا جاتے ہوئے پہاڑی سلسلے

میں موجود پارک میں آجانا وہاں میں تمہیں اور بھی کچھ بتاؤں گی یاد رکھو تمہاری زندگی کو خطرہ ہے، کسی سے اس سلسلے میں کوئی بات مت کرنا میں پارک میں تمہارا انتظار کروں گی۔''

رافیہ نے کہا اور واپس چلی گئی سمیرا حیران کھڑی اس کی باتوں پر غور کرتی رہ گئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ سمیرا کے بارے میں اتنا کچھ کیسے جانتی ہے۔

اس پوری رات وہ سو نہیں سکی تھی اور اپنے بیڈ پر کروٹیں بدلتی رہی تھی۔ ہاسٹل پہنچتے ہی اسے سرمد کا خط ملا تھا جو اس نے سمیرا کے خط کے جواب میں لکھا تھا۔

''جان سے پیاری سمیرا۔''

سلامت رہو!

تمہارا خط پڑھ کر اندازہ ہوا ہے کہ تم وہاں مشکلات کا شکار ہو میرا مشورہ ہے تم جتنی جلد واپس آسکتی ہو آجاؤ مجھے لگتا ہے کہ تمہاری زندگی خطرے میں ہے۔ غیر ضروری افراد سے بے تکلف مت ہو صرف اپنے شعبے سے متعلق لوگوں سے ملو جن سے تمہیں آفیشلی ملوایا گیا ہے۔ اگر تمہیں کچھ ہوا تو میں برداشت نہیں کرسکوں گا تمہارے جواب کا منتظر۔

''تمہارا سرمد''

سمیرا نے خط پڑھ کر ایک طرف رکھ دیا تھا اور کافی دیر تک اپنے مسئلے کے بارے میں سوچتی رہی تھی۔ کوئی تھا جو اس تک رسائی چاہتا تھا۔ اس نے کمرے کی تلاشی بھی لی تھی اور وہ جب کمرے میں آکر تلاشی لے سکتا تھا اور اس کی ریسرچ ڈاکومنٹس تک پہنچ سکتا تھا تو اس کا مطلب واقعی یہی تھا کہ اس کی جان خطرے میں ہے اور رافیہ اسے اس بات سے آگاہ کرچکی تھی۔ ''اوہ رافیہ..... بھلا میرے دل میں یہ خیال پہلے کیوں نہیں آیا سمیرا نے بڑبڑانے کے انداز میں خود سے کہا۔

''میرا خیال ہے مجھے کل رافیہ سے ضرور مل لینا چاہیے ممکن ہے وہ مجھے کچھ خاص بات بتائے یا میری کوئی مدد کرسکے۔''

دوسرے روز 5 اگست 1952ء کو وہ کیلیفورنیا جانے کے لیے روانہ ہوئی راستے میں وہ پہاڑی وادی تھی جہاں ایک حسین پارک تھا۔ جہاں رافیہ نے اس سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی لیکن اس پارک تک پہنچنے سے پہلے اچانک ایک پہاڑی موڑ مڑتے ہوئے اس کی کار پھسل کر 40 فٹ گہری کھائی میں جا گری اور وہ موقع پر ہی ہلاک ہوگئی لیکن کار کا ڈرائیور کار زمین سے ٹکرانے سے پہلے ہی چھلانگ لگا کر نکل گیا تھا اور اس کا کہیں کوئی پتا نہیں لگا تھا۔

جب تحقیقات ہوئی تو سمیرا کو کیلیفورنیا بلانے والی فیکلٹی کا کہنا تھا کہ اسے لانے کے لیے کوئی کار نہیں بھیجی گئی تھی جبکہ ڈرائیور کی شناخت بھی جعلی تھی۔ اس حادثے پر شکوک و شبہات کا اظہار کیا گیا جبکہ ڈرائیور کا بے پتا ہونا بتا رہا تھا کہ سمیرا حادثے کا شکار نہیں ہوئی تھی اسے باقاعدہ سازش کے ذریعے ہلاک کیا گیا۔ جس سائنسدان کی امریکی حکومت کی طرف سے آؤ بھگت کی گئی اور جسے اپنے ملک کی شہرت دینے کے لیے امریکا بے تاب تھا اس کی پُراسرار موت کا معاملہ دبا دیا گیا اور اسے محض ایک ممتاز اور عرب سائنسدان ہونے کی وجہ سے اور سستے جوہری علاج کا تصور پیش کرنے کی وجہ سے ظلم کا نشانہ بنایا گیا۔

بعد میں مصر کے آن لائن اخبار ''ایجنٹ اندیسہ'' پر دستیاب ویب سائٹ ''ایسیان'' سے لے کر شائع کی جانے والی ایک رپورٹ کے مطابق سمیرا کے قتل کی سازش میں نمایاں ترین کرداروں میں سے ایک کردار اداکارہ رافیہ ابراہیم کا بھی تھا بعد میں رافیہ کے پوتے کے حوالے سے اس کی دادی کی ڈائریوں میں جو کیلیفورنیا میں واقع رافیہ کی رہائش گاہ کی لائبریری میں چھپائی گئی تھیں سمیرا موسیٰ کے قاہرہ واقع گھر کی مختلف مواقع کی تصاویر بھی ملی تھیں جبکہ اس وقت رافیہ اسے نہیں جانتی تھی اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ رافیہ اس کے قتل کی ایک شریک تھی۔

رافیہ کے کیس کی تحقیقات نہ ہوسکی۔ سمیرا کو اس کے کام کے اعزاز میں کئی انعامات سے نوازا گیا۔

1۔ مصری آرمی کی طرف سے انعامات۔

2۔ سائنس اور آرٹ کے فرسٹ کلاس کارکردگی کے ایوارڈ۔

3۔ اس کے گاؤں میں اس کے نام سے ایک اسکول، ایک لیبارٹری کے نام رکھے گئے۔

4۔ مصری ٹی وی پر اس کی بائیوگرافی قسط وار دکھائی گئی۔

5۔ 1998ء میں مصری خواتین کے دن کے موقع پر اس کے گاؤں میں اس کی یادگار قائم کی گئی۔

6۔ اس کی زندگی پر ایک کتاب شائع کی گئی جس میں اس کی زندگی اور اس کے سائنسی خدمات کے بارے میں معلومات موجود ہیں۔

اس کی ناگہانی موت کے باعث اس کا تحقیقاتی کام کبھی شائع نہ ہوسکا جبکہ آج بھی اس کی ایجادات سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے خاص طور پر X-Radiation کے ذریعے۔

++

فلم نگری

# پردہ سیمیں

انور فرہاد

کراچی کبھی فلمی دنیامیں اپنی خاص پہچان رکھتا تھا۔ یہاں سے یادگار فلمیں ناظرین تک پہنچیں جسے فلم بینوں نے بھرپور پذیرائی بخشی ہمارے اس سنہرے دور سے آج کی پود ... ناآشنا ہے۔ اسی نکتے کو ذہن میں رکھ کر اس تحریر کو ترتیب دیا گیا ہے۔ آدھا حصہ گزشتہ ماہ آپ کی بصارتوں کا رزق بنا آدھا اس ماہ، یہ آخری حصہ بھی اہمیت کا حامل ہے۔

**کراچی کی فلمی صنعت پر ایک بھرپور تحریر**

کراچی کو اس بات کا اعزاز بھی حاصل ہے کہ تقسیم ہند کے بعد پاکستان کے عالم وجود میں آنے کے فوری بعد اسے اس مملکت خداداد کا دارالخلافہ بنادیا گیا۔ نہ صرف یہ بلکہ یہ روشنیوں کا شہر کہلایا اور صنعت وحرفت اور ملک کی ترقی کے لیے ریڑھ کی ہڈی بن گیا۔ منی پاکستان کہلانے والے اس شہر نے ملک بھر کے باشندوں کے لیے روزگار کے دروازے کھولے اور یہاں کے باسیوں نے یہاں آنے والے تمام لوگوں کے لیے اپنی باہنیں پھیلا کر سب کو گلے لگالیا۔ یہ شہر عروس البلاد بھی کہلایا کیونکہ دوسرے تمام شہروں کے مقابلے میں اس نے بہت کم مدت میں بہت زیادہ ترقی کرکے اپنے حسن اور خوبصورتی کی دھاک بٹھادی تھی۔ دارالسلطنت کی توسیع وترقی کے لیے شہر کا ایک نیا اور جدید حصہ نیو کراچی کے نام سے تعمیر کیا جارہا تھا مگر کچھ ایسا سیاسی چکر چلا کہ 1962ء میں کراچی کو دارالخلافہ کے درجہ سے محروم کردیا گیا اور راولپنڈی سے متصل ایک نوتعمیر شہر اسلام آباد کو پاکستان کا کیپٹل بنادیا گیا۔ اس کے باوجود اس کی

اہمیت اور افادیت میں کمی واقع نہیں ہوئی کیونکہ اس کی کمائی کا ستر اسّی فیصد ریونیو ٹیکس اس وقت سے آج تک پورے ملک کی ضروریات پوری کرتا ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ کراچی میں ایک دن کاروبار بند ہوجائے تو ملک کو تقریباً ڈھائی ارب کا نقصان ہوتا ہے۔

کراچی نے جہاں پاکستان کی سرمایہ کاری کے لیے اہم کردار ادا کیا وہیں اس نے ہماری فلمی صنعت کو بھی بام عروج تک لے جانے میں اپنا ایک کلیدی کردار ادا کیا ہے اور اس کی سینما انڈسٹری نے بھی اپنی بہتر کارکردگی کا ثبوت دیا ہے۔ اگرچہ قیام پاکستان سے پہلے بھی اس شہر میں خاصے سینما گھر موجود تھے اس کے باوجود قیام پاکستان کے بعد بھی ایک دو نہیں متعدد سینما گھر تعمیر کیے گئے۔ سینماؤں کی تعداد کے حوالے سے کراچی شہر ہمیشہ سب سے آگے رہا یہی وجہ ہے کہ فلموں کے کامیاب ہفتے اسی شہر میں بنائے جاتے رہے اور اسی کے کاروبار کو اہمیت دی جاتی ہے۔ یہ اپنے فلمی کاروبار کے لحاظ سے بھی تجارتی حب کا درجہ رکھنے والا شہر ہے۔ فلموں کی اصل کامیابی کو کراچی کے بزنس سے ہی منسوب کیا جانے لگا۔

پاکستان کا واحد سینما گھر جو اس کے آغاز کے ساتھ ہی عالم وجود میں آیا وہ جوبلی سینما تھا۔ جس کا اگست 1947ء میں افتتاح ہوا اور اس میں پہلی نمائش پذیر ہونے والی فلم ''وامق عذرا'' بھارتی فلم تھی۔ جب تک پاکستان میں بھارتی فلموں کی نمائش جاری رہی، بھارتی فلموں کے تقسیم کاروں کی یہ خواہش ہوتی کہ ان کی فلم جوبلی سینما ہی میں ریلیز ہو۔ اس کے لیے انہیں اپنی باری آنے کا انتظار بھی کرنا پڑتا تھا۔ اس خوبصورت سینما گھر کی عمارت حسن و زیبائش کے معاملے میں بے مثال تھی۔ اس کی اسکرین منفرد انداز کی تھی۔ اس کا پردہ کنواب کا تھا جو موتیوں سے جڑا ہوا تھا۔ گیلری پر جانے کے لیے دونوں جانب وسیع و عریض سیڑھیاں تھیں۔ سیٹیں بڑی صاف ستھری اور آرام دہ، نچلے حصے میں بھی اور اوپر بھی ڈیکوریشن کے طور پر فریم میں لگے زیر نمائش اور آنے والی فلموں کی تصویریں بڑے سلیقے سے آویزاں ہوتیں۔ سب سے زیادہ نمایاں اس سینما گھر کا بلند و بالا ٹاور تھا جو دور ہی سے آنے والوں کو اپنی طرف متوجہ کرتا تھا۔ جوبلی میں نہ صرف بڑی بڑی بھارتی فلموں نے ریکارڈ بزنس کیا بلکہ پاکستانی فلموں نے بھی کامیابی کے جھنڈے لہرائے۔ ان میں دو آنسو، نوکر، سہیلی، قیدی، گہرا داغ، بیٹی، دال میں کالا، ضدی، مجبور، اک تیرا سہارا، تلاش (مشرقی پاکستانی)، جوش، ماں پتر، دل دے کے دیکھو، نئی لیلیٰ نیا مجنوں، دولت اور دنیا، غلام، راول، سلطانہ ڈاکو اور زرین جیسی کئی ناقابل فراموش فلمیں ہیں۔

دوستو! اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ 1980ء میں حکومت نے اس سینما کی اہمیت اور قیام پاکستان کے بعد تعمیر کے حوالے سے حکومتی خرچ پر اس کی مرمت اور آرائش کے علاوہ اس کے ٹاور کے شیشے دوبارہ لگوائے۔ جس سے اس کی تاریخی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے مگر صد افسوس کہ بعد کی حکومتوں کی بے حسی اور لینڈ مافیا کے آگے تمام قاعدے قانون کو بالائے طاق رکھ کر اس خوبصورت اور تاریخی عمارت کو مسمار کرکے یہاں شاپنگ پلازا اور فلیٹس تعمیر کرکے اس تفریحی عمارت کو قصۂ پارینہ بنا دیا گیا۔ آج کل جہاں جوبلی مارکیٹ ہے بھی اسی جگہ جوبلی سینما ہوا کرتا تھا۔

جوبلی سینما کے کامیاب بزنس کو دیکھ کر اس کے بالمقابل ایک اور خوبصورت سینما گھر تعمیر کیا گیا۔ یہ کوہِ نور سینما تھا۔ اس کا افتتاح فلم ''کوہِ نور'' سے ہونے والا تھا جس کے مرکزی فنکار زیبا، سدھیر اور علاؤالدین تھے مگر اس کے تاخیر سے مکمل ہونے کی وجہ سے یہ فلم نشاط سینما میں شفٹ ہوگئی۔ لہٰذا کوہِ نور سینما میں پہلی فلم کے طور پر وحید مراد کی فلم ''ہونہار'' ریلیز ہوئی۔ جن لوگوں نے کوہِ نور میں فلمیں دیکھیں انہیں اچھی طرح یاد ہوگا کہ پورے پاکستان میں 1966ء تک اس جیسا کوئی اور سینما نہیں تھا۔ جس میں اچھی اور معیاری فلمیں ریلیز کی جاتیں۔ کوہِ نور اپنی اندرونی اور بیرونی خوبصورتی کے لحاظ سے لاجواب تھا۔ اس میں پاکستانی فلموں کے علاوہ کامیاب نئی اور پرانی انگریزی فلمیں بھی دکھائی جاتی تھیں۔ افسوس کہ اس سینما کو بھی اپنی تین دہائیاں دیکھنے سے قبل ہی صفحہ ہستی سے مٹا کر کوہ نور پلازا کے نام سے کمرشل پلازا اور رہائشی فلیٹوں میں تبدیل کردیا گیا۔

''کوہِ نور'' سے آگے جاکر تھوڑے فاصلے پر 1960ء میں ''ریوالی'' کے نام سے ایک سینما گھر تعمیر ہوا۔ اس میں سب سے پہلی فلم ''رہ گزر'' ریلیز ہوئی۔ پاکستان فلم انڈسٹری کے عروج کے دور میں ریوالی کی سپرہٹ فلمیں ریلیز کرنے کا اعزاز حاصل رہا۔ اسے بھی بلڈر مافیا نے تباہ کرکے دکانیں اور فلیٹس تعمیر کردیئے۔

ریوالی کے سامنے ایک اور سینما قیصر کے نام سے تھا

جہاں اب قیصر سینٹر قائم ہے۔ اس سینما کا افتتاح 1950ء میں لالہ سدھیر کی فلم ''طوفان'' سے ہوا تھا۔ مارٹن روڈ (موجودہ وحید مراد روڈ) پر ٹوٹنے والا سب سے پہلا سینما گھر یہی تھا۔

قیصر سینما کے سامنے ایروز سینما تھا۔ جس کا افتتاح 1952ء میں دلیپ کمار کی فلم ''بابل'' سے ہوا تھا۔ اس کے بعد پاکستانی فلمیں گلبدن، جان بہار، توبہ، بھارتی فلم آن کی دوبارہ نمائش (1963)، پاکستانی فلمیں دل کے ٹکڑے، دارا، کون کسی کا، اس کی یادگار فلمیں ہیں۔ اس سینما کو بھی مسمار کر کے پلازا بنا دیا گیا۔

ایروز کے قریب ہی ایک اور سینما ''نشیمن'' کے نام 1975ء میں تعمیر ہوا تھا۔ جس میں ریلیز ہونے والی پہلی فلم ہی ڈائمنڈ جوبلی کامیابی سے ہمکنار ہوئی تھی۔ یہ ندیم کی فلم ''پہچان'' تھی۔ نشیمن میں بھی یادگار فلمیں دکھائی گئیں مگر اس کا حشر بھی دیگر سینماؤں جیسا ہوا۔ یعنی اسے بھی توڑ کر پلازا اور رہائشی فلیٹس بنا دیا گیا۔

نشیمن کے ساتھ ہی ایک اور سینما افشاں کے نام سے تعمیر ہوا۔ وہ پشتو فلموں کے سہارے اب تک زندہ ہے۔ اگرچہ ابتداء میں یہاں بڑی و معیاری اردو اور پنجابی فلمیں دکھائی جاتی تھیں۔

افشاں سے چند ہی قدموں کے فاصلے پر انگریزی فلموں کا بہترین ایئر کنڈیشنڈ سینما گوڈین تھا۔ واہ کیا فلمیں تھیں جو پاکستان میں بزنس کرتی تھیں۔ بڑی اور کامیاب اردو پنجابی اور کبھی کبھی پشتو فلمیں بھی دکھائی جاتی تھیں۔ اب اس سینما کی جگہ غازیانی سینٹر کے نام سے ناکام ترین کمرشل پلازا ہے۔

گوڈین سے ذرا آگے ایک اور سینما رینو ہے۔ اپنے وقت کی کلاسک فلموں کے حوالے سے مشہور تھا۔ گارڈن روڈ پر واقع اس سینما میں بھی ریکارڈ توڑ فلمیں ریلیز ہوئیں۔ یہاں ریلیز ہونے والی پہلی فلم دلیپ کمار کی ''داغ'' تھی۔ یہیں ندیم کی داغ بھی نمائش پذیر ہوئی تھی۔ کاش یہ سینما اب بھی ماضی کی یادگار فلمیں دوبارہ چلائے تو اسے گندی اور بے ہودہ فلمیں دکھانے کی ضرورت نہ پڑے۔

دوستو! سینماؤں کے ضمن میں یہ چند دلچسپ باتیں شاید بہت کم لوگوں کو معلوم ہوں گی جواب میں آپ کو بتا رہا ہوں۔ کراچی میں بمبینو اور لیرک سینما کراچی کے خوبصورت اور معیاری سینماؤں میں شمار کیے جاتے ہیں۔

> ''ایک دفتر کے اعلیٰ افسر نے بڑی بڑی مونچھیں رکھ لیں۔ لوگ سمجھے یہ شخص شاید سالانہ رپورٹ بھی مونچھوں کی طول بلد ناپ کر لکھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پورے محکمے میں ایک سے ایک لمبی مونچھ لہرانے لگی۔ ایک صاحب خیر سے کچھ ادیب تھے بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ ادب کے ''ابن الوقت'' تھے کیونکہ زندگی کے ہر شعبے میں ابن الوقت ہوتے ہیں انہوں نے تو ستم ظریفی کی حد کر دی یعنی مونچھوں کے فوائد و فضائل پر سوا سو صفحے کی ایک پوری کتاب لکھ ماری۔''
>
> اقتباس: ابن الوقت۔ از: ضمیر جعفری

1968ء کا ذکر ہے کہ فوجی جرنلوں کی کہانی پر بنائی گئی انگریزی فلم Night of Jernal لیرک سینما میں ریلیز ہوئی تو اس وقت کے پاکستانی صدر فیلڈ مارشل ایوب خان نے یہ فلم مہمانوں کے ہمراہ دیکھی۔ لیرک سینما کے شیخ رشید احمد نے صدر پاکستان اور ان کے ساتھیوں کا پرتپاک استقبال کیا۔

اس سے قبل بمبینو سینما میں ہی فیلڈ مارشل ایوب خان نے ''لارنس آف عربیا'' دیکھ کر اس سینما گھر کو عزت بخشی تھی۔ نواب آف کالا باغ نے بھی بمبینو سینما میں ''قلوپطرہ'' دیکھی تھی۔

واضح رہے کہ بمبینو پاکستان کا پہلا 70 ایم ایم سینما ہے۔ جس کے دیوہیکل اسکرین پر لارڈ جم، کراکاٹوا ایسٹ آف جاوا اور ایلکزنڈر جیسی فلمیں ریلیز ہوئیں۔ اسے موجودہ پاکستان کے پہلے Twin سینما ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے اس کے ساتھ دوسرا سینما اسکالا ہے جہاں منی اسکرین پر فلمیں دکھائی جاتی ہیں... اور اس کی سیٹوں کی تعداد محدود ہے۔

نشاط سینما ہی کی سائیڈ میں تھوڑا آگے جا کر 1972ء کے اوائل میں ایک جدید طرز کا سینما گھر پرنس کے نام سے تعمیر کیا گیا۔ جو ایشیاء کا سب سے بڑا اور وسیع سینما گھر شمار ہوتا ہے۔ اس کا افتتاح 16 جون 1974ء کو انگریزی فلم ''سباتا'' سے ہوا تھا۔ یہ انگریزی فلموں کا کلاس ون سینما تھا جو مکمل طور پر سینٹرلی ایئر کنڈیشنڈ تھا۔ اس کی اسکرین بھی دیگر سینماؤں سے بڑی تھی۔ اس سینما میں صبح گیارہ بجے پرانی

پاکستانی فلموں کے خصوصی شوز کا اہتمام سب سے پہلے شروع کیا گیا۔ جو رعایتی ٹکٹ پر دکھائے جاتے تھے۔ 1993ء کے بعد یہاں نئی پاکستانی فلموں کے ریگولر شوز بھی شروع ہوگئے تھے۔ اس سینما کی بلڈنگ میں ایک منی سینما ''پرنسس'' کے نام سے 23 فروری 1979ء میں شروع ہوا۔ افسوس کا مقام ہے کہ اس کے مالکان کے جھگڑوں اور مقدمہ بازی کی وجہ سے ایک طویل عرصے سے یہ دونوں سینما گھر بند پڑے ہیں۔

پرنس اور پرنسس سے چند قدم کے فاصلے پر ایک سینما گھر 1968ء میں ''کیپری'' کے نام سے تعمیر کیا گیا... جو آج تک سینما انڈسٹری میں اپنے بہترین ساؤنڈ سسٹم کے حوالے سے سرفہرست ہے۔ یہ بھی انگریزی فلموں کے حوالے سے مشہور سینما گھر ہے اور یہاں جنٹری کی اکثریت آتی ہے۔ انگریزی فلموں کے ساتھ یہاں معیاری اردو فلمیں بھی دکھائی جاتی ہیں۔ صاف ستھرے ماحول اور اپنے اعلیٰ معیار کی وجہ سے آج بھی کیپری سینما کراچی ہی نہیں بلکہ پاکستان کے بہترین سینماؤں میں اپنا منفرد مقام رکھتا ہے۔

صدر کے علاقے میں جو سینما گھر موجود تھے جن میں ریگل سے لے کر پیلس تک کے سینما گھر آتے تھے، حکومتوں کی عدم سرپرستی اور بے توجہی کی وجہ سے سب کے سب ختم کیے جاچکے ہیں۔ بلڈر مافیا نے کیپٹل سینما سے پہل کی، بعد میں پیراڈائز اس کے بعد ریکس جسے پاکستان کا پہلا سینما اسکوپ سینما گھر بننے کا اعزاز حاصل تھا اسے بھی توڑ کر اس کا نام ونشان مٹا دیا گیا۔ اس کے عقب میں ریو سینما جو پرنس سے قبل سب سے بڑا ہال والا سینما کہلاتا تھا اور جہاں انگریزی اور اردو زبان کی بڑی بڑی فلمیں دکھائی جاتی تھیں اسے بھی مسمار کردیا گیا۔ اس کے بعد پیلس سینما کی بھی بربادی کی باری آگئی۔ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ پاکستانی فلمی صنعت کو مٹانے کے لیے سب سے پہلے کراچی کے سینما گھروں کا گلا دبایا گیا۔ یہ شہر جو اپنے سینما گھروں کی وجہ سے سب سے زیادہ کما کر دیتا تھا۔ اس کا گلا گھونٹ دیا گیا۔ دوسری طرف بندر روڈ کے تاج محل، ریٹز، میجسٹک اور نئے تعمیر ہونے والے مغل اور انجمن تک کو نہ بخشا گیا اور لائٹ ہاؤس سے لے کر کیماڑی تک نگینہ کو مٹا کر لینڈ مافیا نے پاکستان کے کلچر اور ثقافت کو پیش کرنے والی تمام عمارتوں کو مٹی کا ڈھیر بنا دیا۔ پلازے اور فلیٹس تیار کر کے ایک نیا کلچر تشکیل دیا۔ کس کس کا ماتم کریں ارم، گلیکسی، فلستان، لبرٹی، شالیمار، سوسائٹی اور ڈرائیو ان جیسے عوامی تفریحی مراکز کی جگہ غیر قانونی طور پر پلازے، مارکیٹ اور فلیٹس بنا دیے گئے۔ بلڈر مافیا نے جو بلی سینما سے جو سلسلہ شروع کیا تھا وہ 43 سینما گھروں کو مسمار کرنے تک جاری رہا۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ یہ غیر قانونی کھیل جاری رہا مگر ارباب اختیار کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر سینماؤں کے انہدام کی نوبت ہی کیوں آئی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جب سینماؤں کا بزنس کم ہوتے ہوتے اتنا کم ہوگیا کہ ان کے بنیادی اخراجات پورے کرنے بھی دشوار ہوگئے تو مالکان نے اپنے سینماؤں کو بوجھ سمجھنا شروع کردیا۔ وہ سینما گھر جو انہیں کما کر دیا کرتا تھا اب اس کے اسٹاف اور ملازمین کی تنخواہیں انہیں اپنی جیب سے ادا کرنی پڑی تو انہوں نے اپنے سینما گھر فروخت کرنا شروع کردیے۔ جنہیں بلڈر مافیا نے خرید کر ان کی جگہ پلازے اور فلیٹس تعمیر کرنا شروع کردیے۔

سینما گھروں کو ان حالات کا سامنا کیوں کرنا پڑا؟ کیوں ان کا کاروبار ٹھپ ہوگیا؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک طرف تو فلمیں بنانے والوں نے چیخ چلا کر بھارتی فلموں کی نمائش پر پابندی لگا دی تھی۔ دوسری طرف بتدریج فلموں کا معیار اور تفریحی کوالٹی گھٹتے گھٹتے اتنی کم ہوگئی کہ تماشائیوں نے سینما گھروں کا رخ کرنا ہی ترک کردیا۔ فلم انڈسٹری میں بھی ایک ایسا مافیا آگیا تھا جو نان کمرشل تھا۔ فلمسازی کی تعلیم وتربیت سے جو بالکل نابلد تھا۔ انہوں نے پرانے اور باصلاحیت فنکاروں اور ہنرمندوں کو بھگایا یا وہ خود اس ماحول سے گھبرا کر گوشۂ گمنامی میں چلے گئے۔ ان حالات میں فلم انڈسٹری کے ساتھ ساتھ سینما انڈسٹری کو بھی ناقابل تلافی نقصان اٹھانا پڑا۔

☆☆☆

کراچی کو یوں تو اردو بولنے والوں کی اکثریت کا شہر کہا جاتا ہے مگر یہاں پاکستان کے ہر علاقے اور ہر زبان بولنے والے لوگوں کو اس شہر اور شہر والوں نے اس طرح اپنے دامن میں سمیٹ رکھا ہے جس طرح ایک ماں اپنے بچوں کو رکھتی ہے۔ اس کی فلمی صنعت کا بھی یہی ممتا بھرا روپ ہے۔ اس کی فلم انڈسٹری میں صرف اردو فلمیں ہی نہیں بنائی گئیں دیگر علاقائی زبانوں کی فلمیں بھی تخلیق کی گئیں بلکہ جن میں پشتو فلمیں بھی سرفہرست ہیں اور پشتو

فلموں کے سپر فنکاروں اور ہنرمندوں نے بھی اسی پیارے شہر سے ابھر کر عزت، شہرت اور مقبولیت حاصل کی۔ پشتو فلموں کے بانی ہدایت کار عزیز تبسم نے بھی کراچی کی فلمی صنعت سے اپنا فلمی سفر شروع کیا تھا۔ ان کی پہلی فلم پشتو زبان کی بھی پہلی فلم تھی جس کا نام ''یوسف خان شیر بانو'' تھا اور یہ پشتو زبان کی ایک لوک کہانی پر بنائی گئی تھی۔

اس سے پہلے کہ عزیز تبسم کی جیون کتھا سناؤں، اس بات کا بھی اظہار کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ایک متنازعہ مسئلے کا بھی ذکر کردوں اور وہ یہ ہے کہ کچھ مؤرخین کا کہنا ہے کہ پہلی پشتو فلم ''لیلیٰ مجنوں'' کے نام سے 1938ء میں بنائی گئی تھی لیکن وہ فلم ریلیز نہیں ہوسکی تھی۔ جبکہ بعض ناقدین اور مبصرین کا خیال ہے کہ یہ فلم ممبئی اور پشاور میں دکھائی گئی تھی۔ اس فلم کے فلمساز و ہدایت کار بابا میر حمزہ خان شنواری تھے اور فلم کے مرکزی ہیرو رفیق غزنوی تھے۔ اس فلم کے بارے میں مختلف قیاس آرائیاں ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ 1941ء میں مکمل ہوکر 1942ء میں ریلیز ہوئی تھی جبکہ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ فلم مکمل ہی نہیں ہوسکی تھی اس لیے اس کی نمائش کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہاں پشتو زبان میں باقاعدہ دستاویزی فلم ''پلوشہ'' تھی جو 1963ء میں آئی تھی جبکہ پاکستان میں پہلی بار پشتو فلم کا آغاز سال 1968ء میں ہوا تھا۔ جس کا افتتاح اداکار و ہدایت کار رنگیلا کے ہاتھوں ہوا تھا۔ جس میں اداکار رب نواز ہیرو اور اداکار امان ولن تھے جبکہ ہدایت کار جمیل احمد تھے لیکن اگر تاریخ کو دیکھا جائے اور پڑھا جائے تو پاکستان کی پہلی پشتو فلم ''یوسف خان شیر بانو'' تھی جو ریلیز بھی ہوئی، سپرہٹ کامیابی اور مقبولیت سے بھی ہمکنار ہوئی، اور پاکستان بھر میں ریکارڈ بزنس بھی کیا یہی اب تک پاکستان کی پہلی پشتو فلم قرار دی جارہی ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ ''یوسف خان شیر بانو'' ہی پاکستان کی پہلی پشتو زبان کی پہلی ریلیز ہونے والی فلم ہے۔

اب ہم اس فلم کے کپتان اور پشتو سینما کے پہلے بانی ہدایت کار عزیز تبسم کی کہانی شروع کرتے ہیں۔ عزیز تبسم ایک باصلاحیت، پڑھے لکھے اور فلم کے ہر شعبہ سے واقف اور ماہر فلم میکر تھے۔ ان کا اصل نام عبدالعزیز خان ہے۔ انہیں کالج کے زمانے ہی سے لکھنے پڑھنے کا شوق تھا اور وہ ''تبسم'' تخلص کے طور پر اپنے نام کے ساتھ استعمال کرتے تھے، پھر جب وہ فلم انڈسٹری سے جڑے تو عزیز تبسم بن گئے۔ ان کا تعلق پشاور سے ہے۔ انہوں نے پشاور کے ایڈورڈ کالج میں تعلیم حاصل کی۔ 60ء کی دہائی میں روشنیوں کے شہر کراچی آگئے اور امریکا سے تربیت حاصل کرکے آنے والے پاکستان کے باصلاحیت ہدایت کار پرویز ملک کے اسسٹنٹ بن کر فلم ٹریڈ سے منسلک ہوگئے۔ پرویز ملک کے ساتھ مل کر کئی اردو فلمیں بنانے میں اپنی خدمات انجام دیں اور فلم کے تمام شعبوں کی تربیت حاصل کی۔ پڑھے لکھے اور ذہین تھے اس لیے اچھے استاد کی سرپرستی میں جلد ہی فلمسازی کے امور پر دسترس حاصل کرلی۔ اسی دوران کراچی میں پاکستان کی پہلی پشتو فلم ''یوسف خان شیر بانو'' کا آغاز ہوا تو بطور ہدایت کار ان ہی کو سائن کیا گیا۔ اس طرح عزیز تبسم کو پاکستان کی پہلی پشتو فلم ''یوسف خان شیر بانو'' کے ہدایت کار بننے کا اعزاز حاصل ہوا۔ ان کی یہ پہلی فلم ہی سپرہٹ ہوگئی اور اس فلم کے ساتھ وہ بھی کامیاب اور مقبول ہدایت کار تسلیم کرلیے گئے۔ ''یوسف خان شیر بانو'' 1970ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ اسی سال ان کی دوسری فلم بطور ہدایت کار پشتو فلم ''آدم خان درخانئ'' ریلیز ہوئی۔ یہ فلم بھی پشتو زبان کی مشہور فوک کہانی پر مبنی تھی۔ یہ بھی یادگار اور سپرہٹ شاہکار رومانوی ایکشن موو ی ثابت ہوئی۔ اس فلم میں بھی بدر منیر، یاسمین خان اور نعمت سرحدی نے کلیدی کردار کیے تھے۔ ان دونوں فلموں کی زبردست کامیابیوں کے بعد انہوں نے کراچی ہی میں تیسری پشتو فلم ''ٹوپک زما قانون'' بنائی۔ اور اپنے پرانے آرٹسٹوں کو بھی ان میں پیش کیا۔ ان تینوں فلموں سے نہ صرف عزیز تبسم اپنے آغاز ہی میں کامیاب ڈائریکٹر مان لیے گئے بلکہ ان فلموں کے متذکرہ بالا فنکار بھی اپنے فنی کیریئر کی ابتداء ہی میں پشتو سینما کے سپر اسٹارز بن گئے۔

ان دونوں فلموں کی فقید المثال کامیابی کے بعد عزیز تبسم کراچی سے لاہور شفٹ ہوگئے اور ان کے ساتھ بدر منیر، یاسمین خان اور نعمت سرحدی بھی لاہور چلے گئے۔ عزیز تبسم نے لاہور میں ڈائریکشن شروع کردی۔ لاہور میں عزیز تبسم کی پہلی فلم ''ارمان'' تھی جس کے فلمساز لالہ سردار خان تھے۔ یہ فلم 1975ء میں نمائش پذیر ہوئی۔ اس فلم میں عزیز تبسم نے بدر منیر کی بجائے ایک نئے ہیرو بیدار بخت کو مرکزی ہیرو کے کردار میں متعارف کرایا۔ ''ارمان'' بھی کامیاب ہوئی اور اس نے پلاٹینم جوبلی کی کامیابی کا اعزاز

حاصل کیا۔ یہ عجیب اتفاق تھا کہ عزیز تبسم کے استاد محترم پرویز ملک کی اردو فلم ''ارمان'' نے بھی پلاٹینم جوبلی کامیابی حاصل کی تھی۔

عزیز تبسم نے اپنی لاہور کی پہلی فلم ''ارمان'' میں بدر منیر کو شامل نہیں کیا تھا۔ جس پر بدر منیر، عزیز تبسم سے شدید ناراض ہوگئے تھے اور کچھ عرصہ تک دونوں کے درمیان کشیدگی اور تناؤ کا سلسلہ جاری رہا۔ بدر منیر نے ''ارمان'' کے مقابلے میں اپنی فلم ''کوچوان'' بنائی اور ''ارمان'' کے ساتھ ہی ریلیز کی۔ ''کوچوان'' نے بھی شاندار گولڈن جوبلی کامیابی حاصل کی مگر عزیز تبسم کی فلم ''ارمان'' نے پلاٹینم جوبلی کا اعزاز حاصل کیا۔ بزنس کے لحاظ سے یہی سب سے زیادہ چلنے والی واحد پہلی اور آخری سپرہٹ پشتو شاہکار فلم ہے جس میں بیدار بخت کے علاوہ آصف خان، ثریا خان، یاسمین خان، جمیل بابر اور امان نے یادگار مرکزی کردار پلے کیے تھے۔ ''ارمان'' اس دور کی پہلی ماڈرن اور عریاں وفحش گانوں سے بھرپور پشتو فلم تھی۔ جس پر بعد میں حکومتِ پاکستان نے پابندی بھی لگادی تھی مگر بعدازاں ''نوے ارمان'' کے نام سے ریلیز ہوئی... اور کامیاب رہی۔

یاد رہے کہ عزیز تبسم نے اپنی فلموں میں زیادہ تر بدر منیر، یاسمین خان، نعمت سرحدی اور بیدار بخت کو کاسٹ کیا۔ ''ارمان'' کی ریکارڈ کامیابی کے بعد بیدار بخت بھی بدر منیر اور آصف خان کی طرح پشتو سینما کے سپر اسٹار بنے اور بعد میں کئی یادگار فلمیں کیں۔ اس طرح عزیز تبسم نے بدر منیر کے سامنے ایک اور سپر اسٹار کو کھڑا کر دیا... جو بعد میں اپنی غیر معیاری اور معمولی کرداروں میں کام کرنے کی وجہ سے اپنا مقام اور سپر اسٹار کا درجہ برقرار نہ رکھ سکا۔ عزیز تبسم نے ''ارمان'' کے بعد بیدار بخت کو 1976ء میں دو اور سپرہٹ اور یادگار پشتو فلموں ''احسان'' اور ''قیدی'' میں سولو ہیرو کے طور پر کام دیا اور دونوں فلموں میں وہ کامیاب ثابت ہوا۔ ان فلموں میں عزیز تبسم کی ڈائریکشن بھی عروج پر تھی۔ یہ تمام فلمیں سوشل ایکشن اور میوزیکل مووی تھیں۔ خاص طور پر ''ارمان'' کے تمام گانے سپرہٹ ہوئے تھے جو آج بھی مقبول ہیں۔ 1978ء میں ہدایت کار عزیز تبسم کی صرف ایک پشتو فلم ''شرافت'' ریلیز ہوئی تھی جبکہ 1979ء ایک بار پھر عزیز تبسم کے لیے کامیاب ترین سال ثابت ہوا جس میں انہوں نے دو بڑی سپرہٹ اور ریکارڈ ہولڈر فلمیں ڈائریکٹ کیں۔ ان میں ''کشمکش'' اردو فلم تھی جو عزیز تبسم کی پہلی اردو فلم تھی جس کے فلمساز ذوالفقار علی تھے۔ یہ سپرہٹ ہوئی اور اس نے گولڈن جوبلی کامیابی حاصل کی۔ دوسری فلم پشتو زبان کی تھی۔ اس کا نام ''گنز کپ'' تھا۔ اس کے موسیقار اور فلمساز امیر غلام صادق تھے۔ اردو فلم ''کشمکش'' کی کاسٹ میں آصف خان، نجمہ، مصطفیٰ قریشی، نازلی، چکوری اور اقبال حسن شامل تھے۔ یہ آصف خان کی لازوال اداکاری سے آراستہ ایک سپرہٹ ایکشن سے بھرپور سوشل شاہکار فلم تھی۔ یہی عزیز تبسم کی پہلی گولڈن جوبلی ہٹ اردو فلم بھی تھی۔

پشتو فلم ''گنز کپ'' میں بدر منیر، نعمت سرحدی، یاسمین خان، بیدار بخت اور لیاقت میجر نے مرکزی کردار کیے تھے۔ یہ بھی ایک خوبصورت میوزیکل کامیاب فلم ثابت ہوئی تھی۔

1980ء میں عزیز تبسم نے صرف ایک پشتو فلم ''انصاف'' کی ڈائریکشن دی اور یہ فلم بھی سپرہٹ کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔ ''انصاف'' میں بدر منیر، یاسمین خان، بیدار بخت، ثریا خان، بادشاہ اور میر خان نے مرکزی کردار کیے تھے۔ اس فلم نے بہترین پشتو فلم کا ایوارڈ بھی حاصل کیا۔ واضح رہے کہ اس سے پہلے ''ارمان'' اور ''احسان'' نے بہترین پشتو فلموں کے ایوارڈز حاصل کیے تھے۔ بعدازاں عزیز تبسم کو بھی ان کی اعلیٰ ڈائریکشن پر کئی دیگر ایوارڈز بھی ملے۔

1981ء میں عزیز تبسم کی دو پشتو اور ایک اردو فلم ریلیز ہوئیں۔ پشتو فلموں کے نام ''گزدا میدان'' اور ''غیرت زما ایمان'' تھے جبکہ اردو فلم ''کھوٹے سکے'' تھی۔ ان میں ''گزدا میدان'' عزیز تبسم کی فنی کیریئر کی پہلی فل کامیڈی میوزیکل کلاسک پشتو شاہکار تھی جس میں یاسمین خان، بدر منیر، عمر دراز، شہناز، اسماعیل خان اور عمران نے اداکاری کی تھی۔ یہی اداکارہ شہناز بیگم اور اداکار عمران خٹک کی بھی پہلی پشتو فلم تھی۔

''کھوٹے سکے'' میں عزیز تبسم نے پہلی بار محمد علی، غلام محی الدین، بابرہ شریف، بدر منیر اور ہمایوں قریشی کو کاسٹ کیا تھا۔ ''کھوٹے سکے'' بھی ایکشن سے بھرپور یادگار اردو فلم تھی۔

عزیز تبسم نے اپنے 22 سالہ فنی کیریئر میں ہر انداز اور موضوع پر فلمیں بنائیں۔ انہوں نے سوشل، ایکشن،

رومانی، کامیڈی اور پشتو فوک کہانیوں پر مبنی ایکشن سے بھرپور فلمیں تخلیق کیں۔

1983ء میں عزیز تبسم کی ایک پشتو فلم ''خوگ دشمن'' میں اداکار و ہدایت کار رنگیلا کو بھی ہیرو کے یادگار کردار میں کاسٹ کیا۔ ان پر پشتو گانے بھی فلم بند کیے۔ اس فلم کی دیگر کاسٹ میں بدر منیر، بیدار بخت، یاسمین خان، لیاقت میجر، امان اور منرلہ شامل تھے۔

اسی سال انہوں نے پشتو فلم ''ٹیکسی ڈرائیور'' اور ''چالاک'' کی بھی ڈائریکشن دی۔ جن میں ''ٹیکسی ڈرائیور'' ایک کامیاب ترین پشتو شاہکار فلم ثابت ہوئی۔ اس فلم میں بدر منیر اور یاسمین خان نے مرکزی رولز پلے کیے تھے۔

عزیز تبسم نے اداکار و فلمساز اعجاز درانی کے لیے بھی ایک کامیاب پشتو فلم ''خاندان'' تخلیق کی تھی۔ ''خاندان'' کو پشتو زبان میں ''زما پیغام'' کے نام سے ریلیز کیا گیا تھا۔

اسی طرح سال 1986ء میں عزیز تبسم کی بطور ہدایت کار دو پشتو فلمیں ''پیداگیر'' اور ''خہ کوہ بدشتہ'' ریلیز ہوئیں۔ پیداگیر میں بدر منیر، یاسمین خان اور دوسری فلم میں بھی بدر منیر اور نسرت شاہین شامل تھے۔ دونوں فلمیں درمیانہ درجہ کی رہیں۔

1987ء ایک بار پھر عزیز تبسم کی کامیابی کا سال ثابت ہوا۔ اس سال انہوں نے کامیاب ترین گولڈن جوبلی اردو فلم ''ہمت والا'' اور دو پشتو فلمیں ''نرم گرم'' اور ''نوکر'' کی ڈائریکشن دی۔ ان میں پشتو فلم ''نرم گرم'' تو باکس آفس پر نرم گئی لیکن باقی دونوں فلمیں بھرپور اردو فلم ''ہمت والا'' نے پورے پاکستان میں زبردست کامیابی اور مقبولیت حاصل کی اور اپنی پہلی اردو فلم ''کشمکش'' کی طرح اعلیٰ معیار کی مووی قرار پائی۔ ''ہمت والا'' کے ساتھ ریلیز ہونے والی اردو فلم ''آن والا'' ناکام ثابت ہوئی۔ بہت عرصے کے بعد عزیز تبسم نے پشتو سینما کے ساتھ ساتھ اردو سینما پر بھی اپنی مقبولیت اور کامیابی کا ثبوت دیا۔ ''ہمت والا'' میں اداکار جان، رنگیلا، شیدی ملک اور آصف خان کی اداکاری کا مظاہرہ کیا۔

1988ء میں عزیز تبسم کی چار فلمیں ریلیز ہوئیں۔ ان میں دو ڈائریکشن سے آراستہ اردو شاہکار فلم ''خان ڈاکو'' اور ان کی اردو فلم ''ہمت والا'' ''خانہ پہ جاپان کے'' ان میں اردو فلم

## زندگی نامہ

اصل نام۔عبدالعزیز خان
فلمی نام۔عزیز تبسم
پیدائش۔پشاور میں ہوئی
تعلیم۔ اسکول اور کالج کی تعلیم پشاور ہی میں حاصل کی۔ 24، 25 سال کی عمر میں کالج کی تعلیم ادھوری چھوڑ کر کراچی آ گئے اور ہدایت کار پرویز ملک کی شاگردی اختیار کر لی۔ 6 سال تک ان کے نائب کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ کراچی میں پہلی پشتو فلم ''یوسف خان شیر بانو'' شروع کی گئی تو ان ہی کو اس کی ہدایت کاری کے لیے منتخب کیا گیا۔ انہوں نے جو 28 فلمیں بنائیں ان میں 23 پشتو، چار اردو اور ایک اردو اور پنجابی کی ڈبل ورژن فلم تھی۔

''ہنگامہ'' جو ایک اعلیٰ درجے کی سوشل ایکشن شاہکار تھی۔ اس نے گولڈن جوبلی منائی۔ ان کی چوتھی فلم ''داظلم انجام'' جو ان کی اردو فلم ''کشمکش'' کا پشتو ورژن تھی۔ یہ بھی سپرہٹ کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔ یہ فلم پہلے ''یاتوز'' کے نام سے ریلیز ہونے والی تھی مگر اس کا نام بعد میں بدل کر ''داظلم انجام'' کر دیا گیا۔

عزیز تبسم نے براہ راست کبھی بھی پنجابی زبان کی کوئی فلم نہیں ڈائریکٹ کی۔ ہاں 1990ء میں صرف ایک فلم ''جنگجو گورپتے'' ڈائریکٹ کی جو اردو اور پنجابی کی ڈبل ورژن فلم تھی۔ یہ فلم بھی سپرہٹ ایکشن مووی ثابت ہوئی۔ اس کی کاسٹ میں جاوید شیخ، نیلی، عجب گل، کویتا، ثمینہ پیرزادہ اور مصطفیٰ قریشی جیسے نامور فنکار شامل تھے۔

1992ء میں عزیز تبسم نے صرف ایک پشتو فلم ''خطرناک'' کی ہدایت کاری کی۔ یہ فلم عزیز تبسم کے فنی کیریئر کے لیے خطرناک ثابت ہوئی۔ یہی فلم ان کی ہدایت کارانہ زندگی کی آخری ریلیز شدہ پشتو فلم ثابت ہوئی۔

کراچی فلم انڈسٹری سے ابھرنے والے ہدایت کار جس نے پاکستانی فلمی صنعت میں اپنے لیے ایک ممتاز مقام بنایا۔ ان کی فنی زندگی 22 برسوں پر محیط ہے۔ اس دوران انہوں نے 28 پشتو اور اردو فلمیں تخلیق کیں جن میں پشتو کی 23، اردو زبان کی چار اور ایک ڈبل ورژن اردو پنجابی فلم تھی۔ چاروں اردو اور ایک ڈبل ورژن فلم سپرہٹ

کامیابی سے ہمکنار ہوئیں۔ ان کی کامیابی کا تناسب 90 فیصد رہا۔ ممتاز علی خان کے بعد عزیز تبسم ہی پشتو سینما کے کامیاب ترین ہدایت کار رہے۔

ہدایت کاری کے علاوہ عزیز تبسم نے کئی پشتو فلموں کی فلمسازی بھی کی اور کئی فلموں کی کہانی اور اسکرین پلے بھی لکھے۔ پشتو فلموں کے بانی، ہدایت کار کے طور پر پشتو فلم انڈسٹری کی تاریخ میں ان کا نام سنہرے حروف میں لکھا جائے گا۔ عزیز تبسم 90 کی دہائی میں امریکا چلے گئے۔ وہاں 22 سال گزار کر 2018ء میں واپس وطن آئے تو امریکا میں اپنی گزاری ہوئی مدت کے بارے میں بتایا کہ وہ امریکا کیوں گئے اور اتنے دنوں تک وہاں کیا کرتے رہے۔ دوستو! آپ کی دلچسپی کے لیے ان کے ایک انٹرویو سے اقتباس پیش کررہا ہوں تاکہ اصل حقائق کا آپ کو علم ہوسکے کیونکہ ان کی عدم موجودگی میں یہاں ان کے بارے میں جو باتیں میڈیا کی زینت بنتی رہیں۔ ان میں کچھ محض قیاس آرائی پر مبنی تھیں۔

امریکا جانے کی کیا وجہ تھی؟ اس کے بارے میں انہوں نے بتایا..... ''1993ء میں امریکی شہر کیلیفورنیا کی ایک فلم کمپنی میں کام کی آفر ہوئی جو گذشتہ کئی برسوں سے اپنی میڈ فلمیں بنارہی تھیں۔ میں وہاں گیا اور انہوں نے مجھے ملازمت دے دی۔ میں بطور اسکرپٹ رائٹر وہاں اپنی خدمات انجام دیتا رہا۔ اب تک میں وہاں انگریزی زبان میں لاتعداد اینی میڈ فلمیں بناچکا ہوں۔ جو امریکا میں باکس آفس پر کامیابی حاصل کرچکی ہیں۔ میں امریکا میں 22 برسوں کے درمیان کیلیفورنیا اور اوکوہاما کی فلم کمپنیوں کے لیے انگریزی زبان میں بچوں کی تفریحی ضرورتوں کو پیش نظر رکھ کر اینی میڈ فلمیں لکھنے کے ساتھ ساتھ ان کے بنانے میں بھی اپنی فنی صلاحیتوں کا ثبوت دیتا رہا ہوں۔

ایک سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ ''مجھے اسکول اور پڑھائی لکھائی سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ میں اس دور میں انگلش فلمیں بہت شوق سے دیکھا کرتا تھا۔ شروع سے میری خواہش تھی کہ میں بھی فلم ڈائریکٹر بنوں لیکن اس دور میں ہدایت کار بننا بہت مشکل کام تھا۔ بہرحال پشاور کے کنگ ایڈورڈ کالج میں اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر کراچی آگیا۔ اس وقت میری عمر 24 یا 25 سال تھی۔ تھوڑی جدوجہد کے بعد نامور ہدایت کار پرویز ملک کے یونٹ میں شامل ہوگیا۔ ان کو جب معلوم ہوا کہ میں ایک پڑھا لکھا لڑکا ہوں اور نہ صرف انگریزی زبان فراٹے سے بول لیتا ہوں بلکہ اچھی طرح انگریزی لکھ پڑھ بھی سکتا ہوں تو انہوں نے مجھے اپنا اسسٹنٹ ڈائریکٹر بنالیا۔ مجھے ڈائریکشن سیکھنے کا شوق تو ابتداء ہی سے تھا۔ میں نے خوب جی لگا کر مسلسل چھ برس تک پرویز ملک صاحب کو اسسٹنٹ کیا اور اس دوران ان کے ساتھ وحید مراد کی ابتدائی فلمیں دوراہا، ارمان وغیرہ میں بطور ایسوسی ڈائریکٹر کام کیا۔''

وہ جو بزرگوں کا کہنا ہے کہ استاد اچھا ہو تو شاگرد بھی اچھے ہوتے ہیں۔ یہ بات عزیز تبسم پر صادق آتی ہے۔ پرویز ملک جیسے استاد سے تربیت حاصل کیے ہوئے تھے اس لیے دیار غیر میں جاکر بھی پروقار زندگی بسر کی۔ امریکا جیسے ملک میں بھی اپنی فنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا اور امریکی فلمسازوں کے ساتھ کام کیا۔ 22 سال تک امریکا جیسے ملک میں قیام کرنا اور اپنی فنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر روزی روٹی کمانا، اس بات کا بین ثبوت ہے کہ عزیز تبسم معمولی خوبیوں کے حامل نہیں تھے۔

بڑے لوگوں کی سوچ اور فکر بھی بڑی ہوتی ہے۔ جب عزیز تبسم 22 برس بعد وطن واپس آئے تو انہیں یہ جان کر بہت دکھ ہوا کہ ان کے کئی پرانے دوست اور ساتھی فنکار اب موجود نہیں، وہ جنت آشیانی ہوچکے ہیں تو انہوں نے لاہور کے ایور نیو اسٹوڈیو میں بدر منیر، یاسمین خان، بیدار بخت، عمر دراز، خلیل، لالہ سردار خان، بختیار تانگہ، امیر غلام صادق، جہانزیب نوشہروی اور طارق شاہ کے لیے قرآن خوانی کا اہتمام کیا اور ان کی روحوں کو ایصال ثواب پہنچایا۔

بات جس انٹرویو کی ہورہی تھی اس میں انہوں نے پرانی یادوں کی راکھ کریدتے ہوئے بتایا کہ ''1970ء میں میری ریلیز ہونے والی پہلی فلم ''یوسف خان شیر بانو'' نے اس دور میں پشاور، مردان، سوات، راولپنڈی اور کراچی میں چالیس لاکھ روپے کا بزنس کیا تھا۔ جبکہ میری اردو فلموں کشمکش، ہمت والا، ہنگامہ اور جنگجو گورلے نے گولڈن جوبلی منائی تھی۔ دو پشتو فلموں پر مجھے بہترین ہدایت کار کا نگار ایوارڈ ملا تھا جبکہ پانچ پشتو اور اردو فلموں پر مجھے بولان، مصور اور دیگر ایوارڈ ملے۔

22 سال بعد جب انہوں نے پاکستان میں فلم انڈسٹری اور ٹریڈ کو دیکھا تو انہیں بڑا دکھ ہوا۔ ''مجھے یہ دیکھ کر بہت دکھ ہوا کہ خیبر پختون خواہ میں 25 کے قریب سینما گھر

مسمار کیے جا چکے ہیں۔ یہ پشتو فلمیں دیکھنے والے فلم بینوں پر بڑا ظلم ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ خیبر پختون خواہ میں کم از کم 20 سنے پلیکس سینما گھر تعمیر کیے جائیں۔ اس کے ساتھ تمام فلم میکروں کو چاہیے کہ وہ اپنی فلموں میں جدت پیدا کریں۔''

انہوں نے اپنے دور کو یاد کرتے ہوئے کہا کہ ''ماضی میں ہدایت کار انتہائی سبق آموز اور معیاری فلمیں بناتے تھے۔ جنہوں نے اس دور میں پشاور، مردان اور کراچی میں ایک ایک سینما پرسلور، گولڈن، پلاٹینم اور ڈائمنڈ جوبلیاں منائیں۔ اس دور میں فلم کی کہانی اس کے ڈائیلاگ اور موسیقی پر مہینوں کام ہوتا تھا مگر اب ایسا نہیں ہوتا۔''

ایک سوال کے جواب میں اپنے پسندیدہ فنکاروں کا ذکر یوں کیا۔ ''پاکستان کی فلم انڈسٹری میں ہر دور میں لیجنڈ فنکار پیدا کیے۔ ان میں ایک بابرہ شریف بھی ہے۔ وہ نیچرل اداکاری میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ کویتا کو ایکشن مناظر اور ڈانس پر مکمل عبور حاصل تھا۔ جبکہ لالہ سدھیر، آغا طالش، درپن، علاؤالدین اور سنتوش کمار جیسے سپر اسٹارز اکیڈمی کا درجہ رکھتے تھے۔''

ہالی ووڈ کی فلم میکنگ سے متعلق ایک سوال کے جواب میں عزیز تبسم نے بتایا کہ ''پاکستان اور ہالی ووڈ کی فلموں اور ان کی میکنگ کے انداز میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ہالی ووڈ میں فلم بنانے سے پہلے اسٹوری لکھی جاتی ہے۔ اسکرپٹ رائٹنگ کے لیے باقاعدہ ایک بورڈ تشکیل دیا جاتا ہے اور مہینوں کہانی اور اس کے مکالموں پر محنت کی جاتی ہے تب کہیں جا کر اسکرپٹ فائنل ہوتا ہے لیکن ہمارے ہاں ایسا کچھ نہیں ہوتا۔''

عزیز تبسم کا 2017ء میں امریکا میں دل کا بائی پاس آپریشن ہو چکا ہے۔ صحافی نے ان سے جب سوال کیا کہ آپ کی اتنی اچھی صحت کا راز کیا ہے؟'' تو انہوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''میری اچھی صحت کا راز یہ ہے کہ میں ہر وقت خوش رہتا ہوں۔ چوبیس گھنٹے اللہ کا ذکر کرتا ہوں۔''

☆☆☆

کراچی کی فلموں، فنکاروں اور ہنرمندوں کی ساری سرگرمیوں کی بنیادی وجہ اس کے سینما گھر رہے۔ جب تک یہاں سینماؤں کا جمعہ بازار قائم رہا، فلمی کاروبار میں بھی نکھار رہا۔

کراچی میں مرکزی سینماؤں کے علاوہ مضافاتی علاقوں میں پاکستان بننے کے بعد سینماؤں کی تعمیر میں بڑی تیزی سے اضافہ ہوا۔ 1950ء سے 1970ء تک بڑی تعداد میں سینما گھر بنائے گئے جن کا مختصر تاریخی پس منظر کچھ یوں ہے۔

شیریں۔ کورنگی میں 1961ء میں ایک اوپن ایئر سینما شیریں کے نام سے بنا جو 8 سال چلنے کے بعد جون 1969ء میں بند ہو گیا۔

مسعود۔ اس نام سے بننے والا کورنگی سوکوارٹرز کے اس سینما کا افتتاح 15 فروری 1964ء کو اکمل، محمد علی اور بہار کی فلم ''خاندان'' سے ہوا۔ 1980ء میں اس سینما کو دوبارہ تعمیر کیا گیا اور اسے ''نسرین'' کا نام دیا گیا۔ 29 فروری 1980ء کو پنجابی فلم ''نظام ڈاکو'' سے اس کا افتتاح ہوا۔ ایک مہینے کے بعد اسے بند کر دیا گیا اور ایک بار پھر نئے فرنیچر اور نئی اسکرین لگائی گئی اور 9 اگست 1981ء کو یہاں ممتاز، محمد علی کی ایکشن فلم ''سنگرام'' لگائی گئی اور یہ باقاعدگی سے چلنے لگا اور آج بھی چل رہا ہے۔

نسیم۔ کورنگی کے خوبصورت نئے سینما گھر کا افتتاح 18 اکتوبر عیدالفطر کے دن 1974ء کو رانی اور وحید مراد کی فلم ''لیلیٰ مجنوں'' سے ہوا۔

زینت۔ کورنگی میں واقع اس سینما کا شمار بھی اعلیٰ درجہ کے سائیڈ سینماؤں میں ہوتا ہے۔ 22 دسمبر 1968ء عیدالفطر کے دن یہاں پہلی فلم زیبا، محمد علی کی ''تاج محل'' لگی تھی۔

غالب۔ کورنگی میں نسیم، زینت اور نسرین کے ساتھ ہی واقع ہے۔ اس سینما کا افتتاح 27 جنوری 1972ء کو عیدالاضحیٰ کو رانی اور وحید مراد کی فلم ''خلش'' سے ہوا تھا۔ کورنگی کے ان سینما ہاؤسز میں اب شاید ایک یا دو سینما چل رہے ہیں۔

تصویر محل۔ سوکوارٹرز کورنگی کے اس سابقہ سینما کا افتتاح 29 اکتوبر 1976ء کو سنگیتا، غلام محی الدین کی فلم ''محبت اور مہنگائی'' سے ہوا تھا۔ یہ سینما اگست 1986ء میں بند ہو گیا۔

صنم۔ بھینس کالونی لانڈھی کے اس سابقہ سینما کا افتتاح 5 ستمبر 1972ء کو پنجابی فلم ''پتر دا پیار'' سے ہوا تھا۔ یہ سائیڈ سینما 1988ء میں توڑ دیا گیا۔

مہتاب۔ لانڈھی کے اس خوبصورت سائیڈ سینما کا

افتتاح 6 ستمبر 1968ء کو آغا جی اے گل کی پہلی کلر پاکستانی فلم ''مائلہ'' سے ہوا تھا۔ جس میں شمیم آراء، سنتوش کمار اور درپن نے مرکزی کردار کیے تھے۔

شیش محل۔ اپنے نام کی طرح خوبصورت اس سائیڈ سینما کا افتتاح 17 ستمبر 1971ء کو ندیم اور شبنم کی فلم ''چراغ کہاں روشنی کہاں'' سے ہوا تھا۔

پیری کین۔ یہ بنا چھت کا قدیم سینما کورنگی میں واقع تھا۔ اسے چھاؤنی والا سینما بھی کہتے تھے یہاں صرف ایک شو ہوا کرتا تھا۔ اسے توڑ کر شاپنگ سینٹر بنا دیا گیا۔

نیرنگ۔ لالوکھیت میں قائم ہونے والا یہ پہلا سینما گھر تھا۔ 1952ء میں یہ اوپن ایئر تھیٹر کی شکل میں شروع ہوا۔ 1961ء میں لیاقت آباد تعمیر نو کے بعد اسے نئی طرز پر تعمیر کیا گیا۔ 1979ء میں یہ سینما ایک بلڈنگ میں تبدیل کر دیا گیا اور اس بلڈنگ میں ''مضراب'' کے نام سے نیا سینما ہاؤس قائم کیا گیا جس کا افتتاح 25 اگست 1979ء میں عیدالفطر کے دن فلم ''جوش'' سے ہوا۔ نیرنگ کی آخری فلم ''دو آنسو'' تھی۔ مارچ 1983ء میں مضراب سینما کو آگ لگ گئی اور پھر یہ بند ہو گیا۔ 1992ء کو اس سینما کو ''وینس'' کا نام دیا گیا اور یہاں 2 فروری 1992ء کو اردو فلم ''انسانیت کے دشمن'' پیش کی گئی۔ آج بھی یہ سینما موجود ہے۔ جہاں زیادہ تر پنجابی فلمیں ریلیز کی جاتی ہیں۔

ارم۔ لیاقت آباد کے علاقے فیڈرل بی ایریا میں ایک بے حد معیاری خوبصورت سینما ارم کے نام سے تعمیر ہوا۔ جس کا افتتاح 19 اپریل 1974ء کو ندیم اور نشو کی ڈائمنڈ جوبلی فلم ''تاوان'' سے ہوا تھا۔ اس سینما کی بلڈنگ میں ایک خوبصورت منی سینما گلیکسی کے نام سے قائم ہوا جس کا افتتاح 18 اکتوبر 1974ء عیدالفطر کے دن فلم ''مس ہپی'' سے ہوا تھا۔ یہ دونوں سینما 1986ء میں بند کر دیے گئے اور ان کی جگہ شادی ہال بنا دیے گئے۔

عرشی۔ فیڈرل بی ایریا عائشہ منزل کے قریب 16 جون 1974ء کو عرشی سینما کا افتتاح رنگیلا کی کامیاب فلم ''پردہ نہ اٹھاؤ'' سے ہوا۔ اس بلڈنگ میں جہاں عرشی قائم ہوا اس کے ساتھ اسی بلڈنگ میں ایک اور سینما اوپرا کے نام سے بنایا گیا۔ جس کا افتتاح 9 اگست 1974ء کو انگریزی فلم ''سولجر بلو'' سے ہوا تھا۔ یہ دونوں سینما 1989ء میں ختم کر دیے گئے۔

چاندنی۔ سبزی منڈی پرانی جیل روڈ پر 12 دسمبر 1980ء کو چاندنی سینما کا افتتاح ہوا۔ وحید مراد اور شبنم کی فلم ''پیاری'' پہلی فلم تھی جو یہاں دکھائی گئی۔

خیام۔ نرسری پی ای سی ایچ سوسائٹی کے پوش علاقے میں 1956ء کو خیام کے نام سے ایک بے حد معیاری اور جدید سینما بنا جس کا افتتاح ایک انگریزی فلم ''کلپو جوائے'' سے ہوا۔ ہائی جنٹری کا یہ پسندیدہ سینما تھا۔ یہاں کئی پاکستانی فلمیں سائیڈ کے طور پر بے حد اچھا بزنس کرنے میں کامیاب رہیں۔ یہاں آخری فلم ''تلاش'' ریلیز کی گئی۔ اس کے بعد اسے گرا دیا گیا اور اس کی جگہ شاپنگ سینٹر بنا دیا گیا۔

ہالی ووڈ۔ بہادر آباد کے پوش ایریا میں یکم ستمبر 1970ء کو اس سینما کی تعمیر کی گئی۔ یہ ایک معیاری فل ایئر کنڈیشنڈ سینما تھا جو سائیڈ کے طور پر بے حد کامیاب رہا۔ یہاں پہلی فلم ''راجا جانی'' لگی تھی جس کے ہدایت کار رنجیت مرزا تھے۔ 1987ء میں یہ سینما توڑ کر وہاں رہائشی اور کمرشل سینٹر بنا دیا گیا۔

امبر۔ ہالی ووڈ کے بعد بہادر آباد میں ایک نیا سینما امبر کے نام سے بنا جس کا افتتاح 18 جولائی 1975ء کو ندیم اور شبنم کی فلم ''دلنشیں'' سے ہوا تھا۔

شیریں۔ یہ سینما 1965ء میں قائم ہوا۔ اس نام کا ایک اور سینما کورنگی میں بھی تھا۔ نیو کراچی میں قائم ہونے والے اس سینما کا افتتاح رانی اور محمد علی کی یادگار فلم ''ہزار داستان'' سے ہوا تھا۔

صبا۔ نیو کراچی میں بننے والا دوسرا سینما صبا تھا جس کا افتتاح 17 اپریل کو رانی اور وحید مراد کی نغماتی فلم ''ناگ منی'' سے ہوا تھا۔

فلستان۔ تین ہٹی میں تعمیر ہونے والے اس سینما کا افتتاح 1953ء میں بھارتی فلم ''ترانہ'' سے ہوا تھا۔

ناولٹی۔ فلستان سے کچھ فاصلے پر ناولٹی سینما تھا جس کا افتتاح 10 اپریل 1959ء میں ریلیز ہونے والی پاکستانی فلم ''تیرے بغیر'' سے ہوا تھا۔

ریجنٹ۔ ناظم آباد کے علاقے میں بننے والے اس سینما کا افتتاح 1954ء میں بھارتی فلم ''ملہار'' سے ہوا تھا۔

شالیمار۔ ناظم آباد میں قائم ہونے والے اس پکچر ہاؤس کا افتتاح بھارتی فلم ''کالی گھٹا'' سے ہوا تھا۔ یہ سینما دسمبر 1991ء میں منہدم کر دیا گیا۔

مسرت۔ ناظم آباد میں 1954ء کو ایک اوپن

سینما مسرت کے نام سے تعمیر ہوا۔ 23 مارچ 1954ء کو پاکستانی فلم ''مجبور'' سے اس کا افتتاح ہوا۔ مسرت اپنے وقت کا ایک کامیاب سینما ہے۔ جہاں نئی پاکستانی فلمیں ریلیز کے طور پر ریلیز ہوتی رہیں اور پرانی فلمیں بھی یہاں پیش کی جاتی رہیں۔

دلشاد۔ سائٹ ایریا میں 6 ستمبر 1968ء کو فلم ''ہونے کی چڑیا'' سے شروع ہوا۔ محمد علی اور غزالہ نے اس فلم میں مرکزی کردار ادا کیے تھے۔ 1977ء میں یہاں سے بتی اور پھر یہ سینما بند ہوگیا۔ کچھ عرصہ بعد یہاں فیکٹری بنادی گئی۔

لبرٹی۔ پاپوش نگر چاندنی چوک کے علاقے میں ایک خوبصورت سینما کا افتتاح جولائی 1957ء کو انگریزی فلم ''اشیلا'' سے ہوا تھا۔ اپریل 1988ء میں یہاں آخری فلم ''گہرے زخم'' دکھائی گئی۔ اس کے بعد یہ سینما شادی ہال میں تبدیل ہوگیا۔

نایاب۔ ناظم آباد میں تعمیر ہونے والا یہ خوبصورت سینما 8 نومبر 1968ء کو اوپن ہوا۔ یہاں پہلی فلم شبنم اور وحید مراد کی فلم ''جہاں تم وہاں ہم'' ریلیز ہوئی تھی۔

ریلیکس۔ ناظم آباد کے علاقے کا سب سے خوبصورت جدید اور معیاری سینما ریلیکس کا افتتاح 1958ء میں دلیپ کمار کی فلم ''سنگدل'' سے ہوا تھا۔ یہ نئی فلموں کا ایک کامیاب ترین سائیڈ سینما تھا جہاں فلمیں تین سے چار ہفتے تک بڑی کامیابی کے ساتھ بزنس کرتی تھیں۔ بعد ازاں توڑ کر رہائشی سینٹر بنادیا گیا۔

سوسائٹی۔ لسبیلا چوک پر تعمیر ہونے والا یہ سینما 2 جنوری 1968ء کو شروع ہوا۔ یہاں پہلی فلم کمال اور شبنم آراء کی ''دوسری ماں'' ریلیز ہوئی تھی۔

ڈیلیکس۔ ماری پور میں ''ڈیلیکس'' کے نام سے بنایا گیا تھا جس کا افتتاح 1959ء میں ہوا تھا۔

کراؤن۔ ماڑی پور روڈ پر 18 ستمبر 1970ء کو قائم ہونے والے اس سینما کی پہلی فلم ''گھونگھٹ لاکنوار'' سندھی زبان کی فلم تھی۔ 2019ء میں اسے توڑ کر اس کی جگہ رہائشی عمارتیں تعمیر کیے گئے ہیں۔

شاہین۔ ماڑی پور میں 7 اپریل 1978ء میں قائم ہونے والا اس سینما کی پہلی فلم محمد علی اور وحید مراد کی فلم ''آدمی'' ریلیز ہوئی تھی۔

اوڈین۔ اس نام کا ایک سینما صدر کے علاقے میں تھا جو مین تھیٹر کی حیثیت رکھتا تھا۔ یہ دوسرا سینما ماڑی پور میں 1959ء میں بنا تھا اور 1979ء میں بند ہوگیا۔

گلشت۔ یہ اوپن ایئر سینما 1971ء میں ماڑی پور میں بنایا گیا تھا۔ جہاں صرف دو شو ہوا کرتے تھے۔ 1975ء میں یہ سینما بند ہوگیا۔

فیلکن۔ 3 دسمبر 1982ء کو فیلکن کے نام سے ماڑی پور میں ایک سینما بنا۔ ندیم اور کویتا کی فلم ''تھوڑی سی بے وفائی'' اس کی افتتاحی فلم تھی۔

کرن۔ بناچھت کے اس سینما کا افتتاح 14 اکتوبر 1966ء کو مسرت نذیر، اعجاز اور علاؤالدین کی فلم ''ڈاکو کی لڑکی'' سے ہوا تھا۔ یہ پاک کالونی لیاری کا واحد سینما تھا۔

راج محل۔ شیر شاہ میں تعمیر ہونے والے اس سینما کا افتتاح 18 اکتوبر 1982ء کو بابرہ شریف اور ندیم کی فلم ''زندگی'' سے ہوا تھا۔

ڈیلائٹ۔ شیر شاہ میں واقع یہ سینما 1963ء میں تعمیر ہوا تھا۔

چمن۔ منگھوپیر روڈ پر 2 اگست 1957ء کو فلم ''دربارِ حبیب'' سے اوپن ہونے والا چمن سینما اپنے دور میں سائیڈ فلموں کا کامیاب سینما تھا۔

رنگ محل۔ شیر شاہ میں قائم ہونے والا یہ سینما 1961ء میں تعمیر ہوا تھا۔

شہزاد۔ قصبہ کالونی میں اس سینما کا افتتاح 27 اکتوبر 1977ء کو ممتاز اور سلطان راہی کی اردو فلم ''شاہین'' سے ہوا تھا۔

میٹرو۔ اورنگی ٹاؤن کا خوبصورت اور معیاری سینما میٹرو کا افتتاح 21 ستمبر 1973ء میں ہوا تھا۔ یہاں پہلی فلم ''سادھو اور شیطان'' پیش کی گئی تھی۔ روزینہ اور سلطان راہی نے اس فلم میں مرکزی کردار ادا کیے تھے۔

روبی۔ بلدیہ ٹاؤن کے معیاری اور خوبصورت سینما روبی کی تعمیر 17 دسمبر 1976ء میں مکمل ہوئی۔ اس سینما کا افتتاح محمد علی اور زیبا کی فلم ''پھول اور شعلے'' سے ہوا تھا۔

الف لیلیٰ۔ روبی کے بعد یہ بلدیہ ٹاؤن میں دوسرا سینما الف لیلیٰ کے نام سے تعمیر ہوا۔ جس کا افتتاح 13 جولائی 1979ء کو رنگیلا کی ذاتی فلم ''عورت راج'' سے ہوا تھا۔

گریشن سینما۔ اس منی سینما ہاؤس کا افتتاح مارچ 1979ء میں فلم ''چوری چوری'' سے ہوا تھا۔ زیبا اور

محمد علی اس فلم کے مرکزی کردار تھے۔ یہ سینما ملیر میں واقع تھا۔ یہاں فوجیوں کے لیے فلمیں ریلیز کی جاتی تھیں۔

یہ تو ہیں کراچی کے سائیڈ کے سینما گھر، جن میں اب چند ہی باقی رہ گئے ہیں۔ آج کی نئی نسل ہی نہیں، مجھے یقین ہے کہ بہت سے سینئر سٹیزن بھی ان میں سے بہت سے سینما گھروں کے نام سے واقف نہیں ہوں گے۔ ایک زمانہ تھا جب فلم بینی سب سے سستی تفریح ہوا کرتی تھی۔ چند آنوں سے لے کر چند روپے میں لوگ ڈھائی تین گھنٹے کی تفریح سے لطف اندوز ہو جایا کرتے تھے۔ جبکہ آج کے دور میں یہ سستی تفریح اتنی مہنگی ہوگئی ہے کہ کم آمدنی والے لوگوں کے لیے خواب بن گئی۔ کہنے کو تو پرانے سینماؤں کی جگہ نئے اور جدید ٹیکنالوجی سے آراستہ سینماؤں نے لے لی ہے مگر ان کے ٹکٹ اتنے مہنگے ہوتے ہیں کہ عام لوگوں کی دسترس سے کوسوں دور ہوتے ہیں۔ پانچ سو اور ہزار پندرہ سو کے ٹکٹ خریدنا عام تماشائیوں کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ اب فلموں کی کامیابی کا پیمانہ جوبلیاں نہیں ہوتیں۔ اب کروڑوں کمانے والی فلموں کو ہی کامیاب قرار دیا جاتا ہے۔

دوستو! ہم جو اس وقت پرانی یادیں تازہ کر رہے ہیں۔ پرانے سینماؤں کے ضمن میں یہ بھی بتاتا چلوں کہ پاکستان بننے کے بعد، جن پرانے سینماؤں کو نئے ناموں سے دوبارہ شروع کیا گیا...ان میں پہلی بار کون سی فلم دکھائی گئی۔

جیسا کہ آپ کو بتا چکا ہوں کہ پاکستان بننے سے پہلے شہر کراچی میں 20 مرکزی سینما گھر موجود تھے۔ جب 1946ء میں ہنگامے پھوٹ پڑے تو کراچی کے تمام سینما گھر بند ہوگئے ان کے مالکان زیادہ تر ہندو تھے جو حالات کے پیش نظر کراچی چھوڑ کر بھارت چلے گئے پھر جب پاکستان بن گیا اور حالات نارمل ہوئے تو کئی ہندو مالکان واپس آئے اور اپنے سینما گھر مسلمانوں اور پارسیوں کے ہاتھوں فروخت کر دیے۔ نئی انتظامیہ نے ان پرانے سینما گھروں کو نئے ناموں سے چلانا شروع کر دیا۔ پرانے سینما جب ایک ڈیڑھ سال بند رہنے کے بعد دوبارہ کھلے تو ان کی نمائش پذیر پہلی فلم کون سی تھی۔ یہ یاد رہے کہ پاکستانی فلمی صنعت کی ابتداء بھی 1948ء کے بعد ہوئی تھی۔ لہٰذا سینما گھروں میں بھارتی فلمیں ہی دکھائی جاتی تھیں۔

لائٹ ہاؤس۔ نومبر 1947ء کو اس سینما گھر کا دوبارہ افتتاح رنجیت مووی ٹون کی فلم ''بیلا'' سے ہوا۔

ریگل۔ پریڈی اسٹریٹ صدر کا مشہور سینما ریگل 1947ء سے پہلے موجود تھا جو فسادات کے دوران بند ہوگیا تھا۔ پاکستان بننے کے بعد 1947ء کے آخری دنوں میں بھارتی فلم ''سندور'' سے اس کا افتتاح ہوا۔ شمیم بانو اور کشور ساہو اس کے مرکزی کردار تھے۔ 1955ء میں اس کی نئی انتظامیہ نے اس کی تعمیر میں کچھ تبدیلیاں کر کے اسے دوبارہ پاکستانی فلم ''سوہنی'' سے اس کا افتتاح کیا۔

پلازا۔ ایم اے جناح روڈ کا اہم اور سب سے کامیاب مین سینما پلازا کا نیا افتتاح بھارتی فلم ''ساجن'' سے 1947ء میں ہوا۔

ناز۔ ایم اے جناح روڈ کے اس سینما کا دوبارہ افتتاح ''ناز'' کے نام سے ہونا تھا مگر کسی وجہ سے یہ فلم دکھائی نہ جا سکی اس کی جگہ اے آر کاردار کی فلم ''درد'' سے اس کا افتتاح ہوا۔

رٹز۔ اس کا پرانا نام امپیریل تھا۔ 1948ء میں رٹز کے نام سے اس کو دوبارہ چلایا گیا۔ اس کی پہلی فلم ''منجدھار'' تھی جو بھارتی فلم تھی اور اس کے فلمساز سہراب مودی تھے۔

میجسٹک۔ یہ سینما رٹز سینما کے سامنے ایم اے جناح روڈ پر واقع تھا۔ اس کی دوبارہ افتتاح سبطین فضلی کی مسلم سوشل بھارتی فلم ''مہندی'' سے 1948ء میں ہوا تھا۔

کمار۔ 1946ء کے فسادات میں بند ہونے والا اس قدیم سینما کا دوبارہ افتتاح بھارتی فلم ''سفر'' سے ہوا تھا۔ یہ سینما نیپئر روڈ پر آج بھی موجود ہے اور چل رہا ہے۔

سپر۔ نیپئر روڈ اور بھیم پورہ سڑک کے کارنر پر واقع یہ سینما بھی 1946ء میں بند ہوگیا تھا۔ دوبارہ 1948ء میں مسلم سوشل بھارتی فلم ''اعلان'' سے چلنے لگا۔ اس فلم میں اداکار ریحان نے ایک اہم کردار ادا کیا تھا۔ جو بہت بعد میں پاکستانی فلموں میں اولڈ کیریکٹر کرتے رہے۔

نور محل۔ اس کا پرانا نام جگدیش ٹاکیز تھا۔ پاکستان بننے کے بعد اس کا نیا نام نور محل رکھا گیا۔ نور محل میں ریلیز ہونے والی پہلی فلم ''پیا گھر آجا'' تھی جس میں بینا کماری نے یادگار کردار ادا کیا تھا۔ نور محل کا افتتاح 1949ء میں ہوا تھا۔

تاج محل۔ یہ سینما بھی فسادات کی وجہ سے بند کر دیا گیا تھا۔ دوبارہ 1949ء میں کھولا گیا۔ یہ سینما ایم اے

ناح روڈ پر واقع تھا۔ دوبارہ کھلنے کے بعد پہلی بھارتی فلم ''پیار کی جیت'' دکھائی گئی تھی جس میں ثریا اور رحمن نے مرکزی کردار ادا کیے تھے۔

بدر۔ کیماڑی کی ایک گلی میں پاکستان بننے سے پہلے ایک چھوٹا سا سینما کیماڑی ٹاکیز کے نام سے ہوا کرتا تھا۔ بعد میں جس کا نام گلوب ہوگیا تھا۔ 1946ء میں یہ بند ہوگیا تھا۔ اسے 1950ء میں دوبارہ بدر کے نام سے شروع کیا گیا۔ یہاں پرانی فلمیں دکھائی جاتی تھیں۔

نگار۔ نیپئر روڈ کا یہ ایک اہم مرکزی سینما تھا جو [illegible] میں جلا دیا گیا تھا۔ اس وقت یہ پربھات ٹاکیز کے نام سے چل رہا تھا۔ 1950ء میں ازسرنو اس سینما کی تعمیر کی گئی اور اسے نگار کا نام دیا گیا۔ اس نئے سینما کا افتتاح پہلی فلم ''مینا بازار'' سے ہوا تھا۔ یہ سینما آج بھی بند حالت میں موجود ہے۔

لیرک۔ لیرک سینما 2005ء میں بند ہوگیا۔ کافی عرصہ تک اس کی بلڈنگ قائم رہی۔ بالآخر 2019ء میں اسے منہدم کردیا گیا اور اس کی جگہ شاپنگ سینٹر قائم ہوگیا۔ لیرک کی آخری فلم ''پرچم'' تھی۔

قیام پاکستان سے پہلے بھی کراچی شہر کی اہمیت تھی کیونکہ یہ ساحل سمندر کے دامن میں واقع تھا اور اس کا اپنا ایک پورٹ تھا جہاں سے ایکسپورٹ اور امپورٹ کے کاروبار کو بڑی تقویت حاصل ہوتی تھی۔ پاکستان بننے کے بعد اس شہر کی اہمیت اور افادیت میں مزید اضافہ اس طرح ہوگیا کہ اسے پاکستان کا دارالخلافہ بنادیا گیا۔ 1962ء تک اسے یہ اعزاز حاصل رہا۔ اس کی سیاسی اہمیت کے ساتھ ساتھ اس کی معاشی اور تجارتی پوزیشن میں بھی پھیلاؤ پیدا ہوتا چلا گیا۔ دیگر انڈسٹریز کی طرح فلم اور سینما انڈسٹری نے بھی ترقی کرنا شروع کردی۔ ملک بھر سے یہاں لوگ روزگار کے سلسلے میں آتے رہے۔ آبادی میں اضافہ کی وجہ سے شہر پھیلتا اور وسیع تر ہوتا گیا اور اسی تناسب سے اس کے سینما گھر بھی بڑھتے گئے۔ جب ہمارے ہاں فلمیں بہت کم تعداد میں بنتی تھیں اس دور میں بھارتی فلمیں اس کمی کو پوری کرتی رہیں پھر وہ وقت بھی آیا جب ہمارے ہاں سالانہ سو فلمیں تک بننے لگیں۔ ان فلموں کا معیار بھی اچھا ہوا کرتا تھا پھر ہمارے فلم میکرز کے ایک طبقہ نے چیخ چلا کر بھارتی فلموں کی نمائش پر پابندی لگوادی۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ بھارتی فلموں کی موجودگی میں ہماری فلمیں ترقی نہیں کرسکتیں مگر پابندی لگنے کے بعد ایسا نہیں ہوا، جیسا کہا گیا تھا۔ بھارتی فلموں کی موجودگی میں تو مقابلے کا ایک رجحان تھا، کوشش کی جاتی تھی کہ اچھی فلم بنائی جائے تاکہ بھارتی فلموں کی موجودگی میں بھی عوامی پذیرائی حاصل کریں۔ پابندی ختم ہوئی تو یہ جذبہ آہستہ آہستہ معدوم ہوتا گیا۔ فلموں کے معیار پر توجہ دینا کم ہوتا گیا۔ زیادہ تر فلم بنانے والے بھارتی فلموں کے چربے بنانے لگے۔ اب جب پہلے جیسی خوبصورت اور معیاری فلمیں روز بروز کم سے کمتر ہوتی گئیں تو تماشائیوں کی دلچسپیاں بھی کم ہونے لگیں۔ فلم بینوں نے سینما گھروں کا رخ کرنا بھی کم کردیا اور ایک ایسا وقت بھی آیا جب سینما گھر مرثیہ خواں ہوگئے کہ تماشائی نہ رہے۔

اور یہی وہ حالات تھے کہ سینما مالکان نے مجبور ہوکر انہیں ختم کردیا۔ حالات سدا ایک سے نہیں رہتے۔ بچے کھچے سینما گھروں کے مالکان نے حکومت وقت سے مطالبہ کرنا شروع کردیا کہ اگر دوبارہ بھارتی فلموں کی نمائش کی اجازت نہیں دی گئی تو ہم ملک گیر طور پر یہ باقی سینما گھر بھی منہدم کردیں گے۔

دوستو! سینما ٹکٹوں سے حکومت ٹیکس کی مد میں خاصی رقم وصول کرتی ہے لہٰذا حکمرانوں کو دوبارہ بھارتی فلموں کی نمائش کی اجازت دینی پڑی۔ اب یہ دلچسپ صورت حال سامنے آئی کہ بھارتی فلموں کی وجہ سے تماشائی آنے لگے تو سینما گھر کم پڑ گئے کیونکہ بہت سے سینما گھروں کی جگہ شاپنگ پلازے اور رہائشی سینٹرز بنادیئے گئے تھے۔ سینماؤں کی اس کمی کے پیش نظر نئے سرے سے سینما گھر تعمیر کیے جانے لگے۔ مگر یہ سینما نئے دور کے نئے تقاضوں کے تحت پرانے سینما جیسے نہیں تھے۔ یہ جدید سائنس و ٹیکنالوجی سے آراستہ چھوٹے چھوٹے سینما گھر تھے۔ محدود سیٹوں پر مشتمل۔ پرانے سینماؤں میں جہاں سو سے زائد نشستیں ہوتی تھیں۔ وہ ان نئے پلیکس اور ملٹی پلیکس سینماؤں میں چالیس پچاس سے زیادہ سیٹیں نہیں ہوتیں۔ ایسے سینماؤں کا رواج جاپان سے شروع ہوا تھا اور اس وجہ سے ایسے سینما گھر بنائے گئے تھے کہ لوگوں کے پاس اپنی مصروفیات کی وجہ سے اتنا وقت نہیں بچتا تھا کہ سینما گھروں تک جائیں۔ جبکہ انہیں گھر بیٹھے بھی بہت سی تفریحات مہیا ہوجاتی تھیں۔ اس وجہ سے بڑے سینما گھر اکثر خالی رہنے لگے تو انہوں نے منی سینما گھر تعمیر کرنا شروع کردیے۔ یہ ٹیکنالوجی جلد ہی دنیا بھر میں مقبول ہوگئی اور بڑے سینما گھروں کی جگہ منی سینما گھر بنائے

جانے لگے۔ ہمارے ہاں بھی جب نئے سینماؤں کی ضرورت پڑی تو سنے پلیکس اور ملٹی سنے پلیکس سینما گھر دھڑا دھڑ تعمیر کیے جانے لگے۔ ان میں کچھ تو سنگل منی سینما ہوتے تھے اور کچھ دو، تین اور چار منی سینماؤں پر مشتمل ہوتے تھے۔ بھارتی فلموں کی وجہ سے ایسے سینما گھروں کی تعمیر کراچی ہی میں نہیں ملک کے تمام چھوٹے بڑے شہروں میں ہوئی۔ کراچی کے ایسے چند سینماؤں کے نام ایٹریم، میگا مکینیم ملٹی پلیکس، سائن پلیکس، یونی ورس سائن پلیکس، سائن پلیکس ہیں۔ جبکہ لاہور، اسلام آباد، راولپنڈی، فیصل آباد، گجرانوالہ، مری، گجرات، سیالکوٹ، سرگودھا، ملتان اور حیدر آباد میں بھی متعدد سنے پلیکس اور ملٹی پلیکس سینما گھر تعمیر کیے گئے ہیں۔ ان کی وجہ سے ایک بار پھر سینما انڈسٹری کو آکسیجن ملا اور یہ انڈسٹری ترقی کے راستے پر گامزن ہوگئی لیکن شاید فنک کچ رفتار کو اس کا پھولنا پھلنا اچھا نہیں لگا اور حالات نے پھر ایک کروٹ لی۔ بھارت سے سیاسی حالات کشیدہ ہوگئے۔ سرکاری سطح پر بھارت سے فلمیں آنے اور ان کی نمائش پر پابندی لگ گئی۔ ہمارے ہاں ان دنوں جو فلمیں بنائی جارہی ہیں ان کی تعداد بہت کم ہے جو سینماؤں کی سالانہ ضرورت پوری نہیں کرسکتی ہیں۔

☆☆☆

کراچی سے محبت کرنے والے دوستو! کراچی کے حوالے سے کراچی کی فلم اور سینما انڈسٹری کراچی کی فلموں اور ان کے فنکاروں اور ہنرمندوں کے بارے میں اس تحریر کے ذریعہ جو معلومات آپ کو بہم پہنچائی گئی ہیں ان سے آپ کے شوق اور جستجو کی یقیناً سیرابی ہوئی ہوگی اور بہت سی اُن سنی باتیں بھی آپ کو سننے کا موقع ملا ہوگا۔ اس تحریر کو اختتام تک پہنچانے کے لیے کراچی کی ایک فلم کا ذکر بھی مناسب رہے گا جو کراچی میں کراچی کے فنکاروں اور ہنرمندوں کی کوششوں اور کاوشوں سے عالم وجود میں آئی۔ جس کا کراچی میں بنائی گئی فلموں میں ایک خاص اور ممتاز مقام ہے، یہ عام روایتی روش سے ہٹ کر بنائی گئی ایک سیمی آرٹ کلاسک فلم تھی۔ اس کا نام ''سوغات'' تھا۔ اس کے سپر کپتان (ڈائریکٹر) لیجنڈ ہدایت کار پرویز ملک تھے۔ وہ اس فلم کے فلمساز و ہدایت کار تھے اور بحیثیت فلمساز یہ ان کی دوسری فلم تھی۔ فلمساز عام طور پر اس بات کو پیش نظر رکھ کر فلمیں بناتے ہیں کہ ان سے انہیں خاطر خواہ فائدہ حاصل ہو، ان پر لگائے ہوئے سرمائے کی واپسی کے علاوہ زیادہ سے زیادہ مالی منفعت ہو اور اس مقصد کے لیے ان میں وہ ہر طرح کے مصالحے ڈالتے ہیں مگر پرویز ملک نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ اپنی محنت و شائقہ سے کمائے ہوئے سرمائے کو داؤ پر لگا دیا۔ کمرشل پوائنٹ آف ویو کی بجائے آرٹسٹک انداز میں فلم بنائی جس کا سبجیکٹ دوسروں کی فلموں سے ہی نہیں ان کی اپنی دیگر فلموں سے بھی یکسر مختلف اور منفرد تھا۔ ایسی فلمیں جو کامیاب اور آزمودہ فارمولوں سے ہٹ کر بنائی جاتی ہیں، وہ بڑی رسکی ہوتی ہیں، لیکن پرویز ملک کی اس فلم نے کراچی کے مین تھیٹر نشاط میں 8 ہفتے اور مجموعی طور پر 23 ہفتوں تک چل کر سلور جوبلی کا اعزاز حاصل کیا۔ ''سوغات'' اپنے بنانے والوں کے لیے نقصان کا سبب نہیں بنی۔ تھوڑا کما کر بھی دیا اور قائدین اور مبصرین کی پذیرائی بھی حاصل کی اور اس کے دو شعبوں پر اسے ایوارڈز سے بھی نوازا گیا۔

''سوغات'' ایک شاعر کی کہانی پر بنائی گئی فلم ہے۔ ایک ایسا شاعر جو وقت اور حالات کا مارا ہوا ہے۔ جس کی بہن بیمار ہے اور وہ بے یار و مددگار ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کہانی کا تخلیق کار بھی خود ایک شاعر تھا اور وہ شاعر تھا مقبول نقش نگار مسرور انور۔ حیران ہوگئے نا۔ وہ تو اپنے بے شمار مقبول گیتوں کی وجہ سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ بالکل ایسی ہی بات ہے دوستو! شاعری کے علاوہ وہ رائٹنگ کے حوالے سے اور بھی بہت کچھ لکھتے تھے۔ انہوں نے فلموں کے لیے کہانیاں بھی لکھیں۔ اسکرین پلے بھی لکھے، مکالمے بھی تحریر کیے جبکہ فلمسازی اور ہدایت کاری کے شعبوں میں بھی اپنی شناخت کروائی۔ ''سوغات'' کی کہانی کے علاوہ اس کے مکالمے بھی لکھے اور ایسے اچھے مکالمے تحریر کیے کہ انہیں بہترین مکالمہ نگار کا نگار ایوارڈ بھی ملا۔

اس سے پہلے کہ ان کی لکھی ہوئی کہانی کا خلاصہ آپ کو بتاؤں، اس کہانی کے کردار ادا کرنے والے فنکاروں کا تعارف کرادوں تو آگے چل کر آپ کو کہانی سمجھنے میں مزہ آئے گا۔ ندیم، روزینہ، مسعود اختر، زمرد، نھنا، عندلیب، ایس ایم سلیم، طارق عزیز، جمشید انصاری، بدر منیر، زرقا، مینا داؤد، آغا پیر جان وغیرہ اس کی کاسٹ میں شامل تھے۔ ندیم نے اس فلم میں شاعر کا مرکزی کردار ادا کیا ہے۔

فلم ''سوغات'' کی کہانی مختصر طور پر کچھ یوں بیان کی جاسکتی ہے کہ سلیمان فاروقی (ندیم) ایک غریب شاعر ہے جو اپنی جوان بہن ناہید (عندلیب) کے ساتھ رہتا ہے۔ اسی شہر میں ایک امیر زادی افشاں (روزینہ) بھی رہتی ہے جس

کو شعر و شاعری سے بڑا شغف ہے جبکہ اسی شہر میں ایک امیر زادہ خالد مرزا (مسعود اختر) بھی رہتا ہے۔ جس کا باپ ایک امیر شخص ہے جو پرنٹنگ کا کاروبار کرتا ہے۔ ایک دن خالد مرزا افشاں کو دیکھتا ہے تو اس پر عاشق ہو جاتا ہے مگر جب خالد، افشاں سے متعارف ہونے کی کوشش کرتا ہے تو وہ بے رخی برتتی ہے۔ کچھ دنوں بعد خالد مرزا کو معلوم ہوتا ہے کہ افشاں کو شعر و شاعری کا شوق ہے۔ لہٰذا افشاں کے دل میں جگہ بنانے کے لیے شاعر بن کر دستک دینے کا فیصلہ کرتا ہے۔ جبکہ وہ شعر و سخن سے بالکل نابلد ہوتا ہے۔ خالد مرزا کے ساتھ اس کا ایک دوست جمشید (جمشید انصاری) بھی ہوتا ہے۔ دونوں مل کر کسی ایسے شاعر کی تلاش کرتے ہیں جو اپنا کلام انہیں فروخت کر سکے۔ کچھ تگ و دو کے بعد انہیں شاعر سلیمان مل جاتا ہے۔ سلیمان چونکہ بے روزگار ہوتا ہے اور اسے بہن کے علاج کے لیے پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے، اس مجبوری کی وجہ سے وہ اپنا کلام خالد مرزا کو فروخت کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اس طرح خالد مرزا افشاں کے دل میں بحیثیت شاعر ایک راستہ بنا لیتا ہے۔ سلیمان فاروقی جو افشاں کو چاہتا تو ہے مگر اس کا اظہار کرنے کی اسے جرأت نہیں ہوتی کیونکہ اسے معلوم ہو چکا ہے کہ وہ ایک امیر کبیر آدمی کی بیٹی ہے اور وہ ایک قلاش شاعر۔

وقت کا پہیا گھومتا رہا پھر ایک دن یوں ہوا کہ شاعر سلیمان کی ملاقات شہر کی ایک طوائف ثریا سے ہوئی تعارف کے بعد جب ثریا کو معلوم ہوتا ہے کہ سلیمان ایک اچھا شاعر ہے تو ثریا اس کا کلام خریدنا شروع کر دیتی ہے۔

''تم میری غزلیں کیوں خریدنا چاہتی ہو؟''

''سلیمان صاحب! آپ کے اشعار بڑے دم دار ہیں، میں انہیں گاؤں گی تو میری محفل میں بہار آجائے گی۔''

''اگر یہ بات ہے، میرے اشعار آپ کے کاروبار کو نکھار سکتے ہیں تو میں آپ کی خدمت کے لیے تیار ہوں۔''

اب سلیمان فاروقی کو ایک اچھی خریدار مل جاتی ہے تو وہ خالد مرزا کو اپنا کلام فروخت کرنا بند کر دیتا ہے۔ ان حالات سے خالد مرزا پریشان ہو جاتا ہے اور سلیمان کی دشمنی میں اس قدر اندھا ہو جاتا ہے کہ ہر طرح سے نقصان پہنچانے پر کمربستہ ہو جاتا ہے۔ اس دوران سلیمان اپنا شعری مجموعہ ''سوغات'' کے نام سے شائع کرانے کے لیے پبلشر کی خدمات حاصل کرتا ہے تو خالد مرزا اس کے دیوان کو اپنے نام سے شائع کرا دیتا ہے۔ اگرچہ پبلشر جو خالد مرزا کا باپ ہے، وہ کسی طرح بھی رضامند نہیں ہوتا مگر بیٹے کی زبردستی کرنے پر اس بددیانتی کا مرتکب ہوتا ہے۔

چوری اور سینہ زوری کی بنیاد پر خالد مرزا صاحب دیوان شاعر بن جاتا ہے تو ایک ادبی تنظیم خالد مرزا کے اعزاز میں ایک تقریب کا اہتمام کرتی ہے۔ اس تقریب میں افشاں اور ثریا بھی شرکت کرتی ہیں۔ سلیمان اور اس کی بہن

## طیب اردگان

جنوری 2009ء ختم ہونے کو تھا۔ سوئٹزر لینڈ کے شہر ڈیووس میں مشاہیر عالم جمع تھے۔ عالمی اقتصادی فورم کا اجلاس ہو رہا تھا۔ فلسطین اسرائیل تنازعہ پر غور و خوض بھی فورم کی کارروائی کا حصہ تھا۔ 29 جنوری کو ہونے والے اس مذاکرہ میں اسرائیلی ریاست کے صدر شیمون پیریز اپنے ملک کی نمائندگی کر رہے تھے۔ مسلم دنیا کے رہنماؤں میں ترکی کے وزیراعظم طیب اردگان بھی شامل تھے۔ غزہ میں فلسطینیوں پر ڈھائے جانے والے ظلم و ستم کا جواز پیش کرتے ہوئے اسرائیلی صدر جب حد سے گزر گئے تو اردگان نے حقائق کی روشنی میں مختصر سا جواب دینا چاہا۔ اسٹیج سیکریٹری نے وقت کی کمی کو جواز بناتے ہوئے انہیں بولنے کا موقع دینے سے معذرت کر لی۔ حمیت نے اپنا جلوہ دکھایا۔ سیکولر ترکی کا منتخب وزیراعظم اٹھا، اسٹیج چھوڑنے سے پہلے شیمون پیریز سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا:

''تم عمر میں مجھ سے بڑے ہو۔ بہت اونچی آواز میں بولتے ہو جو تمہارے مجرمانہ ضمیر کی غماز ہے۔ میں مگر دھیمے لہجے میں بات کروں گا۔ قتل و غارت میں تم یکتا ہو۔'' ترک وزیراعظم احتجاجاً واک آؤٹ کر گئے۔ ساتھ ہی عندیہ دے گئے کہ وہ پھر کبھی ڈیووس نہیں آئیں گے۔

مرسلہ: ظہیر شیخ۔ لاہور

ناہید بھی شرکت کرتے ہیں۔ جب سلیمان کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ مجموعہ کلام حقیقتاً اس کا ہے۔ جس پر دونوں بہن بھائی احتجاج کرتے ہیں تو انہیں دھکے دے کر تقریب سے نکال دیا جاتا ہے۔ ناہید اس صدمے کو برداشت نہیں کرتی اور گھر واپس جاتے ہوئے راستے ہی میں دم توڑ دیتی ہے۔ ثریا، افشاں کو بتاتی ہے کہ ''خالد مرزا جعلی شاعر ہے، کبھی وہ سلیمان سے اس کا کلام خریدا کرتا تھا اور جب اس نے اپنا کلام دینا بند کر دیا تو اس کے مجموعہ کلام پر ہی ڈاکا ڈال دیا۔''

''یہ کیسے پتا چلے گا کہ کون اصلی شاعر ہے اور کون نقلی؟''

''میری بہن! اس کا بہترین طریقہ تو یہ ہے کہ کسی تقریب میں دونوں کا مقابلہ کرا دیا جائے۔''

اور پھر ایک دن ایک ادبی انجمن کے زیر اہتمام سلیمان فاروقی اور خالد مرزا کی صلاحیتوں کو پرکھنے کے لیے دونوں کا مقابلہ ہوتا ہے۔ اس مقابلے میں سچ کی فتح اور جھوٹ کو شکست ہوتی ہے۔ خالد مرزا کے چہرے سے جعل سازی کا نقاب اتر جاتا ہے تو افشاں بھری محفل میں اس پر لعنت بھیجتی ہے۔ اب افشاں کے دل میں سلیمان کے لیے جو ہمدردی تھی محبت میں بدل جاتی ہے۔ سلیمان کو ایک بڑا اور مستند شاعر تسلیم کر لیا جاتا ہے اور افشاں بھی اسے مل جاتی ہے۔

☆☆☆

اب اس فلم کے بارے میں چند ایسی باتیں جو قابل غور و فکر ہیں۔ پرویز ملک کے بارے میں ہر شخص کو معلوم تھا کہ ان کی اور وحید مراد کی دوستی زمانہ طالب علمی سے تھی پھر جب انہوں نے امریکا سے آ کر ہدایت کاری کی ابتداء کی تو یہ بھی وحید مراد کی فلم تھی۔ ''ہیرا اور پتھر'' کے بعد انہوں نے جو بھی فلم ڈائریکٹ کی اس کے ہیرو وحید مراد اور ہیروئن زیبا ہوتی تھیں پھر اپنی دوسری ذاتی فلم ''سوغات'' میں انہوں نے وحید مراد اور زیبا کی جگہ ندیم اور روزینہ کا نیا پیئر کیوں پیش کیا؟ اس تبدیلی کو اس وقت بھی محسوس کیا گیا اور اس کے بعد بھی۔ اس تبدیلی کی اصل وجہ کیا تھی یہ بات کھل کر کبھی سامنے نہیں آئی۔ قیاس آرائیاں بہت کی گئیں۔ بہر حال یہ تبدیلی دونوں کے حق میں بہت مثبت اور سود مند ثابت ہوئی۔ ندیم کا یہ ابتدائی دور تھا۔ ان کی پرویز ملک کے ساتھ جوڑی بنی تو ندیم صاحب کے لیے گویا کامیابیوں کے سارے دروازے کھل گئے۔ ان دونوں کی پہلی مشترکہ فلم ''سوغات'' تھی دوسری فلم تھی ''پہچان''۔ یہ فلم سپر ہٹ کامیاب ہوئی تو پرویز ملک وحید مراد کو بھول ہی گئے۔ دونوں نے مشترکہ طور پر 12 فلموں میں ایک ساتھ کام کیا۔ جن میں ''سوغات'' اور ''گمنام'' نے سلور جوبلی، سچائی، رشتہ، مہربانی اور کامیابی نے گولڈن جوبلی، پاکیزہ نے پلاٹینم جوبلی اور پہچان، تلاش، ہم دونوں اور قربان نے ڈائمنڈ جوبلی کرنے کا اعزاز حاصل کیا۔ جبکہ ان کی آخری مشترکہ فلم ''شہزادہ'' کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔

کہنے والے کہتے ہیں کہ پرویز ملک جوہر شناس تھے۔ انہوں نے نئے ہیرو ندیم کے اندر چھپی فنی صلاحیتوں کا اندازہ لگا لیا تھا اس لیے اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے اور اپنی فلموں کو زیادہ سے زیادہ کامیاب بنانے کے لیے انہوں نے ندیم کو اپنا مستقل ہیرو بنا لیا۔

جوہر شناسی کی بات چلی ہے تو دوستو! ایک بہت پرانی بات آپ کو بتاؤں گا۔ ندیم صاحب کی پہلی فلم ''چکوری'' کی نمائش سے پہلے ان پر سب سے پہلا مضمون میرا چھپا تھا جو ڈھاکا کے ہفت روزہ ''چترالی'' میں شائع ہوا تھا۔ ''چکوری'' کی نمائش سے ایک ہفتہ پہلے گلستان سینما میں اس کا پریس شو ہوا تھا۔ مجھے اس فلم پر تبصرہ لکھنے کو کہا گیا تھا مگر میں نے تبصرے کی بجائے نئے ہیرو ندیم پر ایک مکمل تحریر لکھ دی۔ جس میں اس ہیرو کی فنکارانہ خوبیاں گنواتے ہوئے یہاں تک لکھ گیا کہ.....

''وہ دن دور نہیں جب ندیم، وحید مراد اور محمد علی کی ٹکر کا اداکار بن جائے گا۔'' میری اس پیش گوئی پر دوسروں کے علاوہ خود ندیم نے بھی مجھ سے شکایت کی۔

''انور صاحب! یہ آپ نے کیا لکھ دیا؟''

''آنے والا وقت ثابت کرے گا کہ میں نے آج جو لکھا ہے وہ کتنا درست ہے۔''

پرویز ملک نے اگر وحید مراد کو چھوڑ کر ندیم کو اپنی فلموں کا ہیرو بنا لیا تو اس کے پس پردہ یقیناً یہ بات ہوگی کہ اداکاری کے فن میں انہوں نے ندیم کو وحید مراد سے زیادہ مستحکم سمجھا ہوگا۔ وحید مراد تو ان کے دوست تھے۔ ندیم سے ان کی کوئی رشتہ داری نہیں تھی۔ پرویز ملک نے جو فیصلہ کیا تھا اس سے ان کی دور اندیشی کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ان دونوں کی مشترکہ 12 فلموں میں سے گیارہ فلموں نے سلور جوبلی سے ڈائمنڈ جوبلیاں تک کیں۔

ایک بار ایک انٹرویو کے دوران پرویز ملک نے کہا

تھا۔ ''وحید مراد آج بھی میرا دوست ہے۔ مجھے پہلے کی طرح عزیز ہے۔ جہاں تک اسے کاسٹ کرنے کا تعلق ہے تو فلمسازی کے کچھ تقاضے ہیں جنہیں پورے کرنے پڑتے ہیں۔ پروڈیوسر سے لے کر عوام تک کی پسند کو پیشِ نظر رکھنا پڑتا ہے۔''

وحید مراد کی طرح موسیقار سہیل رعنا اور نغمہ نگار مسرور انور بھی پرویز ملک کے دوست تھے۔ ان کی بھی جب اور جہاں ضرورت پڑتی تھی، ملک صاحب ان کی خدمات حاصل کرتے تھے۔ ''سوغات'' ان کی دوسری ذاتی فلم تھی۔ پہلی ذاتی فلم ''جہاں تم وہاں ہم'' تھی۔

پرویز ملک 18 جولائی 1938ء کو کراچی میں پیدا ہوئے ان کا تعلق ایک خوش حال اور تعلیم یافتہ گھرانے سے تھا۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم کراچی کے میری گلاسکو اسکول سے حاصل کی۔ کراچی یونیورسٹی سے گریجویشن کرنے کے بعد وہ مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے امریکا چلے گئے اور کیلیفورنیا کی ایک یونیورسٹی سے فلم میکنگ کی ڈگری حاصل کی۔

اسکول اور یونیورسٹی میں وحید مراد اور سہیل رعنا ان کے کلاس فیلو تھے۔ پرویز ملک تعلیم مکمل کر کے امریکا سے آتے وقت ایک جدید موویٰ کیمرا بھی اپنے ساتھ لائے۔ پاکستان واپس آ کر بطور ہدایت کار پہلی فلم ''ہیرا اور پتھر'' بنائی جس کے فلساز اور ہیرو وحید مراد تھے۔ یہ فلم ہٹ ہوگئی اس نے گولڈن جوبلی کی۔ اس فلم کی ہیروئن بیوٹی کوئن زیبا تھیں۔ موسیقار سہیل رعنا، نغمہ نگار مسرور انور تھے۔ اس ٹیم کی دوسری فلم ''ارمان'' تھی جس نے پلاٹینم جوبلی کی۔ کچھ عرصہ بعد موسیقار سہیل رعنا نے ''دورا ہا'' کے نام سے ایک فلم پروڈیوس کی اسے بھی پرویز ملک نے ڈائریکٹ کی۔ یہ فلم 1967ء میں ریلیز ہوئی پھر پرویز ملک نے بھی بطور فلساز ایک فلم ''جہاں تم وہاں ہم'' بنائی۔ پرویز ملک نے مجموعی طور پر 27 فلموں کی ہدایت کاری کی۔ ان کی پہلی سلور جوبلی فلم ''احسان'' 30 جون 1967ء میں پہلی گولڈن جوبلی فلم ''ہیرا اور پتھر'' 11 ستمبر 1964ء کو ان کی پہلی پلاٹینم جوبلی فلم ''ارمان'' 18 مارچ 1966ء کو اور پہلی ڈائمنڈ جوبلی فلم ''انمول'' 21 جنوری 1972ء کو سلور اسکرین کی زینت بنی۔

پرویز ملک کی 27 فلموں میں سے صرف دو فلمیں ''اسے دیکھا اسے چاہا'' اور ''شہزادہ'' ناکام ثابت ہوئیں۔

آخری فلم شہزادہ میں انہوں نے اپنے بیٹے عمران ملک کو متعارف کرایا تھا مگر وہ کامیاب ثابت نہ ہوسکا۔ 2005ء میں عمران ملک نے بحیثیت فلساز ایک فلم ''تیرے بن جیا نہ جائے'' بنائی جو ناکام ثابت ہوئی۔

پرویز ملک نے بھرپور فلمی دور گزارا۔ اپنی بہترین صلاحیتوں کی بنیاد پر عمدہ فلمیں پیش کیں اور کئی ایوارڈز بھی حاصل کیے۔ فلم شہزادہ کے دوران جب فلمی صنعت کے حالات خراب ہوگئے تو دل برداشتہ ہو کر فلم انڈسٹری سے کنارہ کشی اختیار کرلی اور 18 نومبر 2008ء کو اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔

''سوغات'' کے گیتوں کے بارے میں بتاؤں، اس کے موسیقار اور نغمہ نگار کے متعلق بھی کچھ معلومات حاصل کرلیں۔ سہیل رعنا کا تعلق ایک ادبی گھرانے سے تھا۔ بچپن میں انہیں مصوری کا شوق تھا۔ بعد میں ان کی طبیعت موسیقی کی طرف مائل ہوگئی۔ سب سے پہلے انہوں نے Non فلم کے لیے ریکارڈ Emi کے لیے بنائے۔ فردوس بیگم، طلعت محمود، ایس بی جون اور وسیم فاروقی کے ساتھ ان کے گانوں کی موسیقی دی۔ Non فلم کے گانوں کے دوران بہت دنوں کے بعد ان کی ملاقات وحید مراد سے ہوئی جو ان کے پرانے کلاس فیلو تھے۔ وحید مراد نے ان سے اپنی فلموں کے لیے موسیقی ترتیب دینے کو کہا اور انہوں نے پہلی بار وحید مراد کی ذاتی فلم ''جب سے دیکھا ہے تمہیں'' کی میوزک کمپوز کی۔ جس کی ہیروئن زیبا اور ہیرو درپن تھے۔ یہ وہ دور تھا جب سہیل رعنا طالب علم تھے اور کالج میں پڑھ رہے تھے۔ سہیل رعنا کے روحانی استاد موسیقار اعظم نوشاد صاحب تھے۔ جبکہ پاکستانی موسیقار فیروز نظامی بھی ان کے پسندیدہ موسیقاروں میں تھے۔ ویسے انہوں نے مبین خان اور منظور حسین عابدی جیسے استادوں سے باضابطہ موسیقی کی تربیت حاصل کی۔

سہیل رعنا نے کم وبیش 24 فلموں میں موسیقی دی۔ ان کی خاص فلموں میں، اسے دیکھا اسے چاہا، ہیرا اور پتھر، ارمان، احسان، شہنائی، اشارہ، ماں بیٹا، قسم اس وقت کی، بازی، دیا اور پیغمبران، بادل اور بجلی، سوغات، روشنا نہ کرو، صلاح الدین ایوبی، پھر چاند نکلے گا اور حساب ہیں۔

سہیل رعنا نے Emi سے ابتداء کی پھر فلموں میں میوزک دیا اور اس کے بعد ٹی وی پر انہوں نے 1968ء سے 1987ء تک کام کیا۔ ان کے ٹی وی پروگراموں میں

رنگ برنگی دنیا، کلیوں کی مالا اور سنگ سنگ چلے قابلِ ذکر ہیں۔ بعد میں وہ اپنی اولاد کی خاطر کینیڈا شفٹ ہوگئے اور وہیں انتقال ہوگیا۔ وہ ایک ملنسار، خوش اخلاق اور خوش گفتار انسان تھے۔

''سوغات'' کے نغمہ نگار مسرور انور 6 جنوری 1944ء کو متحدہ ہندوستان کے شہر شملہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والدین نے ان کا نام انور علی رکھا مگر فلمی دنیا میں مسرور انور کے نام سے اپنی شناخت بنوائی۔ قیام پاکستان کے بعد اپنے والدین کے ساتھ کراچی آکر آباد ہوگئے۔ میٹرک کے بعد PIA میں ملازمت کی مگر شعر و شاعری کا شوق انہیں ریڈیو پاکستان لے آیا۔ جہاں معروف اداکار ابراہیم نفیس کی توسط سے اقبال شہزاد سے ان کی ملاقات ہوئی ان کی فلم ''بنجارن'' میں پہلا فلمی گیت۔

ماسٹر جی! مجھے سبق پڑھا دو

لکھا۔ ہدایت کار اقبال شہزاد کی فلم کا یہ گانا آئرن پروین کی آواز میں ریکارڈ کیا گیا۔ ''بنجارن'' 1962ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ اس فلم کی باکس آفس پر کامیابی کے بعد مسرور انور بھی کامیاب نغمہ نگاروں کی صف میں شمار کیے جانے لگے۔ شرارت، ہیرا اور پتھر، لاکھوں میں ایک، صاعقہ، ناگ منی، عندلیب، آگ، پہچان، تلاش، آئینہ، انتخاب، انجمن، شمع اور پروانہ، انمول، آسرا، سوغات، سہاگ، رشتہ ہے پیار کا، احسان، بلندی، استادوں کے استاد، غریبوں کا بادشاہ، دوراہا، اسے دیکھا اسے چاہا، بیوی ہو تو ایسی، کرن اور کلی، پھول میرے گلشن کا، محبت زندگی ہے، ملن، تم سلامت رہو، راستے کا پتھر اور دیگر بہت سی فلموں کے لیے گیت لکھے۔ کہانیاں، ان کے مکالمے اور اسکرین پلے بھی تحریر کیے۔ چند فلمیں بھی بنائیں، ہدایت کاری بھی کی۔ اور

☆ سونی دھرتی اللہ رکھے قدم قدم آباد تجھے

☆ اپنی جاں نذر کروں اپنی وفا پیش کروں

جیسے قومی نغمات بھی تحریر کیے۔ ان کے بہترین گیتوں پر انہیں سات نگار ایوارڈز بھی ملے۔ جبکہ بعد از مرگ حکومت پاکستان کی جانب سے صدارتی ایوارڈ برائے تمغۂ حسن کارکردگی سے بھی نوازا گیا۔ یکم اپریل 1996ء کو ان کا انتقال مرملال ہوگیا۔ مسرور انور پرویز ملک صاحب کی ٹیم کا حصہ ہے۔ وحید مراد اور سہیل رعنا بھی ان کے دوستوں میں تھے۔

اب ''سوغات'' کے نغموں کا بھی ذکر ہوجائے۔ پرویز ملک کی اس دوسری ذاتی فلم کے لیے موسیقار رعنا نے ایسے پیارے دھن تیار کیے جن پر مسرور انور نے اتنے ہی خوبصورت گیت لکھ کر اس فلم میں چار چاند لگا دیے۔ آج 50 سال گزرنے کے بعد بھی اس فلم کے گیت کانوں میں رس گھولتے ہیں۔

☆ نغمہ و شعر سے ہے پیار مجھے
کب ہے اس دل پہ اختیار مجھے
(آواز رونا لیلیٰ، پکچرائز روزینہ)

☆ تم سے مل کر مری دنیا ہی بدل جاتی ہے
(آواز مجیب عالم۔ فلم بندنديم)

☆ ہو چکا ہونا تھا جو
اب دل کو کیا سمجھائیں ہم
(آواز مسعود رانا۔ پکچرائز ندیم)

☆ جو بھی غم ملتا ہے ہم دل میں چھپا لیتے ہیں
(آواز رونا لیلیٰ۔ عکسبندی زمرد)

☆ دنیا والو تمہاری دنیا میں
یوں گزاری ہے زندگی ہم نے
(آواز مجیب عالم۔ پکچرائز ندیم)

☆ تم ہی کو مبارک رہے دوستو
مجھے ایسی دنیا نہیں چاہیے
(آواز احمد رشدی۔ پکچرائز ندیم)

☆ زندگی تو آپ کی رعنائیوں کا نام ہے
(قوالی۔ پکچرائز ندیم، زمرد، مسعود اختر)

''سوغات'' کی نمائش یکم دسمبر 1970ء کو عیدالفطر بروز منگل کے دن ہوئی۔ اس فلم کے ساتھ سید کمال کی روڈ ٹو سوات، لالہ سدھیر کی چڑھدا سورج، اور بھٹی پکچرز کی فلم دنیا مطلب دی جیسی سپر ہٹ فلمیں بھی سلور اسکرین کی زینت بنیں۔

''سوغات'' ندیم صاحب کی ریلیز کے اعتبار سے 19 ویں اور پرویز ملک کی چھٹی فلم تھی۔

دوستو! کراچی جو کبھی ایک شہر تھا عالم میں انتخاب، یہ اسی شہر کی فلمی سرگرمیوں کی ایک جھلک ہے۔ زندگی رہی اور موقع ملا تو اس کے کچھ اور رخ بھی دکھاؤں گا۔ اس کے رخ روشن سے کچھ مزید نقاب بھی اٹھاؤں گا۔ اللہ بس باقی ہوس.....!

++

# سفر پہلا پہلا

ندیم اقبال

احساسات، جذبات، فہم و فراست، حکمت و تدبر اور مشاہدے کو الفاظ کا پیرہن دینا۔ اندازِ بیان کے مختلف قرینوں، سلیقوں سے ناسٹلجیائی کیفیات اور عصری صورتِ حال کو اپنی اظہاری صلاحیت کے ذریعے قارئین کی نذر کرنا، اس طرح پیش کرنا کہ پہلی سطر سے آخری سطر تک قاری اسیر رہے۔ یہ کمال ہے ندیم اقبال کا۔ ''نانگا پربت کا عقاب'' اور ''شمشال سے ٹورنٹو'' کے بعد ان کا یہ تیسرا سفر نامہ جو جوانی کے ابتدائی ایام کا احوال ہے اور ایک نئے انداز سے لکھا گیا ہے، قارئین کو پسند آئے گا۔

سائیں کی روح جسم سے نکل کر جہاں چاہتی ہے چلی جاتی ہے یہ سن کر کومل نے ہنس ہنس کر اپنا حال برا کر لیا۔ میں خود اس کی بے ساختہ ہنسی پر مسکرا رہا تھا مگر اس کی ماں اپنے پیر کی اس توہین پر خاموش کیسے رہ سکتی تھیں۔ وہ اتنے لوگوں کی موجودگی میں بھی بیٹی پر ہاتھ اٹھ بیٹھیں۔ ان کا ہاتھ ہنستی ہوئی کومل پر ایسا پڑا کہ وہ اچھل کر بہن کی گود میں جا پڑی۔ روئی ہرگز نہیں بلکہ باقی کی ہنسی بہن کی گود میں پوری کی۔

بیٹی کو ہاتھ دکھانے کے بعد ماں نے ترچھی نظروں سے شوہر کو دیکھنے کے بعد کہا۔ ''بڑے جب نیک لوگوں کی باتیں مذاق میں لیں گے تو چھوٹے تو اثر لیں گے ہی۔''

دوسری جانب کنول بہن کا کندھا سہلا رہی تھی۔ ''امی کتنے زور سے بے چاری کو مارا ہے؟''

''تو چپ کر بڑی آئی بہن کی وکیل۔ جب اللہ والوں کی باتیں ہو رہی ہوں تو ادب سے سنتے ہیں.....اور سر پر دوپٹا اوڑھ کر بیٹھا کرو۔''

ڈر سے سب نے اپنے دوپٹے درست کیے۔ وہ اب لطیف کی طرف پلٹیں۔ ''طبیعت کیسی پائی ہے؟''

لطیف پھر بھی باز نہ آیا۔ بولا۔ ''کس نے؟''

گھور کر اس کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''کس کی بات کر رہے تھے.....؟''

''پیر صاحب کی بات کر رہے تھے؟''

''تو بتاؤ.....؟''

''کیا.....؟''

وہ چبا کر بولیں۔ ''یہ کہ طبیعت کے کیسے ہیں.....؟''

''بالکل تندور کی روٹی کی طرح ہیں۔''

انہوں نے زچ ہو کر پوچھا۔ ''اب اس بات کا کیا مطلب ہوا؟''

''یعنی کبھی کچی، کبھی پکی اور کبھی جلی ہوئی.....''

''معلوم نہیں یہ مثالیں کہاں کہاں سے لے آتے ہو..... عمر ہو گئی مگر ایسی مثال پہلی بار سن رہی ہوں۔''

''آنٹی۔ میرا مطلب یہ ہے کبھی نرم، کبھی معتدل اور کبھی غصے میں.....ویسے عموماً کچے کچے رہتا ہیں۔ یعنی نرم اور حلیم۔ بس ایسا سمجھ لیں کہ پانی سے بھرے بادل ہیں جو برستے تو نہیں مگر سایہ ضرور کرتے ہیں۔''

''دم درود، تعویذ تو بہت کرتے ہوں گے۔''

''اس کے علاوہ بھی بہت کچھ کرتے ہیں۔ خاندانی رئیس ہیں۔ کئی جگہ ہوٹل ہیں، دکانیں اور زمینیں ہیں۔ دم درود کا کسی سے ایک آنہ تک نہیں لیتے بلکہ آتے جاتے کی مدد بھی کرتے ہیں۔ بہت مرتبہ تو جو دم کروانے آتا ہے ایک دو روپے اس کے ہاتھ پر رکھ دیتے ہیں۔ آنٹی ان کو ایسا ویسا نہ سمجھیں۔ نظر نہیں آتے مگر ہیں بڑے مالدار.....''

یہ سنا تو شوہر کو ایک بار پھر جگا کر بولیں۔ ''کئی بار میں نے آپ کو بتایا کہ پیر اصلی ہو تو ایک دھیلا بھی کسی سے نہیں لیتا۔ میری بات کا اعتبار کبھی نہیں کیا اور اب یہ کل کا چھوکرا بتا رہا ہے تو کان بند کر کے پڑے ہیں.....''

وہ کچھ بڑبڑا کر پھر سو گئے۔

لطیف سنانے لگا۔ ''ان کا دم پورے ڈیرہ میں مشہور ہے۔ میں آپ کو ایک واقعہ سناتا ہوں اور دیکھنا آپ بھی حیران رہ جائیں گیں۔ ہمارا دوست مائیک جس کو آپ نے بھی دیکھا ہوگا وہ ایک بار سرکلر روڈ پر سائیکل سے آ رہا تھا۔ ایک تیز ٹرک نے ٹکر ماری اور یہ سیدھا گندے نالے میں جا گرا۔ نالے سے نکلا خود مگر سب سے کہنے لگا کہ یادداشت میری چلی گئی ہے۔ چچی نے بڑا علاج کروایا مگر یادداشت تھی کہ واپس نہیں آ رہی تھی۔ آخر کار چچی نے بھی لاعلاج سمجھ کر اسے اپنے حال پر چھوڑ دیا۔ جیسے کسی کو مرگی کے دورے پڑتے ہیں اسے یادداشت جانے کے دورے پڑنے لگے۔ اس کو جب یونیورسٹی میں دورہ پڑتا یہ اپنی کلاس کی بجائے دوسری کلاس میں جا بیٹھتا۔ یہ بات صرف ہمیں اور اس کلاس کی ایک لڑکی کو معلوم تھی کہ جس کو وہ پسند کرتا تھا۔ لڑکی کو غلط فہمی تھی کہ یہ مجھے تنگ کرنے کے لیے ادھر آ جاتا ہے۔ ایک دن اس لڑکی نے چیئرمین صاحب سے مائیک کی شکایت کر دی کہ ایک تو یہ بلاوجہ میری کلاس میں آ بیٹھتا ہے اور آگے کالی عینک لگائے میری جانب دیکھتا ہے۔ انہوں نے مائیک کو ایک ہفتے کے لیے ڈیپارٹمنٹ سے نکال دیا۔ ایک ہفتے بعد ہمارے سمجھانے پر بھی مائیک نے بھولنے کی عادت نہ بدلی۔ وہی اپنی ضد دکھا کر اس کی کلاس میں جا کر بیٹھ جاتا۔ آخر کار سائیں ہی کام آئے۔ اگلی جمعرات ہم سب نے مائیک کے ہاتھ پاؤں باندھے اور اسے پیر سائیں کے ساتھ ..... قبر میں بٹھا دیا۔ انہوں نے ایسا وظیفہ پڑھا کہ مائیک کی یادداشت تو واپس آ گئی مگر لڑکی کی چلی گئی۔ اب مائیک تو اس کی کلاس میں نہیں بیٹھتا مگر وہ ہماری کلاس میں اکثر آ کر بیٹھ جاتی ہے۔''

اس کی والدہ لطیف کو بغور دیکھ رہی تھیں اور وہ بولے جا رہا تھا۔ ''یہ تو پیر سائیں کی ایک ہلکی سی کرامت ہے.....''

اس کی والدہ نے کہا۔ ''ایسے صاحب برکت لوگ ڈھونڈے سے نہیں ملتے۔ تم لوگوں کو اپنی خوش قسمتی کا اندازہ بھی نہیں ہے، کیا ہستی آپ کے ہمراہ ہے۔'' پھر وہ افسوس میں سر ہلانے لگیں۔

لطیف ادھر اپنی ہنسی چھپانے کے لیے پیچھے مڑ کر دیکھنے لگا۔ اوپر چھپر ہوٹل پر بیٹھے دوستوں کو دیکھنے کے بعد بولا۔ ''آنٹی جی۔ آپ خود انصاف سے فیصلہ کریں، دور

سے کوئی بھی نہیں پہچانا جا رہا۔ مگر پیر سائیں سر کھجلاتے صاف نظر آ رہے ہیں۔ یہ تو جہاں ہوں سب سے نمایاں یہی ہوتے ہیں.....''

وہ کچھ دیر اوپر دیکھ کر کسی کو پہچاننے کی کوشش کرتی رہیں۔ آخر کار ٹھنڈی سانس خارج کر کے بولیں۔ ''یہ سب اللہ کا نور ہے بیٹا، سب اللہ کا نور ہے.....'' کہتے ہوئے شوہر پر ایک نظر ڈالی۔ پھر بولیں۔ ''مگر لوگوں کو ان باتوں کی سمجھ نہیں.....''

☆☆☆

کنول میری جانب دیکھ رہی تھی۔ لگتا کہ کوئی شکوہ کر رہی ہے۔ لگتا کہ میری توجہ اپنی جانب چاہتی ہے۔ لگتا کہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہے۔ لگتا کہ یہ کہنا چاہتی ہے کہ کہیں الگ بیٹھ کر اپنی باتیں کرتے ہیں۔ لگتا کہ چاہتی ہے کہیں آزادی بھرے لمحوں میں بیٹھ کر مناظر میں کھو جاتے ہیں۔ وہ کبھی آنکھوں سے اور کبھی ہونٹوں سے مسکرانے لگتی۔ لگتا کہ اس کا دل کر رہا ہے کہ کہیں سے پیار کے بادل دھم دھم کرتے آئیں اور ہم دونوں پر محبت کی برسات برسا دیں۔ لگتا مجھے ڈرا رہی ہے کہ میرا دل دھک دھک دھڑک رہا ہے۔ یہ اگر ایسے ہی بے قرار رہا تو آ کر تمھارے بازو پر سو جاؤں گی۔ لگتا کہہ رہی ہو کہ جھیل کو چومتی ہوائیں مجھے بے تاب کر رہی ہیں۔ پہاڑوں سے لپٹے یہ گھنیرے بادل مجھے کہتے ہیں کہ تم بھی اس سے ان کی طرح لپٹ جاؤ۔ وہ مجھے بار بار کہہ رہی تھی ہم ان وادیوں میں عرصے سے ملتے رہے ہیں، کوئی نا آشنا نہیں ہم تو ایک دوسرے کے دیکھے بھالے ہیں۔

میں یونہی کھویا بیٹھا رہتا اگر کومل چلا نہ پڑتی ''بھائی یہاں بیٹھے ہیں کہ شفیع چاچا کہیں اپنے ساتھ لے گیا ہے..... واپس آ جائیں واپس.....''

میں بری طرح سے چونک پڑا۔ میرے سپنے اس نے توڑ دیے تھے۔ میں اسے کیا کہتا مگر ماں نے اس کو پھر جھاڑ دیا۔ ''بدذات تیری زبان کو چپ نہیں؟ کچھ بھی احساس نہیں کہ ماں بے تاب بیٹھی ولیوں کی باتیں سن رہی ہے۔''

''امی..... بھائی کو دیکھا.....''

ماں بات کاٹ کر بولی ''کیا دیکھوں۔ کتنی معصوم شکل بنا کر تو بیٹھا ہے۔ اب کیا تیری طرح چرچر کرنا شروع کر دے۔ اب کے تو بولی تو قسم سے کسی کا لحاظ نہیں کروں گی سمجھی؟''

''جی امی.....'' یہ کہہ کر پھر سے اپنی ہنسی دبالی۔

لطیف اس کی ماں سے پوچھ رہا تھا۔ ''ویسے پیر سائیں سے کوئی خاص مسئلہ ڈسکس کرنا ہے؟ ذاتی ہے تو ضروری نہیں آپ بتائیں۔''

وہ شوہر کو دیکھ کر بولیں۔ ''ان کے علاوہ میرا اور کیا مسئلہ ہے؟ ہر بندہ ان کے پیچھے پڑا ہے۔ کسی کو ان کی ترقی ہضم نہیں ہو رہی۔ نظر تو ان کو ایسے لگتی ہے جیسے میٹھے پر مکھیاں پڑتی ہیں.....''

اسی دوران شوہر کو دیکھ کر کچھ پھونک بھی رہی تھیں۔

''میں چاہتی ہوں پیر صاحب ہم سب کو تعویذ کے علاوہ کچھ پڑھنے کے لیے بھی دے دیں۔ جو مصیبتیں میرے گھر پر منڈلا رہی ہیں وہ کسی طرح سے ٹل جائیں۔ ایک نے تو یہ بھی کہا تھا ان پر کسی دیو پری کا بھی سایہ ہے۔ اب تو بیٹا ہماری مشکلات کا حل پیر سائیں کے پاس ہی ہے۔''

لطیف نے تشویش کا اظہار کیا ''مگر آنٹی دیو پریاں تو اس جگہ بھی بہت ہیں۔ اللہ خیر کرے۔ ہم سے غلطی ہو گئی کہ ہم پہلے ہی سے یہاں دم کروا کر آتے.....''

''کیا.....؟'' وہ پھر معلوم نہیں کس پر برس پڑیں ''مجھے تو آتے ہی پتا چل گیا تھا یہ کوئی منحوس جگہ ہے۔ بھلا سیر کی جگہ کوئی ایسے ہوتی ہے؟ دور دور تک نہ کوئی آدم اور نہ آدم زاد۔ شکر ہے پیر صاحب ساتھ ہیں۔'' یہ کہہ کر چادر ٹھیک کی اور سوئے خاوند کو دیکھنے لگیں۔

کنول نے گھورتی نظروں سے لطیف کو دیکھا ''امی یہ تو ایسے ہی کہہ رہے ہیں۔ کتنے لوگ سیر کرنے یہاں آتے ہیں۔ یہ جگہ پورے پاکستان میں مشہور ہے۔''

''ماں صدقے جائے اپنی بیٹی پر۔'' یہ کہا اور پوری اس کی جانب گھوم گئیں۔ ''یہ مشہور جگہ ہے تو لوگ کیوں نہیں آ رہے؟ ہمارے علاوہ کسی کی شکل بھی دیکھی ہے؟ دیکھنا یہاں کوئی نہیں آئے گا۔ یہ جگہ بھاری ہے۔''

ثروت بولی ''آنٹی..... دیکھیں تو سہی کتنی خوبصورت جگہ ہے.....''

''بیٹی..... سامنے پہاڑ، ادھر بھی پہاڑ اور ادھر بھی پہاڑ۔ مجھے تو لگتا ہے یہ سب ابھی چل پڑیں گے۔ جھیل دیکھو جیسے ساری دنیا اس میں ڈوبی ہے۔ پہاڑ، آسمان اور بادل بھی اس میں غرق ہیں۔ میں تو نرا دھوکا کھا گئی۔''

کومل نے ہنس کر کہا ''مگر آپ تو بابا کے ساتھ ہنی مون پر بھی آئی تھیں۔''

''میری چندا۔ مجھے کیا معلوم تھا یہ مجھے لے کر کہاں جا

رہے ہیں۔ جہاں یہ، اور میں ان کے پیچھے پیچھے۔ اس وقت بھی یہ آج کی طرح خالی خولی پڑی تھی۔ اللہ زندگی دے کنول کو انیس کی چڑھ گئی مگر یہاں کوئی نہ آیا.....''

لطیف نے کہا۔ ''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں..... شکر ہے سائیں ساتھ ہیں اور اوپر مورچہ سنبھالا ہوا ہے... ورنہ دیو طاہرہ کو تو اٹھا کر ضرور لے جاتا.....''

''منہ سے خیر نکال بیٹا۔ کیا کہیں گے اس کے ماں باپ کہ سیر پر بھیجا اور دیو اٹھا کر لے گیا.....؟''

میں نے چھیڑنے کی غرض سے کہا۔ ''لیکن اس جگہ کے گن ہر ایک گاتا ہے.....''

پہلے تو گھوم کر اپنے شوہر کو تسلی سے دیکھا اور پھر مجھ سے مخاطب ہوئیں۔ ''مجھے آج بتاؤ کون اس کے گن گاتا ہے۔ چلو اگر گن گاتا بھی ہے تو یہاں خود کیوں نہیں آتا؟ ان انگریزوں کو مجھ سے زیادہ کون جانتا ہے۔ وہ کہیں کہ کوہ قاف اچھی جگہ ہے تو تم لوگ وہاں بھی چلے جاؤ گے۔''

''آنٹی۔ مجھے اگر خیمہ مل جائے تو رات یہاں اکیلے بسر کروں۔''

''مطلب یہ کہ رات یہاں ٹینٹ میں اکیلے سو گے؟''

''سوؤں گا کہاں۔ رات بھر جھیل کنارے بیٹھا پریوں کے اترنے کا انتظار کروں گا.....''

انہوں نے دوبارہ سے اپنی بکل درست کی اور فضا میں کہیں دیکھتی ہوئی ڈولنے لگیں۔ ڈولتے ڈولتے بولیں ''ماں باپ نے پالا پوسا۔ جوان کیا اور آگے اولاد اس جیسی نکلی۔''

کنول چلا کر بولی ''امی یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟''

ماں بولیں۔ ''کیا غلط کہہ رہی ہوں؟ جیسی حرکتیں ہیں تو بات بھی ویسی کروں گی۔ عقل مند ہے، ذہین ہے فرماں بردار ہے مگر ان باتوں کو کوئی چاٹے گا جب حرکتیں ساری شیریں فرہاد والی ہیں؟''

کومل نے کہا۔ ''مگر بھائی تو بہت اچھے ہیں.....''

''بڑی آئی بھائی کی چچی۔ اس کی ماں کو پتا چل جائے کہ میرا لال رات کو یہاں اکیلا سویا تھا تو اس بے چاری کی نیندیں اڑ جائیں گیں۔ مگر اس لڑکے کو کسی کی فکر ہی کہاں؟ اللہ وقت سے پہلے بھی کسی کو اتنی عقل نہ دے۔'' طاہرہ بولی ''آنٹی۔ اس نے مذاق کیا ہوگا۔''

بولیں ''اس بچے سے کچھ بعید نہیں..... کچھ بھی کر سکتا ہے۔''

کومل نے کہا ''امی یہ یہاں کیمپنگ کر کے پریاں دیکھنا چاہتا ہے۔ کہتا ہے ہمیں بہشت میں حوریں ان جیسی ملیں گیں۔''

وہ خاموش بیٹھی رہیں۔ میں نے اپنی نظریں کنول کے چہرے پر رکھ لیں اور کہا۔ ''بات پریوں کی نہیں۔ میں اس جھیل کو چودھویں کی رات میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ جب یہاں ہر سو چاندنی پھیلی ہو تو یہ کتنی خوبصورت دکھائی دے گی۔''

کومل میری نظروں کا حدف سمجھ گئی تھی، کہنے لگی ''جھیل کو ابھی دیکھ لیں یا چاندنی میں، اس نے کون سا بدل جانا ہے۔''

میں نے بتایا۔ ''ہم اچھے کپڑے اس لیے پہنتے ہیں کہ خوبصورت نظر آئیں۔ عورتیں خود کو سجانے کے لیے زیورات کے علاوہ میک اپ کا سہارا بھی لیتی ہیں۔ اسی طرح جھیلیں خود کو سجا دیکھنے کے لیے چاند کی چودھویں رات کا انتظار کرتی ہیں۔ ہماری عید پہلی چاند کو ہوتی ہے اور ان کی عید چودھویں کی رات کو ہوتی ہے۔ اس رات جھیلوں کے انداز ہی الگ ہوتے ہیں۔ یہ دلہن کی طرح سجی ہوتی ہیں۔''

''آپ نے چودھویں کے چاند میں کبھی جھیل کو دیکھا ہے۔''

''دیکھا تو نہیں.. مگر خود سوچو جو ابھی اتنی حسیں ہے وہ اس رات میں کتنی حسیں نظر آئے گی۔''

اب کومل کے ساتھ ساتھ طاہرہ اور ثروت بھی مسکرا رہی تھیں۔ کنول بیٹھی اپنی لطافتیں مجھ پر لٹا رہی تھی۔ وہ میرے اشارے کنائے سمجھ رہی تھی کہ میں جھیل نہیں اس کی مثال دے رہا ہوں۔ میں نے اپنی بات جاری رکھی۔

''رات تو ایک سحر ہے۔ دن میں نظر آنے والی چیزیں رات کو اور طرح کی دکھتی ہیں۔ کئی چیزیں روشنی سے زیادہ سایوں میں بھلی لگتی ہیں۔ ہم لحظہ بھر کے لیے تصور کر لیتے ہیں کہ ابھی رات ہے... اور ہر سو چاندنی کی چادر بچھی ہے۔ کائنات کا ایک ایک ذرہ چمک رہا ہے۔ سامنے پہاڑ سے سفید اور اجلے لباس میں ملبوس پریاں جھیل کے اس کنارے اترتی ہیں۔ ان کے جھرمٹ میں شہزادی بدر جمال ہے۔ وہ اتنی حسین ہے کہ چاند بھی اس کے سامنے شرما جاتا ہے۔''

طاہرہ نے مجھے روک کر پوچھا ''کس کے سامنے چاند شرماتا ہے؟''

اس کے لہجے کی شوخی کو میں جانتا تھا، بولا ''تمہیں نہیں معلوم کس کی بات کر رہا ہوں؟''

وہ اٹھلا کر بولی ''جانتی ہوں تمہاری بدر جمال کو.....''

خوشی کی لہریں کنول کے چہرے پر پھیلتیں چلی گئیں۔ وہ بے خودی بیٹھی اپنے خوابوں کے جزیروں میں کھو گئی تھی۔

اس کی والدہ بول اٹھیں "اللہ زندگی دے میری کنول اور تم کو۔ دونوں کی عادتیں بہت ملتیں ہیں۔ ذکر ایک بات کا ہو رہا ہوتا ہے اور بات دوسری شروع کر دیتے ہیں۔ اپنے کو سمجھ آ رہی ہوتی ہو تو سمجھ لیتے ہیں سب کو آ رہی ہے۔" پھر مجھ سے براہِ راست مخاطب ہوئیں "مانتی ہوں بیٹا تم کو دنیا جہاں کا پتا ہے۔ مانتی ہوں تم ارسطو اور بقراط ہو۔ مگر مجھے تمہاری کسی ایک بات کی بھی سمجھ نہیں آئی۔ یا تو تمہاری بات کنول بھی ہوگی یا پھر اس کے بابا تھوڑا بہت سمجھے ہوں گے....." یہ کہہ کر وہ پھر ڈولنے لگیں۔

مجھے اور کنول کو انہوں نے ذہنی سطح پر ایک کیا تو میں خوشی سے پاگل ہونے لگا۔ میرا یقین پختہ ہو گیا کہ میری بات وہ اور اس کی بات میں ہی سمجھ سکتا ہوں۔ بات وہ ہونٹوں سے کرے کہ زبان سے، آنکھوں سے کرے کہ چہرے سے، ہم ایک دوسرے کی باتیں جان جاتے ہیں۔

طاہرہ نے مجھ سے کہا "بھائی۔ آپ نے کہا تھا کہ جھیل پر ہمیں سیف الملوک کی کہانی سنائیں گے؟"

اس کی والدہ حسبِ عادت بولیں "مجھے تو کوئی بتا رہا تھا کہ ایک انگریز لڑکی گھر سے بھاگ کر یہاں آ چھپتی ہے۔ پھر ایک لڑکا اسے یہاں سے اپنے گھر چھوڑ آتا ہے، اس بے حیا بے شرم نے اچھا سبق آج کی نسل کو دیا....."

ہم سب ہنسنے لگے۔ میں بولا "وہ لڑکی انگریز نہیں بلکہ یہاں کی پری تھی... اور وہ لڑکا کسی ملک کا شہزادہ تھا۔ ایک دیو اس شہزادی کو اغوا کر کے یہاں لے آیا تھا اور شہزادے نے دیو کو مار کر لڑکی کی جان بچائی تھی..... پھر دونوں نے شادی کر لی تھی۔"

"وہ پری زاد اور وہ آدم زاد۔ دونوں کی شادی بھی حرام ہے۔"

میں نے کہا "آنٹی، یہ اسلام سے پہلے کی بات ہے۔ اس وقت یہاں پر مشرکوں کی حکومت تھی۔"

وہ بولیں "یہی کہو ناں کہ مشرکوں کی کہانی ہے مگر نام تو اسلامی ہیں؟"

"آنٹی۔ نام اسلامی نہیں مقامی ہے۔"

کنول نے پوچھا "مگر کہانی کیا ہے؟"

میں نے کہا "گائڈ یہ کہانی سنانے کے پچاس روپے لیتے ہیں۔ آپ کہتی ہیں کہ مفت میں سنا دوں؟"

"امی ان سے نہیں سنتے۔ یہ تو اپنے پیسے کھرے کرنے کے چکر میں ہیں۔"

اس کی ماں بولیں "نہیں میری بچی۔ شکل سے کیا پیسے مانگنے والا لگتا ہے۔ ذہین اور سمجھ دار لڑکا ہے۔ کوئی قصہ گو تو نہیں....."

میں نے کہا "آنٹی۔ اب تو آپ کی بیٹی پچاس روپے دے گی تو سناؤں گا۔ مفت میں ملی چیز کی قدر نہیں ہوتی ہے۔"

"نہیں بیٹا ایسی بات نہیں۔ یہ تو بڑی نصیبوں والی ہے۔ اس کے منہ سے کسی کے لیے غلط بات نہیں نکلتی۔ تم خفا نہ ہونا۔ نئی سہیلیاں بنی ہیں تو شوخیاں دکھا رہی ہے۔"

"امی نہیں سنتے ان سے کوئی کہانی۔ اردو بازار میں تین روپے کی کتاب ملے گی، میں لا کر آپ کو سنا دوں گی۔"

ثروت نے کہا "جو مزہ یہاں بیٹھ کر سننے میں ہے وہ گھر میں سننے میں کہاں۔"

کچھ دیر شور شرابہ رہا۔ آخر کار فیصلہ یہ ہوا کہ سب مل کر پچاس روپے جمع کریں گے۔ اگر داستان پسند آئی تو ان پیسوں سے ٹریٹ میرے نام پر دی جائے گی... ورنہ یہ کنول کے نام پہ ہوگی۔

میں سوچنے لگا میری جیت دونوں صورتوں میں ہے۔ ویسے تو میری ہار بھی میری جیت تھی۔

ہم ہار گئے تم جیت گئے ہم نے خود یا تم نے پالیا
ان چھوٹی چھوٹی باتوں کا ہم خیال نہیں کرتے

کنول سب سے پیسے اکٹھے کرنے کے لیے اپنی جگہ سے اٹھی اور پھر ایک منظر میرے آنکھوں میں ہمیشہ کے لیے بس گیا۔ نہ اس نے کوئی سولہ سنگھار کیا ہوا تھا اور نہ کوئی لباس رنگ برنگی تھا۔ نہ مہندی تھی نہ کجلا اور نہ کسی زیور سے آراستہ تھی۔ سادہ لباس اور بالوں کی بندھی پونی میں وہ تمام منظروں کی ملکہ بن گئی۔ اس کی چمکتی آنکھوں کے آگے لشکتی ہوئی ملکہ پربت کی چوٹی مدھم پڑ گئی۔ اس کی مسکراہٹ کے سامنے سب مناظر دھندلے ہو گئے۔ وہ ہر ایک سے پیسے

> نشے میں دھت ایک نوجوان کو پولیس کے سپاہی نے پل پر سے چھلانگ لگا کر خودکشی کرنے سے روک دیا۔ "اگر تم نے چھلانگ لگائی تو اپنا فرض ادا کرنے کی خاطر مجھے بھی تمہارے پیچھے آنا پڑے گا۔ دریا کا پانی شدید ٹھنڈا ہے اور جب تک ایمبولینس ہمیں اسپتال لے جانے کے لیے پہنچے گی، ہم نمونیا کا شکار ہو کر مر چکے ہوں گے۔ اب تم ایسا کرو کہ اچھے بچے کی طرح گھر جاؤ اور پنکھے سے لٹک کر مر جاؤ۔"

اکٹھے کر رہی تھی۔ اس کی ساری سرگرمی کا مقصد بھی یہی تھا کہ میرے سامنے کھڑی ہو کر مجھ سے پیسے مانگے... اور پھر یہی ہوا۔ میری آنکھوں میں جھانکتی اپنی ہتھیلی پھیلائے کھڑی تھی۔

''ایسے کیوں بیٹھے ہیں دس روپے نکالیں۔''

''میں کیوں نکالوں؟ انعام تو میرے لیے اکٹھا ہو رہا ہے''

''جی نہیں۔ آپ ہار بھی سکتے ہیں۔''

''ہارنے کا ڈر ہوتا تو میں کھیلتا بھی نہیں۔''

''اس بار مدمقابل کوئی اور ہے۔ دل تھام کر سنائیے گا۔ اس بار ہار نا ٹھہر گیا ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''یہ بتائیں ہار جیت کا فیصلہ کون کرے گا؟''

مسکرا کر بولی۔ ''یہی تو کہہ رہی ہوں کہ مدمقابل میں ہوں... کیونکہ فیصلہ میں نے کرنا ہے۔''

''پھر سنانے کا کیا فائدہ... کیونکہ آپ نے مجھے تو ہرا ہی دینا ہے۔''

''ضروری تو نہیں۔ میں ہار بھی سکتی ہوں۔'' اس لہجے میں اس نے کہا جیسے کہہ رہی ہو میں تو ہار ہی گئی ہوں۔

میں بولا۔ ''چلو۔ میں ہاروں کہ جیتوں۔ میرے لیے ایک ہی بات ہے۔''

یہ کہا اور دس روپے جیب سے نکالے۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اپنے لمس سے مجھے آشنا کر کے نوٹ تھام لیا۔

☆☆☆

سب سننے کے لیے خاموش بیٹھے میری جانب دیکھ رہے تھے۔ میں نے بولنا شروع کیا۔ ''پچھلے سینکڑوں سالوں نے زمین کا نقشہ تبدیل کر دیا ہے۔ جہاں آج بڑے بڑے شہر آباد ہیں وہاں چھوٹے چھوٹے قصبے ہوا کرتے تھے۔ نہ سڑکیں اور نہ ریل گاڑی تھی۔ آبادی بہت کم ہوا کرتی تھی۔ جہاں شہر ختم ہوا وہاں پر جنگل شروع ہو جاتے تھے۔ پھر قصبے پھیل کر شہر بنے اور گاؤں بڑھ کر قصبے بن گئے۔ بیشتر زمین جنگلوں سے ڈھکی تھی۔ جنگل کاٹ کر انہیں ہموار کیا گیا۔ دریاؤں سے نہریں نکالی گئیں۔ پل بنے اور رابطے آسان ہو گئے۔ غرض دنیا کی ہیت ہی بدل گئی، مگر کچھ مقامات ویسے کے ویسے رہے جیسے صدیوں سے تھے۔ جہاں ہم بیٹھے ہیں یہ بھی انہی مقامات میں ایک ہے جو سینکڑوں سالوں سے جوں کی توں ہے۔ جو آج ہم یہاں بیٹھے دیکھ رہے ہیں یہ جگہ شاید صدیوں پہلے کا انسان بھی اسی طرح سے دیکھتا ہوگا۔ ان دنوں برفیں زیادہ تھیں۔ یہ سارا علاقہ برفوں سے ڈھکا تھا۔ غرض کوئی خاص تبدیلی یہاں رونما نہیں ہوئی۔ یہی پہاڑ تھے اور یہی منظر تھا۔ یہی خاموشی اور یہی تنہائی تھی۔

بغداد کے ایک شہزادے نے حوض میں نہاتے ہوئے ایک اوپر سے گزرتی پری کا عکس پانی میں دیکھا۔ وہ اس پر اسی لمحے مر مٹا۔ ہر جگہ اس پری کو تلاش کیا گیا مگر کوئی اسے نہ ڈھونڈ سکا۔ ایک بزرگ نے بتایا کہ پری کو کوئی دیو اٹھا کر یہاں لے آیا ہے اور سامنے پہاڑ کی چوٹی پر ایک قلعہ میں قید کر رکھا ہے۔

آپ کو معلوم ہے کہ یہ سامنے والا پہاڑ پہلے دیو تھا۔ شہزادے نے اسے قتل کر دیا تو وہ پہاڑ بن گیا۔ ساتھ والے پہاڑ پر دیو کا وہ قلعہ تھا۔ جہاں شہزادی کو قید کر رکھا تھا۔ شہزادہ ایک بڑا لشکر لے کر پری کی تلاش میں نکلا۔ سارے محافظ راستے میں مر گئے۔ یہ فقیروں کی حالت میں یہاں پہنچا۔ درویش نے شہزادے کو یہ بتایا تھا کہ پری اس پہاڑ کی چوٹی پر دیو کے بنائے قلعہ میں قید ہے اور چودھویں چاند کی رات کو دیو کی اجازت سے نیچے جھیل پر اترتی ہے۔ شہزادہ کئی دن انتظار میں یہاں پڑا رہا۔ آخر کار پری اپنی ہم جولیوں کے ہمراہ چودھویں کی رات نیچے اتری اور شہزادے کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ مگر دیو پری کو اٹھا کر وہ سامنے پہاڑ پر دوبارہ لے گیا۔ شہزادہ مشکلوں سے اوپر پہنچا۔ ایک جنگ اس میں اور دیو کے درمیان ہوئی۔ آخر کار بہادر شہزادے نے دیو کو ہلاک کر دیا۔ پھر یہاں اسی جگہ شہزادے اور پری کی شادی ہوگئی..... اور جو ساتھ والا پہاڑ ہے یہ وہی دیو ہے جس کو شہزادے نے مار دیا تھا۔ اس مقام کا نام پھر شہزادے سیف الملوک کے نام پر پڑ گیا۔ یہاں جو خاموشی اور... افسردگی چھائی ہے اس کے پیچھے بدرجمال اور شہزادے کی داستان چھپی ہے.....''

سب ملکہ پربت کی چوٹی کو دیکھ رہے تھے۔ شاید دیکھنا چاہتے تھے کہ ابھی پری جمال وہاں سے اترے گی اور ہمارے بیچ بیٹھ کر اپنی داستان پھر سے سنائے گی۔ ہمارے درمیان ایک خاموشی چھائی تھی۔ اتنے میں جھیل سے سرد ہوا کا ایک جھونکا آیا اور سب کو چھو کر نکل گیا۔ سارے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ یوں لگا کہ کوئی ہماری محفل میں ذرا بھر کے لیے مچل ہوا اور پھر چلا گیا۔ کنول اپنی سوچوں میں کھوئی بیٹھی تھی۔

اس کی والدہ ثروت کو بتا رہی تھیں ''میری کنول بیٹی بہت حساس ہے۔ کوئی اسے اپنا جھوٹا سچا دکھ سنائے تو اسی طرح اداس ہو کر بیٹھ جاتی ہے۔'' پھر بیٹی سے بولیں ''ادھر آؤ میری بچی۔ ماں کے پاس آ بیٹھو.....''

وہ نجانے کن خیالوں میں کھوئی تھی کہ رونے لگی ''امی آپ ہر وقت مجھے کمزور بنا کر سب کے سامنے پیش کرتی ہیں۔ سارے میری طرح بیٹھے ہوئے ہیں مگر آپ کو صرف میں نظر آئی.....''

ماں یہ سن کر چپ ہو گئیں۔ باپ اٹھ بیٹھا۔ بہن نے اس کو گلے سے لگا لیا۔ چھوٹا بھائی تڑپ کر بہن کو مڑ کر دیکھنے لگا۔ کنول کے آنسوؤں نے میری طرح سب کو بے چین کر دیا تھا۔

باپ نے بیٹی سے کہا ''تم میری بہادر بچی ہو۔ تمہاری ماں کو تم پر پیار آ رہا ہوگا.....''

وہ رندھی آواز میں بولی ''صرف مجھ پر کیوں، کومل پر یہ پیار کیوں نہیں آتا؟''

آنسوؤں سے اس نے اپنا چہرہ بھگو دیا۔ میں خاموشی سے اس کو تکے جا رہا تھا۔

کنول نے مجھے بے اختیار کر رکھا تھا۔ اس کی شخصیت کا ہر پہلو خوبصورت تھا۔ مسکراتی تو لگتا ہلال سر آسماں نظر آ گیا ہے۔ روئی تو لگا کہ اس کا حسن سلگ رہا ہے۔ باتیں کرتی تو محسوس ہوتا کہ تان بھر رہی ہے اور جب محبت سے دیکھتی تو لگتا کہ پیار کی مٹی سے بنی مورت ہے۔

رونے کے ساتھ ساتھ وہ اپنے بازوؤں کی اوٹ سے مجھے دیکھ بھی رہی تھی۔ مٹھی کھول کر میری جانب بڑھائی جس میں پچاس روپے رکھے تھے۔

''لیں اپنے پیسے.....''

میں اپنی جگہ سے نہیں ہلا اور وہ پیسے کومل نے لے لیے۔

دل کرتا تھا کہ بڑھ کر اسے اپنے بازوؤں میں لے لوں۔ سوچ رہا تھا کاش مجھ سے بھی خفا ہو اور میں اپنے گلے لگا کر اسے مناؤں۔

اس کا یہ نازک ہاتھ، کلائی اور کلائی کا کنگن، یہ جھیل جیسی آنکھیں اور ان آنکھوں میں چھایا حزن، یہ اس کا بیٹھنا اور بیٹھ کر یوں میری جانب دیکھنا، یہ کندھوں پر پھیلے سیاہ بال..... یقین نہیں آ رہا تھا یہ سب میرے ہیں۔ ان سب کا میں مالک ہوں۔ جس کو اپنی محبت دے دی جائے اس کو تو اپنا سب کچھ لٹا دیا جاتا ہے۔ کنول اور میں نے ایک دوسرے کو اپنا اپنا مالک بنا دیا تھا۔

اس کی والدہ مجھ سے شکوہ کر رہی تھیں ..... ''ناں بیٹا۔ تم لوگ ابھی اپنی جیپوں پر بیٹھ کر واپس چلے جاؤ گے اور ہم ادھر دیو کے رحم و کرم پر اکیلے ہوں گے؟''

میری سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہوں۔ وہ پھر بولیں۔ ''ایک تو میری معصوم بیٹی کو پہلے رلا دیا اور اب ہمیں یہاں اکیلا چھوڑ کر جا بھی رہے ہو؟''

میں بولا ''لگتا ہے آنٹی آپ کو ڈرلگ رہا ہے.....؟''

''لو اور دیکھو۔ پوچھ رہا ہے کہ ڈر لگ رہا ہے۔'' پھر میرے سامنے ہاتھ لہرا کر بولیں ''یہاں کون سا میلہ لگا ہے کہ ہم گھومتے پھرتے رہیں۔ جب اپنی دو بچیوں کے ساتھ اس ویرانے میں اکیلی بیٹھی ہوں گی تو کیا ڈر نہیں لگے گا؟ مانتی ہوں تم علم اور عقل رکھتے ہو مگر تمہاری یہ بات کیا کرنے والی تھی۔ سامنے دیو پہاڑ بن کر کھڑا ہے اور ادھر یہ لڑکا پوچھ رہا ہے کہ آنٹی کیا آپ کو ڈر لگ رہا ہے.....''

میں نے بھی شرارت کی ''آنٹی دعا کریں یہاں کبھی میلہ نہ لگے۔ ورنہ میری پریاں یہاں سے اڑ کر کہیں اور چلی جائیں گی.....''

''میری طرف سے تو جائیں جہنم میں۔ یہاں بیٹھتی ہیں یا پھر کہیں اور دفع ہوتی ہیں۔ مجھے صرف یہ بتاؤ کہ ہمیں اکیلا چھوڑ جاؤ گے؟''

کنول نے کہا ''ابو تو ہیں۔ پھر کیوں کہتی ہیں ہم اکیلے ہوں گے.....''

متعجب ہو کر کنول کو دیکھنے لگیں ''اب تمہارے ابو اس پہاڑ جیسے دیو سے لڑیں گے؟ جہاں ان کو بٹھاؤں یہ لیٹ جاتے ہیں۔ اس حالت میں ان سے یہ کہوں کہ جا کر دیو سے دو دو ہاتھ کرو.....''

میں نے کہا کہ آنٹی اب تو دیو کب کا مرکھپ کر پہاڑ بھی بن چکا ہے۔ تو کہا ''تم اپنے سارے علم کے باوجود بھی مجنوں والی باتیں کرتے ہو۔ یہ بتاؤ جو دیو پہاڑ بن سکتا ہے کیا وہ دوبالا رہ دیو نہیں بن سکتا؟''

میں نے بتایا ''ہم کچھ دوست رک رہے ہیں۔ جیپ میں جگہ بہت ہے۔ آپ سب بڑی آسانی سے ہماری جیپ میں جا سکتے ہیں.....''

''بیٹا۔ مگر تم یہاں کیوں رک رہے ہو.....؟''

''آپ کو بتایا تو تھا کہ یہاں سے ہم واپس پیدل

جائیں گے۔اور میں اس جگہ کو خاموشی اور تنہائی میں بیٹھ کر اکیلے دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''کوئی وظیفہ کرنا ہے اکیلے بیٹھ کر؟ بیٹا ہمارے ساتھ تم بھی چلو۔ابھی شام ہو جائے گی اور پھر بلائیں گھومتی نظر آئیں گی.....کل سب کے ساتھ آ کر اسے دوبارہ دیکھ لینا۔''

''یہاں کوئی بلائیں نہیں آئیں گی۔اور جو مزہ تنہا بیٹھ کر یہ جھیل دیکھنے میں ہے وہ کسی اور کے ساتھ کہاں آ سکتا ہے۔''

کنول چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔نظروں میں ایک شکایت بھر آئی کہ میرا ساتھ بھی تم کو گراں بار ہے؟

☆☆☆

جیپیں آئیں تو ہم سب اٹھ کر چلے۔طاہرہ ثروت اور کومل نے ذرا آگے نکل کر ہم دونوں کو باتیں کرنے کا موقع فراہم کر دیا۔ کنول سر جھکائے خاموش چل رہی تھی۔چہرہ اداس تھا اور اپنے ایک ہاتھ میں اپنا دوسرا ہاتھ سختی سے تھاما ہوا تھا میں نے پوچھا''پری کے دکھ میں روئی تھی کہ دیو کا ڈر تھا.....؟''

''یہ وجہ نہ تھی.....''

''پھر کیا بات تھی.....؟''

وہ پلکیں اٹھا کر مجھے اداس نظروں سے دیکھنے لگی''میرا دل پہلے سے ہی بوجھل تھا۔امی نے مجھے موقع دیا اور مجھے آنسو بہانے کا بہانہ مل گیا.....''

''آخر اداسی کی کوئی وجہ بھی تو ہوگی.....؟''

وہ دلگیر لہجے میں بولی''ہم سب اس طرح سے بیٹھے تھے جیسے سب ایک فیملی کے افراد ہوں۔ بابا لیٹے ہیں، اطہر آپ کے بازو سے لپٹا بیٹھا ہے، امی اور کنول غور سے سن رہی ہیں۔میں سب کو محو دیکھ کر سوچنے لگی کہ سب اتنا اچھا لگ رہا ہے۔ہم اس طرح سے قریب قریب ہو کر بیٹھے ہیں جیسے عرصے سے سب ایک دوجے کو جانتے ہیں۔پھر یہ خیال آیا کہیں یہ خوبصورت لمحے صرف خوبصورت یادیں بن کر نہ رہ جائیں۔ ایسی یادیں جن کی صرف خوشبو فضاؤں میں باقی رہ جاتی ہے۔خیال مجھے یہ آیا کہ کہیں میں بھی کھو کر تمہاری کوئی خوبصورت یاد بن کر نہ رہ جاؤں۔میں تو پانی کی وہ بوند ہوں جو بادل سے برس کر کسی سمندر میں ہمیشہ کی طرح گم ہو جاتی ہے۔ایسی بوند جس کا کوئی نام ونشان بھی باقی نہیں رہتا۔ یہ سب سوچ کر میں رونا چاہتی تھی۔صرف رونا نہیں بلکہ تمہارے کندھے پر سر ٹکا کر رونا چاہتی تھی۔''

اس کے لہجے میں بے پناہ درد تھا۔ بولتے بولتے وہ نڈھال سی ہو گئی تھی۔

میں نے پوچھا''یہ کیوں سوچتی ہو کہ ہم جدا ہو جائیں گے؟''

''میں ایسا کہاں سوچتی ہوں۔تم سے ملنے کے بعد ایسی سوچیں میرا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔جب بھی تمہارے اور اپنے تعلق کا سوچتی ہوں تو یہ خود ہی چلی آتی ہیں۔''

''کنول خود تو کہا تھا کہ آرزو ضرور پوری ہو جایا کرتی ہے.....پھر اتنی مایوسی کیوں ہے؟''

وہ شکستہ لہجے میں بولی''میری یہ آرزو آپ ہی نے پوری کرنی ہے۔مجھے آپ پر اعتماد ہے اور اسی خاطر تو کہا تھا کہ میری آرزو پوری ہو جائے گی''یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔اپنی بات جاری رکھی''مجھے بیچ راستے پر نہ چھوڑ دینا اور کہیں ہمت نہ ہار بیٹھنا۔''

میں نے کہا''مجھ پر اعتماد ہونے کے باوجود بھی مایوس ہو؟''

''تمہارے ساتھ میرا تعلق اتنا شدت پکڑ چکا ہے کہ اب کسی انجانی چیز سے ڈر لگنے لگا ہے۔وسوسے دل میں ابھرتے ہیں۔ جدائی کے ناگ کہیں اندر بیٹھ کر پھنکارتے ہیں۔مجھے ان وسوسوں سے نجات دلاؤ۔میری ہمت ٹوٹ رہی ہے۔مجھے اپنے پیار کا سہارا دو۔''

اس کی آنکھیں بہہ رہی تھیں۔میں حیران تھا کہ چند دنوں کی محبت کیا طوفان بن چکی ہے۔میری محبت کی وجہ تو یہ تھی کہ میں غزالہ کو ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔ اس کی ہمشکل ہونے کی وجہ سے میں کنول کے قریب ہوتا چلا گیا تھا، مگر وہ تو لاغرض سی پھر رہی تھی۔ اسے تو میری طرح کسی کی تلاش نہ تھی، پھر کیوں وہ دیکھتے دیکھتے محبت کے گرداب میں غرق ہوتی چلی گئی تھی۔ وہ بار بار مجھ سے میرا اعتبار اور بھروسا مانگتی۔کبھی ایسی نظروں سے دیکھتی جیسے التجا کر رہی ہو۔ اس کی ایسی نظروں نے ہر بار مجھے نادم کیا۔ کبھی تو مجھے خود پر شک ہونے لگتا کہ کیا واقعی میں وہ ہوں جو خود کو سمجھتا ہوں۔یا میں کوئی اور ہوں جسے کنول جان چکی ہے۔

وہ مجھے چیلنج کرنے کے انداز میں کہہ رہی تھی۔''آپ کو اپنی محبت پر بہت ناز ہوگا، مگر جو غرور مجھے ہے آپ اس کو چھو بھی نہیں سکتے۔آپ نے تو شاید مجھ سے پیار اپنے آپ کو خوش کرنے کے لیے کیا ہو مگر میں نے پیار اپنے سے زیادہ

آپ کو خوش دیکھنے کے لیے کیا ہے۔''

میں نے کہا۔'' ابھی تو ہماری محبت کی شروعات ہے۔ آہستہ آہستہ میرے پیار کو سمجھ جاؤ گی.....''

طنزیہ نظروں سے میری جانب دیکھ کر بولی۔'' پہلے تو کہتے تھے عرصے سے ہم ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ ازل سے ہم پیار کرتے چلے آرہے ہیں۔ اب کہہ رہے ہیں کہ یہ محبت کی شروعات ہے؟''

میں مسکرا کر اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔ یہ غزالہ نہ تھی۔ یہ میری ہر بات کے ہر لفظ کو جوڑ جوڑ کر رکھتی آرہی تھی۔ اس کے آگے بڑے بڑے دعوے کرنا آسان نہ تھا۔

مجھ سے پوچھا۔'' اس لیے رک رہے ہو کہ واپسی کے لیے جیپ میں ہماری جگہ بن سکے؟''

''نہیں۔ جگہ تو بہت ہے۔ ہم دوستوں نے پہلے سے واپس پیدل جانے کا پروگرام بنایا ہوا ہے.....''

''تو پھر میرے ساتھ واپس چلو۔ میں نے اکیلے نہیں جانا.....''

میں نے پوچھا۔'' کیا میرے بغیر کچھ گھنٹے بھی نہیں گزر سکتے؟''

فٹ سے بولی۔'' ہاں نہیں گزرتے...اور نہ ہی گزارنا چاہتی ہوں۔ جب تک ناران میں ہیں تو زیادہ سے زیادہ وقت آپ کے ساتھ گزاروں گی۔''

''بہت زیادہ پیار دکھلا رہی ہو۔ کہیں ایسا نہ ہو.....''

یہاں آکر میں رک گیا۔

وہ بولی۔'' کیا ایسا نہ ہو؟ یہی کہ مجھے گلے لگا لیں گے۔ کاش تم لگا لیتے۔'' یہ کہنے کے بعد مسکرانے لگی۔

مجھے خاموش پا کر بولی۔'' تو میرے ساتھ چل رہے ہو کہ نہیں؟''

میں نے بھی بلا سوچے بول دیا۔'' ہاں .....ساتھ جائیں گے۔''

''اور ٹریکنگ.....؟''

''وہ کیا تم سے بڑھ کر ہے؟''

''سوچ لو.....''

''محبت میں سوچتا کون ہے۔ حساب کتاب تو نہیں رکھا جاتا۔ جو کرنا ہو وہ کر گزرتے ہیں.....''

''دوستوں سے کیا کہیں گے.....''

''یہی کہوں گا میں واپس جا رہا ہوں۔ اگر وہ ناراض ہو گئے تو بعد میں انہیں منا لوں گا۔''

لحظہ بھر میرے چہرے سے میرے ارادے کی پختگی کا اندازہ لگاتی رہی۔ پھر مسکرا کر کہنے لگی۔'' میں آپ کے پرنہیں کاٹنا چاہتی۔ آپ کے راستے بند نہیں کروں گی۔ آپ اپنا شوق پورا کریں اور میں ناران میں آپ کے آنے کا انتظار کروں گی۔''

میں نے کہا۔'' نہیں۔ میں تمہارے ساتھ واپس چلتا ہوں۔ تم چلی گئیں تو تمہاری کمی شدت سے محسوس ہوگی.....''

''اب آپ نہ رکیں۔ دوست برا محسوس کریں گے۔ مگر شام سے پہلے آجانا۔ میں انتظار کروں گی.....''

''ہاں۔ میں جلدی آؤں گا۔ مجھے بھی تمہارے بغیر ہر لمحہ بوجھل لگتا ہے۔''

وہ غزالہ سے بہت مختلف تھی۔ وہ یہاں ہوتی تو مجھے کبھی نہ رکنے دیتی۔ مگر کنول نے سوچا، سمجھا اور میری خواہش کے باوجود مجھے دوستوں کے ساتھ رکنے دیا۔ غزالہ میں شوخی اور اس میں بے پناہ متانت تھی۔ وہ آب اور یہ آگ تھی۔ اس کا پیار ایک ندی کی طرح رواں دواں بہتا تھا اور کنول کا پیار ایک ابلتا ہوا لاوا تھا جو کہساروں کا سینہ چیرتا تیزی سے بہتا چلا آرہا تھا۔ غزالہ کی محبت جسم میں تازگی بھرتی تھی اور اس کا پیار اپنی شدت کے باعث جسم کو جھلساتا تھا۔

☆☆☆

وہ گئی اور ایک بھریا میلہ اجڑ گیا۔ فضا سونی سونی ہو گئی اور دل پر اداسی چھا گئی۔ نہ کوئی دلکشی باقی رہی اور نہ کوئی چاشنی۔ سب نظارے بیں کرنے لگے تھے۔ ایسا لگا کہ میں جھیل کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبا جا رہا ہوں۔ ابھی تو وہ سامنے اپنے دونوں ہاتھ تھامے کھڑی تھی اور ابھی وہ مقام ویران پڑا ہے۔ اس کا ہونا خواب تھا کہ نہ ہونا خواب ہے؟ میرے دل پر پڑا بوجھ بڑھتا جا رہا تھا۔ محبت کی جس منزل تک پہنچنے میں مجھے سالوں لگے اور وہ ایک جست میں اسے طے کر گئی تھی۔

طاہرہ اور ثروت نے بار ہا کہا کہ وہ بھی ہمارے ساتھ واپسی پیدل کرنا چاہتی ہیں ... مگر میں یہ رسک نہیں لے سکتا تھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ میں جلد سے جلد ناران پہنچنا چاہتا تھا۔ کنول کے بغیر گزرا وقت مجھے کاٹے جا رہا تھا۔ سوچتا اب میری یہ حالت ہے تو جب وہ چلی جائے گی تو کیا ہوگی۔ یہ دوری کیا ہر پیار کرنے والے کی مجبوری ہوتی ہے۔ یہ دوری کیا وہ تشنگی ہے جو ملنے کے باوجود بھی رہ جاتی ہے۔

وہ دوری ختم نہیں ہوتی

اور یہ دوری خواب دیکھنے والوں کی مجبوری ہے
مجبوری ختم نہیں ہوتی

کنول کی والدہ یہ کہتی رہیں کہ اتنے عقل مند ہو کر احمقوں والی حرکتیں کیوں کرتے ہو۔ سیدھی طرح جیپ میں بیٹھ کر ہمارے ساتھ چلو۔ جب مجھے مسلسل مسکراتے دیکھا تو بولیں۔ ''آ کر یاد سے تم بھی پیر سائیں سے دم کروا دینا۔'' پھر اپنے آپ سے کہنے لگیں ''مجھے تو لگتا ہے اسے کوئی پری چمٹ گئی ہے۔'' یہ سن کر ساتھ کھڑی کنول بھی مسکرانے لگی۔

میں چھپر ہوٹل پر بیٹھا جھیل کو دیکھنے لگا جو کنول کے جاتے ہی سوگئی تھی۔ مناظر جم چکے تھے۔ ہر سو خاموشی چھائی تھی۔ ہر چیز تھکی تھکی نظر آنے لگی۔ بادل پہاڑوں کے دامن سے لپٹے نیچے کرنے لگے۔

میں اتر کر جھیل کنارے آ بیٹھا۔ پانیوں میں مجھے اور کچھ نہیں بلکہ کنول کا عکس نظر آنے لگا۔ غزالہ بھیس بدل کر کنول بنی اور کنول روپ بدل کے جھیل بن گئی۔ ملائم، مدھم، مدہوش مدھر اور پُراسرار..... کنول اور جھیل۔ دونوں اپنے اندر کئی سربستہ راز دفن کیے ہوئے تھے۔

آج کنول نے اپنے انداز و بیان سے مجھ کو واضح کر دیا تھا کہ مجھ میں غزالہ نہیں بلکہ مجھے تلاش کرو۔ کنول سمجھ کر مجھے تلاش کرو۔ اگر میں تم کو مل گئی تو وعدہ ہے تمہیں غزالہ بھی بخش دوں گی۔

کتنی عجیب بات تھی کہ سارے مناظر وہی تھے جو پہلے تھے مگر ان میں دلکشی وہ نہ تھی۔ ہوا بھی وہی تھی اور فضا بھی وہی تھی۔ میں بھی وہی تھا اور میری نظر بھی وہی تھی۔ مگر کتنے حیرت کی بات ہے کہ وہ کچھ نہ تھا جو پہلے تھا۔ کہاں گم ہو گئے وہ سارے ساز اور کہاں ٹھہر گئیں وہ ساری راگنیاں؟ فضاؤں کا ترنم سرد آہوں میں بدل گیا۔ منظر بے رنگ اور دوست اجنبی لگنے لگے۔ مجھے یقین آ گیا کہ آنکھ تو وہ دیکھتی ہے جو دل دیکھتا ہے۔ جو دل دیکھتا ہے وہ کوئی دوسرا نہیں دیکھتا۔

چھپر ہوٹل تلے ایک سناٹے میں بیٹھ کر میں نے کھانا کھایا۔ یادوں کے جو موتی بکھرے پڑے تھے انہیں چنا، اپنی جھولی بھری، اکتائی ہوئی جھیل پر الوداعی نظر ڈالی اور ناران واپسی کے لیے چل پڑے۔

☆☆☆

میرا اٹھایا ہر نیا قدم مجھے کنول سے قریب کیے جا رہا تھا۔ میرے اندر ایک طوفان بھرا تھا جو مجھے اڑائے جاتا تھا۔ میں کسی صحرا کا پیاسا مسافر تھا جس کی محبت کا چشمہ ناران میں بہہ رہا تھا۔ میرے ہمراہ لطیف، شہزاد اور امتیاز تھے۔ کئی بار مجھے روکا کہ کیا قیامت آ پڑی ہے کہ بھاگے چلے جا رہے ہو۔ میں نے سوچا ہاں آج یوم حساب ہے اور انعام میں مجھے میری جنت ملنی ہے۔

ہم ایک پہاڑی ڈھلوان پر نیچے اتر رہے تھے۔ اس راستے پر شاذ و نادر ہی سیاح اترتے ہوں گے۔ وہاں ہم تھے اور ہمارے قدموں تلے ڈھلوانوں پر بچھے کھیت تھے۔ وہ ایک نئی زمین تھی جس پر نیا آسمان کھڑا تھا۔ نئی راہیں تھیں، نئی امنگیں اور نئے جذبے تھے۔ ہونٹوں پر گیت اور قدم ہواؤں میں اڑتے تھے۔

راستے میں ایک گاؤں آیا جس کے پہاڑی ڈھلوان پر تہہ در تہہ بچھے کھیتوں کی فصل کٹ چکی تھی۔ وہاں بچے دوڑتے پھرتے نظر آ رہے تھے۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو برفانی چوٹیاں ہمیں جاتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔ جھیل سے نکلے پانیوں کی ندی گرتی پڑتی اور شور مچاتی بہے چلی جا رہی تھی۔ وہیں آرام کی غرض سے سب کھیتوں کے درمیان جا بیٹھے۔ ندی کے قریب ایک جھاڑی میں جنگلی پھول اگے تھے اور میں نے ساتھ ہی اپنی جگہ بنالی۔

ہم بیٹھے تو سارے بچے وہیں جمع ہو گئے۔ سائے لمبے پڑنے لگے اور خنکی بڑھنے لگی تھی۔ ہمارے سامنے بچوں کے سرخ و سفید چہرے، میلے کپڑے اور ان کی حیرت سے تکتی نظریں تھیں۔ ایک ہنستا تو سب ہنس پڑتے۔ فوٹو بنوانے کا کہتے تو پانچ روپے مانگتے۔ دوست ان سے باتیں کر کے ہنس رہے تھے اور میں کھلی فضا میں کسی گہری سوچ میں گم بیٹھا تھا۔ مجھے چلنے کی جلدی تھی اور سب کو بچوں کی محفل مزہ دے رہی تھی۔

دوبارہ روانہ ہوئے اور ہمارا سفر ندی کے ساتھ ساتھ تھا۔ ندی کے کناروں خودرو جھاڑیاں تھیں اور پتھر پڑے تھے۔ کہیں کہیں بلند درخت ایستادہ تھے۔ پانی جھاگ اڑاتے .... بہے جا رہے تھے۔ ہمارے اوپر نیلگوں آسمان پر کہیں کہیں بادل ٹھہرے تھے۔ زرد دھوپ نے بلند پہاڑوں کی چوٹیاں سنہری کر دی تھیں۔ میرے دوست ہر خوبصورت منظر میں میرے دلی خواہش کے باوجود بیٹھ جاتے۔ میں ان کی خوشی کی خاطر خاموش رہا۔ وہ دیر تک بیٹھے رہتے۔ گانے گاتے، لطیفے سناتے اور قہقہے لگاتے تھے۔ لطیف کے علاوہ کسی کو خبر نہ تھی کہ آج مجھے کوئی منظر اچھا نہیں لگ رہا۔

میری سوچیں کنول کی جانب تھیں جو میرا ناران میں بیٹھی انتظار کررہی تھی۔ میں جانتے ہی اس کی صورت دیکھنا چاہتا تھا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ مجھے دیکھ کر وہ خوشی سے کس طرح کھل اٹھتی ہے۔ اس پر کیا کیا رنگ اترتے ہیں۔ میرے اندر خواب وخیال جاگ اٹھے۔ میں اس کو دیکھنے کے لیے بے تاب تھا۔

میں خود پر جبر کیے اور اپنے جذبات چھپائے دوستوں کے ہمراہ بیٹھا تھا۔ میں اپنے دل کی خبر دل ہی میں رکھنا چاہتا تھا کیونکہ ایسا کرنے سے محسوس ہوتا کہ میں کوئی قیمتی خزانہ اندر رکھے پھر رہا ہوں۔

ہم ایک مقام پر بیٹھے تھے۔ کھلی وادی میں آتی ہوا چہار سو پھیل رہی تھی۔ سورج کا سرخ گولہ دور پہاڑوں کی چوٹیوں کے پیچھے ڈھل رہا تھا۔ وقت اسرار کے لمحوں میں داخل ہونے لگا۔ دلوں کے در کھلنے کا وقت قریب آیا۔ پہاڑ سرمائی اور وادیاں دھواں دھار ہوگئیں۔ ندی کے قریب جھاڑیوں پر پھول ہی پھول نظر آرہے تھے۔ ناران کی وادی قریب مگر نظروں سے اوجھل تھی۔ وہاں کے آسمان پر محبت کے لہرے مجھے دکھائی دیتے تھے۔ وہاں کی کشش مجھے اپنی جانب کھینچے جارہی تھی۔ دل کے اندر پیار طوفان چھپا تھا۔ میری نگاہیں ناران کے آسمان پر تھیں۔

پھر شام ایک چیل کی مانند ہم پر آجھپٹی۔ ہم ناران پہنچے تو اندھیرا چھا چکا تھا۔ چاند کہیں چھپا تھا اور فضا میں عجیب سا سکوت چھایا تھا۔ بازار میں لوگ بہت کم تھے۔ چند دکانوں کی ٹمٹماتی روشنیاں ایک اُمید کی طرح روشن تھیں۔ ناران کوئی چھوٹی اور قدیم بستی کی طرح دکھتی جو لمحوں کے لیے بسائی گئی تھی اور جیسے ہی ہم چلے جاتے اس کو لمحوں میں لپیٹ لیا جاتا۔ جب دور سے اپنا ہوٹل دیکھا تو میری ساری تھکاوٹ زائل ہوگئی۔ میرا دل زور سے دھڑکنے لگا۔ کنول اندر اپنے کمرے میں بیٹھی میرے بارے سوچ رہی ہوگی، میرا یہ خیال بھی بڑا خوش کن تھا۔

اندر داخل ہوا تو دیکھا ڈائننگ ہال خالی ہے۔ کاؤنٹر پر کوئی موجود نہیں۔ ایسی خاموشی طاری تھی کہ دل گھبرانے لگا۔ برآمدے میں جھانکا تو کوئی بھی موجود نہ تھا۔ دوست اپنے کمروں میں آرام کرنے چلے گئے اور میں پریشان کھڑا اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا، پھر اپنے کمرے میں آیا تو سب سو رہے تھے۔ دوسرے کمرے کی لائٹ بھی بند تھی۔ سوچا وہ بھی تھکی ہاری آرام کررہی ہوگی، پھر سوچا جس کے لیے میں اتنا بے چین تھا اور وہ سو رہی ہے؟ دل میرا بجھ سا گیا۔ وہ تھکی ہے تو میں بھی تھکا ہوں۔ بے قراری مجھے ہے تو اسے کیوں نہیں۔ میں راستے میں ہوں اسے نیند کیوں آگئی۔

لگی آلیاں تو نیند نہیں آندی تہ تیری کیویں اکھ لگ گئی

(پیار کرنے والے تو نہیں سوتے۔ پتا نہیں تیری آنکھ کیسے لگ گئی)

میرے دل میں چبھن تھی۔ ایک خلش مجھے بے قرار کیے جارہی تھی۔ میں تو سمجھا تھا اس کی محبت آگ ہے، مگر یہ کیسی آگ ہے جو مجھ سے دور جانے پر بجھ گئی ہے۔ جب ہم یہاں سے چلے جائیں گے تو کیا وہ مجھے یاد بھی رکھے گی؟

میں اپنے کمرے میں آگیا۔ کھڑکی کے فریم سے باہر کا نظارہ کرنے لگا۔ وہاں ہلکی دھند میں اداسی تیر رہی تھی۔ دھند چھٹنے لگی مگر اداسی وہیں جم گئی۔ زمین و آسمان گلے شکوے کرنے لگے۔ میں وہاں سے ہٹ آیا۔ باتھ روم جاکر اتنی ٹھنڈ میں شاور لیا۔ ڈائننگ ہال آیا تو وہاں کی دیواریں، چھت میز کرسیاں اور سب چیزیں بے زاری نظر آرہی تھیں۔ میں باہر نکلا اور سڑک کنارے بڑے پتھر پر آبیٹھا۔ چاند نہیں نکلا تھا اور تارے چپ چپ تھے۔ آسمان دھندلا نظر آرہا تھا۔ اپنے دل کو تسلیاں دیتا رہا کہ نیند تو کہیں بھی آجاتی ہے۔ اگر وہ سوگئی ہے تو یہ اتنی بڑی بات کیسے ہوگئی، مگر اپنا دل تو زور آور جذبوں کا عادی تھا۔ ایسی طفل تسلیوں سے کہاں بہلنے والا تھا۔

اتنے میں طارق اور توقیر بازار سے آتے دکھائی دیئے۔ ہاتھوں میں ہاتھ تھامے بچپن کے دوستوں کی طرح ہنستے گاتے چلے آرہے تھے۔ مجھ پر نظر پڑی تو توقیر میری جانب بڑھا چلا آیا۔ ساتھ طارق بھی تھا۔ توقیر نے مجھ سے کہا۔ ''طاہرہ باجی آپ کا پوچھ رہی تھیں۔ کہا کہ جب بھی آئیں تو میری طرف بھیج دیں۔''

میں نے پوچھا ''کوئی کام تھا.....؟''

''معلوم نہیں .....'' اسی دوران طارق مجھے متواتر گھورتا رہا۔ میں اس کے ساتھ کوئی شرارت ضرور کرتا مگر مجھے تجسس تھا کہ طاہرہ کیا کہنا چاہتی ہے۔

ان کے دروازے پر جاکر دستک دی تو لمحے بھر میں دروازہ کھل گیا۔ سامنے طاہرہ تھی۔

''کب سے آپ کا پوچھ رہی ہوں.....کہاں تھے؟''

''میں باہر سڑک پر بیٹھا تھا.....''

''یہاں کا خیال بھی نہیں کہ کوئی انتظار کر رہا ہوگا؟''

یہ کہہ کر اس نے دروازے کا پٹ پورا کھول دیا۔ سامنے کرسی پر کنول بیٹھی دروازے کی جانب دیکھ رہی تھی۔ مجھے دیکھتے پایا تو سوئی آنکھوں میں ایک مچلی سی کوندی اور پھر اپنی نگاہیں کسی اور جانب کر لیں۔ میرے سارے گلے شکوے پہلے پشیمانی میں بدلے اور پھر بدل کر محبت میں ڈھل گئے۔ پیار کی مدھم موجیں مست ہوگئیں۔

میں کمرے میں داخل ہوگیا۔ وہیں کومل بھی بیڈ پر آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی۔ کشمیرن نے کہا۔ ''یہاں کوئی پریشان اور اداس بیٹھا ہے اور جناب کو کسی کی پرواہ بھی نہیں.....

طاہرہ بولی۔'' بندے کو ذرا سی لفٹ کیا ملی کہ نخرے آسمان کو چھو رہے ہیں.....''

کومل گلا پھاڑ کر گانے لگی۔'' آج بھی سورج ڈوب کیا آج بھی تم نہیں آئے.....''

میں نے دوسری کرسی کھینچی اور کنول کے سامنے بیٹھ گیا۔ میں بیٹھ تو گیا مگر ان نظروں کی تپش مجھے جلائے جا رہی تھی۔ وہ نظریں مجھ پر ٹکی تھیں۔ آج ان میں خفگی تھی۔

کومل نے ڈرائی فروٹ کا لفافہ میری جانب بڑھایا۔ ''کیا یاد کریں گے کہ کن نخیوں سے پالا پڑا ہے۔''

مگر میں نے سر ہلا کر انکار کر دیا۔

کہیں سے آواز آئی۔'' آپ نے بھی کھانے سے انکار کر دیا اور ہم نے بھی۔ کیا ہماری کیمسٹری ملتی ہے۔''

جب میں نے کنول کی جانب دیکھا تو اس نے اپنی تپتی نگاہیں جھکا لیں۔

ثروت بھی کسی سے پیچھے نہ رہی، کہا۔'' آپ کو ہمارا احساس بھی تھا کہ یہاں انتظار ہو رہا ہے۔ ہماری تو نظریں بھی پتھرا گئیں۔''

وہ سب کنول کی بے قراری کے فسانے بتا رہے تھے۔ ہر بات میری رگوں میں خوشبو بھر رہی تھی۔ اس کی اپنے لیے اس تڑپ پر میں نازاں تھا۔ میں مرتبے والا ہوگیا تھا۔ یہ یقین خود کو کیسے دلاتا کہ کنول مجھ سے پیار کرنے لگی ہے۔ دل چاہتا تھا وہ یونہی پلکیں گرائے اسی طرح محبت کی چھاؤں میں بیٹھی رہے۔ کنول کا پیار میری انگلیوں کے پوروں میں سرسرانے لگا تھا۔

میں بھی کتنا جلد باز تھا کہ ڈائننگ ہال خالی دیکھا اور غلط اندازے لگا بیٹھا۔ انہی لمحوں میں کنول سب کو اپنی پریشانی میں گھیرے کمرے میں بے چین بیٹھی تھی۔ اسے میری فکر تھی کہ دیر کیوں ہوگئی؟ کوئی حادثہ تو نہیں ہوگیا؟ راستہ خطرناک ہوگا؟ اسی قسم کے سوال وہ اطہر کو بھیج کر اکرام سے پوچھ چکی تھی۔

میں ابتدا سے کنول کا تقابل غزالہ سے کرتا چلا آ رہا تھا۔ شکلیں ایک جیسی مگر انداز مختلف تھے۔ وہ اپنا پیار بول کر جتلاتی اور یہ اسی پیار کو اداسی کی چادر پہنا دیتی۔ اس کی آنکھیں محبت سے مسکرا پڑتیں اور یہ مغموم ہو جاتیں۔ وہ ناراض ہو کر لڑنے لگتی اور یہ سہم جاتی۔ وہ چاہت میں پانی کی مانند ادھر ادھر بہنے لگتی اور یہ پیار کی ندی میں ڈوب جاتی۔ غزالہ کو میں نے چوڑیوں کی چھن چھن اور کنگنا کی کھن کھن میں پایا اور کنول کا سراغ مجھے دیپک راگ کے سروں میں ملا۔ وہ مجھ سے مغلوب تھی اور یہ مجھ پر غالب آ گئی۔

میں خاموش بیٹھا سب کی باتیں سن رہا تھا۔ چپ اس لیے رہا کہ اپنے پیار کے احساس کو اپنے لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا تھا۔ غیر موزوں فقرے میری محبت کو بے قدر کر کے رکھ دیتے۔

طاہرہ نے کہا۔'' کچھ تو آپ بھی بولیں۔ اس طرح خاموش بیٹھنے سے بات نہیں بنے گی۔''

''آپ لوگ کچھ مجھ سے پوچھیں تو بتاؤں... ورنہ کیا کہوں.....؟''

''ضروری تو نہیں کوئی آپ سے کچھ پوچھے۔ آپ خود سے کچھ بتا سکتے ہیں.....''

''وہ کچھ میں اسے بعد میں بتا دوں گا.....''

''اب تو ہم سب کے سامنے کچھ بتانا ہوگا.....''

میں نے کنول کی جانب دیکھا تو اس کی اداس آنکھوں میں ایک چمک آ گئی۔ ہونٹ بھینچ کر اپنی مسکراہٹ چھپانے لگی۔

طاہرہ نے گرہ لگائی۔'' بھائی صرف دیکھنا نہیں، کچھ بولنا بھی ہے۔''

میں نے یہ مصرع پڑھا.....

زندگی کے میلے میں خواہشوں کے ریلے میں
تم سے کیا کہیں جاناں اس قدر جھمیلے میں

پھر تو شور پڑ گیا کہ پوری نظم سناؤں۔ کسی نے پردہ ہ
کر کھڑکی کھول دی۔ ہوا تو جیسے باہر انتظار میں کھڑی تھی
کھڑکی کھلی اور اس نے کمرا بھر دیا۔ باہر چاند چمکتا دیکھا
کومل نے اٹھ کر لائٹ بند کر دی۔ ذرا اندھیرا ہوا تو چاند
چھن چھن کرتی کمرے میں چلی آئی۔ چاندنی نے کمرا مگ

کنول کو زیادہ منور کر دیا۔ اس کا چہرہ یوں دمکنے لگا کہ چاندنی پھیکی پڑ گئی۔ وہ ایسے چمک رہی تھی جیسے تاج محل چودھویں کی رات چمکتا ہے۔

ایسا ماحول بنا کہ نظم کے مصرعے میری زبان پر پھسلنے لگے

زندگی کے میلے میں خواہشوں کے ریلے میں
تم سے کیا کہیں جاناں اس قدر جھمیلے میں
وقت کی روانی ہے بخت کی گرانی ہے
سخت بے زمینی ہے سخت بے مکانی ہے
ہجر کے سمندر میں
تخت اور تختے کی ایک ہی کہانی ہے
تم کو جو سنانی ہے
بات گو ذرا سی ہے
بات عمر بھر کی ہے
عمر بھر کی باتیں کب دو گھڑی میں ہوتی ہیں
درد کے سمندر میں
ان گنت جزیرے ہیں بیشمار موتی ہیں
آنکھ کے دیے میں جو تو نے سجایا تھا
بات اس دیے کی ہے بات اس گلے کی ہے
جو لہو کی خلوت میں چور بن کے آتا ہے
لفظ کی فصیلوں پر ٹوٹ ٹوٹ جاتا ہے
زندگی سے لمبی ہے بات رتجگے کی ہے
راستے میں کیسے ہو
بات تخلیے کی ہے
تخلیے کی باتوں میں گفتگو اضافی ہے
پیار کرنے والوں کی ایک نگاہ کافی ہے
ہو سکے تو سن جاؤ ایک روز اکیلے میں
تم سے کیا کہیں جانا اس قدر جھمیلے میں۔

میں سنا کر خاموش بیٹھا تھا مگر لگتا کہ ان کی کوئی تاثیر فضا میں تیرتی پھرتی ہے۔ میں اپنے کمرے میں آ کر خراب سجائے بستر پر لیٹ گیا۔

☆☆☆

جب ڈائننگ ہال میں آیا تو دیکھا کنول کی فیملی بیٹھی میز کے گرد کھانے کھا رہی ہے۔ میرے دوست ابھی تک نہیں پہنچے تھے۔ میں ان کی ٹیبل کے پاس رک گیا۔

کنول کی والدہ مجھ سے بولیں ”اتنی دیر سے آئے۔ اطہر تم کو دیکھنے تمہارے کمرے میں گیا تھا۔ تم اپنی مرضی


فیصلے دل کے
محبت اور چالبازی کے درمیان عبرت اثر معرکہ آرائی کا احوال
آخری صفحات پر **نشور ہادی** کے قلم سے

بے منزل مسافر
گمشدہ تاریخی گوشوں پر ایک گہری نظر..... ابتدائی
صفحات پر **زویا اعجاز** کے قلم کا جادو

شہ زوز
عشق و محبت کے سحر انگیز جذبوں کی جنوں خیزی، لطیف رشتوں اور کثیف سازشوں کے جال **اسما قادری** کے قلم کا کمال

ساشا
کبھی پرخطر جزیروں، کبھی بغاوتوں کے جنگل میں بھٹکتے مسافر کی داستان..... **عمر عبداللہ** کے قلم کا شاہکار

ناہید سلطانہ اختر، تنویر ریاض، غلام قادر، طاہر جاوید مغل، ڈاکٹر شیر شاہ سید، آصفہ ضیا احمد اور فہمی فردوس کی خوب صورت تحریریں

کرتے رہتے ہو۔ جب بیوی آئے گی تو وہی تمہیں ٹھیک کرے گی۔''

کومل چہکنے لگی ''بھائی کی بیوی میں خود ڈھونڈوں گی.....'' کنول جو سر جھکائے کھانا کھا رہی تھی۔ کومل کی بات سنتے ہی اس نے ہاتھ روک لیے۔

کومل کی بے تحاشا بھری پلیٹ دیکھ کر میں بولا ''لگتا ہے لوگ ٹرپ پر صرف پیٹ پوجا کے لیے آتے ہیں۔''

کومل سن کر پہلے تو سر جھکائے اپنی پلیٹ کو کچھ دیر گھورتی رہی، پھر سر اٹھا کر ماتھے پر شکنیں ڈالے مجھے گھورنے لگی۔

بولی ''مجھے سارا پتا ہے میری بات کر رہے ہیں۔ اگر یہ سوچا ہے مجھے نظر لگ جائے گی تو ہزار بار نظر لگا لیں۔ مجھے کچھ نہیں ہوتا.....'' پھر ماں سے تائید مانگی ''مجھے پہلے کبھی نظر لگی ہے۔ نہیں لگی ناں.....'' پھر پلیٹ کو تھوڑا سا اپنی طرف کھسکا لیا۔

ماں نے کہا ''تمہیں کئی بار سمجھایا ہے نظر برحق ہے۔ اتنی ضدی ہے کہ مانتی ہی نہیں.....''

بولی ''دیکھیں امی۔ نظر لگتی تو پہلے انگریزوں کو لگتی۔ کتنے سوہنے اور چٹے ہوتے ہیں۔ کھاؤ پیو اور موج اڑاؤ۔ کچھ نہیں ہوتا.....''

میں نے بتایا ''ہاں۔ الاؤں بلاؤں کو کہاں لگتی ہے۔''

''کیا.....؟'' چیخ کر بولی ''امی دیکھیں مجھے بلا اور معلوم نہیں کیا کیا کہہ رہے ہیں.....''

''تم کو تو نہیں کہا۔ صرف یہ کہا ہے کہ بلاؤں کو بھی نہیں لگتی'' میں نے صفائی دی۔

''صاف لگ رہا ہے مجھے بلا اور چڑیل بولا ہے۔ کیوں امی.....''

میں نے کہا ''صرف یہ کہا کہ عادتیں ملتی ہیں۔ ویسے بلا کہنے کی ضرورت کہاں ہے.....''

''سب سمجھتی ہوں آپ کی چالاکیوں کو' اور یہاں کیوں کھڑے ہیں۔ اپنی ٹیبل پر جائیں۔ میرے کھانے کا وقت ہے.....''

''تم اپنا کھانا کھاؤ۔ میں نے کون سی تمہاری پلیٹ چھین لینی ہے۔ بلی کے منہ سے کوئی نوالہ چھین سکتا ہے.....''

''مجھے بلی بھی کہہ رہے ہیں..... میری ساری بھوک مار دی۔ سوچا تھا جی بھر کے مزے سے کھاؤں گی۔''

''جلدی سے کھاؤ۔ سارا کھانا بھی ٹھنڈا کر دیا ہے.....'' میں بولا۔

''دیکھ لیں بھائی۔ آپ کی دلہن میں نے ہی تلاش کرنی ہے۔'' بڑے معنی خیز انداز سے بولی۔

میں خاموش ہو گیا۔

اس کی والدہ نے کہا ''پیر صاحب سے بات کی ہے؟''

میں نے سوچے سمجھے بغیر کہا ''جی بات کر لی ہے۔''

مسکراہٹ سجا کر پوچھا ''پھر کیا کہتے ہیں.....''

''کہتے تمہاری دلہن کے لیے ایک خاص وظیفہ کروں گا۔ بس دو چار سال صبر کر لے۔''

وہ قدرے غصے میں بولیں ''میں اپنی بات کر رہی ہوں کہ مجھے ٹائم کب دیں گے..... اور ادھر تمہیں اپنی شادی کی پڑی ہے.....''

''آنٹی وہ تو آپ نے لطیف سے کہا تھا۔ وہی بات کرے گا.....''

اس سے پہلے وہ کچھ کہتیں کہ خوش قسمتی سے لطیف اسی دوران آ گیا۔

ان کے پوچھنے پر لطیف نے بتایا کہ وہ ابھی عشاء پڑھ رہے ہیں، کھانے کے بعد ان سے بات کروں گا۔

وہ کہنے لگیں ''بس ایک بار تمہارے انکل اور بچوں پر دم کر دیں۔ تعویذ کے علاوہ کچھ پڑھنے کے لیے بھی دے دیں۔ نذرانہ دینے کے لیے بھی میں تیار ہوں۔''

لطیف جھلا کر بولا ''پہلے بھی کہا ہے وہ نذرانے وغیرہ نہیں لیتے۔ انہیں پیسوں کی لالچ کبھی نہیں رہی.....''

کومل نے کھاتے کھاتے مشورہ دیا ''ان کا مزار بھی تو بنانا ہے۔ رکھ لیں اس کے کام آئیں گے۔''

مجھے ہنسی آ گئی۔ کنول اور اس کے والد منہ دبائے بیٹھے تھے اور کومل اپنے کھانے میں مشغول رہی۔ والدہ بگڑ کر بولیں.....

''تیری زبان قینچی کی طرح چلتی رہتی ہے۔ کسی کا احترام تو دل میں ہے ہی نہیں۔ تو چل کمرے میں۔ بتاتی ہوں تمہیں کہ پیسے کہاں خرچ کرنے ہیں.....''

کومل تو بات سنی ان سنی کر کے اپنے کھانے میں لگی رہی اور ماں اس پر اپنے دانت پیستی رہیں۔

لطیف نے ان کی توجہ بدلنے کے لیے کہا ''آئندہ پلیز پیسوں کی بات مت کریں۔ پیر سائیں تو کمرے میں

مصلے پر بیٹھے ہیں مگر ان کا جاسوس چاچا شفیع ادھر ہی پھر رہا ہے۔ وہ سائیں کو ساری خبریں دیتا ہے۔''

یہ سننا تھا کہ انہوں نے پہلے بہ آواز بلند سلام کر ڈالا اور اسی دوران سر پر دوپٹا بھی کس لیا اور ساتھ ہی بیٹیوں کو بھی سر ڈھکنے کی تلقین کر دی۔ کنول کے والد مسکراتی نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔

کنول کی والدہ نے دونوں بیٹیوں کو یہ تاکید بھی کی۔ ''یہاں سے آتے جاتے ہر وقت سر ڈھانپ کر رکھنا' اور آہستگی سے سلام کر دیا کرو.....''

کومل کچھ کہنے لگی تھی مگر ماں کی تیکھی نظروں کا لحاظ کر لیا۔

پھر اس کی والدہ نے آہستگی سے پوچھا'' ویسے ہی پوچھ رہی ہوں۔ سارا دن یہاں بیٹھے کیا کرتے رہتے ہیں؟''

میں نے کہا'' فارغ جن پورا دن کیا کرے گا۔ یہیں بیٹھ کر ''ڈان'' اخبار پڑھتے رہتے ہیں۔ کبھی باہر جا کر ٹانگیں سیدھی کر آئے۔ چلم بھی پیتے ہیں۔ کسی کھڑے پر بیٹھ کر چلم کھینچ لی۔ بس اسی طرح سے ٹائم گزارتے ہیں.....''

پہلے تو میرے چہرے کا بغور مطالعہ کرنے لگیں۔ مگر اسی دوران شوہر کا قہقہہ بلند ہوا تو مجھ پر چڑھائی کر دی.....

''اگر اللہ نے عقل دے ہی دی ہے تو اس کا استعمال بھی کر لیا کرو۔ اس علم کا کیا فائدہ جو اپنی اصلاح بھی نہ کر سکے۔ تم لوگ بڑا بڑا اس لیے بولتے ہو کہ پیر صاحب کا دست شفقت سر پر ہے... ورنہ دیکھتی آواز کیسے منہ سے نکلتی ہے..... فوراً معافی مانگو۔''

''آنٹی معاف کر دیں.....''

غصے میں کہا'' مجھ سے نہیں چاچا سے مانگو۔ بلکہ دونوں مانگیں.....''

''دونوں کون..... میں اور کومل.....؟''

''نہیں تم اور کنول کے ابا اور کومل تم بھی.....''

میں بولا'' اس وقت وہ باہر حقہ پینے جاتے ہیں۔ لگتا ہے ابھی یہاں نہیں ہیں۔ بات یہیں دبا دیتے ہیں.....''

مجھے وہ غصے بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے زیر لب کچھ پڑھتی بھی جا رہی تھیں۔ میں سر جھکائے وہاں سے کھسک آیا۔ سیدھا میں کمرے کی طرف بھاگا کہ سائیں کو حالیے سے آگاہ کر دوں۔ دیکھا تو وہ جانماز پر بیٹھے تھے۔ سلام پھیرا تو میں نے ان سے کہا۔

''اس کی والدہ تو آپ کی بیعت کرنے پر تیار بیٹھی ہے۔ کسی طرح سے آج ٹال دیں۔ کہہ دیں کہ رات کو کوئی خاص وظیفہ کرنا ہے.....''

تند خو لہجے میں بولے'' زیادہ ٹرٹر نہ کر' ورنہ یہیں چیر کر رکھ دوں گا.....''

''استاد جی سمجھا کریں ناں۔ کہہ دیں کل رکھوں گا۔ آپ کے یہ کہنے سے میرا کام بن جائے گا.....''

''جندڑی مجھے یہ بتا کہ تمہارا سارا کام میں نے کیا ہے۔ کئی وظیفے کیے۔ جب کام ہو گیا تو اب ان کا گھر داماد بن بیٹھا ہے... اور مجھ کو سمجھاتا ہے کہ یوں کر اور یوں نہ کر ..... ہیں؟''

میں سائیں کے گھٹنے سے لگ بیٹھا'' کل ہم سب لالہ زار جا رہے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ بھی ہمارے ساتھ جائیں۔ پہلے ہم کل کا کہیں گے اور پھر کہیں گے کہ ہم تو لالہ زار جا رہے ہیں۔ بس یہی کرنا ہے۔ اس کی والدہ بھی دیکھنا لالہ زار کے لیے تیار ہو جائیں گی.....''

پھر سائیں سودا بازی پر اتر آیا'' پھر تو بھی ایک وعدہ کر.....''

''حکم سرکار.....''

''امتحانوں میں میرا پریکٹیکل کرائے گا؟ سودا منظور ہے تو بات پکی۔ ورنہ میں کہتا ہوں کہ کل کا دن کوئی سفر نہیں کرنا ہے۔''

میں مسکرانے لگا۔ بولا'' استاد جی۔ پہلے بھی تو کراتا رہا ہوں.....''

'' جندڑی نخرے بھی تو بہت کیے تھے۔ تلی مچھی بھی ایک کلو تم دونوں کھا گئے تھے۔''

میں نے بات فائنل کرتے ہوئے کہا'' ٹھیک ہے سودا پکا۔ مگر یہاں بھی کام پکا ہونا چاہیے۔''

پھر پلنگ پر پڑی ایک کالی پگ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔'' یہ آج باندھنی تھی۔ کپڑے بھی استری کیے۔ اب پگ باندھ کر لالہ زار تو نہیں جا سکتا۔ آج دم کا موڈ بھی تھا.....''

''کوئی بات نہیں مرشد۔ آج یہی باندھ کر باہر آئیں۔ رونق لگ جائے گی... اور رعب علیحدہ پڑے گا .....''

سائیں بولا'' ٹھیک ہے۔ میں تو سوچ رہا تھا ٹور پر پہننے کا موقع نہیں ملے گا۔''

''اور استاد جی کوئی مشک بھی لگا لیں.....''

جانماز سے اٹھتے ہوئے بولے ''تو اب نکل۔ میں تیار ہو کر آتا ہوں اور باہر کا ذرا ماحول بھی بنا.....''

☆☆☆

کھانے کی میز کے گرد دم بیٹھے سائیں کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ جان بوجھ کر اپنی اہمیت بڑھانے کے لیے اپنا انتظار کروا رہے تھے۔ پھر سائیں جب ڈائننگ ہال میں داخل ہوتو ان کی وضع قطع دیکھ کر ہم سارے ششدر رہ گئے۔ سفید براق شلوار قمیص پہنے تھے۔ سیاہ پگڑی سر پر رکھی تھی۔ چمکتی ہوئی سیاہ پشاوری چپل پہنی تھی۔ کلائی پر تسبیح لپیٹے تھے۔ کوئی خاص خوشبو لگائی تھی۔ چہرے پر تیل لگایا تو وہ چمک رہا تھا۔ بھاری بھرکم شخصیت کا رعب تو پہلے ہی سے تھا بھی تو کنول کی والدہ انہیں قریب پا کر بے ساختہ ادب سے اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔ سائیں نے سر کو خفیف سی جنبش دی اور دھیمے دھیمے چلتے میرے قریب آ بیٹھے۔ نظریں میز پر رکھے تھے اور چہرے پر سنجیدگی چھائی تھی لڑکیاں بھی کرسی چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ جب یہ بیٹھ گئے تو وہ بیٹھیں۔ ہم دوست ایک دوسرے کو مسکرا کر چوری چھپے دیکھ رہے تھے۔

میں نے پوچھا ''استاد جی کھانا منگوائیں.....؟''

''ہاں ہاں۔ بسم اللہ کریں.....''

فرید نے ویٹر کو کھانا لگانے کا کہہ دیا۔ اتنے میں سائیں نے ڈائننگ ہال کے کونے پر نظر ڈالی۔ مجھ سے پوچھا ''چاچے شنیع کو باہر تم نے بھیجا ہے.....؟''

میں نے بتایا ''ہاں..... کہہ رہا تھا کش لگا کر ابھی آتا ہوں.....''

میری سرزنش کی ''ٹرپ پر اپنے ساتھ اس کو بھی اپنے جیسا کر دیا ہے۔ ڈیرہ میں کبھی تمباکو کو اس نے ہاتھ نہیں لگایا۔''

لطیف نے کہا ''سختی صرف ہم پر ہے۔ چاچے کو کھلی چھٹی دی ہوئی ہے.....''

سائیں گمبھیر آواز میں بولا ''ساری رات پہرہ دیتا ہے۔ تم تو سوئے ہوتے ہو اور وہ جاگتا ہے۔ اگر ٹرپ پر دھواں لگا ہی لیا تو تم لوگوں کو اعتراض کا حق نہیں پہنچتا۔ آج سب غور سے سن لیں کہ چاچے کی وفاداری پر آئندہ کوئی شک نہ کرے.....''

فرید نے کہا ''شاہ کا قدیم قبرستان) سے خبر نکلی ہے کہ چاچا اپنی وفاداری بدلنے والا ہے۔ دھوپ سڑی والے پیر سے دو ملاقاتیں بھی ہو چکی ہیں۔ سائیں آپ نے نظر نہیں رکھی.....''

سائیں نے تمسخرانہ انداز میں کہا ''وہاں میں نے خود دو تین بار سنیہہ (پیغام) دے کر چاچے کو بھیجا تھا اور ادھر پورے شہر میں افواہوں کا بازار گرم ہو گیا۔''

''سائیں آپ نے اعتبار کیا اور ادھر دوسرے نے ہاتھ دکھا دیا۔ بات تو پورے علاقے میں یہ بھی گرم ہے کہ چاچا ٹرپ کے بعد پارٹی بدلنے والا ہے.....''

سائیں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا ''پیروں کے معشوق اور ان کے جن بھی دغا نہیں کرتے۔ اب زیادہ کوئی ٹرٹر نہ کرے.....''

شہزاد نے استفسار کیا ''جو بلاگر میوں میں چھت پر ملنے آئی تھی، وہ ابھی تک ہے کہ چلی گئی؟''

''سال پہلے اسے نکال دیا تھا۔ ٹی بی ہو گئی تھی اسے۔ وبا پھیلنے کا خطرہ تھا.....''

''اب کہاں ہے.....؟''

فرمایا ''سری لنکا اسے علاج کے لیے بھیجا ہے.....''

''یہاں سے کیوں نہیں کروایا.....؟''

''اس کی بہن وہاں رہتی ہے۔ سوچا اس سے بھی مل آئے گی.....''

امتیاز نے پوچھا ''اس کی جگہ تو خالی ہو گی.....''

ڈپٹ کر بولے ''تم نے اس کی جگہ بیٹھنا ہے.....؟''

شہزاد بولا ''لگتا ہے سائیں آج غصے میں ہیں.....''

لطیف نے شہزاد کو سمجھایا ''یہ کہتے ہیں جلال میں ہیں۔ یہ نہیں کہتے کہ غصے میں ہیں.....''

فرید نے گرہ لگائی ''غصے میں تو بھوک نہیں لگتی۔ جلال میں لگتی ہے.....؟''

سائیں نے ترچھی نظروں سے میری جانب دیکھ کر نظروں نظروں میں شکایت کی کہ فرید تیرے استاد کی گت بنا رہا ہے اور ایک تو ہے جو خاموش بیٹھا ہے۔ ہم سب دوستوں نے فیصلہ کر رکھا تھا کہ کسی دوسرے کے سامنے سائیں کی کم نہیں دیں گے اور نہ ہی اس کے ''علم'' کا پردہ چاک کریں گے۔ لہٰذا میں نے فرید کو اشارہ کر کے خاموش کر دیا۔

☆☆☆

کھانے کے بعد سائیں اپنے کمرے میں چلے گئے کنول کی والدہ بے بسی سے سائیں کو ہاتھ سے پھسلتے دیکھ

رہی تھیں۔ وہ تو سمجھ رہی تھیں کہ کھانے کے بعد سائیں سے ملاقات ہوگی، کوئی دم درود کی محفل جمے گی۔ انہوں نے ابھی تک قہوہ بھی نہیں پیا تھا۔ لطیف اور میں ان کے ساتھ جا کر بیٹھ گئے۔ ہمارے ہمراہ طاہرہ اور ثروت بھی آگئیں۔ اس کی والدہ لطیف کو استفساریہ نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ لطیف نے انہیں بتایا.....

''پیر سائیں نے آج کوئی خاص وظیفہ پڑھنا ہے۔ ہمیشہ تو یہ وظیفہ قبر میں بیٹھ کر پڑھتے مگر اب مجبوری کے باعث کمرے میں پڑھیں گے۔ فرما رہے تھے کہ کل بیٹھ کر گفتگو کریں گے.....''

''کوئی بات نہیں بیٹا۔ ملاقات کل کر لیں گے.....'' اس کی والدہ نے کہا۔

طاہرہ بولی کہ کل تو ہم لالہ زار جا رہے ہیں۔

اب وہ سوچ میں پڑ گئیں۔

کومل ماں سے بولی ''امی پرسوں کی بجائے کل ان کے ہمراہ لالہ زار چلے جاتے ہیں۔ اکٹھے مزہ بھی آئے گا۔''

''مجھے کیا اعتراض ہوسکتا ہے میری بچی.....'' پھر ہمدردی بھری نظر شوہر پر ڈالی ''مجھے تو ان کی فکر ہے۔ دیکھتی نہیں تمہارے باپ کا گ کیسا پڑ گیا ہے۔ سوچا کہ ایک دن انہیں آرام دے دوں.....''

کنول کے والد نے کہا ''مجھے تو کوئی اعتراض نہیں۔ کمرے میں نہیں تو وہیں جا کر لیٹا رہوں گا.....''

اس طرح سے وہ لوگ بہ آسانی ہمارے ساتھ جانے پر تیار ہوگئے۔ قہوہ پیتے ہوئے اس کی والدہ بتا رہی تھیں کہ لاہور میں گرمی بہت ہے۔ ہمارا ارادہ یہاں دو تین دن آرام کرنے کا ہے۔ وہاں چلے گئے تو اگلے دن یہ آفس پہنچ جائیں گے۔ یہاں ان کو بھی آرام مل جائے گا اور میری بیٹیوں کی بھی تو نئی سہیلیاں بن گئی ہیں۔

یہ سن کر طاہرہ خوشی کے مارے کنول سے لپٹ گئی۔ خود کنول کا اپنا چہرہ بھی خوشی سے دمکنے لگا۔ وہ نظریں بچا کر مجھے دیکھتی تو اس کی آنکھیں مسکراتی نظر آتیں۔

طاہرہ اس کی والدہ سے کہنے لگی ''آنٹی آپ کی یہ بیٹی بہت پیاری اور بہت سادہ بھی ہے۔ خاموش بہت رہتی ہے.....ہم تو پکے دوست بن گئے ہیں۔''

وہ کہنے لگیں ''یہ میری بڑی نصیبوں والی بیٹی ہے۔ کبھی مجھے کومل کی طرح تنگ نہیں کیا۔ جو ملا کھا لیا اور پہن لیا۔ یہ تین سال کی تھی کہ اس کے بابا کا لندن میں اسکالرشپ ہوگیا۔ یہ دو سال وہاں اسکول بھی گئی۔ ٹرپ پر اداس اداس پھر رہی تھی۔ اسے تو چپ لگ گئی تھی۔ ہم بہت پریشان تھے۔ بیٹھی ہوتی تو رونے لگتی۔ شکر ہے تم لوگ آگئے۔ اب دیکھو چہرے پر، ماشاللہ، رونق بھی ہے۔''

طاہرہ اور ثروت میرا چہرہ دیکھنے لگیں۔ میں اور کنول ایک دوسرے کو مسکراتی نظروں سے دیکھنے لگے۔

کومل شرارت سے میری جانب دیکھ کر بولی ''ہمارے چہرے پر بھی تو بہت رونق ہے۔ ہماری تو کوئی تعریف بھی نہیں کرتا۔''

میں نے طاہرہ سے کہا کہ کچھ اس کی بھی تعریف کردو۔ یہی کہہ دہ کتنی معصوم اور کتنی نیک پروین ہے۔ ہر وقت نظریں جھکائے رہتی ہے۔

کومل بولی ''میری کوئی تعریف نہ کرے۔ مجھے تعریف کروانے کا شوق بھی نہیں۔ اس سے کوئی پیٹ بھرتا ہے۔ بلکہ الٹا نقصان کہ ہر وقت اچھا بننے کی اداکاری بھی کرو۔ نہ بھائی میں تو ایسے ہی بھلی۔''

میں کومل کو باتوں میں چھیڑتا رہتا تھا۔ اس کی بے ساختہ باتیں مجھے بہت مزہ دیتیں۔ اس کے والدین بھی جانتے تھے کہ میں اس کی باتوں سے لطف لیتا ہوں۔

میں نے اس سے پوچھا کہ پھر چہرے سے اتنی اداسی کیوں ٹپک رہی ہے؟

پہلے تو ہنس کر ایک زوردار تالی بجائی ''میں اور اداس۔ امی آپ بتائیں میں کبھی اداس ہوئی ہوں.....نہیں ناں؟'' پھر مجھ سے مخاطب ہوئی ''دیکھ لیا؟ نہ مجھے کوئی اداس کرسکتا ہے اور نہ خوش۔ کومل خوش تب ہے جب تین وقت کا اچھا کھانا ملتا رہے۔ نہ پڑھائی ہو نہ گھر کا کام ہو اور لمبا سونا ہو۔ ٹھیک کہہ رہی ہوں ناں امی.....''

ماں منہ پھیرے خاموش بیٹھی رہیں۔

میں نے پوچھا ''کتنا کھاتی ہو۔ معلوم نہیں موٹی کیوں نہیں ہوتی.....؟''

''جلتے رہیں آپ۔ سارا کھانا کھاؤں گی اور آپ کا بھی کھا جاؤں گی۔ آپ دیکھیں گے پھر بھی موٹی نہ ہوں گی۔ جو کرنا ہے کرلیں..... ہے ناں امی؟''

وہ ہر بات کے آخر میں اپنی ماں کی تصدیق ضروری سمجھتی تھی۔ ماں ... کبھی اس کی بات کا جواب دیتیں اور اکثر نہیں..مگر کومل ماں کی پوری توجہ اپنی جانب ضرور رکھتی۔

آج بیٹھا سوچتا ہوں کہ ماں بیٹیوں کی دوستی کی کیا

خوبصورت سی یہ نشانی تھی۔

میں نے اس سے کہا۔ ''مجھے تو لگتا ہے تم پر کوئی جن ہے۔ تم اس کا حصہ بھی کھاتی ہو۔ پیر صاحب سے کہوں گا کل تم کو بھی کوئی دھونی دیں.....''

تالی بجا کر پہلے تو خوب ہنسی، پھر ہنسی کے دوران بمشکل بولی۔ ''یہ دم مجھ پر کوئی اثر نہیں کرتے۔ امی بہت رکھوا چکی ہیں۔ کچھ اثر ہوا؟ نہیں ہوا ناں۔ کیوں امی.....؟''

''چپ کر جا کومل چپ کر جا۔ بول بول کر میرا دماغ بھی کھا گئیں۔ کسی کوے کا جھوٹا کھایا ہے؟''

وہ میری جانب دیکھ کر بولی۔ ''پہلے ان کو چپ کرائیں۔ صبح سے میرے پیچھے پڑے ہیں۔''

اس کی ماں نے مجھ سے کہا۔ ''بیٹا تو ہی چپ کر جا۔ ورنہ تیرا مغز بھی کھا جائے گی۔''

''آنٹی میں تو صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ پورے ٹرپ میں اسے سب سے زیادہ کیا پسند آیا۔ ایسی کوئی چیز جو اسے بار بار یاد آئے گی۔''

فوراً مجھ سے احوال بانٹنے لگی۔ ''مری کے چپلی کباب اور گرم روٹیاں۔ اس کے علاوہ سیسل ہوٹل میں آلو کی ٹکیاں۔ ہائے منہ میں پانی آ گیا ہے.....''

ہنستے ہنستے میں دوہرا ہو گیا۔ ابھی ڈنر کر کے قہوہ پی رہی تھی اور منہ میں پانی بھی آ گیا۔ میں بولا۔ ''میرا مطلب تھا جگہ کون سی اچھی لگی.....؟''

فٹ سے بولی۔ ''جگہ تو وہی اچھی ہوتی ہے جہاں سے کھانا اچھا ملے... ورنہ پہاڑوں، جھیلوں سے پیٹ بھرتے ہیں ..... کیوں امی؟''

لطیف نے پوچھا۔ ''کھانے کے علاوہ کون کون سے مشاغل ہیں.....؟''

''کوئی خاص نہیں۔ پڑھائی اور کالج کے علاوہ سونا، ٹی وی دیکھنا اور گھر کا کام بھی کبھار ہوتا ہے۔ سہیلیاں آ جاتی ہیں تو وی سی آر پر کوئی مووی دیکھ لیتے ہیں۔ بابا سے باتیں کرتی ہوں۔ ہے ناں امی.....؟''

''پڑھائی میں کیسی ہو.....؟''

''کوئی خاص نہیں۔ اویں ہی پاس ہو جاتی ہوں.....''

میں نے کہا۔ ''آنٹی آپ کی دونوں بیٹیوں میں بڑا فرق ہے.....''

جواب کومل نے دیا۔ ''شکر ہے اس کی طرح نہیں ہوں۔ ہر وقت اداس اداس۔ چلو اداس ہو جاؤ مگر کھانا پینا تو نہ چھوڑو' اور یہ جناب اداس ہو کر شاعری کرنے لگتی ہیں۔ اور شاعری بھی رونے والی۔ کبھی کمرے میں ہو رہی ہے اور کبھی لان کے کونے میں بیٹھے شاعری لکھ رہی ہے۔ قسم سے انتہائی بور.....''

''اگر تم اداس ہو تو کیا کرتی ہو.....؟''

تالی بجا کر ہنسی اور بولی۔ ''میں جس حالات میں ہوں میری بھوک بڑھ جاتی ہے۔ ہے ناں امی.....''

ثروت نے کنول سے پوچھا۔ ''تم نے بتایا نہیں کہ شاعری بھی تمہیں پسند ہے.....''

وہ سن کر صرف مسکراتی رہی۔

''کوئی شعر سناؤ ناں.....''

وہ انکار کرنے لگی۔ پھر طاہرہ نے بھی ثروت کا ساتھ دیا مگر وہ انکار کرتی رہی۔

کومل بولی۔ ''گھر میں شعر سنانے کے لیے ہر ایک کے پیچھے بھاگتی رہتی ہے۔ آخر شامت بابا کی آتی ہے.....''

مگر کنول نے کسی کی بات نہ مانی... مگر جب باپ نے کہا تو مان گئی۔

عکس خوشبو ہوں بکھرنے سے نہ روکے کوئی
اور بکھر جاؤں تو مجھ کو نہ سمیٹے کوئی
کانپ اٹھتی ہوں میں یہ سوچ کر تنہائی میں
میرے چہرے پہ تیرا نام نہ پڑھ لے کوئی
کوئی آہٹ کوئی آواز کوئی چاپ نہیں
دل کی گلیاں بڑی سنسان ہیں آئے کوئی

سنانے کا انداز ایسا تھا کہ میں لہجے کی چاشنی میں ڈوب کر رہ گیا۔ اس کے محاسن ایک ایک کر کے سامنے آ رہے تھے۔ خوبیاں پرتوں میں کھل رہی تھیں۔ میرے چہرے کو پُرمسرت دیکھا تو آنکھیں اس کی چمک اٹھیں۔ اپنی ادا کی داد میری آنکھوں سے وصول کرنے لگی۔ سارے اشعار اس کی آنکھوں میں جگنوؤں کی صورت چمکنے لگے۔ چند خیام کی رباعی بنا تو آنکھیں غالب کی غزل بن گئیں۔

مجھے بے خود دیکھا تو بولی۔ ''اب آپ بھی کچھ سنائیں.....''

کنول کی فرمائش سن کر میں گھبرا گیا۔ میں ہرگز تو نہیں کر رہا تھا کہ وہ اپنے والدین کے سامنے مجھ سے اشعار سننے کی فرمائش کرے گی۔ میں اس کو حیرت سے دیکھنے لگا۔ وہ مسکراہٹ دبائے اپنی چمک دار آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

''میں کیا سناؤں.....؟''

اس کے والد بولے'' ساحر لدھیانوی کو تو پڑھا ہوا اسی کے ایک دو شعر سنا دو۔''

کنول میرا منہ تکنے لگی۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ میں اب [illegible] کیا ہوں۔ خود کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا اور اب نرغے [illegible] آ گیا ہوں۔

''انکل پھر کبھی سناؤں گا.....''

''پھر کیوں؟ ابھی سناؤ۔ میری بیٹی نے سنایا ہے اور [illegible] ہو.....''

کنول تو اتر سے میرا چہرہ دیکھے جا رہی تھی۔ میں نے [illegible] کی شکنیں چہرے پر سجالیں۔ کنول نے صورتِ حال [illegible] کی کوشش کی'' بابا رہنے دیں، بعد میں سنا دیں [illegible]

[illegible] نے کہا'' بعد میں نہیں ابھی سنائیں گے۔ [illegible] پڑا ہے۔''

[illegible] والد نے کہا'' کوئی مقابلہ نہیں دونوں میں۔ [illegible] سنانے ہیں.....''

[illegible] والدہ بولیں'' ہم سے تو کہہ رہے تھے اس کو [illegible] لو پڑھا ہے۔ اگر واقعی پڑھا ہے تو سناؤ.....''

[illegible] لدھیانوی کی یہ مشہور نظم سنائی

[illegible] والوں کے جھروکوں کو سجانے والی
[illegible] والوں میں میرا گزر ہے کہ نہیں
[illegible] اپنی نگاہوں سے بتا دے مجھ کو
[illegible] انسان کے مقدر میں سحر ہے کہ نہیں
[illegible] کی رفاقت جو رفاقت ہی نہیں
[illegible] لیے آزار ہوئی جاتی ہے
[illegible] ہمیشہ سے پریشان سی تھی
[illegible] سانس گراں بار ہوئی جاتی ہے
[illegible] ہوئی نیندوں کے شبستانوں میں
[illegible] کے پیکر کی طرح آئی ہے
[illegible] کبھی غیر نظر آتی ہے
[illegible] کی صورت کبھی ہر جائی ہے
[illegible] نہیں ہے میرا لیکن پھر بھی
[illegible] پیار کروں یا نہ کروں
[illegible] تبسم سے سجایا ہے جنھیں
[illegible] اظہار کروں نہ کروں

☆☆☆

میں اور لطیف پچھلے آدھے گھنٹے سے باہر بڑے پتھر پر بیٹھے اپنے گروپ کی لڑکیوں کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ ''ہم ابھی آ رہے ہیں'' کہہ کر پچھلے آدھے گھنٹے سے اندر ہوٹل میں غائب تھیں۔ خالدہ اور نشمیرن ہمارے دوسرے دوستوں کے ہمراہ واک پر گئی تھیں۔ میں بڑے پتھر پر بیٹھا آسمان کے فراخ سینے پر چمکتا چاند دیکھ رہا تھا۔

ساحر لدھیانوی کی نظم سنانے کے بعد میں نے سب سے داد سمیٹی، مگر کنول کے انہماک، آنکھوں میں اترے داد و تحسین کے ڈوروں کے علاوہ چہرے کی چمک نے مجھے خوب حیران کیا۔ میرا مرتبہ میری نظروں میں اس نے بلند کر دیا۔ اس پر چھائی وارفتگی دیکھ کر مجھے میرا نصیب پیارا لگا۔ میرے جیسا خوش نصیب شاید پورے روئے زمین پر نہ تھا جس کو آج اتنی خوشیاں ایک ساتھ مل گئی تھیں۔ ہم جب ڈائننگ ہال سے اٹھے تو دیکھا وہ کسی پھول کی مانند کھلی ہے۔ سب داد مجھے دے رہے تھے اور خوشی بخوشی وصول وہ کر رہی تھی۔ وہ تھی کے رنگین پر پھیلائے اڑ رہی تھی۔ وہ اپنی ہر ادا سے میری پہچان کرا رہی تھی۔

ٹھنڈ آج کل سے زیادہ تھی۔ بازار میں ٹورسٹ کل کی طرح گھوم پھر رہے تھے۔ میری دل کی ہر دھڑکن کنول کی ہر سانس سے جڑی تھی۔ اس موجودگی کا احساس بھی مجھے اڑائے پھرتا تھا۔ میری خوشی میں کوئی نشہ تھا۔ میں ہوش میں بھی مدہوش تھا۔ کچھ خوش اور کچھ اداس تھا۔ کبھی کچھ دیکھنے لگتا کبھی کچھ سوچنے لگتا۔ ہوا جب گدگداتی تو خیال اسی کی جانب جاتا۔ راستے میں بچھی چاندنی دیکھتا تو چہرہ اس کا یاد آتا۔ کوئی پاس سے ہنستا ہوا گزرتا تو دل کنول کے لیے دھڑکتا۔ وہ پاس تھی مگر اس کی یاد ستاتی تھی۔ لطیف سے بات کرتا یا خود سے مگر توجہ اس کی ہوتی۔ خوبصورت لوگ تھے، خوبصورت وادی اور خوبصورت مناظر تھے۔ خوبصورت فضا تھی اور خوبصورت محبت تھی۔ وہاں صرف میں تھا اور صرف وہ تھی۔ چاندنی جو پہلے اداس تھی وہ دمکنے لگی۔ دھند جو پہلے چھائی تھی وہ غائب ہوگئی۔ زمین و آسمان آئینے کی مانند شفاف ہو گئے۔

میرے اور کنول کے پاس یہی دو تین دن تھے اور ان دنوں کے ہر پل کا میں نے حساب رکھنا تھا۔ ہر پل ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ رہنا تھا۔ میں کچھ نہیں گنوانا چاہتا تھا۔ جو اپنی دسترس میں تھا وہ سب اس پر لٹانا چاہتا تھا۔ اپنا سب کچھ اسے بخشنا چاہتا تھا۔ مجھ میں اس سے پہلے کوئی

تشنگی نہ تھی مگر اس کے اس ساتھ اور خیال نے اسے بڑھا دیا تھا۔ چند روز بعد اس نے مجھ سے بچھڑ جانا تھا۔ چند روز بعد یہ ہوائیں یہ فضائیں سسکیاں بھرتی نظر آتیں۔ اجنبی راستوں سے آئی کنول نے اجنبی راہوں پر کھو جانا تھا۔ طاہرہ کی بات میں سمجھنے کے باوجود نہیں سمجھنا چاہتا تھا کہ کسی اجنبی لڑکے کو کوئی باعزت خاندان اپنی لاکھوں میں ایک بیٹی کا ہاتھ کیونکر تھمائے گا؟ اس عمر کے لڑکوں کو کوئی عزت سے پانی بھی پوچھ لے تو یہ بھی بڑی بات ہوتی ہے اور تم اس لڑکی کا سوچ رہے ہو جو چاند پر رہتی ہے۔

مل کر جدا ہوئے تو نہ سویا کریں گے ہم
ایک دوسرے کی یاد میں رویا کریں گے ہم

میں نے اپنے دل میں ایک مصمم ارادہ کر رکھا تھا کہ غزالہ کی طرح میں نے اسے نہیں کھونے دینا۔ اسے دنیا کی بھیڑ میں کہیں گم نہیں ہونے دینا۔ میں اس کے ساتھ ایک مضبوط رابطے میں رہنا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ میرے ارادوں کو کوئی کمزور نہیں کر سکتا تھا۔ کنول کے چہرے کا اعتماد میرا حوصلہ بڑھا جاتا۔ اگر وہ چار پانچ سال کا وقت کاٹ جاتی تو اسے مجھ سے کوئی جدا نہیں کر سکتا تھا۔ یہاں قسمت اور حالات نے وہ یاوری کی کہ میں اس کے گھرانے کے قریب تر ہوتا گیا۔ اس کے والدین مجھے اچھی نگاہ سے دیکھنے لگے تھے۔ میں نے اپنے اس تاثر کو قائم رکھنے کے علاوہ بڑھانا بھی تھا۔

لطیف نے مجھ سے کہا کہ اس عمر کی محبتوں میں شادی نہیں ہوا کرتی۔ صرف شغل میلہ ہوتا ہے۔ میں اس سے پوچھتا کہ ان عمروں میں ایسی محبتیں کیا ہوتی ہیں۔ وہ مجھے سمجھاتا کہ کل کہیں تم کو غزالہ سے بڑا اور بوجھل دکھ نہ ملے۔

میں نے بیزار ہو کر پوچھا ''تو کیا کروں.....؟''

بولا کہ اسے سیریس نہ لو۔ لائٹ لو تاکہ بھولنے میں دشواری نہ ہو۔

میں نے پوچھا ''کس طرح سے.....؟''

وہ کوئی جواب نہ دے سکا۔ میری آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ میں سوچنے لگا کہ زندگی بھر ہم خوف کی بنیاد پر اپنے فیصلے کرتے ہیں۔ ہر ارادے میں یہ شبہ بھی ڈالتے ہیں کہ اگر ناکام ہو گئے تو کیا ہوگا؟ کیوں نہیں اپنے فیصلے اُمیدوں اور خوابوں پر کرتے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں خوابوں کی کوئی حقیقت نہیں۔ میں کہتا ہوں پھر تو خوف کی بھی کوئی حقیقت نہیں۔

اُمید ہمیں پُر اُمید تو رکھتی ہے اور خوف وہ تو ہمیں گھن کی طرح کھا جاتا ہے۔ کل کے خوف میں ہم آج کا دن برباد کر لیتے ہیں۔ اور ہمارے خوف کا کوئی وجود بھی نہیں ہوتا۔ صرف وہم ہمارے پاس ہوتے ہیں۔

میں نہ نظر آنے والی جدائی کے خوف میں نظر آنے والی آج کی محبت کو داؤ پر نہیں لگا سکتا تھا۔ نہ ملنے کے ڈر بہت تھے مگر ملنے کی ایک اُمید میرے راستے کی روشنی تھی۔ وہ اُمید کنول سے میری محبت تھی۔ میں ڈر کو پکڑ کر اُمید کو کیسے چھوڑ سکتا تھا۔ جس طرح سے مجھے وہ مری میں ملی اور پھر مری سے نتھیا گلی میں' اور وہاں سے ایبٹ آباد میں مل گئی' پھر وہاں سے ایبٹ آباد اور پھر ناران میں ہمارا ملنا کیا تھا؟ اگر اتفاق تھا تو ایسے اتفاق بعد میں بھی ہو سکتے ہیں۔ اللہ کا کوئی پلان تھا تو بات بھی ختم تھی۔ وہی اللہ ہمیں ایک دن ہمیشہ کے لیے ملا بھی دے گا۔ وہ میری دلہن بن کر ایک دن میری ہو جائے گی۔ میں خوف کی بجائے اپنا نصیب آزمانا چاہتا تھا۔

لطیف نے مجھ سے کہا ''محبت پا کر کھو دینا محبت نہ پانے سے بڑی تکلیف ہے.....''

میں نے جواب دیا۔ ''تو سمجھ نہیں رہا ہے۔ یہ کتنا خوبصورت احساس ہے آپ کسی سے پیار کرتے ہیں' اور یہ احساس کتنا حسین ہے کہ کوئی آپ کو بے پناہ چاہتا ہے۔ آپ کسی کو خیال میں رکھتے ہیں اور کوئی آپ کو اپنے دھیان رکھتا ہے۔ جو محبت کرنے لگتا ہے وہ نرم دل ہو جاتا ہے۔ وہ کسی کا دل دکھانے سے ڈرتا ہے۔ اس کا دل گداز ہو جاتا ہے۔ بندہ نیک ہو جاتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں محبت کرنا ثواب اور محبت پانا صلہ ہے' مگر میں سمجھتا ہوں کہ محبت کرنا کسی بڑی نیکی کا صلہ ہے۔ معلوم نہیں کسی کی نظر میں محبت پانا کیا ہے۔ میری نظر میں محبت کرنا ہی محبت پانا ہے۔ میرا ایمان ہے ہم پیار کر کے کئی رنگ کے پھول زمین میں لگا رہے ہوتے ہیں۔ یہ پھول ایک دن یادیں بن جاتے ہیں۔ یہ یادیں ایک دن ہماری روح میں مہکنے لگتی ہیں۔ ان پھولوں کی آبیاری ہماری اداسی کرتی ہے۔ جتنی اداسی بڑھتی ہے یہ پھول اتنا زیادہ مہکتے ہیں۔''

وہ سن کر ہنسنے لگا... بولا ''یار تو کسی لیجر میگزین میں کہانیاں لکھا کر۔ تیرے جیسے وہاں بہت ہوں گے۔''

پھر میری نظر سامنے پڑی اور میں منجمد ہو گیا۔ لگا میں اپنے ہوش کھو بیٹھا ہوں.....

(جاری ہے)

# قیدی شہنشاہ

زین مہدی

برصغیر کی قسمت کا ستارہ اسی دن غروب ہوگیا تھا جب شہنشاہ ہند کی بے عزتی کے لیے عوام کے سامنے ان پر تشدد کیا گیا۔ یہ سب کچھ کیسے اور کس طرح ممکن ہوا؟ شطرنج کی بساط بن گئی سرزمین ہند پر کس نے کون سی چال چلی اسی کا خلاصہ، مختصر سی مگر بھرپور داستان۔

**تاریخ کا طالب علم رہنے میں دلچسپی لینے والوں کے لیے**

اورنگ زیب نے 1707ء میں انتقال کیا۔ اس کی آنکھیں بند ہوتے ہی بیٹوں میں تلواریں کھنچ گئیں اور ملک میں خانہ جنگی کی نوبت آ گئی۔

بہادر شاہ اوّل نے قریباً پانچ سال حکومت کی (1707ء تا 1712ء) اس نے باغی راجپوتوں اور سکھوں سے جنگ کی اور راجپوتوں کو پوری طرح کچل دیا لیکن سکھوں کا فتنہ باقی رہا جسے فرخ سیر نے کچلا۔ فرخ سیر نے چھ سال حکومت کی۔ (1712ء تا 1719ء) وہ ایک

سمجھ دار حکمران تھا پھر بھی وہ مسلمان امراء کے درمیان پیدا ہونے والے مسلکی اختلافات کو ختم نہ کر سکا وہ اختلافات جو اورنگ زیب کے وقت پیدا ہوئے تھے۔ اور ان اختلافات کا سیدھا اثر سلطنت پر پڑا۔ ایرانی اور تورانی امراء کے درمیان وسیع کھائی پہلے ہی بن چکی تھی ایسے وقت میں سید برادران نے بغاوت کا پرچم بلند کیا۔ امیر الامراء سید حسین علی اور قطب الملک سید عبداللہ کو بادشاہ گر کہا جاتا ہے۔ ان سید برادران نے قلیل وقفے میں تین بادشاہوں کو تخت نشین کرایا اور حکم عدولی کرتے ہی ان بادشاہوں کو قتل کرا دیا پھر محمد شاہ رنگیلا تخت نشین ہوا۔

بہادر شاہ اوّل کی وفات (1712ء) سے مغلیہ سلطنت کے آخری دور تک تاریخ سیاسی افراتفری' خانہ جنگی ولوٹ کھسوٹ کے ہولناک واقعات سے بھری پڑی ہے۔ بہ حیثیت مجموعی اس مدت میں جتنے بادشاہ برسر حکومت آئے وہ عیش وعشرت کے بندے اور نفس کے غلام تھے۔ وہ مئے عشرت میں سرشار' لہو ولعب میں مبتلا' رنگ رلیاں مناتے رہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مرکزی حکومت کمزور ہوتی گئی۔ 1724ء میں آصف جاہ نے دکن میں نظام سلطنت کی بنیاد ڈالی اور ادھر سعادت خاں نے اودھ میں خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ 1734ء میں علی احمد خاں نے روہیل کھنڈ کے علاقے پر خود مختار حکومت قائم کر لی۔ اس طرح مغل سلطنت کے چند ہی برس میں حصے بخرے ہو گئے۔

1775ء میں جب ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ کی پیدائش ہوئی' اس وقت 24 صوبوں میں حکومت کرنے والے بادشاہوں کا وارث انگریزوں کا پنشن خوار ہو چکا تھا پھر اس جرم میں کہ وہ الہ آباد چھوڑ کر دہلی چلا آیا تھا اس کی پنشن بھی بند کر دی گئی تھی اور دوآبہ کا علاقہ بھی چھین لیا گیا تھا۔ اس بے بسی میں بہادر شاہ ظفر کی وہ تعلیم وتربیت نہیں ہو سکی تھی جو مراد ودانیال کی ہوئی تھیں۔

اس بے چارگی نے تیمور کے جانشینوں کو اپنے شاہ زادوں کو امور حکمرانی سکھانے کے بجائے دوسرے علوم کی جانب راغب کر دیا جن میں ادب وانشاء' تصوف واخلاق' فقہ وحدیث وتفسیر شامل تھے۔

شاہ عالم کی بے بسی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ان کے دور میں جب کسی قصبے کے لوگ سرکشی کرتے اور لگان ادا نہیں کرتے تو یہ اپنے ملازموں کو سرکوبی کے لیے روانہ کرتے لیکن وہ ملازم کامیاب نہ ہوتے اور بادشاہ کا مؤرخ درباریوں لکھ دیتا کہ فلاں کو رنمک کی نمک حرامی کی وجہ سے یہ مہم کامیاب نہیں ہوئی۔ شاہ عالم کی جو ساکھ باقی تھی وہ لارڈ لیک نے 1803ء میں دہلی پر قبضہ کر کے ختم کر دی اور 1807ء میں دل شکستہ ہو کر وہ اس دار فانی سے کوچ کر گیا۔ اس کے بعد اکبر شاہ ثانی تخت نشین ہوا۔ اس کے اختیارات اور حدود سلطنت اپنے باپ سے بھی کم تھے 1837ء میں اکبر شاہ ثانی کی وفات ہوئی اور بہادر شاہ ظفر تخت نشین ہوئے۔ شہنشاہ دہلی کے احکامات پہلے ہی قلعے تک محدود کر دیے گئے تھے۔ آداب شاہانہ تو ہسٹنگز کے جانشین نے 1828ء میں ترک کر دیے تھے۔

1835ء میں جو سکے جاری ہوئے تھے ان پر شاہ انگلستان کی مورت نقش تھی۔ 1837ء میں ایلن برا نے یہ تجویز پیش کی کہ بہادر شاہ ظفر قلعہ خالی کر دے اور خطابات سے دستبردار ہو جائے۔ لارڈ ڈلہوزی نے بھی بعد کے دنوں میں ایلن برا کی تجویز پر صاد کیا اور یہاں تک کہہ دیا کہ بہادر شاہ کے انتقال کے بعد بادشاہت کا خاتمہ کر دیا جائے۔

انہی دنوں 1849ء میں شہزادہ دارا بخت (ولی عہد) نے وفات پائی اور ولی عہدی کے لیے ریشہ دوانیاں شروع ہو گئیں۔ ڈلہوزی کو اچھا موقع ہاتھ آیا اور اس نے شہزادہ فخر الدین سے بات چیت پکی کر لی کہ ظفر کے بعد اس کا خطاب شہزادگی قائم رہے گا اور وہ قلعہ چھوڑ کر قطب میں بود وباش اختیار کرے گا۔ اس سے شاہ کا لقب ترک کرنے اور شاہی محل سے دستبردار ہونے کا معاہدہ کر لیا لیکن 1856ء میں اس کا بھی انتقال ہو گیا۔

محل میں سازشوں کا بازار گرم تھا لیکن بہادر شاہ نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ وہ خود کو شعر وادب میں ڈبو کر سینے کے زخموں کو مہلا رہے تھے۔ قلعہ معلیٰ اردو کا ریسرچ سینٹر بنا ہوا تھا۔ ایسے الفاظ خارج کیے جا رہے تھے جو سنسکرت سے ٹوٹ کر آئے تھے اور ان میں صوتی حسن نہ تھا۔ ایسے الفاظ ہزاروں میں ہیں جن میں سے کچھ بطور نمونہ دیے جا رہے ہیں چاند (چند) دوا (دارو) دوسرے (دوجے) معشوق (ساجن) سورج (سرج) دنیا (سنسار) سوں (سے) کبھی (کدھی) ان کے سوا (اون سوا) آگے (اگے) اپنے (اپن) فراق (برہا) پوچھنا (بوجھنا) تمہاری (تمنا) دیکھا (دکھا) گوشت (ماس) پگھلنا (گلنا) کرتا (کیا) منہ (مکھ) دل (من) ہمیشہ (نس دن) طرح (غن) ہمیں (ہمن) تک (لگ) حالانکہ اصلاح زبان کا کام شاہ

عالم کے زمانے ہی سے جاری تھا مگر اس کام کو ترقی بہادر شاہ ظفر کے عہد میں دی گئی۔ سرکاری زبان فارسی تھی لیکن اس دور میں اردو نے رؤساء اور امراء کے درباروں میں اعتبار حاصل کرنا شروع کر دیا تھا چنانچہ سودا' میر' سوز وغیرہ کسی نہ کسی دربار سے منسلک رہے۔ ظفر کے دور میں آزردہ' مولوی امام بخش صہبائی' شاہ نصیر' ذوق' غالب' شیفتہ' نواب ضیاء الدین خاں نیر اور حکیم مومن خاں مومن جیسے سخنوران باکمال موجود تھے۔

اس دور میں دو گروہ نظر آتے ہیں۔ ایک گروہ تو ان شعرا کا تھا جو معنی آفرینی پر جان دیتا تھا' دوسرا لفظی صنعت' روزمرہ اور محاورے پر! پہلے گروہ کے حامیوں میں مومن' غالب اور شیفتہ وغیرہ تھے جبکہ دوسرے گروہ کے زمرے میں نصیر' ذوق اور ان کے متعدی! یہاں پر یہ واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ اس دور کے اکثر شعرا لکھنو کی شاعری سے متاثر نظر آتے تھے جس کے علمبردار ناسخ و آتش تھے۔ ظفر نے بھی انہی کی پیروی کی۔ مومن اور غالب بھی شروع شروع میں لکھنو کے رنگ سے متاثر ہوئے لیکن جلد ہی ان پر اس کا بے اثر ہونا ظاہر ہو گیا اور وہ اپنے اصل رنگ میں کہنے لگے۔

ظفر نے شاہ عالم کے دور میں شاعری کی شروعات کیں۔ شاہ عالم خود بھی ایک باکمال شاعر تھا۔ آفتاب تخلص رکھتا تھا۔ سودا' میر' نصیر' انشا' ممنون' احسان' قاسم اور فراق اسی کے دربار سے متعلق تھے۔

ظفر نے ابتدا میں نصیر سے اصلاح لی۔ شاہ نصیر نے فن شعر گوئی میں شاہ محمدی مائل سے تلمذ کیا تھا۔ ان دنوں شاہ نصیر کی شہرت آگرہ و لکھنو تک پھیلی ہوئی تھی۔ وہ سنگلاخ زمینوں میں شعر کہتے تھے۔ اس کا اثر ظفر کی شاعری پر بھی پڑا لیکن جب انگریزی عمل داری ہوئی تو شاہ نصیر نے 1803ء میں دہلی کو خیر باد کہہ دیا اور دکن چلے گئے۔ تب ظفر نے اصلاح کے لیے میر کاظم حسین بے قرار سے رجوع کیا لیکن وہ بھی 1808ء الفنسٹن کے ہمراہ میر منشی ہو کر دہلی سے چلے گئے۔ اب ظفر نے اصلاح کے لیے ذوق کو منتخب کیا۔ اس دوران میں انہوں نے میر عزت اللہ عشق کو بھی کئی بار اپنا کلام دکھا کر اصلاح لی تھی۔

ذوق کے بعد ظفر کے کلام پر غالب نے نظر ثانی شروع کی۔ لال قلعہ میں غالب کا باقاعدہ دخل 1850ء سے ہوا۔ اس سال ظفر نے احترام الدولہ حکیم احسن اللہ خاں کی تجویز پر غالب کو شاہان تیموری کی تاریخ لکھنے پر مقرر کیا اور مرزا انجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ کے خطاب اور خلعت سے عزت بخشی۔ غالب نے صرف تین سال ظفر کی اصلاح سخن کی خدمت انجام دی۔

تذکرہ نگاروں نے ظفر کی شاعری کے علاوہ مصوری اور خوش نویسی کی بھی کافی تعریف کی ہے۔ ایک بادشاہ کا ان چیزوں میں دلچسپی لینا تعجب خیز بات ہے۔ اس کی وجہ خود ظفر بیان کرتے ہیں۔

جوش جنگ وجدل پہنیں تو کس کے واسطے
ہم تو بیٹھے ہیں ردائے صلح کل اوڑھے ہوئے

ذہن انسانی پر مسلسل محرومی و ناکامی اور شدید رنج والم نفسیاتی اثر ڈالتے ہیں۔ ان کی شدت بعض اوقات انسان کو پاگل کر دیتی ہے یا پھر دنیا سے ایسا بے نیاز کر دیتی ہے کہ وہ تصوف کے دامن میں پناہ لے لیتا ہے۔ ظفر کے حالات اور ماحول نے ان کے دل و دماغ پر جو کاری ضربیں لگائیں شاعری اور دیگر فنون لطیفہ اسی کا ردِعمل ہے۔

جانو اپنی ظفر کہانی کہے ہے اوروں کی داستاں میں
سنو اگر اس اسیر غم سے کہیں کا جھگڑا کہیں کا دکھڑا!

کلیات ظفر کے چار حصے ہیں۔ ان میں تقریباً 1857ء تک کا کلام شامل ہے۔ چاروں حصے حمد سے شروع ہوتے ہیں۔ بغور دیکھا جائے تو پوری کلیات حزن وملال' درماندگی اور تھکن کے احساس کی آئینہ دار ہے۔ اس کی واحد وجہ مرثیہ جاہ وحشم ہے۔

خواب تھی جو زندگی جاہ و حشم میں کٹ گئی
ورنہ اپنی عمر ساری درد و غم میں کٹ گئی

یہی وجہ ہے کہ ظفر حزنیہ شاعری میں ید طولیٰ کا باعث بنے حالانکہ انہوں نے جتنے تجربات کیے اتنے تجربات اس دور کے کسی شاعر نے نہیں کیے۔ سودا اور نظیر کے علاوہ کسی اور شاعر نے ان الفاظ کا استعمال اس کثرت سے نہیں کیا جس کثرت سے ظفر نے اپنے کلام میں بھاکا' پنجابی' پوربی اور پشتو زبانوں کے الفاظ نظم کیے ہیں۔ ان کے کلام میں خاصی تعداد میں مفرد الفاظ اور مرکب مصادر بھی ملتے ہیں۔ سابقے اور لاحقے کا استعمال بھی بہ کثرت کیا۔ انہوں نے نئی بحور بھی ایجاد کیں ظفر کی یہ غزل جس کا مطلع ہے۔

زلف بھی بل اور کاکل پر خم پیچ کے اوپر پیچ پڑا
وہ ہوئی سرکش یہ ہوئی برہم پیچ کے اوپر پیچ پڑا

یہ پوری غزل فاع فعولن فاع فعولن فاع فعل کے وزن

پر ہے۔ فاع فعولن میں ''ف'' کی حرکت ہر جگہ ساکن ہوکر فعلن فعلن ہوجاتی ہے۔ ایسی بحر اردو میں ایک بھی نہیں ہے۔ ہاں ہندی میں اس سے ملتی جلتی چھند (بحر) ''منجری'' ہے۔ منجری سے ایک ''گرُھ'' کم کردیا گیا ہے... ورنہ یہی وزن اس کا بھی ہے۔ یہ تیس ماترے کا وزن ہے۔

اگر شہنشاہ معظم بہادر شاہ ظفر کو وقت دھوکا نہ دیتا تو یقیناً وہ اردو کے لیے بہت کچھ کرجاتے کیونکہ ابھی وہ اردو کے گیسو سنوار ہی رہے تھے کہ میرٹھ چھاؤنی میں آزادی کے متوالوں نے جہاد کا علم بلند کردیا۔ یہ بغاوت ایک دن میں نہیں پھیلی تھی۔ دبی دبی سی آگ کافی عرصے سے سلگ رہی تھی۔ انگریزوں نے فوجیوں کو ایسے کارتوس فراہم کیے تھے جنہیں چلانے سے پہلے دانتوں سے اس کا خول پھاڑنا پڑتا تھا۔ خول کے اندر جو گولی ہوتی تھی اس پر ایک لیس دار مادہ لگا ہوتا تھا۔ اس لیس دار مادے کے بارے میں طرح طرح کی افواہیں گردش کررہی تھیں۔ کہا یہ جارہا تھا کہ وہ مادہ سور اور گائے کی چربی کا آمیزہ ہے۔ سور مسلمانوں کے نزدیک نجس العین جانور ہے اور گائے ہندوؤں کے لیے مقدس ترین جانور۔ دونوں فریق یقین سمجھ گئے تھے کہ ان کے مذہب میں دخل اندازی ہورہی ہے۔ انہیں لامذہب بنانے کی سازش ہے۔ انہوں نے ایسے کارتوس استعمال کرنے سے انکار کردیا تھا۔ انگریزوں کے لیے یہ حکم عدولی ناقابلِ قبول تھی۔ انہوں نے سختی سے کام لیا اور ایک دستے کو چاندماری کی شروعات کرنے کا حکم دیا۔

''ہم یہ کارتوس نہیں چلائیں گے۔'' سپاہی منگل پانڈے نے چیخ کر کہا۔

منگل پانڈے ذات کا برہمن تھا۔ اس کا تعلق ایک دھارمک (مذہبی) گھرانے سے تھا۔ وہ صوبہ بنگالہ کے شہر اجودھیا (اب یہ شہر صوبہ اتر پردیش کے زیرانتظام ہے) کا رہنے والا تھا اور کافی جوشیلا تھا۔ اس نے اپنے دوسرے ساتھیوں کو للکارا اور سب مل کر انگریز افسر پر پل پڑے۔ کئی انگریز افسران کو گولیوں کا نشانہ بنانے کے بعد اس نے دہلی کا رخ کیا۔ اس کا ساتھ دینے کے لیے بہت سے سپاہی جمع ہوگئے اور وہ سب انگریزوں کا قلع قمع کرتے ہوئے طوفانی رفتار سے دہلی کی سمت بڑھنے لگے۔

یہ طوفان جب دہلی پہنچا تو وہاں والے حیران رہ گئے۔ خود شہنشاہ معظم بھی پریشان ہوا ٹھے۔ انہیں مطلق اُمید نہ تھی کہ انگریزوں سے بھی کوئی ٹکر اسکتا ہے۔ وہ حیران پریشان سے چوبارے میں کھڑے تھے اور میدان میں جمع ہونے والے سپاہیوں کو دیکھ رہے تھے۔ ایسی بدانتظامی اور شورہ پشتی انہوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ سب کے سب ایک ساتھ چیخ رہے تھے شہنشاہ سے استدعا کررہے تھے مگر کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔

''تم سب کیا چاہتے ہو؟'' ضعیف العمر شہنشاہ نے نحیف آواز میں پوچھا۔

''ہمیں آزادی چاہیے' ہم مذہب کا سودا نہیں کریں گے۔'' کئی آوازیں ایک ساتھ سنائی دیں۔

''تم لوگ صبر وتحمل سے کام لو میں انگریز بہادر سے بات کروں گا۔''

''ہم انگریزوں کو ختم کردیں گے، آپ ہمارے بادشاہ ہیں۔''

''بادشاہ وہ ہوتا ہے جس کے پاس خزانہ ہوتا ہے۔ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔''

''ہمیں کچھ نہیں چاہیے صرف آپ کا ساتھ چاہیے۔ ہم آپ کی تاج پوشی کریں گے۔ آج سے آپ ہی ہمارے بادشاہ ہوں گے۔''

یہ خواب شہنشاہ کا بھی تھا کہ بابر و ہمایوں کا دبدبہ پھر سے قائم ہوجائے' سلطنت مغلیہ کو پھر سے عروج مل جائے' کھوئی ہوئی سلطنت کا وقار بحال ہوجائے لیکن وہ یہ بھی سمجھ رہے تھے کہ ان سپاہیوں پر ابھی جوش غالب ہے اور عقل کہتی ہے جوش کے بجائے ہوش سے کام لیا جائے۔ ہوش مندی سے شہنشاہ نے پھر جواب دیا ''مجھے بادشاہ بنا کر آپ کو کیا ملے گا یقین کیجیے میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔''

''ہمیں صرف آزادی چاہیے۔'' مجمع بپھر رہا تھا۔

''ہمارے دین دھرم کے یہ دشمن ہمیں عیسائی بنانا چاہتے ہیں۔ ہم مرسکتے ہیں مگر مذہب نہیں چھوڑیں گے۔ آپ ہمارے بادشاہ ہیں' ہمارے سروں پر ہاتھ رکھیں۔''

''میں بادشاہ نہیں فقیر ہوں' گوشہ گیر ہوں۔ انہی انگریزوں کی امداد پر اپنے بچوں کو سینے سے لگائے ایک گوشے میں بیٹھا ہوں۔ بادشاہ میرے اجداد تھے جن کے قبضے میں ہندوستان تھا۔ مجھے مت ستاؤ۔ میرے حال پر چھوڑ دو۔ میرے پاس خزانہ نہیں ہے کہ تمہیں تنخواہ دوں گا' ملک نہیں ہے کہ تمہیں نوکر رکھوں گا' فوج نہیں ہے کہ امداد کروں گا۔'' بادشاہ سلامت کی آواز میں حسرت ویاس کا

عنصر کچھ زیادہ ہی تھا۔

''ہم آپ کی فوج ہیں۔ ہماری محنت آپ کا خزانہ ہے اور یہ ملک صرف اور صرف آپ کا ہے۔''

ان کا اصرار بڑھ رہا تھا اور شہنشاہ کا انکار! وہ سب مایوس ہوگئے اور کچھ دیر آپس میں صلاح مشورہ کرتے رہے' پھر راج گھاٹ کی جانب چل دیے۔

ان کے جاتے ہی حاکم دہلی سر ڈگلس پہنچ گیا۔ اس کا رنگ فق ہو رہا تھا مگر زعم باقی تھا۔ اس نے بادشاہ کو ڈھارس دی ''آپ مطلق نہ گھبرائیں۔ میں ابھی جا کر سپاہیوں سے بات کرتا ہوں' باہر سے تازہ کمک پہنچنے ہی والی ہے۔''

''ان کے تیور بگڑے ہوئے ہیں۔ لگتا ہے ان کے درمیان نہ جائیں۔'' بادشاہ نے مشورہ دیا۔

''بغیر ان کے پاس گئے ...میں کیسے ان سے بات کروں گا۔'' ڈگلس نے جاتے جاتے کہا۔

طاقت کے زعم میں وہ نکل تو گیا مگر ان فوجیوں تک پہنچ نہ سکا۔ اسے راستے ہی میں ایک دوسرے دستے نے گھیر لیا اور اینٹوں' پتھروں' لاٹھی ڈنڈوں سے اتنا مارا کہ وہ وہیں پر مر گیا۔

قلعے تک یہ خبر پہنچ رہی تھی کہ آزادی کا نعرہ لگانے والوں میں بہت زیادہ اشتعال ہے۔ وہ سب چن چن کر انگریزوں کو قتل کر رہے ہیں' ان کے گھروں کو لوٹ رہے ہیں۔ اس لاقانونیت اور غنڈہ گردی کا سدباب ضروری تھا لیکن شہنشاہ کے پاس نہ سپاہ تھی اور نہ رعب و دبدبہ! زبردستی انہیں بادشاہ بنانے کی کوشش ہو رہی تھی۔ ضعیف العمر بادشاہ عجیب تضیے میں پھنس گئے تھے۔ انکار کرتے بنتی تھی یا نہ اقرار! اگر اقرار کر لیتے تو انگریزوں کی جانب سے ملنے والی پنشن بند ہو جاتی' یہ ایک لاکھ روپے کا وثیقہ ہی ان کے لیے نعمت سے کم نہ تھا۔ اگر وہ آزادی کے متوالوں کا ساتھ دے دیتے تو وہ بھی بند ہو جاتا۔ ایسے وقت میں جب خود ان کا ذہن کام نہیں کر رہا تھا' ان کے مقرب خاص حکیم احسن اللہ خان انہیں ورغلانے کے لیے پہنچ گئے۔

''ظل سبحانی' یہ کھلی بغاوت ہے اور ان لٹیروں کا ساتھ دینے کا مطلب ہے انگریز بہادر کے عذاب کو دعوت دینا' ہمیں ان مٹھی بھر لوگوں کا ساتھ نہیں دینا چاہیے۔''

''احسن اللہ خان! تمہاری باتیں درست ہیں۔ یہ مٹھی بھر سرفروش حکومت انگلشیہ سے ٹکرا تو سکتے ہیں مگر فتح نہیں حاصل کر سکتے۔'' بادشاہ نے دریچے سے پار دور افق کو گھورتے ہوئے کہا ''مگر میں کیا کروں' جنہیں تم لٹیرے کہہ رہے ہو یہ میری اولادیں ہیں' مجھ ناتواں پر بھروسا کر کے آئے ہیں۔ میں انہیں کیسے خالی ہاتھ لوٹا دوں؟''

''ظل الٰہی! آپ کا خیال درست ہے مگر یہ بھی سوچیے اس کا انجام کیا ہوگا؟ دلی کی تباہی' خاندان مغلیہ کی بربادی۔ میرا مشورہ یہی ہے کہ آگرہ کے لیفٹیننٹ گورنر سے مدد طلب کی جائے۔ ان لٹیروں کا سدباب ضروری ہے۔''

''لیکن ہم اپنی اولادوں کو کیسے قتل کرا دیں۔ لیفٹیننٹ گورنر کی کمک انہیں گولیوں سے بھون دے گی۔ میں ایسا نہیں کر سکتا۔ وہ میری مدد طلب کر رہے ہیں۔ ایک ایسے شخص کی جس کی حکومت ہے اور نہ جسم میں طاقت۔ گھور اندھیرے میں روشنی کی ننھی سی کرن بھی سورج لگتی ہے۔ انہوں نے بھی مجھ ایسے بے بس و مجبور کو سورج سمجھ رکھا ہے۔ میں ان کی استطاعت بھر مدد کروں گا۔''

''اور اس کا نتیجہ ہم سب کی تباہی ہے جہاں پناہ! میں پھر استدعا کروں گا کہ آگرہ سے مدد طلب کی جائے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے اجازت طلب کی اور کورنش بجاتے ہوئے چلا گیا۔

اس کے جاتے ہی شہنشاہ معظم سوچ میں پڑ گئے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کریں۔ دل کہتا تھا کہ ان سرفروشوں کی حوصلہ افزائی کریں اور دماغ کہتا تھا کہ انگریزوں کی مدد طلب کریں۔ وہ اپنی تیرہ بختی سے تنگ تھے اور قسمت کے آگے سپر ڈال چکے تھے۔ اس کا عکس ان کے شعر میں ہے:

کیا کہوں بے دولتی اور بدنصیبی اپنی میں
جب ہما پر ہاتھ ڈالا ہے تو زاغ آیا ہے ہاتھ

بالآخر انہوں نے درباریوں سے مشورہ طلب کرنے کی ٹھان لی اور دربار خاص کا حکم صادر کر دیا۔ ''تمام اہل کار' شہزادے' امراء و عمائدین شہر دربار میں حاضر ہو گئے۔ شہنشاہ معظم نے تاریخی تخت پر جلوہ فرمایا اس دربار نے کئی شہنشاہوں کا جلال دیکھا تھا مگر اس شہنشاہ کے چہرے پر جلال کی ہلکی سی بھی رمق نہ تھی۔ جلال کے بجائے پدرانہ شفقت کی جھلک تھی۔ چہرے سے تفکر عیاں تھا۔ وہ سر جھکائے سوچ میں غلطاں تھے اور درباری منصب کے مطابق اپنی اپنی قطار میں بیٹھے شہنشاہ کے بولنے کے منتظر تھے۔ کافی دیر بعد شہنشاہ نے سر اٹھایا۔ دربار کا جائزہ لیا اور بولے ''اس صورت حال کا مقابلہ کیسے کیا جائے اسی سلسلے میں ہم نے آپ کو طلب کیا ہے۔''

''ان داتا' وشوسمراٹ!'' ایک ہندو تاجر نے کھڑے ہوکر دونوں ہاتھوں کو سینے پر باندھ کر کہا ''شہر میں ہر طرف لوٹ مار مچی ہے۔ چھاؤنی خالی ہوچکی ہے۔ فرنگی سپاہی اپنی اپنی جان بچا کر بھاگ رہے ہیں۔ زیادہ تر سپاہیوں کو باغیوں نے قتل کرڈالا ہے۔ کچھ فرنگیوں کو شہر کے لوگوں نے پناہ دی تھی' پناہ دینے والوں کے گھروں کو بھی لوٹ لیا گیا ہے۔ کسی بھی شخص کی عزت محفوظ نہیں ہے جگت سمراٹ!''

''ہنہہ!'' شہنشاہ نے ہنکارا بھرا اور ایک دوسرے درباری کی جانب دیکھا جو اپنی جگہ سے اٹھ رہا تھا۔ تمام درباریوں کی نظریں اسی جانب اٹھ گئیں۔ اس نے ادب سے دونوں ہاتھوں کو سینے پر باندھا اور سر جھکا کر کہا ''ظل سبحانی! یہ سچ ہے کہ میرٹھ سے آنے والے سپاہیوں میں بے ترتیبی ہے۔ وہ لوٹ مار کررہے ہیں اور ایسا ہونا عین فطرت ہے۔ انہیں سربراہی کی ضرورت ہے۔ جب تک ان پر افسر مقرر نہیں ہوگا یہ ایسی حرکتیں کرتے رہیں گے۔ یہ سب ہماری نصرت کے لیے آئے ہیں' ہمیں ان کی مدد کرنا چاہیے۔ انگریزوں کی دھتکار کھاتے کھاتے ہم نالاں ہیں۔ غلامی کی زنجیریں توڑنے میں یہ افرادی قوت ہمارے لیے خدائی رحمت ہے۔'' پھر وہ اپنی جگہ بیٹھ گیا۔

حکیم احسن اللہ خاں نے کھڑے ہوکر کہا ''ظل سبحانی! جذباتی باتیں کچھ دیر کے لیے بہت اچھی لگتی ہیں مگر سوچیے اس کا انجام کیا ہوگا؟ میرا مشورہ یہی ہے کہ ہم انگریزوں کا ساتھ دیں اور ان لٹیروں کو مار بھگائیں۔''

''وہ لٹیرے نہیں ہیں۔'' عمائدین میں سے کوئی گرجا۔

''ہاں ہاں' وہ لٹیرے نہیں ہیں' جہاد کی خاطر سر کٹانے آئے ہیں' ہمیں ان کا ساتھ دینا چاہیے۔'' کئی امراء نے بہ یک زبان ہوکر کہا۔

کچھ ہی دیر میں دربار مچھلی بازار بن گیا۔ درباری ادب آداب کو پس پشت ڈال کر شہزادے اور امراء بحث مباحثے میں جت گئے۔

ہر شخص خود کو زیادہ عقل مند سمجھ رہا تھا اور دوسرے کو بے وقوف! درباری دو گروہوں میں بٹ چکے تھے۔ ایک کا کہنا تھا کہ مجاہدین کا ساتھ دیا جائے لیکن دوسرا گروپ اس کی مخالفت کررہا تھا۔ شہنشاہ معظم کے گرد ان لوگوں کا حصار تھا جو انگریزوں کے بہی خواہ تھے۔ ایسے لوگوں نے شہنشاہ معظم کو مجبور کردیا اور انہوں نے شاہی محرر کو حکم دیا کہ آگرہ کے لیفٹیننٹ گورنر کے نام شاہی عرضی تیار کی جائے۔

محرر نے امداد کی خاطر تازہ کمک کی استدعا کرتے ہوئے لکھا ''شہنشاہ معظم کو مجبور کیا جارہا ہے' انہیں ورغلانے والے باغیوں کی مدد کے لیے اکسارہے ہیں لیکن شہنشاہ ہند سراج الدین ابوظفر انگریزوں کے دوستدار ہیں' وہ چاہتے ہیں کہ ان باغیوں کا سر کچلنے کے لیے انگریز بہادر اپنی سپاہ لے کر آئیں۔''

اس امداد نامہ کا مضمون خود حکیم احسن اللہ خاں نے تیار کیا تھا۔ اسی وقت اس نے ایک سانڈنی سوار کو آگرہ کی جانب دوڑا دیا۔ محب وطن درباریوں کے چہرے اتر گئے۔

ابھی زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ قلعہ کے دروازے پر پھر شور بلند ہوا۔ آوازیں بہ دم تیز ہوتی جارہی تھیں۔ قلعہ کے دروازے پر شاید انبوہ کثیر تھا جو اندر آنا چاہتا تھا۔ درباریوں کے چہروں پر پریشانی پھیل گئی۔ وہ جانتے تھے قلعہ داروں کی تعداد بہت کم ہے۔ وہ انہیں روکنے میں ناکام رہیں گے۔ سب کے سب اٹھ کھڑے ہوئے اور دیوان خاص سے دیوان عام میں آکر دروازے کی سمت دیکھنے لگے۔ ابھی بہ مشکل چند ساعت گزری تھی کہ چیونٹیوں کی طرح سپاہیوں کا انبوہ صحن میں آگیا۔ قلعہ کا وسیع وعریض صحن بھر گیا۔ سیکڑوں کی تعداد میں آنے والے سپاہی پُرجوش انداز میں نعرے لگارہے تھے۔

''مغلیہ سلطنت' تاقیامت! مغل سمراٹ کی جے! سفید بندر کو دیش نکالا دو۔ ہمارا دیش سوادھین۔ ہمارا سمراٹ شاہ ظفر! ہند کو آزاد کرائیں گے' مغلیہ سلطنت قائم کریں گے۔''

طرح طرح کے نعرے گونج رہے تھے۔ کوئی کسی کی سننے کو تیار نہ تھا۔ سب اپنا اپنا راگ الاپ رہے تھے۔

شہنشاہ معظم نے درباریوں کو ہٹنے کا اشارہ کیا اور اپنے نحیف وجود کو تقریباً گھسیٹتے ہوئے آگے بڑھے اور اپنا ہاتھ اوپر اٹھا کر انہیں خاموش ہوجانے کا اشارہ دیا۔ وہ اشارہ گویا جادو کی چھڑی تھا۔ ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ اتنی گہری خاموشی چھا گئی تھی کہ اگر سوئی بھی گرتی تو آواز صاف سنائی دیتی۔ وہ سپاہی جو کچھ دیر پہلے آسمان سر پر اٹھائے ہوئے تھے۔ اب ایسے خاموش کھڑے تھے جیسے وہ سب پتھر کے بت ہوں۔

''میرے بیٹو! تم میرے پاس کیا لینے آئے ہو۔ میں تو خود مجبور ہوں۔ میری حکومت قلعے تک محدود ہے۔ میرے پاس دولت ہے نہ طاقت! میں تمہاری کیا مدد کرسکتا ہوں؟'' شہنشاہ معظم نے کہا۔

''ہمیں نہ دولت چاہیے اور نہ کسی قسم کا لالچ ہے۔ ہمیں آپ کا ساتھ چاہیے۔ ابھی ہم بکھرے ہوئے ہیں۔ اگر آپ نے ساتھ دے دیا تو ہم ایک جھنڈے تلے جمع ہو جائیں گے۔ ہمیں تو لڑنا ہی ہے اگر آپ نے ساتھ نہ دیا تو بھی ہم لڑیں گے مگر وہ لڑائی بکھری ہوئی ہوگی۔ ہم آپ کے پاس صرف اس اُمید پر آئے ہیں کہ یہ ملک مغلیہ پرچم تلے آزاد تھا' ہم اسی پرچم کو بلند کرنے آئے ہیں۔ ابھی ہمارے اور ساتھی بھی یہاں پہنچنے والے ہیں۔ ملک کے ہر گوشے میں سپاہیوں نے آزادی کا جھنڈا بلند کر دیا ہے۔ ابھی وہ سب اِدھر اُدھر مقابلہ کر رہے ہیں۔ آپ کا نام سنتے ہی سب کا رخ دلی کی جانب ہو جائے گا۔'' سب سے آگے کھڑے ہوئے سپاہی نے تقریر کے انداز میں اپنی بات کہہ دی۔

شہنشاہ معظم سوچ میں پڑ گئے' پھر وہ کافی دیر بعد بولے

''میرے بیٹو! اگر تمہاری منشا یہی ہے تو میں تیار ہوں لیکن سوچ لو انگریز منظم ہیں ان سے ٹکرانا ہنسی کھیل نہیں ہے۔ اگر کہو تو میں مصالحت کرانے کے لیے بھی تیار ہوں۔''

''عالی جاہ! ابھی تک آپ نے انگریزوں کو پہچانا نہیں ہے۔ یہ فرنگی کسی کے دوست نہیں ہوتے۔ اب تو ہم نے ہتھیار اٹھا ہی لیے ہیں' اب جو بھی قسمت میں ہوگا دیکھا جائے گا۔'' اس شخص نے کہا پھر وہ آگے بڑھا' سلطان الہند سراج الدین ظفر کے ہاتھ کو بوسہ دے کر پلٹا اور زور دار نعرہ بلند کیا ''اللہ اکبر!''

جواب میں مسلمان سپاہیوں نے بھی نعرہ تکبیر بلند کیا اور ہندو سپاہیوں نے بہادر شاہ کی جے کا نعرہ لگایا۔

اور تاریخ میں سراج الدین ظفر کے لیے ایک نیا خطاب ''بہادر شاہ'' رقم ہو گیا۔

اسی پُرجوش سپاہی نے سلطان المعظم کو مشورہ دیا کہ اپنے کسی شہزادے کو فوج کا سپاہ سالار مقرر کر دیں تاکہ شہر کا نظم ونسق سنبھالا جا سکے۔ سلطان المعظم نے اس کے مشورے کو پسند کیا اور شہزادہ مرزا مغل اور مرزا عبداللہ کی سربراہی میں دو دستے ترتیب دیے۔ ان دونوں دستوں کی ذمے داری تھی وہ شہر کے بگڑے ہوئے حالات اور نظم ونسق پر قابو پائیں۔ اس کے علاوہ شہر کی دیواروں پر جلی حروف میں اعلان چسپاں کیا گیا جس کا متن یہ تھا۔

''چونکہ حضرت ظل سبحانی فلک بارگاہ نے انگریزوں کا قلع قمع کرنے کے بعد تخت طاؤس پر جو موروثی جلوہ گاہ سلاطین گورگانیہ کی ہے' جلوس فرمایا لہٰذا حکم شاہی صادر ہوا کہ اب انگریزوں کے اموال ونفوس کا قتل وغارت موقوف رکھا جائے۔ اب احکام امن وامان جاری ہوں گے اور عدل وانصاف سے کام لیا جائے گا۔''

اسی دن شہنشاہ معظم شہر میں امن وامان قائم کرنے کے لیے خود ہاتھی پر سوار ہو کر نکلے۔ وہ سپاہی جو کسی بھی طرح قابو میں نہیں آ رہے تھے' شہنشاہ کے اس اقدام سے لوٹ مار موقوف کر کے شہر پناہ کی جانب چل دیے۔ وہی فوج جو بے ترتیب تھی' اب منظم ہو چکی تھی۔ ان کے سپاہ سالار بھی مقرر کر دیے گئے تھے۔ ایک دس رکنی کمیٹی بھی بنائی گئی تھی جس میں چھ فوجی نظم ونسق کے اور چار شہری امور کے نمائندے تھے۔ متفقہ فیصلوں سے حکومت کا نظام چل رہا تھا۔ ہر روز ایک نیا حکم جاری ہوتا مگر اسے نافذ کرنا خاصا دشوار تھا۔ انگریزوں کے خلاف سرفروشوں میں اتنا غم وغصہ تھا کہ وہ کسی کی بھی بات سننے کو تیار نہ تھے۔ کئی بار تو ایسا ہوا کہ بادشاہ کے حکم بھی انہوں نے ٹھکرا دیے۔ ایک بار سپاہیوں کے ایک جتھے نے کچھ عورتوں اور بچوں کو شہنشاہ کے سامنے پیش کیا۔ وہ سب انگریز تھے۔ سپاہیوں کا کہنا تھا کہ ان کے مردوں نے ہم پر گولیاں چلائی تھیں۔ بادشاہ نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی کہ جرم ان کے مردوں نے کیا ہے' اب جب تم انہیں لے آئے ہو تو انصاف کریں گے۔ اگر یہ واقعی سزا کے مستحق ہوئے تو انہیں سزا بھی ملے گی مگر وہ سب تو جوش انتقام میں اندھے ہو رہے تھے۔ ان کا ایک ہی مطالبہ تھا کہ انہیں فوراً سزا دی جائے۔ بادشاہ نے معصوم عورتوں کو سزا دینا مناسب نہ سمجھا اور ان عورتوں کو سزائے موت دینے کے بجائے حفاظت کے خیال سے قید خانے میں ڈال دیا۔ یہ بات ان سپاہیوں کو ناگوار گزری اور اسی رات انہوں نے قید خانے سے ان عورتوں اور بچوں کو نکالا پھر گولیوں سے چھلنی کر دیا۔ اس حادثے نے شہنشاہ پر گہرا اثر ڈالا۔ وہ سمجھ چکے تھے کہ سپاہیوں میں ابھی تک تنظیم نہیں ہو پائی ہے اور خودسری باقی ہے۔ ان کی خودسری کو لگام دینا ضروری تھا۔ اس سلسلے میں انتظامی امور میں بہتری لا کر ان پر قابو پانے کی کوشش کی۔ شہر بھر میں بیک وقت کئی کوتوال اور عدالتوں کی منصفی کے لیے مفتیوں کو مقرر کیا۔ اس طرح شہنشاہ نے بگڑتے ہوئے حالات پر بہت حد تک قابو پا لیا۔ دلی میں آزاد مغلیہ حکومت بحسن وخوبی کام کرنے لگی لیکن یہ بات

انگریزوں کو کب پسند آتی۔

ان کے لیے تو دلی گلے میں ہڈی بن گئی تھی۔ اگر وہ اس کی جانب سے نظریں چرا لیتے تو بقول ان کے یہ بغاوت پورے ہند میں پھیل جاتی۔ انہوں نے دلی پر قبضے کے لیے جنرل این سن کو مقرر کیا وہ سپاہ کثیر کے ساتھ دہلی کی جانب بڑھنے لگا۔ یہ خبر چھوٹی موٹی نہ تھی۔ جنگل کی آگ کی طرح ہند کے گوشے گوشے میں پھیل گئی۔

این سن نے سمجھا تھا کہ دلی میں مٹھی بھر سپاہی ہیں۔ انہیں ایک ہی ہلے میں روند دے گا۔ شاید اسے یاد نہیں تھا کہ یہ وہی ملک ہے جہاں ٹیپو سلطان نے ٹوٹی ہوئی تلوار سے بھی جنگ کی تھی۔ نواب سراج الدولہ کا وطن بھی یہی ہے۔ اسی سرزمین پر جیسور بھی ہے جہاں کے ایک معمولی سے زمیندار تیتو میر نے بانسوں کا قلعہ بنا کر لاٹھی ڈنڈوں سے انگریزوں کی سپاہ کا مقابلہ کیا تھا۔ یہ رضیہ سلطانہ چاند بی بی اور جھانسی کی رانی کا وطن ہے' یہاں بہادروں کی کمی نہیں ہے۔ وہ اپنی سپاہ کثیر کے زعم میں آگے بڑھ رہا تھا تو حب وطن سے سرشار جوان بھی دہلی کی جانب چھوٹے چھوٹے دستوں میں بڑھ رہے تھے۔ انگریز سپاہ تنخواہ کے لالچ میں لڑنے جا رہی تھی اور یہ چھوٹے چھوٹے دستے جذبہ جہاد کے تحت بڑھ رہے تھے۔ وہ سب بہادر شاہ ظفر کی نصرت کے لیے آ رہے تھے ایسا ہی ایک دستہ بخت خاں کا تھا۔ وہ روہیل کھنڈ کے دستے کا سپاہ سالار تھا۔ اس کی بہادری روز روشن کی طرح ہند بھر میں مشہور تھی۔ وہ مشرقی یوپی کے شہر سلطان پور کا رہنے والا تھا اور اودھ کے شاہی خاندان سے اس کا تعلق تھا۔ اس کی بہادری کو مدنظر رکھتے ہوئے شہنشاہ معظم نے اسے سپاہ سالار اعلیٰ مقرر کر دیا۔ پہلے یہ منصب شہزادہ مرزا مغل کے پاس تھا۔ بخت خاں نے یہ منصب لینے سے پہلے ہی شہنشاہ معظم سے کئی قول و قرار لے لیے تھے۔ وہ بہادر ہی نہیں منہ پھٹ بھی تھا۔ اس نے صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ اگر نوٹ مار کرتے ہوئے میں نے کسی شہزادے کو بھی دیکھا تو اسے گولی مار دوں گا۔ اس کی یہ بے خوفی شہنشاہ معظم کو بھا گئی۔ انہوں نے کلی اختیار اسے دے دیا تھا۔ اس نے اپنے حسن کارکردگی سے نظم و نسق تو سنبھالا ہی' بہادری سے انگریزوں کے دانت بھی کھٹے کرنا شروع کر دیے۔ جنرل این سن کے لیے وہ لوہے کا چنا ثابت ہوا تھا۔ کسی پہاڑ کی طرح وہ اس کے آگے ڈٹ گیا تھا۔

اس صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے انگریزوں نے آپس میں صلاح مشورے تیز کر دیے۔ کافی سوچ بچار کے بعد انہوں نے اسی حکمت عملی کو کام میں لانے کی ٹھانی جسے ہسپانیہ میں مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لیے استعمال کیا گیا تھا۔ جس حکمت عملی کو سرزمین ہند پر انہوں نے نواب سراج الدولہ کے خلاف استعمال کیا تھا' جس کے ذریعے انہوں نے ٹیپو سلطان کو شکست دی تھی۔ یعنی مفاد پرستوں کو تلاش کر کے اپنے مفاد کے لیے آمادہ کرنا۔ ایسے غداروں کی ہر دور میں بہتات ہوتی ہے۔ انہیں بھی دلی میں اس قسم کے لوگ مل گئے۔ کچھ تو پہلے ہی سے انگریزوں کے پالتو کتے تھے اور کچھ کو انہوں نے بعد میں خرید لیا۔ ایسے لوگوں نے بہ یک وقت کئی محاذ کھول دیے۔ انہوں نے شہزادوں کو بخت خاں کے خلاف ابھارنا شروع کر دیا۔ شہزادے پہلے ہی بخت خاں کے خلاف بھرے بیٹھے تھے۔ اب انہوں نے کھلے عام اس کی مخالفت شروع کر دی۔ بخت خاں جنگی حکمت عملی تیار کرتا اور شہزادے اسے نامنظور کر دیتے یا ناکام بنانے کی سازش شروع کر دیتے۔ اس صورتِ حال سے بخت خاں کا دل چھوٹا ہو گیا اور اس نے شہنشاہ معظم سے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ اب وہ صرف اپنی فوج کی کمان سنبھالے گا۔

یہ غداروں کی بہت بڑی کامیابی تھی انہوں نے گویا آدھی جنگ جیت لی تھی۔ اب انہوں نے سپاہیوں کے درمیان کام شروع کر دیا۔ وہ انہیں تنخواہ کی طلب پر اکسا رہے تھے۔ ہر روز کی ایک ہی بات ان کے ذہنوں پر چھا گئی اور انہوں نے ایک دن خاصہ تحل کو گھیر لیا۔ ان کا مطالبہ تھا کہ انہیں تنخواہیں دی جائیں۔ یہ خبر شہنشاہ معظم تک پہنچی تو شہنشاہ معظم ان سے مذاکرات کرنے خود تشریف لے آئے۔

انہوں نے بہ آواز بلند کہا: ''کیا میں نے پہلے ہی دن تم سے یہ نہیں کہا تھا کہ میرے پاس دولت ہے اور نہ ملک..... میں تمہیں تنخواہ کہاں سے دوں؟''

''آپ قرض لے کر تو دے سکتے ہیں۔ ہم غریب لوگ ہیں' دلا نے دانے کو ترس رہے ہیں۔''

''قرض کس سے لوں؟ تمام مہاجنوں' سوداگروں کو تم لوگوں نے پہلے ہی لوٹ لیا ہے پھر قرض کے لیے میری ضمانت کون دے گا؟''

''ہم کچھ نہیں جانتے' ہمیں تنخواہ چاہیے۔'' یہ مطالبہ اب شور کی شکل اختیار کرتا جا رہا تھا پھر انہی میں سے کسی نے کہا: ''یہ ہمیں تنخواہ نہیں ملی تو ہم شہر لوٹ لیں گے' چلو بھائیو! شہر کو لوٹنے چلتے ہیں۔''

''نہیں، تم لوگ شہر کو نہیں لوٹو گے، میں اپنا تمام مال اسباب بیچ کر تمہاری تنخواہیں ادا کروں گا۔ تم سب تنخواہیں لے کر خاموشی سے چلے جاؤ گے۔ میں نے تمہیں بلایا نہیں تھا، تم خود آئے تھے۔'' شہنشاہ معظم نے آبدیدہ ہو کر کہا اور جانے کے لیے مڑ گئے۔ غداروں کی دوسری چال بھی کامیاب ہوگئی تھی۔ جس کا عکس ان کے شعر میں ملاحظہ کریں۔

نصیب اچھے اگر بلبل کے ہوتے
تو کیوں پہلو میں کانٹے گل کے ہوتے

ادھر انگریز فوجیوں کا دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ انہیں روکنے والے پیچھے ہٹ رہے تھے۔ زیادہ تر باغی سپاہی شہر سے بھاگ گئے تھے۔ بچے کھچے سپاہیوں میں بھی سرفروشوں کی تعداد بہت تھوڑی تھی۔ وہی انگریزوں کا مقابلہ کر رہے تھے۔ انگریز شہر میں داخل ہو چکے تھے اور قلعہ معلیٰ کے بہت نزدیک پہنچ گئے تھے۔ گھمسان کی جنگ جاری تھی کہ بادشاہ نے منادی کرادی ''یہ وقت جہاد ہے تمام شہری گھروں سے نکل پڑیں۔ خود جہاں پناہ بھی مقابلے کے لیے ساتھ ہوں گے۔''

اعلان ہوتے ہی تقریباً دس بارہ ہزار افراد قلعے میں جمع ہوگئے۔ انگریزوں کے پاس بھاری توپ خانہ تھا، بندوقیں تھیں اور ادھر لاٹھی، بلم اور تلواریں تھیں مگر دل میں جوش جہاد تھا۔ شہنشاہ معظم ہاتھی پر سوار ہو کر قلعے سے باہر آئے۔ ان کے ساتھ وہ بے ترتیب لشکر بھی تھا۔ انگریز سیاہ دلی کی جامع مسجد تک پہنچ چکی تھیں۔ ان کی چلائی ہوئی گولیاں قلعے کے نزدیکی میدان لال ڈگی تک پہنچ رہی تھیں۔ باغی فوجیوں میں بھگدڑ مچ چکی تھی مگر بخت خاں کی فوجیں بے جگری سے لڑ رہی تھیں۔ ان کے علاوہ بھی کئی دوسرے علاقوں کی فوجیں جن میں جذبہ جہاد باقی تھا سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے تھیں۔ انہوں نے ہی شہنشاہ معظم سے استدعا کی کہ آپ قلعہ میں لوٹ جائیں۔ بادشاہ نے ان کی بات مان لی اور لوٹ کر قلعہ میں چلے گئے۔

بخت خاں دور رس نگاہ رکھتا تھا۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ اب شکست مقدر ہے۔ وہ شہنشاہ معظم کے پاس آیا اور استدعا کی ''عالی جاہ! جنگ میں فتح و شکست عجوبہ نہیں ہے۔ ہمیں ہر حال میں شکست ہوگی لیکن ہمیں ہمت نہیں ہارنا ہے۔ فرنگیوں کے خلاف ہم نیا محاذ بنائیں گے۔ ابھی پورا ہندوستان باقی ہے ہم کسی دوسری جگہ سے پھر جنگ کا آغاز کریں گے۔ آپ ہمارے ساتھ نکل چلیں۔''

انگریزوں نے اس پہلو پر پہلے سے ہی نگاہ رکھی تھی۔ وہ جانتے تھے اگر شہنشاہ معظم فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے تو یہ فتح بے معنی ہو جائے گی اس لیے انہوں نے پہلے ہی شہنشاہ کے سدھی الٰہی بخش کو ساتھ ملا لیا تھا کہ وہ بادشاہ کو بھاگنے نہ دے۔ بقول ان کے:

جہاں میں اور تو ڈرتے ہیں غیر سے لیکن
ظفر رہے ہے مجھے اپنے آشنا کا خوف

بخت خاں کا مؤقف غلط نہ تھا۔ بادشاہ اس کی دکھائی راہ پر چل پڑتے کہ مرزا الٰہی بخش نے کہا ''حضور! مجھے بخت خاں کی باتوں سے اختلاف نہیں ہے مگر سوچیے، یہ جنگ آپ پر مسلط کردہ ہے، باغیوں کی شرارت ہے اور جب باغی ہی نہ رہیں گے تو جنگ خود بخود ختم ہو جائے گی۔''

''اور انگریز انہیں معاف کر دیں گے؟'' بخت خاں نے کہا۔

''اور کیا، انگریز اندھے نہیں ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ بادشاہ سلامت کو یرغمال بنا کر باغیوں نے اپنا کام نکالا ہے۔ پھر وہ اس استدعا نامہ کو بھولے نہیں ہوں گے جو حضور نے آگرہ کے لیفٹیننٹ گورنر کو بھیجا تھا۔''

پتا نہیں شہنشاہ معظم نے کیا سوچا کہ انہوں نے بخت خاں کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔

اڑ گئی صیاد اب دل سے ہوس پرواز کی
بیٹھا رہنے دے قفس میں ہم کو پر جھاڑے ہوئے

انہوں نے رنجیدہ لہجے میں کہا ''بخت خاں! ہم کل تم سے مقبرہ ہمایوں میں ملاقات کریں گے۔''

''تو کیا آپ قلعہ خالی کر رہے ہیں؟'' بخت خاں کی آواز میں لرزہ تھا۔

''ہاں! اب اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں ہے۔''

''تو آپ میرے ساتھ ہی کیوں نہیں نکل لیتے؟''

''ابھی مجھے سوچنے کے لیے وقت کی ضرورت ہے۔ رات بھر میں کوئی فیصلہ کر لوں گا۔''

بخت خاں مایوس ہو کر لوٹ گیا۔ اسی رات اماوس کے گھپ اندھیرے میں شہنشاہ معظم بیگمات اور شہزادوں کے ساتھ قلعہ کے خفیہ دروازے سے باہر نکلے اور چھپتے چھپاتے مقبرہ ہمایوں کی جانب چل پڑے۔ جس لال قلعہ نے مغلیہ سلطنت کا عروج دیکھا تھا اسی لال قلعہ نے تاریخ کا سب سے بدترین فرار بھی دیکھا۔ شہزادے پاپیادہ بھاگ رہے تھے۔ بیگمات کی ڈولیاں جاں فدا کرنے والے خواجہ سرا کندھوں پہ اٹھائے سرپٹ دوڑ رہے تھے۔ انہی کے شعر میں وہ منظر

ملاحظہ کریں:

کبھی دیکھے محل یہاں اور دیکھی ان میں آبادی
کبھی دیکھی خرابی اور اک ویرانہ سا دیکھا

☆☆☆

میجر ہڈسن قلعہ سے کافی دور ایک مکان میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اس گھر کو وہ بطور ہیڈ کوارٹر استعمال کررہا تھا۔ اسے صبح کا انتظار تھا تاکہ قلعہ پر پوری طاقت سے حملہ کرے۔ وہ اسی سلسلے میں دوسرے افسروں سے صلاح مشورہ کررہا تھا کہ اسے اطلاع ملی ایک شخص ملاقات کے لیے آیا ہے۔ اس نے بلانے کو کہا۔ بادشاہ کا سمدھی الٰہی بخش ہاتھ باندھے آ کھڑا ہوا۔

''ویل فیوچر کا بادشاہ تم کیسے آیا؟'' میجر ہڈسن نے اسے بادشاہ بنانے کا لالچ دے رکھا تھا۔

''ظفر اپنے ساتھیوں کے ساتھ قلعہ خالی کرگیا۔'' الٰہی بخش کے چہرے سے خوشی چھلک رہی تھی۔

''کتنا آڈمی غدار کے ساتھ گیا اور کس طرف گیا؟''

''حضور کا اقبال بلند ہو! اس کے ساتھ باغی سپاہی نہیں ہیں۔ بیگمات اور شہزادے ہیں۔ وہ سب چھپنے کے لیے مقبرہ ہمایوں گئے ہیں۔ ایک روز بعد اس سے کسی اور طرف جائیں گے۔''

''ہم نے سنا ہے اس کے ساتھ بخت خان بھی ہے؟''

''اس نمک خوار نے بخت خاں کی چال کو ناکام بنادیا۔ ظفر کو اس کے ساتھ جانے سے روک دیا۔ آپ کے پاس پوری رات ہے۔ آپ جلد سے جلد اپنے سپاہیوں کے ساتھ جاکر اسے گھیر لیجئے۔ وہ کبوتر کی طرح پھڑ پھڑا کر رہ جائے گا۔''

''ہم اس کو موقع دے گا۔ وہ خود ہمارے پاس معافی مانگنے آئے گا۔ تم اس کا نگرانی کرو۔ وہ بھاگنے نہ پائے۔ ہم تم کو بہت جاگیر دے گا۔ بادشاہ کا خطاب بھی دے گا۔''

الٰہی بخش لالچ میں آ گیا اور شہنشاہ معظم کو ورغلانے مقبرہ ہمایوں پہنچ گیا۔ آتے وقت اس نے ہڈسن کو بتادیا تھا کہ بخت خاں شہنشاہ معظم کو لینے آئے گا۔ اس طرح دونوں کو ایک ساتھ گرفتار کیا جاسکتا ہے۔

ہم دیکھ چکے خوب تماشائے زمانہ
اچھا ہے جو کچھ اور نہ دکھائے زمانہ
ڈھونڈو تو زمانے میں نہیں مہر محبت
کس طرح کا آیا ہے ظفر ہائے زمانہ

الٰہی بخش نے بادشاہ کے علاوہ ان کی سب سے چہیتی بیگم زینت محل کو بھی ورغلانا شروع کردیا۔ اس کا کہنا تھا کہ انگریز بادشاہ حضور کو بے قصور سمجھ رہے ہیں۔ ان کی لڑائی باغیوں سے تھی جو اب سب کے سب فرار ہوچکے ہیں۔ اگر بادشاہ سلامت خود کو انگریزوں کے حوالے کردیں تو یقیناً وہ انہیں عزت واحترام سے دہلی میں رہنے کی اجازت دے دیں گے۔

بیگم زینت محل نے بھی بادشاہ پر دباؤ ڈالنا شروع کردیا۔ ضعیف العمر بادشاہ کا ذہن کام نہیں کررہا تھا۔ ہر طرف دشمن تھے ایسی حالت میں کدھر جائیں یہ خود ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ جس کا اشارہ انہی کے شعر میں ہے:

یہ کہہ دو شمع سے گل گیر چھوڑنے کا نہیں
ارادہ اس نے ترے تاج زر کا باندھ لیا

الٰہی بخش لگاتار زور ڈال رہا تھا کہ بخت خاں کے ساتھ نہ جائیں۔ برسات کا موسم سر پہ کھڑا ہے ایسے وقت میں شہزادیوں کو ساتھ لیے کہاں کہاں ٹھوکریں کھائیں گے۔

یہ بات بادشاہ کے دل میں گھر کرگئی اور جب بخت خاں آیا تو انہوں نے اسے خالی ہاتھ لوٹا دیا۔

یہ ساری باتیں ٹوٹی ہوئی ایک دیوار کی آڑ میں کھڑا ہڈسن دیکھ رہا تھا۔ جیسے ہی بخت خاں مقبرے کے مشرقی دروازے سے باہر نکلا ہڈسن نے رجب علی نامی ایک غدار کو بادشاہ کے پاس بھیج دیا۔ اس نے جاکر عرض کیا: ''شہنشاہ عالم! صاحب بہادر ہڈسن تشریف لارہے ہیں' وہ آپ سے کچھ باتیں کریں گے۔''

''اب وہ کیا لینے آرہے ہیں۔ انہیں قلعہ چاہیے تھا وہ میں خالی کرآیا ہوں۔'' بادشاہ نے نم آنکھوں کو پونچھتے ہوئے کہا۔

''انہوں نے پیغام بھیجا ہے کہ آپ خود کو ان کے حوالے کردیں ورنہ وہ آپ کے تمام لواحقین کو گولی سے اڑادیں گے۔''

بادشاہ نے حسرت بھری نگاہوں سے بیگم کی طرف دیکھا پھر رجب علی سے بولے: ''جاؤ' ان سے کہو کہ اگر وہ جاں بخشی کا اقرار کرتے ہیں تو میں خود کو ان کے حوالے کردوں گا۔''

رجب علی نے جاکر ہڈسن کو بتایا۔ اس نے نخوت بھرے انداز میں کہا: ''اب بادشاہ کوئی بھی شرط منوانے کی حالت میں نہیں ہے۔ ویسے تو میں نے پہلے ہی جاں بخشی کا وعدہ کرلیا ہے۔''

رجب علی نے یہ بات بادشاہ تک پہنچادی۔ شہنشاہ معظم نے لاچاری سے خود کو انگریزوں کے حوالے کردینے کا فیصلہ کیا

اور باہر نکلنے لگے۔ زینت محل تڑپ کر آگے بڑھیں۔ ''نہیں عالم پناہ! پہلے میں باہر نکلوں گی... تاکہ اگر انگریز گولیاں چلائیں تو میں مروں اور آپ زندہ رہ جائیں۔''

زینت محل کے اصرار پر شہنشاہ معظم نے اجازت دے دی۔ سب سے آگے زینت محل کی پالکی تھی۔ اس کے پیچھے مرزا بخت کی سواری' سب سے آخر میں شہنشاہ ہند تھے' غم والم کی زندہ تصویر بنے۔ ان کے پیچھے وہ نمک خوار تھے جنہوں نے آخری سانس تک ساتھ نبھانے کا وعدہ کیا تھا۔ ان میں عام شہری بھی تھے اور امراء بھی۔ یہ سب بعد میں آکر جمع ہوئے تھے۔

ہڈسن نے بادشاہ کو دیکھتے ہی آگے بڑھ کر کہا ''ہتھیار میرے حوالے کردو۔'' وہ معمولی سی تلوار جو کئی پشتوں سے اس خاندان کی نگراں تھی' کئی بادشاہوں کے ہاتھوں میں جا کر اس کا وقار بڑھا چکی تھی مگر اب تو کند ہو چکی تھی' صیقل بھی کرانے کی کسی نے ضرورت نہیں سمجھی تھی مگر خاندانی وقار کی نشانی سمجھ کر سب نے اسے سینے سے لگائے رکھا تھا۔ بادشاہ نے تلوار اس کے حوالے کردی۔

اسی سال کے اس سن رسیدہ بادشاہ کی نظروں میں دنیا تاریک ہو چکی تھی۔ کچھ ہی دیر پہلے ظالموں نے انہیں ایک ایسا منظر دکھایا تھا جس نے ان پر سکتہ طاری کردیا تھا۔

ان کے سامنے کچھ لوگ کھڑے تھے۔ ان میں ہندی بھی تھے اور انگریز بھی! وہ سب ان کی اس کیفیت کا مذاق اڑا رہے تھے۔ سب سے آگے میجر ہڈسن کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں چھڑی تھی۔ اس نے چھڑی کی نوک کو شہنشاہ معظم کی ٹھوڑی کے نیچے لگایا اور چہرے کو اوپر اٹھاتے ہوئے بولا ''غم کالا آڈی کیا سمجھا تھا! ہم سے گدّاری کر کے حکومت چھین لے گا؟''

وہاں کھڑے حقیقی غداروں نے قہقہہ لگایا۔ مادر وطن کا سودا کرنے والے خوش تھے' ہر بات پر قہقہے لگا رہے تھے' اپنے ہی آقا کا تمسخر اڑا رہے تھے۔ شہنشاہ معظم کا سر کچھ اور جھک گیا۔ انہوں نے ایک لفظ بھی نہ کہا مگر چہرے کے جلال نے بہت کچھ کہہ دیا تھا۔ وہ اپنے ہی دانتوں سے اپنا ہونٹ چبا رہے تھے۔

''اے بڈھے اوپر دیکھ۔'' ایک غدار نے آواز کسا۔ شہنشاہ معظم نے سر اٹھا کر غداروں کی جماعت کو خونخوار نظروں سے دیکھا اور پھر سر جھکا لیا۔

مرغ دل مت رو یہاں آنسو بہانا منع ہے
اس قفس کے قیدیوں کو آب ودانہ منع ہے

ان کے پُرجلال چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے میجر ہڈسن بولا ''ہم تمہارا واسطے ٹھہ لایا ہے۔'' پھر اس نے ایک شخص کو اشارہ کیا۔ اس شخص نے اپنے سر پر ایک سینی اٹھا رکھی تھی جو خوان پوش سے ڈھکی ہوئی تھی۔ اس شخص نے سینی کو سر سے اتارا اور ضعیف العمر بادشاہ کے آگے رکھ دیا۔ میجر ہڈسن نے چھڑی سے خوان پوش ہٹا دیا۔ خوان پوش ہٹتے ہی شہنشاہ معظم کے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا۔ اس تشت میں شہزادوں کا سر تھا۔

بادشاہ نے حسرت بھری نگاہوں سے شہزادوں کے کٹے ہوئے سروں کو دیکھا اور پھر زیر لب بولے ''کاش! تم نے دانائی کا دامن نہ چھوڑا ہوتا اور اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کی غلطی نہ کرتے۔ بخت خاں کی پیٹھ میں چھرا نہ گھونپتے تو آج نہ تم اس حالت میں ہوتے اور نہ میں۔''

''بے چارہ پاگل ہوگیا ہے۔'' غداروں میں سے کسی نے کہا۔

بادشاہ نے اپنی غم ناک نظروں سے انہیں ایسے دیکھا کہ اگر ان کے سینوں میں دل ہوتا تو کٹ کر رہ جاتا۔

خانۂ دل میں جو ہے آہ و فغاں کا عالم
تعزیہ خانہ میں بھی ایسا نہ شیون دیکھا

غداروں پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ ان کے دل تو سیاہ ہو چکے تھے۔ وہ ہنستے رہے' ضعیف العمر بادشاہ کا مذاق اڑاتے رہے۔

اب شہنشاہ معظم کو بھی احساس ہو چکا تھا کہ بخت خاں کی بات نہ مان کر وہ بہت بڑی غلطی کر بیٹھے ہیں۔ سانپ ہر حال میں ڈستا ہے' یہ اس کی فطرت ہے' پھر بھی انہوں نے اس پر بھروسا کرلیا تھا۔ جانتے بوجھتے' ہر چہرے کو پہچانتے ہوئے بھی غلطی کر بیٹھے تھے۔

ہتھیار لینے کے بعد ہڈسن نے بادشاہ کی تذلیل کرانے کو ان راستوں سے گزارا جن پر عوام کثیر تعداد میں جمع رہتے تھے۔ ایسے ہی راستوں سے گزار کر انہیں لال قلعہ پہنچایا گیا۔ اسی لال قلعہ میں جہاں کبھی ان کا حکم چلتا تھا مگر اب وہ قیدی تھے اور قیدی کی تذلیل فاتح کا پرانا حق ہے۔ انگریز افسران بادشاہ کا مذاق اڑا رہے تھے۔ یہ بات بادشاہ کے ایک غلام کو بہت زیادہ گراں گزری اور وہ حق نمک ادا کرنے کے لیے تڑپ کر آگے بڑھا اور اس بدتمیز افسر کو اٹھا کر پٹخ دیا۔

بعد میں اس حبشی غلام کو بھی سزائے موت دے دی گئی

مگر تاریخ نے اسے امر بنادیا اور یہ سب شہنشاہ معظم کی آنکھوں کے سامنے ہوا۔ جگر سوختہ شہنشاہ معظم کو یہ سب کچھ دیکھنے میں مجبور کیا جاتا رہا۔ جس کا ذکر ان کے شعر میں:

آہ کرنے کی بھی نہیں طاقت
اس قدر دل ہے ناتواں اپنا

کمشنر دہلی مسٹر سنڈرس کا تقرر ہو چکا تھا۔ اس نے فوراً بادشاہ کو اپنے حضور طلب کیا۔ وہ بادشاہ جس کے حضور ایک عالم سر جھکائے کھڑا رہتا تھا' آج وہ خود سنڈرس کے آگے سرنگوں تھا۔

نہ تنگ یوں ہمیں صیاد کیوں قفس میں کرے
خدا کسی کو کسی کے یہاں نہ بس میں کرے

سنڈرس نے بادشاہ کا سرتاپا جائزہ لیا اور پھر اپنا ظالمانہ حکم جاری کر دیا۔ "اس باغی کو ناظر حسین مرزا کے خالی پڑے گھر میں قید کر دیا جائے اور اس کی بیوی بچوں کو الگ الگ قید تنہائی میں رکھا جائے۔"

شہنشاہ معظم نے غمناک نگاہوں سے سنڈرس کو دیکھا پھر نظریں جھکا لیں۔

"تمہیں کچھ کہنا ہے۔" سنڈرس نے سوال کیا۔

بادشاہ نے جواب دینا ضروری نہ سمجھا۔ ان کی حالت تو پہلے ہی بہت کچھ بول رہی تھی۔ بقول ان کے:

مجھ سے کیا پوچھتے ہو غم سے ہی پوچھو مرے
جیسے میں غم زدہ ہوں کوئی بشر اور بھی ہے

بادشاہ کو ناظر حسین مرزا کے مکان میں لایا گیا۔ تنگ و تاریک گلیوں کے درمیان وہ ایک خستہ حال مکان تھا۔ مکین نے اسے بہت پہلے ہی چھوڑ دیا تھا۔ اس کے کمرے دن میں بھی ایسے تاریک رہتے تھے کہ ان پر رات کا گمان ہوتا تھا۔ بادشاہ کو اس مکان کے کمرے میں دھکیلتے ہوئے انگریز افسر نے وہاں موجود پہرے دار کو حکم دیا۔ "قیدی اگر فرار ہونے کی کوشش کرے تو بلا تامل گولی مار دینا۔"

اسی برس کا ضعیف' جس پر حالات کا کوہ ستم وہ فرار کی کوشش کیسے کرتا؟ یہ حکم بادشاہ کی تذلیل کے لیے صادر کیا گیا تھا۔ بادشاہ نے سن کر بھی ان سنی کر دی۔ ان پر تو سکتہ سا طاری تھا۔ وہ خالی نگاہوں سے کمرے کا جائزہ لے رہے تھے۔ ان کا یہ شعر عکاس ہے:

جو آ گیا ہے اس محل تیرہ رنگ میں
قید حیات سے ہے وہ قید فرنگ میں

شہنشاہ معظم کو مطلق خبر نہ تھی کہ بیگم زینت محل کو کہاں قید کیا گیا ہے اور شہزادے جواں بخت کو کس حال میں رکھا گیا ہے۔ جواں بخت ولی عہد تھا اس لیے بھی وہ انہیں زیادہ عزیز تھا۔ وہ اسی کے بارے میں سوچ رہے تھے۔

☆☆☆

"حضور! ایک نئی خبر لے کر آیا ہوں۔" الٰہی بخش نے نمک حرامی کی آخری حد پار کرتے ہوئے کہا۔

"ویل مسٹر الٰہی بخش! بولو کیا بولنا ہے۔ کیسی خبر لایا ہے۔" ہڈسن نے نخوت سے پوچھا۔

"حضور کا اقبال بلند ہو۔ میں نے معلوم کر لیا ہے کہ باغی شہزادے مرزا مغل' مرزا ابوبکر اور مرزا سلطان کہاں چھپے ہوئے ہیں۔"

"وہ غدار کہاں ہے' جلدی بولو!" ہڈسن نے کہا۔

"وہ سب مقبرہ ہمایوں میں چھپے ہوئے ہیں۔ جتنی جلدی ممکن ہو انہیں گرفتار کر لیں اگر وہ فرار ہو گئے تو باغیوں کو حیات نو مل جائے گی۔" نمک حرام الٰہی بخش کے چہرے پر دبا دبا جوش تھا۔ جاگیر کی لالچ نے اسے اندھا بنا دیا تھا۔ اپنے مفاد کی خاطر وہ ملک کی شہ رگ پر چھری چلا چکا تھا اور اب خاندان مغلیہ کا گلا کاٹ رہا تھا۔

ہڈسن نے اسی وقت سپاہیوں کو ساتھ لیا اور مقبرہ کا محاصرہ کرنے چل پڑا۔ ابھی بھی وطن پرست زندہ تھے۔ ایسے ہی کسی نمک حلال نے شہزادوں کو خبر دے دی۔ تینوں شہزادے گھبرا اٹھے' اس آفت سے بچنے کی ترکیب سوچنے لگے۔

"ہمارے خاندان کی تاریخ رہی ہے کہ ہم نے میدان جنگ کو پسند کیا ہے۔ عزت کی موت افضل ہے ذلت کی زندگی سے' آؤ ہم مقابلہ کرتے ہوئے موت کو گلے لگا لیں۔" مرزا ابوبکر نے مشورہ دیا۔

"لیکن بھائی! ہمارے پاس تو ہتھیار بھی نہیں ہیں؟"

"دارا شکوہ جب اورنگ زیب کی قید میں تھا تو اس نے قاتل کا مقابلہ پھلوں کو کاٹنے والی چھری سے کیا تھا۔ ہمارے پاس تو پھر بھی تلواریں ہیں۔ مرنا یوں بھی ہے تو ہم بزدلی کی موت کیوں مریں؟"

وہ سب مقابلے پر تیار تھے کہ الٰہی بخش پہنچ گیا۔ اس نے کورنش بجالاتے ہوئے کہا۔ "شہزادو! میں نے حق نمک ادا کرتے ہوئے آپ کی جاں بخشی کرالی ہے۔ انگریز بہادر کے دربار سے آپ کے لیے معافی نامہ لے آیا ہوں۔"

خاندان مغلیہ کی تاریخ گواہ ہے' وہ خطروں کو دور سے بھانپ لیتے تھے مگر یہ تب کی بات تھی جب شمشیر و سناں اول تھی

اور اب طاؤس و رباب کا دور تھا۔ ان شہزادوں نے جہانبانی کا طریقہ سیکھا نہیں تھا۔ الٰہی بخش کے دام کو پہچان نہ سکے اور اس کے بہکاوے میں آ کر مقبرے سے نکل آئے۔ ہڈسن پہلے سے ہی تیار تھا اس نے انہیں رتھوں پر سوار ہونے کا حکم دیا۔ ہڈسن کی خونخوار آنکھیں بہت کچھ کہہ گئی تھیں۔ شہزادے سمجھ گئے تھے کہ ان کے ساتھ دھوکا ہوا ہے لیکن اب کوئی چارہ نہ تھا۔

برگشتہ زمانہ ظفر ایسا ہوا ہم سے
جو یار موافق تھے وہ ہیں یار مخالف

ہڈسن انہیں لے کر جانب دہلی چلا۔ جب دہلی ایک کوس کے فاصلے پر رہ گئی تو اس نے شہزادوں کو تذلیل کے لیے حکم دیا ''ستر پوش اتارو!''

قسمت کے ماروں نے پیرہن اتار دیا۔ ہڈسن نے تمسخرانہ لہجے میں کہا۔ ''یہ ہے ہندوستان کی عزت! او ننگے شہزادو جانتے ہو میں تمہارے ساتھ کیا سلوک کروں گا؟''

شہزادے جواب کیا دیتے انہیں انگریزی آتی نہیں تھی، وہ آنکھیں پھاڑے اسے دیکھتے رہے۔ ہڈسن نے نزدیک کھڑے سنتری سے بندوق لی اور اسے اچھال کر شہزادوں کی جانب دیکھا۔ بقول ڈاکٹر فرحت اللہ دہلوی ''اس وقت احساس ہوا شہزادوں کو وہ اسیر دام فرنگ ہو چکے ہیں اور ممکن نہیں اُمید رہائی سو انہوں نے مرنے کا قصد کیا اور تھاما ایک دوسرے کا ہاتھ اور دیکھا جانب ناہنجار۔ اس بدکار نے داغی ایسی گولی جو پار ہوگئی شہزادوں کے سینے سے۔''

یکے بعد دیگرے تینوں شہزادوں کو گولی مار کر اس بدبخت انگریز نے سر کاٹ لیا اور اسے لے جا کر شہنشاہ معظم کے سامنے پیش کر دیا۔

یہ ایک ایسا ظلم تھا جس کی تاریخ میں صرف ایک مثال ہے۔ یزیدی افواج کی یہ پیروی تھی، شہنشاہ معظم کا دل پارہ پارہ ہوگیا۔

مسلسل صدمے، غم و آلام، بے عزتی کا احساس اور تنگ و تاریک کوٹھری، اس پر کبیر سنی شہنشاہ معظم بیمار ہوگئے۔ چار ماہ کی اس قید تنہائی نے انہیں آدھا کر دیا تھا۔

اتنے دنوں میں انگریزوں نے اپنے پاؤں پوری طرح جما لیے تھے۔ اب وہ جب چاہتے بادشاہ کو شہزادوں کی طرح گولیوں سے اڑا دیتے مگر وہ خود ساختہ مہذب قوم تھے۔ انہوں نے ایک نیا ڈراما شروع کر دیا۔ لال قلعہ کے اسی دیوان عام میں جہاں کبھی مغلیہ شہنشاہوں کا دربار سجتا تھا، انگریزوں نے کچہری سجائی اور مقدمہ چلانے کی تیاری ہونے لگی۔ شہنشاہ


ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ پاکیزہ

پاکستان

میں کچھ عرصے سے

مختلف مقامات سے یہ شکایت موصول ہو رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو اسٹال پہ پرچا نہیں ملتا اس سلسلے میں ادارے کے پاس دو تجاویز ہیں۔

آپ اپنے قریبی دکان دار کو ایڈوانس 100 روپے ادا کر کے اپنا پرچا بک کروالیں۔

یا

ادارے کو 1500 روپے بھیج کر سالانہ خریدار اور 750 روپے ادا کر کے 6 ماہ کے لیے بھی خریدار بن سکتے ہیں اور گھر بیٹھے پورے سال اپنے پسندیدہ ڈائجسٹ وصول کر سکتے ہیں

ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ پاکیزہ

معظم کو عام قیدیوں کی طرح عدالت میں طلب کیا گیا۔

شہنشاہ معظم سر جھکائے اپنے ہی دیوان عام میں کھڑے تھے۔ ایک اردلی سے افسر تک سب ہی انہیں قیدی کے نام سے پکار رہے تھے۔ جس دیوان عام میں وہ خود دوسروں کے فیصلے کیا کرتے تھے آج ان کے خلاف فیصلہ ہو رہا تھا۔ منصف کی کرسی پر انصاف کا خون کرنے بیٹھے ہوئے انگریز نے ان کے خلاف عائد الزامات کی فہرست سنائی ''تم حکومت انگلشیہ کے پنشن خوار تھے پھر بھی تم نے 10 مئی تا یکم اکتوبر 1857ء کے درمیان تادیبی کمیشنڈ افسران کو ورغلایا' انہیں حکومت انگلشیہ کے خلاف ہتھیار اٹھانے کا مشورہ دیا۔''

اس سفید جھوٹ پر شہنشاہ معظم نے چونک کر سر اٹھایا' جج کی جانب حیرت بھری نگاہوں سے دیکھا پھر کچھ سوچ کر سر جھکا لیا۔ شاید انہوں نے سوچا ہوگا کہ یہ تو وہی ہیں جنہوں نے نواب علی وردی خان کے پیر پکڑ کر تجارت کی اجازت لی تھی اور پھر انہی کے جانشین نواب سراج الدولہ کو تاراج کر دیا۔ انہیں تو ان سپاہیوں سے بھی شکایت نہیں تھی جنہوں نے بیچ منجھدار میں لا کر چھوڑ دیا تھا۔ جب جب ان کی دغا یاد آتی تھی وہ یہ کہہ کر دل کو تسلی دے لیا کرتے تھے۔

اعتبار صبر و طاقت خاک میں رکھوں ظفر
فوج ہندوستان نے کب ساتھ ٹیپو کا دیا

ابھی وہ پہلے الزام کا جھٹکا برداشت نہ کر سکے تھے کہ منصف نے دوسرا زہریلا تیر پھینکا۔ ''مذکورہ مدت میں قیدی نے مرزا مغل کو جو حکومت برطانیہ کا شہری تھا اور دیگر باشندوں کو حکومت کے خلاف جنگ پر آمادہ کیا۔'' پھر کچھ توقف کے بعد اس نے تیسرا زخم لگایا۔ ''اس قیدی نے خود کو بادشاہ دہلی مشہور کیا جو خلاف قانون تھا اور غاصبانہ طور پر دلی شہر کو اپنے قبضے میں لے لیا۔''

''بادشاہ نے پھر اس کی جانب حیرت بھری نظروں سے دیکھا گویا خاموش نظروں سے وہ پوچھ رہے ہوں کہ حقاً انصافاً بتاؤ یہ شہر تمہارا ہے یا میرا' یہاں کا بادشاہ میں ہوں یا تم؟ مگر جواب دیتا تو کون؟''

ہاتھ سے قاتل کے کچھ شکوہ نہیں کرتے کبھی
رکھ کے آپ اپنا گلا شمشیر پر شاکر ہیں ہم

نام نہاد منصف نے چوتھا تفنگ آزمایا ''شہر دہلی میں 49 انگریز جن میں عورتیں' بچے بھی تھے انہیں قتل کرانے میں حصہ لیا۔''

شہنشاہ معظم نے ایک بھی سوال کا جواب نہیں دیا۔ سر جھکائے کھڑے مجسم سوال بنے رہے۔

الٹی سیدھی یہ گفتگو کیا ہے
تجھے منظور جنگجو کیا ہے

پورے اکیس دن تک یہ ڈراما رچایا جاتا رہا۔ آخری دن بادشاہ عالی کو صفائی پیش کرنے کا موقع دیا گیا۔ انہوں نے پہلے تو کچھ بولنے سے ہی انکار کر دیا کیونکہ ان کے خلاف گواہوں میں وہ سب تھے جو ان کا دیا کھاتے تھے۔ ان میں سرفہرست انہی کے وزیر احترام الدولہ حکیم احسن اللہ خان تھا۔ پھر الٰہی بخش وغیرہ تھے' مکند لال تھا جو کبھی مقرب خاص تھا ایسی حالت میں وہ کیا کہتے؟

مشہور بڑے دوست ہیں جو سب میں ہمارے
کرتے ہیں عداوت وہی مطلب میں ہمارے

ہر ایک کے زور دینے پر شہنشاہ معظم بولنے پر آمادہ ہوئے اور خوب بولے۔ انہوں نے تمام الزامات کی نفی بڑے احسن طریقے پر کر دی لیکن فیصلہ تو بہت پہلے کر دیا گیا تھا' اس دن اسے پڑھ کر سنایا گیا۔ جج نے بیان میں لکھا تھا۔

''ہم بادشاہ کو جو کٹہرے میں ہیں' باغیوں سے ساز باز کرتا پاتے ہیں۔ وہ پہلا نصب العین جس کی طرف باغی چلے' وہ پہلا شخص جس سے انہوں نے التجا کی یہی دہلی کے فرضی بادشاہ ہیں۔ یہ دیکھ کر معمولی عقل والا بھی کہہ سکتا ہے کہ ان میں ضرور پچھلا ربط ضبط تھا۔ کیا ہوا اگر بادشاہ کی شرکت بعد میں ہوئی۔''

''اس فیصلے کے کچھ ہی دنوں بعد انہیں مجرم گردانتے ہوئے سزا کا موجب قرار دیا اس فیصلے کی رو سے انہیں پھانسی ہو جانی چاہیے تھی مگر وہ بادشاہ سلامت کو ہیرو بنانا نہیں چاہتے تھے اس لیے انہوں نے جلاوطنی کی سزا دے دی۔ اس سلسلے میں جان لارنس کی وہ چٹھی خاصی اہمیت کی حامل ہے جس میں اس نے سفارش کی تھی کہ معزول بادشاہ کو جلاوطن تاحیات کی سزا دی جائے۔ بیگم زینت محل اور شہزادے بخت جواں کو یہ اجازت دی جائے کہ چاہیں تو وہ بادشاہ کے ساتھ رنگون جائیں۔ اگر وہ رنگون جانے پر رضامند نہیں ہوتے تو انہیں بنگال کے کسی دور افتادہ جگہ پر نظر بند رہنا ہوگا۔''

فیصلے کے تقریباً سات ماہ بعد بادشاہ ہند کو جبری طور پر رنگون روانہ کر دیا گیا۔ دہلی تو اجڑ ہی چکی تھی' اب مزید ویران ہوگئی۔

جن گلیں میں پہلے دیکھیں لوگن کی رنگ رلیاں تھیں
پھر دیکھا تو اون لوگاں بن سونی پڑیں وہ گلیاں تھیں

انکھاں اسھاوی ڈھونڈے اونہا نوں ہائے وہ کتے لوگ گئے
جن کے مکھ سوں پیاری گاں لگدی دلوں بھلیاں تھیں
خاک کا ان کا بستر ہے اور سر کے نیچے پتھر ہے
ہائے وہ شکلیں پیاری پیاری کس کس چاؤ سے پلیاں تھیں

☆☆☆

ہند کی قسمت کا فیصلہ کر دیا گیا تھا۔ شہنشاہ ہند سراج الدین ظفر اپنی دو بیویوں اور ولی عہد بخت جواں کے ہمراہ دیدہ عبرت بنے مشرق کی جانب چلے جا رہے تھے۔

یہاں تک ہے شوق دشت نوردی کا کہ دوں نکال
میں اپنے بعد مرگ بھی باہر کفن کے پانو

انہیں کڑے پہرے میں رکھا گیا تھا مگر تذلیل بھی منظور تھی اس لیے جلوس کو مختلف شہروں میں پھرایا جا رہا تھا۔ یہ بھی یزیدی افواج کی پیروی تھی لیکن یہ کوفہ و شام کے بازار نہیں تھے ہندکی سرزمین تھی۔ جس شہر سے بھی جلوس گزرتا وہاں ماتمی فضا چھا جاتی۔ ہر آنکھ اشکبار ہو جاتی۔ لوگوں میں جوش و جذبہ انگڑائیاں لینے لگتا۔

یہ خبریں حکومت انگلیشیہ کے اہلکاروں تک پہنچ رہی تھیں۔ کہیں کسی شہر کے لوگ بادشاہ کو چھین نہ لیں اس ڈر سے انہیں الہ آباد میں روک لیا گیا۔ شہنشاہ معظم کی طبیعت علیل تھی۔ حکومت نے دنیا کو دکھانے کے لیے ایک میڈیکل بورڈ بٹھایا۔ انہیں فیصلہ دیا تھا کہ بادشاہ رنگون تک کا سفر طے کرنے کے قابل ہیں بھی یا نہیں؟ ڈاکٹر بھی انگریز تھے۔ انہوں نے برق رفتاری سے معائنہ کیا اور فیصلہ دے دیا کہ قیدی کی صحت قابل رشک ہے وہ برما تک کا سفر بہ آسانی طے کر لے گا۔

اگلے ہی دن انہیں دریائی راستے سے کلکتے کی جانب روانہ کر دیا گیا۔ بادشاہ سلامت ابھی کلکتہ پہنچے بھی نہ تھے کہ ان کی آمد کا شہرہ پہنچ گیا۔ اس شہر میں پہلے سے ہی ایک قسمت کا مارا اودھ کا حکمران نواب واجد علی شاہ نظر بندی کے ایام گزار رہا تھا۔ اس نے جو سنا کہ والیٔ ہند سراج الدین بہادر شاہ کی سواری آ رہی ہے تو وہ ملنے کے لیے بے چین ہو اٹھا کیونکہ وہ بھی اسی خنجر سے زخم خوردہ تھا۔

مست نازے، فتنہ سازے، تند خوئے جنگجوئے
ظلم کیشے، ظلم کوشے، ظلم خواہے، ظلم رانے

انگریزوں کی سیاست کے اس شکار کے انتظار میں وہ گھڑیاں گننے لگا۔ اس نے وائسرائے کی معرفت شہنشاہ کے پاس ملاقات کا دعوت نامہ بھیجا۔ انگریزوں کو کوئی اعتراض نہ تھا۔ وہ تو خود بھی چاہتے تھے کہ لوگ اپنے بادشاہ کی تذلیل کا منظر دیکھیں، وائسرائے نے فوراً اجازت دے دی۔ شہنشاہ معظم بھی واجد علی شاہ کے غم سے واقف تھے۔ انہوں نے دعوت قبول کر لی۔ دریائے ہگلی میں جہاز لنگر انداز ہوا۔ واجد علی شاہ جو ٹیا برج میں ایام اسیری گزار رہے تھے۔ ان سے ملنے چلے۔ دریائے ہگلی جس نے اپنے ساحل پر انگریزوں کو بے سروسامانی کی حالت میں اترتے دیکھا تھا۔ اسی ساحل نے دل پارہ پارہ دو حکمرانوں کو بھی ملتے دیکھا۔ نحیف و ناتواں شہنشاہ معظم جہاز سے اترے، قوی الجثہ نواب واجد علی شاہ آگے بڑھے اور شاہی آداب کے تحت اپنے بھاری بدن کو جھکا جھکا کر تین بار کورنش بجالایا پھر آبدیدہ لہجے میں بولا۔ ''حضور، غلام کا دامن خالی ہے۔ اب جاہ ہے اور نہ حشمت، دیدۂ عبرت ہے۔ ہاتھوں میں یہ مرصع عصا باقی رہ گیا ہے اسے بطور نذر قبول کیجیے۔''

یہ الفاظ زخم کی طرح ٹیس دے گئے۔ شہنشاہ معظم کی آنکھیں بھر آئیں۔ انہیں تخت ہمایاد آیا ہوگا، اپنے دربار کی یاد آئی ہوگی۔ نذر دینے کی رسم آنکھوں تلے ناچ اٹھی ہوگی۔ آنکھوں پر ہتھیلی پھیرتے ہوئے بولے ''بھائی! اب نہ میں بادشاہ ہوں اور نہ یہ دہلی کا دربار ہے پھر کیوں اس روایت کو نبھا رہے ہو؟''

''میرے خلوص کا اظہار سمجھ کر قبول کر لیجیے۔'' نواب نے اصرار کیا۔ شہنشاہ معظم انکار نہ کر سکے اور عصا کو تھام لیا پھر بولے ''جب ہم بادشاہ تھے تو ہماری روایت تھی کہ نذر قبول کرنے کے بعد کچھ نہ کچھ مرحمت کرتے تھے۔ اب تو سب کچھ خواب ہو چکا ہے۔ دلی کیا لٹی ہم بھی لٹ گئے۔ دل میں زخموں کا انبار بچا ہے یا پھر یہ تسبیح بچی ہے۔ اسے آپ قبول کر لیں۔''

نواب نے عقیدت کے ساتھ اس تسبیح کو لے لیا پھر جھک کر بادشاہ کے دابنے ہاتھ پر بوسہ ثبت کیا اور آنسوؤں کو چھپانے کے لیے ان کی جانب پیٹھ کر کے کھڑا ہو گیا۔

الغرض یہ ملاقات ختم ہوئی اور بادشاہ کا جہاز پھر چل پڑا۔

☆☆☆

1858ء ختم ہو رہا تھا کہ خاندان مغلیہ کا آخری چراغ جہاز سے اس پرائی زمین پر اترا۔ بیگم تاج محل نے کلکتہ میں ہی بادشاہ کا ساتھ چھوڑ دیا تھا اور واپس چلی گئی تھیں۔ اس ضعیف و ناتواں بادشاہ کے ساتھ صرف بیگم زینت محل اور جواں بخت

تھے۔ ان تینوں کو وہاں موجود انگریز سپاہیوں نے اس طرح گھیر لیا گویا وہ سب خطرناک قسم کے دہشت گرد ہیں۔ ساحل سے انہیں اپنے حلقے میں لیے' سنگینوں کے پہرے میں وہ سب ریس کورس آئے۔ اس گھڑ دوڑ کے میدان میں عارضی چھاؤنی بنی ہوئی تھی۔ یہاں سے وہاں تک تر پال کے فوجی خیمے نصب تھے۔ انہی خیموں میں سے ایک میں انہیں رکھا گیا۔ اس خیمے کے گرد کل بیس سپاہی بندوقیں تانے پہرے پر موجود تھے۔ سارا دن اور ساری رات اسی طرح بدل بدل کر ڈیوٹیاں دی جاتیں۔

اسی دوران میں ریس کورس کے نزدیک ایک نیا مکان تعمیر کیا گیا۔ برما میں اینٹ گارے کے مکان خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ زیادہ تر مکان ساگوان کی لکڑیوں سے بنتے ہیں۔ وہ مکان بھی ساگوان کے تختوں کو جوڑ کر بنایا گیا تھا۔ اس مکان میں کل چھ کمرے تھے۔ ایک میں شہنشاہ معظم دوسرے میں بیگم زینت محل اور تیسرے میں شہزادہ جواں بخت کو ٹھہرایا گیا تھا۔ شہنشاہ معظم کی خدمت کے لیے ایک ملازم کا بھی انتظام کیا گیا تھا لیکن عام قیدیوں کی طرح پابندیاں اب بھی عائد تھیں۔ وہ شاعر تھے اور ایک شاعر جذبات کے اظہار پر پابندی برداشت نہیں کرسکتا۔ یہ اس پر بہت بڑا ظلم ہے۔ انگریزوں نے اس سزا کو بھی ان پر روا رکھا تھا۔ انہیں کاغذ قلم رکھنے کی ممانعت تھی۔

قید حیات و بند.....
اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی
غم سے نجات پائے کیوں

سمندر پر بند باندھا جاسکتا ہے مگر خیالات پر نہیں۔ اتنی پابندیوں کے بعد بھی وہ شعر کہتے۔ بلکہ پابندیاں ہی شعر کہلواتیں' حالات کی بے رخی' غم و آلام کی نشتر زنی الفاظ کی شکل میں دیواروں پر ابھرتے' شہنشاہ معظم قلم کا کام کوئلے سے لے رہے تھے۔ انہوں نے کمرے کی دیوار پر ہندی گیت میں اپنی بپتی لکھ دی جس کے بول تھے۔

کون نگر میں آئے ہم کون نگر میں باسے ہیں
جائیں گے اب کون نگر میں من میں اب ہراسے ہیں
دیس نیا ہے بھیس نیا ہے رنگ نیا ہے ڈھنگ نیا ہے
کون آنند کرے ہے واں اور رہتے کون ادا سے ہے

شہنشاہ معظم کے ملازم سے ان کی بے بسی دیکھی نہ گئی۔ وہ قلم کاغذ کا انتظام کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

برما میں روہنگا مسلمانوں کی اکثریت ہے' یہ وہ قبائلی ہیں جنہیں برسوں پہلے شاہ جلالؒ کے ساتھ بھٹک کر آنے والے صوفیوں نے راہ ہدایت دکھائی تھی۔ ان کا اپنا رسم الخط تھا لیکن اس بات سے آگاہ تھے کہ قرآنی رسم الخط سے ملتی جلتی رسم الخط میں ہندوستانی مسلمان لکھتے ہیں۔ وہ خود بھی بادشاہ سے ہمدردی رکھتے تھے۔ انہیں جب بادشاہ کے ملازم رجب احمد بیگ سے معلوم ہوا کہ بادشاہ کو قلم کاغذ کی ضرورت ہے تو انہوں نے نہایت رازداری سے قلم کاغذ پہنچا دیا۔ یہ اسی کا طفیل ہے کہ اردو ادب میں کئی بے مثال غزلیات کا اضافہ ہوا۔ اسی دور میں شہنشاہ معظم نے معرکتہ الاراغزل۔

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آسکے میں وہ ایک مشت غبار ہوں

کہی اس غزل کا ہر شعر اپنی جگہ ایک نوحہ ہے۔ ایک ٹوٹے ہوئے دل کی صدا ہے۔

ایک اجنبی دیس میں' جہاں ہم مزاج لوگ تھے اور نہ ہم زبان پھر بھی پابندیوں کا سیل گراں بار تھا۔ کسی سے ملنے کی اجازت نہ تھی۔ ایسی حالت میں انہیں صرف ایک ہی کام تھا۔ دل کے پھپھولوں کو کاغذ پر منتقل کرتے رہنا یا پھر بیتے ہوئے ایام کو یاد کرنا۔

یہ جانو اپنی ظفر کہانی کہے ہے اوروں کی داستاں میں
سنو اگر اس اسیر غم سے کہیں کا جھگڑا کہیں کا دکھڑا

رفتہ رفتہ اسی غور و فکر کا نتیجہ ظاہر ہونا شروع ہوا اور پھر ایک روز بیماری کا شدید حملہ ہوگیا۔ ان پر شدید بے ہوشی کا دورہ پڑا تیمور کے وارث کو بابر و اکبر کے جانشین کو ہوش میں لانے کے لیے اس گھر میں نہ تو دوا تھی اور نہ دوا رہا' معمولی سی دوا بھی نہ تھی۔ مٹی کے مٹکے میں پانی تھا۔ زینت محل نے اسے ہی چلو میں لے کر چھڑکنا شروع کردیا۔ ساری رات اسی میں گزر گئی۔ صبح فرنگیوں کو اطلاع دی گئی۔ انہوں نے ایک ڈاکٹر کو بھیج دیا۔ ڈاکٹر نے معائنہ کے بعد بتایا کہ ان کے حلق پر فالج کا حملہ ہوا ہے۔ یہ مرض ایسا نہ تھا کہ معمولی دواؤں سے دور ہو جاتا۔ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی گئی۔ بالآخر 7 نومبر 1862ء کو موت نے انہیں ہمیشہ کے لیے قید سے چھٹکارا دلا دیا۔

ہے کتنا بدنصیب ظفر دفن کے لیے
دو گز زمین بھی نہ مل سکی کوئے یار میں

++

# گھر وندار یت کا

سلمیٰ اعوان

زندگی کیسی پُرپیچ ہوتی ہے، کیسے کیسے رنگ دکھاتی ہے، کبھی شعلہ تو کبھی شبنم، زندگی کے انہی بدلتے رنگوں سے سجی ایک جداگانہ انداز میں ناسٹیلجیا۔

ایک خانہ بدوش سرکس کے

بیوی نے ہاتھ پکڑ کر بٹھانا چاہا پر وہ تو اس وقت تماشا لگانے والے مداری کا وہ بندر بنا ہوا تھا جو غصّے سے بل کھاتے ہوئے ہاتھ میں پکڑے ڈنڈے سے بندریا کا سر توڑ دینا چاہتا ہو۔ نفیس طلائی چوڑیوں سے سجے اس کے سڈول بازو کو جو اسے روکنے اور بٹھانے کے لیے آگے بڑھا تھا بیزارگی سے جھٹک کر زہر بھرے لہجے میں بولا تھا۔

''مجال ہے جو تمہارا دماغ کبھی اس گھسن گھیری سے نکل جائے۔ زبان ہے تو وہ کمبخت سان پر رکھی ہوئی ہے۔ دل گردہ بھی اتنا مضبوط نہیں کہ موقع محل ہی پر نظر رہے۔''

اس نے رخ پھیرا۔ غصیلے چہرے اور سرخ آنکھوں سے اسے ایک بار پھر گھورا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا۔

اور وہ جو سرخ اور سیاہ پھولوں والی راجشاہی سلک کی ساڑی پہنے شانوں پر بوجھل سا جوڑا ٹکائے بڑی تمکنت سے اپنی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ اس نے مضطرب اور خوف زدہ سی ہو کر

اپنے دائیں بائیں اور آگے پیچھے دیکھا کہ کوئی ان کے درمیان ہونے والے اس جھگڑے اور گفتگو کو دیکھ اور سن تو نہیں رہا تھا۔ پر کوئی ان کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ کسی نے ان کی باتوں کا نوٹس نہیں لیا تھا۔

ہال کی Lights بجھ چکی تھیں اور اسکرین پر سینما میں چلنے والی اگلی فلم "The Gold Finger" کا اشتہار دکھایا جا رہا تھا۔ وہ قدرے پُرسکون ہوئی اس کے دونوں بچے داہنے ہاتھ کی سیٹوں پر بیٹھے شان کوزری کو دیکھ رہے تھے اور نہیں جانتے تھے کہ ابھی ابھی ماں اور باپ کے درمیان کسی بات پر تو تو میں میں ہوگئی ہے اور باپ احتجاجاً اٹھ کر چلا گیا ہے۔

اس کے دل سے ایک ہوک سی اٹھی جس نے اس کی آنکھوں کو نم کر دیا! چہرے پر یاس کا رنگ بکھیر دیا۔ لہجے میں درد کو گھول دیا، اور جب وہ اپنے آپ سے یہ سب کہتی تھی اس کی آواز نمی سے بھری ہوئی تھی۔

عجب مزاج ہے، کیسے اس نے اس خوبصورت شام کا ستیاناس کر دیا ہے؟ کس بیدردی سے میرے جذبات پاؤں تلے روند گیا ہے؟ میٹنگ پر جانے سے بھی روکا اور جو تفریح کے لیے لایا اس کا بھی بیڑہ غرق کیا۔ اس کی خود کلامی نے اک ذرا توقف کیا پھر سلسلہ جاری ہوگیا۔

اور یہ دل گردے کی مضبوطی بھی خوب رہی۔ میں پوچھتی ہوں وہ کون سی عورت ہے جس کا شوہر تا کا جھانکی کرتا پھرے اور وہ لبوں کو سیئے بیٹھی رہے۔ اب سچی بات پر تو مرچیں لگنی ہی ہیں اور جو آن، عزت کا اتنا ہی خیال ہے تو آنکھوں کو گنہگار کرنے سے فائدہ۔

بات تو کچھ بھی نہ تھی بس اتنی سی کہ تھوڑی دیر قبل وہ آفس سے گھر آیا۔ گاڑی سے اتر کر اندر آتے آتے اس نے کوئی دس بار اونچے اونچے "طاہرہ بھئی کہاں ہو؟" کی صدائیں لگائیں۔ کچن میں دوپہر کے کھانے کو چیک کرتی طاہرہ بوکھلا کر بھاگی بھاگی لیونگ روم میں یہ کہتے ہوئے آئی۔

"کیا مسئلہ ہے؟ اتنا کیوں چلا رہے ہیں؟"

"مسئلہ وسئلہ کچھ نہیں۔" اس نے بریف کیس ریک پر ٹکاتے ہوئے کہا۔ "میں 'مدھو میتل' میں میٹنی شو کے لیے ریزرویشن کروا آیا ہوں راجر مور کی 'فکشن میکر' بہت رش لے رہی ہے۔ کھانا کھانے کے بعد تم فوراً تیار ہو جاؤ۔"

"مائی گاڈ۔ آج تو مجھے اپوا کی میٹنگ میں جانا ہے۔ ویسٹ پاکستان سے مسز سلیمہ احمد آ رہی ہیں۔"

"مسز احمد کو تو گولی مارو اور آج کی شام میرے ساتھ گزارو۔ شوہر کو بھی کسی کھاتے میں رکھ لیا کرو۔"

"کمال ہے۔ سارا دن آپ اور آپ کے بچوں کے چاؤ چونچلوں میں گزرتا ہے اور ابھی بھی آپ کو وقت اور توجہ نہ ملنے کی شکایت ہے۔ میں تو اس Male Dominating ذہنیت سے عاجز آ گئی ہوں۔"

واش بیسن میں ہاتھ دھو کر وہ کھانے کی میز پر آ بیٹھا۔ کھیرے کے قتلے کو منہ میں رکھتے ہوئے اس نے ڈونگے میں سنگی مچھلی کو شوق و رغبت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "سالن کی صورت بتاتی ہے کہ اسے یہ رنگ و روپ مالکن نے دیا ہے۔"

بھات (چاول) پر دو موٹے قتلے رکھتے ہوئے وہ اس کی طرف متوجہ ہوا جو بہت پھرتی سے میز پر کھانا لگانے میں مصروف تھی۔

"رحمن" وہ ممیائی۔ "پلیز کینسل کر دو نا آج جانا۔"

"ہرگز نہیں۔" اس کا انداز جیسے دھاڑنے والا تھا۔

بچے کھانے کے لیے ٹیبل پر بیٹھے اور انہوں نے فلم کا سنا تو تالیاں بجاتے ہوئے ساتھ جانے کے لیے شور مچایا۔ ماں نے ڈانٹا اور پیار بھری خفگی سے کہا۔ "کوئی ضرورت نہیں۔ اچھے بچے فلمیں نہیں دیکھتے۔ ہوم ورک کرنا ہے۔"

اس پر باپ نے کہا۔ "خیر ہے، کبھی کبھی تفریح ہونی چاہیے۔"

وہ اہتمام سے تیار ہوئی۔ سرخ اور سیاہ پھولوں کی راجشاہی سلک کی ساڑی اس پر بہت اچھی لگ رہی تھی۔ بوجھل سا جوڑا اس کے گداز شانوں پر پڑا تھا۔ نفاست سے کیے گئے میک اپ نے چہرے کو دلآویزی دی تھی اور جب وہ اس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھی تو اس نے جوٹیلی اور محبت کی بھرپور نظریں اس پر ڈالتے ہوئے کہا۔ "طاہرہ بس ذرا موٹاپے نے کام خراب کر دیا ہے وگرنہ....."

اس نے اپنے شوہر کی بات سنی اور گردن کو ادائے ناز سے زبان کو جنبش دی۔ "مدتوں بعد میری تعریف میں تم نے کچھ کہنا چاہا بھی تو اسے ادھورا ہی چھوڑ دیا۔ بات تو پوری کرتے کہ مجھے بھی پتا چلتا کہ میں کس حسینۂ عالم سے مماثلت رکھتی ہوں۔"

اس کے موٹے اور قدرے سیاہی مائل ہونٹوں پر گہری مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ گاڑی کو چوتھے گیئر میں ڈالتے ہوئے اس نے کہا۔ "تمہارا دماغ تو پہلے ہی بہت آؤٹ رہتا ہے۔ ایسا کچھ خوبصورت سا سن کر بات کہاں جائے گی؟"

اس نے اس بات کا برا تو منایا پر چہرے پر ناگواری کا

کوئی تاثر پھیلنے نہیں دیا۔ شوہر کی عادت جانتی تھی۔

اور پھر وہ ایک دوسرے کے پیچھے چلتے گیلری میں آئے اور اپنی نشستوں پر بیٹھے۔ بچوں نے بیٹھتے ہی ماں سے تلے ہوئے بادام (مونگ پھلی کے دانے) خریدنے کی ضد کی جنہیں ایک نوعمر لڑکا لکڑی کی ٹرے میں سجائے بیچ رہا تھا۔ اس نے تین چھوٹے پیکٹ خریدے۔ دو بچوں کو دیئے۔ ایک اپنے لیے بیگ میں رکھا۔ لڑکے کو پانچ کا نوٹ دیا اس سے بقیہ لیا اور جب وہ اس سارے کام سے فارغ ہو کر شوہر کی طرف متوجہ ہوئی تو اس کی آنکھوں میں طنزیہ مسکراہٹ تیر گئی۔ چند لمحوں تک اس نے کمال تحمل اور صبر سے اس عمل کو دیکھا پھر جیسے ضبط کا یارانہ رہا اور شوہر کے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے وہ جیسے پھٹ سی پڑی۔ ''بس بھی کرو اب۔ کیا نگلنے کا ارادہ ہے انہیں۔''

واقعہ یہ تھا کہ بائیں طرف آخری سرے پر آٹھ دس شوخ و چنچل لڑکیوں کا ایک ٹولہ خوش گپیوں اور چہلوں میں مصروف تھا۔ چلبلی لڑکیاں ایسی ایسی حرکتیں کر رہی تھیں کہ ہال میں بیٹھے بیشتر لوگ انہیں ہی دیکھ رہے تھے۔ ان کی وضع قطع سے اس نے اندازہ لگایا تھا کہ ہولی کراس کونونٹ کی طالبات ہیں۔

طاہرہ سے نظریں چار کیا ہوئیں اس کے تن میں جیسے آگ سی بھڑک اٹھی۔ ''عجیب عورت ہے یہ۔ آدھا ہال ان کی طرف متوجہ ہے اور اسے فقط میں ہی انہیں گھورتا ہوا نظر آرہا ہوں۔''

اس کا دماغی میٹر گھوم گیا تھا۔ اپنے صحت مند جسم کو زور دار جھٹکا دیتے ہوئے وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور اسے ڈانٹ ڈپٹ کرتا باہر نکل گیا۔ اس کا بھی جی چاہا کہ وہ اسی وقت اٹھے۔ دونوں بچوں کے ہاتھ پکڑے اور گھر چلی جائے۔

پر وہ چاہتے ہوئے بھی ایسا نہ کر سکی۔ وہ ایک ماں تھی بچوں کے پیش نظر اپنے بچوں کی خوشی تھی۔ دماغ میں غم و غصے کا لاوہ پکتا تھا۔ ہاتھ اضطراری حالت میں اِدھر اُدھر حرکت کرتے تھے۔ آنکھیں اسکرین پر جمی ہونے کے باوجود کچھ نہیں دیکھتی تھیں بس وہ کرسی میں پھنسی بیٹھی صورتِ حال پر پیچ و تاب کھاتی تھی۔

ریس کورس روڈ پر جگمگاتے ڈھاکا کلب کے کمپاؤنڈ میں اس نے ایک جھٹکے سے گاڑی روکی اور کھٹاک سے دروازہ کھولا تو نیلگوں روشنی میں ڈوبے لاؤنج میں درمیانی قطاروں میں سے ایک پر بیٹھا بادل جو کوک ٹیل کے گلاس میں رکھے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو شیشے کی سلاخ سے ہلاتے ہوئے اس موٹے تازے دیو ہیکل اٹیلین کی گفتگو کو بڑی محویت سے سن رہا تھا چونک پڑا۔

وہ تیز تیز چلتا ہوا آیا۔ خالی کرسی پر دھم سے گرتے ہوئے اس نے بغیر کچھ کہے کوک ٹیل کا گلاس بادل کے آگے سے اٹھایا۔ لبوں سے لگایا۔ چند گھونٹ بھرے اور پھر اسے میز پر رکھتے ہوئے بولا۔ ''ایک ذہین اور تیز طرار بیوی بھی کسی خدائی عذاب سے کم نہیں۔''

بادل مسکرایا ضرور پر اس نے کچھ پوچھا نہیں۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ دونوں میں آج پھر کھٹ پٹ ہوئی ہے۔

دیو ہیکل اٹیلین اطالویوں کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا رہا تھا۔ انہیں ذہنے دار اور فرض شناس ثابت کرنے کی کوشش میں اس کا سرخ چہرہ چقندر جیسا ہو رہا تھا۔

وہ کچھ دیر تک غایت سکون سے یہ لن ترانیاں سنتا رہا۔ کوک ٹیل پیتا رہا اور جب معاملہ قوت برداشت سے بڑھ گیا۔ تب زہر بھرے لہجے میں بولا۔ ''ذرا سنو اس کی بکواس۔ اوّل نمبر کی چور اچکی قوم۔''

ٹیرس پر رقص شروع ہو گیا تھا۔ ساز تیز تیز بجنے لگے۔ قریبی میز پر بیٹھی ڈورتھی اور سروج شرما اٹھ کر جانے لگیں۔ عبداللہ اور فونو بھی اٹھ گئے تھے بادل بھی کھڑا ہو گیا اور اس سے بولا۔ ''چلو نا ایک راؤنڈ ہو جائے۔''

اس نے معذرت کی۔ ''یار دل نہیں کرتا۔''

اور جب بادل چلا گیا۔ اطالوی بھی اٹھ گیا۔ میز خالی ہو گئی۔ تب خود کو کرسی میں اور زیادہ ڈھیلا کرتے ہوئے اس نے غربی سمت پینس کھیلنے والوں کی ٹولی کو ایک نظر دیکھا اور پھر آنکھیں بند کرتے ہوئے اپنے آپ سے پوچھا۔ ''بھلا طاہرہ اس وقت کہاں ہوگی۔ سینما میں یا گھر پر۔''

☆☆☆

اپنے گھر کے بیرونی تھڑے پر بیٹھا اور وہاں محفلیں سجاتا اب وہ اچھا نہیں لگتا تھا۔ ایک تو اس نے تاڑ جتنا قد نکال لیا تھا۔ دوسرے اب وہ کوئی ارمنی ٹولہ ہائی اسکول کے چوتھے یا پانچویں درجے میں تھوڑی پڑھتا تھا بلکہ ڈھاکا یونیورسٹی میں آنرز کا اسٹوڈنٹ تھا۔ سیاست اور فلسفہ اس کے دل پسند مضامین تھے۔

اس لمبے چوڑے تھڑے سے آگے اس کا بڑے بڑے محرابوں پیل پایوں اور شہہ نشینوں والا محل نما گھر تھا جس میں سبز کھڑکیوں والا ایک کمرا اس کا بھی تھا۔ یہ عجیب بات تھی اسے اپنے کمرے سے ذرا بھی رغبت نہ تھی۔ سارے گھر کی

طرح وہ بھی اسے اجنبی ہی لگتا جو شانتی اور سکون ملتا تو اسی سرخ سرخ تھری اینٹوں والے تھڑے پر جہاں اس کی دنیا آباد ہوتی۔

وہ اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر پاکستان کے مستقبل پر بحث کرتا۔ ڈھاکا یونیورسٹی کے اساتذہ کے نیچے ادھیڑتا۔ ساتھ پڑھنے والی لڑکیوں پر تبصرے کرتا۔ نکڑ پر پھول محمد کے چھوٹے سے کھوکھے سے چائے منگواتا۔ خود بھی پیتا اوروں کو بھی پلواتا۔ رات ڈھلنے پر اٹھتا اور اپنے کمرے میں آتا یوں جیسے کوئی اجنبی شب بسری کے لیے کسی سرائے میں جاتا ہے، اس کا بس چلتا تو اپنا بستر بھی وہیں اٹھا کر لے جاتا۔ اپنے بھائیوں سے وہ قدرے دبتا تھا بڑے دونے تو اسے اس کے حال پر چھوڑ رکھا تھا۔ پر چھوٹے دو اکثر و بیشتر اسے تھڑے پر یوں محفل سجانے پر ٹوکتے رہتے۔

یہ اور بات تھی کہ وہ ان کی کم سنتا تھا اور وہی کرتا تھا جو اس کا دل چاہتا۔

اس کے اس رویے کے پس منظر میں اس گھر کے مکینوں کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ اس کی نصف درجن بھاوجیں جو نیلے، پیلے، سبز اور سرخ باڈروں والی ساڑیوں سے بندھے چابیوں کے گچھے کمروں پر چھکانی بڑی سی انگنائی میں پھٹکارے مارتی شانوں پر بھاری بھرکم جوڑوں کا بوجھ ڈھکائے، کلوں میں پان کی گلوریاں دبائے، کھٹا کھٹ بگلہ اور کبھی کبھی اردو بولتیں کسی طور بھی ٹھسے کی لکھنوی بیگمات سے کم نظر نہ آتیں اور جب وہ لڑنے پر آتیں تو ایک دوسرے کی سات پشتیں تک گن ڈالتیں۔ ایک سے ایک بڑھ کر سازشی حاسد چغل خور اور مکار بستے رستے گھروں میں آناً فاناً آگ لگا کر تماشا دیکھنے اور اچھے بھلے ذہنوں میں شکوک وشبہات کے بیج بو کر انہیں پروان چڑھانے والیاں۔ ان کے چھوٹے چھوٹے کچر پکر سڑ سڑ کرتے ناکوں والے بچے۔

اسے نفرت تھی ان سب سے۔ وہ بیزار تھا ان کے بچوں سے۔ وہ بھاگ جانا چاہتا تھا اس گھر سے۔ پر مجبوریاں تھیں جو پاؤں باندھے ہوئے تھیں۔ بھلا اپنے پاؤں پر کھڑا ہوئے بغیر وہ کہاں جا سکتا تھا۔

ماں کا تو اسے ایک ہیولا سا یاد تھا۔ جہاں آرا آپا کا دم بس غنیمت تھا۔ ان کے بچوں کے ساتھ گھستا گھساتا وہ پل گیا۔

اور جو کوئی یاد تھا تو سفید براق داڑھی والا وہ انسان جو ڈھاکا کی علمی ادبی اور سیاسی شخصیت تھی۔ جو میر حبیب الرحمٰن کے نام سے جانا پہچانا جاتا تھا جس کی آنکھوں میں ہمہ وقت اپنے اور غیروں کے لیے محبت کے سوتے ابلتے جس کی آواز میں دبدبہ، گونج اور کڑک ہونے کے ساتھ ساتھ محبت کی مٹھاس بھی گھلی ہوئی ہوتی۔ وہ اسی علم دوست اور باغ و بہار شخصیت کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا۔

اس لمبی چوڑی ڈیوڑھی کے بائیں ہاتھ اس کا کمرا تھا۔ یہ کمرا جو اب مقفل تھا۔ پہلے ہمیشہ کھلا رہتا۔ صاف ستھرا چاندنی کا فرش جس پر گاؤ تکیے رکھے ہوتے۔ پیچوان کی گڑگڑاہٹ اونچی اور جوشیلی آوازوں کے ساتھ مل کر عجیب سا سماں پیدا کرتی۔ دروازے میں کھڑا ملازم چھوکرا حکم بجالانے کے لیے مستعد ہوتا۔ اسی سرخ اینٹوں والے تھڑے کی سیڑھیاں چڑھ چڑھ کر ڈھاکا کی نامور شخصیات اس کمرے میں آتیں۔ چائے کا دور چلتا۔ اتوار کی صبح نہاری ہوتی۔ سیاسی بحثیں طول پکڑ جاتیں تو رات کا ایک بج جاتا۔ محفل شعر و سخن جمتی تو واہ واہ، سبحان اللہ کے نعروں سے پورا گھر گونج اٹھتا۔ ان آنے والوں میں نورالامین اور خواجہ ناظم الدین اسے بہت اچھی طرح یاد تھے اور یاد کیسے نہ ہوتے کہ وہ دونوں کی گود میں باری باری ضرور بیٹھتا۔

وہ اگلے جہان کیا گیا کہ خوشیوں کے ہنڈولے میں جھولتا گھر دھڑام سے زمین بوس ہو گیا۔ اس گھر کے اتفاق و محبت کو جیسے کسی کی نظر کھا گئی۔ اس کے مرنے کے بعد کیا کچھ نہ ہوا۔ ابھی تو اس کا کفن بھی میلا نہ ہوا تھا کہ جایداد کے بٹوارے پر جھگڑے فساد شروع ہو گئے۔ اس کی چار عدد بہنیں اپنے شوہروں سمیت اپنے اپنے حصے بخروں کے لیے اس گھر میں آ دھمکیں۔ ایسے ایسے دل دہلا دینے والے منظر اس کی آنکھوں نے دیکھے کہ کبھی وہ گھر کے کسی کونے میں منہ دے کر زار زار رو دیتا اور کبھی اس کا جی چاہتا کہ وہ ان سبھوں کو جو خونی رشتے کے ناطے اس کے بہن بھائی ہیں، مٹی کا تیل چھڑک کر بھسم کر ڈالے۔ وہ ابھی اتنا بڑا نہیں تھا۔ اتنا سمجھدار بھی نہ تھا۔ لیکن خود غرضی، فریب اور ریاکاری کے ایسے ایسے نمونے اس کے سامنے آتے کہ وہ بسا اوقات کڑھ کر اپنے آپ سے کہتا۔

''انہیں کیا ہو گیا ہے؟ ان کی آنکھوں پر حرص و ہوس نے کیسی پٹیاں باندھ دی ہیں کہ نہ تو انہیں اپنے اتنے بڑے باپ کا احساس ہے اور نہ ہی یہ خیال کہ انہوں نے اپنے مرحوم باپ کی عظمت اور خاندان کا وقار سب اپنی اغراض کے لیے داؤ پر لگا دیا ہے۔ مجھے تو یوں جان پڑتا ہے جیسے ان کا خون سفید ہو گیا ہے۔ اچھے برے کی تمیز ختم ہو گئی ہے۔ میرے اللہ تو مہربان ہے انہیں ہدایت دے۔''

آج صبح ہی صبح اس کی طبیعت سخت مکدر ہوگئی۔ ابھی سورج اچھی طرح نہیں نکلا تھا کہ اس کی منجھلی بھاوج اور تیسرے نمبر کی بہن میں خوفناک قسم کی جنگ چھڑ گئی۔ جلتا بھنتا وہ اپنے بستر سے اٹھا اور باہر آ گیا۔ کھڑے پر بیٹھ کر اس نے گلی میں نظر دوڑائی۔ ابھی اس کی چہل پہل اور رونق بحال نہیں ہوئی تھی۔ اِکا دُکا لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ اندر سے آوازوں کا شور گھٹنے کی بجائے بڑھ رہا تھا اور وہ پریشان خود سے باتیں کیے جاتا تھا۔

امریکا نے کتنا ظلم کیا تھا۔ ہیروشیما اور ناگاساکی پر بم برسائے۔ بھولے بھالے معصوم جاپانیوں کو تباہ و برباد کیا۔ میری مانتا تو ایک بم یہاں گراتا۔ اس گھر کو کتنی اشد ضرورت ہے کسی ایسی ہولناک تباہی کی جو اس کے مکینوں کو موت کی میٹھی نیند سلا دے... کیونکہ جیون کی سکون بھری نیندیں انہوں نے اپنے اوپر حرام کر لی ہیں۔ کاش میرے بس میں ہوتو ان کے چیختے چلاتے اور چنگھاڑتے گلوں میں لکڑیاں ٹھونس دوں کہ ان کے گلے پھٹ جائیں اور ان سے کوئی آواز نہ نکلے۔

لڑنے جھگڑنے والی کوئی بات تو نہ تھی۔

کل نور الٹماں دیوان کے ہاں گھر کی سب عورتیں ولیمے کی دعوت میں شرکت کے لیے گئی تھیں۔ سگ بازار سے بابا کے چچیرے بھائی کا کنبہ بھی آیا ہوا تھا۔ دیوان جی کی بڑی بہو اوّل نمبر کی کٹنی اور چالباز عورت تھی دیر جانے منجھلی بھابی کے کان میں کیا کیا کانا پھوسیاں مارتی رہی۔ کس کس کے خلاف لگائی بجھائی کی کہ منجھلی بھابی تو وہیں پھوں پھوں کرنے لگیں۔

تائی اماں نے کہا۔ ''اے دلہن کاہے کو اتنا چلا چلی کرتی ہو۔ آپے میں رہو۔''

منجھلی بھاوج ایسی بیوقوف۔ سمجھی سارا کیا دھرا نند کا ہے جس نے تائی اماں جیسی صبح جو قسم کی عورت کو اتنے سخت لفظ کہنے پر مجبور کر دیا۔ منہ بند اور پیٹ پھلائے جانے اس نے... رات کیسے گزاری؟

صبح شامت اعمال سے نند کا چھوٹا بیٹا لڑھکتا لڑھکاتا اس کے حصے میں آ گیا اور پاخانہ کر دیا۔ اونگھتے کو ٹھیلے کا بہانہ جو شروع ہوئیں تو بھادوں کی بارش کی طرح رکنے کا نام نہ لیں۔

بڑے بھیا گھاٹ تک سیر کے لیے گئے ہوئے تھے۔ وہ واپس آئے تو گھر میں حشر کا سا سماں تھا۔ بہتیرا چپ کروایا پر منجھلی بھابی تو اس دن طعنوں کی توپ و تفنگ سے نند کو اس طرح گھائل کر دینا چاہتی تھی کہ وہ دنوں اس تواضع کو یاد رکھے۔

اس نے گلی میں چاروں طرف پھر نظریں دوڑائیں۔ پھول محمد کی دکان پر کافی بھیڑ تھی۔ چھوٹے چھوٹے بچے گلاس ہاتھوں میں پکڑے گائے کا پاؤ پاؤ بھر دودھ لینے کے لیے کھڑے تھے اور ایک دوسرے سے پہلے لینے کے لیے حلق کی پوری آواز سے اسے متوجہ کرنے میں مصروف تھے۔

عبدالرب اپنی سائیکل پر گزرا اور تازہ اخبار اس کی طرف پھینکتا ہوا بولا۔ ''خواجہ ناظم الدین کو برطرف کر دیا گیا۔''

اس نے چونک کر اسے دیکھا اور اخبار پکڑ کر اپنے گھٹنے پر پھیلاتے ہوئے تیزی سے اس پر نظریں دوڑائیں۔

پہلی شہ سرخی اس کی برطرفی کی تھی۔

''یہ بہت غلط ہوا ہے۔'' اس نے اپنے آپ سے کہا۔

اور جب اس نے خبر کی تفصیل اور اداریہ پڑھ لیا تب وہ دکھ بھرے لہجے میں اپنے آپ سے بولا۔ ''امن، سکون اور شانتی کیسے دنیا سے اٹھتی جا رہی ہے؟ گھر ہوں یا ملک ہر جگہ مال و زر کے حصول کی اندھی ہوس اقتدار اور کرسیوں کی تڑپ نے حق سچ کو تہہ تیغ کر دیا ہے۔''

اور اخبار الٹا کر جب وہ اندر گیا تو اس کی بڑی سے چھوٹی بہن دلدو آپا کے بچے بھی اس خبر پر تبصرہ کر رہے تھے۔

☆☆☆

اب ایسی بھی کوئی بات نہ تھی کہ وہ اپنی اس گھبراہٹ اور بے چینی کو جیوں بیٹھے بٹھائے تپ ملیریا کی طرح یکدم اس پر چڑھ دوڑی تھی کہ پس منظر سے ناواقف تھا۔ ٹھنڈے پانی سے لبالب بھرے دو گلاس اس کے اندر یوں گئے جیسے مئی جون میں تپتی زمین پر ایک قطرہ پانی پڑے اور بھک سے اڑ جائے۔ ابھرتے، ڈوبتے اور مضطرب دل کو ذرا بھی سکون اور چین نہ ملا۔

میز پر فائلوں کا انبار پڑا تھا۔ اس کا جی نہیں چاہتا تھا کہ وہ کسی فائل کو ہاتھ لگائے اور کھولے۔ اس کا اسسٹنٹ نور الٹماں آیا۔ صوبائی سطح پر چند دنوں بعد جنرل مینجروں کی جو اہم میٹنگ چٹاگانگ میں ہونے والی تھی... وہ اس کا ایجنڈا Approval کے لیے لایا تھا۔ اس نے بے دلی سے کاغذ اس کے ہاتھ سے پکڑا۔ میز پر پیپر ویٹ کے نیچے رکھا اور سر کے اشارے سے اسے چلے جانے کو کہا۔ چپڑاسی ریجنل ڈائریکٹر کے پاس سے فائل لایا اس نے وہ بھی پکڑی اور بغیر کھولے میز پر ڈال دی۔

اس کا ذہن گڈمڈ سا ہو رہا تھا۔ کسی بھی کام پر توجہ دینے کے لیے تیار ہی نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد وہ اٹھا۔ اپنے چھوٹے

سے کمرے میں اِدھر اُدھر چکر کاٹنے لگا۔ پھر شیشے کی دیوار سے باہر دیکھنے لگا۔

سڑک پر آگے پیچھے نئی نویلی اور پرانی کاروں اور سائیکل رکشاؤں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ موتی جھیل کا کمرشل ایریا، زیرِتعمیر عمارتوں کا ایک لامتناہی سلسلہ، سامنے جناح ایونیو کی شاندار دکانیں اور ان کے دروازوں میں داخل ہوتے اور باہر نکلتے صاحب ثروت لوگ۔

اس منظر میں اس کے لیے کوئی نیا پن یا کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ جب سے وہ یہاں ملازم ہوا تھا اور یہ کمرا اس کی تحویل میں آیا تھا۔ وہ سینکڑوں بار یہ سب دیکھ چکا تھا۔ پر جانے آج کیا بات تھی؟ اس نے اپنے آپ سے کہا تھا۔ ''ڈھاکا کس تیزی سے اپنی جون بدل رہا ہے۔ سر بفلک عمارتیں اپنے دامنوں میں آباد جھونپڑوں کا مذاق اڑاتی ہیں۔ دھوتیاں صنعتی ترقی نے کونے کھدروں میں چھپا دی ہیں۔ تیزی سے بدلتی اقدار نے معاشرتی زندگی کا ڈھانچا بدلنے پر کمر کسی ہوئی ہے۔ خلوص، پیار اور محبت پر بھی کائی سی جم گئی ہے۔ ہر ایک نتانوے کے چکر میں الجھا ہوا نظر آتا ہے۔

وہ میز پر دوبارہ آ کر بیٹھ گیا۔ کلائی پر نظر ڈالی۔ ابھی ایک بجنے میں آدھ گھنٹا باقی تھا۔

اس نے اکتاہٹ کے انداز میں اپنے دونوں بازو اوپر اٹھائے۔ فون کو دیکھا، بغیر کسی ارادے کے ریسیور کریڈل سے اٹھایا۔ ہاتھوں میں ہلکے ہلکے گھماتے ہوئے اس نے خود سے کہا تھا۔

یہ فون ہی تو ہے جس نے اسے اضطراب میں ڈال دیا ہے۔ بات تو بس اتنی سی تھی کہ وہ تو کام میں پورے انہماک سے مگن تھا۔ بس ابھی تھوڑی دیر پہلے اس کے بڑے بھانجے احتشام الرحمن کی بیوی نجمہ احتشام نے اسے فون پر دوپہر کا کھانا اپنے ہاں کھانے کی دعوت دی تھی۔ اس نے معذرت کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ آج نہیں آسکے گا۔ دفتر میں کام بہت ہے لیکن نجمہ احتشام نے اسے صورتِ حال سے آگاہ کرتے ہوئے بتایا کہ اس کی دونوں چھوٹی بہنیں رات کلکتہ سے آئی ہیں۔

اس کا ہاتھ یہ بات سنتے ہی اک ذرا لرزا تھا۔ دل بھی دھڑکا کیونکہ دونوں بہنوں کی کلکتہ سے آمد اور اس کا کھانے پر مدعو کیا جانا ایک ہی سلسلے کی کڑی تھا۔ ان دونوں میں سے ایک کو اسے اپنی بیوی کے طور پر پسند کرنا تھا۔ اس نے پہنچنے کا وعدہ کیا اور فون بند کر دیا۔

تب سے یہی چھوٹا سا واقعہ اس کی بے چینی اور الجھن کا باعث بنا ہوا تھا۔ طبعاً وہ کچھ اتنا شرمیلا لڑکا بھی نہ تھا پر شاید یہ دیکھنے دکھانے والا سلسلہ نفسیاتی طور پر عجیب سے تاثرات قلب و ذہن پر منعکس کر رہا تھا اور جب ایک بج گیا وہ کرسی سے کھڑا ہو گیا۔ اس نے تنقیدی نظر اپنے کپڑوں پر ڈالی۔

''ٹھیک ہی ہیں۔'' اس نے اپنے آپ سے کہا۔

پر جب وہ لفٹ سے نیچے جانے کے لیے اس میں داخل ہوا اور شیشے میں اپنے سراپے کا ناقدانہ جائزہ لیا؟ اس کے جی میں آئی کہ اگر وہ گھر جا کر کپڑے تبدیل کر لے تو زیادہ مناسب ہوگا پر اگلے لمحے اس نے اس خیال کو جھٹک دیا۔ سج سجا کر جانے کے تصور سے ہی اسے عجیب سی وحشت کا احساس ہوا۔

''لعنت بھیجو۔ یہ کچھ کچھ شکنوں والے کپڑے، ذرا ذرا بکھرے بال، چہرے پر بکھرا قدرے مصروفیت کا پرتو شخصیت کی گمبھیرتا کا عکاس ہے۔ کالجوں میں پڑھنے والی وہ لڑکیاں میرے اس رویے سے جان جائیں گی کہ میں نے ان کا گھٹیا نوٹس نہیں لیا۔''

گراؤنڈ پر پہنچ کر وہ اپنے نئے نویلے ہنڈے کی طرف بڑھا۔ گ بازار کی طرف جاتے ہوئے کتنے ہی خیال اس کے دماغ میں آئے اور ہینڈلوں پر اس کی مضبوط گرفت پر اثر انداز ہوئے۔

گھر کے برآمدے میں ہی اسے نجمہ نظر آ گئی جس نے اس کا استقبال معنی خیز مسکراہٹ سے کیا اور اسے لیے ڈرائنگ روم میں آ گئی۔

اور پھر یوں ہوا کہ نجمہ احتشام کے بے حد خوبصورت ڈرائنگ روم میں دلدوآ پاسے باتیں کرتے ہوئے اس نے آنا فانا ہی وہ فیصلہ کر ڈالا جس کا خیال ہی اسے بولائے جا رہا تھا۔

وہ سرو قد نازک سی لڑکی جو ابھی تھوڑی دیر پہلے کمرے میں آ کر داہنے ہاتھ کے صوفے پر بیٹھی تھی اسے بے طرح بھا گئی۔ وہ یقیناً کسی طرح بھی اپنی اس بہن سے اچھی نہ تھی۔ جس کی چمپئی رنگت، گردن تک کٹے بالوں کے درمیان پوری آب و تاب سے چمک رہی تھی۔ جو شانتی نکیتن کی اسٹوڈنٹ تھی اور کتھک سے لے کر رمبا تک سبھی طرح کے رقص کرنا جانتی تھی۔ جو سنا تھا بہت اچھا گاتی ہے اور اس وقت بھی بڑی میٹھی آواز میں باتیں کر رہی تھی۔

پر پتا نہیں اسے یہ سب کیوں اپیل نہ کیا۔ اس نے دیکھا سانولے سے ایک وجود نے برآمدے میں سے گزرتے

ہوئے بڑی ادا سے نفیس کڑھت کی سوتی ساڑی کے لمبے آنچل کو پام کے پودوں سے الجھنے سے بچایا اور جب اس نے ایسا کیا تھا وہ بہت دلکش نظر آئی تھی۔ وہ جولیڈی برے بورن کالج کلکتہ میں تھرڈ ڈائیر میں پڑھتی ضرور تھی پر جسے رقص و موسیقی سے ذرا بھی لگاؤ نہ تھا لیکن اس کے باوجود اس لڑکے نے فیصلہ کیا کہ یہی اور صرف یہی لڑکی اس کی زندگی کی ساتھی بنے گی۔

☆☆☆

اور جب خلیج بنگال کی مون سون کلکتے پر چھاجوں پانی برسا رہی تھیں۔ دھرم تلے میں واقع پیل پایوں والے اس وسیع و عریض گھر کے آراستہ پیراستہ کمرے میں اسے انگوٹھی پہناتے ہوئے اسے ایک بار بھی یہ خیال نہ آیا تھا کہ سانولی سی رنگ والی یہ سروقد لڑکی جس کے حسن سادہ نے پہلی ہی نظر میں اس کے دل کے خوابیدہ تاروں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا اور جو اب طاہرہ پنی کی بجائے طاہرہ رحمٰن بن رہی ہے۔ آنے والے سالوں میں ایک انتہائی تیز طرار اور رعب دوب والی بیوی ثابت ہوگی۔

آسمان کے سینے میں چھید ہوگئے تھے جن میں سے پانی ایک تواتر کے ساتھ بہہ رہا تھا۔ آنگن میں اگے کیلے کے درخت ہوا کے زور سے جھکے پڑتے تھے اور اشوک کے پھولوں کا رنگ نکھرتا جا رہا تھا۔

پرانی تیز بارش کا اثر اس گھر میں ہونے والی تقریب پر بس معمولی سا تھا۔ مشرقی اور مغربی بنگال دونوں ہی اس کے عادی ہوگئے تھے۔ ان بارشوں سے انہیں کہیں فرار نہ تھا۔

منگنی کی رسم بڑے ہال میں ہو رہی تھی۔ دو دھیا ٹیوبوں کی روشنی کے ساتھ ساتھ سینکڑوں موم بتیوں کی زرد زرد روشنی کمرے میں پُراسرار سا اجالا بکھیر رہی تھی۔ موم بتیاں خوبصورتی کے ساتھ ساتھ دفاعی انتظامات کے تحت روشن کی گئی تھیں کہ اگر برقی روشنیاں گل ہو جائیں تو اندھیرا بدشگونی کا موجب نہیں بننا چاہیے۔ جیون کا یہ بندھن رنگ و بو کے ساتھ شروع ہو اور ایسے ہی ختم ہو۔

طاہرہ کی ماں اس سلسلے میں کچھ زیادہ ہی توہم پرست واقع ہوئی تھی۔ بڑی بہو اور بیٹی کو کوئی بیس بار تاکید کی ہوگی۔ دس بار خود اٹھ کر جائزہ لیا تھا۔

شانتی نکیتن اور لیڈی برے بورن کالج کی شوخ و شنگ لڑکیوں نے ادھم مچا کر کمر اسر پر اٹھا رکھا تھا۔

وہ جب طاہرہ پنی کے منجھلے اور بڑے بھائی کے ساتھ رسم کی ادائیگی کے لیے ہال میں آیا تو اس کا سواگت جس طرح ہوا وہ اسے بوکھلانے کے لیے کافی تھا۔ لڑکیوں سے تو اس کا خاندان بھی اٹا پڑا تھا۔ یوں بھی وہ چھ سال تک لڑکیوں کے ساتھ پڑھتا رہا تھا۔ گھبرانے والی بات تو نہ تھی پر ایک تو کلکتہ کی کان کاٹتی لڑکیاں دوسرے موقع محل کی مناسبت۔

خوشگوار موسم کے باوجود اس کی پیشانی قطروں سے بھر گئی اور چہرہ سرخ ہوگیا۔ بے بسی سے اس نے دور کونے میں بیٹھی اپنی بہن دلدو آپا کو دیکھا جو چیت پور روڈ سے آئے ہوئے اپنے سسرالی عزیزوں کے ساتھ مل کر بنگلہ لوک گیت گا رہی تھیں۔ انہوں نے اس کی پریشانی کا خیال کیا اور فوراً ہی اٹھ کر اس کے پاس چلی آئیں۔ اس کے شانوں پر محبت سے اپنے دونوں ہاتھ رکھتے ہوئے انہوں نے کہا۔ ”اے گھبرا کیوں گئے ہو؟ اپنے ہی تو لوگ ہیں۔“

خوبصورت لڑکیوں کے جلو میں گلابی ساڑی میں لپٹی طاہرہ پنی کو عین اس کے سامنے صوفے پر لا کر بٹھایا گیا۔

دلدو آپا نے انگوٹھی اس کے ہاتھ میں پکڑاتے ہوئے کہا۔

”لو پہناؤ اسے۔“

اور وہ تذبذب میں ڈوبا یہ سوچ رہا تھا کہ وہ اب کیا کرے۔ حواس تو قابو میں ہی نہ تھے۔ دائیں بائیں کے فرق کا کیا پتا چلتا۔ اس کی بہن نے اس مشکل کو سمجھا اور انہوں نے جب اس کا ہاتھ پکڑ کر دلہن کی طرف بڑھانا چاہا تو لڑکیوں نے بہت غل غپاڑہ مچایا۔ ”کیا کرتی ہیں دلدو آپا۔ واہ اتنے تو دودھ پیتے بچے نہیں ہیں۔“

دو تین لڑکیوں کا قلقاریاں مارتی ہنسی کا غبارہ جیسے فضا میں پھٹا۔

”لو میاں شادی کرنے آئے ہیں۔“

اور دلدو آپا جھلا کر بولیں۔ ”نیک بخت دم لو۔ کچھ بعد کے لیے بھی رکھ لو۔“

پر لڑکیاں تو جیسے ادھار کھائے بیٹھی تھیں۔ یوں تابڑ توڑ حملے کیے کہ وہ مزید بوکھلا گیا۔ اب طاہرہ پنی کی ماں نے مداخلت ضروری سمجھی۔

”بس کرو اب۔ بہتیرا ستا لیا ہے باقی کا شادی پر ادھار۔“

دائیں بائیں معمر خواتین آکر کھڑی ہوگئیں اور ان کی مدد سے اس نے اس پل صراط کو جس پر سے وہ پھسلا جاتا تھا جیسے تیسے کر کے پار کر ہی لیا۔

پھر جب مونسونوں کا سارا زور شور ختم ہوگیا اور وہ برس

برس کر ہانپ گئیں تب وہ اپنے چیدہ چیدہ عزیزوں کے ہمراہ اسے کلکتہ سے بیاہ کر ڈھاکا لے آیا۔ اس قدیم تاریخی گھر میں اتارنے کی بجائے وہ اپنی دلہن کو بیت المنیرہ لے گیا جہاں تین کمروں کا ایک خوبصورت سا گھر اس نے کرائے پر لے لیا تھا۔

جہاں آرا اور دلدو آپا چاہتی تھیں کہ دلہن اس گھر میں اپنا پہلا قدم رکھے جو ان کے باپ کی میراث تھا۔ انہوں نے اس پر زور بھی دیا۔ دوسری بہنوں اور بھائیوں نے بھی اپنی سی کوشش کی کہ وہ چند دنوں کے لیے دلہن کو اس گھر میں رکھنا چاہتے ہیں۔ ان کے اصرار کو اس نے خوبصورتی سے ٹال دیا۔ پر جہاں آرا آپا کے سامنے اس نے اپنے پھپھولے ضرور پھوڑ دیئے تھے۔

''آپ مجھے مجبور مت کریں۔ میں ایسی رسوم اور شگن کا ہرگز قائل نہیں۔ اب اتنی ممتا پھٹ پڑی ہے انہیں میری۔ جب وقت تھا تو کوئی منہ لگانا پسند نہیں کرتا تھا۔''

اس نے قسم کھا رکھی تھی کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو کر کبھی اس گھر میں نہیں رہے گا۔ وہ گھر جہاں وہ سدا اجنبی ہی رہا۔ اب تو نہ صرف وہ صاحب روزگار تھا بلکہ ایک عدد بیوی کا شوہر بھی بن گیا تھا۔ اب ایسے میں وہ اپنی قسم توڑتا اور اس ماحول میں چند سانس لینے کے لیے دوبارہ آتا جس کی متعفن اور دھواں دھواں فضا میں اس کا دم گھٹتا تھا۔

بہنوں، بھاوجوں اور بہنوئیوں نے چپا چپا کر باتیں تو کیں لیکن بھاوجوں نے شکر بھی ادا کیا کہ مصیبت ٹلی۔ مفت میں جو یہاں ڈٹ کر بیٹھ جاتے تو کیا ہوتا؟ گھر تو پہلے ہی تنگ ہو رہا ہے۔ پرچوتھے اور پانچویں نمبر والی بڑی تلملائیں۔ دونوں نے اکٹھے بیٹھ کر دیور اور دیورانی کے چیتھڑے کر ڈالے۔ سات پشتیں گن ڈالیں۔

آنے والی کا اونچا مقدران کی نس نس میں زہر گھول رہا تھا۔ اپنا ہر دکھ انہیں یاد آیا تھا اور وہ خون کے آنسو روئی تھیں۔ اپنے اپنے شوہروں کا دیور سے موازنہ کرتے ہوئے دونوں نے شوہروں کے ساتھ ساتھ اپنے نصیبے کو بھی جی بھر کر کوسا۔

طاہرہ رحمٰن ایک ذمے دار بیوی ثابت ہوئی۔ اپنے نئے نویلے ہنڈے پرنئی نویلی دلہن کے ساتھ اس نے اولڈ اور نیو ڈھاکا کی ہر گلی اور سڑک کو روندا جہاں اس کے عزیز اور رشتہ دار رہتے تھے۔ اس کا خاندان ڈھاکا کی قدیم تہذیب کا علمبردار تھا۔ گھر کی خواتین برقعے کے بغیر باہر نہ نکلتی تھیں۔ پر وہ ان دقیانوسی جھمیلوں میں بالکل نہ پڑا۔

☆☆☆

''میں کیا چاہتا ہوں۔''

اس وقت جب منگولیا کے پھولوں کی خوشبو فضا میں تیرتی پھر رہی تھی۔ کیلے کے درختوں کی شاخیں ہواؤں کے بوجھ سے یوں جھکی پڑتی تھیں جیسے ابھی ٹوٹ کر زمین پر گر جائیں گی۔ دکنی ہواؤں نے پپیتے کی شاخوں کو بھی رقص کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وکٹورین طرز کے دریچے میں نیلے دھاگوں سے لپٹی روکتھوریدی اور منی پلانٹ کی بیلوں کے ننھے منے پتے بھی پھڑ پھڑا رہے تھے۔

سورج کی روپہلی کرنیں دریچے کے راستے خوابگاہ میں داخل ہو کر عجیب سی اداسی کا احساس بکھیر رہی تھیں۔

اس نے تکیے کو دوہرا کیا۔ اس سارے ماحول پر گہری نظر ڈالی اور پیٹ کے بل دوہرا ہوتے ہوئے آنکھیں موند کر اپنے آپ سے یہ سوال کیا۔ ''ایک کمزور، مریل اور دبو قسم کی بیوی۔''

''ہاں۔'' وہ دھیرے سے بڑبڑایا۔

اس نے بالوں میں ہاتھ پھیرا، کروٹ بدلی اور دوبارہ اپنے آپ سے بولا۔ ''شاید نہیں۔''

اس نے ''ہاں اور نہیں۔'' دونوں جواب اپنے آپ کو خود ہی دیئے۔ سوال بھی اپنے آپ سے ہی کیے تھے۔

اس کے چہرے پر اندرونی اضطراب کا ہلکا سا غبار چھپایا ہوا تھا۔ چہرہ اس تازگی سے خالی تھا جو رات کو پُرسکون نیند لینے پر صبح دم پیدا ہوتی ہے۔

کلب میں رات گالا نائٹ منائی گئی۔ خلاف معمول اس نے ڈرنک بھی بہت کی اور رقص بھی کرتا رہا۔

اس وقت منہ کا ذائقہ کسیلا ہو رہا تھا۔ پنڈلیوں میں اینٹھن سی تھی۔ دل اٹھنے پر مائل نہ تھا۔ چڑھتی دھوپ بتا رہی تھی کہ وقت نو کے قریب ہے۔

برآمدے میں برتنوں کی کھٹ کھٹ شروع ہو گئی تھی۔ برتنوں کی کھٹکھٹاہٹ سے اسے ازلی بیر تھا۔ یہ شور سنتے ہی اسے یوں لگا جیسے اس کے دماغ کی نسیں پھٹ جائیں گی۔

لیٹے لیٹے اس نے گونج دار آواز میں نوکر کو ڈانٹا۔ یہ وہ اچھی طرح سمجھتا تھا کہ طاہرہ کے سوا نوکروں میں اتنی جرات نہیں کہ وہ صاحب کی موجودگی میں برتنوں کے ساتھ دھینگا مشتی شروع کر دیں۔

جب بھی رات کو اسے گھر آنے کے لیے دیر ہوتی۔ اگلی صبح برتنوں کو ضرور بجایا جاتا۔ یہ ناراضگی کا واضح سگنل تھا جسے

ان دونوں کے علاوہ بچے اور نوکر بھی سمجھتے تھے۔

سائڈ ٹیبل سے اس نے کلائی کی گھڑی اٹھا کر وقت دیکھا۔ نو بج رہے تھے۔ چند بار اس نے پھر دائیں بائیں پہلو بدلے۔ ہاتھ بڑھا کر میز سے ٹرانسسٹر اٹھایا۔ مختلف اسٹیشنوں کو ٹیون کرتا رہا۔ کہیں سے کوئی اچھی چیز سننے کو نہ ملی۔ جھلا کر اسے بند کیا اور وہیں رکھ دیا۔

رات اس کی واپسی تین بجے کے قریب ہوئی تھی اور یہ بھی اتفاق ہی تھا کہ جب وہ ڈھاکا کلب سے گھر جانے کے لیے نکل رہا تھا اس کا ٹکراؤ بادل سے ہوا جس نے گاڑی کی کھڑکی سے چہرہ نکال کر اسے کہا۔ ''میں تمہیں لینے آیا تھا۔''

''کہاں کا ارادہ ہے؟'' اس نے جواباً پوچھا۔

''میرے پیچھے آؤ۔''

گاڑی میں بیٹھے بیٹھے اس نے جانے سے معذرت کی۔ طاہرہ کی ناراضگی کا عذر پیش کیا مگر بادل اس وقت سچ مچ کا زوردار بادل بنا ہوا تھا جو اس کے انکار کی صورت میں فوراً برس پڑتا۔

''ہٹاؤ یار کیا بور کرتے ہو؟ میں تمہیں خاص طور پر لینے آیا تھا۔''

وہ جانتا تھا بادل ٹلنے والی شے نہیں۔ عافیت اسی میں تھی کہ چپ چاپ گاڑی اس کے تعاقب میں ڈال دے۔

ڈھاکا کینٹ میں کرنل غلام سرور کے ہاں محفل رنگ و بو سجی ہوئی تھی۔ راجن پور کا کرنل سرور جو بادل کا گہرا یار تھا۔ بڑا ہنس مکھ اور باغ و بہار شخصیت کا مالک تھا۔ غائبانہ تعارف تو تھا پر ملاقات آج ہی ہوئی تھی۔ اس وقت جب پوربی ہوائیں درختوں کے پتوں پھولوں کے بوٹوں اور گھاس کے قالینوں پر کسی نازک دوشیزہ کی مانند اٹھکیلیاں کرتی پھرتی تھیں۔ کرنل سرور کی آواز چاروں کھونٹ پھیلی ہوئی تھی۔ ظالم نے کیا گلا پایا تھا۔ ٹیگور کا بنگلہ گیت یوں لگتا تھا جیسے آسمان سے کوئی فرشتہ اپنی لے میں ملکوتی نغمہ فضا میں بکھیر رہا ہے۔

''تم اپنے راج سنگھاسن سے اترے اور میری کٹیا کے دروازے پر آ کھڑے ہوئے۔

میں ایک کونے میں بالکل تنہا کھڑی گا رہی تھی۔ میرا گیت تمہیں سنائی دیا۔ تم میری کٹیا کے دروازے پر آ کھڑے ہوئے۔

میرے سیدھے سادے گیت نے تمہارے پریم کو چھو لیا۔ ایک پھول انعام کے طور پر لے کر تم میری کٹیا کے دروازے پر آ کھڑے ہوئے۔''

لیکن اس وقت غضب ہو گیا جب اس نے ''راگنی آسا'' کا گیت گایا۔ اسے کچھ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ بے حس و حرکت ہو کر زمان و مکان کی قید سے آزاد ہو گیا ہے۔

جو گیت وہ گا رہا تھا۔ اس کا مکمل مفہوم اس کی گرفت میں نہیں آ رہا تھا۔ غالباً سراسیکی زبان تھی لیکن اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا تھا۔ زبان کی مٹھاس، کرنل کی آواز کا سحر اور راگنی آسا۔

سچ تو یہ تھا کہ وہ سانس جانے کیسے لے رہا تھا؟

وہ اچھے گیتوں کا رسیا تھا۔ اچھی آوازوں کا قدر دان تھا۔ بنگالی ہونے کے باوجود وہ بے شمار زبانوں کے گیت سمجھتا اور انہیں شوق سے سنتا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ جب تین بجے کے قریب واپسی ہوئی اس نے کرنل سرور کے ہاتھوں کو عقیدت سے اپنے ہاتھوں میں تھامتے ہوئے کہا۔ ''میں بادل کا شکر گزار ہوں کہ وہ مجھے یہاں لے آیا اور میں نے آپ کو سنا۔ فوجیوں کے بارے میں میرے خیالات ٹینی سن سے مختلف نہیں کہ یہ بس مار دھاڑ والی شے ہیں۔ پر آپ کو سن کر یہ احساس ہوا کہ فن کسی کی میراث نہیں۔''

گھر واپسی کا راستہ اس نے خمار میں ڈوبے ڈوبے طے کیا۔ سویا بھی دیر سے اور جاگا بھی دیر سے۔

آج اتوار کا دن تھا۔ بچوں نے صبح سے کمرے میں ایک بار بھی جھانکا تک نہ تھا۔ طاہرہ نے انہیں ڈانٹ ڈپٹ کر کسی کونے میں بٹھا رکھا ہوگا۔

نوکر نے اندر آ کر ناشتے کے لیے پوچھا۔ اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''ناشتا لگاؤ میں آ رہا ہوں۔''

وہ جب کھانے کی میز پر آیا، نوکر چائے دانی کوئی کوزی سے ڈھانپ رہا تھا۔ ٹی وی لاؤنج ویران تھا۔ استفسار پر نوکر نے بتایا کہ بچے ناشتا کرنے کے بعد ابصار صاحب کے ہاں گئے ہوئے ہیں۔ ان کے بچے انہیں بلانے آئے تھے۔ بیگم صاحبہ اسٹور میں ہیں۔ کل مارکیٹ سے خریدی گئی جنس کو ملازمہ کے ساتھ سمیٹنے میں مصروف ہیں۔

ٹوسٹ پر مکھن لگاتے ہوئے اس نے اپنے آپ سے کہا۔ ''اس بار طاہرہ رحمن تم روٹھنے میں سو فی صد حق بجانب ہو۔ کوئی بھی اچھی بیوی شوہر کا اتنی رات گئے تک باہر رہنا برداشت نہیں کرتی۔ میں تمہیں غصے اور ناراضگی کے اس حق سے محروم کرنا ہرگز پسند نہ کروں گا جو بیوی ہونے کے ناطے تمہیں حاصل ہے۔ پر مجھے اگر شکایت ہے تو بس اتنی کہ غصے کے اظہار کے لیے تم جو طرز عمل اختیار کرتی ہو وہ صرف بھونڈا

ہی نہیں منفی بھی ہے۔ میں اب جب تمہیں منانے کی کوشش کروں گا تو جانتا ہوں تم کس قدر غل غپاڑہ مچاؤ گی اور اسی غل غپاڑے سے میری جان جاتی ہے۔''

چائے کپ میں انڈیلی۔ اتنی گرم نہ تھی جتنی وہ پینے کا عادی تھا۔ ناشتے کا سارا مزہ کرکرا ہوگیا تھا۔ بھناتے ہوئے اس نے کپ میز پر پٹخا اور نوکر سے بولا۔ ''اس شربت کو پلانے کے لیے تم گھنٹا بھر سے اپنی ٹانگیں توڑ رہے تھے۔''

نوکر نے مسکینی سے کہا۔ ''صاحب میں نے اسے ٹی کوزی سے اچھی طرح ڈھانپا تھا۔ میرا خیال تھا یہ کافی گرم رہے گی۔ آپ.....''

اس کے ماتھے پر تین چار بل پڑے۔ ترشی سے اس کی بات کاٹتے ہوئے وہ بولا۔ ''بڑی ڈھیٹ ہڈی ہو تم۔ کتنی بار کہا ہے میرے سامنے فضول قسم کے عذر لنگ مت پیش کیا کرو۔''

''صاحب میں دو منٹ میں اور بنا لاتا ہوں۔''

''رہنے دو۔''

اس نے کپ ویسے ہی میز پر رکھ دیا اور اٹھتے ہوئے بولا۔ ''جاؤ بچوں کو ابصار صاحب کے ہاں سے لے آؤ۔''

ابصار صاحب ان کے پارٹنر تھے۔ بہت مخلص، ہمدرد اور ایمان دار سے ساتھی۔ رہنے والے تو میمن سنگھ کے تھے۔ کوئی چھ سال قبل انہوں نے مسٹر خان کی پارٹنر شپ سے چائے کا کاروبار شروع کیا تھا۔ مسٹر خان سرکاری ملازمت کی وجہ سے پس پردہ تھے پر وہ انہیں ساری سہولتیں اور مواقع فراہم کر رہے تھے جنہوں نے تھوڑے ہی عرصے میں اس کاروبار کو خاصا عروج دے دیا تھا۔

وہ اپنے کمرے میں پہنچ کر لان میں کھلنے والی کھڑکی کے پاس جا کر کھڑا ہوگیا تبھی دو صحت مند بچے اچھلتے شور مچاتے آکر اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئے۔ باری باری ان کے رخساروں پر پیار کرتے ہوئے اس نے کہا۔ ''تم لوگ صبح سے کہاں غائب تھے؟ میرے پاس کیوں نہیں آئے؟''

''پپا ہم لوگ مونی اور دلو کے ساتھ لوڈو کھیل رہے تھے۔ آپ نے بلایا تو کھیل ادھورا چھوڑ کر چلے آئے۔''

لڑکی نے جو عمر میں لڑکے سے چھوٹی تھی آنکھیں گھمائیں اور ہونٹوں کو اس کے پاس لاتے ہوئے پُراسرار انداز میں بولی۔ ''پپا مما آپ سے ناراض ہیں؟''

''تمہاری ممی بہت خراب ہیں۔ ہر وقت مجھ سے لڑتی رہتی ہیں میں نے انہیں گھر سے نکال دینا ہے۔''

''ہائے پپا۔'' اس نے دیکھا بیٹی کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ فوراً اس نے اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹا۔ گالوں پر پیار کیا۔

''میری جان دوتی۔ کیوں پریشان ہوگئی ہو؟''

''پپا۔'' بچی نے اپنے ننھے منے ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھام لیا اور اس کے گالوں پر پیار کرتے ہوئے بولی۔ ''ہمیں کھانا کون کھلائے گا؟ ہمارے کپڑے کون سیئے گا۔ ہمیں اسکول کون چھوڑنے جائے گا؟'' ہمیں باہر کون لے کر جائے گا؟

''بس تو اتنی سی بات کے لیے گھبرا گئی ہو۔ ارے بھئی کریم کھانا پکائے گا۔ نذر ل میری بٹیا رانی کو سیر کروائے گا۔ اور ڈرائیور میری منی سی گڑیا کو اسکول چھوڑ کر آئے گا۔''

''چھی چھی پاپا۔'' بچی نے برا سا منہ بنایا۔

''کریم کھانا پکائے گا۔ وہ بہت گندا ہے میں اس کے ہاتھ کا کھانا نہیں کھاؤں گی۔''

چلو کاظم بابا سے کہیں گے وہ کھانا پکائے۔

''نہیں پپا آپ ممی کے ساتھ صلح کرلیں۔''

''اچھا چلو تمہاری ممی کے پاس چلتے ہیں۔ وہ فیصلہ کریں گی۔''

اس نے دونوں بچوں کی انگلیاں پکڑیں اور اسٹور روم کی طرف چل پڑا۔

اور وہاں طاہرہ رحمٰن چاول، دالوں اور چینی کے ذخیرے میں گھری بیٹھی تھی۔

اسٹور کے چھوٹے سے دروازے میں ٹھہر کر اس نے ناک سے سوں سوں کی زوردار آوازیں نکالیں اور بولا۔ ''بچو پھر نہ کہنا۔ پولیس پکڑ کر لے جائے گی تمہاری ماں کو۔ ذخیرہ اندوزی شروع کردی ہے اس نے۔''

دالوں کو مختلف ڈبوں میں سینتی ہوئی ملازمہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ بیٹے اور بیٹی نے بھی قہقہہ لگایا۔ پر وہ چہرے پر برہمی کے آثار لیے بیٹھی رہی... اور پھر یوں ہوا کہ ملازمہ باہر چلی گئی۔ بچوں کو بھی اس نے بہلا پھسلا کر کھیلنے کے لیے بھیج دیا اور رات کلب میں گالا نائٹ منانے اور راکنی آسا کے گیت سننے کا معاوضہ اسے ڈیڑھ دو گھنٹا کی مسلسل منت و خوشامد اور طاہرہ رحمٰن کی کڑوی کسیلی باتیں سن کر صبر کرنے کی شکل میں ادا کرنا پڑا۔

اور شام کو جب اس نے باہر جانے کے لیے گاڑی نکالی تو ''بنانی'' کی اس نسبتاً ویران سڑک پر گاڑی روک کے اسٹیئرنگ پر سر رکھے وہ کتنی دیر تک صرف یہ سوچتا رہا کہ یہ شام کہاں گزاری جائے؟

ہیلن مارلے کے ہاں۔ صبیحہ کے پاس یا مسز امجد کے گھر۔ دیر بعد اس نے سر اٹھایا۔ سڑک کی ویرانی کو گھورا اور چابی گھماتے ہوئے بڑبڑایا۔ ''لعنت بھیجو ان سبھوں پر۔'' سوسائٹی گرلز ایک سے ایک بڑھ کر فلرٹ۔ اور جب وہ ایک لمبی ڈرائیو کے بعد واپس آرہا تھا تو وہ تشنہ سی آرزو اس کے لبوں پر پھڑپھڑائی جو اکثر و بیشتر اسے بے چین رکھتی تھی۔

''جی چاہتا ہے ایک معصوم بھولی بھالی اور دبو قسم کی لڑکی میری دوست ہو۔''

☆☆☆

ماں جی کہا کرتی تھیں قیامت کے روز سورج سوا نیزے پر آجائے گا۔ پر مجھے تو یہ آج ہی سوا نیزے پر آیا ہوا لگتا ہے۔

جون کی چلچلاتی دوپہر میں جب زمین بھٹی میں دانوں کی طرح بھن رہی تھی وہ گھر کی چھت کی دیوار کے چھوٹے سے سائے میں بیٹھی کسی بھارتی مصنف کا ایک فضول سا ناول پڑھنے میں لگی ہوئی تھی۔ یہ ناول اسے اپنی کلاس فیلو سے ملا تھا جس نے اسے دیتے ہوئے اس کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیئے تھے۔

اس نے تو جتنے صفحے پڑھے تھے۔ سر پیر کا ہی پتا نہیں چلتا تھا۔ شاید اس کی ایک وجہ اس کا وہ خوف بھی ہو جو اس کے اعصاب پر سوار تھا کہ گھر کا کوئی فرد اگر اوپر آگیا اور اس کے ہاتھ میں ایسی فضول کتاب دیکھ لی تو سمجھ لو اس کی خیر نہیں۔

یقیناً یہی وجہ تھی کہ اس کی توجہ بٹی ہوئی تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ اٹھتی۔ چھت پر آنے والی سیڑھیوں کو دیکھتی کہ کہیں کوئی کسی خاص ضرورت سے بالائی منزل پر تو نہیں آرہا۔ جونہی اطمینان ہوتا واپس جا کر کتاب سے الجھنے لگتی۔

لو کا ایک جھونکا آتا تو اس کے پسینے میں ڈوبے جسم کو ٹھنڈک کا احساس دینے کے ساتھ ساتھ اس کے نتھنوں میں اس بو کو بھی گھسیڑ جاتا جو اس کے گریبان سے اٹھ اٹھ کر اس کے چہرے کی طرف آتی تھی۔ کھٹی ڈکاروں جیسی یہ بو اسے ہر بار یہ یاد دلاتی کہ اس نے دو دن سے غسل نہیں کیا ہے۔

کہانی پھر گڈمڈ ہونے لگی تھی۔ جب سے اس میں آشا اور پران کود پڑے تھے یا یہ محض اس کا خیال تھا۔ ویسے ناول اسے اپنی ذہنی سطح سے اونچا محسوس ہو رہا تھا۔

لیکن ان سب کے علاوہ بھی ایک بات تھی جو بار بار اس کا دھیان کتاب کے صفحات سے اکھڑوا رہی تھی۔ کبھی خوشی اور اندرونی سکون کا دلکش رنگ اس کے چہرے پر پھیل کر اسے لال گلال کر ڈالتا۔ کبھی ندامت اور پریشانی کے عکس وہاں ویرانیاں بکھیر دیتے۔ کبھی دل اور دماغ میں زور دار جنگ شروع ہو جاتی۔ دونوں ہی ''اچھا کیا'' اور ''نہیں اچھا کیا'' کی زد میں تھے۔

جب دماغ اتنے بکھیڑوں میں الجھا ہوا ہو، الٹی پلٹی سوچوں میں پھنسا ہوا ہو۔ تب کہانی نے خاک پلے پڑنا تھا۔ اب ورقوں کو پیچھے کی جانب بار بار پلٹاؤ اور وہاں کیا لکھا تھا؟ جیسے سوالوں کی تکرار ہی ہوتی تھی۔

وہ جھنجھلا اٹھی۔ اپنے آپ سے باتیں کرنے لگی یوں جیسے اپنا کیس دل کی عدالت میں پیش کیا ہو اور ضمیر کے جج کے سامنے صفائی میں دلائل پر دلائل دیئے جا رہی ہو۔

''ٹھیک ہی تو کیا ہے میں نے۔ ایک اٹھتا ہے تو کند ذہن کا خطاب دیتا ہے۔ دوسرا کہتا ہے دماغ میں بھس بھرا ہوا ہے۔ تیسرے کو اعتراض ہے کہ نالائق برتن مانجھے جو گی رہ جائے گی۔''

ارے میں کوئی کند ذہن ہوں؟ پتا نہیں کیوں سارے میرے ہی پیچھے پنجے جھاڑ کر پڑ گئے ہیں۔ اب اگر میرا دل پڑھائی میں نہیں لگتا تو بھلا اس میں میرا کیا قصور؟

میں بھی دیکھوں گی دونوں کو اب۔ بھلا کتابوں کے بغیر کیسے سبق سنائیں گی ماموں حمید کو۔ کتابیں تو میں نے وہاں پہنچا دی ہیں کہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے مر بھی جائیں تب بھی نہ ملیں۔

اس وقت وہ گرم پانی کی طرح کھول رہی تھی۔ غم و غصے کے ابال اٹھ رہے تھے۔ جلن سے برا حال تھا۔ پر تھوڑی دیر بعد جیسے کسی نے چٹکی کاٹ لی۔

''اچھا نہیں کیا تم نے۔ مار پڑے گی انہیں جب کتابیں نہیں ملیں گی۔ اماں الگ فضیحتا کریں گی۔'' بس تو چھوٹا سا دل ڈوبنے لگا تھا۔

قصہ یوں تھا کہ اس بڑے سے گھر میں جس کے بے شمار کمروں میں ڈھیر سارے لوگ رہتے تھے۔ اس گیارہ بارہ سالہ لڑکی کی رائی برابر بھی اہمیت نہیں تھی۔ یہ دو منزلہ گھر جو اردگرد کے علاقے میں بڑی حویلی کے نام سے جانا جاتا تھا۔ تقریباً سارا اس کی نہال کے قبضے میں تھا۔ اوپر کی منزل کا ایک کمرا اور اس کے ساتھ ایک چھوٹا سا باورچی خانہ اس کی ماں کے پاس تھا جہاں وہ اپنے چھ بچوں کے ساتھ رہتی تھی۔

اس کا باپ فوج میں لانس نائیک تھا۔ وہ لوگ کبھی اس کے ساتھ اس کی ملازمت پر نہ گئے۔ تنخواہ جو تھوڑی تھی۔ اسے

یاد تھا۔ بچپن میں جب اس کا باپ سالانہ چھٹی کاٹ کر واپس جانے لگتا تو وہ اس کی ٹانگوں سے لپٹ جاتی اور اس کے ساتھ جانے کی ضد کرتی جس پر اس کی ماں ڈانٹ ڈپٹ کرتی، تب باپ کہتا۔ ''مت ڈانٹو بچے ہیں نا۔ بڑے ہو کر سب سمجھ جائیں گے۔''

اس کے والدین جہاں غربت کی دلدل میں گھٹنوں گھٹنوں تک پھنسے ہوئے تھے۔ وہیں اس کے ننھیال والوں پر دولت ہن کی طرح برستی تھی۔ اس کے چاروں ماموں اعلیٰ ملازمتوں پر فائز تھے۔ سب سے بڑے گلگت کے ملٹری اسپتال کے ایڈمنسٹریٹو تھے اور گلگت میں پیدا ہونے والی اور پائی جانے والی ہر چیز اس گھر میں تھوک کے حساب سے دیکھی جاسکتی تھی۔ خشک میووں کے کنستر اسٹور روم میں قطار در قطار پڑے رہتے۔ اس کی چھوٹی خالہ دن میں جب کبھی اسٹور میں جاتی تو باہر نکلتے ہوئے اکثر اس کی دونوں مٹھیاں میوے سے بھری ہوتیں جنہیں وہ انگنائی میں کھیلتے بچوں کی ہتھیلیوں پر تھوڑا تھوڑا یوں رکھتیں جیسے دروازے پر کھڑے فقیر کے پھیلے کشکول میں نخرے والی گھر گھرستن مٹھی بھر آٹا ڈال دے۔

''اتنا تھوڑا سا۔'' وہ خود سے کہتی۔

ایک پھکا لگتا اور ہتھیلی خالی ہو جاتی۔ اس کی گرسنہ نگاہیں اسٹور کے بند دروازے کو گھورتیں۔ حسرت کے عکس وہاں نظر آتے۔ تب اسے وہ سلیمانی ٹوپی یاد آتی جس کے متعلق اس نے بے شمار کہانیوں میں پڑھا تھا۔

''اے کاش وہ ٹوپی کہیں میرے ہاتھ لگ جائے تو بس وارے نیارے ہو جائیں۔ سر پر رکھوں اور اسٹور میں گھس جاؤں۔ پہلی ڈبکی تو کالے شہتوتوں کے کنستر میں لگاؤں اور سارے ہڑپ کر جاؤں۔ گری والی خوبانیاں تو ایک نہ چھوڑوں۔''

وہ ذائقوں کے تصور میں چٹخارے لے لے کر خود سے باتیں کیے چلی جاتی۔

اس کا چھوٹا سا ذہن بہت سی باتیں سوچتا رہتا۔ وہ چاہتی تھی کہ اپنے بھائیوں اور بڑی بہن سے پوچھے کہ اس کے ماموؤں کے پاس ڈھیر سارے پیسے کیوں ہیں؟ اور اس کے ابا کے پاس کیوں نہیں؟

لیکن وہ ان سے بہت ڈرتی تھی۔ جب بھی ایسا کوئی سوال اس نے پوچھنا چاہا اسے دھتکار دیا گیا۔ اس کا مذاق اڑایا گیا۔ ایک بار اس کے ایسے ہی کسی سوال پر اس کے تیسرے نمبر کے بھائی نے کہا۔ ''ارے یہ کارل مارکس کی روح اس گھر میں کہاں سے آگئی؟''

پر بڑے بھائی اور بڑی بہن نے دونوں کو ڈانٹا اور اسے اپنے پاس بٹھا کر نرمی سے بتانا شروع کیا۔

''ہمارے ماموں اونچے عہدوں پر بیٹھے ہیں۔ ان کی موٹی موٹی تنخواہیں ہیں۔ وہ امیر ہیں کیونکہ انہوں نے محنت کی۔ ہمارے نانا چھوٹے سے کاشتکار تھے۔ ہمارے ماموں سات کوس کا راستہ پیدل چل کر اسکول جاتے۔ تپتی دوپہروں اور خون جمانے والی سہ پہروں میں اسکول سے واپس آکر باپ کے ساتھ کھیتی باڑی میں ان کا ہاتھ بٹاتے۔ پانی کی باری پر آدھی آدھی رات تک جاگتے۔ لالٹین کی روشنی میں گھنٹوں پڑھتے۔ مشقت ان کی گھٹی میں پڑی۔ ایسے میں اللہ کی مدد بھی شامل حال ہوئی۔ کل جن کٹھنائیوں میں سے انہوں نے خود کو گذارا۔ آج وہ ان کا پھل کھا رہے ہیں۔

اس کا بڑا بھائی چند لمحوں کے لیے بات کرتے کرتے رکا۔ ہنسا اور پھر بولا۔

اب رہے ہمارے ابا۔ ایک تو وہ اپنی ماں بہنوں کے لاڈلے، اوپر سے کام چور۔ پڑھنے جاتے تو لڑکوں سے لڑ جھگڑ کر گھر آجاتے۔ ماں بہنیں لعن طعن کرنے کی بجائے الٹا انہیں شہہ دیتیں۔ ایسے بگڑے ہوئے بچے جب نہیں پڑھتے تو پھر زندگی میں دھکے کھانا ان کا نصیب بنتا ہے۔ اپنے مقدر کے دھکوں میں انہوں نے ہمیں بھی شامل کر لیا ہے۔ ہم بھی کولہو کے بیل کی طرح اچھے دنوں کی اُمید میں اپنے مدار پر چکر کاٹے جا رہے ہیں۔''

ماں بھی وہیں پاس ہی بیٹھی یہ سب سن رہی تھی۔ بیٹا جونہی خاموش ہوا۔ وہ اپنے اندر کی بس گھولتی تلخیاں ہونٹوں پر لائے بغیر نہ رہ سکی۔ ''میں تو شاید حرام کی تھی۔ کوڑے کے ڈھیر پر سے اٹھائی گئی تھی۔ آنکھیں بند کر کے جہنم میں جھونک دیا۔ میرے لیے شاید لوگوں کا قحط پڑ گیا تھا۔ کھاتے پیتے لوگوں کو موت آگئی تھی۔''

وہ اپنی ماں اور بڑی بہنوں کے خلاف زہر اگل رہی تھی۔

''ماں۔'' بڑا بیٹا کھلکھلا کر ہنس پڑا تھا۔ ''خوش رہا کرو۔ تمہارا خالہ زاد، چچا زاد ہے۔ ہر بندے کا اپنا اپنا نصیب ہوتا ہے۔ آپ اگر ابا کے مقدر میں نہ لکھی جاتیں تو ہم جیسے بچے آپ کو کہاں سے ملتے۔''

''بس تو بچے اسی نصیب کے نکھے کو تو بھگت رہی ہوں۔''

اس کے اندر کا کرب جیسے بلبلاتا ہوا چھلک چھلک کر باہر نکل

رہا تھا۔

حالات کے اس جبر نے ماں کے اندر بہت سی تلخیوں کو جنم دے رکھا تھا۔ روزمرہ معمولات میں اکثر و بیشتر اس کا رویہ جارحانہ سا ہوتا۔ ماں بہنوں سے بول چال بھی بند رکھتی۔ ایک گھر میں رہتے ہوئے بھی اچھے ہمسایوں جیسے تعلقات نہ ہوتے۔ چھوٹی موٹی اشیاء جیسے چینی، پتی، آٹا اور دال وغیرہ کا لین دین بھی بہت کم ہوتا۔

سال بعد جب اس کے ماموں اپنے اپنے بیوی بچوں کے ساتھ پھلوں کے ٹوکروں اور دیگر سوغاتوں سے لدے پھندے چھٹیاں گزارنے گھر آتے، تب ایک تھال میں مختلف چیزیں سجا کر اس کی ماں کو بھیجی جاتیں۔ دینے اور لینے کا یہ مرحلہ کس قدر جاں گسل ہوتا۔ اس کی سنگینی کا اندازہ اس سے بڑھ کر کسی کو نہیں تھا۔ دعائیں مانگتے مانگتے اس کی زبان خشک ہونے لگتی۔ ''اللہ ماں پھل واپس نہ کرے۔''

پر یہ دعائیں بہت کم قبول ہوتیں۔ ماں کا طنزیہ ہنکارا کمرے میں گونجتا۔ ''بھوکی نہیں ہوں ان چیزوں کی۔''

تھال ویسے ہی لوٹا دیا جاتا جیسے آتا۔ وہ بس ٹکر ٹکر صورتِ حال کو دیکھتی۔ آنگن میں کھڑی ناخنوں کو دانتوں سے کاٹتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے۔

کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ اس کے بڑے ماموں جو لڑائی جھگڑوں کی تفصیل سے کم ہی دلچسپی لیتے تھے اس کی ماں کو خود چیزیں دینے آجاتے۔ تب ماں انکار نہ کر پاتی اور چپ چپاتے تھال یا سینی رکھ لیتی۔

وہ ماں سے دھپ دھپ مار کھاتی۔ بہن بھائیوں سے پٹتی۔ کزنز کی الٹی سیدھی باتیں سنتی۔ دل ہی دل میں کڑھتی پر کچھ نہ کر پاتی۔

ایک مصیبت یہ بھی تو تھی کہ وہ پڑھنے لکھنے میں بھی بڑی نکمی تھی۔ دماغ جانے کیسا تھا کہ اس میں نصابی چیز تو کوئی گھستی نہ تھی۔ ہاں اِدھر اُدھر کی فضول باتوں کے لیے بہتیری گنجائش تھی وہاں۔

خالو حمید اس کی چوتھے نمبر والی خالہ کے شوہر بڑے صلح کل قسم کی شخصیت تھے۔ ان کا معمول تھا کہ وہ گھر کے سب بچوں کو ہر روز شام کو دو تین گھنٹے پڑھاتے۔ اسے بھی مجبوراً سب کے ساتھ بیٹھنا پڑتا۔ جب وہ اس سارے وقت میں دو سوال بھی صحیح حل نہ کر پاتی تو وہ جھلا کر کہتے۔ ''کتنی کوڑھ مغز لڑکی ہے یہ۔''

اس وقت اس کی آنکھوں میں پانی اتر آتا۔

جب وہ اسے سمجھانے کی کوشش کرتے۔ اسے یوں محسوس ہوتا جیسے دماغ تک پہنچنے کے سبھی راستے بلاک ہوگئے ہیں۔ کوئی چھوٹی موٹی درز یا دراڑ بھی نہیں ہے جن میں سے سمجھایا ہوا اندر جاسکے۔

تب پھوپھا حمید کی کرسی کے پاس کھڑی کاپی پر نظریں جمائے صرف یہ سوچتی کہ وہ دھڑام سے فرش پر گر پڑے۔ اس کا سر پھٹ جائے، خون بہنے لگے، بیہوش ہوجائے۔ تب سارا گھر اس کے گرد اکٹھا ہوجائے، پھر کتنے دن وہ بستر پر پڑی رہے۔ اس کی خوب خاطر مدارت ہو۔

پر وہ یہ سب سوچتی اور کچھ نہ کر پاتی۔

اس کی بہن اور کزن کو اچھا کام کرنے پر ہر روز شاباش ملتی۔ وہ اس روز روز کی کل کل سے تنگ آگئی تھی۔ انہیں زچ کرنے کی کئی ترکیبیں اس کے ذہن میں آتیں۔ پر عمل کی کسوٹی پر کستی تو پھپھسی نظر آتیں۔ وہ ان دونوں کو سزا دینا چاہتی تھی۔ پریشان کرنے کی خواہش مند تھی۔ جلانے اور تڑپانے کی آرزومند تھی۔

اور پھر اس نے ایک دن ان کی کتابیں غائب کردینے کا سوچا۔ یہ تجویز اسے سہل لگنے کے ساتھ ساتھ معقول بھی لگی۔

اور اس دوپہر جب گھر کے سب افراد گرمی سے بچنے کے لیے نچلی منزل میں جمع تھے۔ اس نے احتیاط سے اپنی بڑی بہن اور کزن کے بستے اٹھائے اور اپنے کمرے کی بڑی پیٹی کے پیچھے پھینک دیئے۔ سکھ کا لمبا سانس بھرا اور اپنے آپ سے کہا۔

''اب دیکھوں گی میں انہیں۔ نہ ہوگا بانس اور نہ بجے گی بانسریا۔''

☆☆☆

''مجھے تو یہ سمجھ نہیں آتی کہ اگر میں پیدا نہ ہوتی تو خدا کی اس وسیع کائنات میں کیا کمی رہ جاتی؟''

یہ دھند اور کہر میں ڈوبی ہوئی ایک صبح تھی اور وہ اسکول جارہی تھی۔ اس کے پاؤں میں تین چار روپے کی ایک سستی سی چپل تھی۔ جسم پر سستی سی کاٹن کا سفید سوٹ، اس پر گھٹیا سی اون کی عنابی جرسی اور سر پر موٹی ململ کا دوپٹا تھا۔ سردی کی شدت سے اس کے ناک کی پھننگی بے حد سرخ ہورہی تھی۔ آنکھوں میں نمی تیرتی پھرتی تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ کپڑے کے ایک چھوٹے ٹکڑے سے جسے اس نے رومال کے طور پر ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا اپنی ناک اور آنکھیں صاف کرتی۔

یہ گلی بڑی ویران سی تھی۔ وہ ہمیشہ اسی گلی سے گزر کر اسکول جاتی۔ یہ شارٹ کٹ ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی خودکلامی کے لیے بھی موزوں جگہ تھی۔ بہن بھائیوں، ماں باپ، رشتہ داروں اور خدا سے شکوؤں کی بھڑاس چلتے چلتے بڑبڑاہٹوں کی صورت میں یہیں نکلتی۔

''اے اللہ آج تو غضب کی سردی ہے۔''

بس اسٹاپ پر شہر کو جانے والے لڑکے لڑکیوں کا مجمع حسب معمول کھڑا نظر آیا اور کوٹوں کارڈیگنوں گرم چادروں اور اونی شالوں میں لپٹے ہوئے وجود اپنے آپ پر اتنا کچھ چڑھانے کے باوجود دانت کٹکٹا رہے ہوتے۔ ان کے پاس سے گزرتے ہوئے وہ خود سے کہے بغیر نہ رہ سکتی۔

''اس قدر مدافعتی سامان کے باوجود اگر ان کا یہ حال ہے تو پھر مجھے تو مر جانا ہی چاہیئے۔''

خوبصورت رنگوں والے کارڈیگن، کوٹ، خوشنما شالیں، قیمتی کپڑے اور نرم گرم جوتے پہننے کی تشنہ آرزوئیں اس کے اندر ایک تواتر کے ساتھ اترنے لگتیں۔ ان کی اترائی کا سلسلہ کبھی کبھار اتنی سرعت سے ہوتا کہ اس کا اندر جلنے لگتا۔ ذہن میں ابلتے پانی کی طرح کھولاؤ کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی۔ کچھ دیر تک جلنے، کھولنے اور تلملانے کے بعد وہ اپنی اس خیالی دنیا میں پہنچ جاتی جو اس نے اپنے اردگرد بنا رکھی تھی۔ جس میں داخل ہو کر وہ وقتی طور پر ان تلخیوں کو بھول جاتی جو ہمہ وقت اس کے دل و دماغ پر گھٹاؤں کی طرح چھائی رہتیں۔

وہ جس ہائی اسکول میں پڑھتی تھی کہنے کو وہ ایک فلاحی ادارے کے زیر اہتمام تھا پر اونچا اسٹینڈرڈ رکھتا تھا۔ ٹیچرز اعلیٰ تعلیم یافتہ، فیشن ایبل اور خاصی خوش شکل تھیں۔ خوابوں کے جزیروں میں تیرتی کشتیوں میں اب وہ الٹرا موڈ استانیاں سوار ہو جاتیں۔ فسٹ ایئر انجینئرنگ فورتھ ایئر اور میڈیکل میں پڑھنے والے اس کے سوکھے سڑیل سے بھائی دیکھتے ہی دیکھتے بھرے جوان بن جاتے۔ خوبصورت اور صحت مند نوجوان کوئی ڈاکٹر ہوتا تو کوئی انجینئر۔ ان کی مردانہ وجاہت ٹپک ٹپک پڑتی۔ ان کی قابلیت کی چاروں کھونٹ دھوم مچی ہوئی ہوتی۔

کہانی اب کچھ اس انداز میں آگے بڑھتی کہ وہ ان وجیہہ جوانوں کی بے حد لاڈلی اور چہیتی بہن ہوتی ہے۔ اکلوتی اور دلاری بہن۔ اپنی دوسری بہن کے وجود کو وہ ایک پل کے لیے بھی اپنی اس جنت میں برداشت نہ کر سکتی۔ تصورات کا افق پھیلتا چلا جاتا۔ یوں کہ اس کی پسندیدہ ٹیچرز اس کے بھائیوں سے پیار کرتیں۔

اور کلائمیکس کچھ یوں ہوتا کہ انہیں جب پتا چلتا کہ ان کی کلاس میں پڑھنے والی لڑکی ان کے محبوب کی چہیتی بہن ہے تو وہ آناً فاناً ان کی آنکھ کا ستارا بن جاتی۔ کلاس کی لڑکیاں مارے حسد اور جلن کے انگاروں پر لوٹ لوٹ جاتیں اور وہ ان سب لڑکیوں سے گن گن کر بدلے لیتی جو اسے اچھا نہیں سمجھتی تھیں۔ امتحان میں آنے والے سوالات اور پرچوں کی مارکنگ کا بھی اسے علم ہوتا۔ لڑکیاں سوال جاننے کے لیے اس کی منتیں کرتیں۔ اس کے آگے پیچھے چکر کاٹتیں اور وہ اتراتی پھرتی۔

پر یہ اترا ہٹ جھاگ کی طرح بیٹھ جاتی جب وہ گیٹ میں داخل ہوتی۔ کلاس روم میں سب سے پچھلی سیٹ پر بستہ رکھ کر ریاضی کا ہوم ورک کرنے کے لیے کسی لڑکی کی کاپی مانگنے کے لیے اس کی منت سماجت کرتی۔ جلدی جلدی الٹا سیدھا اتارتی کہ مار سے بچ سکے۔ تاریخ جغرافیہ کی گھنٹی میں اپنا چہرہ مس کی نظر سے بچاتی اور جب اسکول آف ہو جاتا تو سکھ کا لمبا سانس یوں بھرتی جیسے قید بامشقت سے خلاصی ہوئی ہو۔ کتابیں بازوؤں میں بھر کر شکستہ حال چلتی گھر آ جاتی۔

اس دن ہفتہ تھا۔ اس کے پاس کپڑوں کا ایک ہی جوڑا تھا اور وہ بہت گندا ہو رہا تھا۔ بڑی خجالت محسوس ہوئی۔ سارا دن اسکول میں بھی چھپتی پھری۔ تفریح میں بھی باہر نہ نکلی۔ اپنے ڈیسک پر ہی بیٹھی رہی۔ گھر آتے ہی وہ پھٹ پڑی۔ اماں خرچ پر کہیں پہلے ہی جلی بھنی بیٹھی تھی۔ غصے میں بولیں۔

''کہاں سے پورے کروں تمہارے اخراجات؟ فیسیں دوں، کتابیں مہیا کروں، کپڑے بنا کر دوں، کھانے کا سامان لاؤں۔ ڈیڑھ سو روپلی میں کیا ننگی نہائے اور کیا نچوڑے۔ باوا کو کھو مجھ سے کیا کہتی ہو۔''

غصے سے اس نے پاؤں فرش پر یوں مارے جیسے اسے توڑ دینا چاہتی ہو۔ اس کی آنکھوں سے آنسو نکل کر گالوں کے راستے سینے پر جذب ہو رہے تھے۔

وہ بالک ہٹ سیہ اتری ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ مچل مچل کر کہہ رہی تھی۔

''مجھے نہیں معلوم جہاں سے مرضی پیسے لاؤ۔ مجھے ایک جوڑا کپڑوں کا اور ایک جوتی چاہیے۔ میں یہ کپڑے پہن کر اب اسکول نہیں جاؤں گی۔ ذرا دیکھو تو جوتے کا سارا تلہ گھس گیا ہے۔ ٹانکے ٹوٹ گئے ہیں۔ مجھے شرم آتی ہے۔''

اور اماں کسی جنگلی بھینسے کی طرح دھاڑیں۔

''یوں کرو مجھے بیچ آؤ کسی دکان پر۔''

اس وقت اماں کی قہر آلود نگاہیں کسی برچھی کی مانند اس کے آر پار ہوئی جاتی تھیں۔

اس کا نمبر دو بھائی جو اسی سال انجینئرنگ کالج میں داخل ہوا تھا۔ ہنستے ہوئے بولا۔

''اماں تمہارا تو کسی نے ایک روپیا بھی نہیں دینا۔''

اور اماں نے کوسنوں اور صلواتوں کا جو لمبا چوڑا سلسلہ شروع کیا اس نے اسے اور بھی سیخ پا کر دیا۔ جی چاہ رہا تھا اماں کے چیخنے چنگھاڑتے گلے میں کوئی چیز ٹھونس دے۔

پر وہ جو کہتے ہیں قہر درویش بر جان درویش والا معاملہ تھا۔ اپنے ہی آنسوؤں کو پیتی ماں کو قہر آلود نگاہوں سے گھورتی وہ بھوکی ہی چھت پر چلی گئی۔

اور پھر یوں ہوا کہ وہ پاگل سی لڑکی جو ہمہ وقت اپنی غربت پر کڑھنے، دوسروں سے جلنے اور خیالی دنیا میں گم رہنے پر سارا وقت صرف کرتی تھی وہ جو اپنے سب بہن بھائیوں کے مقابلے میں پڑھائی میں بہت کمتر اور نالائق خیال کی جاتی تھی۔ اس نے یوں کایا پلٹی کہ سبھوں کو حیران کر گئی۔ کیا گھر اور کیا اسکول ہر ایک انگشت بدنداں تھا۔

ہوا یوں تھا کہ اس کی بڑی بہن ایف۔ایس۔سی کے امتحان میں صوبے بھر میں اوّل آئی تھی۔ اس کے حاصل کردہ نمبروں نے گزشتہ تیس سالوں کا ریکارڈ توڑا تھا۔ اخبارات میں نہ صرف اس کی تصاویر چھپیں بلکہ اخباری نمائندوں نے اس کے خیالات مثلاً وہ مستقبل میں ڈاکٹر بنے گی۔ اس کا ارادہ ہارٹ سرجری میں اسپیشلائزیشن کرنے کے لیے امریکا جانے کا ہے۔ نیز وہ میڈیکل کو دولت بنانے کا ذریعہ بنانا نہیں چاہتی بلکہ اس کے عزائم اس پیشے کے وسیلے سے دکھی انسانیت کے زخموں پر مرہم لگانے کے ہیں۔ وغیرہ کو خوب بڑھا چڑھا کر لکھا گیا۔ اس نے یہ سب پڑھا۔ اپنی خوبصورت کومل سی ناک کو نخوت سے سیکڑا اور نفرت بھرا ہنکار ابھرتے ہوئے خود سے بولی۔

''پکوڑا جیسی ناک اور چندھی آنکھوں والی یہ امریکا جائے گی۔ کیا کہنے ہیں اس کے۔''

وہ گھر کی فضا کو یکسر بدلا ہوا دیکھ رہی تھی۔ اس کی خالائیں حتیٰ کہ ... اپنی ذات سے حد درجہ پیار کرنے والی خود غرض سی اس کی نانی بھی رنگین پایوں والے سوت کے بنے ہوئے پلنگ پر تکیے سے ٹیک لگائے اس فخر وانبساط سے چہرہ چمکائے اپنے ہمسایوں، عزیز رشتہ داروں اور ملنے جلنے والوں سے مبارکبادیں وصول کر رہی ہیں۔ خوش ہو رہی ہیں اور اس کی بہن کو داد و تحسین کی نظروں سے دیکھ رہی ہیں اور بار بار کہتی ہیں۔

''بھئی آفرین ہے اس لڑکی پر۔ ہمارا تو نام روشن کر دیا ہے اس نے۔''

اس کی ماں بھی اپنی ناراضگی اور گلے شکوے بھول کر صحن میں رنگین پیڑھی پر بیٹھی اپنے دیور، دیورانیوں، نندوں اور ماں بہنوں سے باتیں کرتے ہوئے خوشی سے کھلی پڑتی تھیں۔

''اللہ حیاتی دے میرے بچوں کو۔ اس کی رحمت اور عنایت سے سارے ہی ہونہار ہیں۔ بس اس کی طرف سے دل کو بے چینی لگی رہتی ہے۔ کہیں یہ بھی انسان بن جائے تو اس پروردگار کا سو سو بار شکر ادا کروں۔''

ماں نے کسی قدر تاسف اور دکھ سے اسے دیکھا تھا۔ ماں کی دید کا یہ انداز اسے گھائل کر گیا۔ جی چاہا کہ اسے کھری کھری سنا دے۔ کہے کہ مجھے کیا ہوا ہے؟ میری طرف سے کیسا اضطراب ہے؟

لیکن وہ یہ سب کہہ نہ سکی۔ بس چپ چاپ ماں کو غصے اور نفرت سے گھورتی رہی۔

تب اس نکمی اور نالائق لڑکی نے ایک بہت بڑا اہم فیصلہ اپنے آپ سے کیا۔ سر جھٹکا، خیالی سپنوں اور خوابوں کی جنت کو اٹھا کر کہیں دور پھینکا اور اپنے آپ کو کتابوں کی دنیا میں گم کر دیا۔

☆☆☆

موسم تو ستم ڈھانے پر اترا ہوا تھا۔ اس شاندار کالج کے لمبے چوڑے سرسبز و شاداب ہر سو طراوت اور تازگی کا فرحت آگیں احساس بخشتے لان و موسم کے حسن اور رعنائی کو اور قاتل بنا رہے تھے۔ پچھیا ہوائیں سرو کے بوٹوں اور جامن کے پیڑوں پر سبک خرامی سے بہہ رہی تھیں۔ نیلا شفاف آسمان چیختے چنگھاڑتے بادلوں سے ڈھنپا ہوا تھا۔ گھنے بادل جو کسی بھی پل زمین پر وارد ہونے کے انتظار میں مست ہاتھیوں کی طرح جھولتے جھومتے پھر رہے تھے۔

ایسے ہوشربا موسم میں وہ سنگ مرمر کی بنچ پر بیٹھی جلنے کڑھنے اور اپنا خون آپ ہی پینے میں جتی ہوئی تھی۔ وہ دیوانی تھی ایسے موسم کی۔ سدا ہی چاہتی کہ نیلا آسمان گہری اودی گھٹاؤں کے پیرہن پہنے رکھے۔ سورج کی شکل نظر نہ آئے۔ اجالے اور اندھیرے کے درمیانی عکس کی چادر فضا پر تنی رہے جاڑوں میں جب موسم کی یہ کیفیت ہوتی۔ اس کے بہن بھائی سردی سے دانت کٹکٹاتے ہوئے کہتے۔

''خدایا اب رحم کر۔ سورج کی صورت دکھا۔''

اسے غصہ آتا جھلا کر وہ کہتی۔

''کیا تکلیف ہے تمہیں۔ بدذوق کہیں کے۔''

اور وہ سب نیچے جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑ جاتے۔

''یہاں کیا کر رہی ہو؟ دفع ہو جاؤ لندن۔ جی بھر کر لطف اندوز ہونا دھندا اور کہر سے۔''

پر آج موسم کی دلکشی اور حسن کا اس پر قطعاً کوئی اثر نہیں تھا۔ گراؤنڈ میں لڑکیوں کے غول گھوم پھر رہے تھے۔ ہنسی مذاق اور چہلوں کا سلسلہ جاری تھا۔ لڑکیاں اپنی لانبی گردنوں پر ٹکے سروں کو آسمان کی طرف کرتیں۔ موسم کی دلکشی اور رنگینی کا اعتراف نگاہوں سے کرتیں اور زبان سے بھی یہ کہنا نہ بھولتیں۔

''مائی گاڈ! موسم نے کیا غضب ڈھا رکھا ہے۔''

اسے نفرت تھی ان لڑکیوں سے جن کے خوبصورتی سے ترشے بال ان کے شانوں پر ہلکورے کھاتے تھے۔ جن کے صبیح چہروں پر لالیوں کے غنچے کھلے ہوتے۔ جن کا پہناوا بے شک سفید یونیفارم ہوتا پر کپڑے اپنی اعلیٰ کوالٹی کا پتا بہت دور سے دیتے۔ اس پر طرہ مال اور گبرگ کے درزیوں کی کاریگری جن کی ماہرانہ کانٹ چھانٹ کپڑوں میں جان ڈال دیتی یوں کہ وہ اپنے آپ سے بولنے لگتے۔

وہ جو انجمن کے سیکنڈری اسکول میں آندھی کی طرح اٹھی اور طوفان کی طرح چھا گئی تھی۔ اس چوٹی کے کالج میں آکر صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھ گئی تھی۔

وہ یہاں ایک احساس کمتری کے ساتھ آئی تھی۔ صوبے بھر کے درجہ اوّل اور درجہ چہارم اسکولوں کے لڑکے لڑکیوں کو ایس۔ ایس۔ سی کے امتحان میں مات دے کر اوّل آنے کا اعزاز جیتے ہوئے۔

اس کالج کا انتخاب اس کے بہن بھائیوں کی مشترکہ رائے سے ہوا تھا۔ جب پہلی بار وہ اپنی بڑی بہن جو خود میڈیکل کی اسٹوڈنٹ تھی کے ساتھ یہاں آئی تو اس نے ہر شے کو تعجب اور دلچسپی سے دیکھا۔ گیٹ سے باہر کی سڑک مختلف رنگوں کی کاروں سے اٹی پڑی تھی۔ دروازے کھلتے اور نخروں کی پوٹلیوں میں لپٹی لڑکیاں نکلتیں۔ کچھ تو واقعی حسین تھیں، کچھ کو لیپا پوتی نے حسین بنا رکھا تھا۔ خوش رنگ، جدید وضع کے ملبوسات اور ان سے اٹھتی مختلف پرفیومز کی بھینی بھینی خوشبو اور ان کے کھنکتے ہوئے مسرور قہقہے اسے بے چین کرنے کے لیے کافی تھے۔

اس نے اپنے آپ کو دیکھا تھا۔ گھٹیا سی کاٹن کا لباس جس کی تراش خراش بھی بھدی اور بدنما تھی اس لیے کہ کپڑوں کے ذریعے جسمانی اعضاء کی نمائش کو اس کے گھر میں سخت ناپسند کیا جاتا تھا۔

گزشتہ ایک ہفتے سے وہ جان کنی کے عذاب میں مبتلا تھی۔ کالج کے انتخاب کا مسئلہ جونہی حل ہوا اس نے جستی ٹین کے صندوق سے ان تینوں جوڑوں کو نکال کر اپنے سامنے رکھ لیا جو بار بار پہننے اور دھوئے جا چکے تھے جن کے رنگ و روپ کو ٹھے پر بیٹھی ادھیڑ عمر کی نائکہ جیسی صورت اختیار کر گئے تھے۔

ایک ایک جوڑے کو الٹتی پلٹتی۔ تنقید کی کسوٹی پر پرکھتی اور پھر لہجے میں زمانے بھر کا دکھ انڈیل کر اپنے آپ سے کہتی۔

''یا اللہ آخر ہم اتنے غریب کیوں ہیں؟''

اماں سے کچھ کہنا گویا بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنا تھا لیکن جب مسئلے کا کوئی حل نظر نہ آیا۔ تب اس نے سبزی چھیلتی اماں کے گھٹنے پکڑ لیے۔

اور اماں نے نہایت بے رحمی اور سنگ دلی کی چھری اس کی گردن پر چلا دی یہ کہتے ہوئے۔

''لو ابھی تو چھ ماہ بھی نہیں گزرے تمہیں لیڈی ہملٹن کا سوٹ بنا کر دیا تھا۔ زبیدہ کی شادی پر بنایا ہوا وہ موراکین کا جوڑا کیا ہوا؟ ہاں تمہارے پاس وہ کپڑے بھی تو ہیں جو تمہاری چھوٹی پھپھی نے دیئے تھے۔ اس کا جی چاہا اماں کے ہاتھ سے چھری چھین کر اماں کو ذبح کر ڈالے یا پھر اپنی تکا بوٹی کرے۔

اماں کے بات کرنے کا انداز بھی کسی ظالم مارشل جیسا تھا۔ چھوٹی پھپھو کا دیا ہوا سوٹ، زبیدہ آپا کی شادی پر بنایا ہوا سوٹ سب اماں کو یاد تھے۔ شاید یہ یاد نہیں تھا کہ یہ کپڑے پھپھو کی اترن تھے جنہیں انہوں نے کمال شفقت سے اسے عنایت کیے تھے۔''

پھر اس کا گلا رندھ گیا اور آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''اماں وہ سب تو پرانے اور بدرنگے ہیں۔''

''اچھا چل ہٹ میری جان نہ کھا۔ سوچوں گی۔''

اور اٹھتے بیٹھتے جب نئے سوٹ کا ورد اس کی زبان سے ہونے لگا تب اماں کو اسے کپڑے بنا دینے میں ہی اپنی عافیت نظر آئی۔

جوڑا تو بلاشبہ نیا تھا پر سیا اس کی بہن نے۔ جس نے ستیاناس کر دیا۔ ذرا فٹنگ نہیں تھی۔ اس نے کہا بھی۔

''آپا آپ نے تو اسے جھولا بنا دیا ہے۔''

اور وہ نیک پروین محبت سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔
''بس ٹھیک ہے۔ تنگ کروں گی تو خالہ اور نانی باتیں بنائیں گی۔''
''تو بنانے دو انہیں۔ اب ان کے ڈر سے ہم اپنی مرضی کا کوئی کپڑا بھی نہ پہنیں۔''
اس کی بہن فارم داخلہ جمع کروا کر باہر آئی تو اس نے اس کا ناقدانہ جائزہ لیا۔ وہ بھی ڈھیلے ڈھالے اس جیسے کپڑے پہنے ہوئے تھی۔ ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی اسے اس پر سخت غصہ آیا۔
''یہ کم بخت بھی بدھو ہے۔ ذرا خفت محسوس نہیں کرتی۔ اب اگر یہ بوگی بنی رہے گی تو ہم اپنا حلیہ کیسے ٹھیک رکھ سکتے ہیں۔''
تب درختوں کے جھنڈ تلے کھڑے ہو کر اس نے اپنے دل میں دو فیصلے کیے۔
ایک یہ کہ وہ بہترین اور اچھا لباس پہنے گی اور کسی پر اپنی غربت ظاہر نہ ہونے دے گی۔ دوسرے وہ اپنے تعلیمی معیار کو اونچا رکھے گی۔
پر ہوا یہ کہ ایک وعدہ تو اس نے بلاشبہ پورا کیا۔ کالج میں وہ بہت صاف ستھری حالت میں آتی تھی۔ لڑ جھگڑ کر اس نے عمدہ اور بہترین کپڑے کے دو جوڑے درزی سے سلوائے۔ انہیں وہ جس طرح استعمال کرتی وہ دیکھنے والوں کو اس کے پختہ گھریلو حالات کا پتا دیتے۔ آندھی اٹھے، طوفان آئے، بارش برسے یا کوئی اور ارضی یا سماوی آفت کاروبار زندگی کو معطل کر دے۔ وہ کپڑوں اور جوتوں کی طرف سے غفلت نہیں کرتی تھی۔
کپڑوں کو ہر تیسرے دن دھوتی، کلف لگاتی، کوئلوں کی استری سے گھنٹا بھر الجھتی اور جب وہ پسینہ پسینا ہو کر اٹھتی تو اس کے بازوؤں میں پڑے دو جوڑے یوں چمکتے جیسے کسی اونچے درجے کی لانڈری سے دھل کر آئے ہوں۔ کچھ ایسا ہی حال جوتوں کے ساتھ تھا۔ آدھ گھنٹا تو انہیں چمکانے میں ضرور صرف ہوتا۔ جب وہ اتنے چمک جاتے کہ بقول اس کے کوئی اگر منہ دیکھنا چاہے تو دیکھ سکتا۔ تب اس کے ہاتھ برش کی جان چھوڑتے۔
اماں کو اس کے کپڑوں اور جوتوں سے اس درجہ انہماک کے باعث شدید اختلاج قلب ہونے لگتا۔ وہ غصے سے کہتیں۔
''اے میں کہوں تو وہاں پڑھنے جاتی ہے یا کپڑے دھلانے۔ سب دیکھو دھلائی جب دیکھو استری۔''
اماں کی یہ بات اس کے تن بدن کو سلگا دیتی۔ وہ بہتیرا چاہتی کہ خود ہی سلگے اور حرارت اماں تک نہ پہنچے لیکن جانے کیا ہوتا۔ وہ پھٹے ڈھول کی طرح پھٹ پڑتی۔
''تم تو چاہتی ہو من من بھر میل کپڑوں میں پھنسی رہے۔ چیتھڑے لٹکے رہیں اور لوگ ہم پر ترس کھاتے رہیں۔ اماں تمہارا صابن خرچ ہوتا ہے اس لیے تم اتنا واویلا کرتی ہو۔''
اور اماں بھنا اٹھتیں۔ اس کا اتنا بے باک اور گستاخ لہجہ انہیں تلملا کر رکھ دیتا۔
''تم کوئی نئی کالج میں پڑھنے لگی ہو۔ میرے اور بھی بچے ہیں..... ماشاء اللہ سارے ہی چوٹی کے کالجوں میں جاتے ہیں۔ پر جتنے پر پرزے تم نے نکالے ہیں اس لحاظ سے تو وہ شاباش کے مستحق ہیں۔''
''اماں تم ہزار بار بھی ان پر داد و تحسین کے ڈونگرے برساؤ تب بھی مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔ وہ اگر پاگلوں کی طرح اٹھ کر چلے جاتے ہیں تو کوئی ضروری ہے میں بھی ویسے ہی جاؤں۔''
بڑبڑاتی ہوئی وہ کمرے سے نکل جاتی۔
اماں غصے سے لال پیلی ہوتیں۔ طیش میں پھنکارتیں۔ جی چاہتا دھوری والے ڈنڈے سے اس کی دھواں دھار مرمت کر دیں۔ پر گھر کی عورتوں سے ڈرتی تھی پھر ایسی منہ زور منہ پھٹ اولاد کیا بعید کہ ہاتھ ہی پکڑ لے۔
دو تین بار انہوں نے اس کی بڑی بہن تہمینہ سے بھی بات کی۔
اس نے اماں کی شکایات کو ٹھنڈے دل و دماغ سے سنا اور رسان سے کہا۔
''اماں چھوٹی چھوٹی باتوں پر مت کڑھا کریں۔ بہن بھائی ایک جیسے نہیں ہوتے ہر ایک کا اپنا اپنا مزاج ہے۔ اسے اگر اچھے کپڑے پہننے کا شوق ہے تو کوئی ہرج نہیں۔ باقی اس کا وقت ضائع ہوتا ہے یہ آپ کا مسئلہ تھوڑی ہے۔ وہ جانے اور اس کا وقت۔''
اماں اب اسے نالائقی کا طعنہ بھی نہیں دے سکتی تھیں۔ اس نے اوّل آ کر سارے گلے شکوے دور کر دیئے تھے۔
اور اعلیٰ درجے کے لانڈری ہاؤس سے دھل کر آنے والے کپڑوں کی حفاظت کے لیے وہ کیا کیا جتن کرتی اس کا اندازہ صرف اسی کو تھا۔ کالج اور اس کے گھر کا درمیانی فاصلہ آٹھ نو میل تھا۔ پہلا پیریڈ شروع ہونے سے کوئی دو گھنٹے قبل ہی وہ گھر سے نکل پڑتی۔ بسوں میں اترتے اور چڑھتے اسے نہ تو

اپنی کتابوں کی فکر ہوتی اور نہ اپنی جان کی۔ آگے پیچھے دائیں بائیں غرضیکہ ہر سمت اس کی نظریں اپنے کپڑوں پر ہوتیں۔ کبھی کبھی چھوٹی چھوٹی پوٹلیاں اور بڑی بڑی گٹھڑیاں اٹھائے دیہاتی عورتیں بھی بس میں سوار ہوتیں۔ ان کی کپڑ دھکڑ اور کھینچا تانی کے شور شرابے میں اس کا جی چاہتا کہ وہ انہیں اٹھا کر کھڑکیوں کے راستے سڑک پر پھینک دے۔ ایسے دنوں میں شامتِ اعمال سے اگر اس کے کپڑوں کی کریز خراب ہوجاتی، دوپٹے میں شکنیں پڑ جاتیں، جوتے کا چہرہ گنوار عورتوں کے پاؤں کی دھول مٹی سے دھندلا جاتا۔

تب دو خواہشیں اس کے دل میں پھڑکنے لگتیں۔ پہلی زیادہ طاقتور ہوتی کہ چلتی بس سے چھلانگ مار کر اپنا قصہ ہی پار کرلے یا پھر اندھی عورت یا مرد کا گلا گھونٹ دے جس کا پاؤں اس کے جوتے پر آیا تھا۔

کالج گیٹ پر رنگ برنگی کاروں سے جب وہ لڑکیوں کو اترتے ہوئے دیکھتی تو اور بھی جل جاتی۔ کڑھ کر خود سے کہتی۔

''ارے انہوں نے ایسی کون سی نیکیاں کی ہیں جو اللہ کو اتنی پسند آئی ہیں کہ دولت کی بارش میں نہاتی اور مزے لوٹتی ہیں اور ہم جیسوں نے کیا گناہ کیے ہیں کہ پیسے پیسے کو ترسنا مقدر بن گیا ہے۔ اللہ کس شان اور طمطراق سے کاروں میں بیٹھتی ہیں۔ ہمارے نصیبوں میں تو بسوں اور سڑکوں پر دھکے کھانا لکھا گیا ہے۔''

درختوں کے جھنڈ تلے کھڑے ہو کر اس نے جو دو وعدے اپنے آپ سے کیے تھے ان میں سے ایک تو اس نے جی جان سے نبھایا پر دوسرا وعدہ وہ پورا نہ کرسکی۔

وجوہات بھی کافی تھیں۔

ایک تو وہ ایکا ایکی اردو میڈیم سے انگلش میڈیم میں آگئی تھی۔ کونونٹ اور دوسرے انگریزی اسکولوں کی لڑکیاں جب فراٹے کی انگریزی بولتیں تو وہ بس دیکھتی رہ جاتی۔ عجیب سی پژمردگی اور احساسِ کمتری کا احساس اس کی آنکھوں اور چہرے پر پھیل جاتا۔

دوسرے پڑھائی سے اس کی وابستگی بھی کم ہوگئی تھی۔ خوش پوش امیر زادیاں اور خوبصورت لیکچرارز اس کے حواسوں پر ہمہ وقت مسلط رہنے لگی تھیں۔ وقت کا بیشتر حصہ جلنے، کڑھنے اور ڈینگیں مارنے میں گزرنے لگا۔ میڈیکل اور انجینئرنگ کالجوں میں پڑھنے والے اس کے بہن بھائی بلاشبہ اس کے لیے امتیاز کا باعث بن رہے تھے۔ ماموں بڑے افسر تھے ہی۔ سادہ لوح چچاؤں کو بھی اس نے اعلیٰ درجے کے افسر بنا ڈالا۔

رہا باپ تو وہ بھی اس کی زبان کی ہلکی سی جنبش سے فوج میں افسری کی اونچی کرسی پر بیٹھ گیا۔

وہ جس ڈگر پر جارہی تھی اس کا شدید احساس اسے اس وقت ہوا جب سال اوّل کے نتیجے کی سلپ اسے ملی، وہ جو پورے ضلع میں اوّل آئی تھی پاس تو بے شک ہوگئی تھی، اگلی جماعت میں ترقی بھی مل گئی تھی، پر کیسے جیسے چھوٹا بچہ ایڑیاں گھٹنے رگڑ رگڑ کر سیڑھیوں کا پہلا پوڈا چڑھے۔

اس نے رزلٹ کارڈ کو آنسوؤں سے لبریز آنکھوں سے دیکھا اور گھاس پر یوں بیٹھی جیسے میلوں کی مسافت نے تھکا ڈالا ہو۔ حقیقتاً اس نے سفر بھی تھکا دینے والا کیا تھا۔ گزشتہ ایک سال پر محیط اپنے آپ سے لڑتے، جنگ کرتے، اضطراب اور پریشانیوں کی سولی پر چڑھتے۔ آخر ان سب کا نتیجہ تو نکلنا تھا اور وہ نکلا۔ دل اندر اور باہر ہوتا رہا۔ آنکھیں بھیگتی اور خشک ہوتی رہیں۔ چہرے پر کبھی یاس اور کبھی اُمیدوں کے سائے لہراتے بل کھاتے رہے۔

اور درختوں کے سائے لمبے ہوتے گئے۔

تب وہ اٹھی آنسوؤں کو ہاتھوں کی نرم و نازک پوروں سے صاف کیا اور گھر چل دی۔ پہلی مرتبہ فوراً کھانے سے فارغ ہو کر وہ کتابیں لے کر بیٹھی اور رات کے دو بجے تک پڑھتی رہی۔

اور پھر وہ آہستہ آہستہ اوپر اٹھتی گئی اوپر اور اوپر۔ ساتھی لڑکیوں کو حیران کرتی اور پھر ایک دن پہلے کی طرح اس کا نام نوٹس بورڈ پر سرفہرست تھا۔

جو اسٹینڈرڈ اور معیار وہ اپنی کوشش اور جدوجہد سے حاصل کرسکتی تھی وہ جلد یا بدیر اس نے اپنی لگن، ہمت اور کوشش کے بل بوتے پر حاصل کرلیا۔ پر دیگر معاملات میں وہ کوری رہی۔ گھر پرانی معاشرتی قدروں کو سینے سے لگائے ان کی حفاظت کا داعی بنا بیٹھا تھا۔

فلم اس نے کبھی دیکھی نہ تھی۔ تنگ نظری کا وہ عالم کہ فلم دیکھنا گویا گناہ کبیرہ تھا۔ اخبارات کے فلمی اشتہاروں والے صفحات پر نظریں دوڑانا معیوب تھا۔ ایسے میں ان کے متعلق اس کی معلومات بھی صفر تھیں۔ لڑکیاں جب اونچے اونچے فلمی کرداروں پر بحث کرتیں تو وہ چپ چاپ بیٹھی ان کی گفتگو سنتی رہتی۔ یا ان کے منہ تکتی۔

لاہور سے باہر کہیں جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ دودھیال باڈر کے قریب ایک گاؤں میں ڈیرے ڈالے بیٹھی تھی۔ بس کبھی کبھی وہاں جانا ہوتا۔ گاؤں کا ماحول کچے گھر اور

کھیت کھلیان، وہاں کائنات ہی مختصر تھی۔ کوئی ان پر کتنا بول سکتا تھا۔

اب جب مری، ایبٹ آباد، سوات، کاغان و ناران کے دلکش اور دلفریب نظاروں پر زور و شور سے باتیں ہو رہی ہوں۔ انگلینڈ، امریکا اور یورپین ممالک کے تذکرے ہوں۔ گرمیوں میں وہاں جانے اور رہنے کے پروگرام ہوں تو ظاہر ہے وہ ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم کے مصداق محض تماشائی ہی بن سکتی تھی یا پھر اپنے آپ اور اپنے گھر گھرانے پر کڑھ سکتی تھی جو وہ کڑھتی تھی جز بز ہوتی تھی۔

ایک دن اس کی ایک دوست فرخ ہنستے ہوئے اس کے شانوں پر دو ہتڑ جما کر بولی۔

"یار اللہ قسم تم کنوئیں کی مینڈک ہو۔ کتابی کیڑا ہو۔ بتاؤ نا آخر تم اتنی ان سوشل کیوں ہو؟"

اسے اپنے بہن بھائیوں پر بھی شدید غصہ آتا۔ کم بخت سب کے سب اوندھے ایک سے ایک بڑھ کر کتابی کیڑے۔

چند اونچے گھروں کی لڑکیوں نے اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا بھی پر اس نے کسی گرم جوشی کا ثبوت نہ دیا۔

دیتی بھی تو کیسے ڈیبگیں تو بے انتہا مار رکھی تھیں۔ کل کلاں جو اس کے گھر آ ٹپکتیں اور ساری قلعی کھل جاتی تو کس قدر ہتک والی بات ہوتی۔

جب وہ بی۔ ایس۔ سی سے فارغ ہوئی تب تک اس کے دو بھائی اور بہن یورپ سدھار چکے تھے۔ سب سے بڑا بھائی کولمبو پلان کے تحت کینیڈا انجینئرنگ کی اعلیٰ تعلیم کے لیے چلا گیا۔ برٹش کونسل کی طرف سے اس کی بہن کو وظیفہ مل گیا اور وہ سرجری میں اسپیشلائزیشن کے لیے لندن روانہ ہوگئی۔ تیسرے نمبر والا بھائی اورگینک کیمسٹری Organic Chemistry میں ڈاکٹریٹ کے لیے امریکا چلا گیا۔

اور پھر یوں ہوا کہ وہ لڑکی جو خود کو کنوئیں کا مینڈک سمجھتی تھی۔ ایکسچینج پروگرام کے تحت ڈھاکا یونیورسٹی کے لیے منتخب ہوگئی۔

ایک بارش برساتی دوپہر کو پی۔ آئی۔ اے کے سبز اور سفید ٹرائی ڈنٹ میں بیٹھی اس سرزمین کی طرف روانہ ہوئی جس کے باسیوں کو مشرق کے اطالوی کہا جاتا ہے۔

☆☆☆

یہ پابندیوں اور روک ٹوک سے آزاد ایک خود مختار سی زندگی تھی جو ماضی میں بہر حال اسے حاصل نہ تھی۔ وہ خواہشیں اور آرزوئیں جو ہمیشہ سینے میں مچلتی رہتی تھیں۔ انہیں وہ اس اجنبی سرزمین پر بہت شان سے پورا کر رہی تھی۔ شانوں پر لہراتے بل کھاتے بال جن کی چمک اور کھلار آنکھوں کو بھلا لگتا تھا، اسے بہت پسند تھے۔ اکثر وہ اپنی موٹی سی لمبی چوٹی کو انگلیوں کی پوروں سے مسلتی اور اپنے آپ سے کہتی تھی۔

"اللہ میرا بس چلے تو بالوں کے اس جنگل کو پلک جھپکتے میں کٹوا دوں میرے گھنے بال میرے کندھوں پر بکھرے ہوئے کتنے خوبصورت لگیں گے۔"

جدید کپڑوں پر دوپٹا گلے میں ڈالنا بہت مرغوب تھا۔ لیکن مونا دوپٹا اوڑھے بغیر گھر سے قدم نکالنا دشوار تھا۔ یہ اور بات ہے کہ ایک چھوٹا سا دوپٹا وہ کتابوں میں رکھ کر اپنے ساتھ کالج ضرور لے آتی۔ لباس سے اٹھتی بھینی بھینی خوشبو اور ہلکے ہلکے میک اپ کی اسے شدید تمنا رہتی تھی۔ پر اس تمنا کا اظہار اس دقیانوسی اور روایات کی سڑانڈ مارتے گھر میں ممکن نہ تھا۔ اکثر و بیشتر جب وہ لڑکیوں اور عورتوں کو چھوٹا سا دوپٹا گلے میں ڈالے مکمل اعتماد اور وقار سے نپے تلے قدم اٹھاتے دیکھتی تو اپنے آپ سے یہ ضرور کہتی۔

"کس قدر فضول اور احمقانہ بات ہے کہ عورتیں اگر اپنے سر کھلے رکھیں تو فرشتے ان پر لعنت بھیجتے ہیں لو بھلا اللہ کی یہ نیک مخلوق لعن طعن کرنے اور اچھے بھلے انسانوں پر پھٹکار ڈالنے کے لیے ہی تو رہ گئی ہے اور تو کوئی کام ہی نہیں ہے انہیں۔"

پھر لہجے میں تھوڑی سی ملامت کا عنصر عود آتا۔

"واہ لوگوں نے بھی اپنی مطلب برآری کے لیے کیسی کیسی تاویلیں گھڑ رکھی ہیں؟ ایک وہ ہماری ماں جی ہیں کیسی احمقانہ باتیں کرتی ہیں؟ ناقابل یقین۔ پڑھے لکھے لوگوں کی ذہنی گرفت میں نہ آنے والی۔ دو چوٹیوں والی عورت کی قبر میں سے قیامت کے روز دو سانپ اس کے سرہانے سے نکلیں گے۔ کمال ہے گویا احتساب کا عمل ان کے اعمال پر نہیں چوٹیوں پر ہوگا۔"

کبھی کبھی ماں جی عورتوں کی بڑھتی ہوئی آزادی پر اپنا تقریری سلسلہ شروع کرتیں اور اپنے بیان میں یہ ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگاتیں کہ ننگے سر گھومنے پھرنے والی عورتوں کے چہروں سے نحوست ٹپکتی ہے۔

تب اس کا جی چاہتا کہ وہ اونچے اونچے چلا کر کہے۔

(جاری ہے)

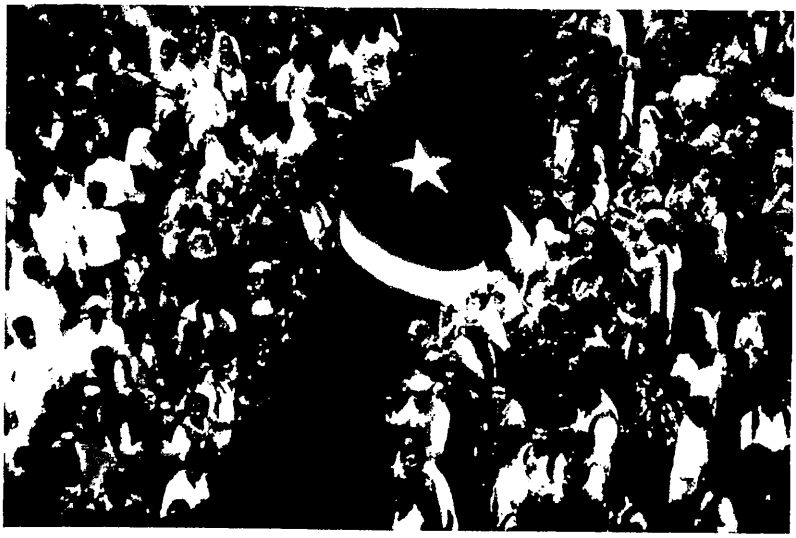

# ترانے کا سفر

کرن صدیقی

ہمارا قومی ترانہ، کئی معنوں میں انفرادیت کا حامل ہے اس کی تیاری میں کن کن مسائل کا سامنا ہوا کن کن افراد نے حصہ لیا، کیسے کیسے نغمے اور دھنیں مقابلے میں آئیں ان سب کا احاطہ کرتی دلچسپ تحریر

بیسویں صدی کا وسط تھا۔ برصغیر کے مسلمانوں نے ایک شان دار، مثالی اور بے لوث جدوجہد کے نتیجے میں ایک الگ آزاد وطن حاصل کرلیا تھا لیکن ابھی بیشمار مسائل تھے جن کا اس نوآزاد مملکت کو سامنا تھا۔ سرفہرست سرحد پار سے مہاجرین کی آمد اور ان کی آبادکاری تھی۔ پھر یہ کہ ملک کا اقتصادی ڈھانچا بالکل تباہ تھا۔ یہاں سے سرحد پار جانے والے ہندو جاتے جاتے فیکٹریوں، کارخانوں حد تو یہ ہے کہ فلمی نگار خانوں کے مالک نگار خانوں تک کو تباہ کر گئے تھے۔ مشینوں اور آلات کو توڑ پھوڑ کے اس قابل نہیں رہنے دیا تھا کہ ان سے کوئی کام لیا جاسکے۔ یہ ایسے بڑے مسائل تھے کہ جن کو حل کیے بغیر آگے نہیں بڑھا جاسکتا تھا اور نہ ہی نوزائیدہ مملکت کو ترقی کے راستے پہ ڈالا جاسکتا تھا۔ ان تمام مسائل کے علاوہ ایک اور کام جو بہت ضروری کرنا تھا وہ یہ کہ پاکستان کے قومی ترانے کی تخلیق کیوں کہ ابھی تک اس ملک کا کوئی ترانہ نہیں تھا۔

ایک اچھی بات یہ تھی کہ پاکستان کا پرچم قیام پاکستان سے پہلے ہی بن چکا تھا۔ سید امیر الدین قدوائی نے قائداعظم کی ہدایت پر پاکستان کا پرچم ڈیزائن کیا جسے گیارہ اگست انیس سو سینتالیس کو پاکستان کے قومی پرچم کی حیثیت دے دی گئی۔ ایک آزاد اور خود مختار ملک کے لیے پرچم اور ترانہ دونوں ہی لازم ہیں۔ 14 اگست 1947 کو پرچم کشائی کے موقع پر جو قومی گیت اس آزاد سرزمین کی پہلی صبح کی روشن فضاؤں میں بکھرا، اس کے الفاظ کچھ یوں تھے:

''پاکستان زندہ باد، آزادی پائندہ باد
آزادی کا ہوا سویرا
لہرایا ہے سبز پھریرا
رب دو عالم شکر ہے تیرا
سن لی ہے تو نے فریاد
پاکستان زندہ باد، آزادی پائندہ باد''

یہ اشعار اسرار الحق مجاز کے تھے لیکن یہ پہلی مرتبہ نہیں تھا کہ مجاز نے پاکستان کے لیے کچھ لکھا تھا 1945 میں انھوں نے ایک ترانہ تحریر کیا تھا جو پاکستان کا ملی ترانہ کہلایا تھا اور جو مجاز کے مجموعہ کلام ''شب تاب'' میں بھی شامل ہے۔ اس کے بول کچھ یوں تھے:

''آزادی کی دھن میں کس نے آج ہمیں للکارا
خیبر کے گردوں پہ چمکا ایک ہلال اک تارا
سبز ہلالی پرچم لے کر نکلا لشکر ہمارا
پربت کے سینے سے پھوٹا کیسا سرکش دھارا
سرمائے کا سوکھا جنگل اس میں سرخ شرارہ
پاکستان ہمارا پاکستان ہمارا پاکستان ہمارا''

یہ ترانہ جیسے ملی گیت کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ چوں کہ قیام پاکستان سے قبل کا تھا اور تب تک نہ پاکستان کے خدوخال لوگوں کے ذہنوں میں واضح ہو سکے تھے کہ وہ ریاست جس کی خاطر وہ اتنی جدوجہد کر رہے ہیں ان کی آنکھوں میں سجے خوابوں سے کس حد تک مماثلت کی حامل ہوگی اور نہ ہی صحیح معنوں میں شعرا کو یہ علم تھا کہ درحقیقت ایک نظریاتی مملکت کا تعارف پیش کرنے والا ترانہ کیسا ہونا چاہیے چنانچہ مذکورہ بالا گیت ترانے کی تعریف پہ پورا نہیں اترتا۔ اگرچہ اس وقت تک مختلف نوع مذہبی یا کسی سیاسی جماعت کے لیے ترانے لکھے اور پڑھے جاتے رہے لیکن ان میں اور ملک کے ترانے میں بہرحال فرق تو ہوتا ہے اور خاصا فرق ہوتا ہے۔ ایک دل چسپ بات یہ ہے کہ قیام پاکستان سے قبل یعنی جنوری انیس سو سینتالیس میں دہلی سے ایک کتاب شائع ہوئی۔ یہ کتاب ان ترانوں کا مجموعہ تھی جو تحریک پاکستان کے دنوں میں مختلف شاعروں نے لکھے تھے۔ وہ شعرا بڑے اور نمایاں نام تھے۔ اس کتاب کی مرتب کنندہ امتیاز جہاں بیگم رحمن تھیں۔ کتاب کی سینتالیس میں سے دو تخلیقات کا عنوان ''پاکستان کا ترانہ'' اور ''پاکستانی ترانہ'' تھا۔ اول الذکر میاں بشیر احمد کی تخلیق تھی جب کہ دوسرے ترانے کے خالق رئیس امروہوی تھے۔ بتانا اس سے یہ مقصود ہے کہ پاکستان بننے سے پہلے ہی شعرا ترانے لکھ رہے تھے لیکن مسئلہ یہ تھا کہ یہ قومی نوعیت کے معیار کے مطابق نہ تھے۔

چوں کہ جب پاکستان معرض وجود میں آیا تب تک کسی بھی نظم یا ترانے کو قومی ترانے کی حیثیت سے اپنانے کا سوچا نہیں گیا تھا۔ لہٰذا اسرار الحق مجاز کے اسی قومی گیت کو کہ جس میں ایک آزاد وطن کے حصول پہ خداوند عالم کے لیے تشکرانہ جذبات کا اظہار تھا، ترانے کے بجائے استعمال کر لیا گیا اور دیکھا جائے تو یہ بہت بر موقع اور برمحل نظم تھی کہ جس میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا گیا تھا کہ انھیں بالآخر ایک الگ وطن مل ہی گیا۔

ایک سب سے اہم دن یعنی آزاد مملکت کا پہلا دن اور اس کا سب سے اہم موقع یعنی پرچم کشائی اور چوں کہ سرکاری طور پر پرچم کشائی کے وقت قومی ترانے کا بجنا ایک لازمی بات ہے لیکن تب تک ظاہر ہے ترانہ موجود ہی نہیں تھا۔ یقیناً اس بات کو صاحبان نظر نے محسوس کیا ہوگا کہ ایسے اہم مواقع تو آتے رہیں گے اور ایسے ہر اہم موقع پہ قومی ترانے کا بجایا جانا بہت ضروری ہے اور یوں بھی قومی پرچم و قومی ترانہ کسی بھی مملکت کا تعارف ہوتے ہیں۔ تو ضرورت اس بات کی ہے کہ قومی ترانہ جلد سے جلد ترتیب دے لیا جائے۔

زیڈ اے بخاری جو اس وقت کنٹرولر آف براڈ کاسٹنگ تھے۔ انھوں نے ملک کے واحد نشریاتی ادارے کے سربراہ ہونے کی حیثیت سے اس بات کی اہمیت کو سمجھا اور جنوری انیس سو اڑتالیس کو ڈپٹی سیکریٹری وزارت داخلہ کو ایک مراسلہ بھیجا جو کہ قومی ترانے کے ہی مسئلے سے متعلق تھا۔ مذکورہ مراسلے میں قومی ترانے کے سلسلے میں کئی اہم باتیں تحریر تھیں۔ جیسے یہ کہ

*پاکستان کے علاوہ دنیا کے ہر ملک کا قومی ترانہ موجود ہے۔

*ایک برطانوی موسیقار جوزف ویلش نے پاکستان کے قومی ترانے کے لیے انھیں ایک دھن پیانو پہ تیار کر کے بھیجی ہے اور یہ دھن انھوں نے ریڈیو پاکستان لاہور اسٹیشن میں تیار کی تھی۔

*سورۂ فاتحہ کو ترانے کے طور پہ اختیار کرلیا جائے۔

غالباً ان کا خیال یہ رہا ہوگا کہ چوں کہ پاکستان میں بیشمار مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں اور یہ ممکن نہیں کہ کسی بھی ایک زبان پہ ریاست کے تمام باشندوں کو مکمل طور پہ عبور حاصل ہو تو ترانہ کسی بھی زبان میں ہو سب کے لیے آسان فہم نہیں ہوگا لہٰذا اس مسئلے کا بہترین حل یہ ہے کہ سورۃ فاتحہ جو قرآن پاک کی اوّلین صورت ہے اس کو بطور قومی ترانہ اختیار کرلیا جائے۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ ملک کی آبادی کی اکثریت مسلمان ہے اور سورۂ فاتحہ کو بطور قومی ترانہ اختیار کر لینے پر کسی کو اعتراض نہیں ہوگا۔ اپنے اس مؤقف کی تائید میں انھوں نے آٹھ دلائل بھی دیے۔

ذوالفقار علی بخاری نے شاید اس بات کو زیادہ اہم نہ جانا کہ ملک کی سو فی صد آبادی مسلمان نہیں ہے چنانچہ سورۂ فاتحہ سب کے لیے اس اہمیت اور مرتبے کی حامل نہیں ہو سکتی جو ملک کی مسلم آبادی کے لیے ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے وہ سمجھتے ہوں کہ یہ کوئی بہت بڑا مسئلہ نہیں لیکن آگے جا کر یہ بات بھی نمایاں ہوئی کہ ترانے کسی خاص مذہبی تشخص سے وابستہ نہیں ہونا چاہیے ورنہ اقلیتیں اس بارے میں بہت حساس ہو کے سوچنا شروع کر دیتی ہیں۔

زیڈ اے بخاری کے مذکورہ بالا مراسلے کا جائزہ لینے کے لیے نو فروری انیس سو اڑتالیس کو وزارت داخلہ نے ایک اعلیٰ سطحی اجلاس طلب کرلیا جس میں مراسلے میں بیان کردہ نکات پر بات کی گئی۔ سورۃ فاتحہ کو بطور ترانہ اختیار کرنے کی تجویز کو سرے سے ہی قابل غور نہیں سمجھا گیا کیوں کہ ترانہ تمام شہریوں کے لیے ہوتا ہے اور اسے ایسا ہونا چاہیے کہ سب کو اس سے وابستگی، قربت اور اپنائیت کا احساس ہو۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ترانہ کسی ملک کا تعارف پیش کرتا ہے نہ کہ محض تقدیس یا تشکر کے ہی جذبے کا اظہار کرتا ہو۔ اس اجلاس میں جوزف ڈیلش کی مرتب کردہ دھن کا ریکارڈ البتہ سنا گیا لیکن وہ دھن کسی ایک رکن کو بھی پسند نہیں آئی لہٰذا وہ اتفاق رائے سے مسترد کر دی گئی۔

اسی اجلاس میں یہ تجویز پیش کی گئی کہ ترانے کا معاملہ اتنا اہم ہے کہ اسے وزارت داخلہ کے اجلاس کے بجائے کابینہ کے اجلاس میں زیر بحث لایا جائے۔ چنانچہ ستائیس فروری انیس سو اڑتالیس کو کابینہ کا ایک اعلیٰ سطحی اجلاس ہوا جس کی سربراہی وزیر اعظم لیاقت علی خان نے کی۔ وزیر اعظم نے کہا کہ ملک میں قومی ترانے کی موجودگی بہت ضروری ہے تاہم اس کے لیے پہلے دھن موزوں کروائی جائے اور پھر شعراء کرام کو اس دھن

سے مطابقت رکھنے والے اشعار موزوں کرنے کی دعوت دی جائے۔ وزیر اعظم نے مزید بتایا کہ وہ مختلف ملٹری بینڈ ماسٹرز اور دوسرے موسیقاروں کو دھن تیار کرنے کا پہلے ہی کہہ چکے ہیں۔ غالباً وزیر اعظم کے ذہن میں یہ بات رہی ہوگی کہ اگر پہلے دھن بن جائے تو پھر اس دھن پہ الفاظ نظم کر لینا آسان ہوں گے۔

ان ہی دنوں جنوبی افریقا کے صوبے ٹرانسوال کے ایک شہر کلیرکس ڈراپ میں مقیم ایک مسلمان تاجر کہ جن کا نام احمد آرغنی تھا۔ انھوں نے پاکستانی اخبارات میں یہ اعلان شائع کروایا تھا کہ جو شخص پاکستان کے قومی ترانے کی دھن بنائے اور جو اس دھن پہ ترانہ لکھے گا۔ ان دونوں افراد کو پانچ پانچ ہزار روپے کی رقم ان کی طرف سے بطور انعام پیش کی جائے گی۔ ابھی وہ اپنے والد احمد آرغنی کی یاد میں کر رہے تھے۔

عام لوگوں کو یہ گمان ہوا تھا کہ یہ اعلان چوں کہ اخبار والوں میں چھپا تھا تو یہ گویا حکومت کی طرف سے ہے مگر درحقیقت ایسا نہیں تھا بلکہ یہ اعلان وطن کی محبت سے سرشار اس سیٹھ کی طرف سے تھا جس سے لوگ اب واقف نہیں ہیں۔ یہ البتہ ضرور ہے کہ حکومت پاکستان نے دو جون انیس سو اڑتالیس میں اس پیش کش کی تائید کر دی تھی۔

اس وقت چوں کہ ملک گوں ناگوں مسائل سے نبرد آزما تھا لہٰذا ترانے کی تیاری کا کام تاخیر در تاخیر کا شکار ہوتا رہا اور زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ بابائے قوم قائد اعظم محمد علی جناح اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ ان کی رحلت کا سانحہ قوم کے ہر فرد کے لیے اس قدر جان کاہ تھا کہ پوری پاکستانی قوم انتہائی شدید صدمے کی کیفیت میں آ گئی۔ ایسے میں اور کسی بات کا کسی کو ہوش کہاں لیکن کوئی بھی صدمہ کسی بھی قدر گہرا ہو، زخم کوئی بھی ہو، کسی قدر گہرا ہو کار جہاں کبھی رکتے نہیں ہیں۔ بس یہ ہے کہ سنبھلتے سنبھلتے کچھ وقت ضرور لگ جاتا ہے چنانچہ زندگی معمول پہ آنے لگی اور پھر سے کاروبار مملکت چل پڑا۔

دسمبر انیس سو اڑتالیس میں حکومت پاکستان نے ایس ایم اکرام کی نگرانی اور سردار عبدالرب نشتر کی صدارت میں ایک کمیٹی قائم کی جس کا کام قومی ترانے کی تشکیل کے امور دیکھنا تھا۔ نوارکان پر مشتمل اس کمیٹی میں بڑے بڑے نام شامل تھے۔

سردار عبدالرب نشتر (وفاقی وزیر مواصلات، قومی ترانہ کمیٹی کے صدر)

عبدالستار پیرزادہ، (وفاقی وزیر خوراک و زراعت)۔

پروفیسر راج کمار چکرورتی، (رکن دستور ساز اسمبلی

بنگال)۔

چوہدری نذیر احمد خان (رکن دستور ساز اسمبلی پنجاب)
ذوالفقار علی بخاری، (ڈائریکٹر جنرل ریڈیو پاکستان)
اے ڈی اظہر، (ادیب، دانشور اور بیوروکریٹ)
کوی جسیم الدین، (بنگالی شاعر)
حفیظ جالندھری، (اردو شاعر)
ایس ایم اکرام، (جوائنٹ سیکرٹری اطلاعات، براڈ کاسٹنگ سیکریٹری، کنوینر ترانہ کمیٹی)

تیس فروری انیس سو پچاس کو وفاقی وزیر خواجہ شہاب الدین نے اس کمیٹی کے اراکین کے ناموں کا اعلان اور توثیق کرتے ہوئے یہ اعلان کیا کہ پاکستان کا قومی ترانہ تشکیل دینے کے لیے مذکورہ بالا ناموں پر مشتمل جائزہ کمیٹی تشکیل دی گئی ہے۔

کمیٹی کی تشکیل میں اس بات کو مدِنظر رکھا گیا کہ کچھ نہ کچھ شمولیت بنگال یعنی مشرقی پاکستان کی بھی ہو۔ ایک شاعر اگر اردو کا لیا تو ایک بنگالی بھی لیا، اور سچ پوچھیے تو بیوروکریٹس یا ارکان قومی اسمبلی سے کہیں زیادہ یہ کام شاعر حضرات کا تھا کیوں کہ کمیٹی کو موصول شدہ ترانوں کا صحیح معنوں میں جائزہ انھوں نے ہی لینا تھا۔ کسی بھی اور شخص کی بہ نسبت زبان و بیان اور شاعری کے عیوب و محاسن شاعر حضرات ہی بہتر طور پر جان سکتے ہیں۔

چار جولائی انیس سو انچاس کو سردار عبدالرب نشتر کی سربراہی میں چھ چھ گھنٹے کے دو دورانیہ پر محیط اجلاس کی دو نشستیں ہوئیں۔ جس کے بعد حکومتِ پاکستان نے دو ذیلی کمیٹیاں بنانے کا اعلان کیا۔ ایک کا کام قومی ترانے کے لیے موصول ہونے والی دھنوں کا جائزہ لینا تھا جب کہ دوسری کمیٹی ترانے کے لیے موزوں نظم کا انتخاب کرتی۔

جیسا کہ وزیراعظم لیاقت علی خان نے کہا تھا کہ پہلے دھن بن جائے تو الفاظ دھن کے مطابق نظم کرنے میں آسانی رہے گی۔ وزیراعظم کے کہنے کے مطابق خیال کے پیچھے شاید یہ بات ہو کہ اکثر سربراہانِ مملکت کی آمد جیسے اہم مواقع اور دیگر سرکاری تقاریب کے دنوں میں پرچم کشائی کے موقع پر قومی ترانے کی صرف دھن بجائے جاتی ہے لیکن ترانے کے الفاظ نہیں پڑھے جاتے۔ نئی مملکت کے قیام کے بعد جن ممالک نے اس آزاد اسلامی ریاست کے قیام کے بعد دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ یہاں آنے کی دعوت قبول کی اور یہاں کے سربراہ کو اپنے یہاں دورہ کرنے کی دعوت دی ان سربراہ حکومت و مملکت میزبان ہوں یا مہمان ایسے ہر موقع پر ہر دو ملکوں کے قومی ترانے کی دھن ضرور بجائی جا سکے چنانچہ یہ ہی وجہ تھی کہ وزیراعظم نے الفاظ سے پہلے دھن کی تخلیق کی بات کی۔

قومی ترانہ کمیٹی کی جو ذیلی کمیٹیاں بنائی گئی تھیں ان میں سے ایک کمیٹی جس کا کام ترانے کی دھن کا انتخاب تھا اس کے ایک رکن احمد غلام علی چھاگلہ تھے۔ وہ خود بھی بہت اعلیٰ پائے کے موسیقار تھے اور نہ صرف مشرقی موسیقی پہ دسترس رکھتے تھے بلکہ مغربی موسیقی پہ بھی انھیں دست رس حاصل تھی۔ انھوں نے انگلستان کے ٹرینٹی کالج آف میوزک سے موسیقی کی تعلیم حاصل کی اور قیامِ پاکستان سے قبل ایک فلم کمپنی اجنتا میں بحیثیت موسیقار کام بھی کیا۔ اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ نہ صرف مشرقی اور مغربی موسیقی کے ماہر تھے بلکہ ایک تجربہ کار موسیقار بھی تھے۔ انھوں نے کچھ ہی وقت میں اپنی تیار کردہ ایک دھن کے ساتھ ساتھ چند اور منتخب شدہ دھنوں کو بھی کمیٹی کے سامنے پیش کیا۔ ان دھنوں کو اپنج ایم پی ایس دلاور پر رائل پاکستان نیول بینڈ کے ذریعے سنوایا گیا۔ نیوی کے بینڈ نے ان تمام دھنوں کو بیگ پائپس پر بھی بجا کر سنایا۔

ترانہ کمیٹی کو سب سے زیادہ فکر اس بات کی تھی کہ شہنشاہ ایران نے انیس سو پچاس کے اوائل میں دورہ پاکستان کا اعلان کر دیا تھا اور ان کی آمد کے موقع پر اگر ترانہ تیار نہ بھی ہو تو کم از کم دھن تو تیار ہو چنانچہ اکیس اگست انیس سو انچاس کو ترانہ کمیٹی نے احمد غلام علی چھاگلہ کی دھن کو قومی ترانے کی عارضی دھن کے طور پر منظور کر لیا۔ احمد چھاگلہ کی دھن کو ریڈیو پاکستان کے لیے بہرام رستم سہراب جی نے اپنے پیانو پر بجا کر ریکارڈ کروایا تھا۔ اس دھن کا دورانیہ 80 سیکنڈ کا تھا۔ اس دھن کو بجانے کے لیے اکیس آلات موسیقی اور اڑتیس سازا استعمال ہوئے تھے۔

شہنشاہ ایران کی پاکستان آمد کے موقع پر حکومتِ پاکستان نے نیوی کے بینڈ کو قومی ترانے کی دھن بجانے کی ذمے داری سونپی اور یوں پہلی مرتبہ یکم مارچ انیس سو پچاس کو کراچی ائیر پورٹ پہ عبدالغفور کی قیادت میں نیوی کے بینڈ کو پہلی مرتبہ قومی ترانے کی دھن کو بجانے کا اعزاز حاصل ہوا۔ یہ پہلی مرتبہ تھا کہ جب کسی سرکاری نوعیت کی تقریب میں قومی ترانے کی دھن بجائی گئی۔

لیاقت علی خان نے جب امریکا کا سرکاری دورہ کیا تب بھی یہ ہی دھن بجائی گئی۔ یہ سب کام تو ہوتے رہے لیکن کمیٹی اپنے کام میں مصروف رہی یعنی قومی ترانے کے لیے موزوں دھن اور الفاظ کی تلاش۔ کمیٹی نے موصول ہونے والی دھنوں کا بغور جائزہ لے کر دو دھنوں کو اس قابل سمجھا کہ ان پہ ترانہ بنایا

جاسکتا ہے۔ ایک تو احمد چھاگلہ والی دھن تھی اور دوسری مشہور موسیقار سجاد سرور نیازی کی دھن۔

سجاد سرور نیازی خود بھی ریڈیو سے وابستہ تھے۔ وہ مشہور گلوکارہ ناہید نیازی کے والد اور مشہور موسیقار مصلح الدین کے سسر تھے۔ بہت سوچ بچار کے بعد دس اگست انیس سو پچاس کو ترانہ کمیٹی نے احمد جی چھاگلہ کی دھن کو عارضی کے بجائے مستقل طور پر قومی ترانے کی دھن کی حیثیت سے منظور کرلیا۔ اس دھن کی منظوری کے بعد چھ دسمبر انیس سو پچاس کو زیڈ اے بخاری نے اس دھن پر لکھا ہوا اپنا ترانہ کابینہ کے ایک اجلاس میں پیش کیا لیکن وہ کابینہ کے ارکان کو بہتر نہیں لگا اور یہ اعتراض ہوا کہ اس کے الفاظ مشکل ہیں اور عام فہم نہیں ہیں۔ پھر اٹھائیس فروری انیس سو اکیاون کو کابینہ کے سامنے برصغیر کے مشہور ادیب اور شاعر حکیم احمد شجاع پاشا کا لکھا ہوا ایک ترانہ پیش کیا گیا۔ اسے پسند تو کیا گیا لیکن قومی ترانے کا درجہ دینے کی حد تک پسندیدگی نہیں تھی۔ اگلے ماہ اٹھائیس اور انتیس مارچ کو قومی ترانہ کمیٹی کے دو اور اجلاس منعقد ہوئے۔ جن میں متعدد شعرا کے ترانے پیش ہوئے۔ کمیٹی کو حفیظ جالندھری کے علاوہ حکیم احمد شجاع پاشا کا تحریر کردہ ترانہ پسند آیا۔

کمیٹی کو یہ محسوس ہونے لگا کہ احمد چھاگلہ کی دھن قدرے مشکل ہے اور جو ترانے انھیں موصول ہو رہے تھے شاید اس دھن سے کسی بھی نظم کے الفاظ صحیح طور پہ مطابقت نہ کر پائیں گے۔ اگرچہ وہ اردو اور بنگالی دونوں زبانوں میں تھے لیکن پھر بھی وہ احمد چھاگلہ کی دھن کے حساب سے مناسب نہیں معلوم ہوئے... چنانچہ ایک مرتبہ پھر سجاد سرور نیازی کی دھن پہ غور کیا جانے لگا۔ اسے ایک دفعہ پھر بی بی سی لندن بھجوایا گیا تاکہ اسے مزید بہتر انداز میں ریکارڈ کیا جائے اور پھر اسے اچھی طرح سن کے فیصلہ کیا جاسکے لیکن جب یہ دھن پھر ریکارڈ ہو کر آئی تو اب پھر یہ مسئلہ پیدا ہوگیا کہ کون سی دھن بہتر ہے احمد چھاگلہ کی یا سجاد سرور نیازی کی۔ کیوں کہ دونوں ہی اپنی جگہ بہتر تھیں۔ کچھ ارکان کو احمد چھاگلہ کی تخلیق کردہ دھن بہتر لگ رہی تھی اور کچھ کو سجاد سرور نیازی کی بنائی گئی دھن اچھی لگ رہی تھی۔

چار جون انیس سو ترپن کو ایک مرتبہ پھر کابینہ کی ذیلی کمیٹی کا اجلاس ایچ ایم پی ایس دلاور میں منعقد ہوا۔ جہاں نیول بینڈ نے ان دونوں دھنوں کو کمیٹی کے سامنے بجایا لیکن کمیٹی کے ارکان اب بھی کسی متفقہ نتیجے پہ پہنچ نہیں پا رہے تھے لیکن وزیر اطلاعات شعیب قریشی کو احمد چھاگلہ کی دھن سجاد سرور نیازی کی دھن سے ذرا زیادہ بہتر محسوس ہوئی۔ انتیس اور تیس دسمبر انیس سو ترپن کو پھر کابینہ کے اجلاسوں میں یہ دونوں دھنیں بجوا کے سنی گئیں... اور بالآخر دو جنوری انیس سو چون کو احمد چھاگلہ کی دھن سرکاری طور پر قومی ترانے کی دھن کے طور پہ منظور کرلی گئی۔

دھن کا مسئلہ تو طے پا گیا لیکن ابھی ترانے کے الفاظ کا معاملہ باقی تھا۔ وفاقی کابینہ نے حکم دیا کہ حکیم احمد شجاع پاشا، حفیظ جالندھری اور زیڈ اے بخاری کے ترانوں کے الفاظ احمد چھاگلہ کی دھن سے ہم آہنگ کرکے کابینہ کے سامنے پیش کیے جائیں تاکہ صحیح طور پر فیصلہ ہوسکے کہ کون سے الفاظ دھن کے ساتھ بہتر طور پہ مربوط ہیں۔ کابینہ نے ان تمام ترانوں کو بغور سنا پھر یہ تجویز دی کہ ترانے کا پہلا بند زیڈ اے بخاری کے ترانے سے لے لیا جائے اور بقیہ دو بند حفیظ جالندھری کے ترانے سے لے لیے جائیں یوں ترانہ مکمل کرلیا جائے۔ اس سلسلے میں متضاد باتیں سننے کو ملتی ہیں۔

ایک تو یہ کہ زیڈ اے بخاری تو اس تجویز پہ رضامند ہوگئے تھے لیکن حفیظ جالندھری نے انکار کردیا تھا دوسری طرف یہ بھی کہا جاتا ہے کہ دونوں حضرات نے اس تجویز کو قطعی طور پہ رد کردیا تھا۔ حفیظ جالندھری نے دوٹوک انداز میں کہہ دیا تھا کہ اگر ان کا تحریر کردہ ترانہ لیا جائے گا تو پورا کا پورا یوں ہی لینا ہوگا جیسے وہ ہے ورنہ وہ اس میں کسی اور کی شاعری کا پیوند ہرگز ہرگز نہیں لگائیں گے۔ اپنے اس مؤقف کے بارے میں ان کی دلیل یہ تھی کہ ان کا ترانہ کسی اور بحر میں ہے اور زیڈ اے بخاری کے ترانے کی بحر بالکل مختلف ہے لہٰذا دونوں کا میل مناسب نہیں۔

یہ بات تو اپنی جگہ ہے لیکن اصل جو بات ہے وہ یہ ہے کہ کوئی بھی تخلیق کار اپنی تخلیق میں کسی دوسرے کی تخلیق کی ملاوٹ برداشت نہیں کرسکتا خواہ وہ کام اس سے بہتر ہی کیوں نہ ہو۔ کیوں کہ پھر اس کو یہ محسوس ہوتا کہ اس کے فن میں کچھ نقص یا کمی تھی تبھی دوسرے شخص کے کام کو اس کے کام میں شامل کیا گیا۔ یہاں اور باتوں کے ساتھ ساتھ ایک شاعر کی شاعرانہ انا کا بھی سوال تھا۔ حفیظ جالندھری کے دوٹوک انکار پہ کابینہ نے دو جون انیس سو چون کو ترانے کے الفاظ کی حتمی منظوری کا فیصلہ مؤخر کرتے ہوئے صرف دھن کی بطور قومی ترانے کی دھن کی منظوری دے دی۔

سات جولائی انیس سو چون کو اسی سلسلے میں کابینہ اجلاس منعقد ہوا۔ جس میں حفیظ جالندھری سے ان کے ترانے کے آخری بند کے تیسرے مصرع میں موجود ''جان استقبال'' کی وضاحت چاہی۔ حفیظ جالندھری نے تسلی بخش طور پر اس ترکیب کی

وضاحت کردی اور ساتھ ہی یہ بھی پیش کش کی کہ اگر وضاحت کے باوجود یہ ترکیب نامانوس اور مشکل لگ رہی ہے تو وہ اسے تبدیل کر کے ''ملت کا اقبال'' کرنے کو تیار ہیں لیکن یہ ہے کہ اس طرح ترانے کی شوکت الفاظ متاثر ہوگی۔ ارکان کابینہ نے اس پر خوب غور وخوض کیا اور بالآخر چار اگست انیس سو چون کو حفیظ جالندھری کا لکھا ہوا ترانہ بغیر کسی ردّ وبدل اور ترمیم کے قومی ترانے کے طور پہ منظور کرلیا۔ کمیٹی کو تب تک سات سو تیئس ترانے موصول ہو چکے تھے۔ یقیناً یہ حفیظ جالندھری کے لیے بہت اعزاز کی بات تھی کہ ان سینکڑوں ترانوں میں سے ان کا ترانہ منتخب ہوا۔ یہ ترانہ پہلی مرتبہ تیرہ اگست انیس سو چون کو ریڈیو پاکستان سے نشر ہوا۔ ریڈیو پاکستان کے ریکارڈ کے مطابق اس ترانے کی صدابندی میں گیارہ گلوکاروں نے حصہ لیا جن کے نام یہ ہیں:

احمد رشدی، نسیمہ شاہین، کوکب جہاں، زوار حسین، اختر عباس، شمیم بانو، نجم آراء، رشیدہ بیگم، انور ظہیر، غلام دستگیر، اختر وصی علی۔

سولہ اگست انیس سو چون کو وزارت اطلاعات ونشریات نے باضابطہ طور پر اس ترانے کو باقاعدہ سرکاری طور پر قومی ترانے کے طور پر منظور کیے جانے کا اعلان کیا۔ انیس جنوری انیس سو پچپن کو اس ترانے کی فلم تیار کی گئی۔

حفیظ جالندھری کو ان کی ملی خدمات کے اعتراف میں انیس سو چھپن میں ہلال امتیاز سے نوازا گیا اس کے علاوہ عدالت عالیہ مغربی پاکستان کے جج صاحبان اور معروف قانون دانوں نے انیس سو اڑسٹھ میں ایک خصوصی نشست میں قومی ترانے کے حوالے سے ان کی خدمات پر ''نقرئی قلم دان'' پیش کیا۔ کہا یہ جاتا ہے کہ جس وقت یہ قلم دان انھیں ان کے اعتراف فن کے طور پہ پیش کیا گیا۔ تب خوشی کا بے پناہ احساس نمی بن کر ان کی آنکھوں میں اتر آیا تھا۔ یقیناً وہ تمام مشقت بھرے لمحے ان کی نظر کے سامنے آن کھڑے ہوئے ہوں گے جب اس عظیم کام کو انجام دینے کے لیے نہ انھیں دن کی پروا تھی نہ رات کی۔ ان کی بیگم خورشید حفیظ نے ایک موقع پہ بتایا کہ قومی ترانہ لکھنے کے لیے حفیظ تین ماہ تک اپنے کمرے میں بند رہے۔ لکھ لکھ کے کاغذ پھاڑ دیتے تھے وہ خود اپنے کام سے مطمئن نہیں ہوتے تھے لیکن بالآخر یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچا۔

ترانے کی تخلیق کا کام اتنا بڑا ہے کہ رہتی دنیا تک جب تک پاکستان رہے گا، پاکستان کا ترانہ رہے گا، تب تک قومی ترانے کے خالق کی حیثیت سے حفیظ جالندھری کا نام بھی روشن رہے گا۔ اسی طرح قومی تاریخ میں قومی ترانے کی دھن کے بنانے والے کی حیثیت سے احمد غلام علی چھاگلہ کا نام بھی ایک ممتاز حیثیت کا حامل اور اونچے مقام پر فائز رہے گا۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ احمد چھاگلہ اس ترانے کو مکمل طور پہ یعنی دھن اور الفاظ کے ساتھ نہ سن پائے۔ اس ترانے کی مکمل طور پر متفقہ اور مستقل منظوری سے قبل ہی پانچ فروری انیس سو ترپن کو ان کا انتقال ہوگیا تھا۔ حکومت پاکستان نے تینتالیس برس بعد ان کے کمال فن کا اعتراف کیا اور انیس سو چھیانوے میں بعد از مرگ انھیں صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی سے نوازا۔ جو ان کے صاحب زادے عبدالخالق چھاگلہ نے تئیس مارچ انیس سو چھیانوے کو واشنگٹن میں ایک باوقار تقریب میں وصول کیا۔

یہاں آخر میں تھوڑی سی بات ترانے سے متعلق اس اعتراض کی جو اکثر لوگ کرتے رہتے ہیں۔ کچھ لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ ہر ایک شے میں نقص نکالتے ہیں۔ چنانچہ ایسے ہی کچھ لوگ قومی پرچم پہ بھی اعتراض کرتے ہیں کہ اس پہ ڈوبتا ہوا چاند ہے۔ یہ غلط ہے اس کے بجائے ہلال نو ہونا چاہیے تھا۔ خیر اتنی تو یہ ہمارا موضوع نہیں۔ یہاں بات ہم اس اعتراض کی کر رہے ہیں جو اکثر ترانے پہ کیا جاتا ہے کہ اس کے الفاظ نامانوس، مشکل اور فارسی کے ہیں۔ ہمارا ترانہ اردو میں نہیں ہے۔ اس قسم کی باتیں سن کے ہنسی آتی ہے۔ اب ذرا بتایئے تو اس پورے ترانے میں ایسا کون سا لفظ ہے جو بولنے، لکھنے اور پڑھنے میں نہیں آتا؟ جسے آپ خالصتاً فارسی کا لفظ کہیں اور یہ نہیں کہ یہ اردو میں مستعمل نہیں ہے وہ کیا الفاظ ہیں؟ سب سے بڑھ کر یہ کہ اگر آپ اردو میں سے فارسی کے وہ الفاظ نکال دیں جو ہم بولنے اور لکھنے پڑھنے میں استعمال کرتے ہیں اور جن سے ہم مانوس ہیں۔ تب ہماری اردو زبان تو گونگی ہو کے رہ جائے گی کیوں کہ ہندی کے الفاظ تو ہمارے یہاں بلاضرورت اور بہت زیادہ بولے ہی نہیں جاتے۔ نہ ہمارے کان ہندی سے بہت زیادہ مانوس ہیں۔ یہ بہت بے تکے اور فضول اعتراضات ہیں جن کی قطعی کوئی اہمیت نہیں ہے۔

شکر خدائے ذوالجلال کہ ہمارے پاس اتنا باوقار پرچم اور خوب صورت ترانہ ہے کہ ہم اس پہ بجا طور پہ فخر کر سکتے ہیں اور ان کی بدولت دنیا میں معزز قوموں کی صف میں سر اٹھا کے کھڑے ہو سکتے ہیں۔

''پاکستان سرزمین شاد باد''۔

++

ساتواں حصہ

# روسیاہ

عاطر شاہین

وہ ایک معصوم سا سیدھا سادا نوجوان، غربت کی گود میں پلا بڑھا، خوابوں کی دنیا ہی اس کا مسکن تھا کہ اسے سبق سکھانے کے لیے اس کی بہن کو اغوا کرلیا گیا اور تب اسے آنکھیں آبنپوش کرنی پڑیں۔ مصائب کے دلدل کو پار کرتا ہوا وہ آگے بڑھا تو اس پر آشکار ہوا کہ تقدس کے ملمع چڑھے چہروں کے عقب میں مکروہ چہرے ہیں۔ وہ ان کے چہروں سے نقاب ہٹانا چاہتا تھا مگر بھول گیا تھا کہ زمینی خدا بن بیٹھے مقدس ظالمین کی قوت ناقابل شکست ہے۔

## (گزشتہ اقساط کا خلاصہ)

گولی علی کی بجائے ایک راہگیر کو لگی تھی۔ علی کے تعاقب میں ایک شہدا آیا تھا جسے اس نے قابو کر کے پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ چودھری ساجد کے کہنے پر اسے قتل کرنے آئے ہیں۔ علی اسپتال سے اپنی ماں اور بہن کو کہکشاں کالونی کے ایک مکان میں چھوڑ آیا اور زکریا ٹاؤن والے ٹھکانے پر پہنچ گیا۔ حیدر الماس اور باربر عرف جوکر بھی وہاں پہنچ گئے۔ جب حیدر الماس نے علی کو بتایا کہ چودھری ساجد ہی دراصل اسماعیل شاہد ہے تو وہ حیران رہ گیا۔ کچھ روز کے بعد جب حیدر الماس، چودھری ساجد کے گرد گھیرا تنگ نہ کر سکے تو علی اسے اغوا کرنے اس کی کوٹھی پر پہنچ گیا۔ اسماعیل شاہد تو وہاں نہ ملا البتہ وہ اس کی بیٹی عذرا کو اغوا کر کے لے آیا۔ اس نے عذرا کو اس کے باپ کے کرتوت بتا دیئے تھے لیکن وہ نہیں مان رہی تھی۔ اس دوران عذرا نے علی کو چکمہ دے کر فرار ہونے کی کوشش کی تھی لیکن قیصر نے اسے پکڑ لیا تھا۔ علی نے اسماعیل شاہد کو فون کیا لیکن وہ انکاری ہو گیا کہ وہ چودھری ساجد ہے۔ علی نے اسے دھمکی دی کہ اگر اس نے اس کی بہن اس کے حوالے نہ کی تو وہ کبھی بھی عذرا کی شکل نہ دیکھ سکے گا۔

## (اب آگے پڑھیں)

غصے سے میرا رواں رواں کانپ رہا تھا۔ مجھے اس روسیاہ شخص پر بے انتہا غصہ آ رہا تھا جو ڈھیٹ پن کی آخری حدوں پر تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ ایک تیر سے دو شکار کھیلنا چاہتا ہے۔ وہ اعتراف نہیں کرنا چاہتا تھا، کہ اس کا سیاہ چہرہ اس کی بیٹی کے سامنے آ جائے اور اپنی بیٹی کو بھی بازیاب کرا لینا چاہتا تھا لیکن وہ شاید قدرت کو بھول گیا تھا۔ جب قدرت انصاف کرنے پر آتی ہے تو بڑے بڑے برج الٹ جاتے ہیں۔ وہ کچھ ہو جاتا ہے جس کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا۔

عذرا خاموش بیٹھی رہی۔ شاید مجھے غصے میں دیکھ کر وہ سہم گئی تھی۔ کئی لمحے خاموشی کی نذر ہو گئے پھر اس نے خاموشی کو توڑتے ہوئے مجھے مخاطب کیا تو اس کی آواز میں کھوکھلا پن تھا۔

''سنو۔''

میں نے اس کی طرف استفہامیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ چند لمحے میری طرف دیکھتی رہی پھر رک رک کر بولی۔ ''کیا تم..... مجھے فروخت کر دو گے؟''

خوف، دہشت اور وحشت اس کے چہرے پر مترشح تھی۔ وہ ایک انجانے خوف میں مبتلا ہو گئی تھی۔ میں نے اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے خاموشی اختیار رکھی اور اپنی نظریں پھیر لیں۔

وہ دوبارہ بولی۔ ''پلیز۔ میرے ساتھ ایسا برا سلوک مت کرنا۔'' اس کے لہجے میں التجا تھی۔ ''میں..... میں حارث سے بہت محبت کرتی ہوں۔ میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہوں گی۔''

اس کی بات سن کر میں بے اختیار چونکا پھر پوچھا۔

''حارث..... کون حارث؟''

''وہ..... وہ میرا کزن اور منگیتر ہے۔'' عذرا ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''میں اس سے بہت محبت کرتی ہوں۔''

وہ اکسا کر بولی۔ ''میں تم سے التجا کر رہی ہوں کہ..... مجھے چھوڑ دو۔''

''سوری عذرا! جب تک میرا مقصد پورا نہیں ہو جاتا، میں تمہاری التجا نہیں مان سکتا۔'' میں نے نفی میں جواب دیا۔ ''میں تیل اور اس کی دھار دیکھ رہا ہوں۔ تمہاری قسمت کا فیصلہ تمہارے باپ کے ہاتھ میں ہے۔''

اتنا کہنے کے بعد میں اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ پیچھے سے وہ مجھے پکارتی رہی لیکن میں نے ان سنی کر دی۔ راہداری سے ہوتے ہوئے صحن میں پہنچ کر میں نے مرینہ کو کال کی اور امی کی خیریت کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ امی اس وقت سو رہی ہیں اور ان کی حالت ٹھیک ہے۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا اور امی کی صحت یابی کے لیے دعا کی۔ مرینہ سے رابطہ ختم کرنے کے بعد میں نے حیدر الماس صاحب کو کال کی لیکن ان کا فون بند جا رہا تھا۔ مجھے تشویش لاحق ہوئی۔ وہ کسی کو کچھ بتائے بغیر ہی کہیں چلے گئے تھے اور اب سہ پہر ہونے والی تھی لیکن ان کی واپسی ابھی تک نہیں ہوئی تھی۔ میں نے اسماعیل شاہد کو آدھا گھنٹا سوچنے کا وقت دیا تھا اور اب بیس منٹ گزرنے والے تھے۔

قیصر بھی گیٹ کے قریب ایک کرسی پر انتہائی مستعد بیٹھا ہوا تھا۔ میرے بازو کا زخم اب ٹھیک ہو چکا تھا البتہ مندمل ہوتے زخم پر ہاتھ لگانے سے ہلکا ہلکا درد ہوتا تھا۔ کچھ دیر ہی گزری تھی کہ مجھے گیٹ پر کار کا ہارن سنائی دیا۔ قیصر

نے گیٹ کھول دیا، حیدر الماس صاحب کی کار اندر آ گئی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر حیدر الماس صاحب خود موجود تھے۔ وہ کار سے اتر کر میری طرف آ گئے۔

''حیدر صاحب، خیریت تو تھی۔ آپ کہیں چلے گئے تھے؟'' میں نے پریشان کن لہجے میں کہا تو وہ مسکرا دیئے پھر ہم ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اندرونی کمرے کی طرف بڑھے۔

''ہاں۔ ایک ضروری میٹنگ تھی۔'' وہ قدم بہ قدم چلتے ہوئے بولے۔ ''اس لیے مجھے ایمرجنسی میں جانا پڑا۔''

''میٹنگ ہوگئی؟'' میں نے استفسار کیا۔

''ہاں۔'' انہوں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''تم سناؤ، تمہاری امی کی طبیعت کیسی ہے؟''

''ابھی مرینہ سے بات ہوئی تھی۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اللہ کا شکر ہے وہ بہتر ہیں اور سو رہی ہیں۔''

''اللہ انہیں جلد سے جلد صحت عطا فرمائے۔'' حیدر الماس صاحب نے امی کے لیے دعا کی تو میں نے آمین کہا۔ کمرے میں آنے کے بعد صوفے پر بیٹھتے ہوئے ان کی نظر میری لال انگارہ آنکھ پر پڑی تو وہ چونکے۔

''تمہاری آنکھ سرخ کیوں ہے؟'' انہوں نے پوچھا۔

''عذرا نے سالن میرے چہرے پر پھینک دیا تھا۔'' میں نے کھسیانے انداز میں کہا اور انہیں مختصر طور پر بتایا تو وہ تاسف بھرے انداز میں بولے۔

''شکر ہے آنکھ میں شور یا زیادہ نہیں چلا گیا ورنہ تمہیں فوراً ڈاکٹر کے پاس جانا پڑتا۔ آنکھ کی بینائی کا بھی مسئلہ ہو سکتا تھا۔''

میں نے اثبات میں گردن ہلا دی اور دوسرے صوفے پر بیٹھ گیا۔ انہوں نے استفسار کیا۔ ''اب کیا سچوئیشن ہے۔ کیا اسماعیل شاہد سے بات ہوئی تمہاری؟''

''جی۔'' میں نے جواب دیا اور پھر مختصر طور پر اسماعیل شاہد سے ہونے والی گفتگو بھی دہرا دی۔

''اسماعیل شاہد اپنے تئیں پوری کوشش کرے گا کہ وہ خود پر ٹینکسٹر کا لیبل نہ لگوائے اس لیے میرا نہیں خیال کہ وہ جلد اپنے گناہوں کا اعتراف کرے گا۔ اس طرح اس کی اپنے خاندان اور معاشرے میں عزت دو کوڑی کی رہ جائے گی۔''

ان کی بات درست تھی۔ تاہم میں نے اٹل لہجے میں کہا۔ ''جب تک وہ اقرار نہیں کرے گا اس کی بیٹی ہمارے پاس رہے گی۔ اگر وہ سیر ہے تو میں بھی سوا سیر ہوں۔''

''وہ تو میں دیکھ رہا ہوں۔'' حیدر الماس صاحب نے ماحول کا تناؤ ختم کرنے کی غرض سے کہا پھر اس سے پہلے کہ ہمارے درمیان مزید بات ہوتی اسی لمحے اسماعیل شاہد کی کال آ گئی۔ میں نے اسکرین پر اس کا نمبر دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اسماعیل شاہد کی کال ہے۔''

''بات کرو، شاید وہ مان گیا ہو۔'' حیدر الماس صاحب سنجیدہ لہجے میں بولے۔ میں نے کال اٹینڈ کرنے کے بعد سیل فون کان سے لگاتے ہوئے کہا۔

''لگتا ہے فیصلہ کر لیا ہے تم نے؟''

''ہاں۔ میں تیار ہوں۔'' اس کا لہجہ ہارے ہوئے جواری کی طرح تھا۔ میں نے مسرت بھری نظروں سے حیدر الماس صاحب کی طرف دیکھا۔

''گڈ۔ آخر اونٹ پہاڑ کے نیچے آ ہی گیا۔ تو پھر بتاؤ میری بہن کہاں ہے؟'' میں نے سرشاری کی کیفیت میں پوچھا۔

''کیا فون پر بتا دوں؟'' اس نے پوچھا۔

میں نے جواب دیا۔ ''ہاں۔''

''نہیں۔'' اسماعیل شاہد نے کہا۔

''تو.....'' میں ٹھٹکا۔

''ایک ایڈریس نوٹ کرو۔ تم میری بیٹی کو لے کر مطلوبہ جگہ پہنچ جاؤ۔ باقی باتیں وہیں ہوں گی۔''

میں نے چونک کر حیدر الماس صاحب کی طرف دیکھا اور دھیمی آواز میں اسماعیل شاہد کی بات دوہرا دی۔ انہوں نے میرے کان میں سرگوشی کی تو میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''سنو اسماعیل شاہد عرف چوہدری ساجد۔'' میں نے کہا۔ ''ہم نے کہاں ملنا ہے اس بارے میں، میں طے کروں گا۔''

''تم.....'' وہ چونکے۔

''ہاں۔'' میں نے جواب دیا۔

''اچھا بتاؤ۔'' اسماعیل شاہد نے چند لمحے بعد جواب دیا۔ ''کہاں ملنا ہے؟''

میں نے حیدر الماس کا بتایا ہوا ایڈریس اسے نوٹ کرانے کے بعد کہا۔ ''اسماعیل شاہد عرف چوہدری ساجد! ہر قسم کی چالاکی، عیاری، مکاری اور چالبازی تمہاری بیٹی کے

لیے نقصان کا باعث بن سکتی ہے اس لیے اکیلے آنا اور پولیس کو خبردار کرنے کی کوشش نہ کرنا ورنہ.....''

''میں سمجھتا ہوں۔'' اس نے گمبھیر لہجے میں میری بات کاٹ دی۔ ''میں اکیلا ہی آؤں گا۔ بے فکر رہو۔''

''گڈ۔'' میں نے اسے ستائش دی۔

''لیکن کان کھول کر میری بات بھی سن لو۔'' وہ سخت لہجے میں بولا۔

''وہ کیا؟'' میں نے ہونٹ بھینچے۔

''اگر تمہاری طرف سے میری بیٹی کو تھوڑی سی بھی گزند پہنچی تو یاد رکھنا، میں تمہاری بوٹیاں اپنے پالتو کتوں کے آگے ڈال دوں گا۔'' اس بار اس نے خونخوار لہجے میں کہا۔ مجھے اس کے لہجے میں خونخواریت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی محسوس ہوئی تھی لیکن میں نے اس کا اثر نہیں لیا تھا۔

''ایسی نوبت ہی نہیں آئے گی چوہدری۔'' میں نے اسے تسلی دی۔ ''تمہیں بھی اس بات کا خیال رکھنا ہوگا۔''

''ٹھیک ہے۔ میں ایک گھنٹے تک پہنچ جاؤں گا۔'' اسماعیل شاہد نے کہا اور پھر کال منقطع ہوگئی۔ میں نے سیل فون پتلون کی جیب میں رکھ لیا۔

حیدر الماس صاحب نے آموں کے ایک باغ میں اسماعیل شاہد کو بلانے کا کہا تھا۔ وہ باغ کس کا تھا اور حیدر الماس صاحب نے اسماعیل شاہد کو وہاں کیوں بلایا تھا مجھے اس بارے میں پوچھنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ مجھے حیدر الماس صاحب پر اندھا دھند اعتماد تھا۔ وہ بے لوث ہو کر میری مدد کر رہے تھے اور میرا ساتھ دے رہے تھے اس لیے ان پر اندھا اعتماد کرنا ضروری تھا۔ وہ ایک اچھے اور مخلص انسان تھے۔ ان کے دل میں کسی قسم کا کوئی کھوٹ، طمع اور مطلب نہ تھا لیکن ایک بات میں سوچتا تھا کہ آخر وہ بے لوث ہو کر میری مدد کیوں کر رہے ہیں۔ وقت ہوتا تو میں ان سے یہ بھی پوچھ لیتا لیکن یہ سوال میں نے پھر کسی دن کے لیے رکھ چھوڑا تھا۔ فی الحال مجھے ہر صورت اسماعیل شاہد کی قید سے اپنی بہن بازیاب کرانی تھی۔

جس جگہ ہم موجود تھے یہ شہر سے ایک گھنٹے کی مسافت پر تھا۔ وہ ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ وہاں آموں اور دیگر پھلوں کے باغات پائے جاتے تھے۔ میں نے اور حیدر الماس صاحب نے موجودہ صورتِ حال کے بارے میں مزید ڈسکس کی۔ آخر میں طے پایا کہ حیدر الماس صاحب اور ان کے کچھ کارندے میرے ساتھ جائیں گے۔ اسماعیل شاہد سے ملاقات کے وقت وہ میرے ساتھ ہوں گے البتہ ان کے کارندے باغ میں چھپ کر ہماری ''حفاظت'' کریں گے اور کسی ناگہانی صورتِ حال میں ہماری ''مدد'' بھی کریں گے۔

میرے استفسار پر حیدر الماس نے بتایا کہ اسماعیل شاہد بہت کائیاں، زیرک، چالاک اور خطرناک انسان ہے۔ اس سے کسی قسم کی اچھائی کی توقع رکھنا عبث ہے۔ ہو سکتا ہے وہ مطلوبہ جگہ پر اکیلا آئے لیکن اس کے کارندے خفیہ طور پر اس کے اردگرد موجود ہوں۔ حیدر صاحب کی یہ بات میرے دماغ کو لگی تھی۔ واقعی ایسا ممکن تھا پھر حیدر صاحب نے خود ہی بتا دیا کہ جس باغ میں ہم جا رہے ہیں وہ ان کا اپنا ہے۔ انہوں نے دو سال قبل ہی وہ باغ خریدا تھا۔ باغ کی رکھوالی اور دیگر کام کاج کے لیے ان کے ملازم کام کرتے تھے۔

میں چشم تصور میں اسماعیل شاہد عرف چوہدری ساجد کو دیکھ رہا تھا۔ جو میرا باس تھا۔ جس نے مجھے نوکری دی تھی لیکن مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہی اصل محرک ہے۔ جب ہمارا ایک دوسرے سے آمنا سامنا ہوگا تو کیا وہ مجھ سے نظریں ملا پائے گا۔ سب کچھ اس کی ناک کے نیچے ہوتا رہا تھا اور وہ انجان بنا رہا تھا۔ وہ مجھے محض طفل تسلیاں ہی دیتا رہا تھا اور میں اسے اپنا ہمدرد، غم گسار اور اپنا سرپرست سمجھتا رہا تھا لیکن وقت نے اس کا سیاہ چہرہ دکھانے کے بعد میری آنکھیں کھول دی تھیں۔

میں بسا اوقات سوچتا تھا کہ اگر حیدر الماس صاحب مجھے نہ ملتے تو میں چوہدری ساجد کو کیسے تلاش کر پاتا۔ وہ میرے سامنے ہوتا اور میں اس کی تلاش میں در در بھٹکتا رہتا۔ شاید تقدیر نے کڑی سے کڑی ملائی تھی اس لیے حیدر الماس صاحب میری زندگی میں آ گئے تھے۔

ہماری روانگی پانچ بجے تھی اس لیے چائے پینے کے بعد ہم روانہ ہو گئے۔ عذرا ہمارے ساتھ نہیں تھی۔ بقول حیدر الماس صاحب، اسے ساتھ لے جانا ہمارے لیے نقصان دہ بھی ہو سکتا تھا۔ نجانے انہیں کیوں کھٹکا لگا ہوا تھا کہ اسماعیل شاہد ہمارے ساتھ کوئی شرارت کر سکتا ہے اس لیے انہوں نے مجھے عذرا کو ساتھ لے جانے سے روک دیا تھا۔ عذرا کی حفاظت پر اماں زلیخا کے علاوہ قیصر اور اس کا ساتھی موجود تھے۔

باغ میں پہنچتے ہی حیدر الماس صاحب نے اپنے

کارندوں کو اِدھر اُدھر درختوں کی اوٹ میں چھپنے کی ہدایت دینا شروع کر دی۔ ایسے لگتا تھا جیسے دو گروپوں میں جنگ ہونے والی ہو۔ میں بڑی دلچسپی سے یہ سب کارروائی دیکھ رہا تھا۔ کارندوں کی پوزیشنز سنبھال لینے کے بعد ہم اسماعیل شاہد کا انتظار کرنے لگے۔ وہاں بیٹھنے کے لیے حیدر الماس صاحب نے مختلف جگہوں پر پتھر کے بنے بینچ بھی رکھوائے ہوئے تھے۔ شاید وہ یہاں آتے رہتے تھے۔ ہم بھی ایک بینچ پر بیٹھے تھے۔

''اسماعیل شاہد تو آپ کو دیکھتے ہی پہچان جائے گا۔'' میں نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔'' حیدر الماس صاحب نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''لیکن اس کے تصور میں بھی نہیں ہوگا کہ تمہاری پشت پر میں ہوں۔''

''اگر اس نے آتے ہی عذرا کے بارے میں پوچھا تو.....'' میں نے بات ادھوری چھوڑتے ہوئے کہا۔

''وہ پوچھے گا تو ضرور۔'' انہوں نے جواب دیا۔ ''اس بارے میں ہمیں کوئی حل نکالنا ہوگا۔''

''مثلاً۔''

''مثلاً یہ کہ.....''

اس سے پہلے کہ حیدر صاحب کی بات مکمل ہوتی اسی لمحے ان کے سیل فون پر قیصر کی کال آگئی تھی۔ وہ چونکے اور ان کے ہیلو کہنے کے جواب میں قیصر نے نجانے کیا بات بتائی کہ ان کا چہرہ یک لخت غصے کی شدت سے سرخ ہو گیا۔ آنکھوں سے شرارے سے نکلنے لگے۔

''کیا بکواس کر رہے ہو قیصر؟'' یکلخت وہ اتنے زور سے دھاڑے کہ میں بے اختیار چونک پڑا۔ ساتھ ہی وہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ انہیں اٹھتے دیکھ کر میں بھی بے اختیار کھڑا ہو گیا تھا۔ نجانے کیا بات ہو گئی تھی۔

''بدبخت۔ مجھے تم سے ایسی غفلت کی اُمید نہیں تھی۔'' وہ بولتے ہوئے رکے پھر بولے۔ ''معافی..... یہ ناقابلِ معافی غفلت ہے۔''

انہوں نے دوسری طرف سے کوئی بات سنی اور پھر بولے۔ ''اماں زلیخا اور ارشد کو لے کر فوراً وہاں سے چلے جاؤ۔ جلدی کرو۔ بدبخت انسان۔ کوئی کام ڈھنگ سے نہیں کر سکتے۔'' اتنا کہنے کے بعد انہوں نے سیل فون آف کر کے میری طرف دیکھا۔

''کیا کچھ ہو گیا ہے؟'' میں نے استفہامیہ لہجے میں پوچھا۔

''لڑکی فرار ہو گئی ہے۔'' وہ بولے تو میں اچھل پڑا۔ لڑکی سے ان کی مراد عذرا تھی۔ میں بے یقین ہی رہ گیا تھا لیکن یہ حقیقت تھی۔

''اوہو۔ کیسے؟ وہ کیسے فرار ہو گئی ہے؟'' میں نے بے اختیار پوچھا تو حیدر الماس نے قیصر کی کہی گئی باتیں دوہرا دیں۔ جن کا لب لباب یہ تھا۔ قیصر چائے کا رسیا تھا۔ دن میں آٹھ دس کپ پی جاتا تھا۔ اس نے اماں زلیخا کو چائے بنانے کا کہا تو انہوں نے بتایا کہ دودھ ختم ہو گیا ہے۔ وہ دودھ لینے قریبی دکان پر گیا تھا۔ دس منٹ بعد جب وہ واپس آیا تو اس کا ساتھی ارشد کمرے کے دروازے پر جبکہ اماں زلیخا اس کمرے میں جس میں عذرا بھی موجود تھی، بے ہوشی کی حالت میں پڑے تھے البتہ عذرا کمرے میں موجود نہیں تھی۔ قیصر نے عذرا کی تلاش میں حویلی کا کونا کونا چھان مارا یہاں تک کہ حویلی کے قرب و جوار کے علاقے میں بھی اسے تلاش کیا لیکن وہ غائب تھی۔ قیصر نے اماں زلیخا اور ارشد کو باری باری ہوش دلایا تو اماں زلیخا نے بتایا کہ عذرا نے واش روم جانے کی ضد کی تھی۔ وہ اسے واش روم بھیج کر واش روم کے دروازے پر ہی موجود تھی کہ اچانک عذرا نے واش روم سے نکل کر فلش دھونے والا ڈنڈا اس کے سر پر مارا تھا جس کی وجہ سے وہ چیختی ہوئی چکرا کر وہیں گریں اور بے ہوش ہو گئیں۔ ارشد نے بتایا کہ وہ برآمدے میں کرسی پر بیٹھا ہوا تھا کہ اسے اماں زلیخا کی چیخ سنائی دی۔ وہ جلدی سے کمرے کی طرف بڑھا تھا پھر وہ جیسے ہی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو اس کے سر پر بھی ڈنڈے کی زوردار ضرب پڑی اور وہ بھی وہیں گر کر بے ہوش ہو گیا۔ گو حیدر الماس صاحب نے میرے سامنے قیصر کو اچھی خاصی ڈانٹ پلائی تھی لیکن اس ڈانٹ سے مجھے کوئی فائدہ پہنچنے والا نہیں تھا۔ میری تو محنت ہی رائیگاں چلی گئی تھی۔

ساری تفصیل سن کر مجھے اپنے حواس مختل ہوتے محسوس ہوئے۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ ذہن سن ہو گیا تھا۔ بنا بنایا سارا کھیل بگڑ گیا تھا۔ ظاہر ہے جب عذرا اپنے گھر پہنچے گی تو اسماعیل شاہد یہاں کیسے آئے گا۔ بلکہ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے کارندوں سمیت اس باغ پر یلغار ہی نہ کر دے۔

حیدر الماس صاحب میری کیفیت بخوبی سمجھ سکتے تھے اس لیے انہوں نے مجھے تسلی دی۔ تاہم میں نے ان کی طرف

دیکھتے ہوئے ہذیانی انداز میں کہا۔ ''یہ..... یہ کیا ہو گیا ہے حیدر صاحب۔ اب میں اسماعیل شاہد سے اپنی بہن کے بارے میں کیسے معلوم کر سکوں گا۔''

لہجے کے آخر میں، میں روہانسا ہو گیا تھا۔ حیدر الماس صاحب نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور ہاتھ کا دباؤ بڑھاتے ہوئے تسلی آمیز لہجے میں بولے۔ ''میں قیصر کو اس کی غفلت کی سزا ضرور دوں گا۔''

''اس سے کیا ہو گا؟'' میں استفہامیہ لہجے میں بولا۔ ''کیا میری بہن مجھے مل جائے گی؟''

''تم ٹھیک کہتے ہو اس سے واقعی کچھ نہیں ہو گا۔'' حیدر الماس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''لیکن جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا ہے۔ اب کیا کیا جا سکتا ہے۔''

''لیکن میں تو ہی دامن رہ گیا ہوں نا۔'' میں نے زخم خوردہ لہجے میں کہا۔ ''کاش میں عذرا کو اپنے ساتھ ہی لے آتا۔''

یہ حقیقت تھی کہ میں اندر سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو رہا تھا۔ میں خود کو ہارا ہوا جواری محسوس کر رہا تھا۔

''پریشان نہ ہو علی۔ کوئی نہ کوئی صورت نکل آئے گی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ابھی تک اسماعیل شاہد کو اپنی بیٹی کے فرار کا پتا نہ چلا ہو اور وہ یہاں آ جائے۔'' حیدر الماس صاحب نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

''اللہ کرے ایسا ہی ہو۔'' میں نے بے اختیار کہا پھر ہمارے درمیان خاموشی چھا گئی۔ میں انگاروں پر لوٹ رہا تھا۔ نجانے مجھے ایسا کیوں لگ رہا تھا کہ جیسے مجھے کچھ حاصل ہونے والا نہیں ہے۔ مجھے بے حد بے چینی ہو رہی تھی۔ میں نے حیدر الماس صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''حیدر صاحب! کیا ہم یہاں بیٹھ کر اسماعیل شاہد کا انتظار کریں؟''

''ہاں۔ اس کے علاوہ ہمارے پاس کوئی چارہ بھی تو نہیں ہے۔'' حیدر الماس صاحب اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولے، پھر ہم دوبارہ بینچ پر بیٹھ گئے۔ میرا دل اداس تھا اور دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ اسماعیل شاہد کو عذرا کے فرار کا پتا نہ چلے اور وہ یہاں آ جائے۔ ایک بار وہ میرے قابو آ جائے پھر میں اسے تب تک نہیں چھوڑوں گا جب تک وہ میری بہن کے بارے میں بتا نہیں دے گا۔

شاید وہ قبولیت کا وقت تھا۔ تقدیر کو میری بے چینی، بے قراری اور کرب پر رحم آ گیا تھا۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ ہماری سماعتوں سے باغ کے دروازے پر ایک کار کے رکنے کی آواز ٹکرائی تھی۔ میں اور حیدر الماس صاحب چونک پڑے۔

''لگتا ہے اسماعیل شاہد آ گیا ہے۔'' حیدر الماس صاحب میری طرف دیکھتے ہوئے بولے تو میں دل ہی دل میں مطمئن ہو گیا۔ اس کے یہاں آنے کا مطلب تھا کہ ابھی تک اسے عذرا کے فرار کا علم نہیں ہوا تھا ورنہ وہ یہاں آتا ہی کیوں۔

دو منٹ کے بعد مجھے اسماعیل شاہد باغ میں داخل ہوتا دکھائی دیا جو بڑی تمکنت سے چلتا ہوا آ رہا تھا۔ اس نے براؤن کلر کا قیمتی لباس زیب تن کیا ہوا تھا۔ پیروں میں پشاوری چپل تھی۔ چہرے پر گہری سنجیدگی، کبیدگی اور غصے کے ملے جلے تاثرات ابھرے ہوئے تھے۔ اس نے بھی ہمیں دیکھ لیا تھا اس لیے اب وہ ہماری طرف آ رہا تھا۔ ہم اٹھ کر کھڑے ہو گئے تھے۔

''لو، تمہارا شکار آ گیا ہے۔'' حیدر الماس نے متبسم لیکن دھیمے لہجے میں کہا تو میرا رواں رواں سرشار ہو گیا۔

ہم اسے ہی دیکھ رہے تھے کہ اچانک اسماعیل شاہد کے بڑھے قدم تھم گئے۔ یوں جیسے زمین نے اس کے قدم جکڑ لیے ہوں۔ وہ اپنی قمیص کی سائیڈ جیب سے کچھ نکال رہا تھا اور جب اس کا ہاتھ باہر آیا تو اس کے ہاتھ میں سیل فون تھا۔ وہ غور سے اس کی اسکرین کی طرف دیکھنے لگا۔ میرے دل میں نجانے کیوں اندیشے سر ابھارنے لگے کہ شاید اسے عذرا کے گھر پہنچنے کی اطلاع دینے کے لیے کال کی جا رہی ہے۔ اسی خیال کے آتے ہی میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس کے اور ہمارے درمیان تقریباً ساٹھ گز کا فاصلہ تھا۔

''مجھے گڑبڑ لگ رہی ہے۔'' میں نے کہا اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا اسماعیل شاہد کی طرف بڑھنے لگا۔ حیدر الماس صاحب بھی میرے پیچھے آنے لگے۔ اسماعیل شاہد نے کال سن لی تھی اور میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے کے تاثرات بھی بدل گئے تھے۔ جب اسماعیل شاہد نے مجھے اپنی طرف آتے دیکھا تو وہ جلدی سے مڑ کر تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

''رک جاؤ چوہدری ساجد۔ میں کہتا ہوں رک جاؤ۔'' میں نے چیختے ہوئے تحکمانہ لہجے میں کہا لیکن وہ نہ رکا بلکہ اس نے مڑ کر دیکھنا بھی گوارہ نہ کیا۔ ہم دونوں ہی اس کے پیچھے بھاگنے لگے۔

''علی! محتاط رہو۔'' پیچھے سے مجھے حیدر الماس صاحب کی آواز سنائی دی لیکن میں نے ان کی ہدایت بھی نظر انداز کردی۔

مجھ پر جنون طاری تھا۔ میں ہر صورت اسماعیل شاہد کو پکڑنا چاہتا تھا اس لیے جتنا تیز دوڑ سکتا تھا دوڑنے کی کوشش کر رہا تھا پھر اچانک اسماعیل شاہد جلدی سے رکا اور اس نے لٹو کی طرح گھومتے ہوئے اپنی قمیص کی جیب سے ریوالور نکال کر مجھ پر فائر جھونک دیا۔ خوش بختی سے گولی میرے پہلو سے نکل کر فضا میں گم ہوگئی البتہ ہم دونوں جلدی سے رک کر جھک گئے تھے۔ پھر جب سیدھے ہو کر دیکھا تو اسماعیل شاہد دروازے تک پہنچ چکا تھا اور پھر ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے دروازہ عبور کر کے باہر نکل گیا۔ میں نے دوڑ لگا دی۔ ادھر حیدر الماس صاحب چیخ چیخ کر اپنے کارندوں کو بھی پکار رہے تھے جو درختوں کی آڑ سے نکل کر ہمارے پیچھے آرہے تھے۔

میں اس وقت چھلاوا بنا ہوا تھا۔ دروازے سے کچھ فاصلے تک پہنچتے ہی میں ایک ہی جست میں دروازہ کراس کر کے دوسری طرف سڑک پر پہنچا تو دیکھا، اسماعیل شاہد اپنی کار میں بیٹھ چکا تھا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے مایوسی نے گھیرا لیکن میں کچھ سمجھے بغیر ہی اسماعیل شاہد کی کار کے پیچھے دوڑ پڑا۔

صورتِ حال یہ تھی کہ اسماعیل شاہد اپنی کار دوڑائے جا رہا تھا اور میں اپنی پوری رفتار سے اس کے پیچھے دوڑ رہا تھا۔ دیکھنے والوں کے لیے وہ منظر کسی ایکشن سے بھرپور فلمی منظر سے کم نہ تھا، اور شاید لوگ یہ گمان بھی کر سکتے تھے کہ فلم کی شوٹنگ ہو رہی ہے۔

''گاڑی روکو، رک جاؤ چوہدری ساجد۔ کہاں جا رہے ہو۔ مجھے میری بہن کے بارے میں بتاؤ۔'' دوڑنے کے ساتھ ساتھ میں چیخ بھی رہا تھا لیکن میری آواز شاید اس تک نہیں پہنچ پا رہی تھی۔

اسماعیل شاہد واقعی اکیلا آیا تھا۔ اگر اس کے کارندے اس کے ساتھ ہوتے یا قرب و جوار میں چھپے ہوتے تو وہ ہم پر حملہ بول سکتے تھے لیکن دکھ اس بات کا تھا کہ قیصر کی غفلت کی وجہ سے اہم مہرہ میرے ہاتھوں سے ریت کی طرح نکل رہا تھا۔ میں جتنا تیز دوڑ سکتا تھا دوڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسماعیل شاہد کی کار اور میرے درمیان فاصلہ لمحہ بہ لمحہ بڑھتا جا رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اگر وہ فرار ہو گیا تو پھر اس کا ہاتھ آنا مشکل تھا۔ عین اسی لمحے اسماعیل شاہد نے کھڑکی سے ریوالور والا ہاتھ نکال کر مجھ پر فائر جھونک دیا۔ میں نے خود کو بچانے کی کوشش کی اور اسی کوشش میں میرا پاؤں رپٹ گیا جس کی بدولت میں خود کو نہ سنبھال سکا اور پہلو کے بل سڑک پر گر گیا۔ پھر جب تک میں اٹھتا، اسماعیل شاہد کی کار قدرے دور جا چکی تھی۔ فائر کی آواز سن کر قرب و جوار میں موجود لوگ ہماری طرف متوجہ ہو گئے تھے بلکہ چند لوگ تو دوڑتے ہوئے میرے پاس آ گئے تھے۔

''تم ٹھیک تو ہو؟'' ایک ادھیڑ عمر آدمی نے استفسار کیا۔

''جی، میں ٹھیک ہوں۔'' میں نے ہونٹ بھینچتے ہوئے جواب دیا۔ میں جلدی سے اٹھا اور حیدر الماس کی کار کی طرف بڑھ گیا۔ میرے وجود میں جیسے بجلی بھری ہوئی تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ لوگ مجھے کن نظروں سے دیکھ رہے تھے پھر میں کار کا دروازہ کھول کر جیسے ہی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تو دوسری طرف والی سیٹ پر حیدر الماس بھی آ کر بیٹھ گئے۔ اگنیشن میں چابی موجود نہیں تھی۔ میں نے جھنجلاتے ہوئے اسٹیئرنگ پر ہاتھ مارا۔

''کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ تمہیں گولی بھی لگ سکتی تھی۔'' وہ برہم انداز میں بولے۔

''حیدر صاحب! آپ نے دیکھا، وہ..... وہ فرار ہو رہا ہے۔'' میں نے روہانسے لہجے میں کہا۔ ''میں اسے پکڑنا چاہتا ہوں۔ اس کے پکڑے جانے سے ہی میں اپنی بہن کو بازیاب کرا سکتا ہوں۔''

''جانتا ہوں لیکن وہ مسلح تھا۔'' حیدر الماس بولے۔ ''گولی تمہیں چاٹ سکتی تھی۔''

''مجھے کوئی پروا نہیں۔'' میں نے جذباتی لہجے میں کہا۔

''جذبات کی بجائے ہوش سے کام لو لڑکے۔'' انہوں نے میری بات منقطع کی۔ ''ہوش و خرد سے بے گانہ ہونے والے ہمیشہ نقصان اٹھاتے ہیں۔ یہ تو اچھا ہوا کہ اس کا نشانہ خطا گیا تھا۔''

''آپ کار کی چابی دیں۔ میں اس کا پیچھا کرنا چاہتا ہوں۔ پلیز۔'' میں منتجیانہ انداز میں بولا۔

''کوئی فائدہ نہیں ہے۔'' حیدر الماس صاحب بولے۔ ''وہ اب تک بہت دور نکل چکا ہوگا۔''

''آپ چابی تو دیں۔'' میں نے ضدی بچے کی طرح

کہا۔ ''ہوسکتا ہے اس کی کار خراب ہو جائے، ٹائر پنکچر ہو جائے یا کچھ بھی ہو جائے۔ کچھ بھی ہوسکتا ہے اور میں اس تک پہنچ سکتا ہوں۔''

میں ہیجانی کیفیت میں بے ربط اور بے تکے جملے بول گیا تھا۔ مجھ پر اس وقت جو گزر رہی تھی میں ہی جانتا تھا۔ میری کیفیت کو سمجھتے ہوئے حیدر الماس صاحب نے اپنی گردن کھڑکی سے باہر نکال کر ایک کارندے سے چیخ کر کہا۔ ''چابی لاؤ نادر۔''

نادر نامی کارندہ جلدی سے دوڑتا ہوا چابی دے گیا۔ حیدر الماس نے چابی مجھے پکڑائی تو میں نے اسے اگنیشن میں ڈال کر گھمادی۔ کار کے اسٹارٹ ہوتے ہی میں نے اسے توپ سے نکلے ہوئے گولے کی طرح آگے بڑھا دی مگر شومئی قسمت، کافی دور آنے کے بعد بھی ہم اسماعیل کی گرد تک کو نہ پا سکے۔ نہ جانے وہ کس سمت مڑ گیا تھا کہ اب اس کی کار کہیں بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ بالآخر میں نے ایک جگہ سڑک کے کنارے کار روک دی اور اپنا سر اسٹیئرنگ پر رکھ دیا۔

مجھے اپنی منزل دھول مٹی کے غبار میں گم ہوتی دکھائی دے رہی تھی۔ میرے جسم کا رواں رواں لرز رہا تھا۔ مجھے اپنے دماغ کی نسیں پھٹتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں اپنا سر پیٹ لوں۔ منزل کے قریب پہنچنے سے پہلے ہی میں بے نیل و مرام ہو گیا تھا۔ مجھے ایسے لگتا تھا جیسے میں نے سب کچھ کھو دیا ہو۔ میں مایوسی کی اتھاہ گہرائیوں میں جا رہا تھا لیکن حیدر الماس صاحب نے شفقت بھرے انداز میں میری ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا۔

''علی..... پریشان مت ہو۔''

میں نے مایوسانہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔ ''وہ فرار ہو گیا آخر۔''

''ہم کوئی نہ کوئی دوسرا راستہ تلاش کر لیں گے۔'' وہ ہنوز شفقت بھرے لہجے میں بولے۔

میں نے ان کی آنکھوں میں بغور دیکھا تو ان کی آنکھوں میں عزم واضح دکھائی دے رہا تھا۔ میں اپنے اندر ہونے والی ہلچل کو اعتدال پر لانے کی حتی الامکان کوشش کر رہا تھا۔

''کیا راستہ تلاش کریں گے؟'' میں نے سوالیہ لہجے میں پوچھا۔

''کوئی بھی۔'' وہ بولے۔ ''جس سے ہم اسماعیل شاہد عرف چوہدری ساجد تک پہنچ سکیں۔''

میں نے ہنکارا بھرا۔ ''پتا نہیں، اب میں اس تک پہنچ بھی سکوں گا یا نہیں۔''

''مایوسی والی باتیں مت کرو۔'' حیدر الماس نے میرے کاندھے پر اپنا ہاتھ رکھا۔ ''میں مانتا ہوں کہ قیصر کی غفلت کی وجہ سے لڑکی فرار ہونے میں کامیاب ہو گئی ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم مایوس ہو جاؤ۔ تمہاری بہن میری بھی بیٹی ہے اور اپنی بیٹی کی تلاش میں، میں تمہارا بھرپور ساتھ دوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے تم سے۔''

میں ونڈ اسکرین کے پار دیکھنے لگا۔ دوسری طرف معمول کی ٹریفک موجود تھی۔ ہر شخص اپنے کام میں مگن تھا۔ کسی کو کسی کی پروا نہیں تھی۔ زندگی معمول کے مطابق چل رہی تھی۔ میں نے حیدر الماس صاحب کی اس بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ دل میں طوفان سا اٹھا ہوا تھا جسے میں دبانے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔ اسی لمحے میرے جیب میں موجود سیل فون کی بیل بجی تو میں نے سیل فون نکال کر اسکرین کی طرف دیکھا۔ اسماعیل شاہد کال کر رہا تھا۔ حیدر الماس صاحب استفہامیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگے۔

پھر پوچھا۔ ''کس کی کال ہے؟''

''اسماعیل شاہد کی کال ہے۔'' میں نے یہ کہنے کے بعد کال ریسیو کر لی۔ جیسے ہی میں نے کال ریسیو کی تو مجھے دوسری طرف سے اسماعیل شاہد کا طنزیہ قہقہہ سنائی دیا۔ وہ میری بے بسی پر ہنس رہا تھا۔

پھر اس کے قہقہے یک لخت تھم گئے اور غراہٹ بھری آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ ''علی! تم نے مجھ سے ٹکر لے کر اپنی موت کو آواز دی ہے۔ اب میں تمہارا کیا حشر کروں گا تم سوچ بھی نہیں سکتے..... تم نے میری بیٹی کو اغوا کر کے ناقابل معافی جرم کیا ہے۔''

اس کے طنزیہ ہنسنے اور اس کی بات نے میرا غصہ ساتویں آسمان پر پہنچا دیا سو میں نے بھی غراتے ہوئے جواباً کہا۔ ''یہ وقت بتائے گا کہ کون کس کا کیسا حشر کرتا ہے ذلیل انسان۔ ایک بار تم میرے ہاتھ لگ جیاؤ پھر میں تمہارا ایسا حشر کروں گا کہ تم آئینے میں اپنا چہرہ بھی دیکھنے سے ڈرو گے۔''

میری بات پر اسماعیل شاہد نے ایک بار پھر قہقہہ لگایا۔ ''تم میرا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔ میں نے تمہیں اسی

لیے فون کیا ہے کہ مجھ سے جتنا بچ سکتے ہو بچ کے رہو۔ تمہاری زندگی کے دن گنے جا چکے ہیں۔''

''زندگی کے دن کس کے گنے جا چکے ہیں یہ تم نہیں میرا رب جانتا ہے۔'' میں نے ہونٹ بھینچتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم میں ہمت اور حوصلہ ہے تو بتاؤ، میں ابھی تمہارے پاس آنے کو تیار ہوں۔ بتاؤ، کہاں آؤں میں؟''

''بہت جلد تم سے ملاقات ہوگی اور وہ آخری ملاقات ہوگی۔'' اسماعیل شاہد بولا۔

''بدبخت انسان۔ اب فون کیوں بند کر دیا۔ بتاؤ، میں کہاں آؤں۔ بتاؤ مجھے۔''

اس سارے عرصے میں حیدر الماس صاحب خاموش بیٹھے رہے تھے۔ ان کے چہرے پر گہری سنجیدگی طاری تھی۔ میں نے سیل فون ڈیش بورڈ پر پھینک دیا اور گہری سانسیں لینے لگا۔

''کول ڈاؤن علی۔'' حیدر الماس صاحب میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے تو میں نے ان کی طرف دیکھا۔

''کیا آپ میرا ایک کام کر سکتے ہیں؟'' میں نے پوچھا تو وہ چونکے۔

''کیا؟'' وہ استفہامیہ لہجے میں بولے۔

''کیا آپ اسماعیل شاہد کے نمبر کی لوکیشن معلوم کرا سکتے ہیں۔'' میرے دماغ میں یہی نقطہ ابھرا تھا اس لیے میں نے حیدر الماس صاحب کے گوش گزار کر دیا۔

حیدر الماس صاحب میری بات کا مفہوم سمجھ گئے تھے اس لیے وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولے۔ ''میں ٹرائی کرتا ہوں۔''

''ٹرائی نہیں، ہر صورت میں مجھے اس کی لوکیشن چاہیے۔'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

''اچھا ٹھیک ہے۔ کول ڈاؤن۔ میں کچھ کرتا ہوں۔ اب چلو۔'' انہوں نے کہا تو میں نے استفہامیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔ جیسے میں پوچھ رہا ہوں کہ کہاں۔ وہ میری نظروں کا مفہوم سمجھ کر بولے۔ ''قاسم پور چلو۔ وہاں میرے دوست کی چھوٹی سی ایک کوٹھی ہے۔ وہاں پہنچ کر ہی کچھ سوچتے ہیں۔''

میں نے بجھے دل کے ساتھ کار آگے بڑھائی اور کار کو قاسم پور کی طرف جانے والی سڑک پر ڈال دیا۔ میں کار کو مناسب رفتار سے چلا رہا تھا لیکن میرا ذہن آندھیوں کی زد میں تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سلب ہو گئی ہو۔

ہم پون گھنٹے کے بعد قاسم پور میں حیدر الماس صاحب کی بتائی ہوئی ایک کوٹھی کے سامنے پہنچ گئے۔ کوٹھی کی ظاہری حالت ایسی تھی جیسے وہاں کوئی رہائش پذیر نہیں تھا۔ گیٹ بھی قدرے گرد آلود تھا اور دھوپ کی وجہ سے اس کی رنگت بھی اڑی اڑی سی دکھائی دے رہی تھی۔ دیواریں قدرے بلند تھیں اور ان پر خاردار تاریں ڈالی گئی تھیں، ان تاروں پر بھی گرد کی تہیں جمی ہوئی واضح دکھائی دے رہی تھیں۔

''ہارن دو۔'' حیدر الماس صاحب بولے تو میں نے ہارن بجا دیا۔ چند لمحوں کے بعد گیٹ کھل گیا اور ایک ادھیڑ عمر آدمی کی شکل دکھائی دی۔ حیدر الماس صاحب کو دیکھتے ہی اس نے دایاں ہاتھ ماتھے پر رکھتے ہوئے سلام کیا تھا۔ حیدر الماس صاحب نے سر کی جنبش سے سلام کا جواب دینے کے بعد مجھے اشارہ کیا کہ میں کار اندر لے چلوں۔ میں نے کار آگے بڑھائی اور پورچ کے گرد آلودہ فرش پر جا کر روک دی پھر میں بوجھل انداز میں کار سے نیچے اتر کر کوٹھی کا جائزہ لینے لگا۔ حیدر الماس صاحب بھی کار سے نیچے اتر آئے تھے۔ کوٹھی کا باغ بھی اجاڑ اور ویران دکھائی دے رہا تھا۔ جیسے پیڑ پودوں کو کبھی پانی ہی نہ دیا گیا ہو۔ گھاس کی رنگت بھی سوکھ کر پیلی ہو رہی تھی۔ یہاں تک کہ کئی جگہوں پر تو گھاس کا نام و نشان ہی نہیں تھا، مٹی دکھائی دے رہی تھی۔

ادھیڑ عمر آدمی گیٹ بند کر کے ہماری طرف ہی آ گیا۔ اس نے مؤدبانہ لہجے میں حیدر الماس صاحب سے پوچھا۔

''صاب! آپ کیسے ہیں؟''

''میں ٹھیک ہوں انکل اجمل۔'' حیدر الماس صاحب نے جواب دیا۔ ''آپ کیسے ہو؟''

''میں بھی ٹھیک ہوں صاب۔'' اس نے خوشدلی سے جواب دیا۔ ''اللہ کا بہت کرم ہے۔''

حیدر الماس صاحب میری طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے۔ ''ان سے ملیں۔ ان کا نام علی ہے اور یہ آج سے یہیں رہیں گے۔''

''ٹھیک ہے صاب۔'' انکل اجمل نے خوشدلی سے جواب دیا۔ ''ان کی خدمت کر کے مجھے بے حد خوشی ہوگی۔''

''ہمم۔'' حیدر الماس صاحب نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''اچھا ہمارے لیے چائے بنا لائیں۔''

''ٹھیک ہے صاب۔'' انکل اجمل نے کہا۔ ''آپ آرام سے بیٹھیں میں ابھی چائے لاتا ہوں۔''

اتنا کہہ کر وہ ایک طرف بڑھ گیا۔

''چلو۔'' حیدر الماس صاحب نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا اور میں بوجھل قدموں کے ساتھ چلتا ہوا ان کی ہمراہی میں ڈرائنگ روم میں پہنچ گیا۔ وہاں پڑے صوفوں کی حفاظت کے لیے ان پر سفید رنگ کی موٹی موٹی چادریں ڈالی گئی تھیں۔ سرد موسم کے باوجود ڈرائنگ روم کا ماحول گھٹن زدہ محسوس ہو رہا تھا لیکن جیسے ہی دروازہ اور کھڑکیاں کھلیں، ٹھنڈی ہوا آنے کے سبب کمرے کا ماحول آہستہ آہستہ بدلنے لگا۔ میں نے حیدر الماس صاحب سے مل کر صوفوں پر پڑی چادریں اٹھائیں اور انہیں سنگل صوفے پر پھینک دیا پھر ہم صوفوں پر بیٹھ گئے۔ اچانک انہیں جیسے کچھ یاد آیا تو انہوں نے اپنے کوٹ کی جیب سے سیل فون نکالا اور تیزی سے نمبر پنچ کرنے لگے۔

''اوہ۔ اس کا تو فون بند ہے۔'' چند لمحوں کے بعد وہ بولے تو میں حیران رہ گیا۔

''کس کا فون بند ہے؟'' میں نے استفسار کیا۔

''بابر کا۔'' حیدر الماس صاحب تشویش بھرے لہجے میں بولے۔ ''مجھے پریشانی ہے کہ وہ کہیں پرانے ٹھکانے پر نہ چلا جائے۔''

واقعی یہ پریشانی کی بات تھی۔ حیدر الماس صاحب چند ثانیے پریشانی سے پہلو بدلتے رہے پھر انہوں نے دوبارہ سیل فون پر نمبر پنچ کرنے شروع کر دیئے۔

''ہیلو اعظم۔ ہاں، کیا پوزیشن ہے؟''

پھر وہ دوسری طرف سے بات سننے لگے۔ اس کے چہرے پر چٹانوں کی سی سختی دکھائی دے رہی تھی۔ دوسری طرف سے نجانے اعظم نے کیا بتایا تھا کہ انہوں نے ہونٹ بھینچ لیے تھے۔

''کیا پولیس ابھی تک حویلی میں موجود ہے؟'' انہوں نے پوچھا۔ پھر دوسری طرف سے بات سننے کے بعد انہوں نے کہا۔ ''تم بھی وہاں سے نکل جاؤ اس سے پہلے کہ تم پولیس کی نظروں میں آجاؤ۔''

اتنا کہہ کر انہوں نے سیل فون آف کر کے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لیا۔ ان کے چہرے پر گہرے تفکرات کے تاثرات ابھرے ہوئے تھے۔

''کیا ہوا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ ''پولیس نے حویلی میں چھاپہ مارا ہے لیکن وہاں کوئی موجود نہیں تھا اس لیے وہ واپس چلی گئی ہے۔''

''ہمم۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔

''مجھے بابر کی فکر ہو رہی ہے۔'' چند لمحوں کے بعد وہ دوبارہ گویا ہوئے۔ ''آج اس نے واپس آنا ہے اور وہ سیدھا حویلی جا سکتا ہے۔ مجھے یقین ہے اسماعیل شاہد نے حویلی کی نگرانی کے لیے اپنے کارندے تعینات کر دیئے ہوں گے۔ ایسے میں اگر بابر ادھر چلا گیا تو وہ پھنس سکتا ہے۔''

حیدر الماس صاحب کے لہجے میں گہری تشویش تھی۔ واقعی ایسا ہو سکتا تھا۔ انہوں نے دوبارہ بابر کو کال کی لیکن اس کا فون بند جا رہا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی تشویش بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ دس منٹ کے بعد انکل اجمل ایک ٹرے اٹھائے ڈرائنگ روم میں آگئے۔ ٹرے پر دو کپ رکھے ہوئے تھے جن سے بھاپ اڑ رہی تھی۔ انہوں نے ایک کپ حیدر الماس صاحب اور دوسرا میرے سامنے میز پر رکھا۔

''ٹھہرو۔'' انکل اجمل واپس جانے لگے تو حیدر الماس صاحب نے انہیں روکا۔ پھر مجھے دیکھتے ہوئے گویا ہوئے۔ ''کچھ کھانے کو منگواؤں؟''

''نہیں رہنے دیں، مجھے بھوک نہیں ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ یہ سچ تھا اس وقت میرا دل کسی چیز کو کھانے کا نہیں کر رہا تھا لیکن انہوں نے میری بات نظر انداز کرتے ہوئے انکل اجمل سے کہا۔

''انکل۔ ہمارے لیے کچھ کھانے کا بندوبست کر دیں۔ بے حد بھوک لگ رہی ہے۔''

''ٹھیک ہے صاب۔ ابھی بنا لاتا ہوں۔'' انکل اجمل نے خوشدلی سے کہا اور وہاں سے چلے گئے۔

''چائے پیو۔'' حیدر الماس صاحب نے اپنا کپ اٹھاتے ہوئے کہا تو میں نے بھی اپنا کپ اٹھایا اور چائے سپ کرنے لگا۔

''علی! جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔'' انہوں نے ناصحانہ انداز میں بات کا آغاز کیا۔ ''وقت ایک سا نہیں رہتا اور مایوسی تو انسان کے ذہن کو متاثر کر کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم کر دیتی ہے۔''

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ مزید بولے۔ ''اب ہمیں اسماعیل شاہد تک پہنچنے کے لیے نئے سرے سے

پلاننگ کرنا ہوگی۔''

''ہم اس کی لوکیشن ٹریس کر کے ہی اس تک پہنچ سکتے ہیں۔'' میں نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ ''اس لیے اگر آپ جلد از جلد اس کی لوکیشن معلوم کرالیں تو.....''

''مجھے اسماعیل شاہد کا نمبر دو۔'' حیدر الماس صاحب نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا تو میں نے انہیں اسماعیل شاہد کا نمبر نوٹ کرا دیا پھر انہوں نے اپنے کسی جاننے والے سے بات کی اور اسے بھی اسماعیل شاہد کا نمبر نوٹ کرا دیا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ ان کے جاننے والے نے بتایا ہے کہ وہ بہت جلد اسماعیل شاہد کے نمبر کی لوکیشن معلوم کر کے بتا دے گا۔

تھوڑی دیر کے بعد انکل اجمل کھانے پینے کی چیزیں لے کر ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ میرا کچھ بھی کھانے کو دل نہیں کر رہا تھا لیکن حیدر الماس صاحب کے سمجھانے اور اصرار پر میں نے تھوڑا سا کھانا زہر مار کر لیا۔ کھانا کھانے کے بعد حیدر الماس صاحب نے دوبارہ بابر عرف جوکر کا نمبر ٹرائی کیا تھا لیکن اس بار بھی ان کا رابطہ اس سے نہ ہو سکا۔ انہیں بابر کی فکر تھی۔ انہیں خدشہ تھا کہ کہیں بابر کسی مشکل میں نہ پھنس گیا ہو۔ اب تو انجانے خدشوں نے میرے دماغ پر بھی بسیرا کر لیا تھا۔

رات آٹھ بجے سے پہلے پہلے حیدر الماس صاحب پریشانی کے عالم میں وہاں سے چلے گئے تھے لیکن جانے سے پہلے انہوں نے مجھے سختی سے ہدایت کی تھی کہ میں کسی صورت گھر سے باہر نہ نکلوں۔ اسماعیل شاہد سے کچھ بعید نہیں تھا۔ اس کے کارندوں نے میری تلاش پہلے سے بھی زیادہ تیز کر دی ہوگی۔ میں نے انہیں تسلی دی کہ میں ان کی ہدایات پر عمل کروں گا۔

انکل اجمل نے میرے لیے کمرا سیٹ کر دیا تھا۔ میں نے کمرے میں آنے کے بعد امی کی خیریت معلوم کرنے کے لیے مرینہ کو کال کی۔

''ان کی حالت پہلے سے کچھ بہتر ہے۔'' مرینہ نے بتایا۔ ''لیکن وہ خوف بھری باتیں کرتی رہتی ہیں۔''

''وہ جلد ٹھیک ہو جائیں گی۔'' میں نے اُمید ظاہر کی۔

''ان شاء اللہ۔'' مرینہ نے کہا پھر امی کا خیال رکھنے کی ہدایت کر کے میں نے فون بند کیا اور سونے کے لیے لیٹ گیا۔

☆☆☆

اگلے روز صبح آٹھ بجے میں ناشتا کر کے فارغ ہی ہوا تھا کہ حیدر الماس صاحب کی کال آ گئی۔ وہ قدرے پریشان تھے۔ بولے۔ ''علی! تمہارے لیے بہت بری خبر ہے۔''

میں چونکا۔ ''کیا مطلب..... کیسی بری خبر؟''

''اسماعیل شاہد نے اپنی بیٹی عذرا کے اغوا کے الزام میں تم پر پرچہ کٹوا دیا ہے۔'' حیدر الماس نے بتایا تو میں بے اختیار اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ انہوں نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''آج کے نیوز پیپر میں یہ خبر شائع ہوئی ہے۔ خبر کے مطابق، اس کی بیٹی ابھی تک تمہارے قبضے میں ہے اور تم نے بدلے میں دس کروڑ تاوان مانگا ہے۔''

''یہ تو واقعی میرے لیے بہت بری خبر ہے۔'' میں نے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔ اب تم کسی صورت کوٹھی سے باہر نکلنے کی کوشش نہ کرنا۔'' حیدر الماس نے مجھے ہدایت دی۔ ''میری معلومات کے مطابق، پولیس تمہیں ہر جگہ تلاش کر رہی ہے۔ یہاں تک کہ تمہارے پرانے گھر پر بھی ریڈ کیا ہے۔ پولیس تالے توڑ کر اندر گئی تھی۔ تمہارے دوست فاروق سے بھی پوچھ گچھ کی ہے۔ وہ ہر اس جگہ چھاپہ مار رہی ہے جہاں تم انہیں مل سکتے ہو۔''

''آپ بے فکر رہیں، میں اس کوٹھی سے باہر نہیں نکلوں گا۔'' میں نے انہیں باور کراتے ہوئے کہا۔ ''لیکن.....''

''میں نے اپنے وکیل سے بات کی ہے۔'' حیدر الماس صاحب میری بات منقطع کرتے ہوئے بولے۔ ''وہ آج ہی تمہاری طرف سے ضمانت قبل از گرفتاری کی درخواست دائر کر دے گا لیکن تم پہلی فرصت میں اپنا سیل فون بند کر دو۔ پولیس سگنل کے ذریعے بھی تم تک پہنچ سکتی ہے کیونکہ اسماعیل شاہد کا کہنا ہے کہ اس کی بیٹی ابھی تک تمہارے قبضے میں ہے اور تم اسے نقصان پہنچا سکتے ہو۔''

یہ سن کر میرا دماغ سنسنا اٹھا۔ اتنا بڑا جھوٹ۔ اس سے ثابت ہو رہا تھا کہ وہ گھٹیا انسان ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہ رہا تھا۔ اس کی بیٹی اس کے پاس پہنچ چکی تھی لیکن وہ مجھے بری طرح پھنسانا چاہتا تھا تاکہ میری باقی زندگی جیل میں گزرے۔

''کیا میری تصویر بھی اخبار میں شائع ہوئی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں۔ شاید اسماعیل شاہد کے پاس تمہاری تصویر نہیں تھی۔'' حیدر الماس صاحب نے جواب دیا۔

''میری تصویر اس کے پاس ہے۔'' میں نے کہا۔ ''جب میں نے اس کی سرکس میں جاب کے لیے فارم فل کیا تو فارم پر تصویر اٹیچ کی تھی۔''

''ہمم۔'' وہ بولے۔ ''بہرحال تم ہوشیار رہو اور میں نے جو کہا ہے اس پر عمل کرو۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ پھر یاد آنے پر بولا۔ ''بابر کا کچھ پتا چلا؟''

''نہیں۔'' انہوں نے بتایا۔ ''اس کے گھر رابطہ کیا ہے۔ وہ کل دوپہر ملتان کے لیے نکلا تھا لیکن اس کا کچھ پتا نہیں چل رہا۔''

''اوہ۔'' میرے منہ سے سرسراتی آواز نکلی۔ ''کہیں وہ؟''

''ایسا ہو بھی سکتا ہے۔'' وہ میری بات کا مفہوم سمجھ کر بولے۔ ''بہرحال میرے آدمی اسے تلاش کر رہے ہیں۔ جلد ہی معلوم ہو جائے گا۔''

پھر مجھے مزید نصیحتیں کرنے کے بعد انہوں نے کال منقطع کر دی۔ میں نے پہلی فرصت میں ہی اپنا سیل فون نہ صرف آف کر دیا بلکہ اس میں سے سم بھی نکال کر اپنی جیب میں رکھ لی۔ میں نے انکل اجمل کے ذریعے مارکیٹ سے آج کا اخبار منگوالیا تھا اور اس میں ساری تفصیل پڑھی تھی۔

اخبار میں اسماعیل شاہد کا بیان، اس کی اور اس کی بیٹی عذرا کی تصویریں بھی شائع ہوئی تھیں۔ اس کے حوالے سے وہی بیان شائع ہوا تھا جو تھوڑی دیر پہلے مجھے حیدر الماس صاحب نے بتایا تھا۔ پولیس نے میرے خلاف مقدمہ درج کر کے میری تلاش شروع کر دی تھی۔

اپنے بارے میں جھوٹی خبر پڑھ کر مجھے اسماعیل شاہد پر بے انتہا غصہ آیا تھا۔ اس نے جھوٹ بولنے کی ہیٹرک کر لی تھی۔ کتنے مضحکہ خیز انداز سے اس نے مقدمہ درج کرانے کے بعد نیوز رپورٹر کو یہ بتایا تھا کہ اس کی بیٹی عذرا ابھی تک میرے قبضے میں ہے اور میں نے تاوان کے طور پر دس کروڑ مانگا ہے۔

شام کو حیدر الماس صاحب سے پھر بات ہوئی۔ انہوں نے بتایا کہ میری طرف سے دائر کی گئی ایک ہفتے کے لیے ضمانت قبل از گرفتاری کی درخواست منظور نہیں ہوئی۔ سننے میں آیا تھا کہ جس جج صاحب کی عدالت میں درخواست دائر کی گئی تھی وہ اسماعیل شاہد کے دور کے رشتے دار ہیں اور ان کے فیملی تعلقات ہیں۔ اگر میری ضمانت قبل از گرفتاری نہ ہوئی تو مجھے باقاعدہ اشتہاری قرار دے دیا جائے گا۔ یہ بات میرے لیے پریشانی کا باعث تھی۔ حیدر الماس صاحب نے مجھے تسلی دی تھی کہ ان کا وکیل ضمانت قبل از گرفتاری کی کوشش کر رہا ہے۔

''بابر کا کچھ پتا چلا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں۔'' وہ بولے۔ ''ملتان آتے وقت بس میں کسی نے اس کی جیب سے سیل فون نکال لیا تھا اس لیے اس سے رابطہ نہیں ہو رہا تھا۔ ملتان پہنچتے ہی اس نے مجھ سے رابطہ کیا۔ بہرحال وہ اب آفس کے کام کے سلسلے میں بزی ہے۔ کچھ روز کے بعد وہ تمہارے پاس آجائے گا۔''

پھر اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد حیدر الماس نے رابطہ منقطع کر دیا اور میں نے گہرا سانس لیا۔

مجھے اس کوٹھی میں رہتے ہوئے تین روز ہو گئے تھے۔ مجھے ایسے لگتا تھا جیسے میں کوئی قیدی ہوں اور مجھے اس گھر میں نظر بند کر دیا گیا ہو لیکن ایسا کرنا میری مجبوری تھی۔ اسماعیل شاہد کے کارندوں کے ساتھ ساتھ پولیس بھی مجھے تلاش کر رہی تھی۔ میں انکل اجمل کے ذریعے روزانہ اخبار منگوا لیتا تھا۔ ہر روز اخبار میں میرے بارے میں خبر شائع ہوتی تھی کہ پولیس ابھی تک مجھے تلاش نہیں کر پائی اور نہ ہی اسماعیل شاہد کی بیٹی کا کچھ پتا چل سکا ہے۔ اسماعیل شاہد کے بیان کے مطابق میں نے اس سے دوبارہ رابطہ نہیں کیا۔ اسے اپنی بیٹی کی بے حد فکر ہو رہی تھی۔

میرے ذہن میں کئی بار یہ خیال آیا کہ میں پریس کے سامنے پیش ہو کر اسماعیل شاہد کے خلاف پریس کانفرنس کر ڈالوں۔ دنیا کو اس کا مکروہ اور سیاہ چہرہ دکھاؤں۔ دنیا کو بتاؤں کہ میں بے گناہ ہوں۔ مجھ پر ناجائز مقدمہ بنایا گیا ہے، اسماعیل شاہد نے میری بہن روزینہ کے علاوہ نجانے کتنی لڑکیوں کو اغوا کیا ہے۔ اس کی بیٹی اسی کے پاس ہے لیکن وہ مجھے پھنسانے کے لیے جھوٹ پر جھوٹ بول رہا ہے لیکن میں نے ایسا کرنے سے خود کو باز رکھا۔ میں جانتا تھا کہ اگر میں نے ایسا کیا تو پولیس مجھے پہلی فرصت میں پکڑ لے گی اس لیے میں نے اس خیال کو ترک کر دیا۔

حیدر الماس صاحب مجھے روزانہ کی خبریں دیتے رہتے تھے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ اسماعیل شاہد نے اپنی فیملی کی حفاظت کے لیے گارڈز کی تعداد میں اضافہ کر دیا تھا۔

اب اس کی کوٹھی پر ایک کی بجائے چھ گارڈز ڈیوٹی دے رہے تھے۔ گھر کا کوئی بھی فرد کہیں جاتا تھا تو اس کے ہمراہ دو گارڈز ہوتے تھے البتہ اسماعیل شاہد خود نجانے کہاں روپوش ہو چکا تھا۔ اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو رہا تھا مگر حیدر الماس صاحب اس کی تلاش جاری رکھے ہوئے تھے۔ ہر بار مجھے وہ یہی تسلی دیتے تھے کہ وہ بہت جلد اسماعیل شاہد کے بارے میں معلوم کر لیں گے۔

اسماعیل شاہد نے اپنی فیملی خاص کر اپنی بیٹی کا سامنا کیسے کیا ہوگا میں چشم تصور میں تو دیکھ سکتا تھا لیکن حقیقت اس کے برعکس ہو گی۔ اس جیسے روسیاہ، شیطان صفت، مکار، دغاباز اور چالاک انسان سے کچھ بھی بعید نہیں تھا۔ اس نے یقیناً اپنے گھر والوں کے سامنے خود کو کلیئر کر لیا ہوگا اور مجھے قصوروار ٹھہرایا ہوگا۔

میرے یہ دن اور راتیں انتہائی بوریت میں گزر رہے تھے۔ بابر میرے ساتھ ہوتا تو شاید وقت کٹنے میں دیر نہ لگتی۔ ابھی تک حیدر الماس صاحب کے جاننے والے نے اسماعیل شاہد کے نمبر کی لوکیشن بھی معلوم کر کے نہیں بتائی تھی۔ میں انکل اجمل کے نمبر سے روزانہ مرینہ کو کال کر کے امی کی طبیعت کے بارے میں بھی پوچھتا رہتا تھا۔ وہ ہر بار تسلی بخش جواب دیتی تھی کہ امی کی نہ صرف طبیعت بہتر ہے بلکہ وہ ریکوری کر رہی ہیں البتہ کبھی کبھار ان پر شیزوفرینیا کا دورہ پڑتا تھا لیکن اس دورے کی شدت کم ہوتی تھی۔ مرینہ نے یہ بھی بتایا تھا کہ ماموں اسلم کا فون آیا تھا۔ وہ امی کی خیریت دریافت کرنے آنا چاہ رہے تھے لیکن انہیں ایڈریس معلوم نہیں تھا۔ ایڈریس تو مرینہ کو بھی معلوم نہیں تھا اس لیے میں نے اسے ایڈریس لکھوا دیا کہ وہ ماموں اسلم کو بتا دے پھر اگلے روز مرینہ سے بات ہوئی تو اس نے بتایا کہ ماموں اسلم آ گئے ہیں۔ ان کے ساتھ ممانی اور رئیس بھی آیا ہے۔ رئیس کے بارے میں سن کر مجھے عجیب سی بے چینی ہونے لگی۔ مجھے اس کا وہاں آنا بالکل بھی پسند نہیں آیا تھا تاہم میں نے مرینہ کو ہوشیار رہنے کی تلقین کی تھی۔

چوتھے روز میں رات کے نو بجے والی نیوز دیکھنے میں مصروف تھا۔ ساتھ ہی میں کھانا بھی کھا رہا تھا کہ اچانک ایک نیوز سنتے ہی میں بے اختیار چونک پڑا۔ وہ نیوز کسی لڑکی کے حوالے سے تھی جسے آج صبح ہی نامعلوم افراد نے اغوا کر لیا تھا۔ یہ نیوز لاہور کی تھی۔

لیڈی اینکر بتا رہی تھی کہ لڑکی کا نام نائلہ ہے اور وہ کالج سے پیدل گھر جا رہی تھی کہ اچانک اسے نامعلوم افراد نے اغوا کر لیا اور ابھی تک اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ پولیس اس لڑکی کی تلاش میں سرگرداں تھی۔ اس لڑکی کا تعلق غریب طبقے سے تھا اور وہ ایف اے کی طالبہ تھی۔ اس کا باپ پھل فروٹ کی ریڑھی لگاتا تھا۔ اس کا ایک بھائی معذور تھا۔

یہ المناک نیوز سنتے ہی مجھے اپنے اندر ٹوٹ پھوٹ سی محسوس ہو رہی تھی۔ میرا دھیان یکدم اپنی بہن روزینہ کی طرف چلا گیا تھا۔ مجھے ایسے لگتا تھا جیسے نائلہ کے اغوا میں بھی اسماعیل شاہد کا ہاتھ ہے لیکن یہ بھی ممکن تھا کہ اس لڑکی کو کسی اور نے اغوا کیا ہو۔ لڑکیوں کی اسمگلنگ کرنے والا ایک گروہ تو نہیں تھا اس ملک میں نجانے کتنے گروہ ایسا بھیانک دھندا کر رہے ہوں۔ دوسرا آج کل دشمنی کی وجہ سے بھی ایک فریق دوسرے فریق کی بہن، بیٹی کو اغوا کر لیتا ہے۔ بہرحال اس نیوز کو سننے کے بعد مجھ پر کبیدگی طاری ہو گئی تھی۔

☆☆☆

اس کوٹھی میں مجھے آئے چھٹا روز تھا۔ زندگی روٹین سے گزر رہی تھی لیکن میرے اندر بے چینی، بے قراری اور ہل چل بدستور موجود تھی۔ اس روز میں ٹی وی دیکھتے ہوئے وقت گزاری کر رہا تھا کہ حیدر الماس صاحب اور بابر آ گئے۔ بابر آگے بڑھ کر مجھ سے ایسے ملا جیسے ہم کافی سالوں کے بعد مل رہے ہوں۔

''کیا میری ہڈیاں پسلیاں توڑنے کا ارادہ ہے۔'' میں نے کہا تو وہ ہنستے ہوئے مجھ سے الگ ہو گیا پھر ہم صوفوں پر بیٹھ گئے۔

''کافی بیزار دکھائی دے رہے ہو۔'' حیدر الماس نے میرے چہرے کا بغور جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''لگتا ہے یہ دن بہت بڑے بور گزر رہے ہیں تمہارے؟''

''آپ کا اندازہ بالکل درست ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''اسی لیے تمہارے دوست کو یہاں لایا ہوں تاکہ تمہاری بوریت دور ہو۔'' حیدر الماس صاحب مسکراتے ہوئے بولے۔

''پریشان نہ ہو، میں آ گیا ہوں۔'' بابر نے کہا۔ ''تمہیں ایک لمحے کے لیے بھی بور نہیں ہونے دوں گا۔''

''اسی لیے تو میں نے تمہیں جوکر کا خطاب دیا تھا۔''
میں نے بھی مسکراتے ہوئے کہا تو وہ ہنس دیا۔ عین اسی لمحے انکل اجمل ہم سب کے لیے چائے لے آئے اور ہم چائے پینے کے ساتھ ساتھ باتیں بھی کرنے لگے۔

''حیدر صاحب!'' میں حیدر صاحب سے مخاطب ہی ہوا تھا کہ جوکر نے مجھے درمیان میں ٹوک دیا۔

''یار! تم میرے انکل کو ان کے نام کے ساتھ کیوں پکارتے ہو۔ تم بھی انہیں انکل کہو نا۔ تمہاری اور میری عمر میں زیادہ سے زیادہ چند ہفتوں کا ہی تو فرق ہے۔''

''انکل۔'' میں نے زیرلب دوہرایا۔

''ہاں علی۔'' حیدر الماس صاحب گہری سانس لے کر بولے۔ ''تم مجھے انکل کہہ سکتے ہو۔ مجھے اچھا لگے گا۔''

''ٹھیک ہے حیدر صاحب، میرا مطلب ہے انکل حیدر۔'' میں نے گڑبڑاتے ہوئے کہا تو وہ دونوں ہنس پڑے۔ پہلی بار حیدر صاحب کو انکل پکارا تھا اس لیے عجیب سا لگ رہا تھا۔

''کوئی بات نہیں، جب بار بار انکل کہو گے تو زبان پر چڑھ جائے گا۔'' جوکر نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ہمم۔'' میں نے گہری سانس لی، پھر حیدر صاحب سے مخاطب ہوا۔ ''اسماعیل شاہد کا کچھ پتا چلا؟''

''نہیں۔'' انہوں نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میرے مخبروں نے یہی بتایا ہے کہ وہ اپنی کوٹھی پر نہیں ہے۔ شاید وہ کہیں گیا ہوا ہے لیکن میرے آدمی اس کا کھوج لگا رہے ہیں۔ جیسے ہی اس کے بارے میں کچھ پتا چلتا ہے تو پھر کوئی لائحہ عمل بنائیں گے۔''

میں نے گہری سانس لی اور پھر گویا ہوا۔ ''اس کے نمبر سے اس کی لوکیشن ٹریس نہیں ہوئی۔''

''نہیں۔'' انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہ کام بہت مشکل ہے کیونکہ کسی بھی سیلولر کمپنی کو کسی کی لوکیشن بتانے کی اجازت نہیں ہوتی البتہ اگر کوئی ایمرجنسی کیس ہو جس کا تعلق سرکار سے ہو تو پھر کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔ میرا دوست کوشش کر رہا ہے۔ جیسے ہی لوکیشن کا پتا چلا تو میں تمہیں فوری طور پر بتا دوں گا۔''

میں نے چند لمحے سوچنے کے بعد کہا۔ ''ویسے وہ کہاں جا سکتا ہے؟''

''مجھے خود بھی اندازہ نہیں ہے۔'' حیدر الماس بولے۔ ''میرا مخبر بھی اس کے بارے میں معلوم کرنے میں ناکام رہا ہے۔ شاید اسماعیل شاہد کو تمہارا خوف ہے کہ کہیں تم اس تک پہنچ نہ جاؤ اسی لیے وہ روپوش ہو گیا ہے۔''

یہ بات کہہ کر ان کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھر آئی تھی تاہم میں نے پُرعزم لہجے میں کہا۔ ''حیدر صاحب! اسماعیل شاہد دنیا کے کسی بھی کونے میں چھپ جائے میں اسے تلاش کر کے ہی دم لوں گا۔''

''میں بھی تمہارا ساتھ دوں گا۔'' بابر نے میرے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا تو میں نے اثبات میں گردن ہلا دی پھر ہم چائے پینے لگے۔

چائے کا آخری گھونٹ حلق میں اتارنے کے بعد میں نے حیدر الماس صاحب سے پوچھا۔ ''حیدر صاحب! میری ضمانت کا کیا ہوا؟''

''اوہاں، تمہیں یہ تو بتانا ہی بھول گیا۔ تمہاری ضمانت قبل از گرفتاری ہو گئی ہے ایک ہفتے کے لیے۔ اس کے بعد تمہیں عدالت پیش ہونا ہوگا اور اپنی بے گناہی ثابت کرنی ہو گی۔'' انہوں نے خوشخبری سنائی تو میں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ انہوں نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''مجھے اُمید ہے کہ اس ایک ہفتے میں ہم اسماعیل شاہد کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے اور تمہاری بے گناہی بھی ثابت ہو جائے گی۔ دوسری بات، ابھی تمہارا باہر نکلنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ اسماعیل شاہد کے کارندے تمہیں تلاش کر رہے ہیں اس لیے محتاط رہو۔ میں پھر تنبیہہ کر رہا ہوں کہ جلد بازی میں اٹھایا جانے والا قدم اپنے گلے پڑ جاتا ہے۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں انکل! لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا ہے میرے خون کی کھولاہٹ بڑھتی جا رہی ہے۔ اب یہی دیکھیں۔ اسماعیل شاہد نے میڈیا کے سامنے کیسے جھوٹ بولا ہے کہ اس کی بیٹی ابھی تک میرے قبضے میں ہے اور میں نے دس کروڑ تاوان کا مطالبہ کیا ہے۔ اسے جھوٹ بولتے ہوئے ذرا بھی شرم نہیں آئی۔ میرا دل کرتا ہے ایسے جھوٹے لوگوں کی زبانیں کاٹ دوں۔'' مجھے اسماعیل شاہد پر بے تحاشا غصہ آ رہا تھا اس لیے میں نے کف افسوس ملتے ہوئے کہا۔

''ایسے لوگوں کی شرم اور ضمیر مردہ ہو چکا ہوتا ہے۔'' حیدر الماس صاحب بولے۔ ''جذبات کو کنٹرول میں رکھو۔''

''انکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' بابر بولا۔ ''تمہیں جذبات کی بجائے ہوش سے کام لینا ہوگا تبھی تم اپنے مقصد

میں کامیاب ہو سکتے ہو۔''

''دیکھو علی، اسماعیل شاہد کے بارے میں جیسے ہی کچھ پتا چلتا ہے تو پھر کوئی قدم اٹھائیں گے۔'' حیدر الماس صاحب نے کہا تو میں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ ظاہر ہے میں بے بس، لاچار اور مجبور تھا اس لیے ان کی بات ماننے میں ہی عافیت سمجھی۔

☆☆☆

مزید دو روز گزر گئے تھے لیکن اسماعیل شاہد کا کچھ پتا نہیں چل رہا تھا اور نہ اس کی نوکیشن ٹریس ہونے کے بارے میں حیدر الماس صاحب نے بتایا تھا۔ ادھر بابر نے جگت بازیوں سے میری بوریت ختم کرنے میں مرکزی کردار ادا کیا تھا۔ وہ موقع بہ موقع ایسی جگت بازی کرتا تھا کہ میں غم و غصے میں کھولتے ہوئے بھی بے اختیار ہنسنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ وہ واقعی زندہ دل نوجوان تھا۔

میں نے ایک رات پھر اس سے لیپ ٹاپ لے کر ڈیپ ویب سائٹس تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی تھی لیکن مجھے کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ ڈیپ ویب سائٹس کے بارے میں، میں نے ایک نیوز پیپر میں نیوز پڑھی تھی۔ نیوز کے مطابق یہ ملبع زدہ کاروبار دنیا بھر میں پھیلا ہوا تھا اور مزید پھیلتا جا رہا تھا۔ ان ممالک میں پاکستان بھی شامل تھا۔ یہاں چائلڈ پورنوگرافی بہت زیادہ تھی۔ آئے روز کم سن، معصوم بچیاں اور بچے انسان نما درندوں کے ہاتھوں زیادتیوں کا شکار ہو رہے تھے۔ یہ انسان نما درندے کم سن بچوں اور بچیوں سے نہ صرف زیادتیاں کرتے تھے بلکہ اس ڈر سے انہیں موت کے گھاٹ بھی اتار دیتے تھے کہ ان کی حیوانیت کے پردے چاک نہ ہو جائیں۔ ایسے کئی واقعات تو میڈیا کے ذریعے منظر عام پر آ چکے تھے اور کئی واقعات ایسے تھے جن میں والدین اپنی عزت اور ناموس کی خاطر خاموش رہتے تھے اور ان درندوں کے خلاف آواز بلند نہیں کرتے تھے۔

جوکر اور میں ایک ہی بیڈ روم میں تھے۔ کافی دیر تک سرچنگ کے بعد تھک ہار کر میں نے لیپ ٹاپ بند کر کے سائیڈ پر رکھا اور بیڈ پر لیٹ کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ میرا ذہن بھٹک کر ایک بار پھر اسماعیل شاہد کی طرف چلا گیا۔ وہ بھی انسان نما ایک درندہ ہی تھا جس سے اپنے ہی ملک کی لڑکیاں محفوظ نہیں تھیں۔

میں نیوز پیپر کا بھی روزانہ مطالعہ کرتا تھا۔ اس روز نیوز پیپر کا مطالعہ کرتے ہوئے میری نظروں کے سامنے ایک اشتہار گزرا۔ وہ اشتہار اسماعیل شاہد کی سرکس کے بارے میں تھا۔ نیوز پیپر میں شائع ہونے والے اشتہار کے مطابق ان دنوں ایشین سرکس ساہیوال میں لگی ہوئی تھی۔ اسماعیل شاہد سرکس میں کم کم ہی جاتا تھا اس لیے ہو سکتا تھا کہ وہ ساہیوال میں موجود نہ ہو اور یہ ممکن بھی تھا کہ وہ وہاں موجود ہو۔ میرے دماغ میں جھکڑ سے چل رہے تھے اور میں کسی واضح پوزیشن میں نہیں آ رہا تھا۔ میرے ذہن میں ایک خیال یہ بھی آیا کہ اپنے دل کی تسلی کی خاطر سرکس میں اس کی موجودگی کنفرم کر لوں لیکن کس سے کنفرم کروں۔۔ اسماعیل شاہد کے منیجر قاسم منیر کو تو میں کال نہیں کر سکتا تھا اس لیے تھوڑی دیر سوچ و بچار کے بعد میرے دماغ کے پردے پر کرامت کا نام ابھرا تو میں نے اسے کال کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

کرامت کا سیل نمبر میری سم میں سیو تھا اس لیے صبح ہوتے ہی میں نے سب سے پہلا کام یہی کیا کہ میں نے اپنی سم سیل فون میں ڈالی اور اسے آن کر کے کرامت کو فون کرنے لگا۔ بابر ابھی تک سو رہا تھا جبکہ انکل اجمل ناشتے کا سامان لینے بازار گئے ہوئے تھے۔ چند سیکنڈ کے بعد ہی کال ریسیو کر لی گئی۔

''ہیلو۔'' کرامت کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی تو میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

''کرامت! میں بول رہا ہوں۔ علی حسن۔'' میں نے دبے لہجے میں کہا۔ ''مجھے پہچانا؟''

''علی حسن۔'' اس بار کرامت کی حیرت میں ڈوبی آواز سنائی دی۔ ''ہاں، میں تمہیں پہچان گیا ہوں۔ کہاں ہو، کیسے ہو؟''

''میں ٹھیک ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''یہ بتاؤ تم اس وقت کہاں موجود ہو؟''

کرامت نے کہا۔ ''میں ساہیوال میں موجود ہوں۔ ان دنوں سرکس اس شہر میں لگی ہوئی ہے۔''

''جانتا ہوں۔ کیا تم اکیلے موجود ہو یا تمہارے آس پاس کوئی موجود ہے۔'' میں نے تصدیق چاہی۔

''میں اپنے خیمے میں اکیلا ہوں۔'' کرامت نے کہا۔ ''میں نے اخبار میں تمہارے بارے میں خبر پڑھی تھی۔ کیا وہ خبر سچ ہے؟ مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔''

''نہیں، وہ جھوٹ ہے۔'' میں نے کہا۔ ''پھر کسی دن

تم سے ملاقات ہوئی تو ساری تفصیل بتاؤں گا۔ فی الحال یہ بتاؤ کہ کیا اسماعیل شاہد ساہیوال میں موجود ہے؟''

''فی الوقت تو موجود نہیں ہیں۔'' کرامت نے کہا۔

''البتہ وہ دو روز پہلے آئے تھے۔''

''اوہ۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ وہ اب کہاں ہوگا؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں مجھے معلوم نہیں ہے۔'' کرامت نے جواب دیا۔ ''البتہ روشی کو معلوم ہوگا کیونکہ وہ باس کے بہت قریب ہے۔''

کرامت نے یہ بات معنی خیز انداز میں کہی تھی۔ روشی کا نام سنتے ہی میرے دماغ کے پردے پر اس کا حسین چہرہ ابھر آیا۔ وہ کانچ کی گڑیا جیسی نازک اندام لڑکی مجھ سے گھنٹوں باتیں کیا کرتی تھی لیکن مجھے یہ آج معلوم ہوا تھا کہ وہ اسماعیل شاہد کے بہت قریب ہے۔

''کیا تم اس سے اسماعیل شاہد کے بارے میں پوچھ سکتے ہو۔'' میرے دماغ میں یک لخت یہ بات آئی تو میں نے پوچھ لیا۔

جواباً کرامت نے گڑبڑاتے ہوئے کہا۔ ''سوری یار علی، میں ایسا نہیں کرسکتا۔ روشی جیسی دکھائی دیتی ہے وہ ویسی ہے نہیں۔ وہ بہت گھنی اور تیز طرار لڑکی ہے۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔ تم اس سے کوئی بات نہ کرنا۔'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''میں کچھ کرتا ہوں۔''

اتنا کہہ کر میں نے رابطہ منقطع کیا اور سیل فون سے سم نکال کر جیب میں رکھ لی۔ کرامت سے بات کرنے کے دوران ہی میں نے فیصلہ کرلیا تھا۔ اب صرف اس پر عمل کرنا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اگر میں نے اپنے فیصلے سے حیدر الماس صاحب کو آگاہ کردیا تو وہ کسی صورت مجھے اس پر عمل کرنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ میں جو قدم اٹھانا چاہ رہا تھا اس میں سو فیصد خطرہ تھا لیکن میں نے یہ خطرہ مول لینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ باہر کمرے میں پڑا سو رہا تھا اور انکل اجمل ناشتے کا سامان لینے گئے ہوئے تھے اس لیے کوٹھی سے باہر نکلنے کا میرے پاس یہ بہترین موقع تھا اور میں یہ موقع کسی صورت گنوانا نہیں چاہتا تھا۔ نجانے حیدر الماس صاحب کو اسماعیل شاہد کو ٹریس کرتے ہوئے کتنے دن لگ جائیں اور میں دیر نہیں چاہتا تھا چنانچہ میں نے حفظ ماتقدم کے طور پر کمرے میں جا کر دیکھا تو بابر بدستور سو رہا تھا اور اس کے خراٹے کمرے میں گونج رہے تھے۔ اچھی طرح اطمینان کر لینے کے بعد میں نے لیدر کا اپر پہنا اور اس کی ٹوپی سر پر ایڈجسٹ کر کے کوٹھی سے باہر نکل آیا۔ لیدر کی اپر کافی گرم تھی اس لیے مجھے سردی کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ میرے پاس حیدر الماس صاحب کے دیئے پیسے موجود تھے اس لیے مجھے پیسوں کی فکر نہیں تھی۔

گیٹ کا ذیلی دروازہ بند کرنے کے بعد میں نے محتاط نظروں سے گردوپیش کا جائزہ لیا۔ صبح کا وقت تھا اس لیے مجھے اسکول جاتے چند بچے دکھائی دیئے۔ میں تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا سڑک کی طرف بڑھ گیا۔ ابھی میں نے تھوڑا فاصلہ ہی عبور کیا تھا کہ اچانک مجھے سامنے سے انکل اجمل آتے دکھائی دیئے۔ ان کے ہاتھ میں چند شاپر تھے اور وہ اپنی ہی دھن میں چلتے ہوئے آرہے تھے۔ میں جلدی سے گلی کے کنارے پر موجود ایک درخت کی اوٹ میں ہوگیا۔ درخت کا تنا قدرے چوڑا تھا اس لیے میرے خیال کے مطابق میں آسانی سے انکل اجمل کو دکھائی نہیں دے سکتا تھا۔

کچھ دیر کے بعد انکل اجمل ہلکی آواز میں اللہ کی حمد و ثنا کا ورد کرتے ہوئے درخت کے سامنے سے گزرتے چلے گئے تو میں اوٹ سے نکل کر ان کی طرف دیکھنے لگا۔ میں انہیں اس وقت تک دیکھتا رہا جب تک وہ کوٹھی میں داخل نہ ہوگئے پھر میں تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا سڑک کی طرف بڑھ گیا۔ وہاں سے بس ٹرمینل بیس پچیس منٹ کی مسافت پر تھا۔ وہاں مختلف کمپنیوں کی بسیں مختلف شہروں کے لیے چلتی تھیں۔ بیس منٹ تک میں آٹو رکشا میں بیٹھ کر بس ٹرمینل پہنچ گیا۔ لاہور جانے والی بس کھڑی تھی۔ لوگ بھی وہاں موجود تھے۔ بس آدھی سے زیادہ بھر چکی تھی۔ میں نے ساہیوال کے لیے ٹکٹ لیا اور بس میں سوار ہو کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

اچانک مجھے مرینہ کا خیال آیا تو میں نے جیب سے سیل فون اور سم نکال لی۔ سم کو فون میں ایڈجسٹ کرنے کے بعد میں نے مرینہ کو کال لی۔ چند سیکنڈ کے بعد اس نے کال ریسیو کر لی۔ سلام و دعا کے بعد میں نے اس سے امی کی کنڈیشن کے بارے میں پوچھا تو اس نے جواباً کہا۔ ''امی ٹھیک ہیں لیکن وہ کافی خاموش ہیں۔ کسی سے کوئی بات ہی نہیں کر رہیں۔''

مجھے اپنا دل کٹتا ہوا محسوس ہوا۔ تاہم میں نے کہا۔ ''اللہ نے چاہا تو وہ جلد ٹھیک ہو جائیں گی۔ تم ان کا خیال رکھنا۔''

''میں ان کا خیال رکھ رہی ہوں۔'' مرینہ نے بتایا۔
''ماموں اور ان کی فیملی بھی یہیں ہے۔''
''ہم۔'' میں نے کہا۔ ''اچھا سنو، میں ساہیوال جا رہا ہوں۔ خدانخواستہ اگر کوئی مسئلہ ہو جائے تو حیدر الماس صاحب کو فون کر لینا۔''
''آپ ساہیوال کیوں جا رہے ہیں؟'' مرینہ کی چونکتی ہوئی آواز سنائی دی۔
''اسماعیل شاہد کو دبوچنے۔'' میں نے دانتوں کو کچکچاتے ہوئے مدھم لہجے میں کہا۔ میرے ساتھ والی سیٹ ابھی خالی تھی۔
''وہ کیوں؟'' مرینہ حیران ہوئی۔ ''انہوں نے کیا کیا ہے؟''
میں نے مرینہ کو چوہدری اسماعیل شاہد کی اصلیت کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا اس لیے اسے جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''وہی تو روزینہ کے اغوا کا اصل ذمہ دار ہے۔ وہی چودھری ساجد ہے۔''
''کیا.....'' مرینہ نے حیرت سے کیا کو لمبا کھینچا۔ ''کیا آپ کو واقعی یقین ہے۔''
''ہاں۔''
''اوہ۔ پھر۔''
اسی لمحے ایک آدمی میرے ساتھ والی سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا تو میں نے بات کو سمیٹتے ہوئے کہا۔ ''اچھا میں فون رکھ رہا ہوں۔ اپنا اور امی کا خیال رکھنا۔ اللہ حافظ۔'' اتنا کہنے کے بعد میں نے رابطہ منقطع کر کے سیل فون آف کر کے واپس جیب میں رکھا اور باہر دیکھنے لگا۔ ابھی بس میں چند سیٹیں خالی پڑی تھیں اس لیے بس کی روانگی میں تاخیر تھی لیکن میری بے چینی کم ہونے کی بجائے بڑھتی جا رہی تھی۔ اسی لمحے بس ہوسٹس وہاں سے گزری تو میں نے پوچھ لیا۔
''مس۔ بس کی روانگی میں کتنی دیر ہے؟''
''سر! دس منٹ کے بعد بس روانہ ہو جائے گی۔''
بس ہوسٹس نے انتہائی شائستہ لہجے میں کہا تو میں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ بس ہوسٹس قدرے خوبصورت اور دراز قد تھی۔ وہ بس کمپنی کی یونیفارم میں ملبوس تھی۔ میں بس کے چلنے کا انتظار کرنے لگا پھر واقعی دس منٹ کے بعد بس لاہور کے لیے روانہ ہو گئی۔ موٹروے سے ہوتے ہوئے بس نے ڈھائی گھنٹے میں مجھے ساہیوال پہنچا دیا۔
ساہیوال کا پرانا نام منٹگمری تھا۔ یہاں ساہی قوم کی

## کائنات

ہم سب جانتے ہیں کہ ہماری کائنات ہر گزرتے لمحے کے ساتھ پھیل رہی ہے اور اس سے انکار ممکن نہیں۔ یہ حقیقت بھی ناقابل تردید ہے کہ اس عمل کی رفتار مسلسل بڑھ رہی ہے مگر اس سے زیادہ کسی کو کچھ معلوم نہیں۔ بیش تر سائنسدان اس کا الزام تاریک توانائی (بلیک ہول) پر دھر دیتے ہیں جو کہ ان کے مطابق ہماری کائنات میں جگہ جگہ موجود ہیں مگر ہم نہیں جانتے کہ ان کے اندر کیا ہے اور یہ کیا کام کرتے ہیں۔ اب کہا جا رہا ہے کہ اس کا جواب ممکنہ طور پر کوئنٹم کشش ثقل میں چھپا ہوا ہے مگر وہ بھی انسانی غلطی محسوس ہوتا ہے کیوں کہ سائنس کے اصولوں کے مطابق دیکھا جائے تو ایسا لگتا ہے کہ کائنات خود اپنے اصولوں کی نافرمانی کر رہی ہے اور ہم بس یہ اندازہ ہی کر سکتے ہیں کہ ایسا ہو رہا ہے۔

مرسلہ: احسان سحر۔ میانوالی

## فلسفہ

جب زندگی کو اپنے دل کے گیت سنانے کے لیے گانے والا نہیں ملتا تو وہ اپنے دلی جذبات کے اظہار کے لیے فلسفی پیدا کر دیتی ہے۔ (خلیل جبران)

فلسفہ کا مقصد زندگی کی تشریح کرنا نہیں بلکہ اسے بدلنا ہے۔ (رادھا کرشن)

تھوڑا سا فلسفہ انسان کو دہریت کی طرف لے جاتا ہے لیکن فلسفہ کی اتھاہ گہرائی اسے مذہب کی طرف مائل کر دیتی ہے۔ (بیکن)

ہم ایسے فلسفی ہیں کہ ایک دوسرے کی بربادی ہی میں اپنی خوش حالی کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ (لوئس بلاک)

مرسلہ: اویس شیخ۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ

اکثریت کی وجہ سے نام ساہیوال ہوا۔ انگریزوں کے زمانے سے پہلے بھی اس کا نام ساہیوال ہی تھا۔ انگریزوں نے تبدیل کر کے منٹگمری رکھا تھا۔ جسے بعد میں پھر ساہیوال کر دیا گیا تھا۔ ساہیوال کی گائے دنیا بھر میں مشہور ہے۔ یہ ایک پُر امن شہر ہے۔ ساہیوال چونکہ دریا کے کنارے پر آباد ہے اس لیے سیلابی ریلوں سے اکثر یہاں نقصانات ہوتے رہتے ہیں لیکن انہی سیلابی ریلوں کے باعث دریا اپنی زرخیز مٹی یہاں کی زمینوں پر بکھیرتا رہتا ہے۔ اس وجہ سے یہاں کی زمینیں بہت زرخیز ہیں۔ قدرتی آفات کا مقابلہ کرنے کے سبب یہاں کے لوگ جفاکش ہیں۔ گندم، گنا، کپاس اور چاول یہاں کی اہم فصلیں ہیں۔ یہ علاقہ کھجور کے باغات کی وجہ سے بھی بہت مشہور ہے۔ اس کے اردگرد بہت عمدہ کھجوروں کے باغات موجود ہیں۔

بس سے اترنے کے بعد میں ایک آٹو رکشے میں سوار ہوگیا۔ ڈرائیور قدرے بھاری جسامت کا مالک تھا۔ اس کی مونچھیں گھنی اور بڑی بڑی تھیں۔ ناک پر چھوٹا سا مسہ تھا۔ اس نے پوچھا کہ کہاں جانا ہے تو میں نے اسے یہی کہا کہ جہاں انٹین سرکس لگی ہوئی ہے مجھے وہاں پہنچا دو۔ ڈرائیور نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے آٹو رکشا آگے بڑھا دیا تھا۔ اس نے مجھ سے کرایہ بھی طے نہیں کیا تھا۔ میں نے بھی اس سے کرائے کے بارے میں بات کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

شاید ڈرائیور نے میرے حلیے اور بات کرنے کے انداز سے اندازہ لگا لیا تھا کہ میں اس شہر کا باسی نہیں ہوں اس لیے اس نے مجھے لوٹنے کا پروگرام بنا لیا تھا۔ میں نے صرف یہ نوٹ کیا تھا کہ اس نے راستے میں کسی کو فون کر کے کوئی بات کی تھی۔ آٹو رکشے کا شور ہی اتنا زیادہ تھا کہ مجھے اس کی بات سمجھ نہیں آئی تھی۔ میں اس وقت ٹھٹکا تھا جب مختلف اور اجاڑ راستوں سے ہوتے ہوئے اس نے نسبتاً سنسان جگہ پر پہنچ کر آٹو رکشا روک دیا تھا۔ میں نے باہر جھانک کر دیکھا تو ہم کسی بے آباد بستی کے کنارے موجود تھے کیونکہ کافی دور مجھے چھوٹے بڑے مکان دکھائی دیئے تھے۔ سڑک ناہموار تھی اور اس کے ایک کنارے پر درختوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا جو کافی دور جاتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ آگے شاید کھیت تھے۔

میرے دماغ میں انجانے سے وسوسے سر ابھارنے لگے تو میں نے اس سے پوچھا۔ ''بھائی! یہ تم مجھے کہاں لے آئے ہو اور رکشا کیوں روک دیا ہے؟''

ابھی میری بات پوری ہی ہوئی تھی کہ عین اسی لمحے مجھے درختوں کے عقب سے ایک نوجوان دکھائی دیا جو تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا اسی طرف آ رہا تھا جدھر ہم موجود تھے۔ وہ شلوار قمیص میں ملبوس تھا اور اس نے کندھوں پر میرون رنگ کی چادر ڈالی ہوئی تھی جبکہ اس کے پیروں میں پشاوری چپل تھی۔ اسے دیکھتے ہی میرے کانوں میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں اور میری چھٹی حس بیدار ہوگئی۔

میں رکشے سے باہر نکل آیا۔ میرے دیکھا دیکھی ڈرائیور بھی باہر نکل آیا تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس کے چہرے پر چالاکی، مکاری اور عیاری کے تاثرات پھیلے ہوئے تھے۔ وہ نوجوان بھی ہمارے قریب پہنچ گیا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں لمبے پھل والا چاقو دبا ہوا تھا۔ ایک لمحے کے ہزارویں حصے میں ساری بات میرے ذہن میں آ گئی۔ ڈرائیور نے مجھے لوٹنے کے لیے فون کر کے اپنے ساتھی کو بلایا تھا۔

''لڑکے! تمہارے پاس جو کچھ موجود ہے وہ نکال کر میرے حوالے کر دو۔'' چاقو پکڑے آدمی نے تحکم آمیز لہجے میں کہا تو میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے وحشت ٹپک رہی تھی۔ میرے دماغ میں لاوا سا پکنے لگا۔ میں تو پہلے ہی اپنی بہن کی وجہ سے پریشان تھا اوپر سے اس کی بات سن کر تو جیسے میرا دماغ ہی گھوم گیا۔ وہ دونوں میرے دائیں بائیں کھڑے ہوگئے تھے۔ ان دونوں نے مجھے ایسے گھیرا ہوا تھا جیسے جنگل میں کئی شیر مل کر اپنے شکار کو گھیر لیتے ہیں۔ میں بھی تو ان کے لیے شکار ہی تھا اور وہ مجھے شکار کر کے ہی دم لینا چاہتے تھے۔

میں نے گردن موڑ کر ڈرائیور کی طرف دیکھتے ہوئے درشت لہجے میں پوچھا۔ ''کیا تم رکشا چلانے کی آڑ میں لوگوں کو لوٹتے ہو؟''

''ہاں۔'' اس نے بڑی ڈھٹائی سے کہا۔ ''کیا کریں جتنا کماتے ہیں پورا نہیں پڑتا۔ اب گھر کے اخراجات پورے کرنے کے لیے ہمیں ''سائیڈ بزنس'' کرنا پڑتا ہے۔ ویسے دیکھا جائے تو سائیڈ بزنس میں اچھی خاصی کمائی ہے۔''

''لعنت ہے ایسی کمائی پر۔'' میں نے دانت پیستے ہوئے برجستہ کہا۔

''تم لعنت بھیج سکتے ہو کیونکہ تم شکل وصورت اور

لباس سے اچھے گھرانے کے دکھائی دے رہے ہو۔'' ڈرائیور نے میرا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''اب تم دیر مت کرو۔ مشتاق نے جو کچھ کہا ہے اس کی بات پر عمل کرو۔ یہ بہت خطرناک انسان ہے۔ اس نے دو قتل بھی کیے ہیں۔''

اس کا اشارہ چاقو بردار کی طرف تھا اور وہ اس کی خصوصیات بتا کر مجھے ڈرانا چاہتا تھا تاکہ میں اس کے ڈر سے اپنا سیل فون اور پیسے نکال کر اس کے حوالے کر دوں۔

''دیکھو، تم میرا وقت ضائع کر رہے ہو۔'' میں نے ہونٹ بھینچتے ہوئے کہا۔ ''یہ بات تو تم دونوں اپنے بھیجوں میں بٹھا لو کہ میں تمہیں کچھ دینے والا نہیں ہوں۔ مجھ سے کوئی توقع نہ رکھو۔''

دونوں نے حیرت بھری نظروں سے پہلے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر میری طرف متوجہ ہو گئے۔ اچانک چاقو بردار نے میرے سامنے آ کر چاقو کی نوک میرے سینے سے لگا دی اور دباؤ بڑھایا تو اس کی نوک مجھے اپنے جسم میں چبھتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میں نے ضبط کرتے ہوئے یہ چبھن برداشت کی اور غصیلی نظروں سے چاقو بردار کو دیکھنے لگا۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھ سے پوچھا کہ کیا میں اس کی بات ماننے کے لیے راضی ہوں یا نہیں۔ میں نے نفی میں سر ہلا دیا تو اس کی آنکھوں اور چہرے پر طنزیہ تاثرات ابھر آئے۔ اس نے ٹھہرے ہوئے انداز میں ڈرائیور سے کہا۔ ''یار سکندر، یہ تو کافی جی دار نگ رہا ہے۔ ہماری بات آسانی سے سمجھنے اور ماننے والا نہیں۔''

''تمہارا انداز بائکل درست ہے۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

ڈرائیور ایک بار پھر طائرانہ انداز میں میرا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ ''دیکھو لڑکے، اگر تم چاہتے ہو کہ تمہیں کچھ نہ کہا جائے تو پیسے اور موبائل نکال کر دے دو۔ ہم تمہیں آخری موقع دے رہے ہیں اس کے بعد اپنی حالت کے ذمے دار تم خود ہو گے۔ شاباش، سب کچھ نکال کر دے دو۔ کیوں اپنی جان کے دشمن بن رہے ہو۔ پیسا تو ہاتھ کا میل ہے، تمہیں تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ شاباش۔''

میں نے اس کی ''ہدایت'' نظر انداز کرتے ہوئے ٹھوس لہجے میں جواباً کہا۔ ''نہیں دوں گا۔''

ڈرائیور نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد مشتاق سے کہا۔ ''مشتاق! یہ لڑکا تو پیسے اور موبائل نکالنے کی زحمت نہیں کر رہا، میں ہی یہ زحمت کر لیتا ہوں۔ تُو اس کا خیال رکھ۔ یہ

## گلوکوز Glucose

گلوکوز یا انگور کی کھانڈ، ادویات کے طور پر عام استعمال میں آنے والی چیز۔ بچوں، کمزوروں اور بیماروں کو گلوکوز کا شربت بنا کر پلایا جاتا ہے جو فرحت بخش ہونے کے علاوہ طاقت بھی دیتا ہے چونکہ اس کا ذائقہ میٹھا ہوتا ہے اس لیے چھوٹے بچے بھی خوشی سے پی لیتے ہیں۔ گلوکوز ہر قسم کے نشاستہ یا اسٹارچ کا جزو ہوتی ہے، لیکن انگور میں سب سے زیادہ پائی جاتی ہے۔ صنعتی مقاصد کے لیے بڑے پیمانے پر اسٹارچ سے حاصل کی جاتی ہے۔ اسٹارچ کو پانی میں ملا کر گاڑھی سی لئی بنالی جاتی ہے، پھر اس میں گندھک کا تیزاب (سلفیورک ایسڈ) ملا کر اچھی طرح ہلانے کے بعد گرم کیا جاتا ہے۔ اسے مسلسل گرم کرتے جاتے ہیں اور کبھی کبھی تھوڑی سی لئی نکال کر اس پر آیوڈین کا اثر دیکھتے رہتے ہیں۔ جب تک کہ تمام اسٹارچ حرارت کے سبب تبدیلی اختیار نہیں کر لیتی۔ اس وقت تک آیوڈین کا رنگ اس کے عمل سے نیلا ہوتا رہے گا۔ جب معلوم ہو جاتا ہے کہ اب تمام اسٹارچ تبدیل ہو چکی ہے اور آیوڈین کے ساتھ کوئی اثر ظاہر نہیں کرتی تو اس گرم محلول میں کیلشیم کاربونیٹ ڈال دیا جاتا ہے، تاکہ تیزاب (سلفیورک ایسڈ) کی تعدیل (Neutralization) ہو جائے۔ اس کے بعد محلول کو فلٹر کر لیا جاتا ہے، اور خشک کر کے ٹھوس گلوکوز حاصل کر لی جاتی ہے، یہ گلوکوز بالکل صاف نہیں ہوتی، بلکہ اس کا ہلکا بھورا رنگ ہوتا ہے۔ محلول کو اگر خشک کرنے سے قبل حیوانی کوئلا Animal charcoal کے ساتھ ملا کر جوش دے لیا جائے، تو رنگت بالکل اڑ جاتی ہے اور حاصل شدہ گلوکوز بالکل صاف اور بے رنگ ہوتی ہے۔ خالص گلوکوز سفید قلمی ٹھوس ہوتی ہے، جو 144 درجہ سینٹی گریڈ پر پگھلتی ہے یہ پانی میں کافی حل پذیر ہوتی ہے۔ محلول بنتا ہے تو کچھ ٹھنڈک بھی پیدا ہوتی ہے یہ کاربن ہائیڈروجن اور آکسیجن کا نامیاتی مرکب ہوتی ہے، اور دوسرے نامیاتی محلل مثلاً الکحل یا ایتھر میں بھی اسے آسانی سے حل کیا جاتا ہے گلوکوز کا ذائقہ خاصا میٹھا ہوتا ہے، لیکن اس کی مٹھاس گنے کی شکر سے کم ہوتی ہے۔ گلوکوز کی تخمیر سے سرکہ اور شراب بھی بنائی جاتی ہے۔ بہت سی کیمیائی اشیا کی تیاری میں نیز شربت اور مربے بنانے میں گلوکوز کا خاصا استعمال ہوتا ہے۔

مرسلہ: سہیل آفندی، ملتان

کوئی حرکت نہ کرے ورنہ تیرے ہاتھ سے ضائع ہو جائے گا۔''

''ہمم۔'' اس نے مجھے خونخوار نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ ''تو پیسے اور موبائل نکال، میں دیکھتا ہوں یہ کیسے حرکت کرتا ہے۔''

اتنا کہہ کر اس نے ایک بار پھر چاقو پر دباؤ بڑھا دیا تو نوک میرے جسم میں چبھی لیکن میں نے اس بار بھی ضبط کیا۔ میں نے ڈرائیور کی طرف دیکھا۔ اس نے بھی ایک نظر مجھے دیکھا پھر اس نے میری پتلون کی جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ میری پتلون کی جیب سے وائلٹ نکالنا چاہتا تھا لیکن میں اسے اس کے مقصد میں کامیاب نہیں ہونے دینا چاہتا تھا اسی لیے میں نے چاقو کی پروانہ کرتے ہوئے مشتاق کی ناک پر بھرپور مکا جڑ دیا۔ شاید اسے میرے وار کی توقع نہیں تھی۔ وہ بلبلاتا اور سسکاری مار کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس کی سسکاری سن کر ڈرائیور اس کی طرف متوجہ ہوا۔ اسے قابو کرنے کا مجھے موقع مل گیا چنانچہ میں نے تیزی سے دو قدم پیچھے ہٹ کر اس کی ناک پر بھی مکا جڑ دیا۔ نتیجتاً وہ بھی بلبلاتا اور سسکاری مارتا ہوا پیچھے ہٹ گیا تھا۔ دونوں کے ناک سے خون نکل کر ان کی مونچھوں میں جذب ہو رہا تھا۔

''تیری.....'' مشتاق نے مجھے گندی گالی دی اور بائیں بازو کی آستین سے خون صاف کرنے کے بعد چاقو کا رخ میری طرف کر کے جارحانہ انداز میں میری طرف بڑھا۔ میں اس کے متوقع ردِعمل کے لیے بالکل تیار تھا۔ اس نے میرے قریب پہنچتے ہی میرے بازو پر چاقو کا وار کرنے کی کوشش کی لیکن میں نے تیزی سے گھوم کر لات اس کے پیٹ میں مار دی۔ ساتھ ہی میں نے اس کے چاقو والے ہاتھ پر کراٹے کا مخصوص وار کیا تو چاقو اس کے ہاتھ سے نکل کر زمین پر گر گیا۔ وہ سنبھلا ہی تھا کہ میں نے ایک بار پھر اس کی ناک پر مکا جڑ دیا۔ وہ چیخا اور لڑکھڑا کر ڈرائیور سے ٹکرا گیا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے فضا میں جمپ کیا اور میری دونوں ٹانگیں اس کے سینے پر پڑیں تو وہ دونوں ایک دوسرے سے الجھتے ہوئے پکی سڑک پر گر گئے۔ جبکہ میں بھی سڑک پر پہلو کے بل گرا تھا لیکن میں پھرتی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ دونوں بھی مغلظات کی بارش کرتے ہوئے اٹھے اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگے جیسے انہیں کسی چیز کی تلاش ہو۔ جب انہیں ان کی مطلوبہ چیز نہ ملی تو دونوں نے اکٹھے مل کر ہی مجھ پر حملہ کر دیا۔ وہ بالکل فلمی سین تھا۔ اگر کوئی دیکھ لیتا تو یہی سمجھتا کہ شاید کسی فلم کی شوٹنگ ہو رہی ہے۔

وہ دونوں عام سے راہ زن تھے جبکہ میں جوڈو کراٹے کا ماہر تھا۔ میں بھلا کیسے ان دونوں کے ہتھے چڑھ سکتا تھا چنانچہ میرے بجلی کی سی تیزی سے الٹی قلابازی کھانے سے ان کا داؤ ناکام گیا پھر جب وہ سنبھلے تو میں نے ڈرائیور کے پیٹ میں لات ماردی جبکہ مشتاق کے جبڑے پر مکا جڑ دیا۔ دونوں سسکاریاں مار کر رہ گئے تھے پھر میں نے ان دونوں پر مکوں کی برسات کر دی۔ میں انہیں ایک لمحہ بھی سنبھلنے کا موقع نہیں دے رہا تھا۔ میرے مکوں نے ان دونوں کو بے حال کر دیا تھا۔ ان دونوں میں شاید اب مجھ سے مقابلہ کرنے کی سکت نہیں تھی۔ انہوں نے مجھے ہلکا لیا تھا لیکن میں ان کی سوچ کے برعکس ثابت ہوا تھا۔ انہوں نے سوچا ہوگا کہ وہ مجھے آسانی سے چاقو سے ڈرا دھمکا کر لوٹ لیں گے اور میں ان کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکوں گا۔ میں نے سڑک پر پڑے چاقو کو بوٹ کی ٹو سے ٹھوکر ماری تو وہ اڑتا ہوا جھاڑیوں میں جا گرا۔

فائٹنگ کے دوران میں نے اپر کی ٹوپی اتار دی تھی تاکہ فائٹنگ کرنے میں کسی قسم کی دقت نہ ہو۔ ہماری فائٹنگ جاری تھی کہ اسی لمحے کچھ لوگ وہاں پہنچ گئے۔ ان کے وہاں آنے کی وجہ سے ہماری فائٹنگ میں تعطل پیدا ہو گیا تھا۔ ان کی تعداد لگ بھگ بیس کے قریب تھی۔ ان میں بوڑھے، جوان اور بچے شامل تھے۔ میں نے دیکھا، ان لوگوں کے وہاں آنے کی وجہ سے ڈرائیور اور مشتاق دونوں نہ صرف گھبرا گئے تھے بلکہ انہوں نے وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کی تو لوگوں نے گھیرا ڈال کر انہیں پکڑ لیا۔ ایک بزرگ نے دوسرے بزرگ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''بابا حق نواز! یہی ہیں وہ دونوں بدبخت راہ زن، انہوں نے مجھے لوٹا تھا۔''

بس پھر کیا تھا۔ سب لوگ ڈرائیور اور مشتاق کو مارنا شروع ہو گئے۔ جس کا جیسا بس چل رہا تھا وہ اپنا غصہ ان دونوں پر نکال رہا تھا۔ یہاں تک کہ سب نے مار مار کر ان دونوں کا بھرکس نکال دیا تھا۔ ان پر نزع کا عالم طاری ہو گیا تھا۔ اس دوران میں خاموشی سے تماشا دیکھتا رہا تھا۔ جب وہ دونوں اچھی خاصی مار کھانے کے بعد نڈھال ہو گئے تو ایک باریش بزرگ نے اونچی آواز میں کہا۔ ''اب بس کر دو۔ کہیں یہ دونوں مر ہی نہ جائیں۔''

''اچھا ہے اگر یہ مر جائیں۔ کم از کم ہماری ان

بدبختوں سے جان تو چھوٹ جائے گی۔'' ایک بزرگ نے غصے سے کہا۔ شاید وہ بھی اُن دونوں راہ زنوں کا ستایا ہوا تھا۔

''دین محمد! ہم کیوں ان کے خون سے اپنے ہاتھ رنگیں اس لیے ان دونوں کو چودھری خدا بخش کے ڈیرے پر لے جاؤ اور پولیس کو بلا لو۔'' حق نواز نامی بزرگ نے کہا تو دین محمد نے اثبات میں گردن ہلا دی پھر چند نوجوان مل کر ان دونوں کو گھسیٹتے ہوئے لے جانے لگے۔ دونوں معافیاں مانگ رہے تھے، آئندہ راہ زنی نہ کرنے کے وعدے کر رہے تھے، قسمیں کھا رہے تھے لیکن ان کے وعدوں، قسموں کا کسی پر کوئی اثر نہیں پڑ رہا تھا۔ کوئی انہیں معاف نہیں کر رہا تھا۔ جب وہ دونوں راہ زنوں کو گھسیٹتے ہوئے دور چلے گئے تو وہاں تین بزرگ رہ گئے تھے جن میں بابا حق نواز بھی شامل تھے۔ وہ باریش انسان تھے۔ ان کی پیشانی پر گہرا محراب تھا جو اس بات کا غماز تھا کہ وہ پرہیزگار اور پانچ وقت کے نمازی تھے پھر وہ تینوں بزرگ میرے پاس آ گئے۔ بابا حق نواز میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے متاثر کن لہجے میں بولے۔

''بیٹا! اِن راہ زنوں کی وجہ سے گاؤں کے سب لوگ پریشان تھے۔ بہت سارے لوگوں کو یہ لوٹ چکے ہیں۔ ان کا طریقہ واردات یہی ہے کہ رکشا ڈرائیور سواری کو بٹھا کر کسی ویرانے میں لے جاتا ہے اور اپنے ساتھی کو فون کر دیتا ہے۔ دونوں اسے لوٹ کر چلے جاتے ہیں۔ پولیس بھی ان کی تلاش میں تھی لیکن یہ کسی کے ہتھے ہی نہ چڑھ رہے تھے۔ تم نے جس طرح اُن دونوں کا حال کیا ہے وہ ہم نے خود دیکھا ہے۔ اس سے لگتا ہے تم کافی بہادر ہو۔ تمہارا نام کیا ہے اور کہاں کے رہنے والے ہو؟''

''جی، میرا نام علی ہے اور میں ملتان کا رہنے والا ہوں۔'' میں نے انکساری سے جواب دیا۔ ''آپ نے اُن راہ زنوں کا جو طریقہ واردات بتایا ہے انہوں نے میرے ساتھ بھی ایسا ہی کیا تھا لیکن ان کی بدبختی کہ وہ مجھے لوٹ نہ سکے۔''

''آج ان کا پکڑا جانا ہی لکھا تھا۔'' بابا حق نواز کے دائیں طرف کھڑے بزرگ نے کہا۔ ''اور یہ اچھا ہو گیا ہے۔ اب پولیس ان سے تفتیش کرے گی تو جتنی وارداتیں کر چکے ہیں وہ اگل دیں گے۔''

''بیٹا! کیا ساہیوال میں تمہارے رشتے دار رہتے ہیں؟'' بابا حق نواز نے پوچھا۔

''نہیں، میں کسی سے ملنے آیا تھا۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اچھا اب مجھے اجازت دیں، میں چلتا ہوں۔''

''ارے ایسے کیسے جا سکتے ہو بیٹا۔'' جب میں جانے لگا تو بابا حق نواز نے مجھے روکتے ہوئے کہا۔ ''تم نے اُن راہ زنوں کو پکڑوا کر ہم پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ اب ہمیں خدمت کا تو موقع دو نا بیٹا۔''

میرے پاس وقت بے حد کم تھا اس لیے میں نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ ''محترم! آپ کا بے حد شکریہ۔ میں بہت جلدی میں ہوں۔ پہلے ہی اُن راہ زنوں کی وجہ سے میں لیٹ ہو گیا ہوں۔''

بابا حق نواز چند لمحے مجھے دیکھتے رہے پھر بولے۔ ''اچھا ٹھیک ہے بیٹا۔ تم نے کہاں جانا ہے؟ چونکہ اب تمہارے پاس سواری بھی نہیں ہے اس لیے جہاں جانا ہے اس جگہ کا بتا دو میں رشید کو بلا لیتا ہوں۔ وہ تمہیں چھوڑ آئے گا۔''

اب میں ان کی اتنی بات بھی نہ مانتا تو یہ بے مروتی ہوتی۔ وہ نہایت شفقت سے پوچھ رہے تھے اس لیے میں نے کہا۔ ''محترم! میں نے ایشین سرکس جانا ہے۔''

''ایشین سرکس۔'' انہوں نے میرے الفاظ دہرائے۔ ''اچھا ٹھیک ہے۔ تم ٹھہرو، میں رشید کو بلاتا ہوں۔''

پھر انہوں نے اپنے سیل فون سے کسی کو کال کی اور اسے موٹر بائیک لے کر فوراً مطلوبہ جگہ پہنچنے کی ہدایت کر کے سیل فون جیب میں رکھ لیا۔

''بیٹا! کیا تم اتنی دور سے صرف سرکس دیکھنے آئے ہو؟'' بابا حق نواز نے پوچھا۔

''نہیں۔'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میرا دوست وہاں کام کرتا ہے میں اس سے ضروری کام سے ملنے جا رہا ہوں۔''

''اچھا پھر ٹھیک ہے۔'' وہ بولے۔ ''بیٹا! میرا نمبر اپنے پاس لکھ لو، پھر بھی ساہیوال آنا ہو تو مجھے کال کر لینا۔ تمہاری میزبانی کر کے ہمیں بے حد خوشی ہو گی۔''

مجھے ان کی محبت، چاہت اور شفقت پر بے حد رشک آ رہا تھا۔ اس دنیا میں واقعی اچھے لوگوں کی کمی نہیں ہے۔ ان اچھے لوگوں کی وجہ سے ہی دنیا قائم ہے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ بے ضمیر، بدکردار اور دوسروں کی زندگیاں برباد کرنے والوں کی بھی کمی نہیں ہے۔ ایسے لوگ ہمیں جا بجا دکھائی

دیتے ہیں۔فرق صرف یہ ہے کہ ایسے لوگ خفیہ رہتے ہیں۔ ان کی اصلیت بہت دیر سے سامنے آتی ہے۔انہی لوگوں کی وجہ سے معاشرے میں بگاڑ ہے۔ہر دوسرے فرد کو کسی نہ کسی سے کوئی شکایت ضرور ہے۔

میں نے بابا حق نواز کا نمبر اپنے سیل فون میں سیو کر لیا۔کچھ دیر ہی گزری تھی کہ ایک سترہ، اٹھارہ سالہ لڑکا موٹر بائیک لے کر وہاں پہنچ گیا۔وہ لڑکا کافی خوش شکل تھا اور اس کی رنگت قدرے سانولی تھی۔شلوار قمیص کے اوپر اس نے لیدر کی جیکٹ پہنی ہوئی تھی۔اس نے سلام کیا تو مجھ سمیت سب نے جواب دیا۔

بابا حق نواز اس سے مخاطب ہوئے۔''رشید بیٹا! یہ نوجوان ہمارا مہمان ہے۔جس جگہ ایشین سرکس لگی ہوئی ہے اسے وہاں چھوڑ آؤ۔''

''ٹھیک ہے بابا۔'' رشید نے مؤدبانہ لہجے میں جواب دیا، پھر میں نے ان سے مل کر رشید کے پیچھے موٹر بائیک پر بیٹھ گیا۔رشید نے موٹر بائیک آگے بڑھائی اور پھر اسے دوڑاتا چلا گیا۔راہ زن ڈرائیور کا آٹو رکشا وہیں موجود تھا۔رشید نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی تھی شاید وہ کم گو تھا۔اس نے موٹر بائیک دوڑانے کی رفتار چالیس اور پچاس کے درمیان رکھی تھی۔ہم مختلف سڑکوں سے ہوتے ہوئے ایک میدانی علاقے میں داخل ہو گئے جہاں دور سے ہی مجھے ٹینٹ، کیمپ اور دیگر چیزیں دکھائی دیں۔غالباً ایک ایکڑ پر مشتمل میدانی ایریئے کو بڑے بڑے ٹینٹ لگا کر چاروں طرف سے بند کیا گیا تھا۔لوگوں کا بھی جم غفیر تھا۔کئی لوگ آ رہے تھے اور کئی جا رہے تھے۔ان میں بچے، لڑکیاں، خواتین اور نوجوان شامل تھے۔بچوں کے چہروں پر خوشی دیدنی تھی۔وہ بہت ایکسائٹڈ دکھائی دے رہے تھے۔ میوزک بجنے کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ٹینٹ کے قریب پہنچتے ہی میں نے رشید کو موٹر بائیک روکنے کا کہا تو اس نے موٹر بائیک روک دی۔میں اس کا شکریہ ادا کر کے اینٹرس کی طرف بڑھ گیا۔

سردی کی شدت بدستور موجود تھی لیکن لوگوں کا جوش و خروش دیدنی تھا۔میں نے اپر سر پر پہن لی تھی پھر میں بھی ٹکٹ لینے کے لیے ایک قطار میں لگ گیا۔دو قطاریں لگی ہوئی تھیں، پھر تھوڑی دیر کے بعد میری باری بھی آ گئی۔میں نے دیکھا کہ ٹکٹ فروخت کرنے والا اور کیشیئر دونوں ہی نئے تھے۔میں نے ٹکٹ لینے کے بعد پیسے ادا کیے اور پھر اندر داخل ہو گیا۔سب سے پہلے میں نے روشی کا کرتب دیکھنے کا فیصلہ کیا کیونکہ میں اسی سے ملنے یہاں آیا تھا۔روشی تنے ہوئے رسے پر بغیر کسی سہارے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چل کر کرتب دکھاتی تھی۔یہ انتہائی خوفناک اور حیرت ناک کرتب تھا۔دیکھنے والے انگشت بدنداں رہ جاتے تھے۔اس میں بیلنس برقرار رکھنا پڑتا تھا، ذرا سا بیلنس بگڑ جائے تو رسے پر چلنے والا نیچے گر جاتا ہے۔ زمین پر موٹے موٹے گدے بچھائے جاتے ہیں تاکہ اگر کرتب دکھانے والا بیلنس خراب ہونے پر گر جائے تو اسے چوٹ نہ لگے۔

میں نے ایک بار روشی سے پوچھا تھا کہ اس نے یہ کرتب کتنے عرصے میں سیکھا تھا تو اس نے بتایا تھا کہ اس نے یہ کرتب تین سے چار ماہ میں سیکھ لیا تھا۔مسلسل پریکٹس کی وجہ سے یہ کرتب اسے اب انتہائی آسان لگتا تھا۔جب میں خیمے کی طرف بڑھ رہا تھا تو اچانک میری نظر بیس بائیس گز کے فاصلے پر کھڑے اسماعیل شاہد کے منیجر قاسم منیر پر پڑی تو میں جلدی سے ایک سائیڈ پر ہو گیا۔قاسم منیر کسی اور طرف دیکھ رہا تھا اس لیے اس کی نظر مجھ پر نہیں پڑی تھی ورنہ گڑبڑ ہو جاتی بلکہ شاید یہاں سے میرے بھاگنے کے راستے بھی مسدود ہو جاتے۔قاسم منیر چند لمحے ناک کی سیدھ میں دیکھتا رہا پھر وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اسی طرف بڑھتا چلا گیا جدھر دیکھ رہا تھا۔میں نے گہری سانس لی اور مڑ کر روشی کے خیمے کی طرف بڑھ گیا۔چونکہ میں نے سرکس والوں کے ساتھ کام کیا تھا اس لیے مجھے پتا تھا کہ کون سا خیمہ کس کرتب کے لیے سجایا گیا ہے۔

جب میں خیمے میں داخل ہوا تو اس وقت لوگوں کی کافی رش تھا سب لوگ روشی کی طرف دیکھ رہے تھے جو ایک بڑے سے رسے پر انتہائی انہماک سے چلتی ہوئی دوسرے سرے کی طرف بڑھتی چلی جا رہی تھی۔اس کے پیروں میں جوتے نہیں تھے۔وہ ایسے ماہرانہ انداز میں چل رہی تھی جیسے وہ رسے کی بجائے زمین پر چل رہی ہو۔اس نے سرخ رنگ کا چست لباس پہنا ہوا تھا۔سر کے بال پونی کیے ہوئے تھے۔اس کا چہرہ پُرسکون تھا اور ہلکی ہلکی مسکراہٹ رینگ رہی تھی۔بچے تو اسے رسے پر چلتے دیکھ کر بہت ایکسائٹڈ ہو رہے تھے۔مردوں اور عورتوں کے چہروں اور آنکھوں کے تاثرات بھی دیدنی تھے۔یوں لگتا تھا جیسے سب نے دل تھام رکھے تھے۔کچھ منچلے نوجوان تو سیٹیاں بھی بجا رہے تھے جیسے

وادد ے رہے ہوں۔

اب مجھے روشی کے کرتب کے ختم ہونے تک وہیں انتظار کرنا تھا۔ اس کے کرتب کے ختم ہوتے ہی دوسری لڑکی اپنا کرتب دکھانے کے لیے تنے ہوئے رسے پر چلے گی پھر اس کے بعد تیسری۔ اسٹیج پر چار لڑکیاں موجود تھیں جو اپنی باری کا انتظار کر رہی تھیں۔ ان کے ساتھ ان کے ٹرینر بھی موجود تھے پھر جب روشی نے اپنا راؤنڈ مکمل کر لیا تو وہاں موجود لوگوں نے اس کی حوصلہ افزائی کے لیے تالیاں بجانی شروع کر دیں پھر ایک لڑکی آگے بڑھی اور تنے ہوئے رسے پر چلنے لگی۔ میں دل ہی دل میں دعا مانگ رہا تھا کہ روشی کسی کام سے اِدھر اُدھر ہو تو میں اس سے بات کر سکوں۔ شاید وہ قبولیت کا وقت تھا۔ روشی نے ٹرینر کی طرف جھک کر کوئی بات کی تو اس نے اثبات میں گردن ہلا دی پھر روشی اسٹیج کی سیڑھیاں اترنے لگی۔ میری نظریں اسی پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ سیڑھیاں اتر کر خیمے کے کونے میں بنے کمرے کا پردہ ہٹا کر دوسری طرف چلی گئی اور پردہ لہرا کر رہ گیا۔ میں لوگوں میں جگہ بناتا ہوا اسی کمرے کے دروازے کے پاس پہنچ گیا۔ سب لوگ دوسری لڑکی کا کرتب دیکھنے میں مگن تھے اور ٹرینرز کی توجہ بھی اسی طرف تھی اس لیے میں موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پردہ ہٹا کر کمرے میں جھانکنے لگا۔

روشی ایک کرسی پر بیٹھی جوس پی رہی تھی۔ میں جلدی سے اندر داخل ہو گیا۔ وہ سائیڈ میں بیٹھی تھی اس لیے اس کی نظر مجھ پر نہیں پڑی تھی اور نہ ہی اسے میرے وہاں آنے کا احساس ہوا تھا۔

''روشی!'' میں نے دھیمی آواز میں اسے پکارا تو وہ یک لخت چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔ دوسرے ہی لمحے اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

''علی..... تم۔'' وہ سرسراتی آواز میں بولی۔ اس کی خوبصورت آنکھوں میں حیرت کی پرچھائیاں تھیں۔ ''تم یہاں کیسے پہنچے۔ مجھے باس نے بتایا تھا کہ تم نے لانچ میں آکران کی بیٹی کو اغوا کر لیا ہے اور اس کی واپسی کے بدلے دس کروڑ تاوان کا مطالبہ کر رہے ہو اور پولیس بھی تمہاری تلاش میں ہے۔''

''یہ سب جھوٹ ہے اور مجھ پر بہتان ہے۔'' میں نے دانتوں کو کچکچاتے ہوئے کہا۔ ''اسماعیل شاہد کی بیٹی میرے پاس نہیں ہے اور نہ ہی میں نے تاوان مانگا ہے۔ وہ شاطر، کمینہ، دھوکے باز بکواس کرتا ہے اور میرے ساتھ ڈبل گیم کھیل رہا ہے۔''

روشی ''باس'' کے بارے میں میرے خیالات و القابات سن کر یقیناً اندر ہی اندر حیران رہ گئی ہو گی بلکہ شاید اسے اپنی سماعت پر بھی یقین نہیں آیا ہو گا کیونکہ بقول کرامت کے وہ باس کے بہت زیادہ قریب تھی۔ تاہم وہ حیرت بھری آواز میں بولی۔ ''علی! یہ تم باس کے بارے میں کیا کہہ رہے ہو۔ کیسی ڈبل گیم۔''

میں نے جواباً چہرے پر تلخ مسکراہٹ سجاتے ہوئے کہا۔ ''فی الحال یہ بتانے کا وقت نہیں ہے البتہ تم اتنا جان لو کہ وہ اب میرا باس نہیں ہے بلکہ وہ میرا سب سے بڑا دشمن ہے۔ یہ وہ انسان ہے جس کے دو چہرے ہیں۔ چونکہ تم حقیقت سے واقف نہیں ہو اس لیے تمہیں اپنے باس کے بارے میں میرے خیالات سن کر حیرت ہو رہی ہو گی لیکن

## وفا کانپوری

(1945ء...2003ء)

پروفیسر مرزا قمر عباس 1945ء کو کانپور میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام مرزا اختر حسین تھا۔ تین برس کی عمر میں والدین کے ساتھ کراچی آئے۔ پھر نئی کراچی کے قیام کے بعد 1964ء میں وہاں آباد ہو گئے۔ ''حلقۂ ارباب غزل'' نئی کراچی میں غافل اکبر آبادی، فضل گوالیاری، اعجاز رحمانی اور فہیم رودولوی وغیرہ کے ساتھ ماہانہ نشستوں میں باقاعدہ شریک ہوتے۔ محرم کی مجالس میں منقبت، سلام پڑھنے کے لیے انہیں مدعو کیا جاتا۔ جامعہ کراچی سے اردو ادب میں ایم اے کیا۔ اسلامیہ کالج میں دس برس تک لیکچرار اور اسسٹنٹ پروفیسر ہو کے ریٹائر ہوئے۔ سرور اکبر آبادی، پروفیسر رحمان خاور اور دیگر اساتذہ اردو کے ساتھ مل کر کالج کے طلباء میں ادبی ذوق پیدا کرنے والے سید قمر عباس وفا کانپوری ''صعق النفس'' (دمہ کا مرض) میں مبتلا رہنے کے بعد 24 دسمبر 2003ء کو جہانِ فانی سے رخصت ہوئے۔ وادیٔ حسین سپرد خاکی وے کراچی میں ان کی تدفین عمل میں لائی گئی۔

جب تمہیں اس کی اصلیت اور کرتوتوں کا پتا چلے گا تو شاید تم بھی اسے غلیظ گالیوں سے نوازو گی۔ وہ ایک مافیا ہے، لڑکیوں کا اسمگلر ہے۔''

میرے انکشاف پر روشی حیران رہ گئی تھی بلکہ وہ سُن ہونے کی کیفیت میں مبتلا ہوتی جارہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ وہ حیران کن آواز میں بولی۔ ''یہ..... یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ مجھے یقین نہیں آرہا۔''

''میں جانتا تھا لیکن یہ سچ ہے۔'' میں نے اسے یقین دلانے والے لہجے میں کہا۔ ''میں کس کرب واذیت میں مبتلا ہوں تم اس کا اندازہ بھی نہیں کرسکتی اور یہ سب تمہارے ''باس'' کی مہربانی ہے۔ اسی نے میری بہن اغوا کرائی ہے۔ بہرحال میں تمہارے پاس ایک اُمید لے کر آیا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ تم میری مدد کرو گی۔''

وہ گنگ سی کیفیت میں مبتلا رہی۔ پھر بولی۔ ''میں تمہاری کیا مدد کرسکتی ہوں؟''

اس نے اپنے دلکش ہونٹ سکیڑ لیے تھے۔ اس کی پیشانی پر سوچ کی لکیریں، آنکھوں اور حسین چہرے پر اُلجھن کے تاثرات بھی ابھر آئے تھے اور وہ اس لمحے مجھے یقینی وغیر یقینی کی کیفیت میں مبتلا دکھائی دے رہی تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں نے روشی کے پاس آکر اچھا کیا تھا یا غلط، کیونکہ وہ اسماعیل شاہد کی چہیتی تھی اور اس کے بہت ''قریب'' تھی۔ وہ یقیناً اسماعیل شاہد کے بارے میں جانتی ہوگی کہ وہ اس وقت کہاں موجود ہے۔ میں نے اپنا یہ سب کچھ تقدیر پر چھوڑ دیا تھا۔ میرا ایمان ہے ہوتا وہی ہے جو کاتبِ تقدیر نے لکھا ہوتا ہے۔ قدرت بھی اس کی مدد کرتی ہے جو اپنی مدد خود کرتے ہیں۔ میں بھی اپنی مدد آپ کے تحت وہاں آیا تھا۔ شاید قدرت نے اسے میری مدد کے لیے چن لیا ہو۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتی اسی لمحے مجھے اپنے عقب سے نسوانی آواز سنائی دی۔

''روشی۔''

میں آواز سن کر نہ صرف چونک پڑا بلکہ میں نے کنکھیوں سے اس لڑکی کی طرف دیکھا۔ اس لڑکی نے بھی سرخ رنگ کا چست لباس زیب تن کیا ہوا تھا۔ اس کا حلیہ بھی ویسا ہی تھا جیسا روشی کا تھا۔ وہ بھی مجھے ہی دیکھ رہی تھی اور اس کے چہرے پر حیرت کے سائے لہرا رہے تھے۔ میں اس لڑکی کو پہلی بار دیکھ رہا تھا جو شاید اس سرکس میں نئی آئی تھی۔ وہ لمبے قد اور دھان پان سی لڑکی تھی۔ اس کی رنگت کافی گوری تھی اور اس کے تین نقش بھی تیکھے تھے۔ بازو سڈول اور پتلے پتلے تھے جیسے پتلے پتلے بانس ہوں۔ روشی اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

''ہاں، کیا بات ہے زجان؟'' روشی نے پوچھا۔ میں بدستور اسے کنکھیوں سے دیکھ رہا تھا۔ میری یہاں موجودگی شاید وہ مخمصے کا شکار ہورہی تھی۔

زجان نے ایک طائرانہ نظر مجھ پر ڈالی اور روشی سے بولی۔ ''تمہیں سر بلا رہے ہیں۔ تمہارے سیکنڈ آئٹم کا وقت ہو رہا ہے۔''

''اچھا میں آتی ہوں۔'' روشی نے جواباً کہا اور جوس کا خالی ڈبا میز پر رکھا۔ ''تم جاؤ۔''

زجان نے ایک بار پھر مجھ پر طائرانہ نظر ڈالی اور مڑ کر وہاں سے چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی روشی میری طرف متوجہ ہوئی اور اضطراری انداز میں بولی۔ ''علی! مجھے جانا ہوگا۔ میرا سیکنڈ آئٹم اسٹارٹ ہونے والا ہے۔''

''اوکے۔ لیکن میرا کام.....'' میں بھی بے چین و بے قرار ہوا۔

''مختصر بتادو میں کیا کرسکتی ہوں۔''

''مجھے اسماعیل شاہد کے بارے میں معلومات چاہئیں۔'' میں نے کہا۔

''کیسی معلومات؟'' وہ چونکی۔

''یہ کہ وہ اس وقت کہاں موجود ہے؟'' میں نے کہا۔

''مجھے کیا پتا باس کہاں ہیں۔'' وہ حیران ہوئی۔ ''نہ ہی وہ کسی کو بتا کر جاتے ہیں۔''

''تم اس کے ساتھ رابطے میں تو ہونا؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا تو وہ گڑبڑائی۔

''ہاں ہوں..... لیکن۔'' وہ کہتے کہتے رک گئی کیونکہ اسی وقت زجان دوبارہ وہاں آگئی تھی۔

''روشی۔ سرناراض ہورہے ہیں۔ پوچھ رہے ہیں کہ تم کیوں نہیں آرہی۔'' زجان نے کہا تو مجھے اس لڑکی پر بے انتہا غصہ آنے لگا۔ اس کی دخل اندازی مجھے زہر لگ رہی تھی۔ میں نے سختی سے ہونٹ بھینچ لیے۔

''میں آرہی ہوں۔'' اس نے زجان کو جواب دیا تو وہ وہاں سے چلی گئی۔ روشی مجھ سے مخاطب ہوئی۔

''میں جارہی ہوں۔ مجھے اپنا نمبر دے دو، میں جیسے ہی فری ہوتی ہوں تو تمہیں بلالوں گی پھر بیٹھ کر اس مسئلے پر ڈسکس کرلیں گے۔'' اس نے کہا تو میں سوچ میں پڑ گیا۔

اس لمحے کئی وسوسے، کئی خیالات اور کئی خدشات ذہن میں کسمسانے لگے کہیں روشی میرے ساتھ دھوکا نہ کرے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ اسماعیل شاہد کو میری یہاں موجودگی کی اطلاع کر دے۔

''جلدی بتاؤ نمبر۔''

میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے اسے اپنا نمبر بتا دیا۔ نمبر نوٹ کرنے کے بعد وہ خیمے کے کونے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''تم اس طرف سے نکل جاؤ۔ میں جیسے ہی فری ہوتی ہوں تو تمہیں بلالوں گی۔''

میں نے اس کے بتائے ہوئے پردے نما دروازے کی طرف دیکھا۔ خیمے کے کونے میں ایک بھاری پردہ ہوا کے زور پر ہلکا ہلکا لہرا رہا تھا۔ شاید اس طرف سے باہر نکلنے کے لیے راستہ بنایا گیا تھا۔

''ٹھیک ہے۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔

''ویسے کتنی دیر تک تم فری ہو جاؤ گی؟''

وہ پردے نما دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ ''تقریباً آدھے گھنٹے تک۔ اس کے بعد ہمارا ریسٹ ہوگا۔''

اس کے جانے کے بعد میں اس کے بتائے ہوئے پردے نما دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ یہ پردے نما دروازہ خیمے کے عقبی طرف کھلتا تھا اور سامنے ہی چند خیمے گاڑے گئے تھے۔ یہ وہ خیمے تھے جہاں سرکس کا اسٹاف رہائش پذیر تھا۔ میں اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا ایک طرف بڑھتا چلا گیا۔ خیموں کے دوسری طرف سے گھوم کر میں ادھر آ گیا جدھر مختلف آئٹمز دکھانے کے لیے بڑے بڑے خیمے لگے ہوئے تھے۔ ان میں موت کے کنواں کا بھی خیمہ تھا اور موت کا کنواں دیکھنے کے لیے لوگوں کا سیلاب اُمڈ آیا تھا۔ نجانے مجھے کیوں روشی پر یقین تھا کہ وہ میری مدد ضرور کرے گی۔ مجھے اس کے لہجے، آنکھوں اور چہرے کے تاثرات سے اپنے لیے پسندیدگی کے آثار بھی دکھائی دیئے تھے۔ مجھے یاد ہے جب میری روشی سے پہلی ملاقات ہوئی تھی تو میں نے اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک دیکھی تھی لیکن میں نے اس کی کوئی حوصلہ افزائی نہیں کی تھی۔ روشی کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ نک چڑھی، مغرور اور منہ پھٹ لڑکی ہے۔ مرد حضرات اس سے بات کرنے سے ہچکچاتے تھے اور محتاط گفتگو کرتے تھے کیونکہ روشی، اسماعیل شاہد کی چہیتی تھی لیکن میں واحد شخص تھا جس سے اس نے کبھی تلخ انداز میں بات نہیں کی تھی۔ میرے ساتھ اس کا لہجہ انتہائی شائستہ اور شیریں ہوتا تھا۔

وقت گزاری کے لیے میں شیروں کا آئٹم دیکھنے ایک خیمے میں چلا گیا۔ اس دوران میں نے اپنا سیل فون آن کر لیا تھا تاکہ جب روشی مجھے کال کرے تو اسے میرا نمبر بند نہ ملے۔ میں نے حفظ ماتقدم کے طور پر اپنا فون وائبریشن پر لگا دیا تھا۔ میرے پاس دونوں فون تھے۔ ایک میرا اپنا اور دوسرا حیدر الماس صاحب کا دیا ہوا۔ میں نے سر سے ٹوپی بھی اتار دی تھی البتہ اپر کے نیچے سے مفلر نکال کر اسے گردن کے گرد لپیٹ لیا تھا جس سے میرے ہونٹ چھپ گئے تھے۔ اگر قاسم منیر یا کرامت کی مجھ پر نظر پڑ جاتی تو وہ مجھے آسانی سے نہیں پہچان سکتے تھے۔ یہ صرف میرا اپنا قیاس تھا۔ ہوسکتا ہے وہ مجھے دیکھتے ہی پہچان بھی لیں اس لیے میں انتہائی محتاط تھا۔

خیمے میں اسٹیج پر چار شیر موجود تھے اور ٹرینر کے اشارے پر اپنے اپنے آئٹم دکھانے میں مصروف تھے۔ میں بھی ان کے آئٹم دیکھنے میں مگن ہو گیا۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ میرا سیل فون وائبریٹ ہونے لگا۔ میں نے جلدی سے سیل فون نکال کر دیکھا تو اسکرین پر حیدر الماس صاحب کا نام چمک رہا تھا۔ یقیناً انہیں میرے فرار کی خبر مل گئی تھی اور وہ سچ پا ہو رہے ہوں گے۔ میں ایک خالی گوشے میں آ گیا۔

''السلام علیکم انکل۔'' یس کا بٹن پریس کرنے کے بعد میں نے سیل فون کان سے لگاتے ہوئے مؤدبانہ لہجے میں کہا۔

''وعلیکم السلام۔'' حیدر الماس صاحب نے جواباً کہا اور پھر پوچھا۔ ''علی! کہاں ہو اس وقت؟''

''میں.....'' میں بائیں کان کی لو کھجاتے ہوئے بولا۔ ''میں ساہیوال میں ہوں انکل۔''

میں نے جھوٹ بولنے سے گریز کیا۔ میری بات سن کر شاید وہ چونکے تھے۔ ''کیا مطلب..... تم ساہیوال میں ہو۔ وہاں کیا کر رہے ہو؟''

''انکل! میں اسماعیل شاہد کا معلوم کرنے آیا ہوں۔'' میں نے وجہ بتاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے کرامت نے بتایا تھا کہ..... روشی اسماعیل کی چہیتی ہے اور وہ اس سے رابطے میں ہے اسی لیے میں وقت ضائع کیے بغیر یہاں آ گیا۔''

ان کے پوچھنے پر میں نے روشی اور کرامت کے بارے میں بتا دیا۔ وہ ناراضگی سے بولے۔ ''علی! تم نے بہت غلط قدم اٹھایا ہے۔ تم نے روشی پر اندھا اعتبار کر لیا۔

اگر اس نے اسماعیل شاہد کو بتا دیا کہ تم ساہیوال میں ہو تو تمہارے لیے مشکل پیدا ہو سکتی ہے۔''

''روشی ایسا نہیں کرے گی انکل۔'' میں نے پُریقین لہجے میں کہا۔

''تم اس کے دل کا حال کیسے جان سکتے ہو؟'' ان کا سوال کافی جاندار تھا۔

''مجھے یقین ہے۔'' میں نے جواباً کہا۔

''اللہ کرے ایسا ہی ہو۔'' حیدر الماس صاحب نے دعا دی اور تنبیہہ کرتے ہوئے کہا۔ ''بہر حال انتہائی محتاط رہنا اور اگر کوئی مشکل ہو تو فوراً وہاں سے نکل آنا۔''

''جی بہتر۔'' میں نے صرف اتنا ہی کہا۔

''ویسے مجھے تم سے احمقانہ حرکت کی اُمید نہیں تھی۔'' حیدر الماس صاحب بولے۔ ''پھر تم نے اپنا نمبر بھی آن کر لیا ہے۔ اسماعیل شاہد لوکیشن ٹریس کر کے تمہیں گھیرنے کے اقدامات کر سکتا ہے۔''

ان کا خدشہ بالکل درست تھا۔ تاہم میں نے کہا۔

''آپ بے فکر رہیں، وہ کچھ نہیں کر سکے گا۔''

''ہمم۔ موبائل کی آواز میوٹ رکھنا۔'' انہوں نے کہا۔ پھر وہ ایک بار پھر احتیاط کی تاکید کرتے ہوئے رابطہ منقطع کر گئے تو میں نے بھی سیل فون اپر کی جیب میں رکھ کر ادھر دیکھا جدھر شیروں کے کرتب ابھی تک جاری تھے۔ میں ایک بار پھر ہجوم میں داخل ہو کر شیروں کے کرتب دیکھنے لگا۔ وقت آہستہ آہستہ گزر رہا تھا اور میری بے چینی کسی طور کم نہیں ہو رہی تھی۔ مجھے بھوک بھی لگ رہی تھی اس لیے میں نے سوچا کہ کچھ کھا پی لیا جائے۔ جب تک روشی بھی فری ہو جائے۔ میں خیمے سے نکل کر اسٹالز کی طرف آ گیا جہاں کھانے پینے کی دکانیں سجی ہوئی تھیں۔ میں نے ایک برگر بنوایا اور وہیں کھڑے ہو کر کھانے لگا۔ اس دوران میں طائرانہ نظروں سے اِدھر اُدھر بھی دیکھ رہا تھا۔ سب کچھ معمول کے مطابق ہی تھا۔ ہر شخص مطمئن اور پُرسکون دکھائی دے رہا تھا لیکن نجانے کیوں مجھے خطرے کی بو محسوس ہو رہی تھی۔ میں برگر کھا کر فارغ ہی ہوا تھا کہ اچانک میرے عقب میں موجود کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ مارا تو میں نے چونک کر اور مڑ کر دیکھا تو اسی لمحے میرے جبڑے پر ایک زوردار مکا پڑا۔ مکا اتنا زوردار اور بھرپور تھا کہ میں چکر اور ڈگمگا گیا تھا۔ یہاں تک کہ میرا ہونٹ پھٹ گیا اور خون کے چھینٹے میرے لباس پر پڑے۔ پھر میں سنبھلتا ہی تھا کہ سامنے موجود دو افراد میں سے ایک نے میرے پیٹ میں لات ماردی اور میں اچھل کر پشت کے بل کچی زمین پر گر گیا۔ مجھے اپنے پیٹ میں اینٹھن محسوس ہوئی اور میں اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسی لمحے مجھے لات مارنے والے مشٹنڈے نے میرے سر کے بال مٹھی میں جکڑ کر میرا چہرہ سامنے کیا تو میں نے دیکھا کہ اس کا خوفناک چہرہ غصے سے سرخ تھا اور وہ اپنی سرخ آنکھوں سے مجھے ایسے گھور رہا تھا جیسے اس کا مجھے زندہ نگلنے کا ارادہ ہو۔ اس کی پیشانی پر بائیں آنکھ کے اوپر کٹ کا ایک نشان تھا۔ اس کے سر کے سیاہ بال گھنگھریالے تھے اور تیل میں لتھڑے ہوئے تھے۔ میں یک ٹک اسے دیکھ رہا تھا کہ اچانک اس نے اپنے سر کی ٹکر میرے سر پر ماری تو مجھے اپنا دماغ جھنجھناتا ہوا محسوس ہوا۔ آنکھوں کے سامنے تاریکی سی پھیلتی محسوس ہوئی۔ حقیقی معنوں میں مجھے دن میں تارے دکھائی دینے لگے۔ یہ سب کچھ اس قدر اچانک ہوا تھا کہ مجھے سنبھلنے اور دفاع کرنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔

''لے چلو اسے۔'' میری سماعت سے اس مشٹنڈے کی آواز ٹکرائی اور پھر دو مشٹنڈوں نے میرے دائیں بائیں آ کر مجھے قابو کیا اور مجھے گھسیٹتے ہوئے لے جانے لگے۔ میں نے خود کو چھڑانے کی ناکام تگ و دو کی لیکن اس کا کوئی فائدہ نہ ہوا۔ دماغ پر پڑنے والی ٹکر نے مجھے اعصابی طور پر کمزور کر دیا تھا۔ میرے اندر اتنی سکت نہیں تھی کہ میں خود کو ان مشٹنڈوں کی گرفت سے چھڑا سکتا۔ یہی وجہ تھی کہ میں صرف کسمسا کر رہ گیا تھا اور وہ مجھے گھسیٹتے ہوئے لے جا رہے تھے۔ وہاں جتنے بھی لوگ موجود تھے سب کے چہرے مجھے دھندلائے دھندلائے دکھائی دے رہے تھے۔ آہستہ آہستہ میرے دماغ پر غنودی طاری ہوتی جا رہی تھی اور پھر میرا سر ڈھلک گیا تھا۔

☆☆☆

ہوش میں آنے کے بعد سب سے پہلا خیال میرے دماغ میں یہی ابھرا تھا کہ روشی نے مجھ سے غداری کی تھی۔ اس نے اسماعیل شاہد کو فون کر کے میری یہاں سرکس میں موجودگی کی اطلاع دی ہو گی اور اس کے کارندوں نے مجھے چھاپ لیا تھا۔ میں نے روشی پر اعتبار کیا تھا لیکن اس نے میرے اعتبار کو ٹھیس پہنچائی تھی۔ میرے دل میں اس کے لیے بدگمانی، غصہ اور نفرت پیدا ہو گئی۔

میں ایک خیمے میں کرسی کے ساتھ رسی سے بندھا ہوا

تھا۔ میری کلائیاں اس انداز میں کرسی سے باندھی گئی تھیں کہ میرے ہاتھ کسی طرح بھی رسی کی گانٹھوں تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔ خیمے میں ٹوٹی پھوٹی کرسیاں، میزیں اور دریاں پڑی ہوئی تھیں۔ شاید یہ خیمہ ''اسٹور'' کے طور پر بنایا گیا تھا۔ ایک سائیڈ پر ایک بھاری پردہ لہرا رہا تھا جو ''دروازہ'' تھا۔ میں وہاں اکیلا تھا اور خیمہ سورج کی روشنی سے منور ہو رہا تھا البتہ خیمے کے کونے میں ایک بانس کے ساتھ ایک مرکری بلب لگا ہوا تھا جو کہ اس وقت بند تھا۔

میرے اندازے کے مطابق اس وقت دن کے تین، ساڑھے تین بج رہے تھے۔ اسماعیل شاہد کے کارندے کافی تربیت یافتہ اور تیز طرار تھے۔ انہوں نے مجھے سنبھلنے کا موقع ہی نہ دیا تھا لیکن انہوں نے پیچھے سے وار کیا تھا۔ اگر وہ سامنے ہوتے تو میں انہیں ڈھیر کرنے کی تگ و دو ضرور کرتا۔ بہرحال اب میں نے خود کو وقت کے دھارے پر چھوڑ دیا تھا۔ میں نے خود کو ذہنی طور پر اسماعیل شاہد کے غیظ و غضب اور قہر آلود سلوک کے لیے تیار کر لیا تھا۔ یہ حقیقت تھی کہ اس نے میرے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرنا۔

سرکس ابھی جاری تھا کیونکہ لوگوں کا شور و غل میری سماعت سے ٹکرا رہا تھا۔ میں نے رسی کا جائزہ لیا تو وہ قدرے مضبوطی کے ساتھ باندھی گئی تھی۔ مجھے ان فلمی اداکاروں کا خیال آ گیا جو کرسیوں کے ساتھ بندھے ہوتے تھے اور اپنے ناخنوں میں لگے بلیڈوں سے رسیاں کاٹ کر آزاد ہو جاتے تھے لیکن میں نہ ہی فلمی ایکٹر تھا اور نہ ہی میرے ناخنوں میں بلیڈ لگے ہوئے تھے اس لیے میں خود کو کسی صورت آزاد کرانے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔

کچھ ہی دیر گزری تھی کہ خیمے کا دروازہ نما پردہ ہٹا اور دو افراد اندر آ گئے۔ سب سے آگے والا شخص روشنی کا ٹریز تھا جبکہ اس کے پیچھے کھڑا شخص وہی تھا جس نے مجھ پر اچانک حملہ کر کے مجھے بے بس کر دیا تھا۔ ٹریز پکی عمر کا تھا۔ اس نے چست لباس پہنا ہوا تھا اور مجھے ایسی نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ میں بھی یک ٹک اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ میں اسے پہچان گیا تھا۔ یہ روشی کا ٹریز تھا اور اس کا نام سلیم تھا۔ میں اس سے دو تین بار مل چکا تھا۔ مجھے یاد تھا جب میں نے سرکس جوائن کیا تھا تو کرامت نے اس سے میرا تعارف کرایا تھا۔ پھر اس سے ایک دو بار ملاقات ہو چکی تھی۔ ایک بار میں نے اس سے پوچھا تھا کہ اس نے رسے پر چلنے کی ٹریننگ کہاں سے لی ہے تو اس نے بتایا تھا کہ اس نے یہ ٹریننگ جاپان کے ایک ٹریننگ سینٹر سے لی تھی۔

''اوہ۔ یہ تو..... یہ تو علی ہے۔'' ٹریز سلیم نے سرسراتی آواز میں کہا تو اس کا ساتھی بھی بے اختیار چونک پڑا۔

''علی..... کون علی۔ کیا آپ اسے جانتے ہیں سلیم صاحب۔'' اس نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا تو ٹریز سلیم نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

''ہاں شوکت۔'' ٹریز سلیم نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''یہ علی ہی ہے، کچھ ماہ پہلے یہ ہمارے سرکس میں ملازم بھرتی ہوا تھا۔ کیشیئر کا کام کرتا تھا۔ پھر پتا چلا کہ اس کی بہن اغوا ہو گئی ہے اور یہ چلا گیا، اور جانتے ہو اسماعیل شاہد صاحب کی بیٹی کو کس نے اغوا کیا ہے؟''

''کس نے اغوا کیا ہے؟'' وہ ٹرانس کی کیفیت میں پوچھنے لگا۔

''اسی نے۔'' ٹریز سلیم نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''کیا.....؟'' وہ حیرت بھرے لہجے میں ''کیا'' کو لمبا کرتے ہوئے بولا۔

''ہاں۔'' ٹریز نے غصیلی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اسی نے اسماعیل صاحب کی بیٹی کو اغوا کیا ہے اور ان سے ان کی بیٹی کے بدلے دس کروڑ تاوان کا مطالبہ کر رہا ہے۔''

شوکت حیرت دیدنی تھی، پھر اس کی آنکھوں اور چہرے پر حیرت در آئی۔ بولا۔ ''دس کروڑ۔ تو کیا اسماعیل صاحب اسے دس کروڑ دینے پر راضی ہو گئے ہیں؟''

''معلوم نہیں۔'' ٹریز سلیم نے کندھے اچکائے، پھر مجھ سے پوچھا۔ ''کیا اسماعیل صاحب نے دس کروڑ تاوان دے دیا ہے تمہیں؟''

''کیسے دس کروڑ۔'' میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''میں نے نہ ہی تمہارے باس کی بیٹی کو اغوا کیا ہے اور نہ ہی دس کروڑ تاوان کا مطالبہ کیا ہے۔ وہ کمینہ انسان دنیا کے سامنے جھوٹ بول رہا ہے۔''

میرے منہ سے اسماعیل شاہد کے بارے میں الفاظ سن کر وہ دونوں بھی روشی کی طرح حیران رہ گئے۔ شاید ان کے بھی وہم و گمان میں نہیں تھا کہ میں ان کے سامنے ان کے باس کے بارے میں ایسے الفاظ استعمال کر سکتا ہوں۔

''اوئے، کیا بکواس کر رہا ہے تُو۔'' ٹریز سلیم نے اس بار بدلے ہوئے لہجے میں کہا اور آگے بڑھ کر اس نے میرے سر کے بال مٹھی میں جکڑ کر میرا چہرہ اوپر کیا۔ اس کے بے رحمانہ انداز میں بال پکڑنے پر مجھے تکلیف تو ہوئی لیکن میں ضبط کر گیا۔ اگر میں بندھا نہ ہوتا تو میں اسے بتاتا۔

''چھوڑ و میرے بال۔'' میں نے غصے سے کہا۔

''نہیں چھوڑتا۔ کیا کر لے گا تُو۔'' وہ چیلنج کرنے والے انداز میں بولا۔

''اندھے ہو تم۔ میں بندھا ہوا ہوں اس حالت میں، میں بھلا کیا کر سکتا ہوں ہمت ہے تو کھول دو۔'' میں نے طیش کے عالم میں کہا تو ٹریز سلیم کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا اور آنکھوں سے شعلے سے نکلنے لگے۔ دوسرے ہی لمحے اس نے میرے چہرے پر تھپڑ مار دیا۔ میرے بال بدستور اس نے مٹھی میں جکڑے ہوئے تھے۔ میرے وجود میں جیسے لاوا سا بھر گیا تھا۔ میں بندھے ہونے کی وجہ سے بے بس پرندے کی طرح پھڑ پھڑا کر ہی رہ گیا تھا۔

''سلیم صاحب۔'' اسی لمحے شوکت نے اسے مخاطب کیا تو اس نے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ ''آپ اسماعیل صاحب کو اس کے بارے میں بتا دیں۔ شاید وہ.....''

''ہاں، میں انہیں بتاتا ہوں۔'' وہ اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول پڑا' پھر اس نے زہر خند نظروں سے میری طرف دیکھا۔

''تُو یہاں کیا کرنے آیا ہے؟'' اس نے مجھ سے یہاں آنے بارے دریافت کیا۔

''میرے بال چھوڑو۔'' میں نے غصیلے لہجے میں کہا۔ اب میری تکلیف میں اضافہ ہو گیا تھا۔

اس نے میری بات نظر انداز کرتے ہوئے دریافت کیا۔ ''تم روشی سے ملنے آئے ہو نا؟''

میں نے اس بار اسے کوئی جواب نہ دیا، صرف غصیلی نظروں سے دیکھتا رہا۔ مجھے خاموش پا کر وہ خود ہی اپنے سوال کا جواب دینے لگا۔ ''میں جانتا ہوں تم روشی کے عاشق ہو۔ تم اسی سے ملنے آئے ہو۔ مجھے روشی نے بتایا تھا کہ وہ تمہیں پسند کرتی ہے۔ مجھے اسی روز سے ہی تم سے نفرت ہونے لگی تھی اور تمہیں میں اپنی راہ میں رکاوٹ سمجھنے لگا تھا۔ میں روشی سے بے انتہا محبت کرتا ہوں لیکن وہ مجھے گھاس تک نہیں ڈالتی۔ حالانکہ میں اس کا ٹریز بھی ہوں۔ اسے سارے کرتب میں نے سکھائے ہیں لیکن اس نے میری محبت ٹھکرا کر اپنے دل میں تمہیں بسا لیا۔''

میرے لیے یہ نیا انکشاف تھا۔ میں نے کبھی روشی کے بارے میں یہ نہیں سوچا تھا کہ میں اس سے محبت کرنے لگوں گا اور اسے پسند کروں گا۔ کالج دور میں، میں لڑکیوں کے پیچھے بھاگتا تھا اب لڑکیاں میرے پیچھے بھاگ رہی تھیں۔ وہ بھی ایک نہیں تین تین۔ حمیرہ، شانزے اور اب روشی۔

''سلیم صاحب! میرے ذہن میں ایک بات آئی ہے؟'' شوکت کی آواز نے مجھے خیالوں کی دنیا سے باہر نکالا۔

''وہ کیا؟''

''میرا خیال ہے کہ..... روشی بھی اس کے ساتھ ملی ہوئی ہے۔'' شوکت نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا تو میں نے ٹریز سلیم کو بھی چونکتے ہوئے دیکھا' پھر اگلے پل اس نے ایک جھٹکے سے میرے بال چھوڑ دیئے تو میں نے سکون کا سانس لیا۔

''اوہ۔ شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' ٹریز سلیم نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے اب پہلے اسماعیل صاحب سے بات کرنی ہوگی۔''

وہ دونوں قیاس آرائیاں کر رہے تھے اور میں حیرت کے سمندر میں ڈوبتا جا رہا تھا۔ روشی مجھے پسند کرتی تھی اور ٹریز سلیم اسے پسند کرتا تھا۔ اس کی بات سے میں سمجھ گیا تھا کہ میری مخبری کرنے میں اس کا ہاتھ نہیں ہے۔ یہ رقابت کی آگ تھی جس میں ٹریز سلیم جھلس رہا تھا اور شاید زجان نے ہی اسے جا کر بتایا تھا کہ کوئی لڑکا روشی کے خیمے میں موجود ہے۔ پھر اس نے یقیناً مجھے ٹریس کیا تھا اور پھر اپنے بندے بھیج کر مجھے قابو کر لیا تھا۔ اس نے یہ قیاس بھی کر لیا تھا کہ روشی میرے ساتھ ملی ہوئی ہے۔ وہ بدبخت انسان معصوم روشی کے لیے مشکلات پیدا کر رہا تھا۔ حالانکہ اس بے چاری کا کچھ قصور نہیں تھا۔

پھر ٹریز سلیم، شوکت سے بولا۔ ''تم اس کا خیال رکھو، میں اسماعیل صاحب کو فون کر کے آتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے سلیم صاحب۔'' شوکت نے جواباً کہا۔

پھر ٹریز سلیم مڑ کر جانے ہی لگا تھا کہ اسی لمحے پردہ ہٹا اور ایک نوجوان اندر داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں۔

''سلیم صاحب، سلیم صاحب۔'' وہ جلدی جلدی بولا۔

''کیا بات ہے واجد؟''

''سلیم صاحب، آپ کے خیمے کو آگ لگ گئی ہے۔'' نووارد نے ہانپتے ہوئے بتایا۔

''اوہ۔ کیسے آگ لگ گئی ہے۔'' ٹریز سلیم بھی پریشان ہوگیا۔

''پتا نہیں۔''

''چلو۔''

جاتے وقت اس نے شوکت کو بھی ساتھ چلنے کا اشارہ کیا تھا' پھر وہ تینوں ہی باری باری خیمے سے نکلتے چلے گئے اور میں اپنے بازو رسی سے آزاد کرنے کی تگ و دو میں مصروف ہوگیا لیکن باوجود کوشش کے میں کامیاب نہیں ہو رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے کوشش ترک کر دی اور خود کو حالات پر چھوڑ دیا تھا۔

کچھ ہی دیر گزری تھی کہ خیمے کا پردہ ایک طرف ہوا اور روشی اندر داخل ہوئی۔ دوسرے ہی لمحے وہ تیر کی طرح سیدھی میری طرف بڑھی۔ اس کے دائیں ہاتھ میں چھوٹا سا ایک چاقو تھا۔ اسے دیکھ کر میں بے اختیار چونک پڑا' پھر میرے بولنے سے پہلے ہی وہ بولی۔ ''میں رسی کاٹ رہی ہوں۔ تم جلدی سے یہاں سے فرار ہو جاؤ۔''

اتنا کہہ کر وہ میرے عقب میں آئی اور جلدی جلدی چاقو سے رسی کاٹنے لگی۔ میرا دل بھی تیز تیز دھڑکنے لگا۔ چاقو کی دھار تیز تھی اس لیے چند ہی سیکنڈز میں رسی کٹ گئی اور میرے ہاتھ آزاد ہو گئے۔ روشی میرے عقب سے نکل کر سامنے آئی اور میرے پیروں کی رسی کاٹنے لگی لیکن میں نے اس سے چاقو لے کر خود ہی رسی کاٹنے لگا۔ چند سیکنڈز کے دو میرے پیر بھی آزاد ہو گئے تھے۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''روشی.....'' میں نے کہنا چاہا۔

''علی! فوراً یہاں سے نکل جاؤ۔'' روشی نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''تمہاری زندگی خطرے میں ہے۔''

''میں کہاں جاؤں؟''

''کہیں بھی لیکن یہاں سے فوری طور پر نکل جاؤ۔'' اس نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''میں تم سے خود ہی فون پر رابطہ کرلوں گی۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ تمہارے ٹریز سلیم کے ارادے اچھے نہیں ہیں۔'' میں نے کہا۔

وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''ہاں جانتی ہوں۔ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے اور زجان نے اسے جا کر تمہارے بارے میں بتایا تھا۔ اس نے رقابت کے ہاتھوں مجبور ہو کر تمہیں پکڑلیا۔''

''وہ مجھے پہچان گیا تھا۔'' میں نے انکشاف کیا تو وہ چونکی۔

''اوہ۔'' اس نے اپنے سرخ ہونٹوں کو گولائی کی صورت میں کر کے کہا۔

''اس کا خیال ہے کہ..... ہم دونوں نے مل کر اسماعیل شاہد کی بیٹی کو اغوا کیا ہے اور تاوان کا مطالبہ کر رہے ہیں۔'' میں نے مزید اضافہ کیا۔ میری بات سن کر اس کے چہرے پر بھی خوف، پریشانی اور وحشت کے تاثرات ابھر آئے تھے۔

''اوہ۔ پھر تو صورتِ حال گمبھیر ہوگئی ہے۔'' وہ بے چین اور خوفزدہ ہرنی کی طرح دکھائی دینے لگی۔

''ہاں.....'' میں نے کہا۔ ''اس نے کہا ہے کہ وہ اسماعیل شاہد کو بھی آگاہ کرے گا۔''

''میں کچھ کرتی ہوں۔ فی الحال تم یہاں سے نکلو۔'' وہ میری بات کاٹتی بولی۔ ''میں نے خیمے کو آگ لگا کر ان کی توجہ اس طرف کر دی ہے۔ اگر وہ دوبارہ یہاں آ گیا تو تمہارے لیے مصیبت کھڑی ہو جائے گی۔ جاؤ۔ جلدی کرو۔''

''آگ تم نے لگائی ہے؟'' میں چونکا۔

''ہاں۔ باقی باتیں فون پر کروں گی۔'' وہ بولی۔ ''تمہارا فون تو تمہارے پاس ہے نا؟''

میں نے اپر کی جیبیں تھپتھپائیں تو میرے دونوں سیل فون اور پیسے اپر کی جیبوں میں موجود تھے۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا تو وہ مڑ کر دروازے نما پردے کی طرف بڑھ گئی۔ پردہ ہٹا کر وہ باہر جھانک کر دیکھنے لگی۔ اس دوران میں اس کے قریب پہنچ گیا تھا۔

''باہر کوئی نہیں ہے۔ جاؤ۔''

''میں تمہاری کال کا انتظار کروں گا۔'' میں نے کہا۔

''اور میری مدد کرنے کا تمہارا بے حد شکریہ۔''

اس نے محبت پاش نظروں سے میری طرف دیکھا۔ اب اس کے چہرے سے خوف، وحشت اور پریشانی کے

تاثرات دور ہو گئے تھے۔ اس کی حسین آنکھوں میں میرے لیے پسندیدگی اور محبت کے جذبات رقص کر رہے تھے، پھر اس نے سر کی جنبش سے مجھے جانے کا اشارہ کیا تو میں خیمے سے نکل کر تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا خارجی راستے کی طرف بڑھنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ وہاں بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ سرکس دیکھنے والے لوگ بھی بھاگتے ہوئے ادھر جا رہے تھے جدھر خیمے کو آگ لگ گئی تھی۔ روشی نے جس خیمے کو آگ لگائی تھی مجھے وہ تو دکھائی نہیں دیا تھا البتہ فضا میں دھواں اٹھتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ روشی نے ایسا مجھے بچانے کی خاطر کیا تھا۔ میں دل ہی دل میں اس کا ممنون ہو رہا تھا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتی تو میرا بچنا بے حد مشکل تھا۔ جب میرے پکڑے جانے کے بارے میں اسماعیل شاہد کو پتا چلتا تو شاید وہ مجھے گولی مارنے کا حکم دے دیتا لیکن اللہ کو میری زندگی مقصود تھی اس لیے اس نے روشی کو میری مدد کے لیے بھیج دیا تھا۔ کسی نے میری طرف توجہ نہیں دی تھی اور میں آسانی سے سرکس سے نکل کر سڑک کی طرف بڑھ گیا تھا لیکن مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اب میں کہاں جاؤں۔ اس شہر میں میرا کوئی جاننے والا بھی نہیں تھا جس کے پاس میں ''پناہ'' لیتا۔ میرے ذہن میں یہ خدشہ بھی سر ابھار رہا تھا کہ جب ٹریز سلیم کو پتا چلے گا کہ میری ''رہائی'' میں روشی کا ہاتھ ہے تو وہ روشی کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرے گا۔ اس کا شک پختہ ہو جائے گا کہ روشی میرے ساتھ ملی ہوئی ہے۔ حالانکہ روشی بھی حقیقت سے نا آشنا تھی۔ مجھے اس کی فکر ہونے لگی۔

میں محتاط انداز میں چلتا ہوا عقابی نظروں سے قرب و جوار میں دیکھ رہا تھا۔ سب کی توجہ فضا میں اٹھتے دھویں کی طرف تھی۔ کچھ دور آنے کے بعد میں نے قرب و جوار میں دیکھا تو مشرقی سمت مجھے دور سے ہی گھنے درخت دکھائی دیئے۔ شاید اس طرف باغ تھے۔ میرے اندازے کے مطابق سرکس اور باغوں کے درمیان دس فرلانگ تک کا فاصلہ تھا۔ اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آیا تو میں تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا درختوں کی طرف بڑھ گیا۔ میرے خیال کے مطابق میرے لیے وہاں چھپنا بہتر تھا۔ زندگی میں ایسے حالات سے واسطہ پڑے گا کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ وقت اور حالات کہاں سے کہاں لے آئے تھے بلکہ ابھی کہاں لے جانا تھا۔

باغ میں پہنچتے ہی میں گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ باغ کافی بڑا تھا ویران پڑا تھا۔ میں نے دیکھا، سرکس کے ایک حصے سے بدستور دھواں فضا میں بلند ہو رہا تھا۔ شاید آگ بجھانے کا کام بھی جاری تھا۔ میں نے قرب و جوار کا جائزہ لیا لیکن قریب و نزدیک آبادی کے آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ میں نے ایک درخت کے سائے میں بیٹھنے کے بعد سیل فون نکال کر وقت دیکھا تو سہ پہر کے ساڑھے چار بج رہے تھے۔ اپنی منزل کی طرف بڑھتے سورج کی روشنی درختوں کے پتوں سے چھن چھن کر آ رہی تھی۔ سیل فون جیب میں رکھنے کے بعد میں دھویں کی طرف دیکھنے لگا جو بتدریج کم ہوتا جا رہا تھا اور پانچ بجے تک دھواں ختم ہو گیا۔ یہ اس بات کی نشاندہی تھی کہ آگ پر قابو پا لیا گیا تھا۔

کچھ دیر سستانے کے بعد میں اٹھا اور باغ میں چہل قدمی کرنے لگا۔ وہ کیلے کا باغ تھا۔ مجھے روشی کے بارے میں فکر ہو رہی تھی۔ نجانے ٹریز سلیم نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا ہوگا اور روشی نے میرے بارے میں کیا بتایا ہوگا۔ مجھے روشی کی کال کا انتظار تھا۔ وقت اپنی رفتار سے گزرتا جا رہا تھا اور آہستہ آہستہ اندھیرا بھی پھیلتا جا رہا تھا۔ گھنے درختوں کی وجہ سے باغ میں تو شام کا سماں ہو رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ رات ہونے پر میں کہاں جاؤں گا؟ کھلے ایریئے کی وجہ سے سردی بھی بڑھتی جا رہی تھی۔

کچھ دیر ٹہلنے کے بعد میں واپس آیا اور سرکس کی طرف دیکھنے لگا۔ اندھیرا پھیلنے کی وجہ سے اب سرکس کے خیمے بھی روشن دکھائی دے رہے تھے۔ چند ہی منٹ گزرے تھے کہ میرا سیل فون وائبریٹ ہونے لگا۔ میرا خیال تھا کہ شاید روشی کال کر رہی ہوگی لیکن جب سیل فون نکال کر دیکھا تو اسکرین پر حیدر الماس صاحب کا نام جگمگا رہا تھا۔ میں نے کال ریسیو کرنے کے بعد سلام کیا تو انہوں نے سلام کا جواب دیتے ہوئے پوچھا۔ ''علی! میں نے ابھی ابھی نیوز سنی ہے کہ سرکس میں آگ لگ گئی ہے اور کافی نقصان ہو گیا ہے۔ کیا تم تو ٹھیک ہو نا؟''

میں دل ہی دل میں اخبارات اور چینلز کے رپورٹرز کو داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ واقعی آج کا میڈیا بہت تیز ہو گیا ہے۔ جیسے ہی کوئی رپورٹرز کو خبر ملتی ہے تو وہ فوراً وہاں پہنچ جاتے ہیں۔ جیسے ہی کسی نے سرکس میں آگ لگنے کی اطلاع کی ہوگی تو وہ فوراً وہاں پہنچ گئے ہوں گے اور یہ نیوز چینلز پر چل گئی ہوگی۔

میں نے تصدیق کرتے ہوئے کہا۔ ''جی انکل! یہ خبر

درست ہے اور میں ٹھیک ہوں۔''

''اللہ کا شکر ہے۔'' ان کی اطمینان بھری آواز آئی۔

''تم سناؤ، کچھ معلوم ہوا؟ کیا روشی نے اسماعیل شاہد کے بارے میں کچھ بتایا؟''

''نہیں انکل!'' میں نے جواباً کہا۔ ''اسے بھی معلوم نہیں ہے کہ اسماعیل شاہد کہاں ہے لیکن اس نے وعدہ کیا ہے کہ وہ بہت جلد معلوم کر کے مجھے بتائے گی۔''

''ہمم۔'' ان کی آواز سنائی دی۔ ''اب تم کہاں ٹھہرے ہوئے ہو؟''

''میں ایک ہوٹل میں موجود ہوں۔'' میں نے جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔

''اوکے۔'' انہوں نے کہا۔ ''اگر کچھ معلوم ہو تو مجھے بتانا۔ پھر کوئی لائحہ عمل طے کریں گے۔''

میں نے ''ٹھیک ہے'' کہا تو دوسری طرف سے رابطہ منقطع ہو گیا۔ جیسے ہی میں نے سیل فون جیب میں رکھا تو ایک بار پھر وہ وائبریٹ ہونے لگا۔ میں نے اسکرین کی طرف دیکھا تو اس بار انجان نمبر سے کال آ رہی تھی۔ میرے دل نے کہا کہ اس بار روشی کی کال ہے تو میں نے کال ریسیو کر لی۔

''ہیلو.....''

''علی!'' دوسری طرف روشی ہی تھی لیکن اس کا لہجہ مدھم تھا۔

''تم ٹھیک تو ہو نا روشی۔'' میں متفکر ہوا۔

''میری چھوڑو، اپنی فکر کرو۔'' وہ جلدی سے بولی۔

''کیا مطلب؟'' میں چونکا۔

''سلیم کو تمہارے فرار کا علم ہو گیا ہے۔ اس کا شک مجھ پر ہے کہ میں نے تمہاری مدد کی ہے۔ سلیم نے اپنے بندوں کو تمہاری تلاش میں بھیج دیا ہے اس لیے تم جلد سے جلد کہیں دور چلے جاؤ اور چھپ جاؤ۔''

''کیا اسماعیل شاہد کا کچھ پتا چلا؟'' میں نے اس کی ''ہدایت'' نظر انداز کرتے ہوئے اپنے مطلب کی بات کی۔

''نہیں۔'' اس کی قنوطیت بھری آواز میری سماعت سے ٹکرائی تو میں نے ہونٹ بھینچ لیے۔ روشی مزید بولی۔ ''لیکن مجھے معلوم ہوا ہے کہ اسماعیل صاحب ایک دو روز میں یہاں آنے والے ہیں۔ اگر وہ یہاں آتے ہیں یا مجھے ان کے بارے میں کچھ معلوم ہوا تو میں تمہیں فون کر دوں گی۔ اچھا میں فون رکھ رہی ہوں۔ تم کہیں چھپ جاؤ۔''

اتنا کہنے کے بعد اس نے رابطہ منقطع کر دیا تو میں نے بھی سیل فون جیب میں رکھ لیا۔ مجھے یقین تھا کہ روشی یکطرفہ محبت کی خاطر میری مدد کر رہی تھی۔ اچانک میری نظر سامنے پڑی تو مجھے دو ذی روح دکھائی دیئے جو تقریباً دوڑتے ہوئے اسی باغ کی طرف آ رہے تھے جہاں میں موجود تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ یقیناً ٹریز سلیم کے بندے تھے اور کسی نے شاید مجھے اس باغ کی طرف جاتے دیکھا تھا اور اس نے ٹریز سلیم کو مخبری کی تھی۔ ان دونوں سے نبٹنا میرے لیے کوئی مشکل کام نہیں تھا لیکن ان سے مقابلہ کرنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں مڑا اور باغ کے دوسرے سرے کی طرف بڑھ گیا۔ اب اندھیرا قدرے گہرا ہو گیا تھا اور میں انتہائی محتاط انداز میں آگے بڑھ رہا تھا۔ باغ کے دوسرے سرے پر پہنچتے ہی میں نے مڑ کر دیکھا لیکن اندھیرا ہونے کی وجہ سے مجھے کچھ دکھائی نہیں دیا تھا۔ باغ سے نکلنے کے بعد میں کچی سڑک پر چلتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ میں کس طرف جا رہا ہوں لیکن رات گزارنے کے لیے کوئی مناسب جگہ بھی تلاش کرنی تھی۔ کچھ فاصلہ عبور کرنے کے بعد میں نے مڑ کر دیکھا لیکن میرے تعاقب میں کوئی نہیں آیا تھا۔ میں اکیلا ہی وہاں موجود تھا۔ میرا خیال تھا کہ سلیم کے بندے مجھے باغ میں تلاش کرنے کے بعد ناکام ہو کر واپس چلے گئے ہوں گے۔

سڑک کسی ناگن کی طرح بل کھاتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ قرب و جوار میں موجود فصلیں سایوں کی طرح سر اٹھائے کھڑی تھیں۔ وقفے وقفے سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں پُرہیبت سناٹے میں گونج جاتی تھیں۔ مجھے معلوم تھا کہ گاؤں میں کتوں کے غول رات ہوتے ہی دندنانے کے لیے نکل آتے ہیں اس لیے میں محتاط انداز سے چل رہا تھا۔

مسلسل پیدل چلنے کی وجہ سے مجھے اپنی ٹانگیں شل ہوتی محسوس ہو رہی تھیں۔ سردی کی شدت میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے سردی میری ہڈیوں میں گھستی جا رہی تھی۔ ایک جگہ رک کر میں رکوع کے بل جھک کر اپنی تھکاوٹ دور کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ مجھ میں اب مزید چلنے کی سکت ختم ہوتی جا رہی تھی اور میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتا تھا۔ کچھ دیر اسی حالت میں رہنے کے بعد میں سیدھا ہوا اور پھر آگے بڑھنے لگا۔ کافی دور آنے کے بعد مجھے

آبادی کے آثار دکھائی دیئے تو میں نے گہری سانس لی۔ مکانوں کی دیواروں پر پیلی روشنی والے بلب چھوٹے چھوٹے نقطوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ جب میں آبادی سے تھوڑے فاصلے پر پہنچا تو اسی وقت ایک مسجد سے عشاء کی اذان ہونے لگی۔ مؤذن کی آواز بازگشت بن کر دور دور تک گونج رہی تھی۔ شاید وہاں ایک ہی مسجد تھی کیونکہ کسی اور مسجد سے اذان کی آواز سنائی نہیں دی تھی۔ مؤذن کی آواز سحر انگیز اور رقت طاری کرنے والی تھی۔ میرے دل کو بھی کچھ کچھ ہونے لگا تھا۔ میں نے اپنا محاسبہ کیا تو مجھے خود سے شرمندگی ہونے لگی۔ میں صرف جمعہ کی نماز پڑھتا تھا۔ البتہ کبھی کبھار فجر کی نماز بھی پڑھ لیتا تھا۔

ہم دنیاوی کامیابیوں کے لیے دن رات بھاگ دوڑ کرتے رہتے ہیں لیکن آخرت کی کامیابی اور تیاری کے لیے کچھ نہیں کرتے حالانکہ اللہ تعالیٰ دن میں پانچ بار اپنے بندوں کو بلاتا ہے کہ آؤ کامیابی کی طرف، آؤ فلاح کی طرف، لیکن ہم دنیاوی کاموں میں اس قدر الجھ جاتے ہیں کہ ہم اللہ کی منادی نظر انداز کر دیتے ہیں۔

اب مجھے پیاس لگ رہی تھی لیکن پانی کا حصول ممکن نہیں تھا۔ کچھ دیر کے بعد میں آبادی کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ میں نے دیکھا کسی کسی مکان کی دیوار پر نصب زرد بلب اندھیرے کو دور کرنے کی اپنی ناکام کوشش کر رہے تھے لیکن وہاں گہری خاموشی اور سناٹے کا راج تھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں اور کدھر جاؤں۔ میں خود کو بے بس ہی نہیں بلکہ لاچار، تنہا اور کمزور بھی محسوس کر رہا تھا۔ میں کسی گاؤں میں آ تو گیا تھا لیکن نہیں جانتا تھا کہ میں رات کیسے گزاروں گا۔ مجھے مسجد کا بھی پتا نہیں چل رہا تھا ورنہ میں مسجد میں چلا جاتا اور وہیں رات گزارتا، پھر میرے ذہن نے کام کیا کہ مجھے مسجد تلاش کرنی چاہیئے۔ کھلے آسمان تلے رات گزارنا گویا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ سردی سے میں اکڑ سکتا تھا اور صبح گاؤں والوں کو میری اکڑی ہوئی لاش ہی ملتی۔

مسجد کی تلاش میں، میں آگے بڑھا اور ایک گلی میں داخل ہو گیا۔ وہ گلی بھی ناگن کی طرح بل کھاتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ گلی کے اختتام پر مجھے مسجد تو دکھائی نہ دی البتہ ایک وسیع احاطے کے گرد چار دیواری دکھائی دی جس کے ایک کونے میں ایک کمرا دکھائی دے رہا تھا۔ احاطے کی چار دیواری بھی میرے اندازے کے مطابق پانچ فٹ سے زیادہ بلند نہ تھی۔ میں دیوار کود کر دبے قدموں سے چلتا ہوا کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ کمرے کا دروازہ ٹوٹا ہوا اور سالخوردہ تھا۔ اندر کمرے میں اندھیرے کا راج تھا۔ میں نے دایاں کان ٹوٹے دروازے کے ساتھ لگا کر اندر کی سن گن لینے کی کوشش کی لیکن شاید گہری تاریکی نے خاموشی کے ساتھ رشتہ استوار کیا ہوا تھا۔ اچھی طرح اطمینان کر لینے کے بعد میں نے جیب سے سیل فون نکالا اور اس کی ٹارچ روشن کر کے پہلا قدم اندر رکھا اور کمرے میں داخل ہو گیا۔

وہ ایک پکا کمرا تھا جس کی دیواریں پلستر شدہ تھیں لیکن پلستر جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا تھا۔ فرش بھی پکا تھا لیکن جگہ جگہ سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا اور گرد آلود تھا۔ ایک دیوار کے وسط میں لوہے کی سلاخوں والی ایک کھڑکی موجود تھی جس کا ایک پٹ غائب تھا۔ میں نے کمرے کا کونا منتخب کیا۔ دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھنے کے بعد میں نے ٹانگیں سیدھی کر لیں۔ فرش ٹھنڈا تھا جس سے مجھے اپنے جسم میں سرد لہری دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی جس پر میں ایک لمحے کے لیے کپکپا کر رہ گیا۔ میں نے سردی کی لہر برداشت کی۔ کچھ بھی تھا مجھے رات وہیں گزارنی تھی، پھر سیل فون کی ٹارچ آف کی اور اسے جیب میں رکھ کر دونوں ہاتھ بغلوں میں دے کر آنکھیں موند لیں۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ صبح ہوتے ہی میں شہر میں جاؤں گا اور کسی ہوٹل کا کمرا کرائے پر لے لوں گا۔ یوں خوار ہونے سے بہتر تھا کہ میں کسی ہوٹل کے کمرے میں ٹھہر کر روشی کی کال کا انتظار کروں، پھر میں نے ایسا ہی کیا۔ رات وہاں گزارنے کے بعد میں وہاں سے نکل کر شہر پہنچ گیا۔ درمیانے درجے کے ایک ہوٹل میں کمرا بک کرا لیا۔ مجھے کمرا دوسری منزل پر ملا تھا۔ میں نہا دھو کر فریش ہوا اور ناشتا کرنے کے بعد میں بستر پر لیٹ گیا۔ گزشتہ رات بے سکونی میں گزری تھی اس لیے بستر پر لیٹتے ہی میں نیند کی وادی میں کھو گیا۔

مجھے سوئے ہوئے شاید تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ میری جیب میں موجود سیل فون وائبریٹ ہونے لگا جس سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے مچی مچی آنکھوں سے سیل فون کی اسکرین پر دیکھا تو کرامت کا نام چمک رہا تھا۔ میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میری چھٹی حس مجھے کسی خطرے سے آگاہ کر رہی تھی شاید۔

میں نے کال ریسیو کرتے ہوئے کہا۔ ”ہیلو کرامت۔“

''سنو علی!'' کرامت نے کہا۔ ''روشی کی زندگی خطرے میں ہے۔ اس کے انچارج سلیم کو اس پر شک تھا کہ وہ تم سے ملی ہوئی ہے اور اسی نے خیمے کو آگ لگائی ہے تاکہ تمہیں فرار کرا سکے اسی لیے روشی راتوں رات غائب کر دی گئی ہے۔ اس کا کچھ پتا نہیں چل رہا۔ میں نے ابھی ابھی سلیم کی باتیں سنی ہیں۔ شاید وہ باس اسماعیل سے بات کر رہا تھا۔ باس سے بات کرنے کے بعد اس نے شوکت سے بات کی ہے اور اس سے کہا ہے کہ..... علی کے بارے میں معلوم ہو گیا ہے۔ وہ ساہیوال میں بس اڈے کے قریب ایک ہوٹل میں موجود ہے..... کیا تم واقعی بس اڈے کے قریب کسی ہوٹل میں موجود ہو؟'' آخر میں اس نے تصدیق چاہی۔

میں بے اختیار چونک پڑا۔ ''ہاں۔ میں ایک ہوٹل میں موجود ہوں۔''

''تو پھر فوراً وہاں سے نکل جاؤ۔ میرے خیال کے مطابق شوکت اپنے ساتھیوں کے ساتھ تمہیں پکڑنے یا مارنے کے لیے روانہ ہو چکا ہے۔'' کرامت نے جواباً کہا۔ ''اب تم کہیں چھپ جاؤ یا بھاگ جاؤ۔''

''سلیم کو کیسے پتا چلا میرے بارے میں؟''

''یہ تو مجھے نہیں معلوم۔''

''ہمم۔ اسماعیل شاہد کا کچھ پتا چلا؟''

''ہاں۔'' کرامت نے جواب دیا۔

''اوہ۔ کہاں ہے وہ اس وقت۔'' میری آنکھیں چمک اٹھیں۔

''وہ لاہور میں موجود ہے۔''

''تمہیں کیسے پتا چلا؟''

''سلیم کی بات سنی تھی۔ وہی باس سے پوچھ رہا تھا۔'' کرامت نے جواباً بتایا۔

''کیا یہ پتا نہیں چلا کہ وہ لاہور میں کہاں موجود ہے؟''

''نہیں۔ اچھا اب میں فون رکھتا ہوں۔ کہیں کسی کو شک نہ پڑ جائے۔'' کرامت نے کہا۔

''اوکے۔ تمہارا بے حد شکریہ۔''

رابطہ منقطع ہوتے ہی میں نے جلدی سے بستر سے اتر کر پہلے جوتے پہنے پھر اپر پہن لی اور کمرے سے نکل کر سیڑھیاں اتر کر کاؤنٹر پر پہنچ گیا۔ میں نے چابی کاؤنٹر مین کے حوالے کی اور ہوٹل سے نکل کر بس اڈے کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے حفظ ماتقدم کے طور پر اپنا سیل فون آف کر دیا تھا۔ لاہور جانے والی ابھی کوئی بس نہیں آئی تھی لیکن معلومات لینے پر پتا چلا کہ ہر آدھے گھنٹے کے بعد لاہور جانے والی ایک بس آتی ہے اور دس، پندرہ منٹ میں بس پہنچنے والی تھی چنانچہ میں ایک جگہ بیٹھ کر بس کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔ میں چوکنا تھا اس لیے میری غائرانہ نظریں اِدھر اُدھر گھوم رہی تھیں۔ اچانک مجھے شوکت دکھائی دیا۔ اس کے ساتھ دو افراد اور بھی تھے اور وہ تینوں غور سے ہر ایک کا جائزہ لے رہے تھے۔ میں جلدی سے ایک ستون کے پیچھے چھپ گیا۔ وہ تینوں مجھے اِدھر اُدھر تلاش کرنے کے بعد کہیں اور چلے گئے تو میں نے سکون کا ایک سانس لیا۔ کچھ دیر کے بعد لاہور جانے والی ایک کمپنی کی بس آ گئی اور میں بس میں سوار ہو کر لاہور کے لیے روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

لاہور تو میں پہنچ گیا تھا لیکن مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ میں اسماعیل شاہد کو کہاں تلاش کروں۔ اگر اس کے ٹھکانے کے بارے میں پتا چل جاتا تو اسے دبوچنے میں آسانی ہو جاتی۔ لاہور بہت بڑا شہر تھا۔ میں اسے کہاں کہاں تلاش کرتا۔ مجھے روشی کے پکڑے جانے پر افسوس تھا۔ چونکہ وہ اسماعیل شاہد کے قریب تھی اس لیے وہ اس سے اس کے ٹھکانے کے بارے میں معلوم کر کے مجھے بتا سکتی تھی۔ لاری اڈے پر بہت رش تھا۔ گندگی الگ پھیلی ہوئی تھی۔ میں لاری اڈے سے نکل کر پیدل چلتا ہوا داتا دربار کی طرف بڑھ گیا۔ میرا لباس گندہ ہو چکا تھا اس لیے میں نے سب سے پہلے لباس چینج کرنے کا فیصلہ کیا۔ ایک شاپ سے ریڈی میڈ سوٹ اور ہوڈی خرید کر ایک مسجد کے باتھ روم میں لباس چینج کیا اور پرانا لباس کچرے کے ڈھیر پر پھینک کر مینار پاکستان والی سڑک سے ہوتے ہوئے میں کچھ ہی دیر میں، میں داتا دربار پہنچ گیا۔

دوپہر ہو رہی تھی۔ داتا دربار سے ملحق احاطے میں لوگوں کا بے حد رش تھا۔ چاول بانٹے جا رہے تھے۔ وہاں موجود مختلف دکانوں پر لوگ خریداری میں مصروف تھے۔ جو لوگ داتا دربار جا رہے تھے پولیس ان کی چیکنگ کر کے بھیج رہی تھی۔ میں بھی چیکنگ کے مرحلے سے گزر کر داتا دربار میں داخل ہو گیا۔ وضو کر کے نمازِ ظہر ادا کی اور پھر ایک طرف دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ نماز ادا کر کے مجھے بے حد سکون ملا تھا۔ چونکہ میں رات کا جاگا ہوا تھا اس لیے بیٹھے

بیٹھے مجھے نیند آ گئی۔ جب میری آنکھ کھلی تو سہ پہر کے چار بجنے والے تھے۔ میں داتا دربار سے نکل کر اسماعیل شاہد کو تلاش کرنے لگا۔ رات تک میں اس کی تلاش میں مارا مارا پھرتا رہا لیکن مجھے کامیابی نہیں ملی تھی۔ میں نے رات گزارنے کے لیے درمیانے درجے کے ہوٹل کا انتخاب کیا تھا۔ میرے کمرے کی کھڑکی سڑک کی طرف کھلتی تھی۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد میں کھڑکی میں آ کر کھڑا ہو گیا اور سڑک پر رینگتی ٹریفک کی طرف دیکھنے لگا۔ آج پھر مجھے اپنی بہن روزینہ شدت سے یاد آ رہی تھی۔ اچانک میری نظر ایک لڑکے پر پڑی جو ہاتھ میں آئسکریم لیے کھاتا ہوا جا رہا تھا۔ روزینہ کو بھی آئسکریم بہت پسند تھی۔ مجھے یاد ہے، کبھی کبھی کالج سے واپسی پر وہ مجھ سے آئسکریم کھانے کی فرمائش کرتی تھی تو میں بہ خوشی اس کی فرمائش پوری کر دیتا تھا۔ یک لخت میں ماضی کی یادوں میں چلا گیا۔

ایک روز میں اسے کالج سے پک کر کے گھر آ رہا تھا کہ اس نے فرمائش کر دی کہ میں اسے آئسکریم کھلاؤں۔ سخت سردی تھی۔ وہ سخت سردی میں بھی آئسکریم کھانے کی شوقین تھی۔ بہرحال ہم نے آئسکریم شاپ سے آئسکریم کھائی اور گھر آ گئے۔ گھر آتے ہی مجھ پر چھینکوں کا دورہ پڑ گیا اور نتیجتاً مجھے نہ صرف نزلہ وزکام ہو گیا بلکہ بخار بھی ہو گیا۔

روزینہ نے افسوس بھرے لہجے میں مجھ سے کہا تھا۔ ''سوری بھیا۔ یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے۔''

''بالکل، تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔'' میں نے ڈپٹنے والے انداز میں کہا تھا۔ ''میں نے منع بھی کیا تھا کہ میں نے آئسکریم نہیں کھانی لیکن تم نے مجھے زبردستی آئسکریم کھانے پر مجبور کر دیا۔''

''بھیا! ناراض تو نہ ہوں۔''

''میں حیران ہوں کہ سخت سردی میں تم نے آئسکریم کھائی اور تمہیں کچھ بھی نہیں ہوا۔''

''اوہ۔ تو کیا آپ چاہتے ہیں مجھے بھی نزلہ وزکام ہو؟'' وہ حیرت زدہ ہوئی تھی۔

''ہاں۔ تاکہ تم آئندہ کے لیے سردی میں آئسکریم کھانے سے توبہ کر لو۔'' میں نے وضاحت کی تھی۔

''کچھ بھی ہو جائے میں آئسکریم کھانا نہیں چھوڑ سکتی۔'' وہ لاڈ بھرے لہجے میں بولی تھی تو میں نہ چاہتے ہوئے بھی مسکرا دیا تھا۔ ''اچھا، میں آپ کے لیے سوپ بنا لاتی ہوں۔ آپ جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔''

روزینہ سوپ بنانے چلی گئی تھی اور میں ماضی کی یادوں سے باہر نکل آیا تھا۔ میں نے ایک طویل سانس لی اور مڑ کر بستر پر جا کر بیٹھ گیا تھا۔ کھانے کے برتن میز پر پڑے ہوئے تھے۔ کچھ دیر کے بعد دروازے پر دستک ہوئی اور پھر میرے ''آ جاؤ'' کہنے پر ایک لڑکا اندر آ گیا۔ وہ برتن اٹھانے آیا تھا۔ اس نے برتن اٹھانے کے بعد میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''باؤ! کچھ اور چاہیے؟''

''نہیں۔ شکریہ۔'' میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' لڑکے نے جواب دیا اور برتن لیے کمرے سے نکل گیا۔

کل سے میرا مرینہ سے بھی رابطہ نہیں ہوا تھا اس لیے میں نے اسے کال کرنے کا سوچتے ہوئے سیل فون جیب سے نکالا اور اسے آن کر کے مرینہ کو کال کی۔ حال احوال دریافت کرنے کے بعد اس نے پوچھا۔

''بھیا! آپ کا فون مسلسل بند جا رہا تھا۔ مجھے بہت فکر ہو رہی تھی۔''

''میں ٹھیک ہوں اور لاہور میں موجود ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''لاہور میں۔ کیوں؟'' اس کی چونکتی ہوئی آواز سنائی دی۔

''مجھے پتا چلا ہے کہ اسماعیل شاہد لاہور میں ہے تو اسی کی تلاش میں ہی لاہور آیا ہوں۔'' میں نے بتایا۔ ''یہ بتاؤ، امی کی طبیعت اب کیسی ہے۔ کیا ماموں وہیں ٹھہرے ہوئے ہیں یا چلے گئے ہیں؟''

''ماموں یہیں ہیں۔'' مرینہ نے بتایا۔ ''وہ ہمیں جلال پور پیر والا لے جانا چاہتے ہیں تاکہ آب و ہوا بدلنے سے امی کی طبیعت ٹھیک ہو سکے۔ آپ کیا کہتے ہیں؟''

''تم کیا کہتی ہو؟'' میں نے الٹا سوال کر ڈالا۔

''جیسا آپ کہیں گے میں ویسا ہی کروں گی۔'' مرینہ نے کہا تو میں نے کچھ دیر سوچنے کے بعد اسے امی کو لے کر ماموں کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی۔ میرے خیال میں یہ اچھا ہو جائے گا۔ آب و ہوا بدلنے سے امی کی صحت بھی ٹھیک ہو جائے گی، پھر میں نے مرینہ کو امی کی صحت کا خیال رکھنے کی ہدایت کر کے فون آف کر کے

جیب میں رکھا اور کمرے سے نکل کر ٹہلنے کی غرض سے ہوٹل سے نکل کر سڑکوں پر مٹرگشت کرنے لگا۔

مجھے لاہور آئے دو روز گزر گئے تھے۔ میں نے کئی جگہیں چھان ماری تھیں لیکن میں اسماعیل شاہد کو تلاش نہیں کر پایا تھا مگر میں ناامید نہیں ہوا اور نہ ہی میں نے حوصلہ ہارا تھا۔ میرے دل میں ایک موہوم سی اُمید تھی کہ میں اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہو جاؤں گا۔ میں اسماعیل شاہد کو ضرور ٹریس کرلوں گا۔ میری شیو بھی بڑھ گئی تھی۔ میں نے کلین شیو ہونے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ میں نے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا تھا شیو ہونے کی وجہ سے میرا حلیہ قدرے بدل گیا تھا اور یہ میرے حق میں بہتر تھا۔ اس طرح میں پہلی نظر میں پہچانا نہیں جا سکتا تھا۔

میری ضمانت کے دن بھی مکمل ہو گئے تھے اور مجھے یقین تھا کہ الیاس حیدر صاحب میری ضمانت میں مزید توسیع کرالیں گے۔ پاکستان میں ہر کام ممکن تھا۔ کچھ دنوں سے حیدر الیاس صاحب سے بھی رابطہ نہیں ہوا تھا۔ نہ انہوں نے کال کی تھی اور نہ میں نے۔

تیسرے روز دوپہر کے وقت میں انارکلی بازار سے گزر رہا تھا کہ اچانک میری نظر غیر ارادی طور پر ایک جیولری شاپ سے باہر نکلتی شانزے پر پڑی تو میں بے اختیار چونک پڑا اور میرے آگے بڑھتے قدم بے اختیار تھم گئے۔

شانزے کے ساتھ حسب سابق اس کی بیسٹ فرینڈ ماریہ بھی تھی۔ دونوں ماڈرن لباس میں ملبوس تھیں اور دونوں نے اپنے سر کے بالوں میں گاگلز اڑسی ہوئی تھیں۔ میں جلدی سے ایک ٹھیلے کے پیچھے ہو کر ان کی طرف دیکھنے لگا۔ دونوں جیولری شاپ سے نکل کر ایک سائیڈ پر کھڑی فیروزی رنگ کی کار کی طرف بڑھ گئی تھیں۔ کار کے قریب پہنچ کر ماریہ کو جیسے کچھ یاد آیا تو وہ شانزے کو اشارے سے وہیں رکنے کا کہہ کر دوبارہ جیولری شاپ کی طرف بڑھ گئی۔

یہ اتفاق تھا کہ شانزے بھی لاہور میں تھی۔ کچھ دنوں سے وہ بھی مجھے کال نہیں کر رہی تھی۔ شاید بزی تھی یا کوئی اور وجہ تھی۔ میں موقع پاتے ہی ٹھیلے کی آڑ سے نکل کر شانزے کے پاس پہنچ گیا۔ مجھے دیکھ کر وہ حیرت زدہ ہو گئی۔

''علی..... تم۔'' وہ حیرت زدہ لہجے میں بولی، پھر دوسرے ہی لمحے اس کے چہرے پر میں نے نفرت اور دکھ کے ملے جلے تاثرات ابھرتے دیکھے۔ جیسے مجھے دیکھ کر کوئی بات اسے یاد آ گئی ہو۔

''کیسی ہو تم؟'' میں نے پوچھا۔

''جب سے مجھے تمہارے بارے میں پتا چلا ہے مجھے تم سے نفرت ہو گئی ہے۔'' وہ نخوت سے بولی تو میں ٹھٹکا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ عذرا کے ''اغوا'' اور ''تاوان'' کے بارے میں بات کر رہی تھی۔ ''کیا مطلب.....؟ کیا پتا چلا ہے میرے بارے میں؟''

''تم تو ایسے انجان بن رہے ہو جیسے تم کچھ جانتے ہی نہیں۔'' اس نے طنز کیا۔

میں نے جیولری شاپ کی طرف دیکھا ماریہ ابھی تک واپس نہیں آئی تھی۔ ''شاید تم عذرا کے بارے میں بات کر رہی ہو۔''

''ہاں۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

''لیکن افسوس کہ تم کچھ بھی نہیں جانتی۔'' میں نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''جاننے کی ضرورت بھی کیا ہے، سب سامنے ہے۔'' وہ تنک کر بولی۔ ''اچھا ہوا ہے کہ مجھے تمہاری اصلیت معلوم ہو گئی ورنہ ساری زندگی مجھے پچھتاوا رہتا۔''

وہ کچھ زیادہ ہی مجھ سے بدظن ہو گئی تھی۔ میں نے دکھ اور تاسف بھری نظر اس پر ڈالی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''شانزے! مجھے افسوس ہے کہ تم مجھے سمجھنے سے قاصر رہی ہو۔ جو کچھ سامنے ہے وہ سب جھوٹ ہے۔ اصل حقیقت کیا ہے وہ میں جانتا ہوں...اور جب تم اصل حقیقت سے آشنا ہو گی تو تمہارے پیروں تلے سے زمین نکل جائے گی۔''

میں نے دیکھا کہ میری یہ بات سن کر اس کی آنکھوں اور چہرے کے تاثرات بدل گئے تھے اور وہ تجسس میں مبتلا ہو گئی تھی۔

''کیوں، ایسا کیا ہے جس کے بارے میں، میں نہیں جانتی۔''

''بہت کچھ ایسا ہے جس سے تم نا آشنا ہو اور جب تم سنو تو شاید تم یقین بھی نہ کرو۔'' میں نے کہا۔ میرا مقصد اسے اپنے باپ چودھری باسط اور بھائی شانی سے متنفر کرنا نہیں تھا لیکن اسے حقیقت نہ بتا کر میں اس کی نظروں میں گرنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ دوسری اہم بات جو میرے ذہن میں آئی تھی کہ شاید شانزے جانتی ہو کہ اسماعیل شاہد عرف چودھری ساجد کہاں موجود ہے۔ میں اس کے ذریعے چودھری ساجد تک پہنچ سکتا تھا۔

''مثلاً کیا؟'' اس نے دریافت کیا۔

''کافی طویل بات ہے۔'' میں نے کہا۔ ''کیا ہم کہیں بیٹھ کر بات چیت کر سکتے ہیں؟''

میں نے بات مکمل کر کے جیولری شاپ کی طرف دیکھا تو مجھے ماریہ دروازہ کھول کر باہر آتی دکھائی دی۔ شانزے نے کہا۔ ''تم فی الحال جاؤ، میں تم سے خود رابطہ کروں گی۔''

''کتنے بجے کال کرو گی؟''

''معلوم نہیں۔'' وہ بولی۔

''میں شام سات بجے تمہیں خود کال کرلوں گا۔'' میں نے کہا اور اس کی بات سنے بغیر ہی مڑ کر ایک طرف بڑھتا چلا گیا۔ کچھ فاصلے پر پہنچنے کے بعد میں نے مڑ کر ترچھی نظروں سے ماریہ اور شانزے کی طرف دیکھا تو وہ دونوں کار میں سوار ہو رہی تھیں۔ چند لمحوں کے بعد ان کی کار وہاں سے نکلتی چلی گئی۔ میں واپس ہوٹل کی طرف بڑھ گیا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ میں شانزے کو اس کے باپ اور بھائی کی اصلیت بتا کر صحیح کر رہا ہوں یا غلط۔ میں نے یہ سب وقت و حالات پر چھوڑ دیا تھا۔

ہوٹل پہنچ کر میں نے دوپہر کا کھانا کھایا اور اپنے کمرے میں آ کر آرام کرنے لگا۔ سارے دن کی بھاگ دوڑ سے میں تھک گیا تھا۔ سیل فون مسلسل آن رکھنا میرے لیے خطرے کا باعث تھا کیونکہ میری لوکیشن مسلسل ٹریس ہو رہی تھی لیکن یہ میری بے وقوفی یا کم عقلی تھی کہ میں نے اسی ہوٹل میں مرینہ سے فون پر بات کی تھی۔ ٹریس کرنے والوں نے یقیناً میرے سیل فون کا آخری سگنل چیک کر لیا ہوگا کہ آخری بار میرا فون اسی ہوٹل میں ہی آن ہوا تھا۔ ہوسکتا ہے اسماعیل شاہد کے کارندے اسی ہوٹل میں پہنچ جائیں۔ یہ خیال آتے ہی میں بستر سے اٹھ بیٹھا۔ مجھے اب جلد از جلد اس ہوٹل سے نکلنا تھا... چنانچہ میں نے یہ کام کرنے میں ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں کی البتہ ہوٹل سے نکلنے سے پہلے میں نے سیل فون آن کر کے اس کے سگنل آف کر دیئے تھے تاکہ مجھے شانزے کا نمبر دیکھنے کے لیے سیل فون آن کرنے کی ضرورت نہ ہو۔ اس طرح میں دوبارہ ٹریس ہو سکتا تھا۔ گوالمنڈی میں ہی مجھے ایک چھوٹے سے ہوٹل میں کمرا کرائے پر مل گیا تھا۔ اب اگر اسماعیل شاہد کے کارندے ہوٹل میں پہنچ بھی جاتے تو وہ مجھے ٹریس نہیں کر سکتے تھے۔ شام کو میں نے ایک پی سی او میں پہنچ کر اپنے سیل فون سے شانزے کے نمبر ذہن نشین کرتے ہوئے اسے کال کی لیکن شومئی قسمت، اس کا فون بزی جا رہا تھا۔ میں نے وقفے وقفے سے ٹرائی کیا اور اس کا فون مسلسل بزی رہا تو میں نے فیصلہ کیا کہ اسے تھوڑی دیر کے بعد دوبارہ ٹرائی کروں گا چنانچہ یہ سوچ کر میں پی سی او سے باہر آ گیا۔

میں ہوٹل جانے کی بجائے مٹرگشت کرنے کے لیے نکل پڑا۔ مختلف راستوں سے ہوتے ہوئے میں ایک بار پھر انارکلی بازار میں پہنچ گیا۔ انارکلی بازار میں رونق اپنے عروج پر تھی۔ ہر دکان آباد تھی اور لوگ اپنی پسند کی چیزیں خریدنے میں مصروف تھے۔ میں بھی چیزوں پر سرسری سی نظریں ڈالتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا کہ عین اسی لمحے ایک خاتون کے پاس سے گزرتے ہوئے اس کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی جس نے مجھے بے اختیار ٹھٹکنے اور رکنے پر مجبور کر دیا۔ اس خاتون نے کہا تھا۔ ''ہیلو اسماعیل! کہاں ہو تم؟''

میں نے بے اختیار چونک کر اس خاتون کی طرف دیکھا۔ وہ خاتون کوئی اور نہیں مشہور و معروف ایکٹریس اور ماڈل نیناں تھی۔ اداکارہ نیناں کے بارے میں، میں بھی جانتا تھا۔ اسے فلم انڈسٹری میں آئے دس سال ہو گئے تھے۔ وہ بے حد حسین تھی۔ اس کا چہرہ گول اور آنکھیں بڑی بڑی تھیں۔ میرے خیال کے مطابق اس کی عمر اس وقت اٹھائیس سے تیس سال کے لگ بھگ ہو گی۔ اس کے کریڈٹ پر کافی کامیاب فلمیں تھیں۔

میرے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ شاید وہ اسماعیل شاہد سے بات کر رہی ہو۔ یہ ضروری بھی نہیں تھا کہ اگر اس نے اسماعیل کا نام لیا تھا تو وہ وہی اسماعیل شاہد ہی ہو سکتا تھا۔ اسماعیل نام کے کئی لوگ اس دنیا میں موجود تھے اسی لیے تصدیق ضروری تھی لیکن میں کیسے تصدیق کر سکتا تھا اسی بات نے مجھے الجھا کر رکھ دیا۔ اداکارہ نیناں مسلسل فون پر بات کر رہی تھی۔ اس کے ساتھ دو گارڈز بھی تھے جو اس کے عقب میں چاق و چوبند کھڑے تھے۔ وہاں کئی ایسے لوگ بھی موجود تھے جو اداکارہ نیناں کو اشتیاق بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے دوبارہ غور سے اداکارہ نیناں کی گفتگو سننے کی کوشش کی۔ وہ کہہ رہی تھی۔

''دیکھو اسماعیل۔ میں کچھ نہیں جانتی۔ تم آج آ رہے ہو۔ بس۔''

دوسری طرف سے سننے کے بعد وہ چیں بہ جبیں لہجے میں بولی۔ ''اپنے سرکس کے معاملات اپنے منیجر کے حوالے

کر دو۔ وہ دیکھ لے گا۔ اچھا ٹھیک ہے۔ میں گلبرگ والی کوٹھی میں ہوں۔ تم وہیں آجانا۔''

میرے حلق سے طویل سانس نکل گیا۔ تصدیق ہوگئی تھی کہ وہ اسماعیل شاہد سے ہی بات چیت کر رہی تھی لیکن اس کے بات کرنے کا انداز ایسا تھا جیسے وہ اس کی بیوی ہو۔ یہ ممکن بھی تھا کہ وہ اسماعیل شاہد کی بیوی ہو۔ کیونکہ ایسے لوگ ایک بیوی پر اکتفا نہیں کرتے۔ اللہ نے اسماعیل شاہد تک پہنچنے میں غیب سے میری مدد کی تھی۔ جب اداکارہ نیناں جانے لگی تو میں بھی اس کا تعاقب کرنے لگا۔ وہ ایک بڑی سی جیپ پر آئی تھی اور اسی میں بیٹھ کر چلی گئی۔ انارکلی بازار سے نکل کر میں ایک آٹو رکشے والے کے پاس پہنچا۔ اُس رکشے کا ڈرائیور ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ اس کی رنگت سانولی تھی اور اس کا سر بالوں سے عاری تھا۔ آنکھوں پر موٹے شیشوں کی عینک تھی۔

''کہاں جانا ہے بیٹا؟''

''گلبرگ کالونی۔'' میں نے کہا اور آٹو رکشے میں سوار ہوگیا۔

''دو سو روپے لوں گا بیٹا۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے جواب دیا تو ڈرائیور نے آٹو رکشا اسٹارٹ کر کے آگے بڑھایا اور سڑک پر دوڑانے لگا جبکہ میں باہر کے نظارے دیکھنے لگا۔ پون گھنٹے کے بعد ڈرائیور نے مجھے گلبرگ کالونی پہنچا دیا۔ کرایہ ادا کرنے کے بعد آٹو رکشا چلا گیا تو میں آگے بڑھا اور اداکارہ نیناں کی کوٹھی تلاش کرنے لگا۔ کالونی میں کافی گہما گہمی تھی۔ میں نے کئی لوگوں کو واک کرتے ہوئے دیکھا۔ میں تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ مجھے چند بچے دکھائی دیئے جو ٹولی کی صورت میں ایک جگہ کھڑے آپس میں ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ وہ سب بچے امیر گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے کیونکہ انہوں نے قیمتی لباس پہنے ہوئے تھے۔ کچھ سوچ کر میں ان کی طرف بڑھ گیا۔

''بات سنو بچو۔'' میں نے قریب جا کر ان سے کہا تو سب خاموش ہو کر میری طرف دیکھنے لگے۔

''جی انکل۔'' بارہ، تیرہ سال کے ایک لڑکے نے جواب دیتے ہوئے استفہام کیا۔

''بیٹا! یہاں ایک ایکٹریس رہتی ہیں جن کا نام.....''

میں کہہ رہا تھا کہ اسی لڑکے نے میری بات کاٹ دی۔

''آپ غالباً نیناں آنٹی کی بات کر رہے ہیں۔''

میں نے جلدی سے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ہاں، کیا تم ان کا گھر جانتے ہو؟''

''کیا آپ ان کے رشتے دار ہیں؟'' لڑکے نے معصومیت سے پوچھا تو میں سوچ میں پڑ گیا۔ فوری طور پر جواب نہ بن پایا تو میں نے کہا۔

''نہیں، میں ان کا رشتہ دار نہیں ہوں البتہ میرا دوست ان کے گھر ملازمت کرتا ہے۔ میں اپنے دوست سے ملنے آیا ہوں۔''

لڑکے نے اثبات میں گردن ہلائی اور ایک طرف اشارہ کر۔ ئے کہا۔ ''انکل! وہ سامنے جو کار ایک کوٹھی کے باہر ری دکھائی دے رہی ہے نا، وہی کوٹھی نیناں آنٹی کی ہے۔''

میں نے اس کی بتائی سمت کی طرف دیکھا تو واقعی مجھے ایک فرلانگ کے فاصلے پر بلب کی روشنی میں ایک کار کھڑی دکھائی دی۔ میں نے اس لڑکے کا شکریہ ادا کیا اور آگے بڑھ گیا۔ قریب پہنچ کر میں نے کار کی طرف دیکھا لیکن کار میں کوئی ذی روح موجود نہیں تھا؛ پھر میں نے کوٹھی کی سمت دیکھا تو گیٹ کے ایک پلر پر ''اسلم اقبال'' نام کی نیم پلیٹ لگی ہوئی تھی۔ میں مخمصے کا شکار ہوگیا۔ لڑکے نے تو اسی کوٹھی کے بارے میں بتایا تھا کہ یہ اداکارہ نیناں کی کوٹھی ہے لیکن نیم پلیٹ پر تو کوئی اور نام لکھا ہوا تھا؛ پھر میرے ذہن میں آیا کہ ہوسکتا ہے کہ یہ نام اس کے والد یا بھائی کا ہو۔

گیٹ کے ساتھ والی ایک دیوار کے ساتھ ایک چوڑا اور گھنا درخت بھی تھا جس کی شاخیں کوٹھی کے اندر تک جا رہی تھیں۔ میں درخت کی اوٹ میں ہو کر سوچنے لگا کہ اب میں کیا کروں؟ معلوم نہیں اسماعیل شاہد کوٹھی کے اندر موجود بھی تھا یا نہیں۔ میں جلد بازی میں کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہتا تھا مبادہ کہ میں کسی مصیبت میں پھنس جاؤں لیکن میں خود پر آنے والی مصیبت سے بے خبر تھا۔

ہوا یوں تھا کہ میں درخت کی اوٹ میں کھڑا سوچنے میں مگن تھا کہ اچانک مجھے اپنے عقب میں آہٹ سنائی دی۔ میں چونک پڑا اور مڑنا ہی چاہتا تھا کہ میرے سر پر زوردار دھماکا ہوا۔ میرے حلق سے نکلتی چیخ یکلخت میرے حلق میں ہی دب گئی تھی اور میں کٹے ہوئے شہتیر کی طرح نرم زمین پر گرتا چلا گیا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے یک لخت اندھیرا چھا گیا تھا اس لیے اس کے بعد کیا ہوا مجھے کچھ ہوش نہیں رہا تھا۔

(لمحہ بہ لمحہ بدلتے واقعات پر مشتمل داستان جاری ہے)

# ایک تھی حسینہ

محترم مدیر
السلام علیکم!
ایک اور سچ بیانی ارسال ہے۔ یہ سونیا کی زبانی ہے مگر حسینہ کی کہانی ہے۔ ہم سب نادانستگی میں ایسا بھی کچھ کرجاتے ہیں جو کسی اور کے دل کا ناسور بن جاتا ہے۔ کاش ہم زبان ہلاتے ہوئے احساس کرلیا کریں۔

فرح انیس
(کراچی)

''سونیا سونیا اٹھو۔''

مجھے نیند میں ایسا محسوس ہوا جیسے مجھے کوئی آواز دے رہا ہو میں گھبرا کر اٹھی تو سامنے پریشان سے کھڑے اپنے شوہر امین کو دیکھا۔ انہیں یوں اچانک دیکھ کر میں ڈر گئی۔

''کیا ہوا۔'' میں بے اختیار گھبرا کر بولی پھر میری نگاہ دیوار پر لگی گھڑی پر گئی جو رات کے چار بجا رہی تھی۔ امین کے چہرے پر اڑتی ہوائیوں نے مجھے کچھ گڑبڑ کا اشارہ دیا تھا۔

''امین سب خیریت ہے نا؟'' میرا دماغ اپنی ساس کی طبیعت پر گیا تھا کیونکہ وہ آج کل بہت زیادہ بیمار رہی تھیں۔

''حسینہ کا انتقال ہوگیا ہے۔'' لفظ نہیں تھے بم تھا جو میرے اعصاب پر آکر گرا تھا۔ مجھے لگا امین نے جو بولا اس کو سننے میں مجھ سے غلطی ہوگئی ہے۔

''کیا بول رہے ہیں، سمجھ نہیں آیا؟'' میں امین کی بات پر ناسمجھی سے انہیں دیکھتی ہوئی بولی۔

''حسینہ اس دنیا میں نہیں رہی۔'' امین مجھے شانوں سے تھامتے ہوئے بولے۔

میری عزیز از جان بہن اس دنیا میں نہیں رہی، مجھے لگ رہا تھا میرا دماغ سن سا ہوگیا ہے اور ساعتیں مفلوج ہوگئیں مگر میری آنکھ سے ایک آنسو کا قطرہ نہیں ٹپکا تھا۔

میرا ہاتھ پکڑ کے امین مجھے باہر کار پورچ میں لے آئے اور میں کسی روبوٹ کی مانند ان کے ساتھ چلتی ہوئی باہر آگئی تھی۔ وہ مجھے پسنجر سیٹ پر بٹھا کر گاڑی اسٹارٹ کرنے لگے۔

مجھے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ امین کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے یا پھر کسی نے یہ بھیانک مذاق کیا ہے۔ اگر یہ بے ہودہ حرکت حسینہ کی ہوئی تو میں اسے معاف نہیں کروں گی، میں دل ہی دل میں اپنی بڑی بہن حسینہ سے سخت خفا ہو رہی تھی۔

گاڑی ایک جھٹکے سے میرے میکے کے آگے رکی جہاں کچھ لوگوں کے ساتھ بھائی اور ابو کھڑے تھے۔

میں گاڑی سے اتر کر بغور اپنے باپ بھائی کے چہرے دیکھنے لگی جو مجھے اس وقت بے حد رنجیدہ سے معلوم ہوئے، میرے ابو کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

میں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے گھر کے اندر کی جانب بڑھی جہاں پر میری ماں کو میری بھابی سنبھال رہی تھیں۔ میری ماں شدت غم سے نڈھال ہوئی جا رہی تھیں مگر میری متلاشی نگاہیں حسینہ کو ڈھونڈ رہی تھیں۔

''حسینہ کہاں ہے۔'' میں قدرے بلند آواز سے بولی جس پر وہاں بیٹھیں عورتوں کی آنکھوں میں میرے لیے ہمدردی آگئی تھی، میں متوحش سی اپنی ماں کو بے حال دیکھ رہی تھی۔

میری نگاہ بے اختیار سامنے کی جانب اٹھی تو میں کھڑے قد سے وہیں ڈھے سی گئی۔ میں خود کو گھسیٹتے ہوئے اپنی بہن کے پاس لے گئی جو آنکھیں بند کیے پُرسکون سی لیٹی تھی۔

''حسینہ اٹھو۔'' میں آہستہ سے سرگوشی میں بولی مگر دوسری جانب جواب ندارد تھا۔

''میری بچی، حسینہ مجھے چھوڑ کر چلی گئی۔'' امی میری

پشت پر سر رکھتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

میرا دماغ جو ابھی تک کچھ بھی سمجھنے سے قاصر تھا سامنے ساکت لیٹی حسینہ کو دیکھ کر بیدار ہوگیا۔ میری ساری حسیات جاگ گئیں اور پھر جو میں بکھری تو مجھے سنبھالنا مشکل ہوگیا تھا، میرے ایک آنسو پر تڑپ جانے والی میری بہن مجھے روتا بلکتا چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے چلی گئی تھی۔

☆☆☆

میں کافی دیر سے چھت پر کھڑی منڈیر سے لگی ڈوبتے سورج کا منظر دیکھ رہی تھی۔ آج حسینہ کو دنیا سے گئے ایک ہفتہ ہو چکا تھا۔

کیسا لگتا ہے کسی بہت اپنے کا دنیا سے چلے جانا، لگتا ہے وہ ہر چیز ویران کر گیا ہے۔ چپے چپے سے مجھے ویرانیت برستی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ لگتا تھا ہر چیز سے اداسی ٹپک رہی ہے۔

میں بوجھل دل لیے نیچے چلی آئی جہاں صحن میں امی سر جھکائے تخت پر بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھیں۔ آنسو ان کی آنکھوں سے مستقل رواں تھے۔ میں چپ چاپ ان کے برابر آکر بیٹھ گئی۔

وہ تسبیح پڑھ کر فارغ ہوئیں تو ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے لگیں۔ دعا سے فارغ ہونے کے بعد وہ مجھ پر پھونکنے لگیں، یہ ان کا معمول تھا۔ تبھی ایک اپنا پرانا جملہ ذہن میں تازہ ہوا۔ ''ارے کوئی حسینہ پر بھی پڑھ دے تاکہ اسے بھی نظر نہ لگے۔''

''میری بچی کیا سوچ رہی ہے۔'' امی پیار سے سر پر ہاتھ پھیرتی ہوئی بولیں، میرے دل کو کچھ ہوا میں چونک کر امی کو دیکھنے لگی۔

''کچھ نہیں، کیا سوچنا ہے۔'' میرے لہجے میں تلخی خود بہ خود در آئی، امی یکدم چپ سی ہوگئیں میں اٹھ کر اندر چلی آئی۔

اگلے دن شام میں امین مجھے لینے آگئے۔

''اب کب آؤ گی۔'' جاتے ہوئے امی بڑی آس سے مجھے دیکھتی ہوئی بولیں۔

''دو چار دنوں میں آجاؤں گی۔'' صحن میں لگے آم کے پیڑ کو دیکھتے ہوئے آہستگی سے بولی، کیریاں پک چکی تھیں۔ ابھی حسینہ ہوتی تو مچل جاتی، میں سوچنے لگی۔

''کہاں گم ہو۔'' امی میرا کندھا ہلاتے ہوئے بولیں۔

''کہیں نہیں یہیں ہوں۔'' کہہ کر میں امی بھابی سے مل کر باہر آگئی جہاں گاڑی میں امین بیٹھے میرا انتظار کر رہے تھے۔

نظام زندگی کسی کے چلے جانے سے رکتا نہیں ہے، وہ چلتا رہتا ہے۔ گھڑی کی سوئیاں تو اپنی رفتار سے چلتی ہیں، یہ تو ہمارے دل کی سوئی ہوتی ہے جو کسی ایک کے چلے جانے سے اس پر اٹک سی جاتی ہے۔

میں جو بظاہر معمول زندگی میں آچکی تھی مگر میرا ذہن و دل اس جانے والے میں اٹک سا گیا تھا۔ شوہر بچوں کے کام کے دوران بھی میری سوچیں حسینہ کو سوچتی رہتیں یہ ایسا دھچکا تھا جس سے سنبھلنے کے لیے مجھے ایک وقت درکار تھا۔

امین کے آفس جانے کے بعد میرے پاس فراغت تھی بچے اسکول گئے ہوئے تھے گھر کے کام کاج کے لیے نوکر چاکر تھے تو میرے پاس وقت ہی وقت تھا۔

میں اپنے کمرے میں چلی آئی۔ سر میں شدید درد ہو رہا تھا، میں بیڈ پر بیٹھ کر سائیڈ ٹیبل کی دراز سے سر درد کی گولی نکال رہی تھی کہ میری نظر ایک لفافے پر پڑی۔ حسینہ نے اپنے انتقال سے کچھ دن پہلے یہ خط مجھے بھیجا تھا اور اس خط کو پڑھنے کے بعد میری ہمت نہ تھی کہ میں حسینہ کا سامنا کرتی۔

یہ خط نہیں تھا آگ کا انگارہ تھا۔ اس خط کو ایک بار پڑھ کے دوبارہ پڑھنے کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔ میں خط واپس دراز میں ڈال کر ماضی میں گزارے اس وقت کو یاد کرنے لگی جو میں نے اور حسینہ نے ایک ساتھ گزارا تھا۔

☆☆☆

''اف، حد ہوتی ہے، تمیز نام کی کوئی چیز ان میں نہیں۔'' حسینہ ساتھ ساتھ چلتے لڑکوں کو دیکھ کر جو گھور گھور کر ہماری طرف ہی دیکھ رہے تھے، دھیمے سے بڑبڑائی۔

''اب ہر کوئی میری بہن کی طرح حسین تو ہوتا نہیں۔'' میری بات پر حسینہ کے لبوں پر ہنسی پھیل گئی۔

''کہاں رہ گئی تھیں تم دونوں، کب سے امی پریشان ہو رہی ہیں۔'' گھر میں داخل ہوتے ہی عالیہ بھابی شروع ہوگئیں۔

''چلو جی تھانے دارنی صاحبہ کھڑی ہوگئیں۔'' میں دھیمے سے بڑبڑائی۔ میری بات پر حسینہ ہنسی ضبط کرتی ہوئی آگے بڑھ گئی مگر عالیہ بھابی اس کے ہنسنے پر اسے گھورنے لگیں جو مجھے کافی ناگوار گزرا۔

''بس شاپنگ میں دیر ہوگئی تھی۔'' میں روکھائی سے بولتی ہوئی امی کے کمرے کی جانب بڑھ گئی تھی جہاں حسینہ امی کو ساتھ لائے کپڑے دکھا رہی تھی۔

''ایک نمبر کی فسادی طبیعت کی ہیں ہماری بھابی، معمولی معمولی بات پر فساد کھڑا کرنا تو کوئی ان سے سیکھے۔'' میں بڑبڑاتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ ''اور تم کیوں منہ پر ٹیپ لگائے پھرتی ہو وہ ہمیشہ تمہیں ایسے گھور کر دیکھتی ہیں یا بولتی ہیں کہ تن بدن میں آگ لگ جائے تمہارے منہ میں زبان نہیں ہے کیا۔'' میں حسینہ کو غصے سے گھورتے ہوئے بولی۔

''بہت اچھا کرتی ہے جو کسی بات کا یہ جواب نہیں دیتی۔ ویسے بھی اسے دوسرے گھر جانا ہے۔ کیا وہاں جا کر بھی یہ زبان چلائے گی اور عالیہ ویسے بھی بڑی بھابی ہے۔ بڑوں کو جواب دینا بھی نہیں چاہیے۔'' امی میری بات پر مجھے ٹوکتے ہوئے بولیں۔

''اپنے بڑے پن کا وہ خود تو خیال کرتی نہیں اور امی یہ آپ نے خوب کہی، بڑا کچھ بھی کرے چھوٹا آگے سے اس کی غلطی پر بھی کچھ نہ کہے۔ یہ بھی میرے نزدیک غلط بات ہے کہ ہم غلط کو غلط نہ کہیں۔'' میں امی کی بات کی تردید کرتے ہوئے بولی، مگر اس سارے عمل میں حسینہ چپ چاپ مسکراتی ہوئی کپڑے دیکھنے میں مگن تھی مجھے اس پر غصہ آیا مگر میں ضبط کر گئی۔

''کچھ ہی دنوں میں اس کی شادی ہونی ہے فضول میں برا بننے کی اسے ضرورت نہیں ہے۔'' امی قطعیت سے بولیں۔

''یہ خوب کہی امی آپ نے، بھابی کا رویہ شروع سے اس کے ساتھ ایسا ہے۔ وہ کچھ بھی برا برتاؤ کریں مگر یہ اس لیے چپ رہے کہ ابھی اس کی شادی ہونی ہے۔ یہ زیادہ نہ بولے ورنہ بھابی بدنام کر دیں گی، معذرت کے ساتھ، وہ اس کی بند زبان پر بھی اسے کون سا بخش دیتی ہیں۔''

ہمیشہ کی طرح میں آج چپ نہ رہ سکی مگر حسینہ ایسے بیٹھی تھی جیسے اس کی نہیں بلکہ کسی اور کی بات ہو رہی ہو۔

''اب بحث ختم کرو کھانا لگاؤ بہت بھوک لگ رہی ہے۔'' امی کہتی ہوئی کھڑی ہوگئیں۔ میں افسوس سے ان کو دیکھتے رہ گئی۔

ہم دو بہنیں اور ایک بھائی ہیں۔ بڑے بھائی سہیل جو شادی شدہ تھے پھر حسینہ اور پھر اس سے ایک سال چھوٹی میں تھی۔

## جزائر کیمین Cyman Islands

مغربی کیریبین میں تین بڑے اور متعدد چھوٹے جزائر کا مجموعہ۔ اس کے شمال میں کیوبا اور جنوب مشرق میں جمیکا ہے۔ رقبہ 100 مربع میل یا 160 مربع کلومیٹر، زبان، انگریزی، مذہب، عیسائیت دارالحکومت، جارج ٹاؤن، ویسٹ بے دوسرا بڑا شہر ہے۔ برطانیہ کا زیر اثر ایک خود مختار علاقہ ہے۔ اس کا انتظام گورنر اور ایگزیکٹو کونسل چلاتی ہے۔ اس کی اپنی دستور ساز اسمبلی ہے۔ سبزیاں اہم زرعی پیداوار ہیں۔ سمندری کچھوا بھی پالا جاتا ہے۔ سیاحت آمدنی کا بڑا ذریعہ ہے۔ کرسٹی کیمین آئی لینڈز ڈالر، 1503ء میں کولمبس نے سیاحت کی 1670ء میں برطانیہ نے قبضہ کرلیا۔ 1962ء میں برطانیہ کی نوآبادی بنالیا گیا۔

## کینبرا Canberra

آسٹریلیا کا دارالحکومت۔ جنوب مغربی آسٹریلیا میں واقع ہے۔ اس جگہ کا انتخاب 1908ء میں ہوا۔ 1913ء میں اس شہر کی بنیاد رکھی گئی۔ یہ آسٹریلیا کا دوسرا دارالحکومت ہے۔ پہلا دارالحکومت ملبورن تھا۔ 1927ء میں یہاں پہلی بار پارلیمنٹ کا اجلاس ہوا۔ دوسری جنگ عظیم میں عارضی طور پر دارالحکومت کو پھر ملبورن میں تبدیل کر دیا گیا۔ یہاں ایئرپورٹ، ریلوے اسٹیشن، دو یونیورسٹیاں 1946-1989ء اور پارلیمنٹ ہاؤس 1988ء بھی ہیں۔

## کیمیائے سعادت

امام غزالی 1058-1111ء نے اسّی سے زیادہ کتابیں تحریر کی ہیں۔ ان میں سے احیائے العلوم کو سب سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ اسی کتاب کا خلاصہ کیمیائے سعادت ہے، جس میں عبادات، مہلکات، منجیات پر مبسوط اور لطیف تبصرہ ہے۔ علاوہ اس کے اس میں قرون وسطیٰ تک اسلامی فکر و نظر کا کامل لب لباب بھی دیا گیا ہے۔ اس کی زبان بہت سلیس ہے۔

''حسینہ آئس کریم کھانے چلیں۔'' یونیورسٹی سے واپسی پر میں اس سے بولی، میں اور حسینہ اکنامکس میں ماسٹرز کررہی تھیں۔

''اتنی ٹھنڈ ہے، ویسے بھی ٹائم دیکھو کتنی دیر ہوگئی ہے۔'' وہ وقت کا احساس دلاتے ہوئے بولی۔

آج کلاس لیٹ آف ہوئی تھی اور مغرب بھی ہونے والی تھی یونیورسٹی سے نکلیں تو سامنے آئس کریم پارلر دیکھ کر میرا دل للچا گیا۔

''سونیا، فضول میں بھائی کو باتیں بنانے کا موقع ملے گا تم جانتی تو ہو پلیز چلو۔'' وہ منتجی لہجے میں بولی۔

''تمہارا دماغ خراب ہے جو تم ان سے ڈرتی ہو، وہ ہوتی کون ہیں فضول کے سوال جواب کرنے والی۔'' میں اسے ڈانٹتے ہوئے بولی۔

''اب پلیز چلو۔'' میں اس کا ہاتھ پکڑ کے بچوں کی طرح ضد کرتے ہوئے بولی۔

میری بات پر ناچار وہ آئس کریم پارلر میں داخل ہوگئی۔ ابھی ہم آرڈر دے کر اِدھر اُدھر کی باتیں کررہی رہے تھے کہ اچانک میرا ہاتھ حسینہ نے زور سے دبایا۔

''سونیا سامنے دیکھو ثاقب بیٹھا ہے۔'' وہ سرگوشی میں مجھ سے بولی۔ میں بھی اس کے کہنے پر اِدھر دیکھنے لگی۔ ہم سے تھوڑے فاصلے پر اگلی ٹیبل پر ثاقب اپنے کسی دوست کے ساتھ بیٹھا تھا۔

ثاقب ہمارا کلاس فیلو تھا اور حسینہ ثاقب کو پسند کرتی تھی۔ میں حسینہ کو دیکھنے لگی جس کی آنکھوں میں ثاقب کو دیکھتے ہی محبت کے دیپ جل اٹھے تھے۔

''تم کو ہی دیکھ رہا ہے۔'' میں سرگوشی میں بولی۔

''نہیں تو۔'' مسکرا کر اس نے تردید کی۔

''ارے واقعی تم کو دیکھ رہا تھا، تم نے غور نہیں کیا۔ وہ کلاس میں بھی تم کو چپکے چپکے دیکھتا ہے۔ میں آئس کریم پارلر سے نکلتی ہوئی اس سے بولی۔

☆☆☆

''کیا ہوا ابھی تک تم سوئی کیوں نہیں۔'' میں نے کروٹ لی تو حسینہ کو جاگتے پایا۔ ''رات کے تین بج رہے ہیں صبح یونیورسٹی بھی جانا ہے۔ سوجاؤ۔'' میں اسے وقت کا احساس دلاتے ہوئے بولی۔

''مجھے نیند نہیں آرہی۔'' حسینہ بیزاریت سے بولی۔

''میں سوچ رہی ہوں، ہمارا یہ آخری سمسٹر ہے۔ چار سال کیسے گزرے پتا ہی نہیں چلا۔ اب یہ بھی مکمل ہوجائے گا پیچھے بس یادیں رہ جائیں گی۔'' وہ گلوگیر لہجے میں بولی۔

میں سمجھ سکتی تھی وہ کن یادوں کی بات کررہی تھی۔ وہ ثاقب کی بات کررہی تھی جسے وہ پچھلے چار سال سے دیوانگی کی حد تک چاہتی آرہی تھی مگر اظہار کی ہمت نہ تھی۔

اس کی بات پر میں گہرا سانس لے کر رہ گئی۔ ''فکر نہ کرو آنے والا وقت تمہارے لیے کچھ اچھا ہی لائے گا۔'' میری تسلی پر وہ اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی۔

کچھ دیر بعد میں تو سوگئی مگر وہ جاگتی رہی نتیجہ صبح اس کی آنکھوں میں نیند بھری تھی۔

لیکچر کے دوران بھی وہ اونگھتی رہی۔ ''حسینہ کی بچی کیا کررہی ہو۔'' میں اسے کہنی مارتے ہوئے بولی جس پر وہ گڑبڑا کر زبردستی آنکھیں کھول کر سامنے کھڑے سر کو یہ تاثر دینے لگی جیسے سب سے زیادہ غور سے وہ ہی ان کا لیکچر سن رہی ہو حالانکہ میں جانتی تھی کہ نیند کی وجہ سے سب کچھ اس کے سر کے اوپر سے گزر رہا تھا۔

☆☆☆

''ثاقب کو دیکھا تھا مستقل کلاس میں تمہیں ہی دیکھ رہا تھا۔''

''اچھا، میں نے غور نہیں کیا۔'' حسینہ میری بات پر بولی۔

''ہاں تم کو سونے سے فرصت جو نہ تھی۔'' میں حسینہ کا مذاق اڑاتے ہوئے بولی۔ ''میری بہن ہے ہی اتنی خوبصورت کہ اسے سب دیکھتے رہ جاتے ہیں۔'' میری بات پر وہ آنکھیں پھاڑے مجھے دیکھنے لگی۔

چھٹی کا دن تھا ہم سب ناشتے کی ٹیبل پر اکھٹے بیٹھے تھے۔

''آپ نے کیا سوچا ہے سونیا کے بارے میں۔'' سہیل بھائی امی سے مخاطب ہوئے۔

☆☆☆

''حسینہ بڑی ہے پہلے میں چاہتی ہوں اس کی ہوجائے۔'' امی کی بات پر سہیل بھائی ہنکارا بھر کے رہ گئے۔

''میں تو یوں بول رہا ہوں کہ رشتہ بہت اچھا آیا ہوا ہے۔ امین بہت اچھا لڑکا ہے خوبرو ہے، پڑھا لکھا اور کھاتے پیتے گھرانے کا اکلوتا چشم و چراغ ہے ہماری سونیا راج کرے گی۔''

''ٹھیک ہے پیپرز ہوجائیں ان دونوں کے پھر دیکھتے

ہیں۔'' ناشتا کرتے ہوئے ابو بولے۔

امین کا رشتہ ابو کے دوست کے توسط سے آیا تھا۔ میں نے ایک محفل میں امین کو دیکھا تھا۔ اسے پانا کسی بھی لڑکی کا خواب ہوسکتا تھا۔ میں اس آنے والے رشتے سے بے انتہا خوش تھی۔

''ہاں تب تک حسینہ کا بھی رشتے ہوجائے گا۔'' بھائی ناشتا کر کے اٹھ چکے تھے تب امی مجھ سے بولیں۔

''اوہو.....'' بھابی کے کھینچ کر بولنے پر میں ناگواری سے بھابی کو دیکھنے لگی۔ جس پر بھابی ڈھٹائی سے ہنسنے لگیں مگر امی نے ہمیشہ کی طرح اس بار پھر ان کی اس حرکت کو نظر انداز کر دیا اور حسینہ وہ تو تھی ہی مٹی کی مادھو۔

☆☆☆

''وقت کیسے گزرا پتا ہی نہیں چلا، آج آخری پیپر بھی ہوگیا اور اب ہم یونیورسٹی کو خیر باد کہہ دیں گے۔'' میری کلاس فیلو ندا کلاس سے نکلتے ہوئے اداسی سے بولی۔

''ہاں ٹھیک کہا تم نے، اچھا وقت ایسے ہی تیزی سے گزر جاتا ہے۔ میں یونیورسٹی کے لان کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ''ابھی کل کی ہی تو بات لگتی تھی جب ہم آئے تھے۔ یہ یونیورسٹی ہمیں خوش آمدید کہہ رہی تھی اور آج ہم اس یونیورسٹی کو خیر باد کہہ رہے ہیں۔''

پھر میں کلاس سے نکلتی حسینہ کی جانب متوجہ ہوگئی جو میری طرف ہی آرہی تھی۔

''ندا میں آتی ہوں۔ میں اس سے ایکسکیوز کرتی ہوئی حسینہ کی طرف بڑھ گئی اور حسینہ کا ہاتھ پکڑ کے دوسری جانب لے گئی۔

''کیا ہوا تم نے بولا تھا ثاقب سے بات کرو گی کہ وہ اپنی فیملی کو ہمارے گھر بھیجے۔'' میں بے چینی سے بولی۔

''ہاں میں کرتی ہوں کوئی موقع تو مناسب ہو۔'' وہ آہستگی سے بولی۔

''آج آخری پیپر ہے اب اور کون سا موقع آئے گا۔'' میں ناراضگی سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

اس سے پہلے کہ میں کچھ بولتی ثاقب وہیں چلا آیا۔

''ہیلو گرلز کیا ہو رہا ہے۔'' اس کو اچانک وہاں دیکھ کر حسینہ گڑبڑا سی گئی۔

''کیا ہوا کیا کوئی خفیہ بات چیت چل رہی تھی۔'' وہ حسینہ کی گڑبڑاہٹ پر شوخی سے بولا جس پر وہ جھینپ سی گئی۔

''کل ہم سب فرینڈز لنچ پر چل رہے ہیں، تم لوگوں نے بھی آنا ہے۔'' وہ مجھے اور حسینہ کو دیکھتے ہوئے بولا۔

''ٹھیک ہے پھر کل ملتے ہیں۔ چلیں حسینہ، بہت دیر ہوگئی۔'' میں مسکراتی ہوئی خاموش کھڑی حسینہ سے بولی اور ثاقب کو خدا حافظ کہتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ سارا راستہ حسینہ خاموش رہی۔

''مجھے بات کرنا خود سے مناسب نہیں لگ رہا سونیا۔'' گھر آکر وہ کمرے میں مجھے دیکھتی ہوئی بے چینی سے بولی۔

''کیوں اس میں کیا قباحت ہے۔'' میں اس کی بات پر بولی۔ ''تم خود سوچو وہ لڑکا ہو کر پہل نہیں کر رہا اور میں لڑکی ہو کر منہ کھول کر پوچھ لوں کہ تم کب اپنے ماں باپ کو بھیج رہے ہو۔ تم خود سوچو۔ مجھے بہت معیوب لگ رہا ہے۔'' وہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ اس کی بات پر میں بھی سوچ میں پڑ گئی۔

''مجھے تو لگتا ہے جیسے صرف میں ہی محبت کرتی ہوں اس سے، وہ نہیں کرتا۔'' حسینہ بولی۔

''ارے نہیں بابا وہ بھی تم سے محبت کرتا ہے۔'' میں اس کی بات پر بولی تو اس کا چہرہ جگمگا سا گیا۔

''میں خود آج ثاقب سے بات کروں گی، تمہارا بات کرنا نامناسب ہے مگر میرا پوچھنا تو نامناسب نہیں ہے نا۔'' اگلے دن لنچ کے لیے وہ تیار ہو رہی تھی جب میں اس کے پاس آکر بولی۔

''تم سچ بول رہی ہو۔'' میری آنکھوں میں بے یقینی سے دیکھتی ہوئی وہ بولی۔

''تم کو لگ رہا ہے میں جھوٹ بولوں گی۔'' میری بات پر وہ خوشی سے مجھ سے لپٹ گئی میں بھی مسکرا دی۔

پارٹی میں حسینہ کی نظریں مستقل مجھ پر تھیں کہ میں کب ثاقب سے بات کرتی ہوں۔ مجھے اس کی بیتابی پر ہنسی آرہی تھی میں خود موقع کی تلاش میں تھی کہ کوئی موقع ملے اور میں اس سے بات کروں۔

واپسی میں دیر ہوگئی تھی ہماری کلاس فیلو سارا نے ہمیں اپنی گاڑی میں ڈراپ کیا تھا۔

حسینہ گاڑی میں بھی بے چین تھی۔ میں جانتی تھی وہ شدت سے گھر آنے کی منتظر تھی تاکہ ثاقب کا جواب جان سکے۔ امی سے مل کر ان کو پارٹی کی تفصیل بتا کر جب میں کمرے میں داخل ہوئی تو وہ کمرے میں ٹہلتی ہوئی شدت سے میری منتظر تھی۔ ''کیا ہوا کیا جواب دیا تھا ثاقب نے۔''

وہ مجھے دیکھتے ہی شروع ہوگئی۔

''ایک منٹ چینج کرلوں پھر کرتی ہوں بات۔'' میں کہتی ہوئی واش روم میں گھس گئی۔ کپڑے بدل کر آئی تو وہ میرے نکلنے کا انتظار کررہی تھی۔

''بتاؤ نا کب سے پوچھ رہی ہوں۔'' وہ ناراض ہوتے ہوئے بولی۔

مجھے بتانے کی ہمت نہ تھی مگر پھر بھی بتانا ہی تھا۔ میں اس کے ساتھ بیڈ پر بیٹھ گئی۔

''حسینہ وہ اپنی کزن سے محبت کرتا ہے اور کچھ وقت بعد شادی ہونے والی ہے۔'' میں دھیمے سے بولی تو میری بات پر وہ منہ کھولے مجھے یوں دیکھنے لگی جیسے میں مذاق کر رہی ہوں۔

''وہ تمہیں پسند نہیں کرتا تھا۔'' میں بولی۔

''مگر تم تو کہتیں تھیں کہ وہ مجھے ہی دیکھتا ہے۔ تم اتنے یقین سے مجھ سے بولتی تھی سونیا کہ تمہارے یقین پر مجھے یقین آگیا تھا۔

''وہ دیکھتا تو تمہاری طرف ہی تھا مگر.....'' میں لڑکھڑاتے لہجے کے ساتھ بولی۔ ''ہوسکتا ہے ہم کو غلط فہمی ہوئی ہو۔ میں آہستگی سے بولی۔ جس پر وہ ٹوٹے دل سے میری شکل دیکھنے لگی۔

''کتنے آرام سے تم ساری بات کرکے اب یہ بول گئی کہ ہمیں غلط فہمی ہوئی ہوگی۔''

''بھول جاؤ اسے۔'' میری بات پر وہ مجھے حیرانگی سے دیکھنے لگی۔

''کتنے آرام سے تم بول رہی ہو سونیا کہ بھول جاؤ۔''

ہاں کیونکہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ میرے درشتگی سے بولنے پر وہ حق دق میری شکل دیکھنے لگی۔

''کہیں تم تو پسند نہیں کرتیں، جو تم ایسا کہہ رہی ہو۔'' وہ مشکوک نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ جس پر میں اسے افسوس سے دیکھ کر رہ گئی۔

اس بات کے بعد سے ہم دونوں میں بول چال بالکل بند ہوگئی تھی۔ ہم ایک کمرے میں اجنبیوں کی مانند رہ رہے تھے۔

مجھے سب سے زیادہ دکھ حسینہ کے رویے پر تھا جس کو اپنی کہی بات پر پشیمانی بھی نہ تھی۔

میری امین سے بات پکی ہوگئی تھی۔ امین جیسا رشتہ ہمارے متوسط گھرانے کے لیے نعمت تھا۔ میں بھی اس رشتے پر بہت خوش تھی کیونکہ امین نا صرف شکل وصورت بلکہ عادت واطوار کے بھی بہت اچھے تھے، دولت کی ریل پیل ہونے کے باوجود امین کے انداز میں غرور نہ تھا۔

شادی دو ماہ بعد طے ہوگئی تھی۔ گھر میں شادی کی تیاریاں چل رہی تھیں۔

حسینہ بہت چپ چپ سی رہنے لگی تھی، اس کی خاموشی کو سب ہی محسوس کرنے لگے تھے۔

رات شاپنگ سے آکر میں کافی تھک گئی تھی اس لیے جلدی سوگئی۔ رات کے کسی پہر میری آنکھ سسکیوں کی آواز پر کھلی جس پر میں یک دم ہڑبڑا سی گئی۔

حسینہ گھٹنوں میں چہرہ چھپائے رو رہی تھی۔

''حسینہ کیا ہوا ایسے کیوں رو رہی ہو۔'' میرا دل اس کو یوں روتا دیکھ کر پسیج سا گیا۔

''مجھے معاف کردو سونیا میں بہت شرمندہ ہوں۔ مجھے ایسی بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کے روتے ہوئے بولی۔

میری اتنے دنوں کی ناراضگی اس کے اس طرح سے رونے پر لمحوں میں ختم ہوگئی تھی۔

''پگلی بہنوں سے کون معافیاں مانگتا ہے۔'' میں اس کو خود سے لگاتی ہوئی بھیگی آنکھوں سے بولی، میرا دل اس لمحے شدت سے اس کی خوشیوں کے لیے دعا گو تھا۔

☆☆☆

میں شادی ہوکر امین کے گھر چلی آئی۔ میرے ساس سسر میرا بہت زیادہ خیال رکھتے اور امین تو تھے ہی میرے دیوانے۔ میں بھی ساس سسر کو ماں باپ کا درجہ دیتی۔ کسی چیز کی تنگی نہ تھی۔ نوکر چاکر ہمہ وقت موجود ہوتے۔ میری خوشحالی دیکھ کر میرے اکثر رشتے دار حسد میں مبتلا ہوگئے تھے۔

میری شادی کے کچھ ماہ بعد حسینہ کا رشتہ امین کے کزن فائق سے ہوگیا تھا۔

میں اور میرے گھر والے اس رشتے سے بہت خوش تھے۔ شادی کے اوائل دنوں میں حسینہ کے چہرے کی چمک اس کی خوشی کا پتا دیتی تھی۔

مگر وقت کے ساتھ ساتھ یہ چمک ماند پڑتی چلی گئی اور پھر اس نے میکے آنا جانا بھی کم کردیا تھا۔ ہمارے کہنے پر وہ آتو جاتی مگر لگتا تھا وہ وہاں موجود ہوکر بھی موجود نہیں۔ اس کے لبوں کی خاموشی مجھے بے چین کردیتی تھی۔ میں نے

کئی بار اس سے تنہائی میں پوچھنے کی کوشش کی تھی۔ مگر وہ سب ٹھیک ہے کہہ کر ٹال جاتی۔ یوں ہی وقت گزرتا چلا گیا اور اس دوران میں دو بچوں کی ماں بن گئی تھی۔

میرے بچے اب اسکول جانے کے قابل ہوگئے تھے مگر حسینہ کے ہاں ابھی تک اولاد نہیں ہوئی تھی۔ میں ہر نماز میں اپنی بہن کی خوشیوں کی دعا کرتی تھی۔ کوئی چیز تھی جو مجھے اندر سے بے چین رکھتی تھی اور اب جب میں اس کے گھر جا کر اس سے ملنے کا ارادہ کر رہی تھی اسی دوران اس کا خط مجھے ملا۔ خط پڑھنے کے بعد مجھ میں حوصلہ نہ تھا کہ اس کا سامنا کر پاتی، اس ہی شش و پنج میں دو دن گزر گئے تھے اور دو دن بعد میری بہن برین ہیمبرج کی وجہ سے ہم سب کو چھوڑ گئی تھی۔

☆☆☆

مما مما دیکھیں مجھے اسٹار ملا ہے۔ میری پانچ سالہ بیٹی زارا میرا ہاتھ پکڑ کے مجھے متوجہ کرتے ہوئے بولی جس پر میں چونک کر ماضی سے حال میں چلی آئی۔

''ارے واہ میری گڑیا کو اسٹار ملا ہے۔'' میں اسے بھینچ کر پیار کرتے ہوئے بولی۔ سامنے سات سالہ مزمل منہ بسورے کھڑا تھا جس پر مجھے بے ساختہ ہنسی آگئی۔

''آپ بھی آجاؤ مما کی جان۔'' میں بانہیں وا کیے بولی تو وہ بھاگ کر میرے سینے سے لگ گیا۔ میں اپنے دونوں بچوں کو پیار کرنے لگی۔

موسم سرما کی چھٹیاں آئیں تو بچے نانی کے گھر رہنے کی ضد کرنے لگے۔

امی کے بھی کئی بار فون آچکے تھے۔ وہ مجھے رہنے کے لیے بلا رہی تھیں جبکہ میرا دل نہیں چاہ رہا تھا وہاں جانے کو مگر امی کے بہت اصرار پر میں ناچار راضی ہوئی تھی۔

جس دن مجھے امی کے ہاں جانا تھا اس رات امین نے کہا تھا کہ پہلے وہ کہیں ڈنر پر لے کر جائیں گے پھر واپسی میں وہ امی کے ہاں ڈراپ کردیں گے۔

میرا دل تو کہیں بھی جانے پر خوش نہ تھا مگر بچوں کی خوشی کی خاطر میں کھڑی ہوگئی۔

میں چینج کر کے آئینے کے سامنے بال بنا رہی تھی کہ دروازے پر ناک ہوا، امین اٹھ کر دروازہ کھولنے لگے سامنے ملازمہ کھڑی تھی۔

''وہ صاحب جی فائق صاحب آئے ہیں۔'' ملازمہ کی بات پر میرا برش کرتا ہاتھ ساکت رہ گیا تھا۔

امین باہر چلے گئے تھے جبکہ میرے اندر بھانبھڑ جل رہے تھے مجھے لگ رہا تھا اتنی ٹھنڈ میں بھی آگ کے شعلوں نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا ہو۔

میں تیزی سے کمرے سے باہر نکلی اور سیدھی ڈرائنگ روم میں پہنچی جہاں وہ صوفے پر بیٹھا امین سے بات کر رہا تھا۔ اس کا اتنا پرسکون انداز دیکھ کر میرا دماغ گھوم گیا۔

''تمہاری ہمت کیسے ہوئی ادھر آنے کی۔'' میں چنگھاڑتی ہوئی بولی جس پر وہ گھبرا کر کھڑا ہوگیا۔

''وہ بھابی میں امین بھائی کے پاس کام سے آیا تھا۔ وہ سر جھکائے بولا۔

''خبردار جو اپنی غلیظ زبان سے بھابی بولا۔'' میری آنکھوں میں اس وقت خون اترا ہوا تھا۔

''تم جاؤ یہاں سے فائق میں تمہاری کوئی مدد نہیں کرسکتا۔'' امین کے کہنے پر وہ چپ چاپ جانے لگا۔

''بات سنو۔'' خبردار جو تم آج کے بعد ادھر آئے، میرا تم سے کوئی ناتا نہیں۔ امین کی بات پر اس نے ایک نظر مجھے دیکھا جس پر میں نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔

''پینے چاہیے تھے اس کو، اس سے پہلے میں کچھ بات کرتا یا اس کو سناتا آپ محترمہ جذباتی ہوکر چلی آئیں۔'' امین ہنس کر مجھے دیکھتے ہوئے بولے۔

''میرا جذباتی ہونا غلط تھا کیا؟'' میں نمدیدہ آنکھوں سے امین کو دیکھ کر بولی۔

''بالکل نہیں۔'' وہ میرے کندھے پر بازو پھیلاتے ہوئے بولے۔

☆☆☆

رات ڈنر کر کے ہم ریسٹورنٹ سے باہر نکل رہے تھے کہ امین کے موبائل میں کسی کی کال آگئی۔ وہ بات کرنے دوسری طرف چلے گئے۔ میں زارا اور مزمل کا ہاتھ تھامے امین کا انتظار کر رہی تھی کہ سامنے سے آتے شخص کو دیکھ کر میں ٹھٹک سی گئی، وہ ثاقب تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر وہیں رک سا گیا تھا۔

''کیسی ہو۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''ٹھیک ہوں میں۔'' اس کی بات پر سادگی سے مسکراتی ہوئی بولی۔

''یہ تمہارے بچے ہیں۔'' وہ میرا ہاتھ تھامے بچے کو دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا۔ اس کی بات پر میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''بہت پیارے ہیں۔'' وہ جھک کر بچوں کو پیار کرنے

ہوئے بولا۔

''تمہاری شادی ہوگئی؟'' میرے سوال پر وہ ہنس دیا۔

''ہاں دو سال ہوگئے میری شادی کو۔ جب دل کو یہ یقین آ گیا کہ تمہارا ملنا اب ناممکن ہے۔'' کہہ کر وہ رکا پھر بولا۔ ''ویسے بھی میں اتنا جانتا تھا کہ تم اس شادی سے بہت خوش ہو اور اپنے شوہر سے بہت محبت کرتی ہو تو بس دل نے یہ سمجھ لیا کہ محبت تو وہی سچی ہوتی ہے جس میں محبوب خوش رہے چاہے کہیں بھی رہے۔ بس کچھ وقت لگا سمجھنے میں مگر سمجھ گیا۔ ویسے بھی اس محبت کے سفر میں، میں اکیلا مسافر تھا تو کب تک یہ کشتی اکیلے چلاتا۔'' اس کی بات پر میں خاموش رہی۔

''دو سال پہلے ایک حسینہ نے ہمارے ویران دل کو آباد کیا۔ ان کا نام بھی حسینہ ہے اور ہیں بھی اپنے نام جیسی حسینہ۔''

اس کی بات پر میری آنکھیں جلنے لگیں۔ ''اپنے نام جیسی حسینہ'' اس کی بات پر میں زیرلب بولی۔

''حسینہ سے یاد آیا حسینہ کا کیا حال ہے کیسی ہے وہ۔'' ثاقب کے سوال پر میں نے بمشکل اپنے آنسوؤں پر قابو پایا۔

''اس کا انتقال ہوگیا ہے۔'' میری بات پر بے یقینی سے وہ مجھے دیکھنے لگا۔

''کب کیسے مجھے پتا نہیں تھا۔'' لفظ بے ربط ہو کر اس کے منہ سے نکلے۔

''برین ہیمبرج ہوگیا تھا۔'' میری بات پر وہ افسردہ سا ہوگیا۔

''تم مل جاتے تو شاید جی جاتی میری بہن مگر وہ حسینہ جو نہ تھی۔'' میں پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ جس پر وہ پشیمان سا نظر آیا۔

''امین آ گئے میرا انتظار کر رہے ہیں چلتی ہوں۔ میں گاڑی کے پاس کھڑے امین کو دیکھتے ہوئے اسے خدا حافظ کہتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

☆☆☆

امی میرے آنے سے بہت خوش تھیں مگر میرا دل کسی چیز میں نہیں لگ رہا تھا۔ مجھے ہر شے سے اداسی ٹپکتی محسوس ہو رہی تھی۔

بچے تھکے ہوئے تھے تو وہ جلدی سو گئے۔ امی بھی اپنے کمرے میں چلی گئی تھیں۔ میں خاموشی سے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر چلی آئی اور صحن میں چھت پر جاتی سیڑھیوں پر آ کر بیٹھ گئی۔

رات کافی بیت چکی تھی اور ٹھنڈ میں بھی اضافہ ہوگیا تھا میں اپنے گرد شال کو مضبوطی سے لپیٹتے ہوئے ہاتھ میں دبے کاغذ کو دیکھنے لگی۔

اتنی ٹھنڈ میں بھی میری ہتھیلیاں نم آلود تھیں۔ یہ خط مجھے بچھو کی مانند ڈنک مارتا محسوس ہوتا تھا۔ اس کو میں نے ایک بار پڑھ کے دوبارہ نہیں کھولا تھا مگر آج میں اس خط کو پڑھ کر حسینہ کی موجودگی کو محسوس کرنا چاہتی تھی۔

''جان سے پیاری سونیا، کہتے ہیں جب انسان کا کرب حد سے بڑھ جائے تو انسان کے لب بھی خاموشی کا قفل لگا ہی لیتے ہیں کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جو انسان چاہ کر بھی نہیں بول پاتا یا بعض غم ایسے ہوتے ہیں کہ اس غم کو بیاں کرنے کے لیے ہمیں لفظ نہیں مل پاتے کہ جس سے ہم اپنے دل میں لگے گھاؤ کی ترجمانی کر سکیں۔

میں اپنے دکھ کا بتاتی کس کو، تم کو؟ جو زندگی بہت حسین ہے حسینہ، کہہ کر مجھے نئے خوابوں کا سرا پھر سے تھما دیتی یا امی کو جنہوں نے کبھی مجھے سنا ہی نہیں، وہ مجھے سننا چاہتی ہی نہیں تھیں کیونکہ میری وجہ سے ان کو معاشرے میں شرمندگی کا سامنا ہوتا تھا مگر ماں تو ماں ہوتی ہے کہ جس کو دنیا تھوک بھی دے ماں اس کو سینے سے لگا کر رکھتی ہے کیونکہ وہ اس کے جگر کا ٹکڑا ہوتی ہے۔

کتنی ہی ان کہی باتوں کا میں بھی گلا گھونٹ لیتی تھی جو باتیں میں ان کی گود میں سر رکھ کے کہنا چاہتی تھی وہ سب بن کہے مر جاتی تھیں۔

تم بولتی تھی کہ تم بولا کرو، میں کس سے بولتی امی، بابا، بھائی، بھابی کس سے؟ سب کے رویئے جو چیخ چیخ کر اعلان کرتے تھے کہ میں ان کو کس قدر ناپسند ہوں۔

عالیہ بھابی جو اٹھتے بیٹھتے حسینہ کہہ کہہ کر طنز آمیز نظروں سے مجھے دیکھتی تھیں۔ میرا دل اس لمحے چاہتا کہ میں کہیں روپوش ہو جاؤں۔

سب کہتے ہیں دادی مرحومہ کی جان تھی مجھ میں، انہوں نے ہی میرا نام حسینہ رکھا تھا۔ آج اگر دادی ہوتیں تو میں خوب لڑتی ان سے اور پوچھتی کہ مجھ موٹی کالی بھدے نین نقش والی گھنگی سی لڑکی کا نام ہی آپ کو حسینہ ملا تھا۔

مانا ان کی نظر میں میں حور پری تھی مگر وہ اپنی نظر بند

کرکے ایک بار دنیا کی نظر سے دیکھ لیتیں تو جان جاتیں کہ ان کی حسینہ صرف نام کی حسینہ تھی۔ وہ ان نظروں میں چھپا میرے لیے تمسخر پڑھ لیتیں تو پھر حسینہ کہنا بھول جاتیں۔

زمانہ طالب علمی سے جب اسکول جانے والے بچوں کو یہ نہیں پتا ہوتا کہ خوبصورت اور بدصورت کیا ہوتا ہے اس وقت میری ذات تضحیک کا نشانہ بنتی تھی۔ مجھے بچے کالی موٹی مچھلی کہہ کر میرا مذاق اڑاتے اور جب اساتذہ یہ پوچھتے کہ سونیا آپ کی سگی بہن ہے تو مجھے مزید اپنے کم صورت ہونے کا احساس ہوتا۔

تم چھوٹی ہونے کے باوجود ہر جگہ بازی لے جاتی تھیں تمہارے ساتھ چلتے ہوئے میرا احساس کمتری مزید جاگ جاتا تھا جب لوگ تمہاری گوری رنگت بڑی بڑی آنکھوں اور تیکھے نین نقش کی تعریف کرتے تو میں اس وقت اندر سے مزید بکھر جاتی تھی مگر اس سب میں مجھے تم سے کبھی نفرت محسوس نہیں ہوئی سونیا، کیونکہ میں اتنا جانتی تھی کہ میں رب کی تخلیق ہوں اس نے مجھے بنایا ہے میں تو اس کی تقسیم پر راضی تھی کسی کو وہ حسن دیتا ہے کسی کو دولت، میں بھی اس کے دیئے پر راضی تھی مگر لوگ مجھے تصور وار ایسے ٹھہراتے جیسے میں نے خود کو بنایا ہو۔

کالج میں بھی سب تمہاری ذہانت و حسن کے گرویدہ تھے اور وہاں بھی تمہاری بہن ہونے پر میں نے ہر آنکھ میں اپنے لیے تحیر دیکھا۔

امی ہر جگہ مجھے نظر انداز کرتیں اور تمہیں ہر جگہ فوقیت دیتی تھیں، عالیہ بھابی کے طنز پر بہت شروع میں، میں نے احتجاج کرنا چاہا تو امی مجھے ڈانٹ کر چپ کرا دیتیں، ان کو یہ ڈر تھا کہ کم صورت تو ویسے ہی ہوں کہیں زبان دراز مشہور نہ ہو جاؤں۔

ایک بار تم کو میں نے چھپ کر اپنے لیے لڑتے دیکھا تھا۔ میں اس وقت امی کے اس جملے پر ساکت تھی، شکل صورت اس کی ویسے ہی کمتر ہے اب اگر زبان بھی اس کی چلی تو کوئی نہیں اس کو بیاہ کرے جائے گا۔ میں اس رات چھت پر چھپ کے بہت روئی تھی۔

جب تم میرے پاس آئی تھی سونیا اور تم نے بولا تھا حسینہ تم جانتی ہو تم بہت حسین ہو اور میں اس وقت تمہاری آنکھ میں اپنے لیے تمسخر ڈھونڈنا چاہ رہی تھی جو عام لوگوں کی آنکھ میں ہوتا تھا۔ تم نے اس رات مجھے بولا تھا چاند اس لیے خوبصورت لگتا ہے کہ وہ اپنی چاندنی سے سب کچھ روشن رکھتا ہے۔ حسینہ تم بھی تو اس چاند جیسی روشنی ہو جو اپنی اچھی عادت و اطوار سے

## کیلشیم (Calcium)

سفید چاندی کی طرح چمکنے والی ایک نرم دھات، جو آزاد حالت میں نہیں ملتی۔ مرکبات کی شکل میں ملتی ہے۔ اس کا مشہور مرکب کیلشیم کاربونیٹ ہے، جس کی قلمی حالتیں کیلسائٹ، سنگ مرمر اور آئس لینڈ سپار ہیں۔ غیر قلمی حالت میں چونے کا پتھر، چاک، انڈے کے چھلکے اور سیپی میں اس کی کافی مقدار پائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ڈولومائیٹ، کیلشیم اور میگنیشیم کا دوہرا کاربونیٹ ہوتا ہے۔ جپسم اور کیلشیم بہت ہلکا ہوتا ہے۔ 839 درجے سینٹی گریڈ پر پگھلتا ہے اور جب پگھلنے کے قریب ہوتا ہے تو اس کے تار کھینچے جاسکتے ہیں۔ 1170 درجہ سینٹی گریڈ پر ابلنے لگتا ہے۔ حرارت اور بجلی اس میں سے گزر سکتی ہے۔ یہ دھات زیادہ گرم کرنے سے جل اٹھتی ہے اور کاربن مانو آکسائیڈ پیدا کرتی ہے۔ پانی کے ساتھ مل کر کیلشیم ہائیڈرو آکسائیڈ بناتی ہے۔ تیزابوں کے ساتھ عمل کر کے ہائیڈروجن گیس پیدا کرتی ہے اور تیزابوں سے متعفنہ نمک بنتے ہیں۔ کیلشیم جسمانی صحت کے لیے بہت ضروری ہے، اس لیے خون کی کمی والے کمزور مریضوں کو اس کے ٹیکے لگائے جاتے ہیں۔ انکحل خشک کرنے اور دھاتوں سے گندھک آکسیجن حاصل کرنے کے کام بھی آتا ہے۔ کیلشیم آکسائیڈ، کیلشیم کاربونیٹ، کیلشیم فاسفیٹ اس کے کثیر الاستعمال مرکب ہیں۔ کیلشیم آکسائیڈ مفید غیر قلمی مرکب ہیں۔ کیلشیم آکسائیڈ مفید غیر قلمی مرکب ہے، جو کیلشیم کاربونیٹ کو چونے کی بھٹی میں گرم کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ رنگ کاٹنے، شیشہ بنانے اور پوٹاشیم کلوریٹ بنانے کے کام آتا ہے۔ اس سے سیمنٹ بھی تیار کیا جاتا ہے۔ کیلشیم کاربونیٹ عمارتوں، سڑکوں، چونا، شیشہ اور سوڈا بنانے میں کام آتا ہے۔ کیلشیم سلفیٹ، جو جپسم کی شکل میں قدرتی طور پر ملتا ہے زمین کی زرخیزی بڑھانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ کیلشیم فاسفیٹ ہڈیوں کی راکھ میں پایا جاتا ہے۔ یہ پانی میں حل نہیں ہوتا۔ کیمیائی عمل سے اسے کیلشیم سپر فاسفیٹ میں تبدیل کرلیا جائے تو پانی میں حل ہو جاتا ہے۔ پانی جانداروں کی پرورش میں مدد دیتا ہے۔ جپسم کو احتیاط سے 12 سینٹی گریڈ تک گرم کیا جائے تو پلاسٹر آف پیرس میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ کیلشیم کا یہ مرکب برتن سازی، بت بنانے، پلستر کرنے اور مرہم پٹی میں استعمال ہوتا ہے۔

مرسلہ: شاہد حسن، کراچی

اپنی نرم گوئی سے کسی کا دل نہیں دکھاتیں۔ کبھی خود کو کمتر نہ سمجھنا۔

میں بھول گئی تھی کہ حسینہ واقعی میں حسینہ نہیں ہے۔ میں زیادہ سے زیادہ خوش رہنے کی کوشش کرتی تھی۔

پھر جب ہم یونیورسٹی پہنچے تو ثاقب جو ہمارا کلاس فیلو تھا مجھے کب اچھا لگنے لگا مجھے اندازہ ہی نہیں ہوا، پہلے پہل مجھے لگا وہ ہماری طرف ہی متوجہ رہتا ہے پھر تمہارے یقین سے کہنے پر کہ وہ دیکھتا ہی تم کو ہے میں پہلے تو بے یقین ہوئی مگر تمہاری بات نے کہ حسینہ ہر کوئی صورت پر نہیں مرتا سیرت بھی کوئی چیز ہوتی ہے تمہاری ان باتوں پر یقین کر کے میں اس کی ہمراہی کے خواب بننے لگی۔

اور پھر ثاقب سے بات کے بعد تم نے بتایا کہ وہ کسی اور سے محبت کرتا ہے۔

میرے دل میں یہ بدگمانی جنم لینے لگی کہ تم نہیں چاہتیں کہ میری ثاقب سے شادی ہو اور ان ہی ناراضگی کے دنوں میں ایک بار جب میں اپنے کسی کام سے اکیلی یونیورسٹی گئی تھی تو وہاں مجھے ثاقب ملا تھا۔

اس سے پہلے کہ میں نظر بچا کر گزر جاتی اس نے آواز دے کر مجھے روک لیا تھا۔ اس نے مجھے بتایا تھا سونیا میرے پاس یہ پوچھنے آئی تھی کہ کیا میں حسینہ سے محبت کرتا ہوں جبکہ وہ میری نظروں کا مفہوم جانتی تھی کہ میری والہانہ نظریں صرف اس کا طواف کرتی تھیں۔

تمہاری بہن یا تو حد درجہ کی بیوقوف ہے یا بننے کی اداکاری کرتی ہے۔ کوئی بھی مرد سونیا جیسی لڑکی کے ہوتے ہوئے حسینہ کو کیوں پسند کرے گا، اور میرے دھواں دھواں ہوتے چہرے کو دیکھ کر وہ جھینپ کر بولا تھا۔ ''معذرت یار تمہاری دل آزاری کرنا میرا مقصد نہیں تھا۔'' اس رات میں نے تم سے معافی مانگی تھی کیونکہ میں جان گئی تھی کہ اس سارے معاملے میں تم بے قصور ہو۔

جانتی ہو سونیا لوگوں کی زبانوں کے نشتر میرے دل میں اترتے تھے۔ رشتے کے لیے آنے والے لوگ مجھے اوپر سے نیچے تک ایسے دیکھتے جیسے میں کوئی بھیڑ بکری ہوں اور پھر ان کے تمسخرانہ جملے اور بات کے اختتام میں یہ کہتے ہوئے اٹھ جانا۔

''معاف کیجئے گا دل آزاری کرنا ہمارا مقصد نہ تھا۔''

مجھے ایک بات کی سمجھ نہیں آتی تھی، لوگ دل آزاری کرنے کے بعد یہ کیوں کہہ دیتے ہیں کہ دل آزاری کرنا ہمارا مقصد نہیں۔

میرے رشتے کے لیے آنے والے لوگ ہمیشہ تمہیں دیکھ کر مرعوب ہو جاتے۔ مجھے دیکھنے جو لوگ آتے وہ تمہارے اُمیدوار بن جاتے۔

امین بھائی سے تمہاری شادی کے بعد بھی میرے لیے جو آتا مجھ میں خامیاں نکال کر چلا جاتا اور میں پشیمان سی سر جھکائے بیٹھی اپنی خامیاں ڈھونڈتی رہ جاتی۔

مگر میں نے خود کو تو نہیں بنایا تھا۔ میں تو رب کی تخلیق تھی۔ لوگ آئے دن رب کی تخلیق میں مین میخ نکالتے اور میں صرف یہ سوچتی کہ بھلے یہ لوگ مجھے پسند نہ کریں نہ بیاہ کر لے کر جائیں مگر رب کی تخلیق کو تضحیک کا نشانہ نہ بنائیں اور پھر فائق میری زندگی میں بہار کا جھونکا بن کر آ گیا۔ اس نے وہ سارے پھانس جو لوگوں نے اپنی زبانوں سے میرے دل میں چبھوئے تھے ایک ایک کر کے اپنی محبت سے نکال دیئے۔

وہ بولتا تھا تم سچ مچ کی حسینہ ہو اور میں اس کی محبت میں اس کی ہر بات پر آنکھ بند کر کے یقین کرتی چلی گئی۔

میں اپنے آپ کو اس روئے زمین کی خوش نصیب لڑکی محسوس کرتی تھی اور پھر ایک رات جب میری آنکھ کھلی مجھے بستر پر فائق نظر نہیں آئے۔

میں سمجھی وہ واش روم میں ہیں مگر جب کافی دیر وہ واش روم سے نہ آئے میں ان کی تلاش میں کمرے سے باہر آئی تو وہ برابر والے کمرے میں کسی لڑکی سے کال پر بات کر رہے تھے۔

یہ وہ فائق نہ تھا جس کے منہ سے پھول جھڑتے تھے، وہ تو بہت نفرت سے میرا ذکر کر رہا تھا۔

وہ بول رہا تھا۔ ''امین بھائی نے بزنس ہی اس شرط پر سیٹ کیا کہ ان کی کالی موٹی سالی سے شادی کروں۔ اس کے لب و لہجے میں میرے لیے حقارت تھی۔ جیسے میں کوئی ناقابل برداشت شے ہوں، بقول اس کے سونیا بھابی جیسی لڑکی ہوتی تو وہ خوشی خوشی اس شادی پر راضی ہوتا مگر اس نے صرف زہر کا گھونٹ اس لیے پیا کہ اس کا بزنس سیٹ ہو جائے گا۔

وہ بتا رہا تھا کہ سونیا بھابی اس کو وقفے وقفے سے پیسے دے کر اپنی ٹھگنی بہن، خالی نام کی حسینہ کا خیال رکھنے کی تاکید کرتی ہیں۔

وہ اس لڑکی سے بول رہا تھا کہ اس کے لیے وہ وقت ناقابل برداشت ہوتا ہے جو وہ میری سنگت میں گزارتا ہے۔ وہ کسی لڑکی کو یہ کہہ کر بھی تسلی دے رہا تھا کہ وہ اس سے ہی محبت کرتا ہے اور مناسب وقت دیکھ کر اس سے شادی کرے گا۔

میں گھسٹتے قدموں سے چپ چاپ وہاں سے چلی آئی تھی۔ احتجاج میرے لبوں پر آکر دم توڑ گیا تھا۔ میں تو اس رات ہی مرگئی تھی سونیا۔

فائق روز میری تعریف میں رطب اللسان رہتا اور میں بنجر دل لیے اس کو بس خالی آنکھوں سے تکا کرتی۔ میں اسے یہ نہیں بتاتی کہ میں سب جانتی ہوں۔ جب وہ میرا ہاتھ تھام کر بولتا کہ حسینہ تم کس قدر حسین ہو تو یقین مانو میں پہلے کی طرح نہیں کھلکھلاتی بلکہ اس وقت میرے دماغ میں اس کے کہے فقرے گونجتے تھے۔ میرا دل چاہتا میں چیخ کر بولوں کہ اپنا فریب بند کرو مگر بات کھلتی تو وہ مزید شیر ہو جاتا اور میں مزید خود کو رسوا نہیں کرنا چاہتی تھی کیونکہ میں لڑ کر جاتی کہاں، وہاں جہاں میرے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔

تم بار بار پوچھتیں تھی نا میری آنکھوں میں ٹھہری اداسی اور لبوں پر جامد خاموشی کا سبب تو میرا اس وقت دل چاہتا تمہیں تھپڑ مار کر بولوں کہ کیوں اپنی بہن کو ارزاں کیا تم نے پیسے کے زور پر میرے لیے ایک شخص تو خرید بیٹھی مگر محبت نہیں خرید سکی۔

امی نے تو کبھی پوچھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی وہ تو جو ہے جیسا ہے چلنے دو کی قائل تھیں۔ وہ ڈرتی تھیں کہ کہیں میں اس سے پوچھوں اور یہ اپنے دکھڑے نہ رونے بیٹھ جائے۔ جس بیٹی کی اتنی مشکلوں سے شادی ہوئی ہو اس کا ان کو ڈر تھا کہ کہیں وہ دوبارہ ان کے گھر نہ آجائے۔ وہ بولتی کچھ نہ تھیں مگر ان کا نظر انداز کرنے کا انداز چیخ چیخ کر اعلان کرتا تھا کہ مجھے تمہاری کسی تکلیف سے سروکار نہیں اور میں جھلی ماں کی طرف اس حسرت سے دیکھتی اور سوچتی کہ کبھی میں ماں کی گود میں سر رکھوں اور ماں بولے، جانتی ہو حسینہ تم بہت حسین ہو کیونکہ تمہارا دل بہت پیارا ہے۔ تم کبھی زبان کے نشتر دلوں پر نہیں لگاتیں، میں اندر ہی اندر کڑھتی تھی جب امی تمہارے چھوٹے سے کام پر فخریہ انداز میں تمہاری تعریف کرتیں اس وقت میری حسرت بھری نگاہیں ان کو دیکھتے ہوئے صرف یہ سوچتی تھی کہ میری قدر کیوں نہیں۔

یہ سوچیں مجھے اندر ہی اندر کھانے لگی تھیں۔ جانتی ہو معاشرے کے نشتر تو میں جھیل جاتی جو اگر گھر والے میرے اپنے ہوتے۔

میرے ماں باپ بھائی بھابی یہاں تک کہ شوہر بھی۔ ایک تم تھی جس سے مجھے فائق والی بات پر بہت شکایتیں ہیں مگر پھر بھی میں جانتی ہوں تم نے مجھ سے سچی محبت کی ہے۔

میں اب زندگی گزار نہیں رہی بلکہ گھسیٹ رہی ہوں دعا کرنا میری زندگی میرے لیے آسان ہو جائے۔''

فقط نام کی حسینہ۔

قطرہ قطرہ کرب میری آنکھوں سے بہہ کر کاغذ پر لکھے حرفوں کو گیلا کر رہا تھا فجر کی اذانیں شروع ہو چکی تھیں۔

''تم سوئی نہیں اب تک۔'' امی میرے پاس آکر بولیں اور میرے برابر ہی سیڑھیوں پر بیٹھ گئیں۔

''جانتی ہیں جب کوئی ہم سے بہت محبت کرتا ہے نا اور ہم اس کی ناقدری کرتے ہیں تو یہ اذیت اس انسان کے جسم میں کینسر کی مانند پھیل سی جاتی ہے اور ہماری ناقدری کے سبب اس مرض کی اسٹیج بڑھتی جاتی ہے یہاں تک کہ وہ آخری اسٹیج پر پہنچ جاتا ہے اور ایک وقت ایسا آتا ہے کلستے کلستے اس انسان کا دل بند ہو جاتا ہے اور پھر سامنے والا لاکھ روئے لاکھ چلائے اسے فرق نہیں پڑتا۔

میں نے بھی اس کے چہرے پر بہت سکون دیکھا تھا جب آپ اس کے پاس بیٹھیں رو رہی تھیں تڑپ رہی تھیں وہ بہت پُرسکون تھی۔ جیسے مسکرا رہی ہو کہ میں بھی تو زندگی میں ایسے تڑپی تھی۔

''آپ مت روئیں امی۔'' میں امی کو روتا دیکھ کر ان کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولی۔

''ہمیں تو خوش ہونا چاہیے کہ وہ چلی گئی جس کو متعارف کراتے ہوئے آپ جھجکتی تھیں۔ وہ تو آپ کے لیے آسانی کر گئی پھر کیسا رونا، وہ مجھے سمجھا گئی کہ حسن جیت جاتا ہے مگر روشنی ہار جاتی ہے، وہ روشنی جس کو ہم سب نے بجھا ڈالا۔'' میں نے گہرا سانس لیا پھر سلسلہ کلام جوڑا۔ ''جانتی ہیں بہت خوبصورت تھی آپ کی بیٹی، بہت حسین کیونکہ اس کے پاس لوگوں جیسی چبھتی ہوئی دلوں کو چیر دینے والی زبان نہیں تھی۔ ایسی شکل کا کیا فائدہ جس کی زبان ہی اچھی نہ ہو۔ اس کے پاس تو ایک پیارا سا دل تھا۔ ہم سب نے مل کر اسے مار ڈالا۔''

میں برستی آنکھوں سے یہ سوچ رہی تھی کہ انسانوں کا شر بھی کتنا برا ہوتا ہے نا اپنی زبان سے لوگ ایک جیتے جاگتے انسان کی سانس تک چھین لیتے ہیں۔ زبان کے نشتر بھی کیا چیز ہوتے ہیں جو دلوں کو ساکت کر دیتے ہیں۔ ہم کس کے ہاتھ پر اس کا لہو تلاش کریں معاشرے کے یا اپنے کیونکہ ہم سب مل کر اس کے قاتل ہیں۔ میں بلک بلک کر روتی امی کو سرخ آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

++

# فائدہ

محترم مدیر
السلام علیکم!
ایک سچ بیانی ارسال کررہا ہوں لیکن یہ روداد میری اپنی نہیں ہے، آپ تو جانتے ہیں کہ میں ایک قلمکار ہوں اچھی کہانیوں کے پیچھے بھاگتا ہوں. اسی تلاش میں یہ کہانی سامنے آئی اور میں نے اسے کہانی کا اصل روپ دے دیا. قارئین کو بھی یہ کہانی پسند آئے گی.

ایم الیاس
(کراچی)

میری زندگی میں جمعرات کا دن نہ صرف مبارک ہوتا ہے بلکہ فائدہ مند بھی ہوتا ہے؟

وہ جمعرات کا مبارک دن ہی تھا جب میں نے نصیبن کو پہلی بار مارکیٹ کے بس اسٹاپ پر دیکھا تھا جو سلطان ہوٹل کے سامنے تھا۔ میں نصیبن کو دیکھتے ہی اس طرح چونک گیا تھا جیسے میں نے اپنی ساری زندگی میں کوئی صورت نہ دیکھی ہو۔ میرے جسم پر ایک میٹھی سی سنسنی دوڑ گئی۔ میں اسے دنیا و جہان سے بے نیاز ہو کر محویت سے دیکھنے لگا۔ جیسے مجھ پر نشہ سا طاری ہو رہا ہے۔ نصیبن کا چہرہ، سراپا دیکھتے ہی میرے دل کی ایک عجیب سی کیفیت ہونے لگی۔ اسے دیکھتے ہی میں نے دل میں ایک فیصلہ کرلیا تھا جو اس کے حصول کا تھا کہ اسے ہر قیمت پر حاصل کر کے رہوں گا۔ جان کی بازی بھی لگادوں گا، میں جو فیصلہ بھی کرتا تھا وہ چٹان کی طرح اٹل ہوتا تھا۔ اسے میں ہر قیمت پر اس لیے حاصل کرنا چاہتا تھا کہ نصیبن جیسی لڑکی میں نے خواب میں بھی نہیں دیکھی تھی۔ میں روز ہی سینکڑوں لڑکیاں دیکھتا تھا، دیکھ چکا تھا، ان میں ایک لڑکی بھی ایسی دکھائی نہیں دی تھی۔

دو برس پہلے میری بیوی گلابو ایک حادثے کا شکار ہوگئی تھی، یہ ایسا جان لیوا صدمہ تھا کہ اس روز سے میرا دل بری طرح مرجھا گیا تھا، میرا دل دنیا سے ایسا اچاٹ ہوا تھا کہ مجھے کوئی نوجوان لڑکی اور جواں سال عورت کیسی ہی پُرکشش کیوں نہ ہو اچھی نہیں لگتی تھی اور نہ ہی میں اس کی طرف مائل ہوتا تھا۔ میں اس آتش فشاں کی طرح ہوگیا تھا جس کا لاوا برس چکا ہو۔ اب مجھ میں جینے کی کوئی امنگ باقی نہ رہی تھی مگر اس آتش فشاں کے اندر اس کی راکھ باقی رہ گئی تھی جس میں کبھی کبھی چنگاریاں سی نظر آتی تھیں، میں اپنا دل مسوس کے رہ جاتا۔

مجھے اپنی گلابو بہت یاد آتی تھی بلکہ روز ہی اس کی یاد آتی چلی جاتی تھی۔ گلابو کوئی بھولنے والی چیز نہیں تھی، اس کے ساتھ گزرے ہوئے دن اور لمحات بے اختیار یاد آجاتے تھے۔ وہ خوب صورت تھی، اس کا متناسب بدن شاداب تھا، وہ پُرشباب تھی اور بے حد پُرکشش بھی اس میں محبت کی گرم جوشی، والہانہ پن اور خود سپردگی بھی تھی۔ اس کی وارفتگی میں دیوانگی تھی، عورت اس لیے بھی یاد رہتی ہے اور دل و دماغ پر اس لئے چھائی رہتی ہے کہ وہ سراپا محبت ہوتی ہے، اس محبت کا تاثر نصیبن کو دیکھنے سے پہلے میرے ذہن پر کسی پرانی شراب کے خمار کی طرح چھایا ہوا تھا ورنہ ہر سمت مجھے گلابو ہی نظر آتی تھی، ہر جوان عورت پر مجھے گلابو کا ہی دھوکا ہوتا۔

مجھے یاد تھا کہ میری ماں نے مجھے جانے کتنی ایسی لڑکیاں دکھائیں جو پُرشباب تھیں۔ خوب صورتی صرف گوری رنگت..... کا نام نہیں ہے، حسن اور کشش تو سیاہ رنگت میں بھی ہوتی ہے، سیاہ رنگت کی لڑکیاں آبنوسی لکڑی کی طرح ہوتی ہیں، چمک دار اور روغنی۔ ایسی پُرکشش کہ مرد دیکھے تو چہرہ اور سراپا نظروں میں جذب کرلے، میں نے ایک روز ایک لڑکی پسند کی جس میں بلا کی کشش تھی، لیکن وہ شادی شدہ نکلی، دو بچوں کی ماں تھی۔

ماں نے جو لڑکیاں اور عورتیں مجھے دکھائی تھیں شاید میں ان میں سے کسی ایک کو پسند کرلیتا اگر مجھے گلابو نظر نہ آئی ہوتی، گو کہ گلابو میں خاص کشش نہ تھی مگر وہ میرے دل کو بھا گئی تھی اتنی پسند آئی تھی کہ دنیا کی ہر حسین سے حسین اور پُرکشش لڑکی گلابو کے آگے ماند پڑ گئی تھی، وہ مجھے اس قدر کیوں

بھا گئی تھی اس کا جواز میرے پاس تھا، میرے جواب اور وضاحت سے میرے ماں باپ بہت خوش ہوئے تھے اور مطمئن بھی، گلابو کی اچانک اور بے وقت موت کے بعد میں نے سیاہ رنگت کے حسن کو دیکھا تھا بلکہ دودھیا گلابی رنگت کی لڑکیاں بھی دیکھی تھیں مگر ویران دل میں کوئی کلی کھل نہ سکی تھی، ماں باپ بھی ہمت ہار کر مایوس ہو گئے تھے۔ لڑکیاں دیکھنا بند کر دیا تھا۔

اس رات میں سونے کے لیے بستر پر دراز ہوا تو پل بھر کے لیے بھی سو نہ سکا تھا بلکہ سونا بھی نہیں چاہتا تھا، میں نے گلابو کے تصور کو بڑی بے رحمی سے ذہن کے تاریک گوشے میں دھکیل دیا تھا، اب میرے ذہن میں صرف اور صرف نصین تھی۔ میں چشم تصور میں نصین کا سراپا دیکھ رہا تھا، نصین کا چہرہ میری نظروں میں گھومتا رہتا جس کے ان گنت روپ تھے، ہر روپ اپنی جگہ مختلف تھا، ان میں حسن تھا، انفرادیت تھی اور ایک عجیب سا بر مادینے والا جادو جو سر چڑھ کے بول رہا تھا۔ میں صبح بیدار ہونے تک نصین کے خواب دیکھتا رہا تھا کہ وہ میرے بازوؤں کے حصار میں لپک رہی تھی، بہک رہی تھی، میں اس سے کہہ رہا تھا کہ میری زندگی! میری روح! تم مجھے صدیوں بعد ملی ہو، مجھے تم سے محبت ہے..... دیکھو میری جان آرزو! اب تم میری زندگی اور میری ذات کا جزو بن گئی ہو ہم تم کبھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے۔ صبح بیدار ہوا تھا تو مجھ پر ایک عجیب سی سرشاری طاری تھی، ایسا محسوس ہو رہا تھا وہ میرے پہلو میں مہک رہی ہو۔

میں دوسرے دن ہی لی مارکیٹ جا پہنچا، صبح نو بجے سے دوپہر تک لی مارکیٹ، بغدادی، چاکی واڑہ اور لیاری کے علاقے کی خاک چھانتا رہا مگر مجھے نصین نظر نہیں آئی، مجھے اس بات کا پچھتاوا سا ہو رہا تھا کہ میں نے اس کا ٹھکانا معلوم کیوں نہیں کیا۔ میں اس کا تعاقب کر کے اس کے گھر تک پہنچ سکتا تھا۔ میں نے دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ کہیں نظر آئے گی تو میں اس کا تعاقب کر کے اس کے گھر تک پہنچ کر ہی دم لوں گا۔ گلابو کوئی دو برس تک میری بیوی رہی تھی، وہ بڑی اطاعت گزار تھی، ایک مثالی بیوی ثابت ہوئی تھی، شوہر پرست تھی، ایسی بیوی کا ملنا نصیب کی بات ہوتی ہے، میں نے اپنے دوستوں اور ملنے والوں کو دیکھا تھا کہ اچھی بیویاں آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔ ان کی ازدواجی زندگی خوش گوار نہ تھی، اس میں زہر اور تلخیاں بھری ہوئی تھیں۔ وہ اپنے شوہروں کی

آنکھوں میں دھول جھونک کے فائدے کے لیے آلودہ ہوتی رہتی تھیں۔ وہ لوگ مجھ پر رشک کرتے تھے میری بیوی جیسی کی تمنا کرتے تھے۔ مجھے اس بات کی پوری اُمید تھی کہ نصیبن بھی گلابو جیسی بیوی ثابت ہوگی۔ یہ میرا اندازہ تھا جس کے غلط ہونے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا، دو دن تک نصیبن کی تلاش میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا، لیکن میں نے حوصلہ نہیں ہارا بلکہ میں خیالی گھوڑے دوڑاتا رہا کہ وہ مجھے کہاں مل سکتی ہے؟ اس کی تلاش میں، میں نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی اور سارے شہر کی خاک چھان ماری تھی، گو نصیبن کی تلاش آسان نہ تھا۔ کراچی میں اڑ کیوں کی کوئی کمی نہ تھی اور پھر کراچی کوئی شہر نہ تھا، یہ تو کسی ملک کی طرح تھا جس کے وجود میں بہت سارے محلے بسے ہوئے تھے۔ میں اس بات پر یقین رکھتا تھا کہ کراچی بھی دنیا کی طرح گول ہے، اس گولائی میں بہت سی لڑکیاں کئی کئی بار نظر آجاتی تھیں، اس طرح نصیبن بھی نظر آسکتی تھی۔ وہ لڑکیاں جنہیں مجھے ماں نے شادی کے لیے دکھائی تھیں وہ نظر آتی تھیں تو نصیبن کیوں نہیں دکھائی دے گی! اُمید کا دامن نہیں تھامے رہنا چاہیے۔

ایک ہفتہ تلاش بسیار کے بعد میں نے دل برداشتہ ہوکر سوچا کہ کیوں نہ سیہون شریف جا کر منت مانگوں، اپنی جھولی پھیلاؤں، گڑگڑاؤں، روؤں، شاید وہاں میرے دل کی مراد برآئے۔ جیسا کہ سینکڑوں لوگ جاتے ہیں اور من کی مراد پا کر واپس آتے ہیں۔ درد دل کی فریاد تو سنی جاتی ہے اور اسے قبولیت بخشی جاتی ہے۔ فریاد کرنے اور مانگنے میں کیا حرج ہے۔

اتفاق سے اس جمعرات کے روز وہاں عرس ہورہا تھا، میرے ماں باپ بھی اس عرس میں شرکت کرنے جارہے تھے، وہ ایک برس میں کئی مرتبہ جاتے تھے، چاہے عرس ہو یا نہ ہو۔ میں اب تک صرف دو ایک مرتبہ جاسکا تھا جبکہ زائرین کو بسیں مفت لے جارہی تھیں۔ بسوں کا انتظام ایک مخیر شخص نے کیا ہوا تھا۔ میں بھی اپنے والدین کے ہمراہ ہولیا تھا۔

میں نے کسی وجہ سے اب تک اپنے ماں باپ سے اس کا ذکر نہیں کیا تھا۔ ماں باپ نے مجھے جو کھویا کھویا، سوچوں میں گم پایا تو باپ یہ سمجھا تھا کہ میں اپنی بیوی کے غم میں گھل رہا ہوں۔ سوال بھی کیا مگر میں انہیں کیا بتاتا کہ مجھے نصیبن کی فکر کھائے جارہی ہے۔ جب انہوں نے محسوس کیا کہ ان کے سمجھانے کے باوجود کوئی اثر نہیں لیا ہے تو انہوں نے مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا۔

میرے دل میں یہ خیال آیا تھا کہ کیوں نہ میں اپنے دوستوں اور ساتھیوں کی مدد سے نصیبن کو تلاش کروں مگر اس خوف میں انہیں نصیبن کی ہوا لگنے نہیں دینا چاہتا تھا کہ کہیں وہ اس پر لٹو ہوکر اس کے حصول کی کوشش شروع نہ کردیں۔

جب میں نے سیہون شریف مزار کے باہر نصیبن کو دیکھا تو یقین نہیں آیا، پہلے تو میں یہ سمجھا کہ یہ میرا وہم ہے۔ میں کتنے ہی دیر تک اسے خواب کی حالت میں دیکھتا آیا تھا۔ اس پر سکتے کی کیفیت طاری ہوگئی تھی اور میرا دل خوشی سے بلیوں اچھل رہا تھا۔ میری نصیبن.....! میری نصیبن.....! میرے دل کے نہاں خانوں میں ایک ہی صدا گونج رہی تھی۔ میرے لیے اس سے اچھا موقع کیا ہوسکتا تھا کہ میں اپنے ماں باپ اپنی پسند اور خواہش سے آگاہ کردوں اور انہیں بتادوں کہ یہ وہ ہے جس کے لیے میں پاگل ہورہا تھا۔

وہ تو مجھے منت مانگنے اور جھولی پھیلانے سے پہلے ہی مل گئی تھی۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ میری دلی مراد یوں برآئے گی۔ نصیبن ہزاروں عقیدت مندوں میں کسی نایاب ہیرے کی طرح نظر آرہی تھی اور ہر ایک نگاہ کی توجہ کی مرکز بنی ہوئی تھی۔ جسے دیکھو وہ اسے حیرت سے دیکھے جارہا تھا۔

میرے دل کے کسی کونے میں ایک نامعلوم سا خوف دامن گیر ہوا کہ کہیں کوئی نصیبن کے حصول کے لیے پہل نہ کردے اس سے پہلے کوئی اور نصیبن کے ماں باپ سے رجوع کرے اور اس کا رشتہ مانگے، بات پکی کرے، کیوں نہ میں اپنے ماپ باپ کو مجبور کروں کہ میرا رشتہ اس کے لیے لے جائیں۔

میں اپنی ماں کو ایک طرف لے گیا، ہم دونوں ایسی جگہ کھڑے تھے جہاں سے وہ صاف نظر آرہی تھی۔ میں نے اماں کو مخاطب کیا۔

''ماں! میں نے اس لڑکی سے شادی کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے، جتنا جلد ہوسکے اس سے میری شادی کرادو۔''

''سچ.....!'' ماں کی آنکھیں حیرت و خوشی سے پھیل گئیں۔ اسے جیسے اپنی سماعت پر فتور کا احساس ہوا۔ ''تم واقعی اس سے شادی کرو گے؟''

''ہاں ماں.....'' میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

''یہ تو اور بھی اچھی بات ہے کہ تم نے خود لڑکی پسند کرلی۔'' ماں نے جواب دیا۔ ''مجھے تمہاری پسند پر ہمیشہ ناز رہا

ہے، تم نے کتنی ہی لڑکیوں اور عورتوں میں سے گلابو کو پسند کیا تھا اور گلابو ہماری پسند، مزاج اور معیار پر پوری اتری تھی۔ قدرت کو منظور نہ تھا۔ اگر گلابو زندہ رہتی تو۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو ان کے ذکر سے فائدہ کیا۔ اچھا بتاؤ تو وہ لڑکی کون ہے؟ کیا یہاں آئی ہوئی ہے؟''

''وہ رہی.....'' میں نے کلے کی انگلی سے اس سمت اشارہ کیا جہاں نصیبن اپنی ماں کے ساتھ کھڑی تھی۔ ''یہ ہے وہ لڑکی ماں! میں اب اس کے بغیر ایک دن تو کیا ایک لمحہ بھی نہیں رہ سکتا۔'' میں بے حد جذباتی ہوگیا تھا۔

میری ماں نصیبن کی ماں سے دوستی کرنے اور یہ پوچھنے کے لیے کہ کہیں اس کا رشتہ کسی سے طے تو نہیں ہوگیا ہے؟ اس کی طرف بڑھ گئی اور میں بھیڑ بھاڑ میں ہوتا ہوا مزار پر جا پہنچا۔ گڑگڑا کے دعا مانگتا رہا پھر میں نے منت مانگی کہ اگر میری شادی نصیبن سے ہوگئی تو میں پانچ سو روپے کی پھولوں کی چادر چڑھاؤں گا۔ جب میں منت مانگ کر عمارت سے باہر آیا تو میرے دل کا بوجھ قدرے کم ہوگیا۔ میں نے ایک عجیب سا سکون محسوس کیا تھا۔ جب سے میں نے نصیبن کو دیکھا تھا میرے اعصاب منوں بھاری تھے آج اب پھول کی طرح ہلکے ہوگئے تھے۔ میرے دل کو بڑی عافیت بھی محسوس ہو رہی تھی اور ایسا لگ رہا تھا کہ میرے دل کی دعا قبول ہوگئی۔ میں بڑے کرب اور بے چینی سے ماں کا انتظار کرنے لگا۔ وہ نصیبن کی ماں سے بات کرنے گئی ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ماں آئی تو اس کا چہرہ دمک رہا تھا، میں نے بے تاب ہوکر پوچھا۔

''کیا ہوا ماں.....؟ کیا نصیبن کی ماں مان گئی؟ اس نے میرا رشتہ منظور کرلیا؟''

''کیا شادی کوئی گڈے گڑیا کا کھیل ہے.....؟'' ماں نے جواب دیا۔ ''کیا رشتے پلک جھپکتے میں طے ہوجاتے ہیں۔''

''مگر تم اس طرح خوش نظر آرہی ہو جیسے کوئی معرکہ سر کرکے آرہی ہو؟ کیا رشتہ طے نہیں ہوا؟'' میں نے دل گرفتہ انداز میں پوچھا۔

''خوشی اس بات کی ہے کہ ابھی تک نصیبن کا رشتہ کہیں طے نہیں ہوا ہے؟'' ماں کہنے لگی۔ ''کیا یہ کم خوشی کی بات ہے؟ مجھے سب سے زیادہ حیرت اس بات پر ہے، خوشی اس بات کی بھی ہے کہ وہ خود کسی اچھے رشتے کی تلاش میں ہیں۔ میرا خیال ہے کہ بات آسانی سے بن جائے گی۔ تم پریشان نہ ہو۔''

''ماں.....! تم کسی نہ کسی طرح آج ابھی اور اسی وقت لڑکی کی ماں سے بات کرکے بات پکی کر ہی لو۔ کل کہیں ایسا نہ ہو کہ ہماری کوتاہی پچھتاوے کا سبب بن جائے اور ہم منہ دیکھتے رہ جائیں۔ اگر ایسا ہوا تو پھر.....'' میں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''ایسا لگتا ہے کہ تم نصیبن کے لیے پاگل ہوگئے ہو، اگر میں نے رشتے کی بات چھیڑی تو وہ لوگ شک و شبہے میں پڑ جائیں گے۔ وہ لوگ کل واپس جا رہے ہیں، کراچی پہنچے کے دوسرے تیسرے دن ہی تمہارے لیے رشتہ مانگ لوں گی۔ جلد بازی سے بعض اوقات بنتے کام بھی بگڑ جاتے ہیں۔''

ماں نے مجھ سے جیسا کہا تھا ایسا ہی کر دکھایا۔ کراچی پہنچے کے تیسرے ہی دن ماں میرا رشتہ مانگنے نصیبن کے ہاں گئی۔ وہ کوئی دو گھنٹے کے بعد آئی تو اس کے چہرے پر مایوسی کی لکیر دیکھ کے میں رنجیدہ ہوگیا اور دل شکستہ لہجے میں پوچھا۔

''کیا ہوا ماں.....؟ کیا اس کے گھر والوں نے رشتہ دینے سے انکار کردیا؟''

''انکار تو نہیں کیا ہے لیکن ایک طرح سے انکار ہی سمجھو۔'' ماں نے افسردگی سے کہا۔ ''انکار کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہوتا ہے۔''

''یہ کیا بات ہوئی؟'' میں نے شدید حیرت بھری نظروں سے دیکھا۔ ''میں کچھ نہیں سمجھا..... صاف صاف بتاؤ کہ آخر بات کیا ہے؟''

''اس کے ماں باپ کہہ رہے ہیں کہ ان کے ہاں کی رسم ہے کہ دولہا والے رقم دیتے ہیں۔ پچاس ہزار کی رقم مانگ رہے ہیں۔'' ماں بتانے لگی۔ ''انہیں اندرون پنجاب سے آئے ہوئے آٹھ دن بھی نہیں ہوئے لیکن انہیں کراچی کی ہوا لگ گئی ہے۔''

''پچاس ہزار روپے؟'' چند لمحوں تک مجھ پر سناٹا طاری رہا۔ ''کیا دماغ خراب ہوگیا ہے ان لوگوں کا، کیا پچاس ہزار کی رقم کوئی معمولی ہوتی ہے.....؟''

''اگر اس کی شادی کسی اور سے ہوگئی تو پھر میں ساری زندگی شادی نہیں کروں گا؟'' میں نے ضدی لہجے میں کہا۔ ''کیوں کہ نصیبن جیسی لڑکی مجھے ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گی؟''

''یہ تو میں بھی جانتی ہوں کہ اس جیسی لڑکی ملنا ناممکن ہے۔؟ مگر میں کیا کروں بیٹے.....'' کچھ دیر کی خاموشی کے بعد ماں بے بسی سے بولی۔ ''ایک انار سو بیمار والا معاملہ ہے۔ لڑکے والے پچیس اور تیس ہزار تک دینے کو تیار ہوگئے۔ ایک

ادھیڑ عمر کا شخص بھی رضامند ہوگیا۔ اس نے خود ہی چالیس ہزار کی رقم نکال کے نصیبن کی ماں کے ہاتھ پر رکھ دی تو اس نے واپس کردی۔ وہ پچاس ہزار کی رقم پر اڑے ہوئے ہیں۔ سودے بازی کررہے ہیں۔ مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ کوئی نہ کوئی پچاس ہزار کی رقم دے ہی دے گا۔ کراچی شہر میں قدردانوں کی کیا کمی ہے؟ ستر اسی ہزار روپے بھی دے دے؟''

''ماں.....! پورے پچاس ہزار روپے.....'' میں چند لمحوں تک سوچتا رہا اور میری آنکھیں بھی سوچ میں ڈوبی رہیں۔ مجھ پر اس وقت ایک گہری سنجیدگی آسیب کی طرح مسلط ہوگئی تھی۔

''کیا سوچنے لگے ہو بیٹے!'' ماں نے سکوت کو توڑتے ہوئے کہا۔ ''مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ دو ایک دن میں کوئی نہ کوئی اس انمول اور نایاب ہیرے کو خرید بھی لے گا۔''

''ہاں ماں.....! تم صحیح کہتی ہو کہ وہ ایک انمول اور نایاب ہیرا ہے۔'' میں نے ایک گہرا سانس لیا۔ ''مجھے یہ سودا منظور ہے ابھی اور اسی وقت جاکر تم ہاں کرآؤ، دس منٹ کی بھی دیر نہ کریں۔ میں اسے دو ایک دن میں آپ کی بہو بنا کے گھر لانا چاہتا ہوں۔''

''پاگل ہوئے ہو کیا.....؟'' ماں نے بگڑ کے تیز لہجے میں کہا۔ ''اس لڑکی کے پچاس ہزار روپے دے رہے ہو.....؟'' ماں کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ''کیا پچاس ہزار کی رقم چھوٹی ہوتی ہے؟ تم نے کتنی محنت سے پیسا کما کے رکھا ہوا ہے؟ نہیں بیٹا نہیں.....''

''میرے خیال میں تو اس کے لیے ایک لاکھ کی رقم بھی کم ہے؟'' میں تکرار کے انداز میں بولا۔ ''اس میں جو خوبی اور خصوصیت ہے وہ آج کل کی لڑکیوں میں کہاں ہے؟''

''میرا بیٹا ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔'' میرا باپ جو اتنی دیر سے خاموش تھا اور ہم دونوں کی گفتگو سن رہا تھا آخر وہ بول اٹھا۔ ''ایسی لڑکی کے لیے پچاس ہزار کیا ایک لاکھ بھی کم ہیں۔ میرا مشورہ تو یہ ہے کہ پچاس ہزار میں بات پکی کرہی لو۔ کہیں بعد میں کف افسوس نہ ملنا پڑے۔''

☆☆☆

چوتھے دن میرا وہ خواب پورا ہوگیا جس کے لیے میں ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا۔ میری شادی نصیبن سے بخیر وخوبی انجام پائی۔ میری شادی میں شریک نوجوان لڑکے اور غیر شادی شدہ میری قسمت پر رشک کررہے تھے۔

میں نصیبن کو دلہن بنا کر گھر لایا تو بہت خوش تھا۔ ایک عجیب سی سرشاری تھی جو پرانی شراب کے خمار سے کہیں تیز تھی۔ میرے ماں باپ بھی اس طرح سے خوش تھے کہ جیسے انہیں ہفت اقلیم کی دولت مل گئی ہو اور پچاس ہزار کی رقم دے کر بغیر جہیز اور جوڑے کی رقم کے بہو لانے پر کوئی غم وملال نہ تھا اور نہ ہی کبھی اس بات کا طعنہ بہو کو دینے والے تھے۔

میں نے حجلۂ عروسی میں داخل ہوکر اپنی دلہن اور شریک حیات کو محبت بھری نظروں سے دیکھا اور اپنی خوش نصیبی پر ناز کرنے لگا۔ وہ سرخ رنگ کے جوڑے میں ملبوس پلنگ پر لیٹی ہوئی تھی اور اس نے میرے قدموں کی چاپیں سن کے آنکھیں موند لی تھیں۔ اس کے گورے چہرے پر فطری شرم وحیا چھائی ہوئی تھی۔ میں نے اپنی بیوی کے چہرے اور سراپا کا ایک بار پھر سے اس طرح جائزہ لیا جیسے میں کھرا سونا دیکھ رہا ہوں کہ اس میں کوئی کھوٹ نہ ہو۔ اصل سونا تو آپ ہی بولتا ہے۔

نصیبن کے گھنے، چمکیلے، ریشمی سیاہ بالوں کی چوٹی تو اس کے قد سے بھی لمبی تھی جو پلنگ پر کسی ناگن کی طرح بکھری ہوئی تھی۔ میں اپنی عجیب وخلقت بیوی کو پیار سے دیکھ رہا تھا جو دونوں ہاتھوں اور بازوؤں سے پیدائشی طور پر محروم تھی۔ بیس برس کی یہ گداز بدن کی دلہن تین فٹ سے زیادہ نہ تھی۔ اسے دیکھ، دیکھ کر خوش ہو رہا تھا کہ وہ میری زندگی بدل دے گی۔

اور یہ بات سچ ثابت ہوئی۔

''لی مارکیٹ، صدر، بوہری بازار، کلفٹن اور سپہون شریف جہاں بھی اسے لے جاتا پیسے کی بارش شروع ہوجاتی تھی۔ جو کوئی اسے دیکھتا اک دم سے ٹھٹک جاتا اور پھر اس کا ہاتھ میکانکی انداز میں جیب میں چلا جاتا تھا۔ کوئی اسے خیرات دیے بغیر نہیں جاتا تھا۔

اس کے ہونٹ کیسے سرخ وگداز اور رسیلے ہیں اور خوب صورت بھی۔ اس کی آنکھیں کتنی بڑی بڑی خوب صورت اور سیاہ قاتل۔ چہرے کے نقش ونگار میں کیسا تیکھا پن ہے۔ گورے گورے گال، اجلی رنگت۔ قدرت نے اگر اسے ہاتھ پیر سے محروم نہ کیا ہوتا تو وہ دنیا کی حسین ترین لڑکی کہلاتی اور یہی کمی میرے لیے خوش نصیبی بنی۔

میں نے کتنے ہی دنوں چھپ چھپ کر اور گھنٹوں کھڑے ہو کے دیکھا تھا اور حساب لگایا تھا کہ نصیبن کو روزانہ چھ سات سو سے زیادہ خیرات مل جاتی ہے۔ سپہون شریف میں تو اس نے صرف ایک دن میں پانچ چھ ہزار کی خیرات وصول کی تھی۔''

++

# ملامتی عورت

مکرمی مدیر
السلام علیکم!
ایک ایسی سچ بیانی بھیج رہا ہوں جو خود میں منفرد ہے۔ واقعات کو افسانوی انداز دے دیا ہے تاکہ پڑھنے والے سچ کی کڑواہٹ کو بھلا کر کہانی کا بھرپور لطف لیں، قارئین سبق حاصل کریں۔

امجد جاوید
(حاصل پور)

چھوٹی سی پختہ سڑک کے دونوں جانب تاحد نگاہ ویرانی تھی۔ ریتیلی مائل زمین پر جا بجا جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ دور دور تک کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں پچھلے پانچ گھنٹے سے اپنی کار میں مسلسل سفر کرتا ہوا یہاں تک پہنچا تھا۔ ہائی وے سے اترنے والی سڑک سنگلاخ تھی۔ وہاں اردگرد کافی رونق بھی تھی۔ جونہی اس سڑک پر سفر شروع کیا، رونق دھیرے دھیرے ختم ہونے لگی۔ اگر راستے میں کوئی گاؤں یا بستی آ جاتی تو لوگ دکھائی دیتے ورنہ پھر ویرانی دکھائی دینے لگتی۔ تقریباً ایک گھنٹا چلتے رہنے کے بعد رونق بالکل ہی ختم ہوگئی اور ویرانی ہی ویرانی شروع ہوگئی۔ میں جو سکون سے ڈرائیو کر رہا تھا، ایک دم سے بے چین ہوگیا۔ اس کی وجہ تھکن کے ساتھ ٹینشن بھی تھی۔ میرے دماغ میں یہ

سوال بھی ابھرنے لگا تھا کہ کہیں میرا تجسس مجھے کسی خطرے سے دوچار تو نہیں کرنے والا؟ کہیں یہ کوئی سازش تو نہیں؟ میں جس قدر اس خیال کو ذہن سے جھٹکتا، اتنا ہی یہ مجھ پر سوار ہو جاتا۔ میرا دماغ کہہ رہا تھا کہ واپس چلا جاؤں، یہ جو پانچ گھنٹے یہاں تک پہنچنے میں لگے ہیں اور پانچ گھنٹے واپسی کے، ان دس گھنٹوں کی کوفت برداشت کرلوں۔ اس سے پہلے کہ کسی بڑے حادثے کا شکار ہو جاؤں، مجھے پلٹ جانا چاہیے لیکن میرا تجسس مجھے آگے بڑھنے پر مجبور کر رہا تھا۔

میں دراصل ایک بڑے اخبار کا شوبز رپورٹر تھا۔ مجھے ایک ایسی خبر کے بارے میں پتا چلا تھا جو اپنی جگہ نہ صرف شوبز کی دنیا کے لیے تہلکہ خیز بھی بلکہ ہم شوبز سے تعلق رکھنے والے صحافیوں کے لیے بھی ایک بہت بڑی خبر تھی۔ سنسنی خیز انکشافات ہونے کی بھی توقع تھی۔ یہ سب کچھ ماضی کی ایک اداکارہ ماورا سے متعلق تھا جو چند برس پہلے فلمی دنیا پر چھائی ہوئی تھی۔ اگرچہ ان دنوں فلم انڈسٹری اپنے زوال کی طرف بڑھ رہی تھی لیکن پھر بھی بہت ساری فلمیں زیرِ تکمیل تھیں۔ ان میں سے آدھی فلموں میں وہ بطور ہیروئن تھی۔ گویا وہ سلور اسکرین کی متعلقہ العنان ملکہ تھی۔ فلموں کی کامیابی کی ضمانت تھی کہ ایک دن اچانک وہ منظر سے غائب ہوگئی۔

ماورا کے غائب ہونے کے ساتھ جہاں بہت سارے فلم پروڈیوسرز کا پیسا ڈوب گیا تھا، وہاں اس کا غائب ہو جانا بھی کسی معمے سے کم نہ تھا۔ چونکہ وہ مصروف اداکارہ تھی، اور ان دنوں اخبارات میں اس کے بارے میں روزانہ خبریں شائع ہوتی تھیں، ہر فلمی ایڈیشن میں اس کے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور ہوتا تھا... کیونکہ ماورا کو خبروں میں رہنے کا نہ صرف سلیقہ تھا، بلکہ وہ یہ ہنر بھی جانتی تھی کہ خبروں میں رہا کیسے جاتا ہے۔

پہلے پہل اس کے غائب ہو جانے کو اس کی چال سمجھی گئی کہ اخبارات اس پر تبصرے کرتے رہیں۔ یہ صرف ہم شوبز رپورٹرز کا خیال تھا۔ ورنہ ایک واویلا تھا جو ایک دم سے مچ گیا تھا۔ اس کے غائب ہونے پر یہی خیال کیا گیا کہ وہ اغوا ہوگئی ہے۔ جن پروڈیوسرز کا پیسا لگا ہوا تھا وہ تو باؤلے ہو گئے تھے۔ انہوں نے ماورا کی تلاش شروع کر دی لیکن چند دن تک اس کا کوئی سراغ نہ ملا تو قتل ہو جانے کی افواہ گرم ہوگئیں۔ کسی نے کہا وہ شادی کر کے غائب ہوگئی ہے، چند دن تک منظرِ عام پر آ جائے گی۔ کسی کا خیال تھا کہ وہ منشیات کا کاروبار کرتی تھی، پکڑے جانے کی وجہ سے فرار ہو گئی۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں اور اتنی ہی کہانیوں نے جنم لیا۔ اس ساری بھاگ دوڑ کا نتیجہ صرف یہی تھا کہ ماورا کا کہیں بھی سراغ نہیں ملا تھا۔

ماورا کے گھر والوں نے جس میں اس کا باپ، ماں اور ایک بھائی شامل تھے، انہوں نے پولیس میں رپورٹ کروا دی تھی۔ پروڈیوسرز، صحافی اور ماورا کو پسند کرنے والے عاشق بھی پولیس پر دباؤ دینے لگے کہ ماورا کو تلاش کیا جائے... مگر وہ کہیں نہیں ملی۔ وہ یوں غائب ہوگئی تھی، جیسے اس کا کوئی وجود ہی نہ ہو۔

ماورا کے غائب ہو جانے کے بعد مہینا دو مہینے شور برپا رہا پھر دنیا کے وتیرے کے مطابق آہستہ آہستہ اس کی خبریں پس منظر میں چلی گئیں۔ سارے مفروضے، قیاسات اور پولیس کی تفتیش دھری کی دھری رہ گئی۔ وہ نہ ملی اور نہ اس کا سراغ ملا۔ اس کی جگہ دوسری ہیروئینوں نے لے لیں۔ کچھ پروڈیوسرز نے دوسری اداکاروں کو لے کر اپنی فلم بنالی، کسی نے اپنی فلم کو جتنا بنایا تھا، اسے ڈبوں میں بند کر دیا۔ بہرحال اس کے جانے سے فلمی دنیا میں بہت سارے لوگوں کا نقصان ہوا۔ اس کے ساتھ ہی یہ سوال بھی اٹھ گیا کہ وہ غائب تو ہوگئی ہے، کیا وہ کسی کا پیسا بھی لوٹ کر لے گئی؟ اس رخ پر بھی بہت کچھ تلاش کیا گیا لیکن ایک بھی بندہ سامنے نہیں آیا، جس نے کہا ہو کہ ماورا اسے لوٹ کر لے گئی ہے۔ البتہ، اس کے گھر والوں نے جو رقم ایڈوانس میں لی ہوئی تھی یا انہوں نے اپنی خاص عادات کی وجہ سے لوگوں سے رقم وصول کی ہوئی تھی، اس کا تقاضا بڑھ گیا۔ گھر والوں نے کسی کو دیئے کسی کو نہ دیئے، وہ بھی ایک دن دنیا کی نگاہوں سے اوجھل ہوگئے۔ دھیرے دھیرے دنیا نے انہیں بھلا دیا لیکن یہ تجسس اپنی جگہ موجود رہا کہ وہ گئی کہاں؟ خاص طور پر ہم صحافی برادری میں کبھی نہ کبھی یہ سوال کوئی نہ کوئی کر دیتا۔ اس طرح وہ صحافی برادری میں زندہ رہی۔

جن دنوں میں نیا نیا صحافی بنا تھا اور صحافت کی دنیا سے وابستہ ہوا تھا، ماورا اس سے کچھ ہی عرصہ پہلے اس دنیا میں آئی تھی۔ جس طرح میرا جدوجہد کا دور تھا، اسی طرح ماورا بھی اپنے جدوجہد کے دور سے گذر رہی تھی۔ ان دنوں الیکٹرونک میڈیا نہیں آیا تھا۔ اخبارات، میگزین اور رسالے ہی خبروں کے ذرائع ہوتے تھے اور یہ ایک طاقت ور میڈیا تھا۔ صحافی کو خبر چاہیے ہوتی تھی، شوبز اور خاص طور پر

اداکاروں کو اپنی پبلسٹی کے لیے اسی میڈیا کی ضرورت ہوتی تھی اس لیے یہ دوطرفہ تعلقات میں، ایک دوسرے کی ضرورت کا خیال کرتے ہوئے تعلق نبھایا جاتا تھا۔ ورنہ شوبز والے لوگ مطلب نکل جانے پر اپنی آنکھیں ماتھے پر رکھ لیتے ہیں۔ ان کا یہ رویہ ان کی ضرورت بھی ہے اور کاروباری تقاضا بھی۔ اس وقت مجھے خبر نہ تھی کہ اس کے دوسرے شوبز رپورٹرز کے ساتھ کیسے تعلقات ہیں، لیکن میں یہ سمجھتا تھا کہ اس کے میرے ساتھ بہت اچھے اور گہرے مراسم بن گئے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے فلمی نگر اور اس کے باسیوں کے بارے میں مجھے بہت کچھ بتایا، سمجھایا اور سکھایا۔ فلم کی اس دنیا میں کس طرح رہا جاتا ہے، اس نے مجھے پوری طرح رہنمائی کی۔ اس کے عوض میں نے اسے خوب پر موٹ کیا، کیونکہ شروع شروع میں وہی میرے ہاتھ لگی تھی۔ اسی سے میں نے کام کی ابتدا کی تھی۔ میں اس کے تعلق کو دوستی سمجھنے لگا تھا۔ کچھ عرصہ بعد میں نے یہ سمجھا، یا مجھے اس نے یہ باور کرادیا کہ وہ مجھ پر مرمٹی ہے۔ اس لیے وہ میرے بغیر نہیں رہ سکتی۔

میرا اور اس کا تعارف ساجد فارانی نے کروایا تھا۔ وہ بھی شوبز رپورٹر تھا اور مجھے اس کی راہنمائی کی ضرورت تھی۔ وہ مجھے اکثر کہا کرتا تھا۔ ''او بچے تیرے پاس دو چیزیں ایسی ہیں جن سے تو اس شعبے میں بڑی ترقی کرسکتا ہے ایک تو 'چیک بچے' ہے اور دوسرا پیسے والا ہے۔''

'چیک بچے' سے مراد خوش شکل ہونا مراد تھا۔ میں یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ مجھ میں مردانہ وجاہت کافی حد تک ہے کہ خواتین مجھے دیکھنے پر مجبور ہو جایا کرتی ہیں۔ ایسے تبصرے میرے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی سو میں سن لیا کرتا تھا۔

ساجد فارانی چونکہ سینئر صحافی تھا، اس لیے وہ ہم نئے صحافیوں میں کھڑا نہیں ہوتا تھا، وہ کسی نہ کسی پروڈیوسر، ہدایت کار یا کسی اداکار کے پاس پایا جاتا تھا۔ اس دن میں بھی دوسرے شوبز رپورٹرز کی طرح ایورنیو اسٹوڈیو میں کھڑا تھا۔ ایسے میں ایک کالا بھجنگ سا لڑکا ہمارے پاس آیا اور پوچھا۔ ''آپ میں تنویر حسین کون ہیں؟''

''ہاں بولو کیا بات ہے؟'' میں نے جواب دیا۔

''وہ جی ساجد فارانی صاحب آپ کو بلا رہے ہیں۔'' اس نے کہا تو میں اس کے ساتھ چل دیا۔

وہ ایک فلم کے آفس میں مجھے لے گیا جہاں ساجد فارانی کے ساتھ دو لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ ماورا تھی۔ ان کے سامنے بلیک لیبل کی بوتل کھلی پڑی تھی۔ چار گلاس تھے، کچھ خالی کچھ آدھے۔ سگریٹ کی مہک سمیت دھواں پھیلا ہوا تھا۔ سبھی نے میری طرف دیکھا۔ ساجد فارانی نے مجھے ماورا کے ساتھ صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ ہے جی ہمارا 'چیک بچہ'، بتاؤ، یہ شوبز میں ترقی کرے گا کہ نہیں؟''

''کرے گا جی کرے گا۔'' ایک موٹی توند والے نے موٹی آواز میں ہنستے ہوئے کہا۔

''بہت کرے گا۔'' ایک آواز ابھری، اس کے ساتھ ہی ماورا کا ہاتھ میری گردن پہ آرہا اور پھر میرے شانوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔ ''ارے ہم کس مرض کی دوا ہیں ساجد صاحب، میرا نمبر دے دیں، کل ملتے ہیں۔ اس وقت تو.....'' یہ کہتے ہوئے وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

''او چیک بچے! کل چلے جانا میڈم کے پاس۔ اب تم جانو اور تمہارا کام۔'' ساجد فارانی نے کہا اور گلاس سیدھا کرلیا۔

ماورا نے میری جانب دیکھ کر کہا۔ ''پیو گے؟''

''نہیں۔'' میں نے اختصار سے کہا تو قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔ ''اوئے پھر جیو گے کیسے؟''

''ابھی اسے جینے دو، پھر خود ہی جینے لگے گا۔'' موٹی توند والے نے بوتل کی جانب ندیدے انداز میں دیکھتے ہوئے کہا۔ میں وہاں سے اٹھ کر باہر چلا آیا۔

اگلے دن میں اپنی کار میں اس کے گھر چلا گیا۔ ان دنوں ڈیفنس کے کئی فیز آباد ہو چکے تھے۔ شوبز والوں کے ہاں صبح دن کے بارہ بجے ہوتی ہے۔ میں تین بجے کے قریب اس کے پاس پہنچا۔ وہ لاؤنج میں تھی۔ مجھے دیکھتے ہی بولی۔

''میں تمہارا ہی انتظار کررہی تھی، آؤ۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے تقریباً کھینچتے ہوئے اپنے بیڈ روم میں چلی آئی۔ مجھے پہلے دن ہی یہ سبق دیا گیا تھا کہ اگر شوبز میں رہنا ہے تو جھجک یا شرم نہیں کرنی۔ سو میں اس کے بیڈ روم میں جا بیٹھا۔ شاندار سجے ہوئے بیڈ روم میں ہر شے موجود تھی۔ ایک بڑے سائز کا سنگھار میز کے ساتھ جہازی بیڈ اور اس سے ذرا ہٹ کر صوفے پڑے تھے۔ میں ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس نے کمال ادائیں دکھاتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا پیو گے؟''

''کافی۔'' میں نے سکون سے کہا۔

''بالکل، بالکل جو میں نے سوچا، تمہیں ایسا ہی رہنا

چاہیے، ٹھیک رہو گے۔''

''س سمجھا نہیں۔'' میں نے سیدھے ہو کر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''رات جب تم چلے گئے تو ساجد فارانی نے تمہارے بارے میں بتایا، تم کون ہو، کس خاندان سے تعلق رکھتے ہو، تم تو اڑتے ہوئے پنچھی ہو اور غلطی سے ادھر آ نکلے ہو۔'' اس نے ایک ادا سے کہا تو میں مسکراتے ہوئے بولا۔

''میں اتنا بھی بھولا نہیں ہوں۔ کام کی بات ہو جائے۔''

''ہو جائے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اس دوسری ملاقات میں کافی گپ شپ کے بعد مجھے لگا کہ یہ میرے کام کی ہے اور اسے بھی احساس ہو گیا کہ میں اس کے کام کا ہوں۔ یوں ہم میں ایک تعلق سا چل پڑا۔ جسے کئی نام ملتے چلے گئے تھے۔

ہر انسان میں خوبیاں اور خامیاں پائی جاتی ہیں۔ ماورا بھی ایک عام عورت تھی۔ اداکاری اس کا ایک کام تھا اور دنیا میں سروائیول کرنے کے لیے طریقہ اور سلیقہ تو چاہیے ہوتا ہے۔ اس کا ہنر وہ خوب جانتی تھی۔ اس میں کچھ خوبیاں بھی تھیں اور اتنی ہی خامیاں بھی موجود تھیں۔

مجھے اس میں سب سے اچھی خوبی یہ لگی تھی کہ وہ کسی بھی معاملے میں فوری ردِعمل نہیں دیتی تھی۔ معاملے کو چھان پھٹک کر کوئی فیصلہ کرتی اور پھر اس فیصلے پر ڈٹ جاتی تھی۔ وہ فیصلہ چاہے غلط ہو یا درست۔

میں ایک بار اس سے ناراض ہو گیا۔ یہ ناراضگی کئی دن تک چلی۔ میں نے کچھ لوگوں کے سامنے بیٹھ کر اس ناراضگی کے بارے میں بتاتے ہوئے تھوڑا بہت غلط کہہ دیا۔ چند دن بعد ایک پروڈیوسر کے پاس بیٹھا تھا کہ وہ وہاں آ گئی۔ کوئی بات کہے بغیر میرا ہاتھ پکڑا اور پیار سے بولی۔ ''آؤ، تم سے بات کرنی ہے۔''

میرے ذہن میں پہلا خیال ہی یہی آیا کہ اب میری پٹائی ہو گی۔ لازمی بات ہے باہر غنڈے ہوں گے۔ میں اکیلا اور نہتا، آج تو کام خراب ہو گیا۔ مگر ایسا بھی نہیں تھا کہ میں حوصلہ چھوڑ دیتا۔ میں ایسے کئی مرحلوں سے گزر کر یہاں تک پہنچا تھا۔ زیادہ سے زیادہ کیا ہو گا؟ میں نے بڑی نرمی کے ساتھ اس سے ہاتھ چھڑایا اور اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے اٹھ کے کہا۔

''چلو آؤ۔''

میں لڑنے کی ہی نیت سے کمرے سے باہر نکلا تھا مگر باہر کوئی بھی نہیں تھا۔ میں برآمدے میں کھڑا ہو گیا۔ وہ میرے پاس آئی اور میری گال پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

تم نے وہاں جو کہا، وہ ٹھیک تھا لیکن، پتا ہے کیا ہوا؟'' یہ کہہ کر وہ میرے چہرے پر دیکھنے لگی۔

''کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''لوگوں نے اسے پتا نہیں کیا سے کیا بنا دیا، میرا کچھ نہیں جائے گا، تمہاری شہرت خراب ہو جائے گی۔'' اس نے بڑے اطمینان سے کہا۔

''تو پھر؟'' میں نے پوچھا۔

''تو پھر یہ کہ دوستی کریں، بھول جائیں کہ ہم میں کچھ ایسا ہوا تھا، یار باشی میں ناراضگیاں ہوتی رہتی ہیں۔ چل، کسی ریستوران میں چلتے ہیں۔ کھانا کھاتے ہیں۔ وہاں سمجھاتی ہوں، یوں ناراضگی میں تیرا اور میرا کتنا نقصان ہے اور دوستی میں کتنا فائدہ۔''

میں کچھ کہے بنا اس کے ساتھ چل دیا۔

وہ بڑی الجھی ہوئی عورت تھی۔ میں نے شاید اسے ''الجھی ہوئی'' غلط کہا، وہ کوئی بے چین روح تھی، جسے خود سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ آخر چاہتی کیا ہے۔ کبھی کبھی مجھے وہ کھسکی ہوئی عورت لگتی۔ اس کے بارے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ اگلے پل کیا کر دے۔

ایک بار میں اسٹوڈیو گیا تو کافی زیادہ رونق تھی۔ اس قدر چہل پہل سے یہی لگ رہا تھا کہ آج ایک سے زیادہ فلور پر شوٹنگ چل رہی ہے۔ کافی ساری خبریں ملنے کا امکان تھا، کئی خبروں کی ٹپ مل جانی تھی، میں خاصا پُرجوش ہو گیا۔ وہ شاید دوسرا یا تیسرا سیٹ تھا جہاں میں گیا، وہاں پر مجھے ماورا مل گئی۔ اس فلم میں اس نے سائیڈ ہیروئن والا کردار کیا تھا۔ وہ اپنا کام ختم کر چکی تھی۔ اس کے چہرے پر کافی حد تک سنجیدگی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی تیر کی مانند میری طرف آئی اور آتے ہی بولی۔ ''چل چیک بیچ چلیں۔''

''کہاں جانا ہے، میں ابھی تو آیا ہوں۔'' میں نے احتجاجاً کہا تو وہ سکون سے بولی۔

''چل میں دیتی ہوں خبریں، تو چل میرے ساتھ۔''

اس نے میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا اور باہر کی جانب چل دی۔

''تم چلو، ڈریس بدلو، میں آتا ہوں۔'' میں نے اسے گولی دینا چاہی مگر وہ نہیں مانی میرا ہاتھ پکڑے چل دی۔ اس کے چہرے پر وہی گہرا میک اپ تھا۔ وہ مجھے لیے ہوئے پارکنگ میں آئی۔

''کہاں ہے تمہاری گاڑی؟'' اس نے پوچھا۔

''تمہاری کہاں ہے؟'' میں نے الٹا پوچھا۔

''وہ ڈرائیور لے جائے گا۔'' اس نے دور سے آتے ہوئے اپنے ڈرائیور کی جانب دیکھ کر کہا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ نہیں بخشنے والی۔ میں اپنی کار کی جانب بڑھ گیا۔ وہ میرے ساتھ پسنجر سیٹ پر آن بیٹھی۔

''کہاں جانا ہے؟'' میں نے گیئر لگاتے ہوئے پوچھا۔

''نہر پر ڈال لو اور بس چلتے چلے جاؤ۔'' اس نے شہر کے مشرق کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا اور میں نے گاڑی بڑھا دی۔ ہم کافی دیر تک چلتے رہے، وہ مجھے بہت سارا خبری مواد دیتی رہی۔ اشاروں کنایوں میں بہت کچھ سمجھایا۔ یہاں تک کہ ہم مغل پورہ بھی گئے۔ تبھی اس نے نہر کا پل پار کر کے دوسری جانب جانے کا کہا۔ میں اس چھوٹی سڑک پر آ گیا۔ کچھ دور ویران سی جگہ پر ایک ڈیرہ تھا۔ اس نے مجھے وہاں رکنے کو کہا۔ میں نے کار قریب لے جا کر روک دی۔

وہ ایک ملنگ کا ڈیرہ تھا۔ اس وقت بھی دو ملنگ موجود تھے۔ وہ ان کے پاس بڑے بے تکلفانہ انداز میں بیٹھ گئی۔ ایک ملنگ اس سے باتیں کرنے لگا۔ دوسرے ملنگ نے دو سگریٹ نکالے اور اس کا تمباکو نکال کر ''جوڑا'' تیار کرنے لگا۔ اس نے دو چرس بھرے سگریٹ بنا کر ماورا کی طرف بڑھا دیئے۔ ماورا نے لے کر سلگائے۔ اس نے باتیں کرتے ہوئے دو سگریٹ ختم کیے، تب تک ملنگ نے 'جوڑا' مزید تیار کر لیا۔ ماورا چھ سگریٹ کا دھواں ہوا میں اڑا کر اٹھ گئی۔ اس پر نشہ حاوی ہو چکا تھا۔ وہ میرے ساتھ واپس کار میں آ بیٹھی اور بولی۔ ''اب مجھے گھر پہنچا دو۔''

مجھے ایک دم سے ہی غصہ آ گیا لیکن اس وقت میں جو بھی کہتا، وہ سب ہوا میں اڑ جاتا۔ میرے کہنے کی اسے کیا خبر تھی۔ سو میں اسے گھر اتار کر اپنے گھر چلا گیا۔

ایسا ہی ایک بار اس نے پھر کیا۔ جنوری کی سرد رات چل رہی تھی۔ ٹھنڈ اپنے جوبن پر تھی۔ سرد ہواؤں نے ہر کسی کو جما کر رکھ دیا ہوا تھا۔ اس دن میں بستر میں دبکا ہوا تھا۔ کہیں بھی جانے کو جی نہیں کر رہا تھا۔ ایسے میں ماورا کا فون آ گیا۔ ''کیا ہو رہا ہے؟'' میں نے صورتِ حال بتائی تو بولی۔ ''چھوڑو بستر اور تیار جاؤ، ایک سرپرائز ہے۔''

''وہ کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''سوال مت کرو اور خوب گرم کپڑے پہن کر آ جاؤ۔ میں آ رہی ہوں، تمہیں پک کر لیتی ہوں۔ پندرہ منٹ ہیں تمہارے پاس۔'' یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

پندرہ منٹ کی بجائے آدھے گھنٹے بعد میرے گھر کی بیل بجی اور پھر مجھے لگا کہ وہ اندر آ گئی ہے۔ میں کمرے سے باہر آیا تو وہ میرے گھر والوں سے باتیں کر رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ پلٹ گئی۔ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے وہ باہر کھڑی فوروہیل میں جا کر بیٹھ گئی۔ کار میں ایک نئی اداکارہ اور شہر کے معروف بزنس مین کا بیٹا تھا۔ میرے بیٹھتے ہی ڈرائیور نے فوروہیل بڑھا دی۔ شاہدرہ پل جب گزر گیا تو میں نے ان سے پوچھا۔ ''او یار ہم سب جا کہاں رہے ہیں؟''

''ہم مری جا رہے ہیں۔ کیا تمہیں نہیں پتا وہاں برف باری ہو رہی ہے۔'' نئی اداکارہ نے بتایا تو میں خاموش ہو گیا۔ مرضی ہونے یا نہ ہونے کی بات کرنا ہی غلط تھا۔ وہ بزنس مین کا بیٹا تو نئی اداکارہ کے ساتھ مصروف تھا، جبکہ ماورا میرے ساتھ باتیں کرتی ہوئی سفر کرتی رہی۔ شام ہونے تک ہم مری پہنچ گئے۔ وہاں ہمارا ٹھکانا ایک گیسٹ ہاؤس میں تھا۔ ہمارے لیے تین کمرے مخصوص تھے اس لیے وہ نئی اداکارہ اور بزنس مین کا بیٹا، ہم سے الگ ہو گئے۔ ڈرائیور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ میں اور ماورا ایک کمرے میں پہنچ گئے۔

میں کمرے میں تھا اور میری ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ میں باہر جاؤں۔ کمرے میں ہیٹر تھا، سکون تھا، کمبل میں دبکا ہوا میں سو جانا چاہتا تھا لیکن بھوک نے بھی ستایا ہوا تھا، میرا خیال تھا کہ ہم کمرے ہی میں کھانا منگوا کر کھا لیں جبکہ ماورا کی خواہش تھی کہ یہاں اگر کمرے ہی میں رہنا ہے تو آنے کا فائدہ، سو کسی ہوٹل میں کھانا کھاتے ہیں۔ میں باہر جانے کو تیار ہو رہا تھا کہ باہر برف باری شروع ہو گئی۔ وہ تیار بیٹھی تھی۔ میری ہمت جواب دے گئی، میں کمبل اوڑھ کر لیٹ گیا۔ میں نے سوچا وہ خود ہی کھانا منگوا لے گی۔ مجھے اتنا یاد تھا کہ اس نے مجھے باہر چلنے کو کہا تھا۔ میں ڈھیٹ بنا لیٹا رہا۔ نجانے کب میری آنکھ لگ گئی۔

میری آنکھ کھلی تو رات کا دوسرا پہر گزر چکا تھا۔ ماورا کمرے میں نہیں تھی۔ میں نے کچھ دیر انتظار کیا اور پھر خود کو اچھی طرح ڈھانپ کر کمرے سے باہر آ گیا۔ وہ کسی کے کمرے میں نہیں جا سکتی تھی۔ مجھے یہ پورا یقین تھا کہ وہ باہر ہی گئی ہوگی۔ میں نیچے لابی میں آیا۔ وہاں کاؤنٹر سے پتا چلا کہ وہ تو کافی دیر ہوئے باہر جا چکی ہے اور ابھی تک واپس

نہیں لوٹی۔ مجھے اس کے پاگل پن پر حیرت نہیں ہوئی، ہاں غصہ ضرور آیا۔ میرے لیے مسئلہ یہ تھا کہ اب میں اسے کہاں تلاش کروں؟ میں باہر نکل پڑا۔ برف باری ختم ہو چکی تھی، سڑک پر برف پھیلی ہوئی تھی۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ رات کا وقت اور برف باری کے بعد یوں سڑکیں ناپنے کا میرا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ مجھے یہ بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ کہاں جا سکتی ہے۔ میں نے خود ہی سے طے کیا اور ایک جانب چل پڑا۔ کافی دور تک پیدل چلتا رہا اور پھر مایوس ہو کر واپس آ گیا۔ گیسٹ ہاؤس کے پاس آ کر دوبارہ مخالف سمت میں چل پڑا۔ اس طرف زیادہ رونق نہیں تھی۔ ابھی زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ مجھے ایک پارک دکھائی دیا۔ وہ چھوٹا سا پارک تھا، اور سڑک ڈھلوان تھی۔ میں نے یونہی اس میں جھانکا تو مجھے لگا جیسے کوئی بینچ پر بیٹھا ہے، غور کرنے پر شک ہوا اور میں اس جانب چل پڑا۔ میرا شک یقین میں بدل گیا۔ وہ ماورا ہی تھی۔ اور وہاں بیٹھی سگریٹ پھونک رہی تھی۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی بولی۔

''اوہ، تم تو سو رہے تھے جانی؟''

''یہاں کیا کر رہی ہو؟'' میں نے دبے دبے غصے سے پوچھا۔

''موسم کا مزہ لے رہی ہوں۔'' اس نے سکون سے کہا تو میں اپنے غصے کو دباتے ہوئے بولا۔

''اچھا اب میرے ساتھ جانا ہے یا یہیں بیٹھنا ہے۔''

''چلو چلیں۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھ گئی۔ ہم دونوں چلتے ہوئے واپس گیسٹ ہاؤس آ گئے۔ میں نے راستے میں اس سے کوئی بات نہیں کی لیکن میں نے محسوس کیا کہ وہ سردی سے کانپ رہی ہے۔ کمرے میں آ کر میں نے پوچھا۔

''کھانا کھا لیا تھا؟''

''تمہارے بغیر کیسے کھاتی، کسی ویٹر کو بلواؤ۔'' اس نے انٹرکام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

ویٹر کے آنے پر جب میں کھانا آرڈر کر چکا تو وہ اچانک ویٹر کی طرف دیکھ کر بولی۔

''کھانا کتنی دیر میں آئے گا؟''

''اس وقت تو میڈم آدھا گھنٹا لگ جائے گا۔'' ویٹر نے جواب دیا تو وہ الجھے لہجے میں بولی۔

''چلو آدھے گھنٹے بعد لے آنا لیکن ابھی کسی اچھے سے برانڈ کی وہسکی لا دو۔''

ویٹر سر ہلاتے ہوئے واپس ہو گیا۔

آدھی بوتل اندر اتار لینے کے بعد جا کر کہیں اس کی سردی کم ہوئی۔ کھانا آیا اور وہ بہت تھوڑا کھا کر یوں ہو گئی جیسے بہت پُرسکون ہو، اسی حالت میں وہ سو گئی۔ اس رات مجھے اس سے خوف آنے لگا تھا۔ نجانے کس وقت کیا کر دے؟

☆☆☆

ایک شام ہم دونوں ایک پروڈیوسر کے ہاں کھانے پر مدعو تھے۔ وہ ایک نئی فلم کے حوالے سے بات کرنا چاہتا تھا۔ وہاں دوسرے فنکار اور صحافی بھی تھے۔ اس محفل میں ماورا کا انتظار ہی ہوتا رہا۔ وہ وہاں نہیں آئی۔ میں نے اس کی خیریت دریافت کرنے کو وہیں سے فون کیا تو پتا چلا وہ گھر پر ہی ہے۔ اس نے اپنے یہاں بلا لیا۔ میں اس کے پاس جا پہنچا۔ اس نے مجھے گاڑی وہیں کھڑی کر دینے کو کہا اور مجھے اپنی کار میں لے کر چل دی۔ مجھے یوں لگا جیسے اس پر اداسی طاری ہے۔ وہ خاموش تھی۔ اتنی بات بھی نہیں کر رہی تھی۔ میں نے بھی زیادہ باتیں نہیں کیں۔ میں سمجھ رہا تھا کہ آج پھر ہمارے سفر کا اختتام کسی نشے پر ہی ہوگا۔ وہ سیدھا شاہدرہ میں مقبرہ جہانگیر پر پہنچی۔ رات کا وقت تھا اور چاندنی تھی۔ ایک سحر زدہ ماحول تھا وہ پھر بھی خاموش تھی، مجھے یوں بھول گئی تھی جیسے میں اس کے ساتھ تھا ہی نہیں۔ وہ پاگلوں کی مانند وہاں راہداریوں میں پھرنے لگی، کچھ دیر بعد اسے سکون ملا تو وہ ایک ستون کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔ نجانے کتنی دیر یونہی خیالوں میں کھوئی رہی، مدہوش سی۔ میں حیران تھا کہ وہ سگریٹ کیوں نہیں پی رہی۔ تقریباً تین گھنٹے وہ وہاں رہی، پھر اچانک اٹھ کر بولی۔ ''چلو کہیں سے کھانا کھاتے ہیں۔''

میں اس کے ساتھ چل دیا۔

وہ اکثر ایسی حرکتیں کرتی تھی۔ ایک دن میں نے ان حرکتوں کے بارے پوچھ لیا۔ وہ چند لمحے سوچتی رہی، پھر انتہائی اکتائے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''یار..... یہ جو ہم خانہ کی نجی محفلیں، ہوٹلوں میں تقریبات، شامیں، یہ سب کس لیے ہوتی ہیں؟ مفاد کے بنا کوئی کچھ نہیں کرتا، یہ سب مصنوعی ہوتی ہیں۔ ایک دم بے کار، کوئی فائدہ نہیں ہوتا، جعلی..... ان ویرانوں میں مجھے سکون ملتا ہے۔ یہ سب کر کے میں شانت ہو جاتی ہوں۔''

وہ اس کا اپنا خیال تھا جبکہ میں اسے کھسکی ہوئی، ایب نارمل عورت سمجھنے لگا تھا۔ ایک نمبر کی نشہ باز لیکن میں نے بعد میں یہ بھی..... دیکھا کہ کئی کئی دن تک اس نے کسی نشے کو

ہاتھ نہیں لگایا۔

پھر وہ غائب ہوگئی۔ اس کے غائب ہونے سے جہاں مجھے ایک خلا محسوس ہوا، وہاں ایک اچھا دوست بھی کھو گیا تھا۔ کچھ عرصے بعد ہی دو تین ہیروئین سے راہ رسم بڑھی۔ میرا خلا تو پُر ہوگیا لیکن اس کی یاد ہمیشہ ساتھ رہی تھی۔ کبھی کوئی تحفہ دیکھ کر، کبھی صحافیوں میں بات کے حوالے سے، کبھی کوئی فلم دیکھ کر، کبھی ویسے ہی کسی جگہ جا کر ہم نے بہت اچھا وقت گزارا تھا۔ یوں وہ ایک یاد بن کر رہ گئی، میرے خیال میں پانچ برس کا عرصہ بیت گیا ہوگا۔

تین دن پہلے کی بات ہے میں ایک ٹی وی ڈرامے پر تبصرہ لکھ رہا تھا۔ وہی رونا دھونا، مظلوم عورت، مصالحے دار اسکرپٹ والا ڈراما تھا۔ میں لکھتے ہوئے کچھ ایسا سوچ رہا تھا کہ سارا کچہ چھٹا کھول دوں۔ ان دنوں سیل فون عام عوام کی دسترس میں آچکے تھے۔ چونکہ باقاعدہ کسی نظم کے تحت نہیں تھے اس لیے بہت سارے گم نام لوگ استعمال کر رہے تھے۔ دوسرے لفظوں میں کہا جا سکتا تھا کہ جرائم پیشہ لوگوں کو ایک نیا ہتھیار مل گیا تھا۔ میں نے بھی ایک فون لے لیا تھا۔ میرا نمبر ہزاروں کے پاس تھا۔ دن دن بھر فون آتے رہتے کہ ایک روز میرے سیل فون پر ایک پیغام آیا۔ میں نے اسے نظر انداز کر دینا چاہا کہ بعد میں دیکھ لوں گا لیکن میں ڈرامے پر کچھ ایسا سچ لکھنا اس لیے نہیں چاہ رہا تھا کہ چینل کی پالیسی کچھ دوسرے قسم کی تھی۔ سو میں نے کاغذ قلم سے نگاہیں ہٹائیں اور سیل فون اٹھا لیا۔ وہ میسج ایک ایسے نمبر سے تھا جو میرے پاس محفوظ نہیں تھا لیکن جیسے ہی میں نے اسے پڑھا تو دنگ رہ گیا۔ لکھا تھا ''ماورا، تمہیں ماورا ادا کار اتو یاد ہوگی، یا بھول گئے؟ میں وہی ہوں، کیسے ہو؟''

اتنا وقت گزر جانے کے بعد اس کا میسج؟ میں چند لمحے سوچتا رہا کہ ممکن ہے کسی نے شرارت کی ہو۔ کوئی ہمارے جاننے والا ہو۔ ایسے ہی مجھے گھما رہا ہو۔ میں نے خود کو پُر سکون کیا اور جواباً یہ میسج بھیج دیا کہ اگر تم واقعی ہی ماورا ہو تو کوئی نشانی بتاؤ؟ میں اسے فوراً کال بھی کر سکتا تھا لیکن جو مجھے گھمانا چاہتا تھا میں نے بھی اس کے ساتھ تھوڑی دیر کھیل لینا چاہا۔ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ مجھے اسی نمبر سے جواب مل گیا۔ ''میں واقعی ہی ماورا ہوں اور نشانی ہے 'چیک بچہ'۔ اور نشانیاں پوچھو گے تو بتا دیتی ہوں مگر تم مجھے کال مت کرنا۔ کرو گے بھی تو میں سن نہیں پاؤں گی۔ بس اپنا حال بتاؤ کیسے ہو؟''

سیل فون پر ابھرے ہوئے لفظ مجھے پاگل کر دینے کو کافی تھے۔ اتنے برس بعد بھی اس نے پہلی ملاقات میں کہے گئے لفظ یاد رکھے؟ میں حیران تھا۔

میں نے اسی نمبر پر کال ملائی، مگر بیل جانے کے باوجود کال پک نہیں کی گئی۔ میں نے دوسری بار کال ملائی تو فون بند تھا۔ میں پریشان ہوگیا کہ یہ کیا تماشا ہے؟ میں رات گئے تک اس نمبر پر ٹرائی کرتا رہا لیکن وہ بند ملتا رہا۔

کیا میسج کرنے والے کو یہ نہیں پتا کہ میں اس نمبر کے بارے میں سب پتا کر سکتا ہوں، وہ کہاں سے بات کر رہا ہے یہ بھی مجھے معلوم ہو سکتا ہے۔ کچھ مشکل ضرور آتی لیکن کچھ نہ کچھ تو پتا چل سکتا تھا۔ یہ کیسا ایک معما ہے، کوئی کھیل ہے؟ یا کوئی تنگ کر رہا ہے؟ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آیا اور میں نے اسے ذہن سے نکال کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر وہ میرے ذہن سے نہیں نکلی۔ میں رات گئے تک اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ مجھے اس کے ساتھ بتائے بہت سارے واقعات یاد آتے چلے گئے۔ مجھے اعتراف کرنا پڑا کہ میں اسے بھلا نہیں پایا ہوں۔ اس کے ساتھ گزرا ہوا ہر لمحہ مجھے یاد تھا۔

اگلے دن کی صبح بھی وہ میرے ذہن میں تھی۔ میں نے صبح ہی صبح اپنا فون دیکھا تو اسی نمبر سے ایک میسج آیا ہوا تھا۔ لکھا تھا۔

''میں نے کہا نا مجھے کال مت کرنا اور اگر تمہارے دل میں میرے لیے ذرا سی بھی قدر ہے تو مجھے کبھی فون مت کرنا۔''

''مگر کیوں؟ کیوں فون نہ کروں۔ مجھ سے بات کرو۔ بات نہیں کرنی ہے تو پھر رابطہ کیوں کیا؟ بات کرو، ورنہ میں خود تمہیں تلاش کر لوں گا۔'' میں نے اسے یہ میسج بھیج دیا کچھ دیر بعد جواب آگیا۔

''تم چاہو بھی تو مجھے تلاش نہیں کر سکتے۔ میں جانتی ہوں نمبر ٹریس ہو جاتا ہے۔ تم میرے آس پاس تو پہنچ سکتے ہو مجھے نہیں مل سکتے۔ ہاں مگر میں تم سے ضرور ملنا چاہتی ہوں۔''

''تو پھر مجھ سے بات کرو اپنے بارے میں بتاؤ، کہاں ہو؟ کس حال میں ہو، میں تم سے ملنا چاہتا ہوں؟''

''اچھا بتا دوں گی۔''

اس نے یہ میسج بھیج کر ایک طرح مجھے انتظار بھرا تجسس تھما دیا اور میں سوائے انتظار کرنے کے اور کچھ نہیں کر سکتا

تھا۔ جہاں میرے ذہن میں بہت سارے سوال اٹھ رہے تھے، وہاں میرے اندر کا صحافی بھی پوری طرح سے بیدار ہو گیا تھا۔ ماورا کا مل جانا اور اس سے جڑی ہوئی باتیں ایک ایسا انکشاف تھا جو چند دن کے لیے سہی، لیکن تہلکہ خیز تھا۔ ایسی سنسنی خیز خبر میرے لیے انتہائی پُرکشش تھی۔

مجھے یہ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ میں اس تک پہنچوں کیسے؟ میں کوشش کرتا تو اس علاقے کے بارے میں خبر ہو جاتی جہاں سے کال کی گئی ہے۔ اس سے زیادہ کچھ معلوم نہیں ہو سکتا تھا۔ میں یہی ہوا میں گھوڑے دوڑا رہا تھا کہ اسی رات اس کا میسج آ گیا۔ ''کیا تم مجھ سے ملنا چاہو گے؟''

''بالکل، میں تم سے ملنے کے لیے بیتاب ہوں، مجھے اپنے بارے میں بتاؤ۔'' میں نے اسی وقت اسے میسج کیا۔ کچھ دیر بعد اس نے جو میسج بھیجا اس میں صرف اس علاقے کا نام تھا، اس کے ساتھ یہ لکھا تھا کہ وہاں پہنچ جاؤں تو وہ آگے کا راستہ بتائے گی۔ میں تھوڑی دیر تک اس پیغام کے بارے میں سوچتا رہا۔ پھر میں نے فیصلہ کر لیا کہ ایک بار ضرور کوشش کروں گا اور میں نے اسی وقت اسے جذباتی سا پیغام بھیج دیا

''صبح میں تم سے ملنے کے لیے آ رہا ہوں۔ چاہو تو ملو اور چاہو تو نہ ملو، میں بہرحال آ رہا ہوں تاکہ میرے دل میں یہ حسرت نہ رہے کہ میں نے تم تک پہنچنے کی کوشش نہیں کی۔''

میں نے چونکہ فیصلہ کر لیا تھا اس لیے صبح ہوتے ہی گھر سے دفتر گیا اور وہاں سے ماورا کی تلاش میں نکل پڑا۔

جس وقت میں لاہور سے نکلا، دوپہر ہو گئی تھی میں نے راستے کے بارے میں معلومات لے لیں تھیں اس لیے میں چلتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ اس ویرانے میں آ پہنچا۔ یہاں آ کر مجھے احساس ہوا کہ شاید میں غلط جگہ پر آ گیا ہوں۔ میں نے یہی سوچتے ہوئے پہلے وقت دیکھا، پھر ڈھلتے ہوئے سورج کو۔ میں واپس لوٹ جاتا کہ مجھے کافی فاصلے پر دو تین کچے مکان دکھائی دیئے۔ میں نے ان تک پہنچ کر معلومات کرنا چاہی۔ اس طرح مجھے واپس جانے یا ماورا کو تلاش کرنے کے بارے فیصلہ کرنے میں آسانی ہوتی۔ میں نے رفتار تیز کر دی۔ کچھ ہی منٹوں بعد میں وہاں پہنچ گیا۔

میں جیسے ہی ان کچے مکانوں کے پاس گیا تو یہ دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوئی کہ وہ ایک بڑا سا ڈھابا تھا۔ جس پر کافی لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ اس پر حیرت زدہ کر دینے والا ایک اور منظر میرے لیے یہ تھا کہ وہاں میرے ہی ساتھی کولیگ شوبز رپورٹر اسد شریف کی گاڑی کھڑی ہوئی تھی۔ میں نے کار کو بریک لگائے تو وہ مجھے اندر ایک چارپائی پر بیٹھا ہوا دکھائی دیا۔ وہ بھی میری طرح مجھے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ میں کار سے اترا اور سیدھا اس کی طرف بڑھا۔ وہ مجھے دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا اور میری طرف انگلی کا اشارہ کرتے ہوئے انتہائی حیرت سے بولا۔ ''تم، ادھر؟''

''یہی حیرت مجھے ہو رہی ہے، تم؟'' میں نے پوچھا اور ہاتھ ملایا، وہ چند لمحے سوچتا رہا پھر یقین بھرے لہجے میں بولا۔

''ماورا.....؟''

''ہاں، کیا تم بھی؟'' میں نے اقرار کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''ہاں، وہی ..... مگر .....'' میں کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔ میں کہنا یہ چاہ رہا تھا کہ اس کا مجھ سے جو ذاتی تعلق تھا، میں تو زیادہ تر اس کے پیچھے آیا تھا، کیا اس کا بھی اتنا تعلق تھا؟ کیا اسے بھی میسج ملے؟ وہ کیسے؟ میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

''یقیناً تمہیں بھی میسج کر کے بلایا گیا ہو گا؟''

''بالکل۔'' میں نے اعتراف کر لیا۔

''میسج، ذرا دکھانا اپنے والے میسج۔'' اس نے اپنا فون میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ مجھے بھی اتنا ہی تجسس تھا کہ اس کے میسج دیکھوں۔ میں نے اپنا فون بڑھا دیا اور اس کا فون لے کر اس کے میسج پڑھنے لگا۔ ترتیب اور انداز وہی تھا جو میرے ساتھ آزمایا گیا تھا، لیکن تھوڑی بہت مختلف تحریر تھی، جیسے ماورا نے میری پہچان 'چیک بچ' بتائی تھی۔ اسد شریف کے ساتھ دوسری پہچان تھی۔ میسج پڑھ کر ہم نے فون ایک دوسرے کو واپس کر دیئے۔ بلاشبہ وہ بھی میری طرح یہی سوچ رہا ہو گا کہ ٹریپ ہو گئے۔ کسی نے بڑا شدید مذاق کیا ہے یا پھر کوئی سنجیدہ بات ہے، کچھ ایسا ہے جو بہرحال وہ نہیں جو سامنے نظر آ رہا تھا۔

ہم دونوں چارپائی پر بیٹھے تھے اور خاموش تھے۔ شام کا ہلکا ہلکا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ ایسے میں ڈھابے کے سامنے ایک کار آن رکی۔ اس کار کو دیکھ کر ہم دونوں کو حیرت نہیں ہوئی بلکہ ہمارے ہونٹوں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔ کار میں سے عمران جعفری اپنے کھلتے کھلتے کرتے ہوئے جسم کو سنبھالتے ہوئے اترا۔ وہ ہماری گاڑیاں دیکھ کر حیران تو تھا لیکن جیسے ہی اس کی نگاہ ہم پر پڑی، اس کے چہرے پر بھی پہلے حیرت

اتری، پھر مسکراہٹ رینگ گئی۔ اس کے ساتھ بات کر کے پتا چلا کہ ہماری والی ہی کہانی ہے۔ فرق وہی میسج والا ہی تھا۔ اسے بہرحال صرف خبر ہی کا لالچ یہاں تک کھینچ کے لایا تھا۔ ہمیں دیکھ کر اور پھر ہماری بات سن کر اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''میرے خیال ہے ابھی اور کبوتر اتریں گے یہاں۔''

''مجھے بھی لگتا ہے۔'' اسد شریف نے سنجیدگی سے کہا۔

''لیکن سوال یہ ہے کہ اگر ماورا ہے تو اتنا تجسس کیوں پھیلا رہی ہے؟'' میں نے جلے ہوئے انداز میں پوچھا۔

''ممکن ہے اس کی کوئی مجبوری ہو، وہ ابھی سامنے نہ آنا چاہتی ہو، یا جو بھی وجہ ہو، یہ وہی بتا سکتی ہے؟'' اسد شریف بولا۔

''اور اگر وہ ماورا نہ ہوئی تو؟'' عمران جعفری نے پُرخیال لہجے میں اپنی رائے دی تو چند لمحے سبھی خاموشی میں ڈوب گئے۔ کسی کے پاس کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔

''میرے خیال میں کسی نے ہم شوبز رپورٹر کے ساتھ مذاق کیا ہے۔ یہ بات اس وقت زیادہ پختہ ہو جائے گی جب یہاں ایک آدھ مزید شوبز رپورٹر آ جائے گا۔'' اسد شریف نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔

''بالکل، اگر ماورا کو خبر بننا ہے، یا کوئی مسئلہ درپیش ہے یا جو بھی کچھ ہے تو میرا خیال ہے ایک آدھ کو اعتماد میں لے کر سب کچھ کر سکتی تھی۔ یوں سب کو یہاں جمع کرنے کا مقصد سوائے مذاق کے اور کچھ نہیں۔''

''صاحب جی کھانا کھائیں گے آپ؟'' وہ ڈھابے والا ہمارے پاس آ کر بولا۔

''ہاں یار بھوک تو لگی ہے۔'' میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے آپ آرام کرو، میں آپ کے لیے اسپیشل کھانا بناتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ مڑ گیا۔

ہم یہی باتیں کر رہے تھے کہ ڈھابے کے باہر ایک کار آن رکی۔ لاشعوری طور پر ہم نے انہیں دیکھا اور اس وقت حیرت زدہ انداز میں ہنس دیے، جب پہلے فرمان شاہ اور کے بعد صابر فاروقی کار سے باہر نکلے۔ وہ ہمیں دیکھ کر فطری طور پر حیران ہوئے اور ایک دم سے ہنس پڑے۔ ان کے ساتھ بھی ویسا ہی کچھ ہوا تھا، جیسے ہمارے ساتھ ہوا تھا۔

سورج غروب ہو چکا تھا۔ ہم سب نے باری باری اسی نمبر پر پیغام بھیجے کہ ہم یہاں پر پہنچ چکے ہیں۔ اب بتاؤ کہاں آنا ہے۔ فون کرتے تو کوئی ریسپونس نہیں کر رہا تھا۔ یہاں تک کہ فون ہی بند ہو گیا۔ فون کے بند ہو جانے کا واضح مطلب تھا کہ وہ جو کوئی بھی تھا ہمارے ساتھ رابطے میں نہیں رہنا چاہتا تھا۔ ہمارا یہاں آنا ایک فضول کوشش تھی۔

ڈھابے کا کھانا کافی مزیدار تھا۔ اسے کھانا بنانا آتا تھا۔ جب ہم کھا چکے تو سبھی کی یہی رائے تھی کہ کسی نے ہمارے ساتھ بڑا ہی سنگین مذاق کیا ہے۔ اب اس سے بچنے کا حل یہی ہے کہ فوراً ایک بک نک قسم کی کہانی گھڑی جائے اور واپس چل دینا چاہیے۔ سبھی اس پر متفق ہو گئے۔ کچھ دیر مزید ٹھہر کر انہوں نے طے یہ کیا کہ رات قریبی شہر کے کسی ریسٹ ہاؤس میں گزاری جائے اور صبح واپس جایا جائے۔ اس کے ساتھ ہی اسد شریف نے اپنے رابطے آزمانا شروع کر دیے تاکہ ریسٹ ہاؤس مل جائے اور وہاں سکون سے رات گزاری جا سکے۔ وہ سب طے کر رہے تھے لیکن میرا دل نہیں مان رہا تھا کہ میں یہاں سے جاؤں۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی ان دیکھی قوت مجھے وہاں رکنے پر مجبور کر رہی ہے۔

''ہاں تو پھر چلیں؟'' اسد شریف نے پوچھا۔

''چلو۔'' سبھی نے یک زبان ہو کر کہا۔

وہ سب اٹھ گئے تو میں بیٹھا رہا۔ سبھی فرمان شاہ نے پوچھا

''تم نے نہیں جانا؟''

''نہیں، میں دو چار گھنٹے یہیں گزاروں گا، پھر رات ہی واپس لاہور چلا جاؤں گا۔'' میں نے کہا۔

''صبح سب اکٹھے.....'' اس نے کہنا چاہا تو میں بولا۔

''میری فکر مت کریں۔'' یہ کہتے ہوئے میں کھری چارپائی پر لیٹ گیا۔

''شاید اسے اب بھی اُمید ہو گی۔ چلو کوئی بات نہیں، اگر رابطہ ہو جائے تو ہمیں بتا دینا، ہم واپس آ جائیں گے۔'' اسد شریف نے ہنستے ہوئے کہا اور ڈھابے سے باہر چل دیا۔

کچھ دیر بعد وہ وہاں سے چلے گئے۔ میں چارپائی پر لیٹا سوچتا رہا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں تھکا ہوا تھا، کچھ بھی نہ سوچ سکا اور میری آنکھ لگ گئی۔

☆☆☆

میں بیدار ہوا تو سورج کی روشنی ہر طرف پھیل چکی تھی۔ ڈھابے والا کچھ دور بیٹھا ہوا برتن ترتیب سے رکھ رہا تھا۔ اردگرد کی ساری چارپائیاں خالی پڑی تھیں۔ سامنے

میری کار کھڑی تھی۔ دور دور تک کوئی ذی روح دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ مجھے اٹھ کر بیٹھا دیکھ ڈھابے والے نے اپنے ہاتھ صاف کیے اور میرے قریب آ کر بولا۔ ''صاحب بڑی گہری نیند سوئے ہیں آپ؟''

''نیند تو نیند ہی ہوتی ہے یار، پر یہ گہری نیند کا تم کیوں کہہ رہے ہو؟'' میں نے ہلکے سے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''صاحب جی، میں نے آپ کو دو تین آوازیں دیں میں نے گھر جانا تھا، لیکن آپ نے کوئی جواب نہیں دیا، میں بھی پھر ادھر ہی رہ گیا، آپ نجانے کتنے تھکے ہوئے ہوں گے۔'' اس نے سادگی میں کہا تو میں ہنس دیا۔ پھر اس سے کہا۔

''تم اچھا سا ناشتا بناؤ، میں منہ ہاتھ دھو کر آیا۔''

''ٹھیک ہے جناب۔'' اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا اور جلتے ہوئے چولہے کے پاس چلا گیا۔ وہ وہاں پر ناشتا بنانے لگا اور کونے میں لگے ہوئے ہینڈ پمپ کی جانب بڑھ گیا۔

اس وقت میں ناشتا کر کے چائے کا کپ تھامے بیٹھا سوچ رہا تھا کہ مجھے باقی شوبز رپورٹر دوستوں سے رابطہ کرنا چاہیے یا پھر سیدھے لاہور نکل جانا چاہیئے۔ میں کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ انہی لمحات کے دوران میرے سیل فون کی ٹون بجی اور میسج آ گیا۔ میں نے فون اٹھا کر میسج دیکھا تو وہ ماورا کی طرف سے تھا۔ اس نے لکھا تھا۔ ''میں جانتی ہوں کہ تم رات کے یہیں ہوڈھابے پر۔ کسی سے کچھ بھی مت کہنا میں ابھی تھوڑی دیر بعد تمہیں بلاتی ہوں۔''

ایک لمحے کے لیے تو مجھے چائے کا گھونٹ لگ گیا۔ یہ کیا مذاق ہوا، وہ جانتی بھی ہے کہ میں یہاں ہوں تو پھر رات ہی کو مجھے اپنے پاس کیوں نہیں بلا لیا؟ آخر وہ چاہتی کیا ہے؟ کیوں یہ سب تماشا لگایا ہوا ہے؟ میں نے سکون سے چائے ختم کی اور ڈھابے والے کو اپنے پاس بلایا۔ وہ میرے پاس آ گیا تو میں نے چند بڑے نوٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''یار تمہاری بڑی مہربانی، تم نے میرا خیال رکھا۔''

''جی کوئی بات نہیں، میں یہاں بیٹھا ہی آپ جیسے مسافروں کے لیے ہوں۔'' اس نے خوشدلی سے کہا اور سلام کر کے پھر سے چولہے کے پاس جا کھڑا ہوا۔ مجھے اب ماورا کے فون یا میسج کا انتظار تھا۔ میں نے اپنے طور پر فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر اگلے آدھے گھنٹے میں اس کا میسج نہیں آیا تو میں واپس چل دوں گا پھر نہیں پلٹوں گا۔

اس وقت میں اٹھ کر کار کی جانب بڑھ چکا تھا جب میرے فون کی اسکرین جاگی، ماورا کا میسج آیا تھا۔ اس نے لکھا تھا، ''یہاں سے بستی کی طرف آؤ گے تو پہلے دائیں طرف ایک راستہ جاتا ہے۔ اس کے آخری سرے پر ایک دربار ہے۔ وہاں آ جاؤ۔''

میں نے ایک لمحے کو سوچا اور پھر ڈھابے والے سے پوچھا۔

''یار یہاں بستی کس طرف ہے؟''

''آپ سیدھے جائیں گے تو آدھے کلومیٹر سے تھوڑا کم ہی فاصلہ ہے۔'' اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے سمجھاتے ہوئے بتایا۔

''اور کوئی دربار بھی ہے اس کے قریب؟'' میں نے پوچھا۔

''جی ہاں، اس سے پہلے ہی دائیں ہاتھ اینٹوں سے بنا سولنگ ہوگا۔ جہاں وہ ختم ہوگا، وہیں دربار ہے۔''

''بہت شکریہ۔'' میں نے کہا اور کار میں آ بیٹھا۔

تھوڑی ہی دیر بعد اینٹوں کا سولنگ آ گیا۔ میں نے کار اس طرف موڑ لی۔ تقریباً فرلانگ بھر فاصلے کے بعد سامنے ایک دربار دکھائی دینے لگا۔ سفید گنبد پر رنگ برنگے جھنڈے لگے ہوئے تھے۔ میں نے مین گیٹ کے پاس کار پارک کی۔ گیٹ کے پاس بیٹھے شخص کے پاس جوتے اتار کر اندر چلا گیا۔ وہ دربار کوئی اتنا بڑا نہیں تھا، تھوڑے سے لوگ تھے وہاں پر۔ میں نے اردگرد دیکھا تاکہ مجھے کہیں ماورا دکھائی دے جائے لیکن مجھے کوئی ایسی عورت دکھائی نہیں دی۔ میں نے مزار کے پاس جا کر فاتحہ پڑھی اور پلٹ کر پھر اردگرد دیکھا۔ مجھے خود پر شدید غصہ آنے لگا تھا۔ میں نے جیسے ہی باہر کی جانب قدم بڑھائے۔ ایک کانپتی ہوئی آواز مجھے قریب سے سنائی دی۔ ''او چیک بچے.....''

میں نے تیزی سے مڑ کر دیکھا۔ میرے سامنے ایک ایسی عورت کھڑی تھی جو بالکل ہڈیوں کا ڈھانچا بن چکی تھی۔ دھنسی ہوئی آنکھیں، پچکے ہوئے گال، پیلی رنگت، پپڑیاں جمے خشک ہونٹ، میلی سی، ماورا نہیں ہو سکتی تھی مگر اس کی ہلکی سی مسکان بتا رہی تھی کہ وہ ماورا ہی ہے۔

''تم..... ماورا.....؟''

''ہاں، میں ہی ماورا ہوں۔'' اس نے زخمی سی مسکان کے ساتھ کہا۔

''تم یوں..... پہچانی نہیں جا رہی ہو؟'' میں نے

حیرت سے پوچھا۔

''تمہاری حیرت کی وجہ میں جانتی ہوں، یہی بڑی بات ہے کہ میں زندہ ہوں ابھی۔'' اس نے اداس لہجے میں حسرت سے کہا تو میں نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

''میں سمجھ نہیں پا رہا..... یہ سب..... کیا ہے؟''

''آؤ بیٹھو، میں تمہیں بتاتی ہوں۔'' اس نے کہا اور مجھے لے کر دربار کے ایک حجرے نما کمرے کی جانب چل دی۔ وہاں بیٹھا مجاور نما ایک شخص ہمیں دیکھ رہا تھا۔ اس نے ایک لفظ تک نہیں کہا۔ مجھے یوں لگا جیسے ماورا اور وہ ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔

حجرہ نما کمرے میں خس کی صفیں بچھی ہوئی تھیں۔ ہم آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ وہ چند لمحے اپنے خیالوں میں کھوئی رہی پھر جیسے اس نے ہمت کر لی ہو۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ رندھے ہوئے لہجے میں گویا ہوئی۔

''تمہارا شکر یہ تم یہاں تک آن پہنچے لیکن تمہیں یہاں سے کوئی خبر نہیں ملے گی بلکہ میں نے تمہیں اپنی مدد کے لیے بلایا ہے۔''

''ہاں یہ سچ ہے کہ میں کسی خبر ہی کے لیے نکلا تھا مگر یہ بھی سچ ہے کہ مجھے تمہاری زیادہ فکر تھی، میں نہیں سمجھ پا رہا تم نے اتنے پُراسرار طریقے سے مجھے یہاں کیوں بلایا؟'' میں نے اپنا تجسس دور کرنے کے لیے پوچھا۔

''میں نے صرف تمہیں نہیں، اس دور کے سب شو بز رپورٹرز کو بلایا، وہ سب چلے گئے کہ وہ کسی خبر کی تلاش میں تھے۔ لیکن تم..... سچ پوچھو تو میرا دل کہہ رہا تھا تم ہی ثابت قدم رہ کر مجھ تک پہنچو گے۔'' اس نے پُرسکون لہجے میں کہا۔

''خیر..... یہ مکالمہ بازی پھر سہی، میں یہ بھی نہیں پوچھوں گا کہ تم اچانک کیوں غائب ہوئیں یہاں کیسے ہو؟ اس وقت مجھے بتاؤ تمہیں مسئلہ کیا ہے؟'' انجانے کیوں میرے لہجے میں تلخی در آئی تھی۔ میری بات سن کر وہ چند لمحے خاموش رہی پھر بولی۔

''مجھے یہ سمجھ نہیں آ رہا، میں تمہارے کس سوال کا جواب پہلے دوں یا پھر اپنا مسئلہ بتاؤں۔''

''تم جو بھی کہنا چاہو، بس کہہ دو۔'' میں نے اکتائے... ہوئے لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے، پہلے میں تمہیں اپنے بارے میں بتا دوں پھر تمہیں میرے مسئلے کا اندازہ ہو گا۔'' اس نے سوچتے ہوئے کہا تو میں خاموش رہا۔ وہ کہتی چلے گئی۔

## فاتحہ

سورۃ فاتحہ، قرآن مجید کی پہلی سورت کا نام ہے۔ اس سورۃ کا نام فاتحۃ الکتاب ہے اس لیے کہ قرآن مجید کا آغاز اسی سے ہوتا ہے۔ یہ سورہ مکی ہے۔ بعض مدنی کہتے ہیں مگر زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ مکی بھی ہے اور مدنی بھی ہے۔ ایک بار مکہ میں نازل ہوئی جب نماز فرض کی گئی پھر مدینہ میں نازل ہوئی جب قبلہ کی تبدیلی ہوئی۔ اس کا نام ام الکتاب اور ام القرآن بھی ہے کیونکہ رسول اللہؐ نے فرمایا ہے اس شخص کی نماز نہیں ہوتی جو ام القرآن نہ پڑھے۔ سورہ وافیہ اور سورہ کافیہ بھی اس کا نام ہے اس لیے کہ یہ قرآن کے اکثر مضامین پر جامعیت کے ساتھ مشتمل ہے۔ سورۃ الکنز بھی اس کا نام ہے کیونکہ حدیث قدسی میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: فاتحہ الکتاب میرے عرش کے خزانوں سے ایک خزانہ ہے۔ سورہ شفاء اور سورہ شافیہ بھی اس کا نام ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے: فاتحۃ الکتاب شفاء من کل داء الا السلام۔ سورۃ الثنا بھی اس کا نام ہے کیونکہ وہ ہر نماز میں دو دو بار پڑھی جاتی ہے۔ سورۃ الصلوٰۃ بھی اس کو کہا جاتا ہے کیونکہ یہ نماز میں پڑھنی واجب اور بعض کے نزدیک فرض ہے۔ سورۃ الحمد اور سورۃ الاساس بھی اس کو کہا جاتا ہے کیونکہ وہ قرآن مجید کی اساس (بنیاد) ہے۔ ابن عباسؓ نے کہا ہے: جب تو بیمار ہو جائے یا تجھے صحت کی [illegible] ہو جائے تو اساس (الحمد) کو لازم پکڑ [illegible] اس لیے کہ اس میں خدا کی حمد درج ہے

اقتباس: اسلامی انسائیکلوپیڈیا

مرسلہ: احسن فاروق، لودھراں

☆☆☆

ماورا اس کا فلمی نام تھا۔ اس کا اصل نام پروین عرف پینو تھا۔ وہ ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہتی تھی جہاں سے شہر تھوڑے سے فاصلے پر تھا۔ اس نے جس گھر میں آنکھ کھولی تھی، وہ نہ تو غریب تھا اور نہ ہی اسے امیر کہا جا سکتا تھا۔ ان کا گزارہ بہت اچھا ہو رہا تھا۔ وہ اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں کے ساتھ اچھی بھلی زندگی بسر کر رہی تھی۔

وہ آٹھویں تک اپنے ہی گاؤں کے اسکول میں پڑھی تھی۔ اس وقت بھی اس کے حسن کا چرچا ہر طرف تھا۔ بلاشبہ وہ حسین تھی اس کے ساتھ چنچل اور شوخ بھی تھی۔ گاؤں کے کئی لڑکے اس کے عاشق بن گئے تھے لیکن اسے صرف ایک ہی پسند تھا۔ تنویر بھٹی، اس کے گاؤں کا گھبرو جوان تھا، سرخ و سفید چہرہ، لمبا قد اور گھنے بالوں والا تھا۔ وہ بھی اس میں بھرپور دلچسپی رکھتا تھا۔ دونوں میں صرف آنکھوں آنکھوں کی حد تک اظہار تھا اس سے زیادہ ان میں کوئی بات چیت نہیں تھی۔

وقت گزرنے کے ساتھ وہ میٹرک کر گئی تو والدین کو اس کی شادی کی فکر ہونے لگی لیکن ماورا کے دماغ پر تنویر بھٹی پوری طرح چھا گیا تھا۔ گاؤں کے دوسرے عاشق مایوس ہو کر دھیرے دھیرے پیچھے ہٹ گئے تو ان کے درمیان ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ماورا کا یہی مؤقف تھا کہ تنویر بھٹی اس سے شادی کر لے تو ہی وہ اپنا آپ اس کے سپرد کرے گی، ورنہ نہیں۔

تنویر بھٹی کی یاری دوسرے گاؤں کے چوہدری کے بیٹے آصف کے ساتھ بہت گہری تھی۔ تنویر بھٹی بھی دل کے ہاتھوں مجبور ہو چکا تھا، سو اس نے آصف کے والدین کو ملا کر اپنے والدین کو ماورا کے گھر رشتہ مانگنے بھیجا۔ چونکہ وہ ذات برادری کے نہیں تھے اس لیے انکار کر دیا گیا۔ آصف نے اسے کچھ زیادہ ہی اپنی توہین سمجھا۔ آصف اور تنویر دونوں اپنے طور پر سازشیں کرتے رہے، بات یہاں تک آن پہنچی کہ ماورا گھر سے بھاگ کر اس کے ساتھ شہر جائے، وہیں نکاح کر کے، وہ غائب ہو جائیں گے۔ سال دو سال بعد والدین خود ہی مان جائیں گے پھر ایسا ہی ہوا، وہ ان کے ساتھ شہر جا پہنچی۔ وہیں عدالت میں نکاح ہوا اور وہ وہاں سے دوسرے شہر چلے گئے۔ وہاں جا کر انہوں نے ایک گھر کرایے پر لیا اور ہنسی خوشی رہنے لگے۔ اس سارے معاملے میں آصف نے ان کا بھرپور ساتھ دیا۔

تقریباً ایک برس یونہی گزر گیا۔ ہمارے مشرقی معاشرے میں عورت اس وقت اپنے آپ کو محفوظ خیال کرنے لگ جاتی ہے جب اس کی اولاد ہو جاتی ہے۔ ماورا بھی یہی چاہتی تھی کہ اس کے اولاد ہو جائے لیکن تنویر بھٹی بڑے خوبصورت انداز میں منع کر دیتا۔ وہ یہی دلیل دیتا کہ ابھی نجانے حالات کیسے ہیں۔ دو تین برس رک جائیں پھر یہ بھی ہو جائے گا۔ ماورا مان جایا کرتی تھی۔ اس دوران آصف بھی آتا جاتا تھا۔ اس نے کئی راتیں وہاں گزاریں۔ یہاں تک کہ وہ بھی ماورا پر ڈورے ڈالنے لگا۔ پہلے پہل ماورا یہی سمجھی کہ اس کی بدنیتی صرف اس لیے ہے کہ وہ اپنے دوست کو دھوکا دے رہا ہے لیکن جلد ہی یہ کھل گیا کہ تنویر بھٹی اس کوشش میں پورا پورا ساتھ دے رہا ہے...اور یہ بات اس دن کھل گئی جب تنویر نے خود آصف کی بات مان لینے کے لیے، ماورا سے کہا۔ ماورا کی تو دنیا ہی الٹ گئی۔ اسے اس دھوکے سے شدید صدمہ پہنچا۔ اب اس کے لیے دنیا میں کہیں کوئی جگہ نہیں تھی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ وہ اب کہیں کی نہیں رہی۔ وہ جو اولاد کی چاہ رکھتی تھی، اس سے دور کیوں رکھا گیا۔ یوں تنویر کے زور دینے پر اسے آصف کی بات بھی ماننی پڑی۔

ماورا سمجھ چکی تھی کہ یہ شادی کوئی گھر بنانے کے لیے نہیں کی گئی اور نہ ہی تنویر بھٹی کو اس سے کوئی محبت ہے۔ انہوں نے اپنی عیاشی کا سامان کیا ہے اور وہ دن دور نہیں جب یہ اسے چھوڑ کر غائب ہو جائیں گے۔ اس دوران اس نے اپنے والدین کو ٹٹولنا چاہی۔ وہاں سے اسے سوائے نفرت کے کچھ نہیں ملا۔ وہ اس کی شکل تک دیکھنے کے روادار نہیں تھے۔ ماورا نے بھی یہی سوچ لیا کہ واپس گاؤں جا کر ہر بندے کے سامنے ذلیل ہونے کی بجائے کچھ بھی نیا سوچ لیا جائے۔

انہی دنوں ماورا اُمید سے ہو گئی لیکن اس نے دونوں میں سے کسی کو نہیں بتایا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ وہ معمول کے مطابق زندگی گزارتی رہی۔ ابھی دو ماہ ہی کی حاملہ تھی جب ایک دن تنویر بھٹی نے کہا کہ ہمیں یہ گھر چھوڑنا ہوگا، مالک مکان نے نوٹس دے دیا ہے۔ جب تک نئے گھر کا بندوبست نہیں ہو جاتا، تم چند دن ایک گھر میں ایک خاتون کے ساتھ رہو گی۔ ماورا سمجھ گئی کہ اب اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ اس نے کوئی بحث نہیں کی۔ سو تنویر بھٹی اسے ایک خاتون کے پاس چھوڑ کر چلا گیا اور پھر اس نے پلٹ کر خبر بھی نہ لی۔

وہ خاتون ناصرہ میڈم تھی۔ شہر بھر کے اعلیٰ تماش بین اس کے گاہک تھے۔ بہ ظاہر اس کا بیوٹی پارلرز کا بزنس تھا

جس کی آڑ میں وہ اپنا دھندا چلا رہی تھی۔ ماورا کو دوسرے ماہ ہی پتا چل گیا کہ وہ کہاں آن پہنچی ہے۔ ناصرہ میڈم کو بتانے اور سمجھانے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ ایک دن میڈم نے اسے بلا کر اپنے پاس بٹھایا اور برے رسان سے پوچھا۔

''کیسے گزر رہے ہیں دن؟''

''ٹھیک گزر رہے ہیں؟'' اس نے مختصر جواب دیا۔

''دیکھو تم ننھی بچی نہیں ہو جو یہاں کے بارے میں تمہیں پتا نہیں ہوگا۔ بہت آرام کر لیا، اب بتاؤ، تم کیا کرنا چاہتی ہو... کیونکہ میں نے تمہارے پانچ لاکھ ادا کئے ہیں۔'' میڈم نے صاف بتا دیا۔

''میڈم میں سمجھ رہی ہوں کہ میں کہاں ہوں اور مجھے کیا کرنا ہوگا، لیکن اگر میں ایک درخواست کروں تو کیا تم مان لو گی؟'' ماورا نے پوچھا۔

''درخواست، کیسی درخواست؟'' میڈم نے حیرت سے پوچھا۔

''میڈم، میں ماں بننے والی ہوں، اور میں ماں بننا بھی چاہتی ہوں۔ اس کے بعد تم جو کہو گی، میں وہی کروں گی۔'' ماورا نے کہا تو میڈم خلاف توقع اس کی بات مان گئی۔

پھر جب تک وہ ماں نہیں بن گئی، اس نے ایک پارلر پر خوب محنت کی۔ اس نے زیادہ سے زیادہ پیسا بنانے کی کوشش کی جو ظاہر ہے اتنا تو نہیں بن سکتا تھا۔ وہ ایک بیٹی کی ماں بن گئی تو اسپتال کے اخراجات اس نے خود پورے کیے، پھر اس نے اپنی بیٹی کے لیے ایک ملازمہ رکھ لی جو اس کی دیکھ بھال کرتی تھی... اور ایک دن اس نے خود میڈم ناصرہ سے کہہ دیا کہ جو تم چاہو، میں حاضر ہوں۔

ناصرہ میڈم کے ہاں نئی لوگوں کا آنا جانا تھا۔ ان سب کا یہی کہنا تھا کہ اس ہیرے کو یونہی ضائع مت کرنا، اسے پوری طرح کیش کرانا۔ یوں راتوں کو لوگوں کے ہاں بھیج کر اسے ضائع مت کرنا۔ میڈم ناصرہ سمجھ گئی تھی۔ ایک فلم پروڈیوسر ماورا پر ریجھ گیا تھا۔ میڈم ناصرہ نے بھی خوب محنت کی اور ایک ہی ہلے میں اس کے پانچ لاکھ واپس آ گئے۔ ناصرہ میڈم کے ہاں اب ماورا کی حیثیت کچھ الگ سی ہو گئی تھی۔ اسے لگا کہ ماورا ایک سونے کی کان ہے۔

ماورا فلم انڈسٹری میں آ گئی۔ اس نے بہترین گھر لے لیا۔ دھیرے دھیرے اس نے اپنی بیٹی کو دنیا کی نگاہوں سے اوجھل کر دیا اور خود ایک کامیاب اداکارہ کے طور پر سامنے آ گئی۔ اس نے اپنے والدین کو بھی بلوا لیا لیکن انہیں اپنی بیٹی کے بارے میں بالکل نہیں بتایا۔ سو اس نے اپنے طور پر ایک نئی زندگی کا آغاز کر دیا تھا۔

جن دنوں وہ مجھ سے ٹکرائی، انہیں دنوں تنویر بھٹی کے ساتھ آصف پھر آ کر اس سے ملے تھے۔ تب ماورا نے انہیں بتا دیا کہ اس کی ایک بیٹی ہے۔ جسے وہ مستقبل میں اداکارہ بنائے گی۔ دونوں حیرت زدہ رہ گئے۔ انہوں نے میڈم ناصرہ سے تصدیق کر لی کہ بیٹی واقعی پیدا ہوئی تھی اب کہاں ہے یہ نہیں معلوم؟ تنویر اور آصف دونوں کو یہ پریشانی لاحق ہو گئی کہ وہ بیٹی کس کی اولاد ہو سکتی ہے؟ یہی سوال انہوں نے ماورا سے کیا تو وہ سکون سے بولی۔

''تم دونوں میں سے کسی ایک کی تو ہے۔ اب یہ مت کہنا کہ میری زندگی میں کوئی تیسرا بھی تھا۔ جس وقت میں اپنی بیٹی کو منظر عام پر لاؤں گی تو ساتھ میں بتا دوں گی کہ یہ کس کی بیٹی ہے۔ کوئی اسے جھٹلا نہیں پائے گا۔ کیونکہ آج کل ڈی این اے ٹیسٹ سب کچھ بتا دیتا ہے۔''

آصف اور تنویر دونوں کو اپنی عزت کے لالے پڑ گئے۔ انہیں سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کریں۔ ماورا جس سطح تک پہنچ چکی تھی، دونوں دھونس سے بھی اپنی بیٹی کا پتا نہیں پوچھ سکتے تھے۔ انہوں نے بڑی منت سماجت کی، لالچ بھی دیئے لیکن وہ نہیں مانی۔ اس کا ایک ہی مؤقف تھا۔

''میں نے تم دونوں سے کبھی بیٹی کے نام پر کوئی پیسا خرچ کے نام پر مانگا؟ بلکہ تم دونوں نے مجھے پانچ لاکھ میں بیچا۔ میں تمہاری بیٹی پر سرمایہ کاری کر رہی ہوں۔ سود سمیت واپس لوں گی۔''

ماورا کی باتوں سے، اس کی ہٹ دھرمی سے یہ واضح تھا کہ وہ ان دونوں سے انتقام لینا چاہتی ہے... اور وہ دونوں اس وقت سے خوف زدہ تھے جب ان کی عزت خاک میں مل جانے والی تھی۔ دونوں ہی نے طرح طرح کے ہتھکنڈے آزمانا شروع کر دیئے، یہاں تک کہ انہوں نے ماورا کے قتل کا منصوبہ بنا لیا۔

اچانک ایک دن ماورا منظر سے ہٹ گئی۔ اس نے اپنی بیٹی اور ملازمہ کو لیا اور اس شہر میں جا پہنچی جہاں اس کی ملازمہ کی بیٹی رہتی تھی۔ انہوں نے خاموشی سے وہاں زندگی گزارنا شروع کر دی۔ اس کے پاس اتنا پیسا تھا کہ وہ اپنی گزر بسر کرتی رہی لیکن اچانک اسے ہم میں سے کسی ایک کی مدد کی ضرورت پڑ گئی۔

☆☆☆

''مطلب تم نے سب کچھ اپنی بیٹی کے لیے قربان کر دیا لیکن اب ایسا کیا مسئلہ آن پڑا ہے کہ تم مدد کے لیے مجبور ہوگئی ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''مجھے کینسر ہوگیا ہے۔'' اس نے اتنی بڑی بات نرم سے لہجے میں کہہ دی۔ میں کچھ دیر تک اس بات کی ٹرانس میں رہا پھر آزردہ لہجے میں پوچھا۔

''کب سے.....؟''

''دو ماہ پہلے پتا چلا ہے۔ میں اس کا علاج کروانا چاہتی ہوں لیکن مجھے اپنے علاج کی اتنی تمنا نہیں ہے جتنی یہ خواہش ہے کہ میری بیٹی کسی طرح اپنی منزل تک پہنچ جائے۔ وہ ڈاکٹر بن چکی ہے اور ان دنوں ہاؤس جاب کر رہی ہے۔'' اس نے سکون سے کہا۔

''کہاں ہے وہ.....؟'' میں انتہائی تجسس سے پوچھا۔

''دیکھو میں اسے سامنے لانا ہی نہیں چاہتی، وہ بہت ذہین اور سمجھدار ہے۔ میں نے اسے سب بتا دیا ہے، سو وہ خود بھی سامنے نہیں آنا چاہتی۔ وہ ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ، خوبصورت بھی ہے۔ اس کا ایک کلاس فیلو اس سے شدید محبت کرتا ہے۔ وہ دونوں شادی کرنا چاہتے ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ شادی کرلیں اور باہر کے کسی ملک میں چلے جائیں۔'' اس نے بتایا۔

''تو پھر اس میں پرابلم کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''میرے پاس پیسا نہیں ہے۔ نہ اپنے علاج کے لیے اور نہ بیٹی کو باہر بھیجنے کے لیے۔ مجھے اب پیسا چاہیے۔'' اس نے سکون سے کہا۔

''میں تمہارے علاج کی ذمے داری تو لے سکتا ہوں لیکن باہر.....'' میں نے کہنا چاہا تو وہ تیزی سے میری بات کاٹتے ہوئے بولی۔

''میں تم سے پیسا نہیں مانگ رہی بلکہ آصف اور تنویر سے پیسا لینا چاہتی ہوں۔''

''میرا اس میں کیا کردار ہے۔'' میں نے پوچھا۔

''یہی کہ میرے اور ان کے درمیان معاملہ طے کروا دو۔ وہ جتنا خوف زدہ ہوں گے، اتنا ہی پیسا میں ان سے لے پاؤں گی۔'' اس نے بتایا۔

''یہ کیسے ہوگا؟'' میں نے پوچھا۔

''تم مجھے اپنے ساتھ لاہور لے چلو، مجھے کسی اسپتال میں داخل کروا کر ان سے رابطہ کرو، انہیں کس طرح خوف زدہ کرنا ہے اور پیسا کیسے لینا ہے، یہی تو ساری زندگی سیکھا ہے۔'' اس نے تلخ مسکراہٹ کے ساتھ کہا تو میں سمجھ گیا کہ وہ کیا چاہتی ہے۔

''تو پھر کب تک لاہور آجاؤ گی؟'' میں نے پوچھا۔

''میں ابھی تمہارے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔'' اس نے جھٹ سے کہا۔

''آؤ چلتے ہیں۔'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا تو وہ بھی میرے ساتھ اس حجرے نما کمرے سے نکلتی چلی گئی۔

واپسی پر جب ڈھابے والے کے پاس سے گزرے تو میں نے اسے بتایا کہ میں نے رات یہاں گزاری ہے۔ تبھی وہ ہنستے ہوئے بولی۔ ''مجھے معلوم ہے۔ میں رات تمہیں سوتا ہوا دیکھ کر گئی ہوں۔ وہ ڈھابے والا مجھے جانتا ہے وہی مجھے یہاں کے بارے میں بتاتا رہا تھا کہ کون کون آیا ہے۔'' اس نے پُرسکون لہجے میں بتایا تو مجھے قطعاً حیرت نہیں ہوئی۔ وہ جن حالات سے گزر رہی تھی اور جو مقصد حاصل کرنا چاہ رہی تھی، اس کا نہ صرف محتاط ہونا بنتا تھا بلکہ کسی کے بارے یقین کر لینا اس کا حق تھا۔

''یہاں کہاں رہ رہی ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ جو دربار پر مجاور بیٹھا ہوا تم نے دیکھا تھا نا، وہ میری ملازمہ کا بیٹا ہے۔ یہ ڈھابے والا اسی کا آدمی ہے۔ اسے میرے بارے میں بالکل نہیں پتا۔'' اس نے سوچتے ہوئے انداز میں کہا۔

ہمارے پاس باتیں کرنے کے لیے بہت وقت تھا۔ کم از کم پانچ گھنٹے تو تھے ہی۔ سو میں نے پوری توجہ ڈرائیونگ پر لگا دی۔

☆☆☆

لاہور پہنچتے ہی ماورا کو ایک نجی اسپتال میں داخل کروا دیا گیا۔ لاہور پہنچنے تک میں نے سارا بندوبست کر لیا تھا۔ اس وقت شام کے سائے پھیل رہے تھے۔ جب میں نے ایک خاتون ملازمہ کا انتظام کر کے اسے ماورا کے پاس چھوڑا اور واپس اپنے گھر پہنچا۔ تھکن سے میرا برا حال تھا۔ میں جاتے ہی جو سویا تو صبح اس وقت اٹھا جب چاروں جانب نیلگوں روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ میں اٹھ کر تیار ہوا اور اپنی بیگم کو بتائے بغیر اسپتال جا پہنچا۔

''بڑا عجیب سا احساس ہو رہا ہے یہاں آ کر۔ لگتا ہے اب میرے پاس چند دن ہی بچے ہیں۔ اس سے زیادہ میں جی نہیں پاؤں گی۔'' اس نے گہرے لہجے میں کہا تو میں ہنستے ہوئے بولا۔

''یہاں پر ہمیں اپنے خدا پر بھروسا کرنا پڑتا ہے۔ یہ ایمان ہمیں مایوس نہیں ہونے دیتا کہ جو رات قبر میں ہے، وہ باہر نہیں آسکتی۔''

''ہاں یہ دل کو تسلی دینے کے لیے بہت اچھے لفظ ہیں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''نہیں تمہارا یہاں بہترین علاج ہوگا، باقی جو تمہاری قسمت۔'' میں نے تسلی دی۔

''میں نے بات کی تھی آصف سے..... انہیں بتا دیا کہ وہ مجھ سے فوراً آکر ملیں۔ شاید وہ ابھی یا تھوڑی دیر بعد آجائیں۔'' اس نے مجھے بتایا تو میں نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''اگر میں آفس چلا بھی جاؤں تو ان کے آتے ہی مجھے کال کر لینا۔ میں فوراً آجاؤں گا۔''

''ٹھیک ہے، ابھی تم بیٹھو، ہوسکتا ہے وہ تمہارے ہوتے ہوئے ہی آجائیں۔'' اس نے کہا تو میں تھوڑی دیر بیٹھا رہا، پھر آفس کے لیے نکل پڑا۔

دو بجے کے قریب میں اس کے لیے کھانا وغیرہ لے کر گیا تو اس کے چہرے پر اداسی پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے آصف اور تنویر کے بارے میں کوئی بات کیے بغیر اسے کھانا کھلایا، تھوڑی دیر بیٹھ کر گپ شپ کرتا رہا۔ جس وقت میں اٹھنے لگا تو اس کا سیل فون بج اٹھا۔ وہ تنویر کا فون تھا۔ وہ کہیں آس پاس ہی تھے اور اپنے پہنچنے کی اطلاع دے رہے تھے۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ دونوں اس کے پاس آن پہنچے۔

وہ تھوڑی دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ اس دوران ماورا نے ان سے سیدھے منہ بات نہیں کی۔ کچھ دیر بعد اس نے ملازمہ کو باہر بھیج دیا پھر تنویر سے کہا۔

''تم یہ بات تو اچھی طرح جانتے ہو نا کہ میں اب تک تمہاری بیوی ہوں، تم نے مجھے ابھی تک طلاق نہیں دی؟''

''ہاں یہ تو ہے؟'' اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا تو ماورا نے میری طرف انگلی کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''اس سے گھبراؤ نہیں، اسے میرے بارے میں سب کچھ معلوم ہے، اسے یہ بھی پتا ہے کہ تم نے میرے ساتھ کیا کیا۔ یہ میرا پرانا دوست ہے، اور اس شہر کا نامور صحافی، میرا خیال ہے تم نے اس کا نام ضرور سنا ہوگا، نہیں تو سن لینا۔''

''تم نے جو بات کرنی ہے وہ کرو، باقی باتیں چھوڑو۔'' تنویر نے منہ بناتے ہوئے کہا، اسے شاید میرے ہونے کا احساس برا لگا تھا۔

''میں نے تم سے صرف آج ہی بات کرنی ہے، اس کے بعد نہیں، کیونکہ مجھے نہیں پتا میں نے کب مر جانا ہے پھر اوپر میرا خدا اور نیچے یہ شخص ہے۔ اسے ہی میرا مقدمہ لڑنا ہے۔ تم مجھے آج طلاق دے دو گے تو کل یہ نشر ہو جائے گا۔'' ماورا نے سکون سے کہا۔

''یہ باتیں چھوڑو اور اصل بات کہو۔'' آصف نے نرم انداز میں کہا۔

''مجھے دکھ صرف اس بات کا ہے کہ میں تم دونوں سے انتقام نہ لے پائی، خیر..... میری بیٹی اب جوان ہو چکی ہے۔ تم دونوں فیصلہ کرو میں اسے کسی شریف گھرانے میں بیاہ دوں یا پھر سے فلم اسٹار بنا دوں؟'' اس نے کچھ ایسے لہجے میں کہا، جس میں دھمکی بھی تھی اور دکھ بھی تھا۔

''تم مجھ پر ایک احسان کرو، میری بیٹی مجھے دے دو، میں اسے.....'' تنویر نے کہنا چاہا تو وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے تیزی سے بولی۔

''وہ صرف تمہاری بیٹی نہیں ہے، ہم تینوں کی بیٹی ہے۔ کیا جواب دو گے تم اسے جب اس نے پوچھا کہ تم اتنا عرصہ کہاں رہے، جب اس نے یہ پوچھا کہ تم اس کی ماں کو کسی غیر کے حوالے کر کے کیوں چلے جاتے تھے، تب تمہاری غیرت کیا جواب دے گی؟''

''کوئی تو حل نکالو۔ میرا ایک ایک دن عذاب میں گزرتا ہے۔'' تنویر نے کہا۔

''اور تم آصف، اگر وہ تمہاری بیٹی ہوئی تو؟'' ماورا نے طنزیہ پوچھا۔

''چپو، بیچ میں ہمارا امتحان نہ لو، جو بھی سزا دینی ہے بس اب دے دو۔'' اس نے شرمندہ لہجے میں کہا تو وہ چند لمحے خاموش رہی پھر بولی۔

''سچ یہ ہے کہ میں نے ابھی تک اپنی بیٹی کو کچھ نہیں بتایا اس کے باپ کے بارے میں بھی نہیں، لیکن اب بتا دوں گی۔ میری بیٹی پڑھنے کے لیے دوسرے ملک چلی گئی ہے۔ میں چاہتی ہوں اس کی شادی وہیں کر دوں اور وہ یہ سوچے بغیر کہ وہ ایک حرام زادی ہے، پُرسکون اپنی زندگی گزارے۔ کہو کیا تم دونوں یہ چاہتے ہو؟''

''بیٹیاں تو پرایا دھن ہی ہوتی ہیں۔ اگر وہ کسی اچھے اور شریف گھرانے میں بیاہ دی جائے تو اس سے بڑی بات کیا ہوگی۔'' تنویر نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

''ابھی وہ دو برس پڑھے گی، اسی دوران اس کی شادی ہو جائے گی۔'' اس نے بتایا۔

''ٹھیک ہے، ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔'' آصف جلدی سے بولا۔

''آج کے بعد ہمارا کوئی لینا دینا نہیں۔ میرے مرنے کے بعد میری بیٹی کو یہ بھی نہیں کہنا کہ وہ تمہاری بیٹی تھی یا حرام زادی تھی۔''

''مت کہو ایسا۔'' تنویر تڑپ کر بولا۔

''تم دونوں کل تک دو کروڑ روپے مجھے یہاں دے کر جاؤ گے۔ جو میں نے اپنی بیٹی کو بھیجنا ہے تاکہ وہ میرے مرنے کے بعد سکون سے اپنی تعلیم جاری رکھ سکے۔'' اس نے پُرسکون لہجے میں کہہ دیا تو تنویر نے انتہائی حیرت سے کہا۔

''دو کروڑ روپے؟''

''ہاں دو کروڑ..... اگر کل شام تک تم نہیں دے کر جاتے تو رات کی خبروں میں خود کو میڈیا کے سامنے پیش کر دوں گی۔ میں تو ختم ہو ہی جاؤں گی تم دونوں کی بیٹی بھی سامنے آجائے گی۔ وہ کل کیا بنے گی، میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ تم دونوں کا کیا ہوگا مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔''

''پتو تم زیادتی کر رہی ہو؟'' تنویر نے کہا۔

''جب تم دونوں نے میرے قتل کا منصوبہ بنایا تھا، وہ مجھ سے پیار تھا؟'' اس نے تڑک کر جواب دیا۔

''اتنی جلدی اتنی بڑی رقم.....'' تنویر نے کہا۔

''تین دن بعد میں نے لندن فیس بھرنی ہے۔ فیس نہ بھر سکی تو پھر میری بیٹی جا نہیں سکے گی اور اگر وہ نہ جا سکی تو میں نے تم دونوں کو کہیں کا نہیں چھوڑنا۔ تم دونوں خودکشی کرو گے اور تمہاری اولاد تم دونوں.....'' اس نے جذبات کی رو میں کہا۔

آصف بولا۔ ''کل رقم پہنچ جائے گی۔''

''ٹھیک ہے اب کل ہی بات ہوگی۔'' اس نے کہا اور منہ پھیر کر لیٹ گئی۔ وہ تھوڑی دیر بیٹھے رہے پھر اٹھ کر چل دیئے۔

ساری رات میرے ذہن پر یہی سوار رہا کہ دو کروڑ رقم کے عوض اس کا قتل بھی ہو سکتا ہے۔ میں نے حفظ ماتقدم کے طور پر دو گارڈ بھی بھجوا دیئے تھے لیکن پھر بھی کئی وسوسے آتے چلے گئے لیکن خیریت رہی، اگلے دن صبح وہ زندہ سلامت میرا انتظار کر رہی تھی۔

سہ پہر ہو رہی تھی جب وہ ایک بیگ میں رقم بھر کر لے آئے۔ انہوں نے وہ بیگ ماورا کو دیا، اور تنویر نے پوچھا۔

''کیا اس کے بعد بھی تمہیں کچھ چاہیے؟''

''نہیں، لیکن اب مجھ سے رابطہ نہ رکھنا اور نہ مجھے کبھی اپنی شکل دکھانا۔ میں نے تو چند دن بعد مر جانا ہے لیکن میری بیٹی کی کبھی کھوج مت کرنا، وہ تمہیں کبھی اپنا باپ تسلیم نہیں کرے گی۔'' اس نے نفرت بھرے انداز میں کہا اور منہ پھیر لیا۔ وہ کچھ دیر اجنبیوں کی مانند کھڑے رہے اور پھر چلے گئے۔

ان کے جاتے ہی اس نے وہ بیگ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''میں جانتی ہوں اس میں پوری رقم نہیں ہوگی لیکن جو بھی ہے، اسے میری بیٹی کو بھیج دینا۔''

''لیکن کہاں بھیجوں گا، اس کا کوئی اتا پتا؟'' میں نے پوچھا تو اس نے اپنے سامان میں سے ایک لفافہ نکالا، اور میری طرف بڑھا دیا، میں نے اسے کھولا، اس میں نے چند تصویریں، ایک پرچے پر ایڈریس اور فون نمبر لکھا ہوا تھا۔ تصویر میں وہ لڑکی بالکل اپنی ماں جیسی لگ رہی تھی۔

''یہ میری بیٹی ہے۔ اس کا یہ پتا اور فون نمبر ہے۔ میں اسے آج سب بتا دوں گی۔ میں تمہارا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گی۔''

میں نے یہ ذمّے داری لے لی۔

☆☆☆

اگلے دن جب میں اسپتال گیا تو وہاں وہی ملازمہ بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی بولی۔ ''بی بی نے یہ خط دیا ہے۔ وہ کہہ رہی تھی کہ میں خط دے کر چلی جاؤں۔ یہ لیں جی خط، میں جا رہی ہوں۔''

مجھے لگا کہ جیسے کوئی گڑ بڑ ہے۔ میں نے جلدی سے لفافہ کھولا۔ اس نے لکھا تھا۔

''تمہارا شکریہ پیک بچے کہ تم نے میرا ساتھ دیا۔ جب میری رپورٹس آئیں گی تب تمہیں پتا چلے گا کہ مجھے کینسر نہیں تھا۔ میری بیٹی ایک حقیقت ہے۔ اسے کبھی دکھ مت آنے دینا۔ وہ اب صرف تمہارے ساتھ رابطہ رکھے گی۔ اس کے سر پر سایہ بن کر رہنا۔ میں جہاں جا رہی ہوں وہاں میری بیٹی کے بارے میں کچھ پتا نہیں ہے۔ میری کھوج مت کرنا۔ اگر ہو سکا تو قیامت کے دن ملوں گی اور رب سے کہوں گی، دنیا میں یہی بندہ میرے لیے نعمت تھا، ورنہ تیری دنیا بڑی ظالم نکلی۔''

خط میرے ہاتھوں میں تھا اور میں سوچوں کے بھنور میں ڈوب گیا تھا۔

++

محترم ایڈیٹر سرگزشت

السلام علیکم!

ایک ایسی سچ بیانی ارسال کررہا ہوں جو حد درجہ انوکھی ہے۔ یوں بھی سرگزشت کا مزاج دیگر ڈائجسٹوں سے الگ ہے اسی وجہ سے یہ روداد بشکل کہانی سرگزشت کے لیے بھیج رہا ہوں۔۔۔ قارئین بھی اس کے انوکھے پن سے محظوظ ہوں گے۔

غلام قادر

(کراچی)

# ایک اکلوتا شوہر

آپ کے رشتہ داروں، دوستوں اور جاننے والوں میں بہت سے ایسے لوگ ہوں گے جن کی ایک سے زیادہ شادیاں ہوں گی لیکن وہ اپنی دونوں بیویوں کے ہاتھوں اس طرح تنگ ہوں گے کہ اکثر انہیں خودکشی کا خیال آتا ہوگا۔ آج میں آپ کو وہ کہانی سناتا ہوں جس کی وجہ دو نہیں بلکہ تین بیویاں ہیں لیکن نہ تو میں ان کے ہاتھوں تنگ ہوں نہ ہی مجھے خودکشی کا خیال آتا ہے۔

کہانی یہاں سے شروع ہوتی ہے کہ جب میں ایم ایس سی کے بعد لیکچرار لگا تو ہمارے گھر میں بہو کی تلاش شروع ہوگئی۔ اماں کا خیال تھا کہ ان کی بھانجی بھی اس قابل ہے کہ وہ ان کی بہو بن سکے۔ اماں کو خالدہ میں وہ تمام خوبیاں نظر آنے لگیں جو کسی بھی اچھی بہو میں ہوسکتی ہے۔ وہ سگھڑ بھی تھی، کھانا بھی بہت اچھا بنا لیتی تھی بلکہ سلائی بھی بہت اچھی کرلیتی تھی۔ بس ایک کمی جو اس میں تھی اس پر بھی وہ یہ کہہ کر پردہ ڈال دیتی تھیں کہ ''میٹرک پاس تو ہے اب کیا بہو کو نوکری کروانی ہے جو اسے ایم اے کرنا ضروری ہے۔''

اس کے برعکس ابا کا ووٹ اپنی بھتیجی کے لیے تھا۔ ان دونوں میں جب بھی جھڑپ نما گفتگو ہوتی تھی تو اس میں ابا اپنی بھتیجی کی تعریف کرتے ہوئے کہتے تھے۔ ''وہ ایم اے پاس ہے۔''

''تو کیا نوکری کروانی ہے تمہیں۔'' اماں تڑپ کر جواب دیتی تھیں۔

''برا وقت کہہ کر نہیں آتا۔'' ابا کا جواب آتا تھا۔ ''..... بھئی ذہنی آہنگی کے لیے میاں بیوی کا تعلیم یافتہ ہونا

ضروری ہوتا ہے۔''

غرض یہ کہ اس رسہ کشی میں میری عمر گزرتی جاری تھی۔ کالج میں ساتھی اکثر مذاق اڑاتے تھے کہ کیا بڑھاپے میں شادی کرو گے۔

اماں تقریباً روز اپنی بھانجی کی خوبیاں گنواتی تھیں اور میں کسی حد تک ان سے متاثر بھی ہو جاتا تھا کہ ابا کا لیکچر شروع ہو جاتا۔ ''اپنے دوستوں اور ساتھیوں سے کیا کہہ کر اپنی بیوی سے متعارف کراؤ گے کہ جی یہ ہیں میری بیوی خالدہ جو کھانا تو اچھا بنا لیتی ہے لیکن ہے صرف میٹرک پاس۔''

ان کی باتوں سے میں متاثر ہو ہی رہا ہوتا کہ اماں آن پہنچتیں اور میرا سرد کھنے پر آ جاتا۔

ابا کے نزدیک خالدہ کلوتھی جبکہ ایسی کوئی بات نہیں تھی بس اس کا رنگ سانولا ضرور تھا۔

اماں کا خیال تھا کہ ابا کی بھتیجی کا تمام رنگ وروپ اس کے میک اپ کی وجہ سے ہے جو وہ روز استعمال کرتی ہے۔ میرے بیٹے کی ساری تنخواہ تو اس کے میک اپ کی نظر ہو جائے گی۔

یہ سلسلہ روز کا تھا کبھی اماں کی بھانجی کا پلڑا بھاری ہوتا اور کبھی یوں محسوس ہوتا کہ اماں شکست کھانے کے قریب ہیں۔ اس روز کی جھک جھک سے تنگ آ کر ایک روز میں نے کہہ دیا ''میں دونوں سے شادی کے لیے تیار ہوں۔''

میرا یہ کہنا تھا کہ اماں اور ابا دونوں کی توپوں کا میں نشانہ بن گیا۔ ''یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک قاضی ایک وقت میں دو نکاح پڑھائے۔''

میں نے اس پر غور نہیں کیا لیکن روز روز کی اس بحث سے پیچھا چھڑانے کا میری سمجھ میں ایک ہی طریقہ آیا تھا۔

کافی لے دے کے بعد اور اس لالچ میں کہ ابا کے بعد ساری دولت میری ہوگی وہ دونوں اس پر تیار ہو گئے لیکن اب دوسری بحث یہ شروع ہوئی کہ پہلا نکاح خالدہ کے ساتھ ہو یا چاچا کی بیٹی رومانہ کے ساتھ۔

چاچا نے اس مشکل کا حل یہ نکالا کہ ٹاس کر لیا جائے۔ خالو اس پر تیار نہ تھے لیکن ابا اور اماں ایک طرف ہو گئے تو خالو کو مجبور ہو جانا پڑا۔

ٹاس ہوا اور رومانہ ٹاس جیت گئی۔

جمعہ کا مبارک دن اس کے لیے مقرر ہوا۔ اب صورتِ حال یہ تھی کہ میں بیچ میں تھا میرے دائیں جانب رومانہ تھی اور بائیں جانب خالدہ تھی۔ ہمارے ہی گھر کے ڈرائنگ روم میں تقریب تھی۔

نکاح ہوا پہلے میں نے رومانہ کے لیے قبول ہے، قبول ہے، قبول ہے کا لفظ ادا کیے اور پانچ منٹ میں یہی لفظ خالدہ کے لیے بھی بول رہا تھا یہاں تک کے تو مراحل طے ہو گئے لیکن اب دوسرا مرحلہ یہ آ گیا کہ دولہا پہلے کس حجلہ عروس میں جائے گا۔

رومانہ سینئر ہے اس لیے پہلا حق اس کا ہے ابا اور چاچا ایک جانب ہو گئے تھے۔

گھر میں دو حجلہ عروس بنائے گئے تھے۔

''میری بیٹی باسی پھولوں کے ساتھ شب عروس منائے گی۔'' خالو نے جوابی وار کیا۔

فیصلہ مجھ پر چھوڑ دیا گیا لیکن میں فیصلہ کر نہیں پا رہا تھا کیونکہ کسی ایک کے حق میں فیصلہ کرنا زندگی کا عذاب بن سکتا تھا۔ رات اسی بحث میں گذرتی جا رہی تھی اور میں دو بیویوں کا شوہر ایک کونے میں کنوارہ بیٹھا ہوا تھا۔

آخر کار ابا اور چاچا کی جیت ہوئی اور میں رومانہ والے حجلہ عروس کی طرف چل دیا۔

''میں کب سے آپ کے انتظار میں تھی اب تو اُمید بھی ختم ہو چکی تھی کہ آپ آ گئے۔'' گھونگھٹ اٹھانے سے پہلے رومانہ نے کہا۔ ''کیا کرتا مجبوری تھی۔'' میں نے کہنا شروع کیا۔

''ابا اور چاچا ایک طرف تھے اور اماں اور خالہ دوسری طرف۔'' میں نے اپنی مجبوری بتائی تو رومانہ مسکرانے لگی۔

''یہ سلسلہ تو اب ساری عمر چلتا رہے گا۔'' اس نے کہا اور میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ''اللہ نہ کرے۔''

میری شیروانی کی جیبوں میں دو انگوٹھیاں تھیں۔ دائیں والی جیب میں رومانہ کو دینی تھی اور بائیں جانب والی جیب میں خالدہ کی انگوٹھی تھی۔

''میں نے رومانہ کو منہ دکھائی دی اور اس نے آداب کہہ کر شکریہ ادا کیا۔''

صبح ناشتا کی میز پر میرے گھر والوں کے علاوہ چاچا اور خالہ کے خاندان بھی موجود تھے۔

خالہ بطور خاص اپنے بیٹوں کو بھی ساتھ لائی تھیں۔ ناشتا ابھی ختم نہیں ہوا تھا کہ خالدہ کے بھائیوں نے اپنی بہن کا حجرہ عروس دوبارہ سے سجانا شروع کر دیا تھا کیونکہ خالہ یہ کہہ چکی تھیں کہ میری بیٹی سوکھے ہوئے پھولوں میں شب عروس منائے گی۔

رات کے کھانے تک سب کچھ ارینج ہو گیا۔ ہم سب

نے ڈنر ساتھ کیا اور اماں نے مجھے خالدہ کے کمرے میں بھیج دیا۔

خالدہ کمرے میں گھونگھٹ نکالے بیٹھی تھی۔ میں نے گھونگھٹ اٹھانا چاہا تو وہ بولی۔

''اب تو تم تجربہ کار ہو چکے ہو۔'' اس کا لہجہ طنزیہ تھا۔

''ہم ایک نئی زندگی کا آغاز کر رہے ہیں اس لیے بہتر ہے کہ طنزیہ گفتگو سے گریز کرو۔'' میں نے کہا۔

''میں کیا غلط کہہ رہی ہوں۔'' اس کا لہجہ بدستور طنزیہ ہی تھا۔

''جو کچھ بڑوں نے فیصلہ کیا ہے کیا تمہیں اس پر اعتراض ہے یا تمہاری شکایات مجھ سے ہیں۔'' میں نے سمجھانے والا انداز اختیار کیا تھا۔

خالدہ اس کے بعد کچھ نہیں بولی تھی لیکن کچھ دیر بعد اس نے رونا شروع کر دیا۔

''اب کیا ہوا؟'' میں نے سوال کیا۔

''تمہارے پاس سے رومانہ کی بُو آ رہی ہے۔'' اس نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

اس سے اگلے روز ولیمہ تھا۔

اپنی نوعیت کا وہ پہلا ولیمہ ہوگا جس میں ایک دولہا اور دو دلہنیں تھیں۔

لوگوں نے اپنے محور پر خوب باتیں بنائی ہوں گی۔

ایک دو بے تکلف دوستوں نے تو میرے سامنے کہا۔ ''کہاں تم شادی کرنہیں رہے تھے اور اب ایک ساتھ دو دو۔'' لیکن زیادہ باتیں اس لیے نہیں بنیں کہ ملتان میں بھی ایک ایسا ہی واقعہ ہوا تھا کہ دو سہیلیوں سے ایک نوجوان نے شادی کی تھی جسے اخباروں میں ٹی وی پر خوب اچھالا گیا تھا۔

بات ہنسی میں اڑ گئی لیکن ولیمہ سے واپسی پر ایک ہلکی سے جھڑپ ہوئی خالدہ اور رومانہ کے درمیان۔

''ابا نے اس جھڑپ کو ختم کرتے ہوئے کہا ہفتہ کے پہلے تین دن رومانہ اور آخری تین دن خالدہ کے ہوں گے۔''

اماں نے دخل دیا۔ ''ہفتہ میں سات دن ہوتے ہیں۔''

''ایک دن تو اپنے بیٹے کے لیے چھوڑ دو۔'' ابا نے تفہیم لہجے میں کہا اور اماں بڑبڑاتے ہوئے خاموش ہو گئیں۔

دن اسی طرح گزرنے لگے۔

مجھے صبح جلدی کالج پہنچنا ہوتا تھا لیکن دو بیویوں کے باوجود اکثر بغیر ناشتے کے کالج جاتا۔ اسی دوران میں میری زندگی میں ایک کرسچن لڑکی آئی نام اس کا سنتھیا تھا اور وہ

---

مجاز تنہا کافی ہاؤس میں بیٹھے تھے کہ ایک صاحب جو ان کو جانتے نہیں تھے۔ ان کے ساتھ والی کرسی پر آ بیٹھے۔ کافی کا آرڈر دے کر انہوں نے اپنی بھونڈی آواز میں گنگنانا شروع کیا۔ ''احمقوں کی کمی نہیں غالب۔ ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں'' مجاز نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ڈھونڈنے کی نوبت ہی کہاں آتی ہے حضرت! خود بخود تشریف لے آتے ہیں''

☆☆☆

کسی مشاعرے میں مجاز اپنی غزل پڑھ رہے تھے۔ محفل پورے رنگ پر تھی اور سامعین خاموشی کے ساتھ کلام سن رہے تھے کہ اتنے میں کسی خاتون کی گود میں ان کا شیر خوار بچہ زور زور سے رونے لگا۔ مجاز نے اپنی غزل کا شعر ادھورا چھوڑتے ہوئے حیران ہو کر پوچھا۔ ''بھئی! یہ نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا؟''

مرسلہ: تحسین علی خان۔ ڈسکہ

---

پاکستان میں اکیلی رہتی تھی۔ اپنے خاندان میں سب سے چھوٹی تھی اس کے والدین کینیڈا میں تھے۔ اس کے بڑے بھائی مارشل نے کینیڈا میں قدم جمائے، امیگریشن لی اور پھر اپنے والدین اور بہنوں کو بھی بلوا لیا۔ کچھ قانونی پیچیدگیوں کی وجہ سے وہ سنتھیا کے لیے اپلائی نہیں کر سکا اور سنتھیا پاکستان میں رہ گئی۔

وہ مجھ سے عمر میں بہت چھوٹی تھی لیکن وہ نہ جانے کیوں میری جانب مائل ہو گئی تھی ابتداء میں بات ڈھکے چھپے الفاظ میں رہی لیکن پھر وہ آہستہ آہستہ کھلنے لگی۔

''آپ کی دو بیویاں ہیں ہے'' ایک روز اس نے براہِ راست سوال کیا۔

''تمہیں کس طرح معلوم ہوا۔'' میں نے جواب دینے کے بجائے سوال کر دیا۔

''لو میں اسی کالج میں ہوں، اڑتی اڑتی خبریں مجھ تک بھی آ جاتی ہیں۔'' اس نے کہا۔

''دو بیویاں ضرور ہیں وہ جو کہتے ہیں کہ دو ملاؤں میں مرغی حرام ہو جاتی ہے وہی میری بھی حالت ہے۔''

''میں سمجھی نہیں۔'' اس نے کہا۔

''ہفتہ میں تین دن پہلی بیوی کے ہوتے ہیں اور باقی تین دن دوسری بیوی کے۔'' میں نے سمجھانا شروع کیا

''پہلی والی ایم اے ضرور ہے لیکن کچن سے اور کالی

تعلق نہیں۔'' میں نے کہا اور وہ حیرت سے میرا منہ تکنے لگی۔

''آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟'' اس نے سوال کیا۔

پہلے تین دن صبح اٹھ کر میں ناشتے کے لیے کہتا ہوں تو اس کا جواب ہوتا ہے۔ ''تھکی ہوئی ہوں اٹھا تک نہیں جارہا۔'' وہ کہتی ہے۔

''اور دوسری بیوی۔'' اس نے سوال کیا۔

''وہ اماں کی بھانجی ہے، شادی کے پہلے اماں اس کی تعریف کرتی تھیں کہ وہ کھانا بہت اچھا بناتی ہے۔'' میں نے کہا۔

''تو کیا وہ غلط تھا؟'' اس نے سوال کیا۔

''ہوسکتا ہے کہ وہ سچ کہتی ہوں لیکن ناشتے کے لیے کہوں تو اس کا جواب ہوتا ہے اپنی چہیتی سے کہو۔''

''چہیتی..... کیا مطلب؟'' وہ سوال کیے بغیر نہیں رہ سکی۔

''خالدہ صرف میٹرک پاس ہے۔ اب مشاعرے میں اگر میں رومانہ کو لے جاتا ہوں تو خالدہ اسے میری چہیتی کہنے میں عار محسوس نہیں کرتی۔ بلکہ یہ بات تو اس نے پہلی رات سے شروع کردی تھی۔''

''پہلی رات کیا ہوا تھا۔''

''میں خالدہ کے پاس دوسری رات میں گیا تھا۔'' میں نے کہا۔

''یعنی پہلی رات آپ رومانہ کے پاس تھے۔''

''یہ بڑوں کا فیصلہ تھا۔'' میں نے کہا۔

''تو خالدہ نے کیا کہا۔''

''ابھی میں نے اسے چھوا بھی نہیں تھا کہ اس نے رونا شروع کردیا کہ مجھے آپ کے پاس سے رومانہ کی بو آرہی ہے۔'' میں نے کہا تو وہ ہنسنے لگی۔

''آپ کا ہی حوصلہ ہے کہ برداشت کررہے ہیں۔'' سنتھیا نے ہمدردی کی۔ ''کل سے آپ ناشتا میرے گھر کریں گے۔'' اس نے آفر کی۔

''مگر تم نے بتایا تھا کہ تم اکیلی رہتی ہو۔'' میں نے دبے لفظوں میں انکار کرنا چاہا۔

''رہتی تو میں اکیلی ہی ہوں لیکن آپ کیوں گھبرا رہے ہیں؟'' اس نے سوال کیا جس کا میرے پاس جواب نہیں تھا۔

''میں کہنا کچھ اور چاہ رہا تھا۔'' میں نے کہا۔

''میں اپنے والد کے دوست کے گھر میں رہتی ہوں ان کے مکان کا ایک کمرا میرے پاس ہے۔''

''آپ کے والد کے دوست کو تو اعتراض نہیں ہوگا؟'' میں نے سوال کیا۔

''ہماری عمروں میں اتنا فرق ہے کہ انہیں شک نہیں ہوسکتا۔''

''یہ بھی تم صحیح کہہ رہی ہو۔'' میں نے کہا۔

''تو پھر طے ہوگیا کہ کل سے آپ ناشتا میرے گھر کررہے ہیں۔''

''پہلے اپنے انکل سے پوچھ لو۔'' میں نے مشورہ دیا۔

''وہ تو میں ابھی بتا دیتی ہوں۔'' اس نے یہ کہتے ہوئے اپنا موبائل نکالا اور اس پر نمبر ملانے لگی۔

''مارشل انکل ایک بات کرنی تھی۔'' دوسری طرف سے رابطہ ہوا تو اس نے کہنا شروع کیا۔ ''وہ میرے ایک پروفیسر ہیں، میں نے کل صبح ناشتے پر بلایا ہے بلکہ کل کے بعد روز وہ ناشتا ہمارے یہاں ہی کریں گے۔'' اس نے کہا۔ ''باقی باتیں میں شام میں کروں گی۔''

''یہ مارشل صاحب آپ کے والد کے دوست ہیں۔'' میں نے سوال کیا۔

''جی ہاں وہ دونوں ایم فورس میں ساتھ تھے۔'' اس نے جواب میں کہا۔

اگلے روز ناشتے کی ذمے داری خالدہ کی تھی لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچن میں جاتی میں گھر سے نکل آیا۔ اماں نے مجھے گھر سے نکلتے دیکھا۔

''کہاں جارہے ہو ناشتا تو کرتے جاؤ۔'' اماں نے کہا۔

''کتنے ہی مہینوں سے میں بغیر ناشتے کے جاتا رہا ہوں آج یہ خیال کیوں آیا۔''

''میں ابھی خالدہ کو اٹھا دیتی ہوں پانچ منٹ میں ناشتا تیار کردے گی۔''

''اگر وہ اتنی ہی اچھی ہوتی تو میرے اٹھنے سے پہلے اٹھ کر ناشتا تیار کرنے میں لگ جاتی۔'' میں نے اماں کو جواب دیا۔

''مگر یہ تو بتاتا جا کہ جا کہاں رہا ہے۔'' اماں نے پیچھا نہیں چھوڑا۔

''ناشتا کرنے ہی جارہا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''جتنی دیر ہوٹل میں لگے گی اتنی دیر میں تو ناشتا گھر پر بھی تیار ہوجائے گا۔''

''ہوٹل جا کون رہا ہے۔'' میں نے ان کی غلط فہمی دور

کردی۔

''دو شادیوں سے سکون نہیں ملا جو تیسری کرنے چلا ہے۔''

''ابھی کی تو نہیں ہے لیکن اگر حالات ایسے ہی رہے تو کرنی پڑ جائے گی۔'' میں نے اتنا کہا اور کار میں بیٹھتے ہوئے میں نے سنتھیا کا نمبر ملایا۔

''گھر سے نکل آیا ہوں اب بتاؤ آنا کہاں ہے۔'' میں نے کہا۔

دوسری جانب سے کال ریسیو کرنے والی سنتھیا ہی تھی، اس نے ایڈریس سمجھانا شروع کیا۔

اس کا گھر ہمارے گھر سے زیادہ دور نہیں تھا۔ دس منٹ سے پہلے میں اس کے گھر کے سامنے کار پارک کر رہا تھا۔

مارشل صاحب گیٹ کے باہر موجود تھے اور ان کے ساتھ سنتھیا بھی موجود تھی۔

مجھے آتا دیکھ کر مارشل صاحب آگے بڑھے۔ ''ویلکم مسٹر پروفیسر'' انہوں نے آگے بڑھ کر کہا اور ہم تینوں گھر کے اندر داخل ہوئے اور ساتھ چلتے ہوئے اس ڈائننگ ٹیبل تک آ گئے جس پر ناشتے کے نام پر انواع واقسام کی چیزیں سجی تھیں لیکن سب سے ضروری آئٹم انڈے نہیں تھے۔ اتنے میں کچن کی جانب سے سنتھیا سے کچھ سال بڑی لڑکی نمودار ہوئی جس کے ہاتھوں میں ٹرے تھی اور ٹرے میں انڈے موجود تھے۔ ان میں بوائلڈ انڈے بھی تھے، آملیٹ بھی تھے۔ مارشل صاحب نے متعارف کروایا۔ ''یہ میری بیٹی ہے ڈونا۔''

''اور میری سب سے اچھی سہیلی۔'' سنتھیا نے لقمہ دیا۔

ہم ڈائننگ ٹیبل کی کرسیوں پر بیٹھ گئے تو ڈونا نے بات شروع کی۔ ''بہت دنوں سے آپ کا ذکر سنتی رہی تھی۔ ہمارے سر ایسے ہیں اور ہمارے سر ایسے ہیں آج آپ کو دیکھ بھی لیا۔''

''آپ کی شکل کچھ جانی پہچانی ہے۔'' میں نے ڈونا کو مخاطب کیا۔

''ڈونا ماڈل ہے اسی لیے آپ کو یہ محسوس ہو رہا ہے۔'' سنتھیا نے کہا اور ڈونا بتانے لگی کہ اس نے کون کون سے اشتہاروں میں کام کیا ہے۔

''ایک طرح سے ہمارے گھر کا خرچ اسی کی آمدنی سے چلتا ہے۔'' مارشل صاحب نے بات آگے بڑھائی۔

''آپ اسے کیوں کام نہیں دلوا دیتیں۔'' میں نے سنتھیا کی جانب اشارہ کیا۔

''اب تک یہ کوئی سو سے زیادہ کمپنیوں کو انکار کر چکی ہے۔'' ڈونا نے جواب دیا۔

''کیوں۔'' میرا سوال سنتھیا سے تھا۔

''بظاہر یہ چکا چوند کر دینے والی فیلڈ ہے لیکن اس کے پیچھے جو گندگی ہے اس سے وہی واقف ہے جو اس فیلڈ میں ہے۔'' سنتھیا کا جواب تھا۔

''جب اس کے والدین یہاں تھے اور کینیڈا نہیں گئے تھے یہ تب سے انکاری ہے۔'' ڈونا بولی۔

''اکیلی لڑکی اس فیلڈ میں پبلک پراپرٹی سمجھی جاتی ہے۔'' سنتھیا نے کہا۔

''جب تمہاری فیملی یہاں تھی تب تو تم اکیلی نہیں تھیں۔'' ڈونا نے ٹوکا۔

''بھائی نے تم سے کہا اور تم مان گئیں۔'' سنتھیا کا جواب تھا۔ ''ابھی وہ کینیڈا میں ہے لیکن سب جانتے ہیں کہ وہ تمہارا منگیتر ہے اور تم کسی بھی روز کینیڈا چلی جاؤ گی۔''

''مجھ سے پہلے تو تم چلی جاؤ گی۔'' ڈونا کا جواب تھا۔

''تمہارا تو بلڈ ریلیشن ہے اور یہ بھی کہ تمہاری تمام بہنیں وہیں ہیں۔'' ڈونا بولنے پر آئی تو بولتی چلی گئی۔

''تم اپنے استاد کو اپنی بنائی ہوئی تصویریں نہیں دکھاؤ گی۔'' مارشل صاحب نے اچانک باتوں کا رخ بدلا۔

''تم پینٹر بھی ہو؟'' میں نے حیرت زدہ آواز میں پوچھا۔

''اس نے آپ کو نہیں بتایا؟'' مارشل صاحب کے لہجے میں حیرت تھی۔

''بالکل بھی نہیں۔'' میرا جواب تھا۔

''ناشتے سے فارغ ہوتے ہی دکھاتی ہوں۔'' سنتھیا نے کہا۔

ہم نے جلدی جلدی ناشتا ختم کیا اور سنتھیا مجھے لے کر اوپری منزل کی طرف چل دی۔

سیڑھیوں سے لے کر اوپر کے لاؤنج تک اس کی بنائی ہوئی تصویریں موجود تھیں۔ وہ ہر تصویر کی تفصیل بتاتی جا رہی تھی۔ آیئے میں آپ کو اپنا کمرا دکھاتی ہوں۔

ہم اس کے کمرے میں داخل ہوئے تو اس کے بیڈ کے بالکل سامنے میرا پورٹریٹ موجود تھا۔

''یہ کب بنائی ہے'' میں نے سوال کیا۔

''ڈیڑھ سال لگے ہیں اس تصویر پر۔'' اس کا جواب تھا۔ پھر کچھ سوچ کر بولی۔ ''سر میرا امیگریشن آنے والا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ میرے ساتھ چلیں۔''

''میں کس طرح جا سکتا ہوں؟''

''میرے شوہر کی حیثیت سے۔'' اس نے جواب دینے میں دیر نہیں لگائی۔ ''میں بھائی سے بات کر چکی ہوں۔ اس نے مارشل انکل سے بات کی اور ساتھ ہی مجھے کہا کہ جو مارشل انکل کا فیصلہ ہوگا وہ ہم سب کو منظور ہوگا اور آج کا ناشتا اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔''

''مجھے اب کیا کرنا ہوگا؟'' میں نے سوال کیا۔

''پہلے مجھے قبول کرنا ہوگا اور پھر ہم کورٹ میرج کر لیں گے اور وہ کاغذات بھائی کو بھیج دیں گے۔'' اس نے کہا۔

''تم پورا پروگرام پہلے سے ترتیب دے چکی ہو۔''

''جی۔'' اس کا مختصر جواب تھا۔

یہ ایک عجیب سچوئیشن تھی۔ وہ تارے توڑنے کی بات کر رہی تھی۔ میرے پاس پہلے ہی دو بیویاں موجود تھیں پھر بھی یہ میری زندگی میں گھسی آ رہی تھی۔ مرد پر جوانی ہو تو مرد ہر جانب سے نگاہیں موڑ لیتا ہے اور اپنی طرف بڑھتی لڑکی کے آگے فرش راہ بن جاتا ہے۔ کم عمر قبول صورت سنتھیا کے آگے میں بھی جھک گیا مگر ایک سوال بار بار میرے ذہن میں آ رہا تھا لیکن میں وہ سوال کر نہ سکا کہ میری بیویوں کا کیا ہوگا۔

☆☆☆

اس روز میں کالج سے گھر گیا تو وہاں صورتحال کافی حد تک تبدیل ہو چکی تھی۔ دونوں بیویاں اتنی مہربان تھیں کہ مجھے شک گزرا کہ میں کسی اور گھر میں آ گیا ہوں۔ اس کی وجہ کچھ دیر بعد ہی معلوم ہو گئی۔ اماں نے اس روز میرے ناشتا کیے بغیر جانے پر خاصا ہنگامہ کیا تھا۔

''میرا بیٹا کبھی اس طرح بغیر ناشتے کے گھر سے نہیں گیا۔''

دونوں بیویاں نشانہ تھیں لیکن خاص نشانہ خالدہ تھی۔

''تیری خوبی میں نے یہی بتائی تھی کہ تو سگھڑ ہے، یہ ہے تیرا سگھڑ پن کہ شوہر بغیر ناشتے کے جا رہا ہے اور تیری نیند ختم نہیں ہو رہی ہے۔'' اسی شور شرابے میں اماں نے اپنی بہن کو بھی بلا لیا تھا۔ دوسری جانب ابا بھی پیچھے نہیں رہے تھے انہوں نے اپنے بھائی اور بھاوج کو بلوا لیا تھا۔ تمام بڑے اس بات پر متفق تھے کہ یوں میرا بغیر ناشتے کا جانا بیویوں کا پھوہڑ پن تھا۔ اس کے بعد کا ایک گھنٹا بڑوں نے بیٹھ کر باقاعدہ پروگرام طے کیے کہ گھر کے کام کون سی بیوی کس طرح کون سا کام کرے گی۔

☆☆☆

میں نے اپنا پاسپورٹ سنتھیا کے حوالے کر دیا اس کے اگلے روز ہم نے کورٹ میرج کر لی کیونکہ مارشل صاحب نے میرے بارے میں بہت اچھی رپورٹ دی تھی۔

''عمر کچھ زیادہ ہے لیکن مجھے اُمید ہے کہ سنتھیا کو خوش رکھے گا۔''

سنتھیا کے بھائی نے میری ڈگریاں منگوائیں جو میں نے سنتھیا کے حوالے کر دیں۔ مجھے اُمید تھی کہ سنتھیا کا بھائی میرے لیے کوئی اچھی سی نوکری کا بندوبست کر دے گا۔

ہماری کورٹ میرج کے تیسرے دن ڈونا نے میرے موبائل پر فون کیا کہ ایک ملٹی نیشنل کمپنی نے سنتھیا کو ماڈلنگ کی آفر کی ہے۔ آپ اس سے کہیں کہ اس بار آفر مسترد نہ کرے۔

میں نے سنتھیا سے بات کی تو اس نے شرط عائد کی کہ جس روز شوٹ ہوگی آپ میرے ساتھ چلیں گے۔

''میں کیوں؟'' میں نے سوال کیا۔

''آپ قانونی طور پر میرے شوہر ہیں۔'' اس کا جواب تھا۔

''شوہر میں بنوں گا جب ولیمہ ہو جائے گا۔'' میرا جواب تھا۔

''اور ولیمہ.....'' میں جو کچھ کہنا چاہ رہا تھا وہ سنتھیا نے ہاتھ اٹھا کر کہنے سے روک دیا۔

''میں جانتی ہوں۔'' اس نے کہا۔

''تو پھر کب کا ارادہ ہے۔''

''جو کام کل ہونا ہے وہ آج کر لیں تو بہتر نہ ہوگا۔'' سنتھیا نے کہا۔

اس روز میں جلد گھر آ گیا۔ بلکہ دوپہر کا کھانا ہم نے ساتھ کھایا۔ کھانے کے دوران ہی میں نے کہا۔ ''رات ایک دوست کی شادی میں جانا ہے۔''

''دونوں میں سے ایک کو ساتھ لے جاؤ۔'' اماں نے فرمائش کی۔

''نہیں میں اکیلے ہی جاؤں گا۔''

''رومانہ کو لے جاؤ۔'' اماں نے کہا اور میں حیرت سے

اسے دیکھنے لگا۔اب سے پہلے اگر میں رومانہ کو ساتھ لے جانے کی بات کرتا تو اماں اور خالدہ ہنگامہ مچا دیتی تھیں۔

شام میں چائے پی کر نکلا اور سیدھا مارشل صاحب کے گھر پہنچا۔ مارشل اور ان کی بیٹی گھر پر نہیں تھے۔ سنتھیا پورے میک اپ میں تھی۔

''یہ مارشل صاحب کہاں ہیں؟'' میں نے سوال کیا۔

''میں نے انہیں روانہ کر دیا ہے۔'' اس کا جواب تھا۔

''کیوں؟'' میں سوال کیے بغیر نہیں رہ سکا۔

''میرا خیال ہے کہ مجھے وضاحت کی ضرورت نہیں۔''

جس وقت ہم یہ گفتگو کر رہے تھے تو ساتھ ہی سیڑھیاں بھی چڑھ رہے تھے۔

سنتھیا، میں آگے پیچھے چلتے ہوئے اس کے بیڈروم میں پہنچے اور سنتھیا نے مجھے گلے لگانے میں دیر نہیں کی۔

صبح اذانوں تک ہم مصروف رہے۔ سنتھیا فریش ہونے کے ساتھ ہی کچن میں گھس گئی۔

وہ پہلا احساس جو مجھے ہاتھ لیتے ہوئے ہوا تھا۔ وہ احساس بے وفائی۔ میں نے ایک نہیں دو خواتین سے بے وفائی کی تھی۔

ناشتے کی میز پر پہنچے تو کچھ دیر بعد ہی مارشل اور اس کی بیٹی آ گئی۔

''کیسی رہی؟'' اس نے مجھ سے نہیں بلکہ سنتھیا سے سوال کیا۔

''بالکل ویسی ہی جیسا میں نے تصور کیا تھا۔''

''تو تمہارا خواب پورا ہو گیا۔''

''یوں کہو ایک اور خواب پورا ہوا۔'' سنتھیا نے اس کی تصحیح کی۔

''اب کون سے خواب باقی ہیں۔'' مارشل نے سوال کیا۔

''ایک تو ماڈلنگ میں نام بنانا اور دوسرے شوہر کے ساتھ کینیڈا میں زندگی گزارنا ابھی وہ خواب ہیں جو پورے نہیں ہوئے۔''

جس روز میں بغیر ناشتے کے مارشل صاحب کی طرف گیا تھا اس روز کے بعد سے ہمارے گھر ایک سکون کی فضا تھی۔ دونوں بیویاں اپنا اپنا کام کر رہی تھیں۔ رومانہ رات دیر سے سونے کی شکایت کرتی تھی تو خالدہ کو یہ گلا ہوتا تھا کہ رومانہ میری چہیتی ہے۔ میں بھی اپنے طور پر اس بات کا خیال رکھتا کہ ان دونوں کے درمیان توازن قائم رکھوں لیکن اس چکر میں سنتھیا کی حق تلفی ہو جاتی تھی لیکن اس اللہ کی بندی نے کبھی شکایت زبان پر نہ لائی۔

اس کے پہلے شوٹ میں اس کے ساتھ گیا ضرور تھا لیکن بعد کے کسی شوٹ پر چلنے کے لیے نہ اس نے اصرار کیا نہ میں گیا۔

پہلے شوٹ پر اس نے میرا تعارف اپنے شوہر کی حیثیت سے کروا دیا تھا اور تمام لوگ بہت تپاک سے ملے تھے۔

دن اسی طرح گزرتے رہے گھر پر بھی کسی کو شک تک


دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں گھر بیٹھے حاصل کریں

جاسوسی، ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 1500 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 12000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 11000 روپے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں

رابطہ

مرزا ثمر عباس: 0301-2454188

سرکولیشن مینیجر سید نذیر حسین: 0333-3285269

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی

مین کورنگی روڈ۔ کراچی

نہیں ہوا۔

ہم اکثر شام میں ملتے تھے۔ جس کے لیے میں نے گھر پر کہہ رکھا تھا کہ میں نے ٹیوشن پکڑ لی ہے۔

دو ماہ آرام سے گزر گئے کہ ایک دن ڈونا نے مجھے فون پر اطلاع دی کہ اگلے ہفتے آپ کا اور سنتھیا کا امیگریشن آرہا ہے۔

میں نے سنتھیا سے کنفرم کرنا چاہا تو اس نے کہا "بھائی کی کال مجھے بھی آرہی تھی لیکن میں فوٹو شوٹ میں مصروف تھی شاید اسی لیے انہوں نے اپنی منگیتر کو اطلاع دے دی۔"

جس روز ہمیں روانہ ہونا تھا اس سے ایک روز پہلے میں نے استعفیٰ دیا اور یہ انتظار کیے بغیر کہ جواب کیا آتا ہے میں سنتھیا کو لے کر کینیڈا روانہ ہوگیا۔

جس روز ہم روانہ ہوئے وہ اتوار کا دن تھا اس لیے گھر پر کسی کو شک نہیں ہوا کیونکہ میں بتا چکا تھا کہ سنڈے کو ہمارا کالج پکنک پر جارہا ہے۔ ہم کینیڈا پہنچے تو سنتھیا کے گھر والے ٹورنٹو ایئرپورٹ پر موجود تھے۔ وہ تمام لوگ مجھ سے بھی گرم جوشی سے ملے جیسے انہیں ہماری شادی پر کوئی اعتراض نہ ہو۔ ڈونا اپنے باپ سے بچھڑنے پر کچھ افسردہ تھی لیکن اس کے منگیتر نے اسے زیادہ دیر اداس نہیں رہنے دیا۔

یہ بات کینیڈا پہنچ کر میرے علم میں آئی تھی کہ سنتھیا نے اپنے بھائی کے ذریعے مکان کا بندوبست کیا ہوا ہے۔ کینیڈا میں 20 فیصد پر بینک مکان فنانس کرتا ہے اور سنتھیا نے اس سے فائدہ اٹھایا تھا۔

سنتھیا کا بھائی کینیڈا میں ایک اردو ٹی وی چلاتا تھا وہ ضامن بنا اور سنتھیا نے ماڈلنگ کی آمدنی سے شروع کے بیس فیصد رقم مہیا کردی تھی۔ یہ بات بھی میرے علم میں کینیڈا پہنچنے کے بعد آئی کہ مکان میرے نام پر تھا۔

پاکستانی حساب سے وہ چار بیڈ رومز کا مکان تقریباً دس کروڑ کا بنتا تھا۔ دو بیڈ روم نیچے بیسمنٹ میں تھے دو بیڈ رومز فرسٹ فلور پر تھے۔

"یہ ہم دونوں کی رہائش کے لیے کچھ زیادہ نہیں ہے۔" میں نے سنتھیا سے کہا۔

ہم دونوں کے لیے تو واقعی زیادہ ہے لیکن مستقبل میں یہی مکان چھوٹا ہوجائے گا۔

"تمہارا مطلب ہے بچوں کے بعد؟" میں نے سوال کیا اور سنتھیا مسکرا کر چپ ہوگئی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کچھ کہنا چاہ رہی ہے لیکن اسے مناسب لفظ نہیں مل پارہے۔

میں نے بھی بحث مناسب نہیں سمجھی۔

ہم ابھی بات کررہی رہے تھے کہ سنتھیا کا بھائی آیا۔

"تم سے کچھ لوگ ملنے آئے ہیں نیچے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں۔"

"کون لوگ ہیں؟" سنتھیا نے سوال کیا۔

"دو مالکان ہیں ایڈورٹائزنگ ایجنسیوں کے وہ تمہیں اپنے اشتہارات میں موقع دینا چاہتے ہیں۔" سنتھیا کے بھائی کا جواب تھا۔

"تم نے بتایا ہوگا میری ماڈلنگ کے بارے میں۔"

"میں نے انہیں تمہاری وہ ویڈیو دی تھیں جو تم مجھے بھیجتی رہی ہو اس کے علاوہ بھی پاکستانی ٹی وی بھی تو یہاں پر دیکھے جاتے ہیں۔"

"تم کیا کہتے ہو؟" سنتھیا نے مجھ سے سوال کیا۔

"مجھے تو کوئی حرج نظر نہیں آتا۔" میں نے کہا "اور اب تو میری نوکری بھی نہیں ہے۔" میں نے اپنی بات مکمل کی تو سنتھیا کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔

"فکر نہ کریں۔" اس نے مجھے مخاطب کیا۔

"میرا ایک ٹی وی ہے وہاں اینکر بن سکتے ہو۔" اس نے کہا تو سنتھیا کے چہرے پر بھی مسکراہٹ آگئی۔

"اب تو خوش ہو۔" اس نے مجھ سے کہا۔

ہم ایئرپورٹ سے سیدھے اس مکان پر آئے تھے جو میرے نام سے لیا گیا تھا۔

"ہفتہ میں تین دن یہ پروگرام ہوتا ہے۔" اس نے کہا۔

"باقی کے چار دن؟" میں نے سوال کیا۔

اس کا انتظام بھی ہوجائے گا۔ "ایک اور چینل ہے وہاں پر وڈیوسر کی جگہ خالی ہے۔"

ہم باتیں کرتے ہوئے گراؤنڈ فلور کے ڈرائنگ روم میں آئے تو وہاں موجود لوگوں نے کھڑے ہوکر ہمارا استقبال کیا۔

"ہم کینیڈا میں آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔" وہ سنتھیا سے مخاطب تھے۔

"میں پاکستان کی ٹاپ ماڈلز میں سے ایک ہوں۔" سنتھیا نے کہا۔

"کچھ مہینوں میں آپ کینیڈا ہی نہیں امریکا کی بھی ٹاپ ماڈل ہوں گی۔" ان میں سب سے ایجڈ شخص نے کہا۔

"یہ میرے شوہر ہیں۔" سنتھیا نے میرا تعارف

کروایا۔ ''پاکستان میں یہ کالج میں پڑھاتے تھے۔'' سنتھیا نے کہا اور میں سمجھ نہیں پایا کہ وہ کہنا کیا چاہ رہی ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنی بات مکمل کرتی ڈونا وہاں پہنچ گئی۔

''بھائی تم نے کہا تھا کہ ایک پاکستانی ریسٹورنٹ بہت سستے دام بک رہا ہے۔'' سنتھیا نے اپنے بھائی سے کہا۔

''مل تو جائے گا لیکن چلائے گا کون؟'' سنتھیا کے بھائی کا سوال معقول تھا۔

''اس کی فکر نہ کریں۔'' سنتھیا نے جواب دیا۔ ''آپ یہ بتائیں وہ ہے کون جو بیچ رہا ہے۔''

''ایک صاحب ہیں جو والد صاحب کی عمر کے ہیں اور ایئر فورس سے ریٹائرڈ ہیں۔''

''پھر تو آسانی ہوگئی۔'' سنتھیا نے کہا۔

''وہ ریسٹورنٹ بیچیں گے نہیں البتہ پارٹنر شپ میں چلانے کا کہہ رہے ہیں۔'' سنتھیا کے بھائی نے بات آگے بڑھائی۔

''اس سے تو اچھا ہے کہ وہ بیچ دیں۔''

''پچاس برس پہلے وہ امریکا اور پھر وہاں سے کینیڈا آئے تھے۔ یہاں ان کا یہ پہلا کاروبار ہے۔'' سنتھیا کے بھائی نے کہا۔

نئے مکان میں وہ ہماری پہلی رات تھی۔ میں ٹی وی پر اپنا پہلا پروگرام کر کے واپس گھر آیا تو سنتھیا پورے میک اپ میں انتظار کر رہی تھی۔

''خیریت ہے کس پر بجلی گرانے کا پروگرام ہے۔'' میں نے کہا۔

''تمہارے علاوہ اور کون ہے جس پر میں بجلی گرا سکتی ہوں۔'' اس کا جواب تھا۔

''میں تیار ہوں تمہارا ہر ستم اٹھانے کے لیے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''بے شرم ہو تم۔'' سنتھیا نے اٹھلا کر جواب دیا۔

''کہاں چلیں۔'' میں نے سوال کیا۔

''اوپر بیڈ روم میں۔'' اس کا جواب تھا۔

وہ آہستہ قدموں کے ساتھ سیڑھیاں چڑھ رہی تھی جیسے اسے کوئی جلدی نہ ہو۔

اس کے پیچھے میں بیڈ روم میں پہنچا تو وہ بولی تھی۔

''وعدہ کرو مجھے ڈانٹو گے نہیں۔''

''ایسا کیا کر دیا تم نے کہ مجھ سے وعدہ لینے کی نوبت آگئی۔'' میں نے کہا۔

''میں ہر کام تم سے اجازت لے کر کرتی ہوں لیکن آج ایک کام تم سے پوچھے بغیر کیا ہے۔'' سنتھیا بولی۔

''کیا وہ ایسا ہی کام ہے کہ تمہیں شبہ ہو کہ میں تمہیں ڈانٹ بھی سکتا ہوں۔'' سنتھیا نے سنا اور اس کی گردن اثبات میں ہل گئی۔

''اور وہ کیا کام تھا۔'' میں نے سوال کیا۔

''میں نے تمہارے گھر فون کر کے بتا دیا ہے کہ ہم کینیڈا میں ہیں۔'' سنتھیا نے کہا اور مجھے یوں محسوس ہوا کہ میرے پیروں تلے زمین نکل رہی ہے۔

''جب ہم ایئر پورٹ جا رہے تھے تو کراچی میں.:. میرے ضمیر نے ملامت کی تھی۔'' اس نے آہستگی سے کہا تھا۔

''کس بات پر ملامت کی تھی تمہارے ضمیر نے؟'' میں نے کہا۔

''کراچی ایئر پورٹ سے ٹورنٹو ایئر پورٹ صرف یہ خیال مجھے ستاتا رہا کہ میں تو اپنے پیاروں کے پاس جا رہی ہوں لیکن تمہیں تمہارے والدین سے چھڑوا رہی ہوں جنہوں نے تمہیں پالا اپنی نیندیں خراب کیں، میں تمہیں ان سے جدا کر رہی ہوں۔''

''فون کس نے اٹھایا تھا؟'' میں نے سوال کیا۔

''تمہاری بیوی نے اٹھایا تھا۔''

''کس بیوی نے رومانہ یا خالدہ نے؟'' میں نے سوال کیا۔

اس نے فون ریسیو کرتے ہی تمہاری امی کو آواز دی تھی، امی نے نام لے کر پوچھا تھا کہ کس کا فون ہے اس طرح مجھے معلوم ہوا کہ وہ رومانہ ہے۔

''اماں نے کیا کہا؟'' میں نے سوال کیا۔

''تم نے گھر پر کہا تھا کہ تم کالج کے ساتھ پکنک پر جا رہے ہو۔'' سنتھیا نے وہی کہا جو میں نے گھر پر کہا تھا۔

''میں نے انہیں بتایا کہ تم خیریت سے ہو اور کینیڈا میں ہو تو انہوں نے بتایا کہ جب تم رات بھر گھر نہ پہنچے تو اگلے روز تمہارے ابا کالج پہنچے جہاں انہیں معلوم ہوا کہ کالج تو پکنک پر گیا ہی نہیں۔ وہاں سے وہ پولیس اسٹیشن گئے، ایف آئی آر درج کروائی۔ پولیس نے چند گھنٹوں میں یہ معلوم کر لیا کہ تم ٹورنٹو کی فلائٹ سے چلے گئے ہو۔'' سنتھیا نے تفصیل بتائی۔

''انہوں نے تم سے نہیں معلوم کیا کہ تم کون ہو۔'' میں نے سوال کیا۔

''تمہارے ابا نے یہ سوال کیا تھا جس پر میں نے ان سے اپنا تفصیلی تعارف کروایا۔''

''تیسری بہو کا سن کر ان کا ردِعمل کیا تھا۔'' میں نے پوچھا۔

''تمہاری امی نے دونوں بہوں کو کوسنے دیے اور ابا نے کہا کہ وہ یہ نہ کرتا تو اور کیا کرتا۔ میں تم دونوں سے کہتا رہتا تھا لیکن تم دونوں کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔''

''تم نے یہ فون کر کے ایک طرح سے میری پریشانی دور کردی۔'' میں نے کہا۔ ''تمہیں یہ کیوں محسوس ہوا کہ میں اس پر ناراض ہوں گا۔''

میری بات سن کر سنتھیا کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ آ گئی۔ ''میں بھائی سے بات کرتی ہوں کہ تمہارے گھر والے جلد سے جلد کتنی دیر میں آسکتے ہیں۔'' سنتھیا نے کہا۔

''سوچ سمجھ کر بات کرنا میں نہیں چاہتا کہ یہاں بھی وہاں والی مورتحال ہو جائے۔'' میں نے خبردار کیا۔

''اطمینان رکھو نہیں ہوگی۔'' سنتھیا نے اطمینان دلایا مگر میں اپنی اماں سے واقف تھا انہیں اس پر شاید اعتراض نہ ہوتا لیکن یہ بات ان کے لیے یقینی طور پر پریشانی کا باعث بنے گی کہ ایک ہی گھر میں دو عقیدوں والے بچے پروان چڑھیں۔

ایک ہفتہ اسی طرح گزر گیا۔ ہفتہ بعد سنتھیا کے بھائی نے ترکیب بتائی کہ انہیں ٹورسٹ ویزا پر بلا لیتے ہیں۔ چھ ماہ میں کچھ نہ کچھ ہو ہی جائے گا۔

''اتنے لمبے پراسس میں الجھانے کی بجائے براہِ راست ہمارے امیگریشن پر انہیں بلوالو۔'' سنتھیا نے بھائی کی رائے سے اختلاف کیا۔

''جب وہ کینیڈا میں موجود ہوں گے تو ان کا کیس مضبوط ہوگا۔''

سنتھیا کا بھائی ہر مہینے نئی کہانی سنا دیتا، اس طرح چار ماہ کا عرصہ گزر گیا۔ اس دوران کم از کم روزانہ ہی میری گھر والوں سے بات ہوتی تھی۔

سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ کینیڈا کے قانون کے مطابق سنتھیا ہی میری بیوی تھی اور مزید بیویوں کی گنجائش نہیں تھی۔

''تم حاملہ ہو جاؤ تو ان کی اماں کی آمد آسان ہو جائے گی۔''

پھر کرنا خدا کا یہ ہوا کہ سنتھیا حاملہ ہوگئی۔

''ایک بزرگ کی حاملہ خاتون کی دیکھ بھال کے نام پر اماں کا ویزا اپلائی ہوا اور پندرہ دن میں آ گیا۔ میری ڈبل جاب جاری تھی لیکن حاملہ ہونے کے بعد سنتھیا نے اپنی ماڈلنگ کم کردی تھی۔

میں نے کینیڈا سے ٹکٹ بھیجا۔

اماں کو ایئرپورٹ سے لینے ایک بار پھر پورا قافلہ ایئرپورٹ گیا۔ اماں ایئرپورٹ سے سیدھے ہمارے گھر آئیں۔ انہوں نے اوپر کی منزل کا کمرا اپنے لیے پسند کیا۔

سال اسی طرح گزر گیا رومانہ اور خالدہ کی آمد کا کوئی راستہ نہیں نکلا۔ اس موقع پر سنتھیا کا بھائی ایک بار پھر مدد کو آیا انہوں نے اپنے کسی دوست سے بات کی اور اس نے رومانہ کو اسپانسر کر دیا۔ محمود صاحب کا ایک ہوٹل تھا جس میں گنجائش تھی۔ رومانہ وہاں سپروائزر ہوگئی تھی انہوں نے ہی خالدہ کو اسپانسر کیا تھا۔ وہ ہوٹل کی جونیئر شیف ہو کر آ گئی۔ ان دونوں کے لیے نیچے بیسمنٹ کے بیڈروم تھے۔

حویلی نام کا وہ پاکستانی ریسٹورنٹ سنتھیا نے کسی نہ کسی طرح حاصل کرلیا۔

اب زندگی اس طرح بسر ہونے لگی کہ صبح میں اپنے کام پر نکل جاتا اور رومانہ اور خالدہ اپنے کام پر جبکہ جس روز سنتھیا کا شوٹ ہوتا وہ دیر سے نکلتی تھی۔ ہمارے خاندان کی خزانچی اماں تھیں۔ ہمارا بیٹا فاتح اماں کی جان تھا۔ وہ سارا دن اماں کے پاس رہتا بلکہ رات میں بھی ان کے پاس ہی سوتا تھا۔

اب صرف ابا پاکستان میں رہ گئے تھے زندگی آرام سے گزر رہی تھی کہ ایک روز چاچا نے اطلاع دی کہ رات وہ اپنے معبود حقیقی کے پاس چلے گئے۔

خالدہ کو تو نہیں لیکن رومانہ کو بچہ پیدا کرنے کی جلدی تھی۔ وہ شام میں سنتھیا سے بات کر لیتی تھی اور رات بیڈروم میں آجاتی تھی کیونکہ اس نے بھی سن رکھا تھا کہ جو بچہ کینیڈا میں پیدا ہوگا اس کی ماں کو فوری طور پر امیگریشن مل جائے گا۔ اپنے طور پر وہ پوری کوشش کر رہی تھی — میرا بھی اس کا ہر طرح سے ساتھ دینا تھا لیکن اللہ کی مرضی نہیں تھی تو فاتح اکیلا ہی رہا۔ خالدہ نے اپنے طور پر ڈاکٹروں سے رابطہ کیا لیکن اسے بھی مایوسی ہی ملی۔

زندگی ہلکی پھلکی خوشی بسر ہو رہی ہے۔ نہ ناشتے کا جھگڑا ہے نہ کچھ اور۔ میں بھی خوش ہوں کہ ایک چھت کے نیچے تین بیویوں کے ساتھ گزر ہو رہی ہے اور بہت آرام سے گزر رہی ہے۔

++

# دست راست

جناب ایڈیٹر سرگزشت

السلام علیکم!

سچ کہوا اور انوکھا بھی ہوتا ہے۔ زیرِنظر سچ بیانی کے واقعات کو میں نے ہلکی سی تبدیلی کے بعد افسانوی انداز دیا ہے تاکہ پڑھنے والے کو بھرپور کہانی لگے۔ انتقام درانتقام کا یہ واقعہ کتنا انوکھا ہے آپ خود ملاحظہ کریں۔

سیدہ صائمہ کاظمی

کھڑاک کی آواز کے ساتھ بھاری لکڑی کے کواڑ کھلے اور سرد ہوا کے ساتھ خشک پتوں نے فاروق زمان کا خیر مقدم کیا۔ وہ بیس سال شہر کی تابناک اور تیز رفتار زندگی گزارنے کے بعد ایک بار پھر ماضی کی جانب پلٹا تھا۔ وہ ماضی جسے وہ عرصہ ہوا دفن کر چکا تھا۔ مگر قسمت ایک بار پھر اسے پرکھوں کے در پر لے ہی آئی تھی۔

فاروق زمان نے سامان اٹھایا اور وسیع و عریض ہال میں قدم رکھا۔ جہاں اس کا بچپن گزرا تھا۔ یہاں چھٹیاں

گزارنے وہ لوگ اکثر آیا کرتے تھے۔

''سلام صاحب! لائیں میں پہنچا دیتا ہوں۔''

کرم دین بابا نے تیزی سے آگے بڑھ کر فاروق زمان کے ہاتھ سے سوٹ کیس تھام لیا۔

''ٹھیک ہے بابا! میں لے جاؤں گا۔''

فاروق زمان نے خود سے بوڑھے کرم دین سے کہا اور اوپر کی طرف جاتی کشادہ سیڑھیوں پر قدم رکھ دیے۔

کرم دین حیرت کا مظاہرہ کرتا باورچی خانے کی طرف پلٹ گیا۔ جہاں اسے اپنے چھوٹے صاحب کے لیے کھانے وغیرہ کا بندوبست کرنا تھا۔

فاروق زمان نے حویلی کے صحن میں کھلنے والی کشادہ کھڑکی کے پٹ وا کیے۔ تناور درختوں اور پودوں کی باس اس کے نتھنوں سے ٹکرائی۔ نیچے جھانکا تو سرخ اینٹوں کی پختہ روش دکھائی دی۔ املتاس کا اداس پیڑ سر نیہوڑائے گہرے تفکر میں گم تھا۔ فاروق زمان نے آسمان پر نگاہ کی۔ کالی بدلیاں اکٹھی ہو رہی تھیں۔ وہ پیچھے ہٹ گیا۔ بھاری ہوا کے تازہ جھونکوں نے اس کے سرمئی بالوں کو چھوا۔ وہ سوٹ کیس سے ضرورت کا سامان نکالنے لگا۔

''السلام علیکم! کیسا ہے یار؟''

کھانے کی میز پر رات کا کھانا چن دیا گیا تھا۔ مینہ چھاجوں چھاج برس رہا تھا کہ سردار کی آواز اس کھلے ہال نما کمرے میں گونجی۔ فاروق زمان نے کھڑے ہو کر اس کا استقبال کیا۔ فاروق زمان کا بچپن لڑکپن سردار کے ساتھ گزرا تھا۔ فاروق زمان کی یادیں سردار کے بغیر ادھوری تھیں۔

''کیسا نظر آ رہا ہوں؟''

فاروق نے خوشدلی سے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ اور سردار کو کھانے کی دعوت دی۔

''آؤ بسم اللہ کرو!''

''میں اعوذ باللہ بسم اللہ سب کر چکا ہوں۔ تم تو جانتے ہو ہم دیہاتیوں کی رات عصر کے بعد ہو جاتی ہے۔ یہ تو تمہیں دیکھنے کی خواہش تھی جو یہاں لے آئی۔ تم لوگوں نے تو مڑ کے دیکھا ہی نہیں کہ کیا کرتے رہے اتنے سال؟'' سردار نے کھانے سے معذرت کرتے ہوئے گفتگو کا آغاز کیا۔

''مڑ کر دیکھنے کو تھا ہی کیا۔ ایک حادثے کے سوا۔ سچ پوچھو تو میں خود سے فرار ڈھونڈتا رہا اتنے برس! مگر افسوس ماضی ہمیشہ آپ کے ساتھ رہتا ہے۔ پرچھائیں کی صورت۔ یہ کبھی آپ کی گردن نہیں چھوڑتا۔'' فاروق زمان نے آنکھوں پر عینک درست کرتے سردار کو جواب دیا۔ سردار کے چہرے پر سنجیدگی کھنڈ آئی۔

''اتنے سالوں بعد یہاں آنے کا خیال کیسے آیا؟'' سردار نے وہ سوال پوچھا جو اسے اب تک بے چین کیے ہوئے تھا۔

''ماضی کی کھوج میں! میں اپنی نئی کتاب کی بنیاد اپنے ماضی پر دھرنا چاہتا ہوں۔ سو یہاں کا رخ کیا۔''

سردار نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

''تم سناؤ! تمہارا زمین سے رشتہ کیسا رہا؟''

فاروق نے آہستہ آہستہ نوالے چباتے ہوئے کہا۔

''کیسا ہو سکتا ہے؟ پرکھوں کا رشتہ تھا۔ سو ساری عمر اسی کو نبھاتے گزر گئی۔''

سردار نے شانے پر پڑی چادر درست کی اور کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ ''سنا ہے۔ بہت بڑے آدمی ہو گئے ہو۔ موٹی موٹی کتابیں لکھتے ہو؟'' سردار نے ہلکا پھلکا مذاق کیا۔

''بڑا آدمی؟ پتا نہیں۔ لیکن نامور ضرور ہو گیا ہوں۔ چار لوگ مجھے پہچاننے لگے ہیں۔''

فاروق نے کسر نفسی سے کام لیا۔

''یہ تو خیر سچ نہیں! تمہاری تصویریں اور انٹرویوز ٹی وی پر اکثر دیکھتا رہتا ہوں۔ اور تمہارا وہ پروگرام..... کیا نام ہے اس کا؟'' سردار نے ایک ثانیہ کو یاد کرنے کی کوشش کی۔ ''ہاں! نگار خانہ!''

''تمہاری یادداشت کافی اچھی ہے۔'' فاروق نے مذاقاً کہا۔

''چھوڑ یار! اب کہاں کی یادداشت! کبھی وقت تھا ہمارا بھی۔ اب تو ایک پہر پہلے کی بات یاد نہیں رہتی۔ ویسے پروگرام بہت کمال کا ہے۔ تمہاری موٹی موٹی کتابوں کے تبصرے تو میری بدھی میں نہیں بیٹھتے۔ میں تو بس تجھے دیکھ کر خوش ہو جاتا ہوں۔'' سردار نے خود اپنا ہی ٹھٹھا لگایا۔ ''ویسے تو یادوں میں کیا کھنگالنے آ گیا یہاں؟'' سردار گفتگو کا رخ موڑ کر ایک بار پھر اپنے مطلب کی طرف لے آیا۔

''تم مجھ سے کیا سننا چاہتے ہو؟'' سردار فاروق نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیے اور سردار کے ساتھ بیٹھک میں چلا آیا جہاں کرم دین بابا نے آتشدان پہلے سے گرم کر رکھا تھا۔

بابا! کافی لے آئیں۔'' فاروق نے بلند آواز سے پکارا۔

''نہیں میں کافی نہیں پیتا!'' سردار نے وضاحت کی۔

''تو پھر کیا پسند کرو گے؟''

سردار نے پس و پیش سے کام لینا چاہا، مگر کرم دین بابا خود ہی بول پڑے۔ ''مجھے پتا ہے جی۔ سردار بیٹے کو دودھ پتی پسند ہے۔ ملائی والی!''

خوب صورت و دلکش تحریروں سے مزین نمبر 2020 کا دلکش شمارہ

کچھ ہے ہر فرد کے لیے

ماہنامہ

# پاکیزہ

کراچی

**افشاں آفریدی** و **نایاب جیلانی** کے سلسلے وار ناول دلچسپ دوراہے پر

**سعدیہ رئیس** کا شاہکار ..... پڑھیے منی ناول **میں انمول** کی صورت

**مدیحہ شاہد** کا سحر انگیز مکمل ناول **پریوں کا دیس**

**عورت کہانی** میں **فرحین اظفر لائی** ہیں ایک اور شاہکار داستان .....

**انداز نو** میں

ملیں ایف ایم کے خوش گفتار آر جے

**اسد علی چوہدری** ..... سے

**شمع ہدایت** میں

**اختر شجاعت** کا تحقیقی مقالہ

**رضا ..... توفیق الٰہی**

کے عنوان سے

اور بھی کئی عمدہ تحریریں

**ہما بیگ**، **ناہید سلطانہ اختر**، **طیبہ عنصر مغل**،

**سعدیہ قریشی**، **افشین نعیم** و دیگر لکھاریوں کی لاجواب تحریریں

رنگا رنگ مستقل سلسلے پُر مزاح ترانے اور مسحور کن شاعری .....

یہ سب آپ جیسے باذوق اور باشعور پڑھنے والوں کے لیے ہی تو ہے

اور مسکرا کر پلٹ گئے۔ سردار فاروق کی طرف متوجہ ہوا۔ ''میں نے سنا ہے۔ نفسیاتی ڈاکٹر سے علاج چل رہا ہے تمہارا؟''

''ٹھیک سنا ہے۔ شہرت سکون کی قیمت پر ملتی ہے۔ ہم آسمانوں پر جگمگانے والے لوگوں کو یہ قیمت ادا کرنی ہی پڑتی ہے۔'' فاروق نے شیڈ سے دھار کی صورت بہتی بارش کو دیکھ کر جواب دیا۔

''اس بے چینی کی وجہ میں تو نہیں؟'' سردار نے گہری نظر سے فاروق کو دیکھا۔ فاروق نے بغور اسے دیکھا۔ مگر جواب نہیں دیا۔ سردار کا سوال اسے بیس برس پیچھے لے گیا۔

☆☆☆

یہ گرمیوں کی ایک دوپہر تھی۔ فاروق سردار کے ساتھ شکار کی تلاش میں اونچی گھاس اور گھنے درختوں کے بیچ دوڑا چلا جا رہا تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی تگ و دو میں تھے۔ پہاڑی کے پیچھے۔ نشیب میں بہتے دریا کے پاس فاروق کو کچھ ہلچل سی محسوس ہوئی۔ مگر فاروق سے پہلے سردار کی گولی نے شکار کو چاٹ لیا۔ ابھرنے والی چیخ انسانی تھی۔

فاروق نے غیر ارادی طور پر مڑ کر سردار کی جانب دیکھا۔ وہ سفید چہرے کے ساتھ۔ دم سادھے اپنی جگہ بت بن چکا تھا۔ فاروق کے ٹھنڈے پڑتے اعصاب نے اچانک ہی جھرجھری لی۔ اور وہ سرعت کے ساتھ اس طرف دوڑ پڑا۔

وہ دریا خان تھا۔ سینے پر ہاتھ رکھے۔ بے دم ہو چکا تھا۔ فاروق کو دیر ہو چکی تھی۔ غالباً وہ گولی لگتے ہی ختم ہو گیا تھا۔ فاروق نے دل میں گہری ٹیس اٹھتی محسوس کی۔ سولہ سال۔ زندگی کے سترہ سالوں میں اسے ہنستا کھیلتا اپنے سامنے، اپنے ساتھ جوان ہوتے دیکھا تھا۔ وہ فاروق اور سردار سے صرف ایک سال چند ماہ چھوٹا تھا۔ اسے اس حال میں دیکھنے کا تو تصور ہی نہیں تھا۔ کیا اپنے ہاتھوں سے.....؟

فاروق نے اپنے پیچھے آہٹ محسوس کی۔ سردار پھٹی پھٹی نظروں سے مردہ دریا خان کو دیکھ رہا تھا۔

''سردار! یہ جو کچھ ہوا ہے۔ ہم نے نہیں کیا! ہم اس بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ بلکہ ہم اس طرف آئے ہی نہیں۔ اب میری مدد کرو۔''

فاروق دریا خان کی لاش کی طرف جھکا مگر سترہ سالہ سردار کی پھٹی پھٹی آنکھیں دریا خان کے سینے سے بھل بھل بہتے خون پر جم چکی تھیں۔ فاروق نے گہرا سانس خارج کیا۔ اور پھرتی سے کھڑا ہوا۔ سردار کا چہرہ دونوں ہاتھوں کے حلقے میں لیا۔ ''سردار! میری طرف دیکھو۔ کچھ..... نہیں..... ہوا..... ہے! تم مجھے سن رہے ہو؟ تمہیں مجھے سننا ہوگا!''

فاروق نے قدرے ٹھہر ٹھہر کر اسے باور کرایا۔ اگلے لمحے وہ جیسے بیدار ہوا۔ فاروق دریا خان کو بازوؤں سے گھسیٹ رہا تھا۔ سردار نے کانپتے ہاتھوں سے اس کی مدد کرنا شروع کی۔ وہ ایک ہی نظر میں فاروق کا منصوبہ سمجھ چکا تھا۔

دونوں نے جیسے تیسے صحتمند دریا خان کو ٹھاٹھیں مارتے پانی کے حوالے کیا اور ساتھ ہی ہتھیار بھی توڑ پھوڑ کر دریا کے حوالے کر دیے۔

پانی سے خود کو صاف کیا اور ایک خاموش معاہدہ دونوں کے درمیان طے پا گیا۔ کبھی زبان نہ کھولنے کا معاہدہ!

''ہم شریک راز ہیں۔ سردار! وعدہ خلافی نہیں کر سکتے۔''

فاروق حال میں لوٹ آیا۔ سردار آہستہ سے اس کے قریب آیا اور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ ''بیشک! لیکن راز تب تک ہی راز ہے جب تک ایک سینے میں رہے۔'' اس عمر میں راز کھلا تو میری شہرت ختم، بچے نفرت کرنے لگیں گے۔

اور اس کے ہاتھ فاروق کی گردن پر دباؤ بڑھانے لگے۔ کرم دین بابا بہت دیر ہوئے کافی اور چائے میز پر رکھ کر اپنے کوارٹر میں جا چکے تھے۔

فاروق کا جسم بے دم ہو کر صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔ سردار نے اطمینان سے چائے کا مگ اٹھایا اور ہونٹوں سے لگا لیا۔ وہ مطمئن تھا کہ فاروق کی موت کو خودکشی بنانا کچھ زیادہ مشکل نہیں تھا۔ اس کا ارادہ لاش کو بیڈ روم میں لے جا کر چھت کے پنکھے سے ٹانگنے کا ارادہ تھا۔ مگر اسے کوئی جلدی نہیں تھی۔ اس نے سامنے رکھا چائے کا کپ ہاتھ میں لے لیا۔ آخری گھونٹ حلق سے اتارنے کے بعد سردار نے کپ رکھا اور جونہی کھڑا ہوا اسے زور کی ابکائی آئی۔ منہ پر ہاتھ رکھ کر وہ باہر کو دوڑا مگر لڑکھڑا کر دہلیز پر ہی گر گیا۔ مختل ہوتے حواس کے ساتھ وہ سمجھ نہیں سکا۔ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے؟

اسی لمحے دو قدم سردار کے چہرے کے پاس آ کر رک گئے اور کرم دین بابا کا چہرہ نمایاں ہوا۔

''بیس سال سے میرے بیٹے کا خون انصاف کا منتظر تھا۔ جو آج پورا ہو گیا۔''

اور سردار کا چہرہ چھپا کر پلٹ گیا۔

++

# دو راہیں

محترمہ عذرا رسول
سلام مسنون!
یوں تو کہانیاں لکھنا میرے شوق میں شامل ہے اور تواتر سے مختلف پرچوں میں چھپتی بھی ہوں لیکن جب کوئی سچی کہانی جو سبق آموز بھی ہو ملتی ہے تو اسے سرگزشت میں بھیج دیتی ہوں۔ یہ سچ بیانی سبق آموز اور ذرا الگ انداز کی ہے اس لیے سرگزشت میں بھیجی ہے۔ اُمید ہے قارئین کو بہت زیادہ پسند آئے گی۔
اریشہ غزل
(کراچی)

''انسان کی زندگی میں دو لمحے ضرور آتے ہیں جب اسے اپنے لیے اچھا یا برا کوئی ایک راستہ چننا ہوتا ہے۔ فیصلے کی باگ ڈور اس کے ہاتھ میں تھمادی جاتی ہے اور اسے اپنے لیے راہ ڈھونڈنی ہوتی ہے بعض لوگ کمزور فیصلے اور نفسانی خواہشوں کے بوجھ تلے دبے ہوتے ہیں اس لیے وہ بری راہ ہی پسند کرتے ہیں۔ میں کوئی بہت اچھی نیک اور پارسا عورت نہیں ہوں، میں بھی انہی کمزور لوگوں میں شمار ہوتی ہوں مگر میری ماں جو میری رہنما بھی ہے اس کی بدولت میں نفسانی خواہشوں کے جال سے نکلنے اور اس کے حصار کو توڑنے میں کامیاب ہوئی۔ یہ آج سے کچھ سال پہلے کی بات ہے۔ مجھ سے بڑی دو بہنیں اور میرے بعد دو بھائی تھے اس طرح ہم کل پانچ بہن بھائی تھے۔ اماں کا تعلق بنگالی خاندان سے تھا اور ابو اردو اسپیکنگ تھے۔ گارمنٹس کی فیکٹری میں ان کی محبت پروان چڑھی اور بعد میں اسی محبت نے انہیں شادی پر مجبور کر دیا اماں

تھیں تو بنگالی فیملی سے مگر بے پناہ خوبصورت حالانکہ زیادہ تر بنگالی کالے اور بھدے نقوش کے ہوتے ہیں مگر وہ بہت خوبصورت تھیں جس کی وجہ سے ہم بہن بھائی بھی خوبصورت تھے حالانکہ ہمارے ابا عام سی شکل وصورت کے تھے۔ ان کے اماں ابا نہیں تھے، لے دے کر صرف ایک بڑا بھائی تھا وہ ابا سے ملنے آتا رہتا تھا۔ اماں نے غیر ذات میں شادی کی تھی اس لیے ان کے خاندان والے بھی ان سے نہیں ملتے تھے۔ ماں، باپ، بھائی، بہنیں سبھی نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔

شادی کے بعد ہمارے گھر میں افراد بڑھتے گئے ضرورتیں زیادہ ہوتی گئیں اور ابا کی اکیلی کمائی میں گزارا نہ ہونے کے برابر رہ گیا کیونکہ وہ آدھا مہینے کام کرتے تھے اور پندرہ دن چھٹیوں میں گزارتے تھے۔ بچے چھوٹے تھے اماں ان کی وجہ سے کام نہیں کر پاتیں تھیں۔ ابا کا ایک دوست تھا منظور علی اس کی بدولت کبھی فاقوں کی نوبت نہیں آئی جب کبھی خرچے کے لیے پیسے نہیں ہوتے تو وہ راشن بھروا دیتا تھا۔ ابا اس کا بہت احسان مانتے تھے اور اٹھتے بیٹھتے اس کی تعریفیں کرتے تھے۔ اماں نے ہم بہن بھائیوں کو ایک ایک کر کے گورنمنٹ اسکول میں ڈالا تاکہ بالکل جاہل نہ رہیں، پڑھنا لکھنا سیکھ جائیں۔ وہاں کی پڑھائی سبھی جانتے ہیں کہ برائے نام ہی ہوتی ہے مگر میٹرک تک آتے آتے مجھے پڑھنا، لکھنا آتا گیا۔ جتنا شوق مجھ میں تھا میرے باقی بہن بھائیوں میں نہ تھا اس لیے ثریا آپی اور فاطمہ باجی کی شادیاں منظور علی کی مدد سے غیروں میں سادگی سے کر دی گئیں۔ ان کے شوہر اچھے آدمی تھے دونوں بہنیں اپنے، اپنے سسرال خوش تھیں۔ محلے میں نجانے کیوں ہمیں اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ محلے کی عورتیں اماں کے پاس آتی بھی نہیں تھیں۔ جب میں چھوٹی تھی تو اکثر محلے کے آدمی جمع ہو کر ابا کے پاس آتے اور جھگڑا کرتے تھے۔ وہ برملا ماں کو برا اور غلط کہتے تھے۔ ابا یہی عذر پیش کرتے کہ بچے چھوٹے ہیں اسے چھوڑ نہیں سکتا ورنہ یہ رل جائیں گے۔ بڑے ہونے پر آہستہ آہستہ بہت سی باتیں سمجھ آنے لگیں۔ باپ کے عذر اور ماں کی نوازشیں غیر آدمی کے لیے کسی سے ڈھکی چھپی نہ تھیں۔ مجھے ماں کے ہر اقدام پر دکھ ہوتا تھا اور ایک بیزاری ونفرت سی مجھے ان کے وجود سے محسوس ہوتی تھی جبکہ اپنے باپ کی میں بہت عزت کرتی تھی۔ تھوڑا بہت جو بھی وہ کماتے تھے حلال تھا۔ ماں نے تو اپنی نفسانی خواہش کے پیچھے اپنی زندگی حرام کروائی تھی۔ ماں کی غلط روش کو دیکھتے ہوئے میں بھی اپنے من کی مرضی پورا کرتی تھی۔

سرفراز سے میری دوستی SMS کے ذریعے ہوئی۔ وہ ہمارے گھر کے سامنے والے گھر میں اپنی فیملی کے ساتھ رہتا تھا۔ آوارہ لڑکوں کے ساتھ پھرنا، سگریٹیں پینا، لڑکیوں سے دوستی کرنا اس کے شوق میں شامل تھے۔ میں بھی اس کے ساتھ سنجیدہ نہ تھی صرف ٹائم پاس کرنے اور اماں کو جلانے کے لیے میں نے سرفراز سے دوستی کر رکھی تھی کیونکہ اماں اسے اشارے کرتے اور دروازے کے باہر ٹہلتے دیکھ کر اسے اور مجھے کئی بار ڈانٹ چکی تھیں مگر میں ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا دیتی تھی۔ اماں سے لاکھ اختلاف سہی مگر جب بھی سرفراز انہیں برا کہتا تو مجھے سخت چڑ آتی تھی۔ اس دن بھی وہ ان کے ڈانٹنے پر اعتراض کرنے لگا تو مجھے برا لگا۔

''میرے سامنے میری باتیں کیا کرو اماں نامہ نہیں کھولا کرو، تمہیں پتا ہے ڈانٹنا ان کی عادت میں شامل ہے۔ تم بھی دروازے کے باہر کم ٹہلا کرو اور اشارے بازی کم کیا کرو تاکہ وہ تم پر اعتراض نہ کریں۔ میں نے سیدھی طرح فون آنے پر اسے سنائیں تو وہ چڑ گیا۔''

''پھر وہ منظور علی کیوں بیٹھا رہتا ہے تمہارے گھر ہر وقت..... تمہارے ابا کے ہوتے بھی اور نہ ہوتے بھی۔ وہ گھر کا مالک بنا ہوا ہے۔''

''چاچا شروع سے ہی مدد کرتے آئے ہیں، ابا سے ان کی یاری دوستی ہے اس لیے۔'' میں نے کمزور جواز پیش کیا۔

''بس رہنے دو، سب محلہ جانتا ہے تم لوگ کیسے ہو۔'' وہ تلخ ہوا۔

''اس بات سے کیا مراد ہے تمہاری اور اگر ہم لوگ اتنے ہی برے ہیں تو آئندہ مجھے کال مت کرنا۔'' میں نے غصے میں فون کاٹا اور چھت پر ٹہلنے لگی۔ یہ موبائل بھی سرفراز نے بات چیت کے لیے لے کر دیا تھا۔ جب اماں بازار جاتی تھیں تب میں چھت پر جا کر آرام سے اس سے بات کر لیتی تھی۔ SMS پر بھی رابطہ رہتا تھا۔ میرے کال کاٹنے پر اس کی مسلسل کال آ رہی تھی۔ میں تھوڑی دیر اس کی کال آتے دیکھتی رہی پھر بیزار ہو کر موبائل آف کر کے بیگ میں ڈالا اور چھت سے نیچے آ گئی۔ مجھے اب اس سے بات نہیں کرنی تھی تاکہ اسے میری ناراضگی کا احساس ہو اور آئندہ کے لیے وہ احتیاط کرے۔ اسے میری ناراضگی کا احساس تھا تبھی تیسرے دن وہ اسکول کے باہر بائیک لے کر کھڑا ہوا تھا چھٹی کے بعد جب میں لڑکیوں کے ساتھ اسکول کے گیٹ سے باہر آئی تو اسے کھڑا دیکھ کر میرا منہ پھول گیا۔ میں اسے نظر انداز کرتی آگے بڑھ

گئی۔ ویسے بھی میٹرک کے پیپرز ہونے والے تھے اور اماں نے صاف لفظوں میں میرے کان میں یہ بات ڈال دی تھی کہ وہ امتحان کے بعد میری سادگی کے ساتھ شادی کا ارادہ رکھتی ہیں۔ منظور علی کے بھتیجے نوری کے متعلق مجھے مارنا چاہتی تھی حالانکہ وہ بڑی عمر کا پینتیس سال کا مرد پکی شکل وصورت کا تھا اور مجھے قطعی پسند نہ تھا جب بھی منظور علی کے ساتھ وہ کھانے پر آجاتے تو ان دونوں کو دیکھ کر میرا موڈ خراب ہوجاتا تھا۔ وہ بس ڈرائیور تھا اور عام سی شکل وصورت کا تھا مگر میرے سلسلے میں وہ بہت سنجیدہ تھا۔ وہ عزت کے ساتھ مجھے اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتا تھا۔ جبکہ سرفراز میری ہی طرح ٹائم پاس کررہا تھا۔ وہ میرے گھر والوں کی عزت نہیں کرتا تھا تو مجھے کس طرح اپنی زندگی میں شامل کرتا اسی لیے میں نے سوچ لیا تھا کہ اس کا موبائل اسے دے دوں گی اور اس دوستی سے جان چھڑالوں گی۔

گلی میں سناٹا دیکھ کر اس نے میرے آگے بائیک روکی تو میں نے بیگ کھول کر اس کا موبائل نکالا اور اس کے حوالے کیا۔

''یہ کیا..... تم موبائل دے رہی ہو۔'' وہ بوکھلایا۔

''صاف بات ہے ہماری دوستی اب آگے نہیں چل سکتی بہتر ہے تم اپنے راستے میں اپنے راستے۔'' میں نے ہاتھ جھاڑ کر صاف گوئی سے کہا اور چل دی۔ وہ بائیک دوڑاتا ہوا میری طرف آیا اسے میرے سخت ری ایکشن پر شاک لگا تھا۔

''پلیز رائمہ ایم سوری بات تو سنو..... آئندہ میرے باپ کی توبہ جو کوئی غلط بات کروں، یہ موبائل واپس رکھ لو ہماری دوستی کی خاطر.....''

وہ گڑگڑایا تو میں نے نظر بھر کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ مجھ سے چار پانچ سال بڑا تھا۔ شکل وصورت بھی اچھی تھی مگر وہ سیریس نہ تھا، بس اپنا وقت رنگین کرنا چاہتا تھا۔ میں رستے میں اس سے زیادہ بات نہیں کرسکتی تھی اس لیے موبائل لے کر خاموشی کے ساتھ گھر کی طرف چل دی۔ مگر میں نے اچھی طرح سوچ لیا تھا کہ اس سے آگے کیا بات کرنی ہے۔ شام میں موقع دیکھ کر میں نے فون نکالا اماں بازار گئی ہوئی تھیں، ابا گھر پر نہیں تھا اور دانش ودانیال کی اپنی سرگرمیاں تھیں۔ وہ بھی ابا کے نقش قدم پر چلتے ہوئے کبھی کام کرتے تھے کبھی یار دوستوں کے ہمراہ وقت برباد کرتے تھے۔ خیر میں نے موقع ملتے ہی فون آن کیا تو اس کی بیل آئی شاید وہ کافی دیر سے ٹرائی کررہا تھا۔

''کہاں تھیں، کب سے پاگلوں کی طرح تمہیں فون کررہا ہوں، تمہیں میرے دل کا احساس نہیں ہے۔'' وہ شروع ہوگیا۔

''تم کون سا میرے لیے سیریس ہو جو میں تمہارے دل کا احساس کرتی پھروں۔'' میں نے دوٹوک کہا۔

''مطلب۔'' وہ حیران ہوا۔

''کیا تم مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہو۔'' میں نے پوچھا۔

''آہ شادی..... لیکن ابھی تو مجھے بہت سے کام کرنے ہیں، اپنا بی۔ اے کمپلیٹ کرنا ہے کوئی جاب دیکھنی ہے اور شادی اتنی جلدی کہاں سے آگئی۔'' وہ ٹالتے ہوئے لہجے میں بولا۔

''تبھی..... میں دوپہر میں تمہارا موبائل تمہیں دے رہی تھی... کیونکہ میٹرک کے بعد اماں میری شادی کرنا چاہتی ہیں نوری کے ساتھ۔'' میں نے صاف گوئی سے بتایا۔

''تم اس بڈھے سے شادی کرکے خوش رہ لوگی۔'' وہ حیران ہوا۔ اسے نوری کے رشتے کا پتا تھا اور اس نے نوری کو بھی دیکھ رکھا تھا۔

''خوش رہوں یا نہیں یہ میرا مسئلہ ہے، کیا تم اپنے گھر والوں کو... میرے لیے بھیج سکتے ہو۔'' میں نے پوچھا۔

''یہ تو پاسیبل نہیں ہے، ابھی تو میں خود ان پر بوجھ بنا ہوا ہوں پھر مجھ سے بڑی تین کنواری بہنیں ہیں یار..... ہم یونہی دوستی بھی رکھ سکتے ہیں، اس میں کیا برائی ہے۔ صرف باتیں ہی تو کرتے ہیں۔'' اس نے لجاجت سے مجھے منایا۔ بے شک وہ اور میں ٹائم پاس کررہے تھے مگر کبھی کبھار میں اپنے دل میں جھانک کر دیکھتی تھی تو مجھے اپنی زندگی کے لیے سرفراز جیسے انسان کی ہی ضرورت تھی جس کی دلنشین باتوں اور خوبصورت ساتھ سے وقت کو حسین کیا جاسکے۔ اس کی باتیں، اس کی آواز ایسی سحر انگیز تھی کہ وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلتا تھا۔ ابھی بھی اس کے لہجے کی لجاجت سے زیادہ میں اپنے کمزور احساسات کے آگے ہاری تھی۔ دیکھا جائے تو گناہ کی لذت بہت بری ہوا کرتی ہے۔ میں نے سوچا شادی تو میٹرک کے بعد رکھی جائے گی کیوں اپنا وقت خراب کروں کچھ دیر کی یاری دوستی ہی سہی ٹائم تو اچھا کٹتا ہے۔ خیر وقت گزرتا گیا اور میٹرک بھی ہوگیا۔

میں ان جانے میں سرفراز کے ساتھ کے سپنے دیکھنے لگی۔ اس کا اظہار بھی میں نے سرفراز کے آگے کیا تو وہ ہنس دیا۔ ''دیکھو ہم اچھے دوست ہیں یہیں تک ٹھیک ہے کیونکہ

میرے گھر والے تمہیں کبھی بھی بہو نہیں بنائیں گے کیونکہ.....''
وہ رکا تو میں اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ جس پر طنزیہ مسکراہٹ تھی
''وہ انہیں پسند نہیں کرتے اور تم اچھی طرح جانتی ہو وہ انہیں کیوں پسند نہیں کرتے۔'' وہ برملا میرے منہ پر ماں کو برا کہہ رہا تھا۔

میں اس کے اصرار پر دوست کے گھر جانے کا بہانہ کر کے پارک میں اس سے ملنے آئی تھی اور اب اس کی باتیں میرا دل دکھا رہی تھیں۔ میں نے اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ نکالا اور کھڑی ہوگئی۔ ''مجھے گھر کے رستے پر چھوڑ دو۔'' میرے سنجیدہ تاثرات پر وہ بوکھلا گیا۔

''دیکھو تم نے پوچھا تو میں نے بتا دیا، پلیز ناراض مت ہوا کرو سچائی کو فیس کرنا سیکھو۔'' وہ نرمی سے میرے شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا تو میں اکھڑ گئی۔

''تم چل رہے ہو یا میں جاؤں۔'' یہ کہہ کر میں نے اس کے ہاتھ جھٹکے اور تیز تیز قدم اٹھاتی پارک کے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ میرے پیچھے وہ بڑبڑ کرتا دوڑتا آیا۔ اس نے مجھے آئس کریم، بوتل، برگر کا لالچ دیا مگر اس دن مجھے احساس ہوگیا تھا کہ اس کے نزدیک میری کوئی اہمیت نہیں ہے اسی لیے جب اماں نے نوری کے رشتے کے متعلق بات کی تو میں خاموش رہی اور یوں خاموشی و سادگی کے ساتھ میری شادی اس کے ساتھ انجام پذیر ہوئی اور سرفراز کا موبائل میں نے چھوٹے بھائی کے ہاتھ اسے واپس بھجوایا۔ وہ مجھ سے بات کرنا چاہتا تھا مگر اب میں اس سے کوئی رشتہ نہیں رکھنا چاہتی تھی۔ نہ دوستی کا اور نہ ہی ٹائم پاسنگ کا۔ ویسے بھی میری شادی ہو چکی تھی اور مجھے کچھ ہفتے بعد نوری کے ہمراہ لاہور روانہ ہو جانا تھا۔

وہاں اس کا آبائی گھر تھا جہاں اس کے دو بڑے بھائی اور ان کی بیویاں، بچے رہتے تھے۔ شادی چونکہ ہمارے حالات کی وجہ سے سادگی سے ہوئی تھی اسی لیے لاہور جا کر وہ اپنے گھر اور عزیزوں میں اپنے دل کے ارمان پورے کرنا چاہتا تھا۔ ابھی تو ہم منظور چاچا کے گھر عارضی طور پر رہ رہے تھے۔ نوری جیسا بھی ہو وہ مجھ سے سچا عشق کرتا تھا اور برملا کہتا تھا، اگر میں اسے نہ ملتی تو وہ کبھی شادی نہ کرتا۔ اس کی محبت اس کے نرم گرم الفاظ میرے دل کی تسلی نہیں کر پاتے تھے۔ ایک خالی پن سا تھا جو میں سرفراز کے بعد اپنے اندر محسوس کرتی تھی۔ اماں کے گھر آ کے میری آنکھیں سرفراز کو ڈھونڈا کرتی تھیں جو اکثر اپنی چھت پر کھڑا نظر آتا تھا اشارے کرتا ہوا۔ ہاتھ ہلاتا ہوا بھی ایک دن جب اماں سودا لینے گئی تو پیچھے سے سرفراز دروازہ کھول کر اندر آ گیا اس نے اماں کو بازار کی طرف جاتے اور دانیال، دانش کو گھر سے غائب دیکھ کر اس نے یہ ہمت کی تھی۔

''کیوں آئے ہو۔'' اسے دیکھ کر میں حیران ہوئی۔

''شادی کے بعد تم بہت خوبصورت ہوگئی ہو دور سے دیکھ کر دل نہیں بھرتا اسی لیے قریب سے تمہارا احساس کرنے آیا ہوں۔'' اس کی آمد حیران کن تھی پھر اس کے الفاظ دونوں نے مجھے گھبراہٹ میں مبتلا کر ڈالا۔

''تم جاؤ اماں آ جائیں گی۔'' میں نے اسے ڈرانا چاہا۔

''تمہاری اماں اتنی جلدی نہیں آتیں دوسرے مجھے تم سے بہت ساری باتیں کرنی ہیں مجھے کال کر لینا۔'' وہ پیار سے میرے گال چھوتے ہوئے بولا میں نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''میں کال نہیں کر سکتی اب میں شادی شدہ ہوں۔''

''تمہیں کھو کر ہی تو احساس ہوا ہے تم میرے لیے کیا ہو..... کیا تمہیں اتنے دن میری یاد نے تنگ نہیں کیا۔'' وہ مجھے سحر زدہ باتوں سے گھیر رہا تھا اور اس کی محبت جس نے مجھے اتنے دنوں سے اداسی میں مبتلا کر رکھا تھا مجھے بے چین کرنے لگی اور میں رو دی۔ واقعی شادی کے بعد مجھے احساس ہوا تھا وہ میرے لیے کتنا ضروری تھا کیونکہ میں نوری کے ساتھ خوش نہیں تھی۔ جب، جب اسے دیکھتی تھی ملال کا احساس میرا دل تڑپا دیتا تھا۔ مجھے روتے دیکھ کر وہ اور شیر ہوگیا، اسے بھی میرے درد کا احساس ہوگیا تھا۔ اس وقت وہ میرے کہنے سے وہاں سے چلا گیا پھر دوسرے دن میں اپنی دوست کا بہانہ کر کے اس سے ملنے پہنچ گئی۔ اماں میری طرف سے مطمئن تھیں کیونکہ میری شادی ہو چکی تھی اور مجھے لاہور چلے جانا تھا اس لیے بھی وہ اب مجھے شک کی نظر سے نہیں دیکھتی تھیں میں اماں کے اعتماد کے بہانے اسی دن سرفراز سے پارک میں ملی اور پھر بہت سارا وقت ہم نے ساتھ گزارا، یہ سوچے بغیر کہ یہ گناہ ہے۔ نوری یا اس کا چاچا ہمیں یوں اکٹھے دیکھ سکتا تھا۔ کوئی بھی ایشو کھڑا ہو سکتا تھا سرفراز نے اس دن مجھے کئی چیزیں اپنے پاس سے دلوائیں جس میں مہنگا پرفیوم اور سوٹ شامل تھے۔ اماں نے ان چیزوں کے متعلق پوچھا تو میں نے اپنی دوست کا نام لے لیا کہ وہ لاہور جانے سے پہلے مجھے گفٹ دینا چاہتی تھی، اسی کی طرف سے ہے۔ وہ چپ ہوگئیں۔ رات میں نوری مجھ سے ملنے آیا تو مجھے اس کی آمد بری لگی وہ مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا مگر میں طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے اماں کے گھر ٹھہر گئی کیونکہ اگر میں نوری کے ساتھ چلی جاتی تو سرفراز سے کیسے مل پاتی یا پھر اس سے میری بات نہیں ہو سکتی تھی۔

میری طبیعت کا سن کر نوری بولا۔ ''تیرے بغیر میں اداس ہو جاتا ہوں مگر تیری خوشی کے لیے چند دن اور سہی۔'' وہ کھانا کھا کر منظور چاچا کے ساتھ اپنے گھر روانہ ہوا تو مجھے اطمینان ہوا۔ دوسرے دن میں بازار کا کہہ کر پھر گھر سے روانہ ہوئی۔ وعدے کے مطابق سرفراز بس اسٹاپ پر کھڑا تھا۔ اس نے مجھے پک کر لیا۔

گناہ کے کھیل جتنے بھی رازداری سے ہو مگر چھپتے نہیں اس لیے اسی شام میری واپسی پر اماں نے مجھے بٹھایا اور دوٹوک پوچھا۔ ''اگر سرفراز اب بھی تجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے تو میں تجھے نوری سے طلاق دلوا دیتی ہوں تو اپنی مرضی کر لینا۔''

''اماں..... ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔'' میں اماں کے سوال پر گھبرا گئی۔ دانش اور دانیال دونوں نے مجھے اور سرفراز کو ایک ساتھ دیکھا تھا اور انہوں نے اس کی خبر اماں کو کر دی تھی۔ اماں کا لہجہ تھکا..... تھکا اداس تھا۔ وہ بہت سنجیدہ اور چپ لگ رہی تھیں۔ میرے اس طرح کہنے پر انہوں نے مجھے تھپڑ مارا اور رو دیں۔ ''میں نے تیرے لیے اچھا انتخاب کیا تھا مگر تو ہے تو اسی کا خون نا، ناشکری تو کس طرح مطمئن ہو سکتی ہے۔ جس طرح تیرا باپ کبھی اپنے نصیب سے خوش نہ ہو سکا نہ مطمئن اور وقت کی دوڑ نے اسے بے ضمیر اور بے غیرت بنا ڈالا، تو بھی اسی راہ کی طرف چلے گی چاہے میں تجھے کتنا ہی گناہ سے بچانا چاہوں، تو ہے تو مراد حسین کی اولاد نا۔'' وہ روتے ہوئے مجھے کوس رہی تھیں وہ خود بری تھیں اور ابا کو برا بھلا کہہ رہی تھیں۔

''اماں اس طرح ابا کو مت برا کہو مجھے سرفراز سے محبت ہے اور میں اپنی مرضی و خوشی سے اس سے ملتی ہوں۔'' میں نے صاف صاف کہا۔

''میں نے نوری سے شادی کرنے سے پہلے تیری مرضی پوچھی تھی تب تجھے یہ محبت یاد نہیں آئی۔'' وہ آنسو پونچھتے ہوئے بولیں۔

''تب مجھے اس کا اتنا احساس نہیں تھا۔'' میں برملا بولی۔

''اور اب تو شادی کے بعد گناہ کے کھیل جاری رکھنا چاہتی ہے تو ایسا نہیں ہوگا رائمہ..... اچھی طرح سوچ لے تو نے کیسی زندگی گزارنی ہے، کیا تو اپنی ماں والی زندگی بسر کرنا چاہتی ہے جو گناہوں سے تھڑی ہوئی ہے۔'' اماں کے تھکے تھکے لفظ احساس جرم لیتے ہوئے تھے۔ میں چپ ہو کر ان کی صورت دیکھنے لگی۔ ہزار بار سب انہیں برا کہتے تھے مگر کبھی

## فاس

مراکش کا ایک شہر اور سلطان کا مقام سکونت۔ آبادی دو لاکھ سے زائد۔ محل وقوع انتہائی اہم اور شاندار ہے۔ فاس درحقیقت دو شہروں پر مشتمل ہے۔ فاس الجدید (نیا شہر) اور فاس البالی (پرانا شہر) فاس الجدید سرکاری دفاتر کا شہر ہے۔ صرف دارالمخزن ہی نصف سے زیادہ شہر میں پھیلا ہوا ہے۔ دارالمخزن ان عمارتوں اور احاطوں کا مجموعہ ہے جہاں حکومت مراکش کے مرکزی دفاتر واقع ہیں۔ وزرائے دفاتر اور کوشک سلطانی بھی یہیں ہیں۔ ان کے علاوہ وہ محلات ہیں، جہاں سلطان اپنے کنبے کے ساتھ سکونت رکھتا ہے اور جو اپنی سبز رنگ کے ٹائلوں کی چھتوں سے پہچانے جاتے ہیں۔ یہاں غیر ملکی سفیروں سے ملاقات کے لیے ایک مخصوص کوشک، شاہی چڑیا گھر، اسلحہ خانہ اور باغات ہیں۔ متعدد مساجد ہیں، جن میں سب سے زیادہ قابل ذکر مسجد جامع، جامع احمر اور جامع اخضر ہیں۔ یہ مساجد اپنے میناروں کے رنگ کی وجہ سے مشہور ہیں۔ فاس الجدید، دراصل فاس البالی کا ایک ذیلی قصبہ ہے۔ فاس البالی کا نقشہ نئے شہر کی نسبت بہت متنوع اور دلکش منظر پیش کرتا ہے۔ یہ شہر دریائے فاس کی تنگ وادی کے ساتھ ساتھ پھیلا ہوا ہے۔ اس کے مکانات، مساجد اور باغات ان پہاڑیوں کی ڈھلواں چٹانوں پر واقع ہیں جو وادی کی گزرگاہ کو اس فصیل تک گھیرے ہوئے ہیں جو چٹانوں کے پشتوں پر بنالی گئی ہے۔ فاس صرف اپنے محل وقوع کی خوبصورتی کی وجہ ہی سے نہیں، بلکہ اپنی مذہبی یادگاروں کی اہمیت کی بدولت بھی سارے مغرب اقصیٰ میں ممتاز و معروف ہے۔ یہاں مختلف شاہی خاندان یکے بعد دیگرے سریر آرائے سلطنت ہوئے۔ اور انہوں نے ہمیشہ اس قسم کی یادگاروں سے شہر کو مالا مال کرنے کی طرف اپنی توجہ مبذول کی۔ چنانچہ شہر میں تمام سلسلوں کی چھوٹی بڑی ہر طرح کی آٹھ سو پچاس مذہبی عمارتیں، مساجد، مدرسے، عبادت خانے، زاویے یا معبد ہیں جو کسی نہ کسی بزرگ کے مقبرے کے ساتھ تعمیر کیے گئے تھے۔

مرسلہ: سلطان محمد، کویت

انہوں نے اپنے منہ سے اپنے گناہوں کا اعتراف نہیں کیا تھا مگر آج وہ کئی کہانی سنا رہی تھیں۔ ''تیرا باپ غریب ہونے کے علاوہ بدکرام اور نکما بھی ہے۔ میری بدبختی یہ تھی کہ محبت کے آگے کچھ نہیں دیکھا نہ ذات، نہ برادری اور نہ ہی عادت و اطوار، بس شادی کرلی۔ شادی کے بعد سو مسئلے، بچے ان کی ذمے داریاں، میرے سر پر پڑیں تو محبت و پیار سب ہوا لگنے لگا۔ پیسا زندگی کی ضرورت ہے۔ بچے چھوٹے تھے میں نے طے کیا کہ مراد حسین گھر بیٹھے اور چھوٹے بچوں کا خیال رکھے اور میں کما کر لاؤں گی مگر عورت کی کمائی میں برکت نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے، بس گھروں کا کام سارے دن کی محنت مشقت پھر گھر کی فکر شوہر کو دیکھنا بچوں کو سنبھالنا کھانا پکانا اس طرح کے معاملات نے مجھے تھکا ڈالا۔ اسی دوران تیرے باپ کو چرس کی عادت لگ چکی تھی۔ طرح طرح کے آوارہ دوستوں کی سنگت نے اسے برے راستے دکھا دیے تھے۔ وہ تیزی سے ان راستوں کی طرف دوڑتا رہا وہ نئے، نئے لوگوں کو گھر لانے لگا۔ زور زبردستی مار پیٹ کرکے وہ آئے دن میرا سودا کرتا۔ گھر بیٹھے یہ دھندا برا نہ تھا۔ مہینے بھر میں محنت مزدوری کرکے اتنے روپے نہیں ملتے تھے جتنے بیوی کی کمائی سے اسے حاصل ہو رہے تھے۔ کئی بار میں نے خودکشی کی کوشش کی۔ اس ظالم آدمی نے مجھے مرنے بھی نہیں دیا پھر بچوں کی معصوم صورتوں نے مجھے ایسی ہی زندگی گزارنے پر مجبور کر ڈالا۔ واپس میں جا نہیں سکتی تھی اپنی مرضی کے سودے میں خسارہ عورت کے حصے میں ہی آتا ہے۔ میری فیملی کے لوگ مجھ سے نہیں ملتے تھے۔ ماں، باپ ان دس سالوں میں مر چکے تھے بھائی نفرت کرتے تھے۔ میں ایسی ہی بدتر زندگی گزارتی رہی اسی دوران ہماری زندگی میں منظور علی آ گیا۔ وہ بھی انہی لوگوں میں سے ایک تھا جو تیرے باپ سے ملتے جلتے تھے۔ اس نے میری بے چارگی اور کسمپرسی کو دیکھا۔ میری حالت پر رحم کھایا اور یونہی تیرے باپ کا بھرتا بھرنے لگا۔ تیرا باپ لالچی اور خود غرض آدمی تھا۔ اس نے منظور علی سے بھی میرا سودا کرنا چاہا تو اس نے صاف لفظوں میں اسے سمجھا دیا کہ میں نور بانو کو بہن سمجھتا ہوں۔ تجھے مہینے میں جتنے روپوں کی ضرورت ہوگی اسے میں پورا کروں گا مگر تو اب کبھی کسی اور کو لے کر گھر کو کوٹھا نہ بنانا۔ تیری ضرورتیں پوری کرنا میری ذمے داری ہے اس شخص نے اپنی بات پر عمل کرکے دکھایا۔ دس سال جس گندگی میں، میں نے گزارے وہ قیامت کے تھے مگر میں مجبور تھی اور تیرا باپ مجرم جسے تو عزت والا سمجھتی ہے۔ وہ کہیں سے بھی عزت کے لائق نہ تھا۔ اگر منظور علی ہماری زندگی میں نہ آتا تو میں آج بھی اسی دلدل میں پھنسی ہوتی اور شاید تمہارا باپ تم لوگوں کو بھی اسی دھندے پر لگا چکا ہوتا کیونکہ جو مرد بے غیرتی اور بدکرامی کی چادر اوڑھ لیتے ہیں، اپنا عیش و آرام دیکھتے ہیں وہ پھر کبھی کام دھندا نہیں کرتے، وہ بیٹھ کر سودا کرتے ہیں۔ چاہے بہن، بیٹیوں کا کریں یا پھر بیویوں کا۔ تیرے دونوں بھائی بھی کم و بیش اپنے باپ پر پڑے ہیں اسی لیے میں نے بڑھتی ہوئی بچیوں کو دیکھتے ہوئے انہیں اپنے، اپنے گھر کا کردیا۔ یہ نہیں دیکھا کہ بڑی عمر والا ہے یا جوڑ نہیں ملتا صرف اس کی محنت اور حلال روزی دیکھی۔ کما کر کھلانے والا ہو بوجھ نہ بنے اسی لیے تجھے بھی نور حبیب کے ساتھ تیرے گھر کا کیا تھا تاکہ تو اپنی ماں والی زندگی نہ گزارے مگر تو تو کم بخت اپنی مرضی سے اس جہنم میں گر رہی ہے جہاں واپسی کے راستے نہیں ملتے۔ ہر عورت کو بچانے کے لیے منظور علی جیسا شخص نہیں ملتا جو کسی بھی غرض اور مفاد کے بغیر رشتوں کو نبھانے والا ہو۔'' اماں کے آنسو میرے دل پر گر رہے تھے۔ احساس جرم و شرمندگی نے زبان گنگ کر ڈالی تھی میں نے دکھ و غم سے چور ماں کے پاؤں تھام لیے۔ وہ عظیم عورت تھی۔ میں اور لوگ اسے کتنا غلط سمجھتے تھے اور منظور چاچا کو بھی، گھر کے حالات اور ناکارہ مرد کی ہمراہی نے اسے گناہوں کی زندگی گزارنے پر مجبور کر ڈالا تھا مگر اندر سے وہ کتنی شفاف و پاکیزہ تھی۔ یہ مرد ہی ہوتا ہے جو اپنی مرضی سے عورت کا سودا کرتا ہے کبھی محبت کے نام پر کبھی ضرورت کے لیے اسے کھلونا بناتا ہے اور میری خوش قسمتی تھی کہ مجھے نوری... جیسا مرد ملا... جو محنت مزدوری کرتا تھا، حلال کماتا تھا عورت کو طوائف بنا کر گھر کو کوٹھا نہیں بناتا تھا۔

میں نے ماں کی نصیحتوں کو پلو سے باندھا اور اگلے ہی دن خاموشی کے ساتھ نوری کے گھر چلی گئی۔ نوری مجھے دیکھ کر خوش ہوگیا اور پھر میرے اصرار پر اگلے ہی ہفتے ہم لاہور چلے گئے۔ میں نے اپنا دل مار لیا اور آس میں بیٹھے سرفراز کی محبت کے شیطان کو بھی اپنے ہاتھوں دفن کردیا اماں کے فون آتے ہیں۔ وہ کراچی بلاتی ہے مگر میں ٹال جاتی ہوں۔ میں کس طرح ان کا سامنا کرسکتی ہوں۔ ایک بار ان کا اعتبار توڑ چکی ہوں دوبارہ ایسی ڈگر پر چلنا نہیں چاہتی۔ اپنے دل کی آوارگی سے ڈرتی ہوں آخر بہوں تو اسی ناشکرے اور خود غرض مراد حسین کی اولاد نا، سوچتی ہوں اگر اماں میری اصلاح نہ کرتیں تو شاید میں بھی وقت کے ہاتھوں ٹھوکر کھا کر بدنصیبی جھیل رہی ہوتی۔

++

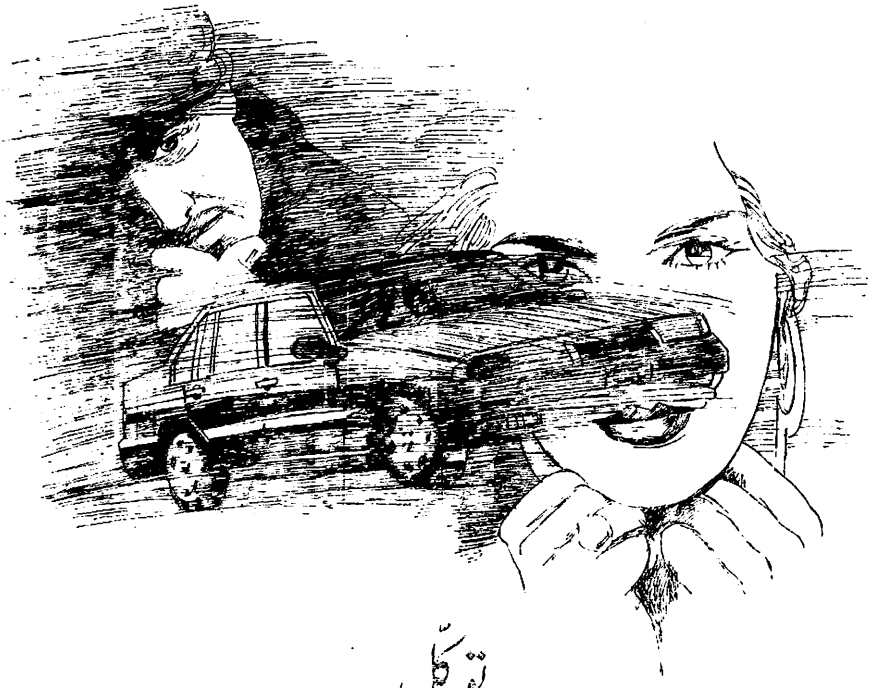

# توکّل

محترم ایڈیٹر سرگزشت
السلام علیکم!
سرگزشت کی سچ بیانیاں میں شوق سے پڑھتی ہوں۔ زندگی میں پہلی بار کہانی لکھی ہے، اپنی کہانی کوشش کی ہے کہ کوئی واقعہ چھوٹ نہ جائے ہر اہم واقعہ کو لکھ دیا ہے۔ اُمید ہے قارئین کو بھی پسند آئے گی

مہہ جبین خالد
(کراچی)

آنکھوں میں بہت پُرکشش تھی، میرے لیے بڑے بڑے گھروں سے رشتے آرہے تھے تو اس میں میرا کیا قصور تھا؟ میں نے خود کو ان لڑکیوں کی طرح حسین نہیں بنایا جو خود پر سینکڑوں روپے خرچ کرتی ہیں۔ یہ حسن خداداد تھا۔ جو بھی میری طرف دیکھتا تو بس دیکھتا ہی رہ جاتا تھا اس کی آنکھوں میں میلا پن نہیں بلکہ ستائش ہوتی تھی جیسے وہ اپنے دل میں میرے حسن و جمال کی دلکشی کو سراہ رہا ہو اور پھر اس کی آنکھوں کی زبان جیسے پوچھتی تھی کہ "تمہیں تو اللہ نے فرصت

سے بنایا ہے؟‘‘

لیکن میں اپنے حسن سے پریشان بھی تھی۔ اکثر سوچتی تھی کہ اگر مجھے بنانے والے نے مجھ سے کہا ہوتا کہ تمہیں میں بہت حسین بنا رہا ہوں، تمہارا حسن بے مثل ہوگا، کیا تمہیں اتنا حسین بننا پسند ہوگا تو میں انکار کر دیتی اور کہتی کہ نہیں، مجھے اتنا حسین نہ بنائیں اس لیے کہ مجھے جو نگاہیں دیکھتی اور گھورتی ہیں ان میں میل بھی ہوتا ہے، جو میرے بدن میں نیزوں کی طرح چبھتا ہے۔ میں ان کی چبھن برداشت نہیں کر سکتی۔ ایسی نگاہیں بہت کم ہوتی ہیں جو تیری صناعی کو سراہتی ہیں۔

میرا حسن ایک طرح سے میری ذات کے لیے اللہ کا بیش بہا تحفہ بھی تھا۔ میں اس پر جتنا بھی شکر ادا کروں کم تھا مگر میں کبھی بھی اس حسن پر نازاں نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی کبھی غرور کیا تھا۔ وہ لڑکیاں، عورتیں جو معمولی سی حسین ہوتی تھیں وہ اپنے آپ کو دنیا کی حسین ترین سمجھنے لگتی تھیں اور کسی سے سیدھے منہ بات نہیں کرتی تھیں لیکن مجھ میں پندار حسن قطعی نہیں تھا۔ میں ہر کسی سے ہنس کر بات کر لیتی تھی بلکہ اس سے دوستانہ انداز سے ملتی بھی تھی۔

میری سوتیلی ماں اور بہن نغمہ جل کر رہ جاتی تھیں۔ جبکہ نغمہ بھی خاصی حسین تھی۔ نوجوانی کے خمار نے اس کے حسن میں ایک عجیب سی دلکشی پیدا کر دی تھی، وہ جہاں بھی جاتی توجہ کا مرکز بن جاتی تھی، وہ بھڑکیلا اور چست لباس پہنتی تھی۔

مگر اس کو کیا کہیے کہ اس کا حسن اور جسمانی کشش میرے آگے ماند پڑ جاتی تھی جب کہ میں اس کے جیسا لباس پہنتی اور نہ ہی اپنے آپ کو سنوارتی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ میں سرو قد تھی جس نے میرے اندر بے پناہ کشش اور حسن پیدا کر دیا تھا۔ بقول میری سہیلیوں کے کہ میں سرو قد کی وجہ سے مردوں کے دلوں پر قیامت ڈھاتی ہوں۔

نغمہ درمیانہ قد کی تھی جس کا اسے بڑا دکھ اور احساس محرومی بھی تھی اس کے باوجود وہ پُرکشش لگتی تھی۔ وہ اپنا قد بڑھانے کے لیے ہر طرح کی ورزش کرتی اور خوبصورتی میں اضافہ کے لیے بیوٹی پارلر جاتی۔ نغمہ مجھ سے دو برس چھوٹی تھی۔

میں نے جب سے شباب کی حدود میں قدم رکھا تھا تب سے میری سوتیلی ماں غیر محسوس انداز سے مجھ سے دور ہونے لگی تھیں۔ اس کی وجہ صرف اور صرف یہ تھی کہ میرا حسن و جمال ان کی نظروں میں کھٹکتا تھا کیونکہ ہماری بلکہ ان کی ملنے والیاں بھی میری خوبصورتی بڑی فراخ دلی سے سراہتی تھیں جو جلتی پر تیل بن کے گرتا تھا پھر آہستہ آہستہ میری تعریفیں سن سن کر نغمہ بھی اپنی ماں کی طرح مجھ سے نفرت کرنے لگی بلکہ ذرا ذرا سی بات پر حکم بھی چلانے لگی تھی۔

میری سوتیلی ماں نے مجھے ایک طرح سے گھر کی نوکرانی بنا کر رکھ دیا تھا۔ صبح کالج جانے سے پہلے سب کے لیے ناشتا بنانا پڑتا تھا۔ کالج سے آنے کے بعد نہ صرف ڈھیر سارے جھوٹے برتن دھونے پڑتے بلکہ سارے گھر میں جھاڑو پونچا بھی کرنا پڑتا۔ اگر ٹھیک سے جھاڑو پونچا نہ ہوا تو باتیں سننا پڑتیں۔ رات کا کھانا بھی مجھے تیار کرنا پڑتا۔ اس کے علاوہ میں خود اپنے کپڑے سیتی اور کڑھائی کرتی تھی۔ میں نے کسی نہ کسی طرح وقت نکال کر سلائی، کٹائی اور کشیدہ کاری کا ڈپلوما لے لیا تھا جو آج میرے کام آ رہا تھا، جب کہ نغمہ کے کپڑے درزن سے سلتے تھے یا پھر طارق روڈ کی کسی بوتیک سے خریدے جاتے جو بے حد قیمتی ہوتے۔ میں نے کبھی ان کپڑوں کو حسد سے نہیں دیکھا۔ نہ ان کی تمنا کی اور نہ کوئی خواب دیکھا۔ میرے لیے جو بھی اچھے اور اعلیٰ گھرانوں کے رشتے آتے امی ان میں کیڑے نکال کر واپس کر دیتیں۔ ابو کو ان رشتوں کی ہوا بھی نہیں لگنے دیتیں کہ کہیں وہاں میرا رشتہ طے نہ ہو جائے۔ وہ یہ بھول گئی تھیں کہ رشتے ہمیشہ آسمانوں پر بنتے ہیں۔ ایک روز ہمارے گھر زینب بوا آئیں ان کی گزر اوقات رشتے لگانے پر تھی۔ وہ میرے لیے ایک بہت ہی اچھا رشتہ لے کر آئی تھیں۔ لڑکا کینیڈا میں رہتا تھا اور اس کا وہاں کوئی کاروبار تھا۔ اس نے وہاں جائیداد بھی بنائی ہوئی تھی۔ اسے ایک حسین ہم سفر کی ضرورت تھی۔ زینب بوا اس لڑکے کی تصویریں لائی تھیں۔ جب نغمہ ان کو بلانے گئی تو زینب خالہ نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کے مجھے لڑکے کی تصویریں دکھا دیں۔ لڑکا نہ صرف بہت خوبصورت بلکہ وجیہہ اور دراز قد بھی تھا۔ اسے ناپسند کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔

دوسرے دن لڑکا اور اس کے گھر والے زینب بوا کے ساتھ مجھے دیکھنے کے لیے آئے۔ امی نے اس روز صبح سے ہی مجھے اپنی بہن کے ہاں بھیج دیا اور لڑکے والوں کو نغمہ دکھا دی، جبکہ میں خواہش مند تھی اور رات بھر اسی کا خواب دیکھتی رہی تھی۔ میرے دل کو ایک گہرے صدمے کا احساس ہوا، لڑکے والوں نے نغمہ کو پسند کر لیا تھا۔ جب میں سونے کے لیے بستر پر دراز ہوئی تو میں نے یہ سوچا کہ اس جگہ میرا رشتہ نہ ہونے میں اللہ کی کوئی مصلحت ہوگی تو میرے دل کو ایک عجیب سا

سکون اور طمانیت ہوئی اور پھر یاد آیا کہ یہ جوڑے تو آسمان پر بنائے جاتے ہیں چوں کہ یہ رشتہ نغمہ کا تھا اس لیے طے ہوگیا، یہ اوپر والے کی رضا تھی۔

نغمہ کا رشتہ طے ہونے کے بعد اس کے پیر زمین پر نہ ٹکتے تھے۔ اس میں ایک عجیب سی طرح رعونت اور تکبر آگیا تھا۔ تیور بھی اک دم بدل گئے تھے۔ پڑوس اور محلے کی لڑکیوں کو بھی خاطر میں نہیں لاتی تھی اور مجھ سے بھی سیدھے منہ بات نہیں کرتی تھی اس لیے کہ وہ ایک بہت بڑے گھر میں بیاہ کر جارہی تھی۔ لڑکا کینیڈا سے آکر ڈیفنس سوسائٹی کے ایک بنگلے میں ٹھہرا ہوا تھا۔ ان کے پاس کسی چیز کی کوئی کمی نہ تھی۔ انہوں نے جو مہندی کی تقریب کی تھی اس نے ہمارے محلے والوں اور رشتہ داروں کو نہ صرف مرعوب بلکہ بھونچکا کردیا تھا۔ انہیں نغمہ کی خوش نصیبی پر بڑا رشک آیا تھا۔

آخر اس کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہوگئی۔ میرا جو جہیز تھا اور شادی پر خرچ کرنے کے لیے جو رقم اٹھا کر رکھی گئی تھی وہ بھی نغمہ کی شادی پر بے دردی سے لٹادی گئی تھی جبکہ نغمہ کے لیے الگ جہیز اور رقم بھی مختص کی ہوئی تھی۔ شادی کے دوسرے دن ایک فائیو اسٹارز ہوٹل میں ولیمہ تھا۔ ولیمے کے دوسرے دن اس کا شوہر جلال اسے مری اور سوات ہنی مون منانے کے لیے لے گیا۔ وہ دونوں ایک ماہ بعد واپس آئے۔ سیر و سیاحت اور ہنی مون نے نغمہ کے حسن و شباب کو خوب نکھار دیا تھا اور وہ بہت خوش تھی۔

ایک ہفتہ بعد جلال اور اس کے گھر والے کینیڈا چلے گئے لیکن نغمہ کو یہیں چھوڑ گئے اس لیے کہ وہ قانونی کارروائی کے بعد ہی وہاں جاسکتی تھی۔ شادی ہنی مون اور سیر و سیاحت کے بعد اس کا دماغ اور خراب ہوگیا تھا۔ اس میں اس قدر تکبر آگیا تھا کہ وہ مجھے کچھ سمجھتی ہی نہیں تھی۔ میں اس کے نزدیک اس کے پیر کی جوتی کے برابر بھی، وہ توامی اور ابو کو بھی گھاس نہ ڈالتی تھی۔ ہر وقت تکبرانہ انداز سے کہتی تھی کہ جلال کا کینیڈا میں بہت بڑا کاروبار ہے اس کے دو بڑے بڑے بنگلے اور تین اپارٹمنٹس ہیں۔ چار پانچ بہت شاندار قسم کی گاڑیاں بھی ہیں۔ ان میں ایک رولز رائس بھی ہیں۔ اس کا شمار وہاں کے کروڑ پتی لوگوں میں ہوتا ہے۔ وہاں جاؤں گی تو بھول کر بھی نہیں آؤں گی..... ہنہ..... پاکستان بھی کوئی ملک ہے؟

اس نے میری زندگی عذاب اور اذیت ناک بنادی تھی۔ وہ روز ایک نیا جوڑا پہنتی تھی۔ گھنٹوں آئینے کے سامنے کھڑی ہوکر سنگھار کرتی اور اپنے آپ کو ناقدانہ نظروں سے ہر زاویے سے دیکھتی تھی۔ اپنی جگہ سے اٹھ کر پانی نہیں پیتی تھی۔ جب دیکھو کولڈ ڈرنک، آئس کریم اور طرح طرح کے کھانوں کی فرمائش کرتی رہتی تھی یا پھر دن ڈوبنے کے بعد باربی کیو ریسٹورنٹ ہو آتی تھی۔ وہ کبھی میرے لیے ایک برگر تک نہیں لائی۔ اس کے شوہر نے جاتے وقت اسے ایک بڑی رقم جیب خرچ کے لیے دی تھی۔ اس نے وہ رقم ایک مہینے کے اندر اندر پانی کی طرح بہادی تھی۔

میں نے سنا ہوا تھا کہ امریکا، یورپ سے آکر جو شادی کرتے ہیں انہیں امیگریشن کے قواعد پورے کرنے پر دو تین برس لگ جاتے ہیں۔ میں یہ سن کر کانپ کانپ جاتی تھی کہ اگر اس دوران میری شادی نہ ہوئی تو نغمہ کے عذاب کے باعث کہیں میں خودکشی کرنے پر مجبور نہ ہوجاؤں لیکن اس کی نوبت نہیں آئی، جلال نے امیگریشن کی شرائط و قواعد پورے کیے اور اس کی روانگی کا پروانہ آگیا۔ مجھے بہت خوشی ہوئی تھی کہ سب ناک اذیت سے نجات مل گئی۔ میں نے کئی نفلیں شکرانے کی ادا کی تھیں۔ ابو نے بھی سکون کا سانس لیا تھا۔

نغمہ کے جانے کے بعد ابو کو میری شادی کی فکر لگ گئی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ کوئی اچھا سا رشتہ دیکھ کر میری شادی کردیں جبکہ امی دو تین برس تک میری شادی کرنے کے موڈ میں نہیں تھیں اس لیے کہ انہیں اس گھر میں نوکرانی کی اشد ضرورت تھی جو دن رات ان کی خدمت کرنے میں جٹی رہے۔ وہ صبح دس گیارہ بجے سے پہلے جاگتی نہیں تھیں کیونکہ وہ رات ایک دو بجے تک ٹی وی دیکھتی رہتی تھیں۔ انہیں ایسی بغیر تنخواہ کی نوکرانی کہاں مل سکتی تھی جو تنہا دو نوکرانیوں سے زیادہ کام کرتی ہو۔

اب تو وہ گھر کے کسی بھی کام کو ہاتھ نہیں لگاتی تھیں۔ بس بیٹھے بیٹھے فرعونیت سے حکم چلایا کرتیں جیسے میں کوئی ماسی ہوں گویا صحیح معنوں میں وہ روایتی سوتیلی ماں بن گئی تھیں۔ انہیں مطلق مجھ پر رحم نہیں آتا تھا میں ان کی کسی بات کا جواب نہیں دیتی تھی۔ اس بات کی ہر ممکن کوشش کرتی تھی کہ انہیں شکایت کا کوئی موقع نہ ملے میں ہر قسم کے حالات پر صابر و شاکر تھی۔ انہیں دل میں اور نماز میں بھی بد دعا دینے کی بجائے یہ دعا کرتی تھی کہ اللہ انہیں نیک توفیق اور ہدایت دے کہ وہ محبت کرنے والی سگی ماں جیسی بن جائیں۔

ایک روز شام کے وقت ہماری پڑوسن ذکیہ خالہ آئیں تو امی انہیں لے کر صحن میں بیٹھ گئیں۔ امی نے مجھے چائے بنانے کے لیے کہا تو میں باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی۔

امی نے ان سے پوچھا۔ ''کیسے آنا ہوا؟ دوپہر تو تم آ کر گئی تھیں، کیا مزید رقم کی ضرورت ہے؟''

''نہیں.....'' ذکیہ خالہ نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں اس وقت ایک کام سے آئی تھی جس کا مجھے باتوں میں کوئی خیال نہیں رہا۔ اب یاد آیا تو چلی آئی..... مہ جبین کے لیے ایک بہت اچھا رشتہ لائی ہوں۔ لڑکے کی عمر پچیس برس ہے اور تنخواہ پچاس ہزار ہے۔ اسے ایک سال میں دو بونس بھی ملتے ہیں۔ اس کا اپنا جو گھر ہے وہ چار سو گز کا ہے۔ گاڑی ہے، دیور اور نندوں کی کوئی جھنجھٹ نہیں ہے صرف ساس اور سسر ہیں جو ایک طرف بیٹھے اللہ اللہ کرتے رہتے ہیں۔''

امی یہ سنتے ہی جل کر کباب ہوگئیں اور وہ زہر خند لہجے میں بولیں۔ ''مہ جبین نے تو اپنی پسند کا انتخاب کرلیا ہے، وہ لو میرج کرنے والی ہے؟''

''آ ئیں؟''

''تمہیں کیا بتاؤں ذکیہ.....!'' وہ سرگوشی میں بولیں۔ ''وہ کالج جاتی تو ہے لیکن کالج کے نام پر گل چھرے اڑاتی ہے۔ ان دنوں وہ ایک ایسے لڑکے کے ساتھ دیکھی جارہی ہے جو سرکاری افسر کا بیٹا ہے۔'' امی نے ہرزہ سرائی کی تھی۔

''یہ کیا کہہ رہی ہیں آپا؟'' ذکیہ خالہ حیرت سے بولیں۔ ''مہ جبین ایسی لڑکی ہرگز نہیں ہوسکتی۔ وہ میری گودوں میں کھیلی ہے اور پھر نازیہ بھی اس کے ساتھ شادی ہونے تک کالج جاتی رہی ہے۔''

امی کی یہ باتیں میرے لیے ناقابل برداشت ہورہی تھیں۔ وہ میرے وجود میں جیسے زہریلے ڈنک چبھا رہی تھیں۔ میں اس وقت چائے بنا چکی تھی۔ میرے جی میں آیا کہ کھولتی ہوئی چائے لے جاکر ان کے سر پر انڈیل دوں۔

لیکن اس کی نوبت نہیں آئی۔ کیوں کہ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ابو آگئے۔ وہ دروازے میں کھڑے امی کی باتیں سن رہے تھے۔ امی کی پشت ان کی طرف تھی۔ امی کو پتا ہی نہیں چلا کہ ابو ان کی باتیں سن رہے ہیں۔ ابو کا چہرہ سرخ ہورہا تھا۔ وہ سیدھا اپنے کمرے میں اس لیے گھس گئے کہ ذکیہ خالہ کی موجودگی میں کچھ کہنا نہیں چاہتے تھے۔ جب ذکیہ خالہ چلی گئیں تو امی نے دروازہ بند کیا اور مڑیں تو ان کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ کیوں کہ ابو کھڑے انہیں غضب ناک نظروں سے گھور رہے تھے۔

''تم نے مہ جبین کے بارے میں ذکیہ بھابی سے کیا بکواس کی تھی؟'' ابو نے غصیلے لہجے میں پوچھا۔ ''تم میری بیٹی پر تہمت لگا رہی تھیں؟''

''میں نے ان سے ایسا کیا کہہ دیا جو آپ اس قدر چراغ پا ہورہے ہیں؟'' امی نے ڈھٹائی سے جواب دیا۔

''میری اس فرشتہ صفت اور صابر و شاکر بیٹی کو ذلیل و رسوا کررہی ہو، تمہیں شرم نہیں آتی۔''

''آپ کو کیا پتا کہ اس کے لچھن کیا ہیں؟'' امی نے تڑخ کر جواب دیا۔ ''آپ اس کے کالج جاکر معلوم کریں کہ اس کے کرتوت کیا ہیں تب پتا چلے گا۔''

ابو اپنے غصے پر قابو نہ رکھ سکے۔ انہوں نے امی کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ رسید کیا تو ایسا لگا کہ شب برات کا پٹاخہ چھوٹا ہے۔ ابو اپنی توہین برداشت نہ کرسکے۔ انہوں نے پیر سے جوتا نکال کر امی کو دھنک کے رکھ دیا۔ اگر میں جاکر امی کو نہ بچاتی اور ڈھال نہ بن جاتی تو شاید وہ امی کو جان سے ہی مار دیتے۔

گھر کی فضا میں تلخی گھل گئی۔ کوئی ایک مہینے تک امی اور ابو کے درمیان بات چیت بند رہی۔ میں نے امی اور ابو کو بہت سمجھا بجھا کر اور قسمیں دے کر صلح کرادی۔ امی نے میرے بارے میں جو کچھ بھی کہا تھا میں نے اسے صدق دل سے معاف کردیا۔

پھر ایک روز اچانک نغمہ کینیڈا سے واپس آگئی۔ ان چار مہینوں میں نغمہ کی حالت ایسے مسلے ہوئے گلاب کی سی ہوگئی تھی جس میں نہ خوشبو رہی تھی اور نہ شادابی۔ وہ برسوں کی مریضہ دکھائی دے رہی تھی۔ وہ نہ صرف امی، ابو بلکہ مجھ سے بھی لپٹ کے زار و قطار روتی رہی تھی۔ اس نے اپنی جو کہانی سنائی وہ بڑی دردناک اور روح فرسا تھی۔ اس کا شوہر اور سسرال والے سب فراڈ تھے۔ جب نغمہ کینیڈا پہنچی تو اسے ایک کمرے میں بند کردیا گیا تھا۔ اسے بتایا سمجھایا گیا تھا کہ اسے شادی کرکے کس لیے لایا گیا ہے۔ اگر وہ ان راستے پر چلے گی تو وہ ایک پُرتعیش زندگی گزارے گی۔ اگر اس نے انکار کیا تو اس کے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔ وہ کوئی احمق نہیں ہیں کہ اس کی ذات پر کئی لاکھ روپے خرچ کرچکے ہیں۔ اب وہ رقم اس سے وصول کریں گے، کرتے رہیں گے، اس وقت تک جب تک اس میں کشش ہے۔ جب اس نے ان کی بات ماننے سے انکار کیا تو اس پر تشدد کیا گیا اسے طرح طرح کی ایذائیں اور اذیتیں دی گئیں۔ بالآخر اس نے ہتھیار ڈال دیے۔

کوئی تین مہینے تک وہ ان درندوں کے ہاتھوں کٹھ پتلی

بنی رہی۔ اس کے بنگلے میں اس کی طرح چار لڑکیاں اور بھی تھیں جنہیں اسی طرح فریب سے شادی کر کے لایا گیا تھا۔ ان میں ایک لڑکی تھی جو بہت ہوشیار، ذہین اور سمجھدار تھی۔ اس نے ان درندوں کو بے وقوف بنایا کہ وہ ان کی مرضی پر چلے گی۔ اس طرح اس نے ان کا اعتماد حاصل کرلیا اور پھر ایک روز وہ باہر نکلنے میں کامیاب ہوگئی۔ راستے میں ایک پولیس گاڑی دیکھ کر وہ ان سے ملی پورا قصہ سنا کر ان سے مدد چاہی۔ پولیس نے چھاپہ مار کر ان لڑکیوں کو برآمد کرلیا۔ جلال اور اس کے گروہ کو بھی گرفتار کرلیا گیا پھر کینیڈا کی حکومت نے ان لڑکیوں کو واپس بھیج دیا۔

جب نغمہ اپنی درد بھری کہانی سنا رہی تھی تب مجھے وہ دن یاد آگیا جب لڑکے والے مجھے دیکھنے آرہے تھے۔ امی نے مجھے اپنی آپا کے ہاں بھیج دیا تھا اور لڑکے والوں کو نغمہ دکھادی تھی۔

گویا اللہ نے مجھے دردناک عذاب سے بچالیا تھا۔ امی نے اپنی بیٹی کے سنہرے مستقبل کے لیے میرے حق پر ڈاکا مارا تھا۔ قدرت نے اس بدنیتی کی ماں بیٹی کو دردناک سزا دے دی۔ امی کو آج اپنی اس کوتاہی پر بڑا غم اور پچھتاوا ہو رہا تھا۔ وہ اپنی بیٹی کی شادی نہ کرتیں تو آج ان کی بیٹی غلاظت کے دلدل میں نہ گرتی اور نہ ہی اس عبرتناک انجام کو پہنچتی پھر بھی انہوں نے اس واقعے سے سبق لینے کی بجائے مجھے اور میری مرحوم ماں کو اٹھتے بیٹھتے کوسنے دینے شروع کردیے۔

اسی دوران میرے لیے ایک رشتہ ابو کے ایک دوست لے کر آئے، یہ خالد کا رشتہ تھا۔ خالد کسی پرائیویٹ دفتر میں معمولی سا کلرک تھا اس کی تنخواہ دس ہزار تھی۔ اورنگی ٹاؤن میں اس کا اپنا ذاتی مکان تھا جو دو چھوٹے چھوٹے کمروں پر مشتمل تھا، اس میں ایک چھوٹا صحن تھا، اس دنیا میں وہ اکیلے تھے۔ ماں باپ، بہن بھائی، کوئی نہ تھا۔ ابو ان دنوں دفتر کے کسی کام سے اسلام آباد ہی گئے ہوئے تھے۔ امی نے خالد کے بارے میں کوئی چھان پھٹک اس لیے نہیں کی تھی کہ وہ مجھے خوش دیکھنا نہیں چاہتی تھیں۔ انہوں نے ابو کی غیر موجودگی میں فوراً ہاں کردی تھی تاکہ میں ایک بہت ہی معمولی شخص کی بیوی بن جاؤں۔ میری زندگی تنگ دستی، محرومی اور حسرت میں گزرے، میں کبھی خوش اور سکھی نہ رہوں۔

ابو اسلام آباد سے واپس آئے تو اس رشتے کے بارے میں سن کے انہیں بہت دکھ ہوا۔ امی نے چوں کہ بات بہت آگے بڑھادی تھی، بات بھی پکی کردی تھی... پھر بھی ابو نے میری رائے جاننا چاہی۔ میں تو خود اس جہنم سے نکلنا چاہتی تھی، اس لیے بولی۔ ''ابو.....! آپ امی سے کچھ نہ کہیں۔ بس ایک مرتبہ خالد سے مل لیں۔ اگر وہ نیک، محنتی اور شریف ہوئے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔''

ابو کی سمجھ میں میری بات آگئی۔ دوسرے دن وہ خالد سے مل کر آئے تو مطمئن تھے۔

''بیٹی.....!'' ابو نے امی اور نغمہ کی موجودگی میں مجھ سے کہا کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ لڑکا ہر لحاظ سے تمہارے لیے موزوں ہے۔ ذہین اور باصلاحیت ہے۔ تمہارا بہترین جوڑ ہے۔ بس اس میں ایک خرابی ہے کہ وہ معمولی ملازم ہے اور پھر اس کی رہائش اورنگی ٹاؤن میں ہے جہاں مسائل ہی مسائل ہیں۔ سہولتیں ناپید ہیں۔

''اورنگی ٹاؤن میں رہنا کوئی عجیب بات تو نہیں ہے ابو.....!'' میں نے پیار سے جواب دیا۔ ''آج معمولی نوکری ہے تو کل اچھی نوکری مل جائے گی۔ مجھے ایک دولت مند شوہر کے مقابلے میں ایک شریف اور سلجھے ہوئے شخص کی ضرورت ہے۔ میں ایک ایسے شخص کے ساتھ فاقے کر کے رہ سکتی ہوں جو رزق حلال کماتا ہو۔''

ابو بے اختیار بولے۔ ''مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم اتنی اونچی اور عظیم ہوگی۔ مہ جبین بیٹی! تم جیسی سوچ اور خیالات کی لڑکیاں آج کہاں؟ ہر شخص ظاہری چیزوں پر زور دیتا ہے۔ صبر اور توکل تو آج کسی میں رہا نہیں ہے جس پر تم کاربند ہو..... اللہ تمہیں اس صبر کا ایسا ثمر دے گا کہ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔''

☆☆☆

کوئی پندرہ دن کے بعد میری شادی سادگی سے انجام پاگئی کیونکہ خالد نے میرے گھر والوں سے استدعا کی تھی کہ شادی کے موقع پر کسی قسم کی فضول خرچی نہ کی جائے۔ وہ ولیمہ بھی بہت سادہ کریں گے۔

خالد نے جوڑے کی رقم لی اور نہ ہی جہیز مانگا تھا۔ انہیں لڑکی والوں سے لین دین سخت ناپسند تھا پھر بھی ابو نے نہ جانے کہاں سے اور کیسے بندوبست کر کے اتنا کچھ دیا تھا کہ ان کے گھر کے دونوں کمرے بھر گئے تھے۔

دوسری طرف امی اور نغمہ خوش تھیں کہ میں ایسے گھر میں نئی زندگی کا آغاز کرنے جارہی ہوں، ایسے شخص کے پلے باندھی جارہی ہوں جو صرف میٹرک پاس ہے اور وہ کسی بھی لحاظ سے میرے قابل نہیں ہے.. مگر مجھے کوئی فکر نہ تھی۔ یہ میرا

اپنا نصیب تھا جسے میں نے اپنی خوشی سے قبول کیا تھا۔

میرے سہاگ کی پہلی رات تھی۔ میں نے ایک لڑکی ہونے کے ناتے اس رات کے کیسے کیسے ان جانے اور حسین خواب نہیں دیکھے تھے۔ میری سہیلیاں مجھ سے کہتی تھیں کہ میں حسن کی شہزادی ہوں۔ مجھے کوئی شہزادہ ہی بیاہ کر لے جائے گا... پھر بھی مجھے کوئی دکھ نہ تھا اس لیے کہ میں ایک حقیقت پسند لڑکی تھی، خدا کی ذات پر میرا غیر متزلزل یقین تھا اور پھر میں ایک صابر و شاکر لڑکی تھی۔ میں جانتی تھی کہ ہر بات میں رب العزت کی کوئی مصلحت ہوتی ہے۔

میں حجلۂ عروسی میں دلہن بنی سمٹی سکڑی بیٹھی تھی۔ اپنے رفیقِ سفر کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ باہر اپنے دوستوں اور مہمانوں کا شکریہ ادا کر کے انہیں رخصت کر رہے تھے۔

میرے کمرے میں ایک گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا لیکن میرا سینہ جو دھڑک رہا تھا وہ ان جانے خیالات کے باعث تھا اور پیشانی بھی عرق آلود ہو رہی تھی۔ فضا موتیا اور گلاب کے پھولوں کی خوشبو سے مہک رہی تھی، ماحول نہ صرف معطر بلکہ خواب ناک بھی تھا۔ میں زندگی کے ایک نئے سفر کے آغاز کی منتظر تھی۔

ایک میٹھی سی بے چینی میرے رگ و پے میں بجلی کی طرح دوڑ رہی تھی۔ میں دل ہی دل میں دعا مانگ رہی تھی کہ یہ سفر خوش گوار ہو تاکہ میں اپنے آپ کو ایک اچھی شریکِ سفر ثابت کر سکوں۔ یہ گھر محبت اور خوشیوں کا گہوارہ بن جائے اور خوشیوں سے ہمیشہ مہکتا رہے۔ اس گھر میں کبھی اندھیرا نہ پھیلے۔

تھوڑی دیر کے بعد میں نے ان کے قدموں کی آہٹ سنی تو میرے دل نے تیزی سے دھڑکنا شروع کر دیا۔ میں نے اپنی آنکھوں پر پلکوں کی چلمن گرالی۔ انہوں نے کمرے میں داخل ہو کر دروازہ بند کیا اور بیڈ پر میرے پاس آ بیٹھے۔ میں نے جو ان کا قرب محسوس کیا تو میرا سر جو جھکا ہوا تھا وہ اور جھک گیا کمرے میں ایسا گہرا سکوت چھا گیا تھا کہ مجھے میرے دل کی دھڑکن سنائی دینے لگیں۔

انہوں نے میرا گھونگھٹ الٹ دیا۔ میری آنکھیں جو بند تھیں اور ان پر پلکوں کی جو چلمن پڑی تھیں وہ تھرتھرانے لگیں۔ ہونٹوں میں ایک ہلکی سی کپکپاہٹ آ گئی۔ فطری حیا نے مجھے اپنی آغوش میں لے رکھا تھا۔

''سبحان اللہ، اللہ نظرِ بد سے بچائے۔'' انہوں نے میری تھوڑی کے نیچے انگلی رکھ کر میرا چہرہ اوپر اٹھایا۔ میں نے محسوس کیا کہ میرا چہرہ ان کی نظروں کی گرفت میں ہے۔ وہ مجھے ایک ٹک دیکھے جا رہے ہیں۔

''چودھویں کا چاند..... آپ کو دیکھے تو شرما جائے۔ اس لیے کہ یہ چہرہ بھی میک اپ سے مبرا ہے۔'' وہ سرشار ہو کر بولے۔ ''مجھے اپنی خوش قسمتی پر یقین نہیں آ رہا ہے۔ سچ ہے عورت کا حسن میک اپ کا محتاج نہیں ہوتا ہے۔''

وہ میرے حسن و جمال کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملانے لگے۔ ادھر میری نس نس میں خون بڑی تیزی سے گردش کر رہا تھا۔ دوسرے لمحے انہوں نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا اور میری انگلی میں منہ دکھائی کی انگوٹھی پہنا دی پھر وہ میرا ہاتھ چھوڑتے ہوئے جیسے خجل سے ہو کر بولے۔

''یہ منہ دکھائی کی انگوٹھی بہت معمولی سی ہے۔ آپ کے اور آپ کے خوبصورت پھول سے نرم و نازک ہاتھ کے شایانِ شان نہیں ہے، پھر بھی آپ اسے ایک غریب شوہر کا تحفہ سمجھ کر قبولیت کا اعزاز بخش دیں۔''

پہلے تو میں نے آنکھیں کھول کے انہیں دیکھا۔ وہ مجھے محبت بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ وہ کسی شہزادے کی طرح خوبصورت تو نہ تھے مگر وجیہہ اور پُرکشش شخصیت کے مالک تھے۔

میں نے منہ دکھائی کی انگوٹھی دیکھی وہ واقعی ایک معمولی سی چاندی کی انگوٹھی تھی چند سو روپے سے زیادہ قیمت نہ ہوگی۔ میں نے اس انگوٹھی کو آنکھوں سے لگایا اور بوسہ دیا جیسے وہ بہت انمول اور نایاب ہو۔ پھر میں نے کہا۔ ''یہ انگوٹھی میرے لیے دنیا کی سب سے انمول اور قیمتی ہے، یہ میرے لیے یادگار رہے گی۔'' اتنا کہہ کر سر جھکا لیا اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔

''اس قدردانی کا بہت بہت شکریہ۔'' وہ ممنون لہجے میں بولے۔ ''لیکن مجھے آپ سے شادی کر کے بہت دکھ ہو رہا ہے۔''

''جی.....!'' میں نے سراسیمہ ہو کر سر اوپر اٹھایا۔ ''وہ کس لیے؟ کیا میں؟'' میں حیا کی وجہ سے اپنا جملہ پورا نہ کر سکی۔

''اس لیے کہ آپ بہت ہی حسین ہیں۔'' انہوں نے تعریفی لہجے میں کہا۔

''کیا آپ کو حسین لڑکیاں پسند نہیں ہیں؟'' میری زبان سے بے اختیار نکل گیا۔

''جی نہیں..... یہ بات نہیں۔'' وہ کہنے لگے۔ ''اس دھرتی پر کون ایسا احمق اور بدذوق ہوگا جو حسن کا پرستار نہ ہو۔

حسن کی قدر دانی نہ کرنا، بنانے والے کی توہین کے مترادف ہے۔ دراصل بات یہ ہے کہ آپ اس قدر حسین ہیں کہ میں آپ کا جوڑ نہیں ہوں اور نہ ہی آپ کے لائق..... سچ پوچھیے تو آپ کی شادی کسی شہزادے سے ہونا چاہیے تھی۔''

''آپ میرے لیے کسی شہزادے سے کم نہیں ہیں۔'' میں نے آنکھیں بند کر کے کہا۔ ''میرے لیے اس سے بڑی خوش قسمتی کیا ہو سکتی ہے کہ آپ نے مجھے رفیق سفر بنالیا۔''

''اچھا.....'' وہ بولے۔ ''مگر میں ایک غریب آدمی ہوں۔ جب میں نے اپنا رشتہ بھیجا تھا آپ کی امی کو اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ میں نے کہلوایا تھا کہ میرے تمام کوائف لڑکی کو بتا دیں۔ اس سے کوئی بات بھی نہ چھپائیں۔ کیوں کہ میں زبردستی سے شادی کرنے کا قائل نہیں ہوں۔ اگر اس نے انکار کر دیا تو مجھے قطعی صدمہ نہ ہوگا..... پہلے آپ کی امی نے پھر آپ کے ابو نے بتایا کہ ان کی بیٹی کو اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں ہے تو مجھے یقین نہیں آیا۔''

''آپ کو کس لیے اس بات کا یقین نہیں آیا؟'' میں نے متعجب لہجے میں پوچھا۔

''اس لیے کہ آپ میرے مقابلے میں ہر لحاظ سے ایک اچھے گھرانے کی تھیں۔''

''مجھے سکھ سے زیادہ آپ کی محبت کی ضرورت ہے۔'' میں نے آہستگی سے کہا۔ ''کیوں کہ شوہر کی محبت سے بڑا سکھ کوئی نہیں ہوتا ہے۔''

''میں آپ کو دیکھ کر سوچ رہا ہوں کہ کاش! میں شاعر ہوتا؟ آپ کے حسن و جمال کے ان گنت پہلوؤں کے بارے میں شعر کہتا۔ ساری رات شعر گوئی کی نذر ہوتی مگر مہ جبین.....!'' انہوں نے سانس لینے کے لیے توقف کیا۔ ایک گہری سانس لی اور اک دم سے سنجیدہ ہو گئے ''میرے ساتھ کیا میری زندگی کے اس سفر میں میری آخری سانس تک ساتھ دے سکیں گی؟ کیوں کہ یہ زندگی بڑی آزمائش کی ہوگی۔ میرے ساتھ سنگلاخ راستوں پر چلنا ہوگا، آپ کو پھول نہیں کانٹے ملیں گے، جذبات کی رو میں بہہ کر نہیں بلکہ حقیقت پسند ہو کر سوچیں..... کیا صرف محبت کرنے سے پیٹ بھر سکتا ہے مہ جبین؟''

''میں آپ کی نہیں بلکہ اپنی آخری سانس تک آپ کی ہر طرح سے خدمت کروں گی۔'' میں نے بڑے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ ''آپ مجھے ان شاء اللہ کسی بھی آزمائش میں پیچھے نہیں پائیں گے۔''

''اچھا.....!'' انہوں نے اپنے ہاتھوں کے پیالے میں میرا چہرہ بھر لیا۔ ''اگر ایسا ہے تو پھر میں اپنے آپ کو دنیا کا خوش قسمت ترین شخص سمجھوں گا۔''

☆☆☆

میں نے دوسرے دن اپنے اس مکان کا اچھی طرح جائزہ لیا جس میں، میں نے اپنی نئی زندگی کے سفر کا آغاز کیا تھا۔ ایک ناقابل فراموش یادگار آغاز۔

اورنگی ٹاؤن کا یہ مکان میرے والد کے مکان کے مقابلے میں بہت چھوٹا تھا۔ اس مکان میں وہ آسائشیں اور سہولتیں نہ تھیں جو میرے گھر میں موجود تھیں۔ نہ تو فریج، نہ کیبل۔ یہاں پانی کی بھی سخت قلت تھی۔ تقریباً ایک ماہ بعد ایک روز امی اور نغمہ مجھ سے ملنے کے لیے آئیں۔ ان کے ہونٹوں اور آنکھوں میں استہزائیہ انداز کی سرخی تھی۔ انہیں میرا مکان دیکھ کر بہت خوشی ہوئی تھی۔ وہ دیکھ کر ششدرہ گئیں کہ میں یہاں بہت خوش ہوں۔

میں نے انہیں بتانا چاہا کہ خوشیاں بڑے گھر اور آسائشوں میں نہیں ملتی ہیں۔ چھوٹا سا گھر بھی بے پناہ مسرت دے سکتا ہے۔

''یہ مکان نہیں پنجرہ ہے۔'' نغمہ نے نفرت اور حقارت سے کہا۔ ''اس کے کمرے تو ہمارے غسل خانے سے بھی چھوٹے ہیں۔''

''یہ پنجرہ میرے لیے کسی شاہی محل سے کم نہیں ہے۔'' میں نے مسکرا کے جواب دیا۔ ''کمروں کے چھوٹے ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔''

''یہ گھر تمہارے لیے ہرگز لائق نہیں ہے۔'' امی نے کہا۔ ''یہ تو جانوروں کے رہنے کی جگہ ہے۔ تم خالد سے کہہ کر بڑا گھر کیوں نہیں لے لیتی ہو؟''

''دس ہزار روپے تنخواہ پانے والا کہاں سے بڑا گھر لے سکتا ہے؟'' میری بجائے نغمہ درمیان میں بول پڑی۔ ''یہ آج کل ایک کمرے کا فلیٹ بھی کم کرایہ کا نہیں ہوتا ہے۔'' پھر وہ توقف کر کے طنزیہ لہجے میں بولی۔ ''یہ کیا کم ہے کہ اس نے کسی نہ کسی طرح یہ ڈربا خرید لیا ورنہ کسی کچی آبادی میں اس کی جھونپڑی ہوتی..... ویسے باجی.....! تم اس شخص کو پسند کر کے پھنس گئی ہو۔ اب ساری زندگی پچھتاؤ گی اور اپنے نصیبوں پر روؤ گی۔''

''اگر وہ مجھے فٹ پاتھ پر بھی رکھتے تو میں بالکل بھی

اف نہ کرتی۔'' میں نے بڑے تحمل سے جواب دیا۔ ''عورت کے لیے سب سے اچھا گھر وہی ہوتا ہے جس میں اس کی عزت ہو۔ اس کا شوہر چاہنے اور سکھ دینے والا ہو۔ کیا میرے لیے یہ بڑی بات نہیں ہے کہ میں یہاں عزت سے ہوں۔ ہم دونوں نے کبھی ایک دوسرے کو شکایت کا موقع نہیں دیا۔''

''تم میرا مذاق اڑا رہی ہو؟'' نغمہ اک دم سے بگڑ گئی۔

''میرے زخموں پر نمک چھڑک رہی ہو تم؟ تم جلد ہی دیکھ لوگی کہ ایک دن خالد تمہیں بیچ دے گا۔ تم جیسی حسین لڑکیوں کی دبئی اور کویت میں بڑی مانگ ہے۔ وہ تو مجھے ایک نمبر کا فراڈی لگتا ہے۔''

ماں بیٹی رکیں نہیں چلی گئیں۔ انہوں نے چائے پینا تک گوارا نہیں کیا۔ وہ یہ دیکھ کر بری طرح جل گئی تھیں کہ میں یہاں خوش ہوں۔ جب کہ انہوں نے میرے لیے بہت برا چاہا تھا لیکن اس کے برعکس ہوا تھا۔

امی کے آنے سے پہلے، شادی کے دوسرے دن ہی ابو مجھ سے ملنے آئے تھے۔ وہ شادی کے بعد پہلی بار میرے ہاں آئے اور نہ جانے کیا کچھ لے کر آئے تھے۔ مجھے یہاں خوش و خرم دیکھ کر بہت خوش ہوئے تھے۔ انہیں میرے چہرے اور باتوں سے ہی میری خوشی کا اندازہ ہوگیا تھا۔ جاتے وقت انہوں نے جیب سے دس ہزار کی رقم نکال کے میرے ہاتھ پر رکھ دی تھی۔ ''یہ کیا ہے ابو؟''

''گھر کے اخراجات کے لیے رکھ لو۔'' ابو نے کہا۔ ''مجھے اس بات کا احساس ہے کہ کتنی مشکل سے گزر بسر ہو رہی ہوگی۔''

''نہیں ابو.....! میں اسے نہیں لے سکتی۔'' میں نے انہیں رقم واپس کرتے ہوئے کہا۔ ''پلیز! آپ اسے واپس لے جائیں۔''

''کیوں بیٹی؟'' ابو حیرت سے بولے۔ ''میں اپنی خوشی سے تو دے رہا ہوں۔ تم نے تو نہیں مانگے؟''

''اس لیے کہ انہوں نے پہلے ہی سے کہہ رکھا ہے کہ تمہارے ابو کسی قسم کی مدد کرنا چاہیں تو صاف انکار کر دینا کیوں کہ تمہیں ہر حالت میں میری ہی تنخواہ میں زندگی گزارنا ہے۔ اگر تم نے اپنے ابو سے کوئی مدد لی تو میری خودداری کو ٹھیس پہنچے گی۔ اللہ نے چاہا تو یہ دن گزر جائیں گے اور اچھے دن بھی ان شاء اللہ ضرور آئیں گے۔ اس کے لیے صبر اور اللہ توکل کی ضرورت ہے۔ ہر نماز میں اللہ کا شکر ادا کیا کرو اس نے پھر بھی ہمیں لاکھوں سے کہیں اچھا رکھا ہوا ہے۔''

ابو اپنے داماد کی خودداری اور خیالات سے بہت خوش ہوئے تھے۔

''بیٹی.....! تم بہت خوش نصیب ہو کہ اللہ نے تمہیں بہت اچھا شوہر دیا ہے۔'' ابو نے کہا۔ ''اچھا شوہر ہی عورت کے لیے سب سے بڑی دولت ہوتا ہے، تم دیکھ لینا کہ ایک دن.. انشاء اللہ وہ بہت بڑا آدمی بنے گا۔ وہ بہت بلند اور عظیم شخص ہے۔''

وہ جب بھی آتے تھے مجھے.. بہت ساری دعائیں دے کر جاتے تھے۔

اس علاقے میں بجلی تھی تو لیکن نہ ہونے کے برابر۔ وہ اکثر چلی جاتی تھی اس لیے کہ ہر کسی نے کنڈا ڈالا ہوا تھا۔ اس محلے اور گلی میں صرف ہمارا ایک گھر تھا جو کنڈے سے محروم تھا۔ خالد کنڈے کے سخت خلاف تھے۔ بجلی بار بار غائب ہونے کی وجہ یہ تھی کہ لوگ بجلی کا بے دریغ استعمال کرتے تھے۔ بجلی کے چولہوں پر کھانا پک رہا ہے چائے بن رہی ہے۔ گیس ابھی آئی نہیں تھی گھروں میں مٹی کے تیل کے چولہے تھے۔ کبھی میں نے مٹی کے تیل کے ایسے چولہے پر پکایا نہیں تھا۔ اس میں کھانا پکنے میں دیر لگتی ہے۔ برتن دھونے میں مشقت ہوتی ہے۔ گھر میں نل تو تھا لیکن اس سے پانی نہیں صرف ہوا آتی تھی۔ غسل خانے اور باورچی خانے میں کیمیکل کے خالی نیلے ڈرم رکھے ہوئے تھے۔ جن میں پانچ چھ بالٹی پانی آتا تھا۔ گلی میں گھر کے سامنے نکڑ پر ایک نل لگا ہوا تھا۔ لڑکیاں، نوعمر بچیاں اور عورتیں ڈبوں، کنستروں اور بالٹیوں میں پانی بھر کے چھوٹی چھوٹی ریڑھیوں پر رکھ کے لے جایا کرتی تھیں۔ دن میں مرد پانی بھرنے نہیں آتے تھے۔ اگر آتے بھی تو اکا دکا ہی ہوتے تھے۔ زیادہ تر چھوٹے لڑکے لڑکیاں اور عورتیں ہوتی تھیں۔ دو بجے گلی ویران ہو جاتی تھی۔ نل پر اس وقت کڑی دھوپ ہونے کے باعث کوئی نہیں ہوتا تھا۔ خالد فجر کی نماز کے بعد تین چار بالٹی پانی لا کر ڈرموں میں بھر دیتے تھے۔ پھر نہا کر تیار ہوتے اور ناشتا کر کے چلے جاتے تھے۔ پانی بھرنے کی وجہ سے انہیں دفتر جانے میں دیر ہو جاتی تھی کیوں کہ اس وقت قطار لمبی ہوتی تھی۔

شام کے وقت دفتر سے تھکے ماندے آتے تھے۔ میرے منع کرنے کے باوجود چار پانچ بالٹی پانی نل سے بھر لاتے۔ مجھے یہ اچھا نہیں لگتا تھا پھر میں ایسے وقت جب نل

پرتش نہیں ہوتا تھا تل سے حسب ضرورت پانی بھر لاتی۔ شام کے وقت جب وہ گھر آتے تو کبھی میں پکوڑے تل لیتی، سموسے اور چھولے وغیرہ بنا لیتی۔ صحن میں چارپائی پر بیٹھ کر ہم چائے کے ساتھ کھاتے اور دیر تک باتیں کرتے۔ مغرب کی نماز پڑھ کے میں رات کا کھانا تیار کرتی۔ رات کا کھانا عشاء کی نماز کے بعد کھا کر چہل قدمی کے لیے نکل جاتے۔ تھوڑی دیر ٹی وی دیکھتے۔ یہ بارہ انچ کا ایک چھوٹا سا بلیک اینڈ وائٹ ٹی وی تھا پھر بستر پر چلے جاتے۔ میں نے انہیں عام مردوں سے مختلف پایا جب کہ وہ ایک کلرک تھے۔

مجھے اندازہ نہ تھا کہ وہ اس قدر نفیس اور شائستہ مزاج، بردبار، سنجیدہ اور بارعب ہوں گے۔ ان کی شخصیت بڑی سحر انگیز اور متاثر کن بھی تھی۔ وہ صرف میٹرک پاس تھے۔ میں گریجویٹ تھی۔ میں نے سوچا کہ ان سے کسی دن کہوں کہ وہ پرائیویٹ طور پر امتحان دے کر گریجویشن کر لیں۔ آخر ہم کب تک اس علاقے میں رہیں گے اور غربت کی زندگی گزاریں گے۔ اس تنخواہ میں کب تک گزر بسر ہوتی رہے گی۔

ایک مرتبہ وہ مجھے جائنیز ریسٹورنٹ بھی لے گئے۔ ایک بار ہم نے فلم دیکھی اور چکن تکے کھائے۔ یہی ایک طرح سے ہماری عیاشی تھی۔ وہ دفتر بس یا منی بس میں دھکے کھاتے جاتے تھے لیکن پھر بھی بہت خوش تھے کہ ان کی زندگی بہت اچھی تھی۔ انہیں ایک حسین و جمیل شریک حیات ملی ہے۔

انہوں نے شادی کے بعد ملنے والی پہلی تنخواہ میرے ہاتھ رکھ دی تھی۔ ''اب آپ بجٹ بنائیں اور میرے لیے جیب کے اخراجات پانچ... سو روپے عنایت فرما دیں۔ باقی رقم آپ گھر کے دیگر اخراجات کے لیے رکھ لیں۔ اب آپ کو یہ گھر چلانا ہے ہر ماہ اسی طرح سے.....''

میں نے پانچ سو کی رقم پہلے ان کی طرف بڑھا دی اور پھر دو سو روپے ان کی طرف بڑھا دیئے۔ ''یہ میری طرف سے ہے۔''

''میرے لیے تو یہی... کافی ہیں۔'' وہ بولے۔ ''اس مہنگائی کے دور میں دس ہزار کی رقم کیا ہوتی ہے؟ سوچتا ہوں تو بڑی شرمندگی ہوتی ہے کہ آپ کو بھی اچھی طرح رکھ نہیں سکا جس طرح رکھنا چاہیے۔ یہ زندگی کسی طرح بھی آپ کے شایانِ شان نہیں ہے۔''

''میں نے کبھی بھی آپ سے کوئی شکایت نہیں کی۔'' میں نے جواب دیا۔ ''میں یہاں ہر طرح سے بہت خوش ہوں کیا آپ کو اندازہ نہیں ہوا؟''

''اس رقم میں کتنی سیدھی سادی، عام اور قناعت سے زندگی گزار رہے ہیں۔ یہ دس ہزار کی رقم پہلے اکیلی میری ذات پر پورے نہیں ہوا کرتے تھے۔ میں مہینے کے آخری ہفتے میں دفتر سے ہزار پانچ سو کی رقم لیتا تھا جو تنخواہ ملنے پر ادا کر دیا کرتا تھا۔ اس گرانی میں اب کہاں دو آدمیوں کے لیے کافی ہوں گے؟'' وہ بڑی سنجیدگی سے بولے۔

''یہ رقم بہت کافی ہے بلکہ اس میں ہر ماہ پانچ چھ سو روپے بچ جائیں گے اس لیے کہ یہ محنت اور حلال کی کمائی ہے۔'' پھر میں نے ان کے سامنے گھر کا بجٹ پیش کر دیا۔ وہ تھوڑی دیر تک بجٹ کا وزیر خزانہ کی طرح جائزہ لیتے رہے۔ پھر بولے۔ ''یہ ٹھیک ہے مگر اس میں آپ کے ذاتی اخراجات شامل نہیں ہیں۔ مثلاً میک اپ کا سامان، کپڑے.....''

''میک اپ کا شوق مجھے پہلے کبھی نہیں رہا اور نہ اب ہے..... میں نے کبھی سرخی، کریم تک نہیں لگائی، آپ کو بھی تو پسند نہیں ہے۔'' وہ تیزی سے میری بات کاٹتے ہوئے بولے۔ ''اس لیے کہ آپ کا حسن میک اپ کا محتاج جو نہیں ہے۔''

میں ان کی بات سن کر سرخ ہو گئی تو انہوں نے میرے چہرے کو چوم لیا پھر میں نے چند لمحوں کے بعد ان سے الگ ہو کر کہا۔

شادی کے میرے پاس اتنے سارے جوڑے ہیں کہ دو ایک برس تک کسی نئے جوڑے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ اس کے علاوہ میں گھر سے اپنے پرانے جوڑے بھی لے آئی ہوں جو گھر میں پہن لیتی ہوں اور وہ ہر موسم کے مطابق ہیں۔ میں سوچ رہی تھی کہ جو میک اپ بکس رکھا ہوا ہے جسے اب تک کھولا نہیں ہے وہ محلے کی ایک لڑکی جس کی آئندہ ماہ شادی ہونے والی ہے اسے آپ سے اجازت لے کے دے دوں۔ کیوں کہ مجھے تو میک اپ سے سخت چڑ ہے۔''

''خدا نے مجھے اتنی اچھی اور نیک سیرت اور قناعت پسند بیوی دی مگر میری بدقسمتی ہے کہ میں آپ کو اچھی طرح رکھ نہیں پا رہا ہوں۔'' انہوں نے میرے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ چند لمحوں تک مجھے محبت بھری نظروں سے دیکھتے رہے تو لگا کہ وہ جذباتی ہونے والے ہیں۔ اگر حیا مانع نہ ہوتی تو میں ان کے گلے میں بانہیں حائل کر کے ان کے چہرے پر جھک جاتی۔ انہوں نے میرے ہاتھوں کو اپنی آنکھوں سے لگاتے ہوئے کہا۔

''یہ خوبصورت، نرم و نازک اور پیارے ہاتھ اتنی محنت اور مشقت کے لیے تھوڑی بنے ہیں۔ یہ ہاتھ ایک شہزادی کے ہاتھ ہیں۔''

''ان ہاتھوں کا حسن تو آپ کی خدمت ہے اور میں یہاں ایک شہزادی کی طرح ہی تو رہتی ہوں۔ میری خوشی آپ کی خدمت میں ہی تو ہے۔''

''سچ.....'' انہوں نے خوش ہو کر مجھے اپنے بازوؤں کے حصار میں لے لیا۔

ایک روز وہ دوپہر کے وقت اچانک دفتر سے آ گئے۔ اس وقت میں گلی کے نل سے بالٹیوں میں پانی بھر رہی تھی۔ دونوں ہاتھوں میں پانی سے بھری بالٹیاں اٹھا کر گھر میں داخل ہو رہی تھی۔ یہ دیکھ کر انہیں بہت دکھ ہوا۔

''مجھے اپنے آپ پر شرم آنے لگی ہے۔ آپ اتنی تکلیفیں اٹھاتی ہیں؟''

''اس میں شرم کی کیا بات ہے؟'' میں نے جواب دیا۔ ''آپ کریں یا میں کروں، ایک ہی بات ہے۔''

''نہیں..... آپ آئندہ سے پانی بھرا نہیں کریں گی۔'' انہوں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''میں صبح سویرے پانی بھر کے جایا کروں گا اس وقت جب مسجد میں نماز فجر پڑھ کے آتا ہوں..... یا پھر کسی آدمی سے بات کروں گا تو شام کے وقت جب میں دفتر سے آ جاتا ہوں پانی بھر دیا کرے گا۔ اس طرح دوسرے روز، سارا دن کام چل جائے گا۔''

پھر وہ اسی وقت کسی آدمی کی تلاش میں نکل گئے لیکن انہیں کوئی آدمی نہیں ملا۔ وہ ایک گھنٹے کے بعد آئے تو ان کے ہاتھ میں کوئی دس بارہ میٹر لمبا پلاسٹک پائپ تھا بہت مضبوط اور موٹا سا بھی تھا۔

''آپ دوپہر کے وقت پائپ لگا کر پانی بھر لیں یا ہم سویرے یا رات کے وقت پانی بھر لیا کریں گے۔''

نل میں سارا دن پانی تو آتا نہیں تھا۔ اس کے اوقات مقرر تھے۔ بعض اوقات سارا دن پانی آتا تھا۔ رات دس بجے بند ہو جاتا تھا۔ وہ پانی بھرنے کے لیے رات چار بجے بیدار ہو جاتے تھے۔ اس وقت نل پر کوئی نہیں ہوتا تھا۔ پانی بھی بہت تیز آتا تھا۔ وہ پائپ نل میں لگا دیتے بیس منٹ میں دونوں ڈرم بھر جاتے تھے۔ انہوں نے پانی کے لیے اپنا آرام حرام کر لیا تھا۔

چوتھے مہینے میں اُمید سے ہو گئی۔ اورنگی میں ایک سرکاری زچہ خانہ تھا انہوں نے اس زچہ خانہ میں میرا نام لکھوا دیا۔ جس روز مجھے معائنے کے لیے جانا ہوتا اس روز وہ دفتر سے آدھے دن کی چھٹی کر لیتے تھے۔ میرا ہر طرح سے خیال رکھنے لگے تھے۔ میرے لیے روز دفتر سے پھل لے کر آتے۔ سارے اخراجات وہ خود ہی اٹھاتے تھے۔ دودھ بھی آنے لگا تھا۔ ڈاکٹر جو دوائیں تجویز کرتی تھیں وہ بازار سے خریدنی پڑتی تھیں کیوں کہ اسپتال سے جو دوائیاں ملتی تھیں ایک تو وہ ناقص ہوتی تھیں اور شاذ و نادر ہی ملتی تھیں کیوں کہ اسپتال کی ڈسپنسری کا عملہ انہیں دکانداروں کے ہاتھوں اونے پونے دام بیچ کر مال بناتا تھا۔ میرے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ دفتر سے انہوں نے رقم قرض لی ہے۔ وہ میری غذا کا بھی بڑا خیال رکھتے تھے میں نے ان سے بہت کہا کہ اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ اللہ جو کچھ بھی دے رہا ہے وہ بہت ہے، اس کا بڑا کرم احسان ہے لیکن وہ میری کوئی بات سنتے نہیں تھے۔

پانچ مہینے دیکھتے دیکھتے پر لگا کر اڑ گئے۔ وہ میرا ضرورت سے زیادہ ہی خیال رکھنے لگے تھے۔ وہ صبح اٹھ کے خود ناشتا بنانے کی کوشش کرتے تھے لیکن میں اس کا انہیں موقع نہیں دیتی تھی۔ آٹھویں مہینے میں ڈاکٹر نے سختی سے تاکید کی کہ میں اس مہینے میں پوری طرح آرام کروں۔ ابو مجھے لے جانے کے لیے آئے تھے لیکن میں وہاں کسی قیمت پر جانا نہیں چاہتی تھی کیونکہ مجھے نغمہ اور امی سے ان جانا خوف آتا تھا۔ یہ میرا گھر تھا میرا اپنا گھر، اپنے گھر سے کہیں زیادہ آرام کہاں مل سکتا تھا اس لیے میں نے وہاں جانے سے صاف انکار کر دیا تھا۔

انہوں نے دفتر سے ایک ماہ کی چھٹی لے لی پورا مہینے میرے آرام کا اس طرح خیال رکھا کہ اگر میری سگی ماں بھی ہوتیں تو شاید اس طرح خیال نہیں رکھتیں۔ وہ خود ہی کمروں اور صحن میں جھاڑو دیتے، ناشتا تیار کرتے تھے۔ دوپہر اور رات کا کھانا پکاتے، برتن دھوتے، چائے بناتے اور اپنے ہاتھوں سے کھلاتے۔ انہوں نے ایک مہینے تک مجھے بستر سے ہلنے تک نہیں دیا، مجھے شہزادی کی طرح رکھا۔ مجھے انہیں کام کرتے ہوئے دیکھ کر اچھا نہیں لگتا تھا۔ میں کہتی تھی کہ مردوں کا کام کھانا پکانا، برتن دھونا اور جھاڑو دینا نہیں ہے۔ وہ جواب دیتے کہ گھر کے کام میں شرم کیسی؟ مردوں سے اچھا کھانا کوئی نہیں پکاتا ہے، ساری دنیا کے چھوٹے بڑے ہوٹلوں میں جو اچھے، لذیذ اور ذائقہ دار کھانے پکتے ہیں وہ سب مرد پکاتے ہیں۔

وہ واقعی اتنا اچھا پکاتے کہ سوچا بھی نہیں جاسکتا، لوگ چمچے چاٹ لیتے، وہ قناعت پسند اور نفاست پسند تھے اس لیے باورچی خانہ صاف ستھرا ہوتا تھا۔ اس ایک مہینے کے دوران وہ تین چار مرتبہ دفتر بھی ہو کر آئے تھے۔ ایک روز وہ کہنے لگے۔ ''یہ سرکاری اسپتال مجھے اچھا نہیں لگ رہا ہے، میں کسی اچھے اسپتال میں تمہارا نام لکھوانا چاہتا ہوں جب کمپنی کی طرف سے طبی سہولتیں ہیں تو کیوں نہ فائدہ اٹھایا جائے۔''

پھر انہوں نے ایک روز ایک پرائیویٹ اسپتال میں لے جا کر میرا نام لکھوا دیا جو دفتر کے پینل میں تھا۔ ایک لیڈی ڈاکٹر نے میرا معائنہ کیا۔ ایک ہزار روپے فیس بھی ہتھیالی۔ آخری مہینے میں کوئی اسپتال، کلینک اور زچہ خانہ کیس نہیں لیتا تھا دفتر کے ایم ڈی کی سفارش پر میرا کیس لے لیا گیا تھا۔

انہیں لڑکی کی بڑی خواہش تھی جب کہ ایک عورت ہونے کے ناتے میں یہ چاہتی تھی کہ پہلا لڑکا ہو۔ وہ کہتے تھے کہ جب لڑکی ہوتی ہے تو حضور کا سلام آتا ہے اور وہ بڑی بابرکت ہوتی ہے، وہ گھر کی رونق ہوتی ہے، لڑکی ہوئی تو اس کا نام بتول اور لڑکا ہوا تو عبداللہ رکھوں گا۔

اس محلے میں زیادہ نچلے طبقے کے لوگ رہتے تھے متوسط گھرانوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر تھی۔ یہ غریب لوگ بھی آخر انسان تھے کمزوریاں اور خامیاں کس میں نہیں ہوتی ہیں ان میں بھی تھیں۔ یہ وہ لوگ تھے جو مشرقی پاکستان سے لٹ پٹ کر آئے تھے۔ یہ لوگ دل کے بہت اچھے، بڑی محبت اور محنت کرنے والے تھے، مخلص اور ہمدرد بھی تھے لیکن میں نے کسی وجہ سے کسی گھرانے سے دوستی نہیں بڑھائی تھی۔ صرف دو ایک گھرانوں سے رسمی سلام علیک رکھی ہوئی تھی۔ ان میں سے بھی کسی نے بھی بے تکلف ہونے کی کوشش کی اور نہ ہی انہیں اس کا کبھی کوئی موقع دیا۔ البتہ میرے پڑوس میں زبیدہ خالہ جو تھیں ان سے ایک طرح سے میرا قلبی تعلق قائم ہو گیا تھا۔ ان کی سات لڑکیاں تھیں جن میں تین کی شادی ہو چکی تھی ان کے شوہر عابد چاچا کہیں ملازمت کرتے تھے۔ ان کی تنخواہ میں پورا نہیں ہوتا تھا۔ چار جوان لڑکیاں ان کے سینے پہ چٹان کا بوجھ بنی ہوئی تھیں۔ لڑکیاں بے حد پرکشش اور اچھی شکل وصورت کی تھیں، نقوش بہت پیارے تھے۔ ایسے نہیں تھیں کہ لڑکے والے ناپسند کر جائیں وہ اس لیے ان کی شادی نہیں کر سکتے تھے کہ ان کے پاس دینے کے لیے کچھ نہ تھا۔ آج کل شادیاں لڑکیوں سے نہیں لین دین سے کی جاتی ہیں۔ رشتے تو آرہے تھے۔ تین لڑکیوں کی شادیوں نے ان کی کمر توڑ کے رکھ دی تھی۔ ان کی مفلسی، تنگ دستی کا خالہ کو شدت سے احساس تھا۔ وہ بھی کبھی کبھی ان کے لیے فکرمند ہو جاتے تھے۔

زبیدہ خالہ کا میرے ہاں آنا جانا تھا، وہ سگی ماں کی طرح میرا خیال رکھنے لگی تھیں جب کہ ان سے میرا کوئی رشتہ ناتا نہیں تھا۔ وہ میری سوتیلی ماں سے لاکھ درجے بہتر تھیں، میری سوتیلی ماں نے ایک بار بھی آکر میری خیریت دریافت نہیں کی تھی۔ خالد کی غیر موجودگی میں وہ اور ان کی لڑکیاں میرے سارے کام کاج کرتی تھیں۔ ہر طرح سے میرا خیال رکھنے لگی تھیں جیسے میں ان کی سگی آپا ہوں۔

اس روز سہ پہر کے وقت مجھے اسپتال لے جانے کی ضرورت پڑ گئی۔ خالد دفتر گئے ہوئے تھے۔ زبیدہ خالہ نے ٹیکسی منگوائی اور مجھے اسپتال لے کر پہنچ گئیں۔ اسپتال سے خالد اور ابو کو فون کر دیا گیا۔ ان دونوں کے اسپتال پہنچنے سے پہلے ہی میں نے ایک چاندسی بچی کو جنم دیا۔ ابو نے خالد کے کہنے پر بچی کے کان میں اذان دے کر اس کا نام بتول رکھ دیا۔

خالد بہت خوش تھے کہ اللہ نے ان کی دلی تمنا پوری کر دی انہیں خوش دیکھ کر میں بھی خوشی سے پھولی نہیں سمائی۔ دوسرے دن نغمہ اور امی غیروں کی طرح رسم پوری کرنے آئیں۔ انہوں نے اسپتال دیکھا تو ان کے سینوں پر سانپ لوٹ گئے۔ وہ اندر ہی اندر بری طرح جل کر رہ گئیں۔ امی سے رہا نہیں گیا انہوں نے مجھ سے سرگوشی میں پوچھ ہی لیا۔

''تمہارے میاں نے کمپنی میں غبن تو نہیں کیا مہ جبین؟''

''مجھے نہیں معلوم۔'' مجھے غصہ تو بہت آیا تاہم میں نے ضبط کر کے جواب دیا۔ ''آپ خود ہی ان سے پوچھ لیں۔ وہی آپ کو بتا سکیں گے۔''

''تم ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو کہ جس کی تنخواہ دس ہزار ہو اتنا خرچ کیسے کر سکتا ہے؟''

''وہ تو کہہ رہے تھے کہ انہیں کمپنی کی طرف سے سہولت ملی ہے۔ کمپنی کے تمام ملازمین کو سہولت دی جاتی ہے۔'' میں نے کہا۔

''جس کی تنخواہ صرف دس ہزار ہو اور جو کمپنی میں ایک معمولی کلرک ہو اس کی اوقات ہی کیا ہوتی ہے؟'' امی نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اسے پرائیویٹ اسپتال کی سہولت

مل جائے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مجھے دال میں کالا نظر آتا ہے؟'' وہ میرے دل میں شک کا زہریلا خنجر گھونپ کے چلی گئیں لیکن میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا کہ امی سچ کہتی ہیں۔ ایک معمولی کلرک کو اتنی زیادہ طبی سہولت کیسے مل سکتی ہے... پھر یہ سوچ کر دل کو تسلی دی کہ وہ چونکہ مجھ سے بے انتہا محبت کرتے ہیں شاید اس لیے انہوں نے میرے آرام کی خاطر قرض لیا ہو، انہیں اس بات کا بڑا دکھ اور احساس تھا کہ مجھے سکھ سے نہیں رکھ سکے۔

میں تیسرے دن ہی اس قابل ہوگئی تھی کہ گھر جاسکوں کیوں کہ نارمل زچگی تھی لیکن خالد نے مجھ سے کہا کہ گھر جا کر آرام نہیں ملے گا۔ تم مزید کچھ دن اسپتال ہی میں آرام کرلو۔ میرا خیال نہ کرو، میں زبیدہ خالہ کو کچھ رقم دے دوں گا۔ وہ میرے لیے صبح ناشتا اور رات کے کھانے کا بندوبست کردیں گی۔ ان کی لڑکیاں میرے دفتر جانے کے بعد گھر کی صفائی وغیرہ کردیا کریں گی میں روز دفتر کی چھٹی ہوتے ہی تمہیں آکر دیکھ جایا کروں گا۔

☆☆☆

اسپتال میں میرا پانچواں دن تھا، امی دوپہر کے وقت مجھے دیکھنے کے لیے آئیں تو مجھے بڑی حیرت ہوئی، یقین نہ آیا۔ اس روز جو کباب ہو کر گئی تھیں پھر ان کے آنے کی ذرہ برابر بھی اُمید نہیں تھی جانے کیوں میرا ماتھا ٹھنکا۔ اس وقت نرس کمرے میں موجود تھی۔ انہوں نے نرس کو اس بہانے باہر بھیج دیا کہ کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں مجھ سے، جب نرس کمرے سے نکل گئی تو انہوں نے پوچھا۔

''جب نارمل ڈلیوری ہوئی ہے تو تم اپنے گھر کیوں نہیں گئیں؟ نارمل ڈلیوری والی عورتیں دوسرے دن ہی گھر چلی جاتی ہیں۔''

''اس لیے کہ گھر پر کوئی نہیں ہے اور وہاں مجھے آرام نہیں ملے گا اس لیے ان کی خواہش ہے کہ میں دس بارہ دن یہاں آرام کروں۔''

''اصل بات یہ نہیں بیٹی!'' وہ سرگوشی کے انداز میں بولیں تو ان کا لہجہ پُراسرار سا تھا۔ ''تم مجھے سوتیلی نہیں اپنی سگی ماں کی طرح سمجھنا۔ میں تم سے نغمہ کی طرح ہی محبت کرتی ہوں مجھ میں سوتیلا پن اگر ہوتا تو میں تمہیں یہ راز کی بات بتانے ہرگز ہرگز نہیں آتی۔ تمہاری محبت مجھے کھینچ لائی ہے۔ میں تمہیں اندھیرے سے نکالنے آئی ہوں۔ جس روز سے تم اسپتال میں ہو اس کا فائدہ اٹھا کر تمہارا میاں گل چھرے اڑا رہا ہے، وہ زبیدہ خالہ کی بیٹی زاہدہ پر ریشہ خطمی ہوگیا ہے۔ وہ بھی خالد پر مرمٹی ہے وہ خالد کے لیے ناشتا لے کر جاتی ہے تو گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے سے پہلے نہیں نکلتی ہے رات کا کھانا لے جاتی ہے تو تین چار گھنٹے اندر سے دروازہ بند کرکے رہتی ہے۔ تمہارے شوہر دو دن سے دفتر نہیں جارہے ہیں۔ زاہدہ سارا سارا دن گھر میں اس کے ساتھ رہتی ہے۔ وہ نہ صرف خالد کی دل و جان سے خدمت کررہی ہے بلکہ ہر طرح سے خوش بھی کررہی ہے۔''

''نہیں..... یہ سب جھوٹ ہے۔'' میں نے تکرار کی۔

''آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ وہ ایسے ہیں اور نہ زبیدہ خالہ.....''

معلوم نہیں کیوں مجھے اپنی آواز کھوکھلی محسوس ہورہی تھی، میں نے بہ وقت تمام اپنے آپ کو سنبھال کر کہا۔ ''ان کی ساری لڑکیاں نیک سیرت اور باکردار ہیں۔ زاہدہ تو بہت ہی پیاری لڑکی ہے۔''

''کاش.....! یہ جھوٹ ہوتا۔'' امی نے ایک گہری سانس لی۔ ''میں تمہاری سوتیلی ماں ہی سہی لیکن میں ایک عورت ہوں بیٹی! نغمہ کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا وہ تم سے پوشیدہ نہیں۔ اس بات نے مجھے ساری دنیا کی لڑکیوں کا ہمدرد بنادیا ہے اور پھر تم تو میری بیٹی ہو۔ یہ بات حقیقت پسند بن کر سوچو اور دیکھو کہ..... اس نے تمہیں یہاں مزید دس بارہ دن کے لیے کیوں رکھا ہے اور ہاں کل وہ زبیدہ خالہ اور زاہدہ کو لے گیا تھا شام کے وقت وہ واپس آئے تو ٹیکسی میں..... ان کے پاس بہت سارا سامان شاپنگ بیگس میں بھرا ہوا تھا۔''

''یہ ساری باتیں آپ کو کس نے بتائیں؟'' میرا دل اندر سے ڈوبنے لگا۔ یہ باتیں اس لیے سچ تھیں کہ دو تین دن سے زبیدہ خالہ مجھے دیکھنے نہیں آئی تھیں۔ میرے دل میں ان کے خلاف شک جڑ پکڑنے لگا۔ میں نے ویران لہجے میں پوچھا۔ ''کیا آپ وہاں گئی تھیں؟''

''ہاں.....'' انہوں نے اثباتی انداز میں سر ہلایا۔ ''میں تمہارے ہاں گئی تھی کہ خالد سے پوچھوں کہ اگر تمہیں کھانے پینے کی تکلیف ہے تو میرے ہاں آجایا کرو جب میں تمہارے گھر پہنچی تو باہر کا دروازہ بھڑا ہوا تھا۔ اندر داخل ہوئی تو زاہدہ خواب گاہ میں تھی۔ میری آہٹ سن کر دونوں ہراساں اور سراسیمہ ہوگئے۔ وہ اپنے بال اور کپڑے درست کرتی ہوئی سرعت سے نکل گئی۔ میں نے خالد سے کچھ نہیں کہا۔ کہنے کی ضرورت ہی کیا بچی تھی؟'' پھر وہ توقف کرکے

تاکیدی لہجے میں کہنے لگیں۔ ''تم اپنے شوہر سے ان باتوں کا تذکرہ نہ کرنا۔ بس..... تم آج ہی یہاں سے ڈسچارج کر کے چلی جاؤ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ زاہدہ کمینی تمہاری جگہ لے لے۔''

میری حالت غیر ہونے لگی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا میری آنکھوں مرچیں سی اترتی جارہی ہیں۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ پھوٹ پھوٹ کر روؤں۔ انہوں نے مجھے نہیں بتایا تھا کہ وہ دو دن کی چھٹی پر ہیں۔ مجھے امی کی باتوں پر یقین نہیں آیا تھا اس لیے کہ مجھے شوہر کی فطرت کا خوب اندازہ تھا مگر مرد اور ناگ کی فطرت کا کوئی بھروسا نہیں ہوتا۔ زاہدہ کا جسم تو بہ شکن اور اس کے تناسب ایسے تھے کہ ایک زاہد بھی بہک جائے۔ وہ مجھے روتا ہوا دیکھ کر میرے آنسو اپنے دوپٹے میں جذب کر کے دلاسا دینے لگیں پھر چند لمحوں کے بعد انہوں نے مجھ سے کہا کہ تم خالد کو دفتر فون کر کے معلوم تو کرو کہ وہ آج دفتر آئے ہیں یا نہیں؟ میں نے سنا ہے وہ آج بھی ماں بیٹی کو شاپنگ کرانے کے لیے ساتھ لے گئے ہیں۔''

میں نے دفتر ٹیلی فون کر کے پوچھا تو پتا چلا کہ وہ آج دفتر آئے ہی نہیں ہیں۔ وہ تین دن کی چھٹی پر ہیں۔ کل بھی نہیں آئیں گے۔

امی میرے دل میں زہر بھر کے چلی گئی تھیں اور میں جیسے دہکتے انگاروں پر لوٹنے لگی۔ زاہدہ بلاشبہ بڑی پُرکشش تھی مگر وہ مجھ سے زیادہ حسین اور پُرکشش نہیں تھی... پھر کس بات نے انہیں مجھ سے بدظن کر دیا؟ اگر انہیں مجھ سے محبت نہ ہوتی تو وہ مجھے اتنے بڑے اسپتال میں ہرگز داخل نہ کراتے۔ میرے آرام کی فکر اور خیال نہ کرتے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ امی ان کے خلاف میرے دل میں زہر بھر رہی ہوں تاکہ نغمہ کی طرح میری زندگی بھی برباد ہو جائے، بسا بسایا گھر اجڑ جائے؟ اس خیال کے آتے ہی میرے دل کو ایک عجیب سا سکون ہو گیا۔ میں نے دل میں سوچ لیا کہ مجھے امی سے ہوشیار رہنا چاہیے۔ وہ مار آستین ہیں۔ انہیں میرے شوہر کی بے پناہ چاہت آنکھوں میں کھٹک رہی ہے۔ یہ سوچ کر میں کچھ حد تک مطمئن ہو گئی۔ آج خالد مجھ سے ملنے آئے تو ان کے ساتھ زبیدہ خالہ بھی تھیں۔ زبیدہ خالہ بہت خوش نظر آرہی تھیں۔ میں نے انہیں کبھی اتنا خوش نہیں دیکھا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ چلی گئیں تو میں اور خالد کمرے میں رہ گئے۔ نرس بھی نہیں تھی، میں نے ان سے پوچھا۔ ''کیا آپ دفتر نہیں گئے؟''

''تمہیں کس نے بتایا؟'' وہ حیران ہو کر میری شکل دیکھنے لگے۔

''آج امی آئی تھیں تو انہوں نے بتایا تھا۔'' میں بولی۔ ''کیا وہ آپ سے ملنے گھر آئی تھیں؟''

میرا خیال تھا کہ یہ بات سنتے ہی ان کا چہرہ فق ہو جائے گا۔ مگر اس بات کا ان پر ذرا برابر بھی اثر نہ ہوا۔ وہ بولے۔ ''ہاں آئی تو تھیں، وہ اس وقت آئیں تھیں جب زاہدہ میرے لیے چائے لے کر آئی تھی۔ وہ مجھ سے نغمہ کے رشتے کے لیے کہہ رہی تھی۔ بہت دیر تک میرے پاس بیٹھیں باتیں کرتی رہیں۔ میں نے انہیں بتایا تھا کہ میری بہت ساری مصروفیات ہیں اس لیے میں تین دن کی چھٹی پر ہوں۔''

وہ بہت دیر تک میرے پاس بیٹھے اور محبت بھری باتیں کرتے رہے۔ بچی کو بھی گود میں لیا اسے خوب پیار کیا۔ میں نے ان میں ایسی کوئی بات محسوس نہیں کی کہ ان میں گرم جوشی نہ رہی ہو۔ وہ مجھ سے اکتا گئے ہوں۔ اگر وہ زاہدہ کے حسن و شباب کے اسیر ہو گئے ہوتے تو میرے پاس نہ اتنی دیر بیٹھتے اپنی محبت کا اظہار جذباتی انداز میں کرتے۔ اگر وہ زاہدہ کو دل دے بیٹھے ہوتے تو یہاں آتے بھی نہیں، اگر آتے تو تھوڑی ہی دیر میں چلے جاتے تاکہ گھر کی تنہائی میں سرفراز ہو سکیں۔

بغیر کسی ٹھوس ثبوت کوئی بات کہنا اور الزام لگانا فضول تھا۔ میں ایک عجیب سی اور ناقابل فہم کیفیت میں مبتلا ہو رہی تھی۔ فیصلہ تمیز کر پائی تھی کہ سچ کیا ہے؟ جھوٹ کیا ہے؟ جب میں نے بہت سوچا تو میرے ذہن میں ایک بات کوندا بن کے لپکی۔ میں نے خالد سے کہا۔

''آپ مجھے ابھی اور اسی وقت ڈسچارج کروا کے گھر لے چلیں۔ میں اب یہاں ایک منٹ بھی رہنا نہیں چاہتی ہوں۔''

وہ اک دم سے چونک پڑے جیسے میرے الفاظ کرنٹ بن کے لگے ہوں۔ انہوں نے گھبرا کے کہا۔ ''کیوں؟ کیا تمہیں یہاں آرام نہیں مل رہا ہے؟ کسی قسم کی پریشانی ہو رہی ہے؟ اگر کوئی تکلیف ہو تو بتاؤ تاکہ اسے رفع کیا جا سکے؟''

''جی نہیں۔ یہ بات نہیں ہے۔ یہاں بہت آرام اور سکون ہے مگر میں یہاں پڑے پڑے بیزار ہو گئی ہوں اور مجھے ایک طرح کی وحشت سی ہونے لگی ہے۔ اب چونکہ میں بالکل ٹھیک ہوں مکمل طور پر صحتیاب ہوں اسی لیے گھر جانا چاہتی ہوں۔ گھر، گھر ہی ہوتا ہے۔''

''لیڈی ڈاکٹر نسیم آراء اور زبیدہ خالہ کہہ رہی تھیں کہ تمہیں چالیس دن تک کوئی کام نہ کرنے دیا جائے۔'' وہ کہنے لگے۔ ''تم دو چار دن اور رہ لو اسی عرصے میں کسی نوکرانی کا بندوبست کیے لیتا ہوں تاکہ وہ گھر کے کام کاج کرلے۔''

''میں چھوٹے موٹے کام کرنے کے قابل تو ہوں۔'' میں بولی۔ ''اگر ضرورت پڑی تو زبیدہ خالہ سے کام کروالیا کروں گی۔ انہیں کچھ رقم دے دیا کروں گی کیونکہ وہ ضرورت مند تو ہیں، بخوشی لے لیں گی۔''

''نہیں۔'' وہ پیار سے بولے۔ ''آخر تم اپنے آپ پر ظلم کرنے پر کیوں تلی ہوئی ہو۔'' انہوں نے میرے ہاتھ تھام کے انہیں چوما۔

''اس لیے کہ ایک عورت ہونے کے ناتے مجھے ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنا پسند نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''تھوڑی دیر کے بعد میرے دل کے کسی کونے میں ایک ان جانا سا خیال آیا تو میں نے سوچا کہ کیوں نہ آزما کر دیکھ لیا جائے۔ ان کے جواب سے صاف پتا چل جائے گا کہ وہ مجھ سے اس وقت جو محبت بھری باتیں کررہے ہیں ان میں کتنی سچائی ہے۔ کہیں یہ ریاکاری اور منافقت تو نہیں؟ اس بات کا بھی علم ہوجائے گا کہ وہ زبیدہ خالہ کے اشاروں پر تو ناچ نہیں رہے ہیں؟''

''سنیے..... یہ مکان آپ بیچ کیوں نہیں دیتے؟ اسے بیچ کر کسی ایسے محلے میں خرید لیں جہاں سوئی گیس ہو۔''

''کیا کہا..... یہ مکان بیچ دوں؟'' وہ اس طرح اچھل پڑے جیسے بجلی کا جھٹکا لگا ہو۔ ''نہیں۔ میں یہ مکان کسی قیمت پر نہیں بیچوں گا۔''

''وہ کس لیے؟'' میں ان کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ ''اس میں ایسی کوئی خاص بات ہے جو آپ اس قدر جذباتی ہورہے ہیں؟''

''خاص بات؟'' وہ مجھے دیکھتے ہوئے بولے۔ ''کیا خاص بات ہے تمہیں کیا بتاؤں؟ کیسے بتاؤں؟ اس مکان سے واقعی میرا گہرا اور جذباتی لگاؤ ہے۔ میں اس مکان کو چھوڑنے اور بیچنے کا تصور تک نہیں کرسکتا اور پھر زبیدہ خالہ جیسے پڑوسی کہاں مل سکتے ہیں؟'' وہ اپنی رو میں کہتے چلے گئے۔ ''دیکھو نا..... ان کی بیٹی زاہدہ آج کل میرا کتنا خیال رکھنے لگی ہے، مجھے تمہاری کمی بھی محسوس نہیں ہورہی ہے۔'' یہ الفاظ نہیں تھے بلکہ میرے وجود پر ایک بم بن کے پھٹے تھے جس نے میرے پرخچے اڑا دیے تھے۔ میں کچھ کہتی وہ اس سے پہلے بولے۔ ''مجھے ایک ضروری کام یاد آگیا ہے۔ میں کل شاید نہ آسکوں..... اللہ حافظ۔''

پھر وہ کمرے سے تیزی سے نکل گئے اور میں انہیں جاتا ہوا دیکھتی رہ گئی۔ میرے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔ میرے دل پر غم کا پہاڑ ٹوٹا تھا۔ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ان کے اس جملے سے صاف ظاہر ہورہا تھا کہ ان پر زاہدہ کے حسن و شباب کی حشر سامانیوں کا جادو چل گیا ہے۔ آج کی رات میرے لیے کسی قیامت سے کم نہیں تھی۔ میں آدھی رات تک جیسے دہکتے انگاروں پر لوٹتی رہی۔ میرے دل و دماغ قابو میں نہیں رہے تھے۔ ذہن میں ایک کشمکش سی جاری تھی۔ زاہدہ پہلے کبھی بھی ان کی موجودگی میں نہیں آتی تھی۔ وہ ایسی لڑکی نہ تھی جس کے لباس میں اس کا بھڑکیلا بدن اور بے حجابی ظاہر ہوتی ہو، وہ دوپٹا اس طرح سے اوڑھتی تھی کہ جسم کی زینت ظاہر نہیں ہوتی تھی۔ باہر بغیر برقع نکلتی نہیں تھی۔ پنج وقتہ نمازی تھی، حیرت اور دکھ کی بات تھی کہ اتنی جلدی فاصلہ کیسے مٹ گیا۔ جادو کیسے چل گیا اور وہ ان کی کمزوری کیسے بن گئی؟ میں نے امی کی اس بات کا یقین نہیں کیا تھا کہ انہوں نے زاہدہ اور خالد کو غلاظت کے دلدل میں دھنسا دیکھا تھا مگر اب میں ان کی بات کو سچ ماننے پر مجبور تھی۔ اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟ ایک طرح سے زبیدہ خالہ نے نہیں بلکہ انہوں نے میرے سینے میں زہریلا خنجر گھونپا تھا۔ اس خنجر کو نکالنا میرے بس میں نہیں تھا۔ میں چشم تصور میں دیکھ رہی تھی کہ زاہدہ راتوں کو ان کے پاس آتی ہے دونوں میاں بیوی کی حالت میں صبح تک جاگتے ہیں۔

میں مسلسل سوچ و بچار کے بعد اس نتیجے پر پہنچی کہ جذباتی ہونے اور غم و غصے میں آنے کی بجائے اس وقت ایک سمجھدار، دوراندیش، حقیقت اور پڑھی لکھی عورت کا کردار ضبط و تحمل کے ساتھ ادا کرنا چاہیے۔ میں گھر چلی جاؤں گی تو شاید ایسی باتیں رونما نہ ہوں۔ اگر پھر بھی زاہدہ کا جادو نہ اترا تو مجھے کیا کرنا چاہیے؟ ٹھنڈے پن اور خوش اسلوبی سے ایسی کوئی تدبیر کرنی چاہیے کہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ میرا کوئی بھی جذباتی اور جلد بازی کا اقدام میرے حق میں نقصان دہ ہوسکتا ہے۔ مرد ذات کا بڑی ہمت اور خوبصورتی سے سامنا کرنا چاہیے۔ اس نتیجے پر پہنچنے کے بعد میرے دل کو اطمینانیت سی محسوس ہوئی۔

خالد دوسرے دن مجھے دیکھنے نہیں آئے۔ اس بات

سے میرے دل کو گہرے صدمے کا احساس ہوا اور اب اس بات میں ذرہ بھی شک وشبہ نہیں رہا کہ وہ زاہدہ کے طلسم میں کھو گئے ہیں اس لیے مجھے دیکھنے نہیں آئے۔

دوسرے دن وہ آئے تو بہت خوش تھے جیسے کوئی قلعہ فتح کر کے آئے ہوں، ان کا خوشی سے دمکتا چہرہ اور چمکتی آنکھیں میرے دل میں کسی تیر کی طرح اتر گئیں میں نے ان سے محبت بھرے لہجے میں پوچھا۔

''اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟ میں کل سارا دن آپ کی راہ دیکھتی رہی۔ آپ کا انتظار میرے لیے سوہان روح بنا رہا۔''

''کل بھی میں دفتر نہیں گیا تھا ایک کام میں پھنسا رہا۔'' انہوں نے جواب دیا۔ ''اس لیے تمہیں دیکھنے نہیں آسکا۔''

وہ شاید کھل کر یہ بتانا چاہتے تھے کہ کل میں نے سارا دن زاہدہ کے سنگ گزارا ہے۔ میں نے اپنے آنسوؤں کو کس طرح پیا اور غم برداشت کیا میرا دل ہی جانتا ہے..... وہ جتنی دیر بیٹھے رہے میں ان کے سامنے مسکراتی اور ہنستی رہی جیسے بہت خوش ہوں۔ میں جلد بازی میں آکر کوئی حماقت کرنا نہیں چاہتی تھی۔ یہ پہاڑ جیسے دن خدا خدا کر کے کسی نہ کسی طرح گزر گئے۔ بچی کے ننھے وجود نے میرا دل بہلائے رکھا۔ اس کے رونے کی آواز اور موہنی صورت جو چاند کا ٹکڑا تھی میرا دل بہلائے رکھا ورنہ میں یہ صدمہ سہہ نہ پاتی۔ اسپتال سے ڈسچارج ہوتے ہوئے میں اس طرح سے خوش تھی جیسے زنداں سے برسوں کی سزا بھگت کے رہا ہو رہی ہوں۔ وہ کمرے سے نکلنے سے پہلے بولے۔

''میں گھر میں کچھ کام کروا رہا ہوں اس لیے تمہیں کچھ دن اور کہیں رکھوں گا۔''

''آپ کس کے ہاں مجھے لے جا رہے ہیں؟'' میں نے مشکوک ہو کر پوچھا۔ مجھے سمجھتے دیر نہیں لگی کہ وہ اور زاہدہ کچھ دنوں دن رات آزادی سے گزارنا چاہتے ہیں۔ ان کے دل ابھی بھرے نہیں ہیں۔ انہوں نے شادی سے پہلے گھر میں مرمت اور روغن کرایا تھا اس لیے دوبارہ رنگ و روغن کی ضرورت نہیں تھی۔

''دوست کے گھر۔'' انہوں نے جواب دیا۔ ''وہ اپنی بیوی بچوں کے ساتھ دو مہینے کے تفریحی دورے پر یورپ گئے ہوئے ہیں۔ ان کی واپسی تک گھر میرے ذمے اور نگرانی میں دے گئے ہیں۔ وہاں تم پندرہ بیس دن بڑے آرام سے رہو گی۔''

اسپتال کے باہر اسی سال کی نئے ماڈل کی کار کھڑی تھی۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ انہیں ڈرائیونگ بھی آتی ہے۔ اس گاڑی میں ہم دوست کے مکان پر پہنچے۔

ایک ادھیڑ عمر کی چاق و چوبند سی عورت آگے بڑھی وہ سفید لباس میں تھی اس نے بڑے تپاک اور فدویانہ انداز سے سلام کیا اور بچی کو گود میں لے لیا۔ یہ عورت ملازمہ تھی۔ اس کا نام دلشاد بیگم تھا۔ وہ مجھے ایک آراستہ و پیراستہ خواب گاہ میں لے گئی۔ میں اس خواب گاہ کو دیکھ کر مبہوت سی ہو گئی میں نے کبھی خواب میں بھی ایسی شاندار خواب گاہ نہیں دیکھی تھی۔

رات میں جب وہ میرے برابر آکر لیٹے تو پوچھا۔

''یہ بیڈ روم کیسا ہے؟'' ''کیا تمہیں پسند آیا مہ جبیں!''

''بہت شاندار..... بہت خوبصورت اور سحر انگیز.....''

میں نے خواب ناک لہجے میں جواب دیا۔ ''دل چاہ رہا ہے کہ ایک سو بیس گز کے اس گھر میں ساری زندگی گزار دوں۔''

''گزار دو.....'' وہ بے اختیار مسکرا دیے۔ ''تمہیں کس نے روکا ہے۔''

''وہ آپ کے دوست..... کیا کان پکڑ کے نکال نہیں دیں گے؟''

''نہیں.....''

''وہ کس لیے؟''

''اس لیے کہ تمہیں جھٹکا نہ لگے اس لیے میں نے دوست کا گھر ہے، کہا تھا مگر یہ ہمارا گھر ہے تمہارا گھر ہے۔''

''کیا؟'' میں بھونچکی سی ہو گئی۔ ''ہمارا گھر؟'' میں نے حیرت سے ان کی شکل دیکھی مجھے یہ سب کچھ کسی خواب کی طرح لگا۔ ''یہ ہمارا گھر ہے؟ آپ کا گھر؟ کیا آپ سچ کہہ رہے ہیں؟''

انہوں نے ہاتھ بڑھا کے مجھے اپنے بازوؤں کے حصار میں قید کر لیا۔ میرے چہرے پر جھکے اور آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولے۔ ''یہ گھر میں نے تمہارے نام لکھ دیا ہے۔ تم آج سے اس گھر کی مالک ہو۔''

''اگر یہ گھر ہمارا تھا تو آپ نے اورنگی ٹاؤن میں گھر کیوں لیا؟ ایک برس کا عرصہ کیوں گزارا؟ مجھے پہلے ہی دن سے یہاں کیوں نہیں لائے؟'' میں نے سوالوں کی

بوجھ جھاڑ کر دی۔

''یہ سب میں نے تمہارے کہنے پر کیا۔ اب تم کہو گی کہ میں نے کب کہا تھا تو سنو۔ جب تم نے اسی چھوٹے سے گھر کو بجھ جیسے غریب آدمی کو جو کسی بھی طرح تمہارے لائق نہیں اسے اہمیت دی، میرا مان بڑھایا۔ اسی وقت میں نے سوچ لیا تھا کہ کچھ کر دکھاؤں گا۔ زندگی بھر کی کمائی جو میں نے پیٹ کاٹ کر خواہشوں کو کچل کر آٹھ لاکھ روپے جمع کیے تھے وہ رقم سہاگ رات گزارتے ہی بینک سے نکالے اور اسی دن اورنگی میں ایک مکان خریدا پھر اسے اسٹیٹ ایجنٹ کے ذمے لگا دیا کہ وہ بیچ دے۔ اس نے کچھ ہی دنوں میں وہی مکان دس لاکھ میں بیچا پھر اس دس لاکھ سے دو مکان خریدے پھر اسے بیچا۔ ہر سودے میں ڈیڑھ دو لاکھ مل جاتے پھر میں نے نارتھ میں مکان خریدا اس کے سودے پر پورے سات لاکھ ملے اور یہ مکان وکار لے لی۔ اب میں نوکری کے ساتھ یہ دھندا بھی کر رہا ہوں۔''

''آپ نے تو کمال کر دکھایا۔''

''مجھ سے زیادہ تو تم نے کمال دکھایا۔'' انہوں نے میرے گرد بازوؤں کا گھیرا تنگ کر دیا۔ وہ میرے چہرے پر جھک کے جذباتی ہونے لگے تو میں کسمسائی کہ کہیں وہ حد سے تجاوز نہ کر جائیں۔ چند لمحوں کے بعد بولے۔ ''میں آپ کو پرکھنا اور ہر طرح سے آپ کی آزمائش کرنا چاہتا تھا کہ آپ کندن بن جائیں اس لیے تو آزمائش کی بھٹی میں جھونک دیا تھا؟ آپ میری آزمائش پر میری توقع سے کہیں زیادہ پوری اتریں۔ مجھے فخر ہے کہ قدرت نے ایک حسین بیوی کے ساتھ ساتھ نیک سیرت، سلیقہ مند، سب سے بڑھ کر صابر و شاکر اور سمجھدار بیوی دی جو شوہر کی ترقی کے لیے ہمہ وقت دعا کرتی ہے۔ مجھے یقین ہے میری ترقی کے پیچھے تمہاری وہ دعائیں ہیں جو تم جانماز پر مانگتی تھیں اسی لیے کہتا ہوں کہ آپ میرے لیے سب سے زیادہ قیمتی اثاثہ ہیں۔''

''اوہ میرے اللہ.....'' میں دم بخود سی ہو کر رہ گئی۔

''آپ نے نہ صرف اپنے آپ کو بلکہ مجھے بھی ایک امتحان میں ڈال دیا۔ آپ آئندہ ایسے امتحان میں ہرگز نہ ڈالیں۔ امی نے اس محبت میں دراڑیں ڈالنے کی کیا کچھ کوشش نہیں کیں۔ یہ آپ..... مجھے آپ، آپ کیوں کہہ رہے ہیں؟''

''میں جانتا ہوں کہ انہوں نے تمہیں میرے خلاف کس قدر اکسایا ہوگا؟'' وہ کہنے لگے۔ ''زاہدہ جس وقت میرے لیے چائے لے کر آئی تھی میں گھر میں اکیلا تھا۔ انہوں نے تم سے کوئی انجانی کہانی یقیناً گھڑی ہوگی۔ اس کا اندازہ میں نے تمہارے بشرے سے کیا تھا اس لیے میں نے اس شک کو اور ہوا دی۔ جلتی پر تیل چھڑکا یہ دیکھنے اور پرکھنے کے لیے کہ اس کا تم پر کیا اثر ہوتا ہے مگر تم نے بڑی بردباری، دور اندیشی اور سمجھداری سے کام لیا۔ یہ سچ ہے کہ میں نے زاہدہ اور اس کے گھر والوں کو شاپنگ کرائی اس لیے کہ زبیدہ خالہ کے احسانات کو اتاروں اس لیے بھی کہ زاہدہ کی منگنی ہوگئی ہے۔ اس کی شادی آئندہ جمعہ کو ہونے والی ہے۔ اس دنیا میں میری ماں اور بہنیں نہیں ہیں اس لیے میں نے انہیں ماں کا درجہ دیا ہوا ہے۔ ان کی بیٹیاں میری بہنوں کی طرح ہیں۔ میں نے ان کی تینوں لڑکیوں کی شادی کی ذمے داری لے لی ہے۔ زاہدہ کی شادی میں کروں گا۔ نماز عصر کے بعد نکاح ہوگا اور کھانا نہیں ناشتا ہوگا اور نماز مغرب کے بعد رخصتی۔ لڑکا بہت اچھا ملا ہے اس نے جہیز، فرنیچر اور جوڑے کی رقم لینے سے انکار کر دیا ہے۔ میں نے پچاس ہزار جوڑے کی رقم دی تھی اس نے لفافہ کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ میں جو اس کی شادی کروں گا بڑا بھائی بن کر.....''

میں نے ان کے سینے میں سسک کر اپنا سر رکھ دیا۔

''آپ کتنے اچھے اور عظیم ہیں۔''

اگلے روز شام کے وقت خالد ابو، امی اور نغمہ کو لے کر آئے، ان تینوں کو یقین نہیں آیا تھا۔ ابو تو بہت خوش ہوئے اور بہت ساری دعائیں دے ڈالیں۔ امی اور نغمہ بری طرح جل کر رہ گئیں۔ یہ تو میرے نصیب کی بات تھی۔ جب میرے لیے بظاہر بہت اچھا رشتہ آیا تو امی نے میرے حق میں ڈنڈی ماری اور نغمہ کی شادی اس لڑکے سے کر دی۔ خالد کو ایک سراب سمجھ کر میری شادی ان سے کر دی وہ سراب نہیں ٹھنڈے میٹھے پانی کا چشمہ ثابت ہوئے۔ اللہ نے انہیں صبر اور توکل کا بہت بڑا پھل دیا۔

آج میں بہت خوش ہوں اس واقعے کو پانچ برس بیت چکے ہیں۔ خالد اس شہر کے ممتاز اسٹیٹ ایجنٹ میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ہم نے اورنگی ٹاؤن کا مکان اس لیے فروخت نہیں کیا کہ اس مکان سے ہماری سہانی یادیں وابستہ ہیں۔ وہاں سے ہماری خوشگوار ازدواجی زندگی کا آغاز ہوا تھا ہم دونوں کبھی کبھی خصوصاً شادی کی سالگرہ اس مکان میں مناتے ہیں۔ تین ماہ پیشتر میں نے ایک لڑکے کو جنم دے کر خالد کی دلی تمنا پوری کر دی۔ اس کا نام عبداللہ رکھا ہے۔

++

# حیاتِ جاوداں

محترمہ عذرا رسول

سلام مسنون!

ایک ایسی سچ بیانی بھیج رہی ہوں جسے تحریر کرنے کے لیے جداگانہ انداز اختیار کیا ہے یعنی کہ ایک تجربہ کیا ہے۔ حالات و واقعات کو افسانے کے طرز میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے تاکہ قارئین کو افسانے جیسا لطف آئے، اختتام کو تھوڑا سا بڑھا کر تفصیلی کر دیا ہے۔ یہ تجربہ کیسا رہا یہ قارئین ہی بتا سکیں گے۔

کنیز زہرہ

(لاہور)

کہر آلود دھند میں لپٹی دوپہر سارے منظر یہ مہین سفید چادر تانے پورے طمطراق سے کائنات پہ جلوہ گر تھی۔ سرسراتی سرد ہوا سے بے نیاز آزاد پرندے فلک کی وسعتوں میں سرور کے عالم میں جھوم رہے تھے۔ ٹریفک کا بے ہنگم شور جیسے سکون پہ اپنی آہنی گرفت جمائے تسلط قائم کر چکا تھا۔ دھند میں بھیگے درخت گویا زرد پڑ رہے تھے۔ وہ یونیورسٹی سے نکلی تو کاشان کو اپنی بی ایم ڈبلیو سے ٹیک لگائے کھڑا پایا۔ زیب لمحوں میں جل کر خاکستر ہوئی۔ وہ زیب فاروق تھی ملک

فاروق کی اکلوتی اولاد جو محاورتاً نہیں حقیقتاً سونے کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہوئی تھی۔ فاروق اور زرتاشہ کی وہ اکلوتی بیٹی تھی سو اس کے اتنے لاڈ اٹھائے گئے کہ وہ غلط کو بھی بڑے دھڑلے سے درست سمجھ کے اس پہ بضد ہو جاتی... اور اسے منوا کے ہی چھوڑتی چاہے اس کے لیے اسے جان دینی پڑتی یا لینی پڑتی۔ اس کی خواہش اس کی ضد اس کی سوچ درست تھی باقی سب غلط۔ بچپن میں ہی اس کی منگنی اس کے کزن کاشان سے کر دی گئی جو اس کی ہر جائز ناجائز ماننے والوں میں سے ایک بن گیا' پھر بھی زیب کے ہٹیلے دل کو کسی کروٹ چین نہیں تھا۔ روز اس کی نئی سے نئی ضد گویا ملک خاندان کو روز نئی سے نئی آزمائش میں ڈال دیتی تھی۔

''تم آج پھر یہاں آ گئے۔ میں نے کہا تھا نا مجھے لینے کوئی نہ آیا کرے میں کوئی ننھی بچی نہیں جو کھو جاؤں گی۔'' وہ یونیورسٹی کے گیٹ پہ جم کے کھڑی ہو گئی۔ کاشان کو اکتا کے اس کی طرف آنا پڑا۔ کاشان کو سامنے دیکھ کے ہی وہ مشتعل انداز میں اس پہ پل پڑی۔

''زیب فاروق! باز آ جاؤ اپنی حرکتوں سے لوگ اس شاہانہ زندگی کے لیے ترستے ہیں جس سے تم اپنے ایڈونچر کے چکر میں بے زار ہو۔ آج تم مجھے یہ بتا ہی دو کہ کیا وجہ ہے کہ تم اپنی فضول حرکتوں سے ناک میں دم کیے رکھتی ہو۔'' کاشان آج جیسے پھٹ ہی پڑا تھا درشت لہجے میں بولتا اب اسے کینہ توز نظروں سے گھور رہا تھا۔

''مسٹر کاشان! فار یور کائنڈ انفارمیشن زیب فاروق کوئی بچی نہیں جس پہ تم لوگ اپنا تسلط قائم کر لو گے۔ میں نے کہا کہ میں یونیورسٹی بس سے آ جاؤں گی تم لوگ زحمت مت کیا کرو... اور خدارا اپنے محترم ماموں کو بھی سمجھاؤ کہ ڈرائیور کو گارڈز کی فوج کے ساتھ مجھے لینے مت بھیجا کریں۔ جیسے ہزاروں لڑکیاں آتی جاتی ہیں میں بھی ویسے ہی آ جاؤں گی۔'' رعونت سے کہتی وہ اپنے سردی کے احساس سے پتھر ہوتے ہاتھ بیش قیمت کوٹ میں ٹھونستی سڑک کے کنارے کنارے چلنے لگی۔

''تمہیں عزت راس نہیں ہے، یہ سب ماموں کے بے جا لاڈ پیار کا ہی نتیجہ ہے جو آج وہ بھگت رہے ہیں۔ مگر تم بھول رہی ہو ناشکری لڑکی کہ تمہارے سامنے فاروق ملک نہیں بلکہ کاشان حیدر کھڑا ہے جو تمہیں راہ راست پہ لانا جانتا ہے۔'' ایکدم سامنے آتے کاشان نے اس کا ہاتھ مروڑنے کے انداز میں پکڑا اور گھسیٹ کے گاڑی تک لایا اور پھر کسی پرانے سامان کی طرح گاڑی کے اندر پٹخ کے ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھتے ہی گاڑی اسٹارٹ کر دی پھر سارا راستہ جبڑے بھینچے ونڈ اسکرین کے پار دیکھتا رہا۔ جبکہ زیب روتے ہوئے مغلظات بکتی رہی۔ یہاں تک کہ سفید بی ایم ڈبلیو فاروق ولا کے وسیع و عریض پورچ میں جا کے رک گئی۔ سامنے ہی پھیلا کئی کنال پہ مشتمل لان مخملیں گھاس سے اٹا تھا۔ زیب اترتے ہی روتے ہوئے فاروق ولا کی پرشکوہ عمارت میں غائب ہو گئی۔ کاشان مردہ قدم اٹھاتا اندر کی جانب بڑھا اسے بھی کب اچھا لگتا تھا زیب پہ سختی کرنا۔

''ماما کہاں ہیں ڈیڈ انہیں کہہ دیں کہ میں یہ منگنی توڑتی ہوں۔ یہ تسلط یہ حکمرانی کسی اور پہ جتائے ان کا لاڈلا بھانجا، میں اس رعب کی عادی نہیں۔'' لاؤنج میں داخل ہوتے ہی دھاڑتی زیب جوتے اتار کے اِدھر سے اُدھر اچھال کر پھینکتی صوفے پہ براجمان ہو چکی تھی۔

''اب کیا ہوا ہے کاشان! تم جانتے تو ہو زیب کا غصہ کیوں سختی سے پیش آتے ہو اس سے۔ نادان ہے بے پرواہ ہے ٹھیک ہو جائے گی وقت کے ساتھ ساتھ۔'' ایک نظر زیب کے لال بھبھوکا چہرے پہ ڈالتی زرتاشہ نے اندر آتے کاشان سے پوچھا تو وہ من و عن ساری بات بتا کے واپسی کے لیے مڑا۔

''ہاں اسی سے پوچھیں سب تاکہ وہ ساری غلطیاں میرے کھاتے میں ڈال کے سرخرو ہو جائے۔ نہیں پسند مجھے خود پہ کسی کی حکمرانی۔ میں کوئی بچی ہوں کہ یونیورسٹی سے گھر کا راستہ بھول جاؤں مگر نہیں آپ کو عادت ہو گئی ہے مجھ پہ زندگی تنگ کرنے کی۔'' کاشان کے چپ ہوتے ہی زیب بپھر کے کھڑی ہوئی اور حسب سابق جو منہ میں آیا بکتی چلی گئی۔ بے بسی کے گہرے احساس میں ڈوبے کاشان نے اتنے زور سے مٹھیاں بھینچی تھیں کہ اسے اپنی انگلیاں ٹوٹتی محسوس ہوئیں۔

''تم غلط سمجھ رہی ہو بیٹا! ہمیں تمہاری فکر ہے پرواہ ہے اسی لیے تمہیں ہر خطرے سے بچانا چاہتے ہیں۔ تمہیں پتا ہے کہ تمہارے بابا ویل نون پارٹی کے لیڈر ہیں۔ دوستی سے زیادہ دشمنی پال رکھی ہے انہوں نے، بس اسی لیے احتیاط کے پیشِ نظر.....'' زرتاشہ نے اس کے اسٹریس میں کٹے ہوئے بال سنوارکر اس کو سمجھانے کی سعی کی جو بے سود ثابت ہوئی۔

''تو کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ میں اپنی زندگی اپنی مرضی سے گزارنا چھوڑ دوں۔ اگر ایسا ہے تو میں باز آئی اس محبت اور پرواہ سے۔ خدا کرے کل ہی کسی دشمن کی اندھی گولی کا نشانہ بن جاؤں تاکہ آپ کی اس نام نہاد محبت سے تو نجات

ملے۔'' زرتاشہ کی بات کاٹ کے اس نے ہذیانی انداز میں چیخ کے کہا تو کاشان کا ضبط جواب دے گیا۔ وہ ان ہی قدموں پہ گھوم کے لمبے لمبے ڈگ بھرتا فاروق ولا سے نکلتا چلا گیا۔ جبکہ زرتاشہ کی آنکھوں میں دکھ کے جھاڑ اگ آئے۔ سیرت نے ملامت بھری نظر زیب پہ ڈالی، زیب اس سے نظر چراتی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

''بی بی! حجرے میں مریدین کا جمگھٹا لگ چکا ہے۔ صدیقہ بی بی آپ کو بلا رہی ہیں، جلدی سے وضو کریں اور آ جائیں۔'' سیرت اپنے بیڈ پہ یٹم دراز تھی جب ہلکی دستک کے بعد چھنو نے اس کے پرتعیش کمرے میں آ کے صدیقہ کا پیغام دیا۔

''ٹھیک ہے میں آتی ہوں تم چلو۔'' اس نے مختصراً کہا اور پاس ہی پڑا دوپٹا اٹھایا، کاندھے پہ ڈال کر وضو کرنے واش روم گھس گئی۔ کچھ ہی دیر میں وہ سفید عبایہ اوڑھے تیار کھڑی تھی۔ دفعتاً اس کی نظر ارقم حسین شاہ کی مسکراتی ہوئی تصویر پہ پڑی۔ اس کی غلافی آنکھیں لمحوں میں اشک بار ہوئی تھیں۔ وہ ہاتھ میں تسبیح تھامے حویلی کے داخلی دروازے کی طرف بنے حجرے کی طرف چل پڑی۔ اس پہ بڑی ذمے داری تھی، وہ سید ارقم حسین شاہ کی بیوہ تھی۔ اپنے مرحوم سسر سید عظمت حسین شاہ کے بتائے ہوئے وظائف کی روشنی میں لوگوں میں فیض اور شفا بانٹتی تھی۔

''تم ان چنے ہوئے لوگوں میں سے ہو جنہیں خدا نے اپنی مخلوق کے فیض کے لیے اثر دعا جیسی نعمت سے نوازا۔ خدا تمہاری دعا رد نہیں کرتا تو تم خدا کی مخلوق کے لیے خدا سے گڑگڑا کے مانگنے سے کیوں جھجکتی ہو۔'' وسیع و عریض سرخ اینٹوں جڑے صحن سے گزرتے اس کے ذہن میں اماں صدیقہ کے الفاظ گونجے جو اس کے بااعتماد قدموں کو سرور کا عالم بخش گئے۔

''بی بی سیدہ! میرے بیٹے کو ابھی بھی نوکری نہیں ملی۔ آپ دعا کریں خدا اس پہ رزق کے دروازے کھول دے۔'' اس کے مخصوص تخت پہ براجمان ہوتے ہی شریفاں نے اس کے ہاتھ پہ احتراماً بوسہ دیتے ہوئے متفکر انداز میں کہا تو سیرت متوحش ہوگئی۔ اس نے تو بڑے دل سے وظیفہ کر کے دعا کی تھی۔

''شریفاں! بی بی کی دعا کے اثر میں کوئی شبہ نہیں، یہ تیرے ہی اعمال ہیں جو سنوائی نہیں ہوتی۔'' بی بی صدیقہ نے جھٹ سے سارا الزام شریفاں پہ تھوپتے ہوئے اس کی مشکل آسان کر دی۔

''یہ ایک تعویز لکھا ہے تیرے بیٹے کے لیے اس سے کہنا جب بھی رزق کی تلاش میں نکلے اسے جیب میں رکھنا نہ بھولے۔'' سیرت نے تعویز شریفاں کی طرف بڑھایا تو وہ اس کے ہاتھ پہ پھر الوداعی بوسہ دے کر حجرے سے نکل گئی۔

''بی بی سیدہ آپ کی دعائیں رنگ لے آئیں، اللہ نے مجھے چاند سا پوتا دیا ہے۔ میرا تو بس نہیں چل رہا کہ دنیا جہان کی دولت آپ کے قدموں میں رکھ دوں، مگر میں اتنا ہی ہدیہ دے سکی بس بی بی دعاؤں میں یاد رکھنا۔'' خوشی سے کھلتے چہرے سمیت لیسہ مٹھائی کا بڑا سا ڈبا اور ہزار کے دس نوٹ اس کی طرف بڑھا رہی تھی جسے سرعت سے تھامتی صدیقہ گویا ہوئیں۔

''بی بی سیدہ کی ساری دعائیں تم لوگوں کے لیے ہی تو ہیں اور واقعی خوشی تو اتنی بڑی ہے کہ تو خزانے بھی لٹا دے تب بھی کم ہے، مگر بی بی کو خزانوں کا لالچ بھی کب ہے بس تم لوگوں کی عقیدت میں رکھ لیتی ہیں جو بھی حدیہ دیتے ہو۔'' پیسے مٹھی میں دبائی اب صدیقہ بی بی وہاں موجود عورتوں کو مٹھائی بانٹتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

یوں اس دن کئی ایک اپنی مرادوں کے پوری ہونے کی خوشخبری سنانے آئی تھیں تو کئی آنکھوں میں آس کے دیپ جلائے بیٹھی تھیں۔

☆☆☆

''مام ڈیڈ میں نے کہا تھا انگوٹھی اس جنونی شخص کے منہ پہ ماریں اور رشتہ ختم کر دیں۔ مگر آپ لوگ ہیں کہ شادی کی تاریخ ٹھہرا آئے۔ آخر کیوں مجھے ضد دلا رہے ہیں آپ لوگ۔'' سیاہ لانگ شرٹ اور سیاہ ہی ٹراؤزر میں ملبوس زیب تن فن کرتی لاؤنج میں داخل ہوئی تھی اور ایک صوفے پہ بیٹھی اب بلاتردد بولے جا رہی تھی۔

''ڈیٹ ہم نے نہیں آپا نے فکس کی ہے۔ ہم تو یونہی ملنے گئے تھے بس، اور ضد بھی ہم نہیں تم کر رہی ہو وہ بھی بے جا۔'' زرتاشہ جو لاؤنج کے دیبز صوفے میں دھنسی چینل سرچنگ میں مصروف تھیں۔ اس کی بات کو قابل اعتنا جانے بنا سرسری انداز میں جواب دیا۔

''ڈیڈ جب میں نے کہہ دیا کہ مجھے ہائر اسٹڈیز کے لیے بیرون ملک جانا ہے تو بس جانا ہے پھر آپ نے یہ شادی کی ڈیٹ فکس کیسے ہونے دی۔'' وہ اب برف جیسے لہجے میں

زرتاشہ کے مقابل صوفے پہ بیٹھے فاروق صاحب سے مخاطب تھی۔ فاروق صاحب دل ہی دل میں اپنے لاڈ پیار پہ پچھتا رہے تھے۔ یہ ان کے لاڈ پیار کا ہی تو نتیجہ تھا۔

''اب کچھ نہیں ہوسکتا زیب! آپا نے بہت محبت سے ڈیٹ فکس کی ہے۔ اب تم یہ ہائیر اسٹڈیز شادی کے بعد ہی کمپلیٹ کرنا۔ اچھی بات ہے کہ کاشان تمہارے ساتھ ہوگا تو ہم بھی بے فکر رہیں گے۔'' فاروق نے اسے رسان سے سمجھایا تھا کہ وہ جانتے تھے کہ ضد میں ان کی بیٹی ان سے دو ہاتھ آگے تھی۔

''آپ لوگ مجھے ضد دلا رہے ہیں اور ضد اچھی نہیں ہوتی۔ ضد میں انسان اپنا ہی نقصان کر لیتا ہے اور وہ بھی بہت بڑا نقصان۔'' اس کے انداز میں ناچتی وحشت نے گویا فاروق کے دل میں کرنٹ دوڑا دی تھی۔

''ہماری بات مان لو بیٹا ہم تمہارے دشمن نہیں ہیں۔ ذرا سوچو ایک مدت بعد ہمارے گھر میں خوشیاں رقص کریں گی۔ فرحین آپا کا بھی کاشان اکلوتا بیٹا ہے وہ بھی کتنا خوش ہوں گی۔'' زرتاشہ نے بھی اسے نرم لہجے میں پچکارا تو اس کی آنکھیں عالم جنون میں چمکنے لگیں۔

''ہاں کتنا مزہ آئے گا نا جب دونوں گھروں میں شادی کے ہنگامے اپنے عروج پہ پہنچیں گے پھر شادی کا دن آئے گا آپ اور ڈیڈی ویل ڈیکوریٹڈ ہال میں برات کا استقبال کریں گے بھی شور مچے گا کہ دلہن کہیں ہے ہی نہیں، پھر مہمان چہ میگوئیاں کریں گے کہ دلہن بھاگ گئی کتنا مزہ آئے گا نا۔ واقعی آپ کی ضد کی یہ ہی سزا ہونی چاہیے۔'' ہذیانی انداز میں قہقہہ لگاتی اب وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ سیرت نے اک ناراض نظر اس پہ ڈالی اور زیر لب اس سے مخاطب ہوئی۔

''زیب! رشتوں کی قدر کرنا سیکھو پگلی۔ محبت اور پرواہ کرنے والے رشتے دوبارہ نہیں ملتے۔'' سیرت کی بات پر اس کے قدم تھمے تھے۔

''تمہیں کبوتر کی مانند ہر سچ سے نظر چرانے سے فرصت ملے تو سوچنا، کیا تمہارے رشتے تم سے مخلص ہیں۔ کہیں وہ محبت کے نام پہ تمہاری خوشیاں ڈس تو نہیں رہے۔ یاد رکھنا ظلم پہ خاموش رہنے والا بھی ظالموں میں شمار ہوتا ہے۔'' کمرے کا دروازہ دھڑ سے بند کرتی وہ اسے آئینہ دکھا گئی تھی۔ سیرت کو لگا اب وہ زیب سے کبھی بات نہیں کر پائے گی۔ مگر سیرت کو زیب سے محبت بھی تو تھی۔

فاروق صاحب کو لگا وسیع و عریض لاؤنج گھٹن سے بھر گیا تھا۔ وہ بے اختیار اٹھ کے باہر کی جانب بڑھے۔ اپنی سوچوں کے گرداب میں پھنسی زرتاشہ نے ان کا یوں اٹھ کے جانا محسوس ہی نہیں کیا۔

رات کے بارہ بج رہے تھے۔ عشاء کی نماز کے بعد معمول کے وظائف اور کچھ دوسرے کام کرنے کے بعد سیرت سونے کے لیے لیٹی تو یکلخت پیاس نے جیسے اس کے حلق میں کانٹے اگا دیئے۔ اس نے سائیڈ ٹیبل پہ دیکھا شیشے کا جگ خالی تھا۔ وہ بے دلی سے لیٹی چھت کو گھورتی رہی۔

☆☆☆

گاؤں کے اندر داخل ہوتے ہی ان کی حویلی کے فلک بوس برج نمایاں ہونے لگتے تھے۔ یوں جیسے بادلوں میں مدغم ان سے راز و نیاز میں مگن ہوں۔ حویلی میں ان گنت کمرے تھے اور لوگ گنے چنے۔ ارقم حسین نے اپنے ایک دوست کی شادی میں اسے دیکھا تھا۔ سادگی خوبصورتی اور نزاکت کا پیکر سیرت اسے بھا گئی تھی۔ اس نے قدرے جھجکتے ہوئے سید عظمت حسین شاہ کے سامنے اپنی خواہش رکھ دی۔ عظمت صاحب چونکہ انسانیت اور اخلاق کو ذات برادری پہ فوقیت دینے والے انسان تھے سو اگلے ہی دن سیرت کے گھر پہنچ گئے جو کہ دلہن کی عزیز دوست تھی، پھر وہ شادی کی تاریخ لے کر ہی اٹھے۔ سیرت کی ماں کو چونکہ کینسر تھا سو انہوں نے بھی دیر کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

یوں وہ بیاہ کے سیدوں کی حویلی آ گئی۔ جہاں عظمت اور ارقم کے علاوہ صدیقہ چچی اور جمال چچا بھی رہتے تھے۔ گو یہ دونوں حویلی کے ملازموں میں سے تھے مگر ارقم نے چونکہ بچپن میں ہی اپنی ماں کو کھونے کے بعد صدیقہ چچی کی گود میں پرورش پائی تھی۔ سو وہ صدیقہ کو اماں ہی بلاتا تھا، پھر شادی کے کچھ عرصے بعد ہی ماں کے انتقال کی خبر سیرت پہ گویا بجلی بن کے ٹوٹی۔ اس کی ماں کا اس کے سوا تھا ہی کون اس کے ماں باپ کی پسند کی شادی تھی۔ اس کے بابا طلحہ احمد تو تھے ہی اکلوتے مگر اس کی والدہ کوثر بیگم کے والد اور بھائی ان کی پسند کی شادی کے جرم میں ان سے ملنا ترک کر چکے تھے۔ سیرت نے آنسوؤں کا غسل دے کر ماں کو رخصت کیا پھر کئی دنوں ان کی یاد میں تڑپتی رہی۔ ان ہی دنوں صدیقہ اور جمال نے گویا ماں باپ بن کر اسے ہتھیلی کا چھالا بنا لیا۔ وہ بھی انہیں اماں اور بابا کہنے لگی۔

اس کا دل ان دنوں کسی بھی طور بہلتا ہی نہیں تھا۔ تب

ہی اس نے زیادہ تر وقت عظمت صاحب کے ساتھ گزارنا شروع کر دیا۔ ان کے بتائے ہوئے وظائف ذہن نشین کرتی۔ ورد ختم کرتے ہی اپنے اندر سکون کو اترتا محسوس کرتی تھی۔ اس کے بے حد عزیز سسر بھی اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ارقم کی دستار بندی کر دی گئی تھی۔ تب ہی اللہ نے اسے سید اسد حسین کی صورت اولاد کی نعمت سے نوازا، مگر کون جانتا تھا کہ یہ خوشی دیکھنا ارقم حسین کے نصیب میں نہیں۔ ارقم کا ایکسیڈنٹ میں انتقال ہو گیا تھا۔ ارقم کے جاتے ہی اس کی دنیا گویا رنگوں سے اور دل خوشیوں سے خالی ہو گیا تھا۔ اماں صدیقہ نے بصد اسرار اسے ارقم کی جگہ گدی نشین بنایا تھا۔ اسے بھی سکونِ دل کی خاطر یہ راستہ سب سے اچھا لگا۔ یوں وہ عام سی عورت سے سیدہ بی بی بن گئی۔

☆☆☆

ابھی بھی ان ہی تکلیف دہ سوچوں کو جھٹکتی وہ خالی جگ لیے سہج سہج سیڑھیاں اترتی لاؤنج سے گزر کے کچن میں جانے لگی تھی کہ صدیقہ کی آواز پہ لاؤنج کے دروازے پہ ہی رک گئی۔

''عظمت شاہ سائیں کی بھاوج سیدہ حفصہ آج اپنے بیٹے گوہر شاہ کا رشتہ لائی تھیں اپنی سیرت کے لیے۔'' اماں صدیقہ کی آواز سرگوشی میں ڈھلی تھی۔ سیرت کے ہاتھ میں جگ لرزا۔ وہ ارقم کی جگہ کسی اور کو نہیں دے سکتی تھی۔

''وہ تو دو بچوں کا باپ ہے پچھلے دنوں ہی تو بیوی مری ہے اس کی۔ ویسے بھی تم تو جانتی ہو ہم سیرت کی شادی کسی صورت نہیں کر سکتے۔'' حقہ گڑگڑاتے جمال احمد کے پہلے جملے پہ گہری پُرسکون سانس خارج کرتی سیرت اس کے جملے پہ الجھ سی گئی۔

''ہاں میں جانتی ہوں اسی لیے میں نے یہ کہہ کے انکار کر دیا کہ سیرت شادی کرنا ہی نہیں چاہتی۔ تجھے تو میں نے کہا تھا کہ تو خود گدی سنبھال لے، سیرت کی تو بھی نہ کبھی شادی ہو جائے گی پھر سارے مریدین کہاں جائیں گے۔ ہمارا تو سمجھو رزق کا سلسلہ ہی ٹھپ ہو کے رہ جائے گا۔'' سیرت کو لگا ساتوں آسمان اس کے اوپر آ گرے ہیں اور وہ زمین میں دھنستی جا رہی ہے۔ صدیقہ کے منہ سے ایسے الفاظ کی اس نے کبھی توقع نہیں کی تھی۔

''ارے ایسا تب ہوگا جب میں ہونے دوں گا۔ سیرت کی شادی کی تو سمجھو سونے کی چڑیا خود اڑا دی... اور بھلا میں کیسے گدی سنبھال سکتا تھا۔ گاؤں والے جاہلوں کے دلوں میں

## ملا محمود فاروقی

1652_1585ء

ملا محمود بن محمد بن شاہ محمد جونپوری۔ ہندوستان کے ایک عظیم عالم اور منطقی۔ ابتدائی تعلیم اپنے دادا اور اس کے بعد استاذ الملک محمد افضل جونپوری سے حاصل کی۔ سترہ سال کی عمر میں منطق اور فلسفے کی تکمیل کی۔ جب ان کی شہرت شاہجہان بادشاہ تک پہنچی تو بادشاہ نے انہیں آگرے میں طلب کیا اور اپنے وزیر اعلیٰ سعد اللہ خان کو حکم دیا کہ ان کے شہر پہنچنے پر ان کا شاندار استقبال کیا جائے۔ بالآخر انہیں درباری علماء میں شامل کر لیا گیا اور سہ صدی کے منصب سے نوازا گیا۔ وہ مصاحب کی حیثیت سے سفر میں شہنشاہ کے ساتھ رہے۔ لاہور کے شاہی دورہ کے موقع پر ملا شاہ میر بدخشی نے انہیں سختی سے فہمائش کی کہ وہ دنیا داری میں بہت زیادہ الجھ گئے ہیں اور بادشاہ کی ملازمت ترک کرنے کی ہدایت کی۔ اس بات سے متاثر ہو کر ملا موصوف نے شاہی ملازمت سے علیحدگی اختیار کر لی اور اپنے گاؤں واپس جا کر تدریس کا کام شروع کر دیا۔ کچھ عرصہ بعد شاہجہان کے دوسرے بیٹے اورنگ زیب کے بنگال کے حاکم شاہ شجاع نے، جو ان سے فلسفے اور منطق کی کتابیں پڑھتا رہا تھا، انہیں ڈھاکا بلا لیا۔ فلسفے اور علم البلاغت پر ایک عظیم سند کی حیثیت سے انہیں بلند عالم مانا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اپنے منہ سے کبھی کوئی ایسا کلمہ نہیں کہا جسے بعد میں واپس لینا پڑا ہو، اور نہ کبھی کسی حلفیہ بیان کی تردید کی۔ شاہ عبدالعزیز دہلوی نے ان کا شمار قدیم شیعی فقہا میں کیا ہے۔ جونپور میں ان کا مقبرہ اب بھی موجود ہے۔ ملا صاحب کی تصانیف یہ ہیں۔ 1۔ الشمس البازغۃ۔ 2۔ الفرائد فی شرح الفوائد۔ 3۔ الفرائد الحمودیہ۔ 4۔ حاشیہ علی الآداب الباقیہ۔

مرسلہ: نوازش علی، کراچی

بس اک ہی بات گڑی ہے کہ فیض صرف سید زادے ہی دے سکتے ہیں۔ بہر حال تو فکر مت کر میں سیرت کو کہیں نہیں جانے دوں گا۔ وہ چلی گئی تو بڑا نقصان ہوگا۔ جو مریدین اپنی مرادوں کے پورا ہونے پہ کبھی ہزاروں اور کبھی لاکھوں کا نذرانہ دیتے ہیں وہ دربار پہ حاضری پر پانچ دس ہی گلے میں ڈالا کریں گے۔'' جمال کی آواز پہ گویا سیرت کے قدموں سے زمین بھی کھسکی تھی۔ یہ وہ شخص تھا جس نے کافی عرصے سے اسے باپ کی کمی محسوس نہیں ہونے دی تھی۔

''وہ تو تم ٹھیک کہتے ہو سیرت کی شادی کر دی تو جو ہزاروں لاکھوں کی مدد ہم اپنی پانچوں شادی شدہ بیٹیوں کی کرتے ہیں وہ کیسے کریں گے۔ کاش جمال ہمارا بھی کوئی بیٹا ہوتا ہمیں یوں دوسروں کے در سے آس نہ لگانی پڑتی۔'' صدیقہ نے اس بار گلوگیر لہجے میں کہا۔

''ایسا کچھ نہیں ہوگا ہم ہونے ہی نہیں دیں گے، تسلی رکھو۔ اور اگر ہمارے نصیب میں بیٹا نہیں لکھا تب بھی کیا گلہ بھلا اس سے بہتر ہمارے لیے کوئی سوچ سکتا ہے۔'' جمال نے پھر مستحکم لہجے میں کہا اور پاس پڑے چھوٹے سے چمٹے سے حقے کی سرد پڑتی راکھ کو کریدا اور پھر حقہ گڑگڑانے لگا۔

''میں نے کہہ تو دیا تھا کہ سیرت شادی کرنا ہی نہیں چاہتی لیکن اگر حفصہ بی بی نے خود سیرت سے پوچھ لیا تب کیا کریں گے۔'' صدیقہ کے لہجے میں بولتے خدشات نے جمال کو سوچ کی اتھاہ گہرائیوں میں دھکیل دیا تھا۔

''تم سیرت کے دماغ میں یہ بات راسخ کر دو کہ ارقم سائیں کی گدی کو اس کی اشد ضرورت ہے، اور یہ بھی کہ مریدین میں فیض بانٹنا اس کا مقصد حیات ہے۔ اس کے علاوہ اس کی زندگی کسی کام کی نہیں۔ پھر رفتہ رفتہ اسے یہ بھی جتاتی رہنا کہ ایک بیٹے کی ماں اور ایک بیوہ زندگی کی خوشیوں کے لائق ہوتی ہی نہیں۔'' جمال بڑے ہی شاطرانہ انداز سے سیرت کے اندر سے زندگی کی رمق ہی ختم کر دینا چاہتا تھا سو اسی مناسبت سے صدیقہ کو مزید سمجھاتا رہا۔ صدیقہ کو بھی لگا کہ نفسیاتی وار ہی وہ واحد حربہ ہے جو ان کے سب مسائل کا حل ہے۔ سیرت کی برداشت جواب دے گئی تھی۔ وہ مردہ قدم اٹھاتی اپنے کمرے میں آ گئی، پھر باقی رات اس نے نام نہاد رشتوں کی بے حسی پہ ماتم کناں ہوتے ہوئے آنکھوں میں کاٹی۔ وہ چچا چچی سے گلہ کرتی بھی تو کیا وہ تو خود بیٹے کی نعمت سے محروم، مستقبل سے ڈرے ہوئے مجبور لوگ تھے۔ اس نے سب معاملات اللہ کے سپرد کیے اور تہجد کے وقت خدائے واحد کی طرف سے آنے والی پکار پہ لبیک کہتی اٹھ کے وضو کرنے چلی گئی۔

☆☆☆

آج پھر حجرہ گاؤں کے لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ اب تو آستانہ شیر ولی کی شہرت شہر تک پہنچ چکی تھی۔ شیر ولی ارقم حسین کے دادا تھے جن کی وفات پہ عظمت شاہ نے باقاعدہ ان کا دربار بنایا تھا۔ تمام دن مریدین کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ ان کے ہاتھ میں فیض بھی بہت تھا جو ان کے مرنے کے بعد بھی لوگوں کو ان کے دربار پہ منتیں ماننے سے ملتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ سید شیر ولی کی وفات کے بعد سید عظمت شیر کو گدی کا وارث ٹھہرا کے ان کی دستار بندی کر دی گئی۔ یہاں آنے والے اکثر لوگ شفا پاتے تھے۔ کیونکہ سیدوں کی دعا رب بھی مشکل سے رد کرتا ہے۔ سید عظمت حسین اور سید ارقم حسین کی ناگہانی موت کے بعد صدیقہ اور جمال نے بصد احترام سیرت کو اس خاندانی گدی کا وارث ٹھہرا دیا۔ وہ بھی ان دنوں بے دلی سے زندگی جیسا بوجھ گھسیٹ رہی تھی بخوشی لوگوں کی دادرسی کی اپنی سی کوشش کرنے لگی۔ اس کا زیادہ تر وقت مختلف وظائف پڑھنے اور دوسروں کی حاجات کی خاطر گریہ و زاری میں گزرتا۔ اسد صدیقہ کی گود میں کھیلتا رہتا۔ زندگی بمشکل کسی ڈگر پہ آنے لگی تھی کہ اس رات اس نے اپنے مخلص رشتوں کے بھیانک چہرے دیکھ لیے۔ منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکالنے کے باوجود اب ہر کام میں وہ پہلے جیسی دلچسپی مفقود ہو گئی تھی۔ یہ ہی آج ہوا۔

''بی بی! دعا کر میری بیٹی کو اللہ اولاد جیسی نعمت سے نواز دے کئی سال ہو گئے شادی کو، دعا کر اس کے سونے آنگن میں بہار آئے۔'' ملتجی انداز میں کہتی نسیمہ نے ان کے پیروں کو ہاتھ لگایا۔ اس کا سکتہ ٹوٹ گیا۔ اس کی آنکھوں میں یکلخت قہر جھلکا تھا۔

''کیا کر رہی ہے یہ۔ کیا تجھے دعا کرنا نہیں آتا چل میں سکھاتی ہوں۔ دیکھ ایسے کرتے ہیں دعا۔ تو کیا سمجھتی ہے ساتویں آسمان پہ بیٹھا رب صرف میرا رب ہے، وہ تو تجھ سے بھی ستر ماؤں سے زیادہ محبت کرتا ہے۔ کبھی سجدوں میں گڑگڑا کے کچھ مانگ کے دیکھ تو پتا چلے۔'' جنون کے عالم میں نسیمہ کے دونوں ہاتھ دعائیہ انداز میں جوڑ کے وہ سرد لہجے میں کہتی چلی گئی۔ حجرے میں موجود سب عورتیں ہکا بکا اسے دیکھتی رہیں، جبکہ تخت کے ساتھ ہی کھڑی صدیقہ انگشت بدنداں رہ گئی۔

''کیا دیکھ رہی ہو تم لوگ مجھے۔ کیا غلط کہا میں نے، جتنی شدت سے تم لوگ خود اپنے لیے مانگ سکتی ہو کیا کوئی دوسرا مانگ سکتا ہے۔ اندھے اعتقاد کی انگلی تھامے یہاں آنے کی بجائے جاء نماز بچھا کے گڑگڑا کے رب کے حضور اپنی درخواست کیوں نہیں رکھتیں۔ وہ تو کہتا ہے گریہ وزاری سے مجھ سے مانگو میرے پاس سب خزانے تمہارے لیے ہیں پھر کیوں خدا سے نہیں مانگتے بلکہ مجھ جیسی عام سی انسان کے در پہ چلے آتے ہو۔'' نذیانی انداز میں چیختے ہوئے وہ اب اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''بی بی! طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری۔ چلو اٹھو تم سب، آج بی بی آرام کریں گی۔ جاؤ سب اپنے اپنے گھر۔'' مصنوعی فکرمندی سے اس کا ہاتھ تھامتی صدیقہ نے اب کے مڑ کے عورتوں کو جانے کے لیے کہا تھا۔

''کیوں کیا ہوا میری طبیعت کو، سچ سنا نہیں جاتا آپ سے۔ یا آپ کے کاروبار میں گھاٹا پڑتا ہے۔ کہہ دیں ان سے آئندہ آس کا دامن پھیلائے کوئی یہاں نہ آئے کہ میں تو خود بے بس ہوں۔'' طنزیہ انداز میں کہتی سیرت نے ان کا ہاتھ بری طرح جھٹکا اور بپھرے ہوئے انداز میں انہیں کبھی نہ آنے کا کہتی حجرے سے نکل گئی۔

بھل کے سب کہہ دینے کے باوجود وہ جانتی تھی کہ اندھی عقیدت رکھنے والی گاؤں کی عورتیں کل پھر حجرے کا رخ کریں گی۔ خدا سے دوری اور خواہشات کے انبار روح میں یونہی ناآسودگی بو دیتے ہیں۔ انسان خود اپنے اندر بدرجہ اتم موجود برائیوں سے جہاد کر کے رب کی نظر میں عزیز بننے کی بجائے اپنی ناآسودہ خواہشات لیے شارٹ کٹ کی شکل میں اللہ کے نیک بندے ڈھونڈ کے ان کے سپرد اپنی خواہشات کر کے سکھ محسوس کرتا ہے۔

رات حویلی کے آنگن میں درد کی اوڑھنی اوڑھے دبے پاؤں اتری تھی۔ آج سیرت کی بے چینی حد سے سوا تھی۔ صدیقہ بھی صبح کے واقعے کی وجہ سے اس سے کچھ ناراض تھی سو اسد کو چھنو کے ہاتھ اس کے کمرے میں بھجوا دیا۔ چھ ماہ کا گل گوتھنا سا اسد کچھ دیر کھیلنے کے بعد ہی اس کی گود میں پرسکون ہو کے سو گیا تھا۔

بے چینی حد سے سوا تھی اس نے سوئے ہوئے اسد کو اٹھایا ایک ہاتھ سے اس کی چیزوں کا مخصوص بیگ تھاما اور حجرے میں آ گئی۔ یہ حویلی کا وہ گوشہ تھا جہاں آ کے جیسے سب پریشانیاں قدرے کم ہو جاتی تھیں۔ اسد کو تخت پہ لٹاتی وہ ملحقہ واش روم میں گھس گئی۔ کچھ دیر میں ہی اس نے عشاء کی نماز ادا کی اور اپنے دل کے سکون کے لیے وظائف کرنے لگی۔

☆☆☆

ملک فاروق کو ہارٹ اٹیک آیا تھا جس پہ دہل کر زیب نے نہ صرف معافی مانگی بلکہ اسی ڈیٹ پہ شادی کے لیے بھی تیار ہو گئی۔ کیونکہ وہ اپنے باپ سے بہت محبت کرتی تھی۔ ملک فاروق چونکہ ملک کے نامور سیاست دان تھے سو اس شادی کو بڑے بڑے نیوز چینلز کی کوریج ملنے والی تھی۔ شادی میں بچے پندرہ دن اس نے کمرا بند ہو کے گزارے تھے۔ حتیٰ کہ اس کی شادی کی سب شاپنگ بھی زرتاشہ نے خود کی تھی۔ ان کے ہزار سمجھانے پہ بھی اس کا ایک ہی جواب تھا۔

''آپ لوگ شکر کریں کہ میں شادی کے لیے راضی ہو گئی ہوں۔ جب میری زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ خود کر رہے ہیں تو پھر شاپنگ بھی خود کر لیں۔'' زہرخند لہجے میں کہتی زیب اٹھ کے جانے لگی تو زرتاشہ نے روک لیا۔ اس وقت وہ تینوں لاؤنج میں چائے پی رہے تھے۔

''بیٹا! اگر تم کسی اور کو پسند کرتی ہو تو ہمیں بتا سکتی ہو ہم تمہیں ہر فیصلے کا حق دیں گے۔'' زرتاشہ نے قدرے جھجکتے ہوئے اس خدشے کی بابت دریافت کیا جو کافی مدت سے ان کے دل میں سر اٹھا رہا تھا۔

''ماما! میں سوچتی تھی کہ آپ مجھے سمجھنا ہی نہیں چاہتیں۔ یہ تو میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ آپ مجھے اتنا برا سمجھتی ہیں۔'' بے یقینی سے کہتی وہ لاؤنج سے نکلتی چلی گئی۔ زرتاشہ سر تھام کے رہ گئیں۔

''فکر مت کرو وہ کچھ جذباتی اور جلد باز ہے۔ دیکھنا وقت کے ساتھ ساتھ سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' فاروق نے جیسے ان سے زیادہ خود کو تسلی دی تھی۔

پھر شادی کا دن بھی آ گیا جس کے انتظار میں کاشان نے دن گن گن کے گزارے تھے کہ بہرحال وہ زیب کو بہت چاہتا تھا اور اس کی ہزار زبان درازیوں کے باوجود اس سے حد سے زیادہ مخلص تھا۔ نکاح کی تقریب بخیر و خوبی انجام پائی تھی۔ ویل ڈیکوریٹڈ ہال میں اس وقت شہر کی کریم جمع تھی یوں جیسے ملک فاروق نے پورے ملک کی اہم شخصیات کو جمع کر لیا تھا۔ بلیک ڈنر سوٹ میں ملبوس وجیہ سا کاشان اس وقت فوٹو سیشن کے دوران بار بار مسکرا رہا تھا۔

''ہنس لو کاشان حیدر! شاید یہ لمحات تمہاری خوشی کے آخری لمحات ثابت ہوں۔ کیونکہ آج کے بعد تمہاری زندگی

اجیرن کر کے تمہیں ناکوں چنے نہ چبوا دیئے تو میرا نام زیب فاروق نہیں۔'' کاہی رنگ کے بیش قیمت ڈیزائنر لہنگے میں ملبوس زیب نے گویا اس کے کان میں صور پھونکا تھا۔ اس کی مسکراہٹ یک لخت سمٹی تھی۔

''جو رشتوں کی قدر نہیں کرتے نا آخر وہ رشتوں کو کھو دیتے ہیں۔ زیب فاروق! رشتوں کی قدر کروایسا نہ ہو کہ وہ تم سے چھین لیے جائیں۔'' مختصر جواب دیتا وہ کیمرا مین کی ہدایت پہ عمل کرتے ہوئے مختلف پوز بنانے لگا۔ زیب بھنا کے رہ گئی۔

☆☆☆

لکھتے لکھتے سیرت کی کمر تختہ ہو رہی تھی اس نے رائٹنگ چیئر سے ٹیک لگا لی۔ وہ جب بھی حد سے زیادہ بے چین ہوتی اپنے کرداروں میں گم ہو کے ارد گرد سے بے نیاز ہو جاتی۔ گو اس نے کبھی کوئی تحریر پبلش نہیں کروائی تھی پھر بھی وہ اپنی اس دنیا میں خوش تھی۔ اسد تخت پہ بے خبر سو رہا تھا۔

یکلخت تاروں کے جلنے اور دھوئیں کی ناگوار بو اس کے نتھنوں میں گھسی تو وہ حواس باختہ ہو کے باہر کی طرف بھاگی۔ حویلی کے پچھلے حصے میں شارٹ سرکٹ ہوا تھا شاید۔ آگ کے شعلے بڑھتے جا رہے تھے۔ یکلخت اٹھنے والی دل دوز چیخوں سے حویلی کے کونے کونے در و دیوار گونج رہے تھے۔

''بی بی! جلدی سے اسد بیٹا کو لے لو اس سے پہلے کہ آگ ساری حویلی کو اپنی لپیٹ میں لے ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔'' چھنو اسے حجرے کی طرف دھکیلتی سرونٹ کوارٹر میں گھس گئی۔ سیرت اسد کو اٹھائے جیسے ہی حجرے سے نکلی چھنو ایک ہاتھ میں گٹھڑی تھامے اس کی طرف لپکی اور اسے گھسیٹتی حویلی سے باہر بھاگی۔ وہ ابھی کچھ دور ہی بھاگے تھے کہ حویلی سے اٹھتے شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے پوری حویلی سوکھی لکڑی کی طرح بھڑ بھڑ جل رہی تھی۔ یکلخت حویلی کی چھت پہ سیرت کو کاہی کلر کے لہنگے میں لپٹی زیب کا گمان ہوا۔ وہ چھنو سے ہاتھ چھڑا کے اسد اسے تھمائی مڑ کے حویلی کی طرف بھاگی تھی۔ اس پہ بس ایک ہی دھن سوار تھی کہ زیب اندر ہے۔

''کیا پاگل ہو گئی ہو سیرت! ادھر کہاں جا رہی ہو وہاں بس آگ ہی آگ ہے ....'' چھنو نے پہلی بار غیض کے عالم میں اسے نام سے پکارا اور ہاتھ پکڑ کے اپنی طرف کھینچا۔ وہ سیرت سے چند سال بڑی تھی۔

''وہ..... وہ زیب ہے اندر مجھے اسے بچانا ہوگا۔'' بدحواسی سے کہتی ہاتھ چھڑانے لگی۔

''کون زیب بی بی اندر کوئی زیب نہیں ہے کیوں موت کے منہ میں جانا چاہتی ہو چلو یہاں سے۔ کچھ اسد کے بارے میں ہی سوچو۔'' چھنو نے جیسے التجا کی تھی۔ اسے یکا یک احساس ہوا کہ بھلا چھنو کیا جانے کہ زیب کون ہے۔

''زیب میری تحریر کی ہیروئین چھنو اتنے عرصے وہ ہی تو تھی میرے دکھ سکھ کی ساتھی۔ میری رازدار سہیلی میں کیسے اسے یوں مرنے دوں۔'' عالم دیوانگی میں اس سے ہاتھ چھڑاتی وہ پھر حویلی کی طرف بھاگی، چھنو بھی سرعت سے اس کی طرف دوڑی تھی۔

''بند کرو یہ پاگل پن وہاں انسان جل کے خاکستر ہو گئے اور تمہیں اپنے کرداروں کی پڑی ہے۔ چلو تم میرے ساتھ تمہیں ارقم سائیں کی قسم۔'' چھنو کے قسم دینے پہ وہ مٹی کے بے جان پتلے کی طرح اس کے پیچھے گھسٹنے لگی۔ تب ہی عقب سے شناسا آواز پہ تھم گئی۔ ان ہی قدموں پہ پلٹی تو ساکت رہ گئی۔ حویلی کی چھت پہ کھڑا زیب کا ہیولا رفتہ رفتہ آگ کی بے رحم لپٹوں کا حصہ بن رہا تھا۔

''چلی جاؤ سیرت اور مڑ کے کبھی مت دیکھنا۔ ہزاروں سالوں سے یہ روایت رہی ہے کہ مصنف خود مر کے اپنے کرداروں کو امر کر جاتے ہیں لیکن جاؤ آج میں خود امر ہو کے تمہیں حیات نو بخشتی ہوں۔ اگر تم چاہتی ہو کہ تمہاری زیب کو حیات جاوداں ملے تو دوبارہ کبھی مجھے مت لکھنا۔ کبھی بھی ماضی کو مڑ کے مت دیکھنا کہ اس بھیانک ماضی نے تمہیں مجھ جیسے شدت پسند کردار کو لکھنے پہ مجبور کیا۔ جاؤ عام انسانوں کی طرح آزاد زندگی جیو کہ قید و بند ذہنی ہو یا جسمانی شدت پسندی کو جنم دیتی ہے۔ اور ہاں اپنی کتاب کے انتساب میں میرا نام لکھنا مت بھولنا کہ میں نے خود امر ہو کے تمہیں حیات نو بخشی۔'' زیب کی سرگوشی میں ڈھلتی آواز خنک ہوا کے دوش پہ سرسراتی سیرت کے دل میں سرائیت کر رہی تھی۔

''میں وعدہ کرتی ہوں زیب! میری ہر کتاب کا انتساب تمہارے نام لکھوں گی۔ میں تمہیں ایسی حیات جاوداں بخشوں گی کہ میرے بعد بھی میرے لفظوں میں تم سانس لو گی۔ میری تم سے محبت ہر حساس دل محسوس کرے گا۔ کیونکہ تم میرا جاوداں کردار ہو تم نے مر کے مجھے حیات نو بخشی۔ سن لو میرے ہر لفظ میں تمہاری گونج ہو گی۔'' سیرت پلٹ کے بھاگی تھی۔ اچنبھے سے اس کے الفاظ سنتی چھنو بھی اس کے تعاقب میں بھاگی تھی۔

++

# گناہ کا ڈول

جناب مدیر اعلیٰ
السلام علیکم!
ایک سچ بیتی ارسال کررہی ہوں۔ اسے کہانی کا انداز دے تو دیا ہے لیکن قارئین کا پتا نہیں انہیں پسند آتی ہے یا نہیں۔ ویسے اُمید قوی ہے کہ سچ کڑوا ضرور ہوتا ہے مگر دلچسپ ہوتا ہے سبق بھرا ہوتا ہے کیونکہ گناہ کا ڈول ایک دن بھرتا ضرور ہے
افسانہ آفتاب
(کراچی)

دروازے پر ہوتی مسلسل بیل کو نظرانداز کرتی، وہ اپنی واجبی چہرے پہ ڈھیر ساری کریم ملنے میں مگن تھی۔ بیل کی آواز سے اسے بے حد خوشی محسوس ہورہی تھی۔ اسے باہر کھڑے شخص کو ستانے میں مزہ آرہا تھا۔ باہر کھڑے شخص کی بے چینی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے وہ تیزی سے ہاتھ چلانے لگی۔ چہرے کو ٹاول سے خشک کرنے کے بعد وہ بے زاری سے گیٹ کی جانب چل پڑی۔ اس کے چہرے پر دنیا جہان کی اکتاہٹ صاف ظاہر تھی۔ مگر اسے پرواہ کس کی تھی۔ گیٹ کھول کر باہر کھڑے شخص پر نظر ڈالے بغیر وہ کچن کی طرف بڑھ گئی۔

''ماریہ میں دس منٹ سے باہر کھڑا ہوں اور تم اب دروازہ کھول رہی ہو؟'' وجاہت نے اس سے کہا۔ ''آپ چابی لے کر کیوں نہیں گئے۔ غلطی میری نہیں آپ کی ہے۔ صبح سے طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ آنکھ لگ گئی تھی میری۔'' اس

نے کہا۔

''اچھا۔'' اس نے ہاتھ میں تھامے بھاری بھرکم شاپر کو کچن کاؤنٹر پر رکھتے ہوئے کہا۔

وہ کچن کے سامنے ہی رکھی کرسی پر بیٹھ کر سامنے پڑے شاپر کا جائزہ لینے لگی۔ وجاہت کولر سے گلاس میں پانی لے کر اس کے برابر ہی بیٹھ گیا اور پانی پینے لگا۔ ماریہ کو اسے دیکھ کر جتنی کوفت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ پھلوں کے شاپر کو دیکھ کر اس کے جسم میں جان آگئی تھی۔

''جاؤ عبایا پہن کر آؤ، میں تمہیں ڈاکٹر کے پاس لیے چلتا ہوں۔'' اس نے گلاس کولر پر رکھتے ہوئے پریشانی سے کہا۔

''نہیں میں نے میڈیسن لے لی ہے۔ اب بہتر ہوں۔ چکن بنالیتی ہوں جلدی بن جائے گی۔'' خود کلامی کرتے ہوئے وہ اٹھنے لگی۔ اس کی قربت سے اسے اب وحشت سی ہونے لگی تھی۔

''رہنے دو مت پکاؤ میں باہر سے بریانی لے آتا ہوں۔ تم آرام کرو، چکن کل بنالینا ویسے بھی کل سعادت اور بھابی کھانا ہماری طرف کھائیں گے۔''

وہ کہتے ہی باہر کی جانب نکل پڑا۔ یہ دیکھے بغیر کہ ماریہ کے چہرے پر کیسے قوس قزح کے رنگ بکھر گئے تھے۔ اس کے لب مسکرا اٹھے۔ وہ کل کے لیے ہی تو خود کو تیار کررہی تھی۔ کل اس کے خوابوں کا شہزادہ اس کے گھر کو رونق بخشنے والا تھا۔ وہ کیوں خوش نہ ہوتی؟ جس طرح سعادت نے اسے تیار ہونے کے لیے کہا تھا۔ اسے بالکل اسی طرح ہی تیار ہونا تھا۔ وہ کل کے لیے کپڑے پریس کرنے چل پڑی۔ ماریہ نے سعادی میں دلچسپی لینا اپنی شادی سے ہی شروع کردیا تھا۔ وہ بے حد پُرکشش شخصیت کا مالک تھا اور گفتگو کے فن سے بھی بخوبی واقف تھا۔ وہ اپنی پوری شادی کے دوران وجاہت کو کم اور سعادی کو زیادہ فوکس کررہی تھی اور وہ خود بھی تو ماریہ کی گاہے بگاہے تعریف کررہا تھا۔ سعادی کے مقابلے میں وجاہت واجبی شکل وصورت کا حامل تھا۔ اسے سعادی کے مقابلے میں وجاہت بے حد بدصورت لگا کرتا تھا۔ یہیں سے اس شیطانی کھیل کا آغاز ہوگیا۔

☆☆☆

سعادی میں یہ پنک سوٹ پہن لوں یا یہ ریڈ والا پہنوں جلدی بتادیں میں کنفیوز ہورہی ہوں۔ مجھے سمجھ نہیں آرہی کہ کل کون سا سوٹ پہنوں؟ نغمہ نے موبائل میں لگے سعادت کو اپنے دونوں ہاتھوں میں ہینگر تھامے متوجہ کرنا چاہا تھا جو ایک کمرے میں ہوتے ہوئے بھی کہیں اور ہی موجود تھا۔ اس کی ساری توجہ اپنے فیس فون پر تھی۔ اس نے ایک اچٹتی سی نگاہ کپڑوں پہ ڈال کر دوبارہ سے موبائل گیم کھیلنے لگا۔ ''بتائیں نا۔'' اس نے اصرار کیا۔ ''تم بھی حد کرتی ہو یار کون سا ہم کسی بارات میں جارہے ہیں۔ جو تم یہ دلہنوں والا جوڑا نکال بیٹھی ہو۔ پہن لو کوئی لان، وان ذرا کمپل سا تیار ہونا، میک اپ بھی کم کرنا اور یہ جو تم بندروں کی طرح اپنے گال کو لال، پیلا کرتی ہو نا مجھے ذرا بھی پسند نہیں ہے۔ یہ تو وجاہت نے اصرار کیا تو میں نے ہامی بھرلی ورنہ میرا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ وہاں جانے کے لیے۔'' سعادت نے اس کی خوشی کو پل بھر میں غارت کردیا۔ وہ بجھے دل سمیت کپڑوں کو واپس رکھنے لگی۔ وہ اسے کہیں لے کر جاتا ہی نہیں تھا۔ وجاہت کے گھر جانے کی وجہ اس کا بیٹا روحان تھا۔ روحان اسے بے حد اچھا لگتا تھا۔ اس بچے میں لگاؤ کی وجہ اس لیے تھی کہ وہ پانچ سال بعد بھی بے اولاد تھی۔ وہ خاموشی سے آکر بیڈ کی دوسری جانب لیٹ گئی۔ وہ بے جا بحث کرنا نہیں چاہتی تھی اسے علم تھا اگر وہ کچھ کہے گی تو وہ اس کے خاندان کا شجرہ نکال بیٹھے گا۔ وہ اکثر وبیشتر ہی کیچڑ میں پتھر مارنے سے گریز کرتی تھی۔ وہ کروٹ لیے خاموشی سے آنسو بہاتے بہاتے نیند کی وادیوں میں اتر گئی۔ اس کے سوجانے کے بعد اس نے خاموشی سے اپنا موبائل ہاتھ میں تھاما اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ چھت کی سیڑھیوں کی جانب بڑھتے ہوئے ماریہ کو کال کرنے لگا۔ پہلی بیل پر ہی کال ریسیو ہوگئی۔ ''کیا مسئلہ ہے یار! میں کب سے تمہیں میسجز کررہا ہوں... اور تم ایک میسج کا بھی جواب نہیں دے رہی، تم جانتی ہو نا میں اب تمہاری دوری برداشت نہیں کرسکتا۔'' اس نے سیڑھی پر بیٹھتے ہوئے بے چینی سے کہا۔

''جانتی ہوں لیکن آپ کو ستانے میں مجھے مزہ آتا ہے۔ وجہی ابھی جگے تھے۔ نیوز سننے کی بڑی خطرناک بیماری ہے آپ کے دوست کو ورنہ جواب ضرور دیتی میں تو خود کب سے آپ کی آواز سننے کے لیے تڑپ رہی ہوں... مگر آپ کا دوست میری جان چھوڑیں تب نا، ڈھیر ساری خدمت کروا کر محترم کو سلا کر آپ سے گفتگو کرنے کا شرف ملا ہے۔ مابدولت کو۔'' اس نے نہایت ہی لگاوٹ سے کہا۔

''تمہاری ان ہی باتوں نے تو میرا سکون غارت کردیا ہے۔ جب تک تم سے بات نہ کرلوں سکون سے سو نہیں سکتا۔ کون سا

جادو کر دیا ہے یار تم نے مجھ پر۔ اب سے میں تمہیں میری کی بجائے ساحرہ کہا کروں گا۔'' اس نے بھی اپنے جذبات کو زبان بخشی۔ آگ دونوں جانب ہی برابر کی لگی ہوئی تھی۔ دونوں فریقین ہی ایک دوسرے کی محبت میں سرتا پیر ڈوب چکے تھے۔ ''ارے آپ نے مجھے اچھایا دولایا نیند کی میڈیسن کی آج آخری ڈوز دی ہے میں نے کل آتے ہوئے اگلے پندرہ دنوں کی خوراک دے جایئے گا تاکہ ہمارے قیمتی لمحات ان فضول لوگوں میں الجھ کر ضائع نہ ہو جائیں۔'' ماریہ نے اسے یاد دلانا ضروری سمجھا۔ روز رات کے کھانے کے بعد کی چائے میں وہ بلاناغہ وجاہت کو نیند کی دوائی باقاعدگی سے دے رہی تھی تاکہ اسے سعادت سے بات کرنے میں دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ دوسری طرف وہ خود بھی رات کی چائے خود بنایا کرتا تھا اور نغمہ کو بھی وہ باقاعدگی سے ڈوز دیا کرتا تھا۔ دونوں اپنے لائف پاٹنر کو بڑی ہی آسانی سے بے وقوف بناتے چلے آرہے تھے اور شومئی قسمت یہ تھی کہ اب تک کسی کو ذرا سی بھی بھنک نہیں پڑی تھی۔ وہ دونوں دنیا جہان کو فراموش کیے اپنے ہی راز و نیاز میں دلجمعی کے ساتھ مصروف ہوگئے۔ دونوں یہ بھول بیٹھے تھے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات سے ہم کچھ بھی پوشیدہ نہیں رکھ سکتے۔ وہ سب کچھ دیکھتا ہے، اور وہ دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

بھائی یہ کڑاہی تو لیں نا، آپ بلاوجہ تکلف برت رہے ہیں۔ آپ کو باہر کا کھانا پسند نہیں اس لیے میں نے کھانا گھر میں ہی پکوایا ہے۔'' وجاہت نے اسے محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے اس کی پلیٹ میں سالن ڈالتے ہوئے کہا۔

نغمہ خاموشی سے کھانا کھا رہی تھی۔ فطرتاً بھی وہ کم گو تھی لیکن سعادت کی رفاقت میں آنے کے بعد تو وہ گنے چنے الفاظ ہی بولتی تھی۔ ''یہ بے حد Oily ہے۔ مت ڈالو۔ کباب کی پلیٹ بڑھاؤ۔'' اس نے ناگواری سے کہتے ہوئے ایک کباب اپنی پلیٹ میں ڈالا۔ وہ بے حد شاطر طبیعت کا مالک تھا۔ وہ وجاہت کے سامنے بے حد سنبھل کر بات کیا کرتا تھا اور اپنی نظروں کو بھی کنٹرول میں رکھتا۔ وجاہت سے بے حد عقیدت و محبت کرتا تھا کیونکہ دونوں کے والدین حیات نہیں تھے۔ بہن بھی کوئی نہ تھی۔ وہ دوست کو بڑے بھائی جتنی عزت دیا کرتا تھا۔ حالانکہ کچھ لوگ عزت کے قابل نہیں ہوتے۔ ذلت کے لائق ہوتے ہیں۔ وہ اچھے نہیں ہوتے بلکہ اچھے اور نیک بننے کا ڈھونگ کر رہے ہوتے ہیں۔ ماریہ بھی بے حد ہوشیاری برت رہی تھی۔ وہ بظاہر نغمہ سے باتیں کرتے ہوئے روحان کو کھانا کھلا رہی تھی۔ مگر اس کی ساری حساسیت سعادت کی جانب ہی مائل تھی۔ ''بھابی، بھائی جان کو رس ملائی تو دیں اور آپ بھی ٹرائی کر کے بتائیں کیسا بنایا ہے میں نے؟'' اس نے دیکھا وجاہی اور نغمہ کی توجہ کھانے پر مرکوز ہے تو اس نے مسکراتے ہوئے اسے آنکھ مارتے ہوئے اپنا جملہ مکمل کیا۔ سعادی کی نظریں اس کے فٹنگ کو تکنے میں مگن تھیں۔ اس کی نظریں بار بار اس کے اردگرد اٹھ رہی تھیں۔ اس نے سعادی کا پسندیدہ رنگ پہنا تھا۔ اسے ڈارک لپ اسٹک پسند تھی اور اس نے اپنے بھرے بھرے ہونٹوں کو ریڈ لپ اسٹک سے رنگا تھا۔ وہ خود بھی تو اس کی نظریں صاف محسوس کر رہی تھی۔ وہ خود کو ہواؤں میں اڑتا ہوا محسوس کر رہی تھی۔ کچھ لوگ نہایت ہی کم ظرف واقع ہوتے ہیں جن کو نہ ہی اللہ کا خوف ہوتا ہے اور نہ ہی معاشرے کا اور نہ ہی قانون کا۔ ان ہی بے ضمیر لوگوں کی فہرست میں شمار ہوتا تھا سعادت اور ماریہ جیسے لوگوں کا۔ کھانے کے بعد چائے کا دور چلا اس کے بعد وہ لوگ گھر آگئے لیکن جہاں ذرا بھی موقع ہاتھ لگا۔ ان دونوں نے موقعے سے خوب فائدہ اٹھایا۔

☆☆☆

''کتنا بکواس کھانا بناتی ہو یار تم۔'' سعادی نے کھانے کا پہلا نوالہ منہ میں رکھتے ہوئے کمنٹ کیا۔

''میں نے ماریہ کی ریسیپی فالو کی ہے۔ صرف آئل تھوڑا کم رکھا ہے۔ کڑاہی تو آپ شوق سے کھاتے ہیں۔ اس لیے آپ کی پسند کو مدِنظر رکھ کر کڑاہی بنادی۔ اچھی نہیں لگی آپ کو؟'' اس نے سعادت مندی سے استفسار کیا جبکہ دل ڈر کے مارے بری طرح کانپ رہا تھا۔

''اچھی نہیں بنی تب ہی تو کہہ رہا ہوں اور سنو اپنے لیکچر اپنے کالج تک ہی محدود رکھا کرو۔ میں تمہارے لیکچرز سے امپریس ہونے والا نہیں ہوں۔'' وہ قریبی کالج میں لیکچرار تھی اسی باعث وہ اس کی قابلیت سے خائف ہو کر اسے اکثر طعنے دیا کرتا تھا۔ ''لے جاؤ اپنا بدمزہ کھانا نہیں کھاتا میں۔'' اس نے بدتمیزی سے کہتے ہوئے کھانا پرے کر دیا اور اٹھ کر کچن کی جانب بڑھ گیا۔ وہ چاہ رہا تھا کہ وہ جلد از جلد سو جائے۔ کل رات ماریہ سے بات نہیں ہو پائی تھی۔ وہ ویسے ہی کل رات سے کاٹ کھانے کو دوڑ رہا تھا۔

اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ ویسے بھی گناہ میں بے حد لذت ہے اگر انسان ایک بار گناہ کا مرتکب ہو جائے تو وہ انسان گناہ کے دلدل میں دھنستا ہی چلا جاتا ہے۔ جو لوگ اچھائی کی روش چھوڑ کر برائی کو اوڑھنا، بچھونا بنا لیتے ہیں۔ وہ برائی کی گہری اور اندھی کھائی میں گرتے ہی چلے جاتے ہیں۔ برائی کرنے والا شخص اتنی پستی میں چلا جاتا ہے جہاں سے واپسی کا سفر یقیناً ہی ناممکن ہو جاتا ہے لیکن انسان صاحب عقل ہوتے ہوئے سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے برائی اور بڑے سے بڑے گناہ کا ارتکاب خود کرتا ہے اور اپنے ضمیر کی آواز پر کان نہیں دھرتا۔ وہ اپنے اندر سے آتی آواز کو خود تھپک تھپک کر گہری نیند سلا دیتا ہے۔

☆☆☆

''سعادی! کیا کبھی ہم ایک ہو سکیں گے؟'' ماریہ نے اضطرابی حالت میں اس سے کہا۔ وہ لوگ شہر کے مہنگے ترین مال کے ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھے محو گفتگو تھے۔ ''فضول بکواس کر کے تم میرا سارا موڈ برباد کر دیتی ہو۔ اگر ایک ہونے سے تمہارا مطلب شادی ہے تو بی بی شادی شدہ ہم دونوں ہی ہیں... اور آپس میں ہماری شادی نہیں ہو سکتی۔ اگر تمہیں یہی باتیں کرنی ہیں تو میں چلتا ہوں۔'' اس نے لفظ چبا چبا کر ادا کیے اور گاڑی کی چابی ٹیبل سے اٹھا کر جانے لگا۔

ماریہ ایکدم سے بوکھلا گئی۔ ''آپ بیٹھیے آئم سوری۔'' اس نے جلدی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے واپس کرسی پر بٹھایا۔ اس کی ناراضگی اس کے لیے سوہان روح تھی۔ وہ اس کی خفگی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ یہ لوگ اکثر و بیشتر تنہائی میں ملاقاتیں بھی کیا کرتے تھے۔ وجہی سے شاپنگ کے بہانے اچھے خاصے پیسے لینے کے بعد، روحان کو اپنی قریبی سہیلی کے پاس چھوڑ کر وہ اس کی تنہائی کو رنگین کرنے چلی آئی۔ وجہی اس کی ہر چھوٹی بڑی خواہش کا بے حد احترام کیا کرتا تھا۔ اس نے بہانہ بنایا کہ وہ اپنی سہیلی کے ساتھ شاپنگ پر جائے گی۔ وجہی فطرتاً بے حد نفیس اور شریف طبیعت کا مالک تھا اور اپنی دوست (رابعہ) سے کہا کہ وجہی کے دوست کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے تو وہ لوگ اسپتال جا رہے ہیں۔ اسپتال میں ہزار طرح کے انفیکشن کے باعث وہ لوگ روحان کو ساتھ نہیں لے جا سکتے اس لیے وہ مجبوراً روحان کو اس کے پاس چھوڑنے آئی ہے۔ ماریہ کو شروع میں اس کھیل میں ڈر محسوس ہوا تھا لیکن سعادی کی ہمراہی میں وہ بے حد نڈر اور بے باک ہو گئی تھی۔ فطرتاً بھی وہ بے حد چالاک اور ہوشیار تھی۔ اب وہ اس کھیل کو بہ آسانی مزے سے کھیل رہی تھی۔ اسے خود بھی اب اس کھیل میں مزہ آنے لگا تھا۔ اسے یوں محسوس ہونے لگا کہ ساری دنیا بے حد بے وقوف ہے۔ صرف وہی دو لوگ عقلمند اور شاطر ہیں۔ اس کے لیے ایک طرف جان چھڑکنے والا بے وقوف شوہر تھا تو دوسری طرف تگڑا افیئر وہ دونوں جانب مزے کر رہی تھی اور بے حد آسانی سے وجہی کی آنکھوں میں دھول جھونک رہی تھی۔ اسے اپنی دنیا جنت لگا کرتی۔ اس کے پاس سب کچھ تھا۔ پیسا، معاشرے میں عزت، محبوب شوہر، عاشق، اگر کچھ نہیں تھا تو وہ صرف ضمیر تھا۔ ایسے بے ہودہ اور بدکردار لوگوں کا دل مردہ ہو چکا ہوتا ہے اور ضمیر مر جاتا ہے۔ ریفریشمنٹ کے بعد سعادی اسے مہنگے ترین ہوٹل لے کر جانے والا تھا وہ دونوں قیمتی لمحات کو مزید دلفریب اور یادگار بنایا کرتے تھے۔ جب انسان میں حیا باقی نہ رہے تو وہ جو چاہے کر سکتا ہے۔ دونوں نے حیا کا دامن چاک کر کے بے حیائی کا لباس زیب تن کر لیا تھا۔ حیا ان کی بے ہودگی اور بے حیائی دیکھ کر اپنا منہ چھپائے کسی کونے میں سسک رہی تھی۔

☆☆☆

''سعادی آپ مجھ سے شادی کر لیں۔ میں وجہی کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی میں اس سے خلع لے لوں گی۔'' اس نے کال پر بات کرتے ہوئے اتنی بڑی بات بے حد عام سے انداز میں کہی۔

''کیوں، وجہی نے کچھ کہا ہے تمہیں یا اسے شک ہو گیا ہے تم پر۔'' اس نے اضطراب کا شکار ہوتے ہوئے اپنی پیشانی کو مسلتے ہوئے استفسار کیا۔ ویسے بھی وہ آج کل بے حد الجھن کا شکار تھا۔ اس کا دوست اس کی بے حد عزت کرتا تھا۔ اگر اسے علم ہو جاتا تو وہ کیسے اس کا سامنا کر پائے گا۔ یہ سوچ کر وہ اکثر ہی بے چین ہو جایا کرتا تھا لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ وہ اب ماریہ کا عادی ہو گیا تھا۔

''نہیں! مجھے اس سے نفرت ہو گئی ہے۔ میں اس کے ساتھ محبت کا ناٹک کرتے کرتے تھک گئی ہوں۔'' اس نے بے زاری سے کہا۔

''کیا ہو گیا ہے یار تم پاگل ہو گئی ہو کیا ایک بات میں تمہیں کتنی مرتبہ سمجھاؤں۔ جب ہمارا کام شادی کے بغیر ہی چل رہا ہے تو کیوں خود کو اور مجھے ذلیل و خوار کروانا چاہتی ہو۔'' اس نے اسے سمجھاتے ہوئے ڈانٹا۔ ''پلیز آئندہ ایسی

فضول گوئی سے پرہیز کرنا۔ ایسی بے مقصد باتیں سننے کے لیے تمہیں کال نہیں کرتا۔ تمہیں کتنے پیسے چاہیے، بتادو اور فضول مت سوچا کرو۔ لائف کو انجوائے کرو۔ جو جیسا چل رہا ہے چلنے دو او کے کل باتیں کریں گے بائے۔'' اس نے سرد لہجے میں کہا اور کال بند کرنے لگا۔

''ارے! آپ تو ناراض ہوگئے مس یو جان آئی رئیلی لو یو م میرا دل چاہتا ہے... میں آپ کو بہت پیار کروں۔'' اس نے جلدی سے اس کی ناراضگی دور کی اور اسے منانے میں مگن ہوگئی۔ ''ایک گڈ نیوز ہے میرے پاس تمہارے لیے۔'' اس نے کہا۔

''بتائیں کون سی گڈ نیوز ہے آپ کے پاس۔'' اس نے اشتیاق بھرے لہجے میں کہا۔

''اس سنڈے میں تمہیں ٹائم دوں گا اور وجاہت کو میں آفس کے کام سے حیدرآباد بھیج رہا ہوں۔ نغمہ کو میں میکے بھیج دوں گا۔ تم روحان کو پڑوس میں بھیج دینا۔ اچھا سنو! کل تمہیں ایک پارسل ملے گا وہ لے لینا اور وہ ہی ڈریس پہن کر میرا انتظار کرنا۔'' اس نے سارا پلان نہایت ہی خوش اسلوبی سے اسے بتایا۔ وہ بخوبی واقف تھا کہ وہ اس پلان کی تکمیل میں اس کے برابر کی حصہ دار ضرور بنے گی۔

''واؤ کیا بہترین پلان بنایا آپ نے، دل خوش کردیا میرا۔ آپ کی قربت کی تو میں دیوانی ہوتی جارہی ہوں۔ سنڈے تو تین دن بعد ہے میں کیسے انتظار کروں گی۔'' نہایت ہی بے باکی سے اپنی بے چینی اسے بتائی۔

وہ قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا۔ ''بے حد کشش ہو تم یار۔ تمہارا نشہ ہوگیا ہے مجھے۔ I Love U Jan'' اس نے اپنے رشتے کا لحاظ بھول کر بے غیرتی کی انتہا کردی۔

☆☆☆

اگر انسان ہر رشتے میں ایک حد اور فاصلہ رکھ کر ملے تو ممکن ہے کہ وہ شیطان کے بہکاوے سے بچ سکتا ہے۔ ویسے بھی ہمارا مذہب تو ہمیں غیر محرم سے پردے کا حکم دیتا ہے۔ جہاں انسان مذہب کے احکام کی پیروی نہیں کرتا وہاں شیطان کو آسانی سے اپنا کام کرگزرنے کا موقع بہ آسانی فراہم ہوجاتا ہے۔ ویسے بھی ایک مرد اور عورت کے مابین تو شیطان حائل ہوتا ہے۔ اسی باعث ہمیں چاہیے کہ تنہائی میں کسی ایسے شخص کے قریب نہ ہوں، جو آپ کا نامحرم ہو۔ جیٹھ اور دیور تو نامحرم ہوتے ہی ہیں شوہر کا دوست تو آگ ہوتا ہے آگ۔ اسی وجہ سے عورتوں کو چاہیے کہ وہ ان رشتوں سے ضرور فاصلہ رکھ کر ملے اور تنہائی میں تو بالکل بھی نہ ملیں، کیونکہ ہمیں نہیں معلوم کب انسان جو کہ خطا کا پتلا ہے ان کمزور لمحوں کی گرفت میں گرفتار ہوجائے اور اپنی دین اور دنیا دونوں برباد کرلیں۔ شروعات میں تو اس شخص کو گناہ میں بے حد لذت محسوس ہوتی ہے لیکن آہستہ آہستہ اور وقت گزرنے کے ساتھ وہی گناہ اس کے کندھوں پر بوجھ کی صورت بڑھنے لگتی ہے۔ اس کی پیٹھ اور کمر اس بوجھ تلے جھکتے چلی جاتی ہے... پھر اگر وہ انسان چاہے بھی تو خود کو اس بوجھ سے الگ نہیں کرسکتا ہے روز قیامت انسانوں کے گناہ اندھیروں کی صورت میں اس کے مدمقابل ہوں گے۔ ویسے بھی اللہ ظالموں کی سخت پکڑ کرنے والا ہے۔

☆☆☆

رات کے نو بجے رہے تھے وہ ہاتھوں میں رسالہ تھامے پڑھنے میں مگن تھی۔ روحان کو وہ کھانا کھلا کر پہلے ہی سلا چکی تھی۔ بچہ بھی فطرتاً باپ پر گیا تھا۔ وہ ماں کو کم ہی تنگ کیا کرتا تھا کہ اچانک اس کے سیل فون پر میسج آنے کا ٹون بجا۔ سعادی نے اسے ایک رومانٹک غزل سینڈ کی تھی۔ وہ پڑھنے لگی اور مسکرانے لگی۔ سعادی کا نمبر اس نے اپنی امی کے نام سے Save کر رکھا تھا تاکہ کسی کو شک نہ ہو۔ وہ وجہی کے غیر موجودگی میں ہی اسے میسجز کیا کرتا تھا۔ ڈور بیل بجی وہ جلدی سے میسج ڈیلیٹ کرنے لگی۔ اس نے سیل اٹھا کر الماری کے اوپر رکھ دیا اور دروازے کی جانب بڑھ گئی۔

''اسلام علیکم! کیسی ہو؟'' وجہی نے دروازہ وا کرتی ماریہ کو دیکھ کر اس پر سلامتی بھیجی۔

''ٹھیک ہوں۔'' اس نے نہایت ہی اختصار سے کام لیتے ہوئے ڈھیر ساری سنجیدگی اپنے چہرے پر سجائی۔ ویسے بھی وہ وجہی سے کم ہی بات کیا کرتی تھی۔

''کھانا لگادوں؟'' اس نے کچن کی لائٹ آن کرتے ہی استفسار کیا۔

''نہیں ابھی موڈ نہیں ہے۔ آج کام زیادہ تھا۔ لنچ ڈھنگ سے نہیں کیا تو شام میں بھوک لگ گئی۔ پھر قریبی ریسٹورنٹ سے سینڈوچ منگوالیا... اس لیے ابھی بھوک نہیں۔'' اس نے لاؤنج میں رکھے صوفے پر بیٹھ کر جوتے اتارتے ہوئے کہا۔

''اچھا'' اس نے گہری سانس بھرتے ہوئے کہا۔ اس نے دل میں سوچا آج تو فری ہونے میں دیر ہوجائے گی۔

''کہاں گم ہوگئی ہو۔'' وجہی نے اس کے چہرے کے تاثرات کو دیکھ کر پوچھا۔

''کہیں نہیں۔'' اس نے جلدی سے رخ موڑ کر کہا۔

''چلو جلدی سے تیار ہو جاؤ آج ہم ڈنر باہر کریں گے کافی دن ہوگئے ہم کہیں باہر بھی نہیں گئے۔'' اس نے جلدی سے پلان بنالیا۔ وجہی اس کے ساتھ اکیلے وقت بتانا چاہتا تھا۔

''ارے آج نہیں میں بے حد تھکی ہوئی ہوں۔ مشین لگائی تھی میں نے اور کھانا بھی تیار ہے۔ روحان بھی سو چکا ہے۔ میں کھانے کے بعد آرام کروں گی۔ ویک اینڈ پر چلیں گے۔'' اس نے اس کے برابر بیٹھتے ہوئے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''کیا ہوگیا ہے تمہیں عورتیں تو آؤٹنگ کے لیے ہر وقت تیار رہتی ہیں اور تم ہو کہ جانا ہی نہیں چاہ رہی ہو۔ کیا مسئلہ ہے بتاؤ۔'' اس نے پریشانی سے کہا۔

''میں آج کے لیے منع کر رہی ہوں۔ جب کبھی اور آپ لے کر جائیں گے میں ضرور چلوں گی پکا۔'' اس نے بہلاتے ہوئے کہا۔ اس کے دل میں چور ہے وجہی کو اس پر کہیں شک نہ ہو جائے اسی لیے اس نے جلدی سے بات بنائی۔ ویسے بھی وجہی کو کیسے ہینڈل کرنا ہے وہ اس فن میں خاصی ماہر ہو چکی تھی۔

''میں تمہیں منع کرتا ہوں مت لگایا کرو مشین رکھ لو کوئی ماسی مگر تم سنتی ہی نہیں ہو۔'' اس نے ناگواری سے کہا اور اٹھ کر کمرے میں جانے لگا۔

''میں ان بیویوں میں سے نہیں ہوں جو میاں کی حق حلال کی کمائی کو فضول کے خرچوں میں ضائع کریں۔ میں آپ کی اور آپ کے کمائے پیسوں کی قدر کرتی ہوں۔ گھر کے سارے کام بیوی ہی کریں تو اچھا لگتا ہے۔ وہ اس کے پیچھے کمرے میں داخل ہوگئی۔ اور اس کے کپڑے نکالنے لگی۔

''اوہو! میری بیوی تو بے حد سمجھدار ہے بھئی... پھر آج رات کا کیا پلان ہے۔'' وجہی نے اس کے مدمقابل کھڑے ہو کر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ تو وہ بوکھلا کر رہ گئی۔ وہ اس کی بوکھلاہٹ دیکھ کر ہنسنے لگا۔ ''بتاؤ نا۔'' اس نے اصرار کیا۔

''کہا تو ہے آج میں بے حد تھکی ہوئی ہوں۔ آپ خود تو دیر سے آفس جاتے ہیں مجھے ہی روحان کے لیے سویرے جگنا ہوتا ہے۔'' اس نے نہایت ہی تگڑا بہانہ فوراً ہی تلاش کرلیا۔

''اچھا بابا ڈنر کے بعد سو جانا اب خوش۔'' اس نے اس کے گال کو چھوتے ہوئے کہا۔

''جی'' اس نے کہتے ہی کچن کی جانب قدم بڑھا دیئے۔ اسے وجہی کے لیے چائے جو بنانی تھی۔

☆☆☆

وہ دھڑکتے دل اور کانپتے ہاتھوں سمیت بہت ہی خوبصورت پیکنگ میں ملبوس ڈبے کو دیکھ رہی تھی۔ ابھی تھوڑی دیر قبل ہی اسے پارسل موصول ہوا تھا۔ وہ خوش ہو رہی تھی۔ جانتی تھی پارسل اسے سعدی کی جانب سے موصول ہوا ہے۔ وہ کل کے لیے بے حد ایکسائیٹڈ تھی۔ اوپر سے یہ اتنا مہنگا تحفہ اس نے بے تابی سے ڈبا کھولا! اندر سے بلیک کلر میں ایک بے حد باریک شب خوابی کا لباس برآمد ہوا۔ وہ مسکرانے لگی۔ سعدی ان تحفے، تحائف کے طفیل تنہائی کے لمحات کو مزید خوبصورت اور یادگار بنایا کرتا تھا۔ وہ جلدی سے ڈبے کو چادر میں لپیٹ کر خفیہ جگہ میں چھپانے لگی۔ وہ پھونک پھونک کر قدم رکھتی تھی۔ وہ اپنے کسی بھی عمل سے اتنی محنت سے بنایا کھیل بگاڑنا نہیں چاہتی تھی۔

☆☆☆

''چائے! اس نے وجہی کو کپ پکڑایا اور اپنی چائے لے کر بیڈ کی دوسری جانب بیٹھ گئی۔ کھانے کے بعد وہ فوراً ہی چائے لے کر آگئی۔ ''کتنی بار کہا ہے کہ کھانے کے تھوڑی دیر بعد مجھے چائے دیا کرو یار۔ چائے کے بعد مجھے نیند آجاتی ہے نہ ہی میں تمہیں ٹائم دے پاتا ہوں اور نہ ہی ٹی وی دیکھ سکتا ہوں۔'' اس نے کپ سائیڈ ٹیبل پہ رکھتے ہوئے ناگواری سے شکوہ کیا۔

''مجھے جلدی اٹھنا پڑتا ہے، اس لیے میں جلدی سو جاتی ہوں۔ میں صبح سویرے اٹھتی ہوں۔ آپ کیوں یہ بات بھول جاتے ہیں۔'' اس نے اپنی گھبراہٹ پر قابو رکھتے ہوئے اپنا دفاع کیا۔

''دن بھر آفس میں دماغ کھپاتا ہوں، سوچتا ہوں گھر جا کر تم سے ڈھیر ساری باتیں کروں گا لیکن تھکن اتنی ہوتی ہے کہ میری آنکھ لگ جاتی ہے۔'' وجہی نے رسانیت سے کہا۔

''جانتی ہوں اس لیے میں بھی آپ کو ڈسٹرب نہیں کرتی۔'' اس نے فوراً کہا۔

''کل رات میری آنکھ کھلی تم کمرے میں نہیں تھی۔

واش روم میں بھی نہیں کہاں گئی تھی تم؟'' اس نے اچانک یاد آجانے پر اس سے استفسار کیا۔ وہ ایکدم سے گھبرا گئی۔

وہ اس سوال کے لیے بالکل بھی تیار نہیں تھی۔

''وہ..... میرا دم گھٹ رہا تھا۔ کل رات گرمی بھی زیادہ تھی۔ میں بالکونی میں تھی۔ کچھ دیر ٹھنڈی ہوا میں کھڑی رہی تو مجھے سکون ملا، تھوڑی گھبراہٹ کم ہوئی۔ آپ مجھے ڈھونڈ رہے تھے۔'' اس نے کہا۔

''ہاں میں پانی پینے کے لیے اٹھا تھا۔ سوچا تمہیں دیکھوں لیکن مجھے اتنی زور کا چکر آیا کہ میں پانی پیئے بغیر ہی سوگیا۔'' اس نے بتایا۔

''اچھا میں آج سے پانی بھی رکھ دوں گی۔ پہلے کیوں نہیں بتایا آپ نے بی پی لو ہوگیا ہوگا۔ میں ابھی آپ کے لیے O.R.S بنا کر لاتی ہوں۔'' اس نے بیڈ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ وہ کانپ کر رہ گئی تھی کہ وہ اگر بالکونی میں آجاتا اور اسے باتیں کرتے سن لیتا تو.....'' آگے سوچ کر ہی اس کی روح کانپ گئی تھی۔ وہ اٹھ گئی۔

''ارے ارے بیٹھو میں ٹھیک ہوں۔ اچھا لگتا ہے جب تم میری اتنی فکر کرتی ہو۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ اسے کیا خبر تھی کہ وہ آستین میں سانپ پال رہا ہے۔ اندھی محبت، اندھا بھروسا اور کسی پر اندھا اعتماد ہمیشہ ہی نقصان دہ ثابت ہوتا ہے۔ اگر اس کے دماغ میں جب کبھی بھی شک کی چنگاری ابھرتی تھی تو وہ جلدی ہی اپنی جھوٹی محبت اور ڈرامے سے اس چنگاری کو بجھا دیتی تھی۔ وہ فل ڈراما کوئین تھی۔

☆☆☆

''ماریہ میرا سوٹ کیس تیار کر دینا کل مجھے آفس کے کام سے حیدرآباد جانا ہے۔'' اس نے آفس سے آتے ہی کہا۔ ماریہ ٹی وی دیکھنے میں مگن تھی۔ ٹی وی پر اس کا پسندیدہ سیریل آرہا تھا۔ اس نے صرف اچھا کہنے پر ہی اکتفا کیا۔ اس کا دل خوشی سے بلیوں کی مانند اچھلنے لگا۔ ''چاہو تو تم بھی میرے ہمراہ جاسکتی ہو۔ وہاں میرے بیسٹ فرینڈ کا گھر ہے کام زیادہ نہیں ہے۔ پھر گھومنے پھرنے کا پلان کریں گے۔ کئی مرتبہ علی نے مجھے آنے کے لیے کہا، لیکن کبھی جانے کا موقع نہیں ملا۔ تم ساتھ چلو گی تو سفر کا مزہ دوبالا ہوجائے گا۔ ایسا کرو تم اپنی اور روحان کی بھی پیکنگ کرلوں۔'' اس نے پُرجوش ہوتے ہوئے خوشگوار لہجے میں کہا۔ وہ چاہ رہا تھا کام کے ساتھ ساتھ وہ اپنی فیملی کو بھی بھرپور ٹائم دے کر خوش کردے۔ ایک اچھا انسان ہمیشہ اچھا ہی سوچتا ہے۔ اس کی سوچ مثبت ہی ہوتی ہے، چاہے حالات اور لوگ اس کے برعکس ہی کیوں نہ ہوں۔ اس کی سوچ اور عمل میں تضاد نہیں ہوتا۔

''نہیں بھئی میں کبھی نہ جاؤں اتنے لمبے سفر کے لیے جانتے تو ہیں کہ راستے میں میری طبیعت خراب ہوجاتی ہے۔ زیادہ دیر Travel کرنے سے مجھے گھٹن محسوس ہونے لگتی ہے اور پھر روحان کے اسکول میں اس کے منتھلی ٹیسٹ ہو رہے ہیں، میں اس کی چھٹی نہیں کرواسکتی۔ میں اپنے بچے کے فیوچر کو لے کر بے حد سیریس ہوں۔ فضول کے سیر سپاٹوں میں، میں الجھ کر بچے کی چھٹی کروا دوں تاکہ میرے بچے کی پڑھائی پر اثر پڑے اور پروگریس بھی اچھی نہ آئے۔ آپ ہو کر آجائیں پھر ڈنر کے لیے چلیں گے۔ آپ خفا تو نہیں ہیں نا مجھ سے۔'' اس نے فوراً اپنی بات مکمل کرتے ہوئے معصومیت سے کہا۔

''تم میرے اور میرے بچے کے متعلق اتنا سوچتی ہو، تم تو ہم دونوں کی خیر خواہ ہو۔ میں اگر چاہوں بھی تو تم سے خفا نہیں رہ سکتا۔'' وہ وجہی کے ساتھ جاکر اپنا موڈ اور وقت برباد کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کی دلی خواہش یہی تھی کہ وہ جلد از جلد حیدرآباد چلا جائے تاکہ وہ دل بھر کے عیاشی کرسکے۔ جس عورت کو غیر مرد کی لت لگ جائے اسے اپنے مرد سے کراہت محسوس ہوتی ہے۔ اگر انسان حلال رزق چھوڑ کر حرام کے پیچھے بھاگنا شروع کردے تو اسے حرام میں مزہ آنے لگتا ہے۔ ایسے لوگ گمراہی کے راستے کو چن کر خود اپنا مقدر تاریک کرلیتے ہیں۔

''ایسا کریں گے روحان کی چھٹیوں میں چلیں گے۔'' اس نے کہا۔

''ٹھیک ہے آپ آرام کریں میں آپ کی پیکنگ کردیتی ہوں۔'' اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

وجہی نے اس کا ہاتھ تھام لیا اس نے مڑ کر دیکھا۔ ''تم سے دور جانے کو جی نہیں چاہتا، تمہاری رفاقت میں، میں بے حد آسودہ ہوں، تم میرا بے حد خیال رکھتی ہو، تم کبھی مجھے دھوکا تو نہیں دو گی نا، بولو! جواب دو؟'' اس نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے نمناک لہجے میں استفسار کیا۔ وہ دل کی گہرائیوں سے ماریہ کو چاہتا تھا۔ پاگلوں کی طرح اس پر اعتماد کرتا، نجانے وہ کس جذبے کے تحت اس سے یہ سوال کر بیٹھا۔

''کیوں، آپ کو بھروسا نہیں ہے مجھ پر تو رہنے دیں۔ میں اپنی صفائی بھی نہیں دوں گی۔ میں ہی پاگل ہوں جو دن بھر گھر اور گھر داری میں لگی رہتی ہوں۔ پھر بھی میاں جی کو لگتا ہے کہ میں انہیں چھوڑ کر چلی جاؤں گی۔ بس رہنے دیں اپنی دکھاوے کی محبت۔'' اس نے آنسو بہاتے ہوئے آنکھوں کو رگڑتے ہوئے کہا اور روٹھ کر کمرے سے جانے لگی۔

''میں نے ایک سوال ہی تو پوچھا تھا اس میں اتنے رونے کی کیا بات ہے۔ چپ ہو جاؤ تمہارے آنسو مجھے تکلیف دیتے ہیں۔'' وہ اچانک اس کے بری طرح رونے سے گھبرا گیا اور خود ہی اپنے سوال پوچھنے پر شرمندہ ہو گیا۔

ماریہ اس کے سوال پر سن ہو کر رہ گئی تھی۔ مگر اس نے فوراً ہی مگرمچھ کے آنسو بہا کر اس کا دل موم کر دیا۔ وہ ہر وقت الرٹ رہتی تھی کہ اسے کب، کیا اور کیسے کرنا ہے۔ وہ اس کھیل کو بڑی عمدگی سے کھیل رہی تھی۔

☆☆☆

موسم بے حد خوبصورت تھا۔ نرم گرم سی دھوپ اچھی لگ رہی تھی۔ جب دل کا موسم خوشنما ہو تو ہر چیز ہی اچھی لگتی ہے۔ وہ بھی معمول کے مطابق صبح سویرے اٹھ چکی تھی۔ وہ خوب چہک رہی تھی۔ آنے والے وقت کو سوچ کر ہی وہ مدہوش ہوئے جا رہی تھی۔ وجاہت کو الوداع کہنے کے بعد تو اس کا وقت کاٹے نہیں کٹ رہا تھا۔ وہ اپنے آپ میں مگن اپنی تیاریوں میں لگ گئی۔ روحان کو اس نے پہلے ہی اپنے میکے بھیج دیا، بہانہ بنایا کہ اسے ڈاکٹر کے پاس جانا ہے، وہ اسے ساتھ لے کر نہیں جا سکتی۔ وہ تیار ہو کر سعادی کا بڑی بے چینی سے انتظار کرنے لگی۔ دروازے پر دستک ہوئی تو اس کا ہر موئے تن خوشی سے کھل اٹھا۔ خود پر ڈھیر ساری خوشبو انڈیل کر وہ تیزی سے دروازے تک آئی۔ اپنی بے قابو ہوتی سانسوں پہ قابو پانے کے لیے ایک لمحے کے لیے وہ خاموشی سے دروازے کے پیچھے کھڑی ہو گئی۔ سعادی نے اپنی آمد کا یہی وقت اسے دیا تھا۔ اس نے بے قراری سے دروازہ وا کیا۔ ''آپ۔'' اس کے مسکراتے لب یکدم ساکت ہو گئے گویا منہ میں زبان ہی نہ ہو۔ سامنے کھڑے شخص کو اپنے سامنے کھڑے دیکھ کر اس کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ وہ گھبراہٹ میں دروازہ کھلا چھوڑ کر ہی صحن میں آ گئی۔

''ماریہ، یہ کیا بے ہودگی ہے، یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے، اتنی تیار کیوں ہو تم؟ بولو جواب دو۔'' اس نے دروازے کو اندر سے بند کیا۔ صبح سویرے جلدی نکلنے کے چکر میں وہ اپنا موبائل اور والٹ بھول گیا تھا۔ وہ اپنی چیزیں لینے ہی گھر واپس آیا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ وہ اس کے پیٹھ پیچھے ایسی فضول حرکتیں کرتی ہو گی۔ اس نے تیزی سے اس کا ہاتھ کھینچ کر اسے اپنے مدمقابل کھڑا کیا۔ ''کب سے چل رہا ہے یہ بے ہودہ کھیل، میری غیر موجودگی میں اتنی گری ہوئی حرکتیں کرتی ہو تم۔'' اس نے ماریہ کے چہرے پر ایک زوردار تھپڑ رسید کیا۔ وجاہت نے اس کے نازیبا لباس کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے دوسرا زناٹے دار تھپڑ رسید کیا، اسے بے حد اشتعال محسوس ہو رہا تھا۔ جس پر ہم اعتماد کریں اور وہی ہمارے اعتماد کی دھجیاں بکھیرتا پھرے تو اپنا وجود ہی کھوکھلا محسوس ہونے لگتا ہے۔ ''کون ہے تمہارے گناہ میں برابر کا حصے دار، بتاؤ ورنہ تمہیں جان سے مار دوں گا۔'' اس نے اس کے شانے کو جھنجوڑتے ہوئے استفسار کیا۔

وہ تو گویا بت کی مانند بے حس و حرکت کھڑی، ڈر اور مارے خوف کے اس کے آنسو بھی خشک ہو گئے تھے۔ اسے اپنی موت صاف نظر آ رہی تھی۔ کیونکہ وہ بخوبی جانتی تھی۔ وہ سب کچھ معاف کر سکتا ہے لیکن اس کی بے وفائی نہیں برداشت کر سکتا۔ وہ خاموشی سے بے حس و حرکت پٹے جا رہی تھی۔ دروازے پر بیل بجی، وہ اسے چھوڑ کر تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا۔ وجاہت کے چھوڑنے سے وہ ایکدم بھربھری ریت کی مانند فرش پہ ڈھے گئی۔ دروازہ کھولنے پر جس شخص پر اس کی نظر پڑی اسے سامنے دیکھ کر اسے اپنے قدموں تلے سے زمین سرکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ سعادی ہاتھوں میں ریڈ پھولوں سے مزین بکے تھامے آنکھوں پہ ڈارک گلاسز چڑھائے دروازے پر موجود تھا۔ اس کی تیاری بھی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ دونوں ہی ایک دوسرے کو دیکھ کر ساکت رہ گئے۔ وجاہت پھٹی پھٹی نگاہوں سے اپنے بھائی جیسے دوست کو اس روپ میں دیکھ رہا تھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کے گھر کی عزت سے کھیلنے والا شخص اس کا جگری دوست ہے۔ ایکدم ہی اسے ہوش آیا اور اس نے فوراً ہی جھپٹ کر اس کا گریبان تھام لیا اور اس کا گلا دبانے لگا۔ سعادی تو اسے دیکھ کر بری طرح گھبرا گیا تھا۔ وہ اس حملے کے لیے بالکل بھی تیار نہیں تھا۔ اس کا دم گھٹنے لگا، بکے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور فرش پر بکھر گیا۔ وہ تیزی سے اپنے بچاؤ کی کوشش کرنے لگا لیکن وجاہت

کی گرفت خاصی مضبوط اور سخت تھی۔ ایکدم ہی ماریہ کو ہوش آیا اور وہ دوڑ کر وجہی کو پکڑ کر کھینچنے لگی۔ ''چھوڑیں وجہی یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ چھوڑیں۔'' سعادی بری طرح تڑپ رہا تھا۔ وجہی نے ماریہ کو ایک ہاتھ سے دھکا دیا۔ تو گرفت کمزور پا کر وہ تیزی سے خود کو چھڑا کر دروازے سے باہر نکل گیا اور بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔ وجہی نے ماریہ کو ایک زوردار تھپڑ مارا تو اس کا سر دیوار سے ٹکرا گیا۔ پھر وہ تیزی سے باہر سعادی کے پیچھے گیا۔ دیکھا تو سعادی کا مردہ وجود سڑک کے بیچ پڑا تھا۔ اس کا چہرہ خون آلود ہو رہا تھا۔ گھبراہٹ کے مارے اندھا دھند بھاگنے [illegible] سے آتی گاڑی نے اسے بری طرح کچل ڈالا۔ وجہی کو اس شیطان صفت انسان کی عبرتناک موت دیکھ کر بے حد خوشی محسوس ہوئی۔ اللہ نے اس کے ساتھ بھرپور انصاف کیا تھا پھر وہ تیزی سے گھر کی جانب چلنے لگا۔ اب اسے ماریہ کو انجام تک پہنچانا تھا۔ ظلم جب حد سے بڑھ جاتا ہے تو وہ خود بخود فنا ہو جاتا ہے۔ وجاہت نے دیکھا وہ بے ہوش پڑی ہے۔ اس نے ماریہ کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے، وہ ہلکا سا کسمسائی اور آنکھیں کھولنے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ ڈر سے بے ہوش ہو گئی تھی۔

''وجہی پلیز مجھے معاف کر دیں۔'' اس نے بلک بلک کر روتے ہوئے التجا کی۔

''میں اب تمہاری کوئی بات نہیں سنوں گا۔ میں حق مہر تمہیں پہلے ہی ادا کر چکا ہوں۔ تم ایک بدکردار عورت ہو۔ میں تمہیں اب مزید اپنی زندگی میں برداشت نہیں کر سکتا۔ اس لیے میں تمہیں طلاق دیتا ہوں۔ طلاق دیتا ہوں۔ طلاق دیتا ہوں۔ اپنے گھر والوں کو بلاؤ اور نکل جاؤ میرے گھر سے۔ میرے بیٹے کو بھی میرے حوالے کرو کہاں ہے وہ؟'' اس نے کہا۔

''امی کے گھر بھجوا دیا تھا میں نے اسے۔'' اس نے دیوار کا سہارا لیتے ہوئے کہا اور مردہ قدموں سمیت کمرے کی جانب بڑھ گئی۔ کچھ لوگوں کو عزت راس نہیں آتی ہے، ایسے لوگ خود اپنے لیے ذلت والی زندگی کا انتخاب کرتے ہیں اور گھٹ گھٹ کر مرتے ہیں۔ کسی کو دھوکا دے کر کسی اپنے کی خوشی، چین و سکون کو ملیا میٹ کر کے ہم خود کیسے آباد رہ سکتے ہیں۔ اللہ بے شک اپنے بندوں کے ساتھ انصاف کرتا ہے۔ قدرت کی لاٹھی بے آواز ہے۔ مگر وہ صحیح وقت پر پڑتی ضرور ہے۔

## گرینیڈا Grenada

ونڈ وارڈ جزائر (غرب الہند) کے جنوب میں کیریبین کا ایک جزیرہ اور پارلیمانی مملکت۔ رقبہ: 133 مربع میل یا 338 مربع کلومیٹر۔ آبادی: (نیگرو 53 فیصد، مخلوط 42 فیصد، سفید فام ایک فیصد، دیگر 4 فیصد)۔ دارالحکومت: سینٹ جارجز۔ زبان: انگریزی۔ مذہب: مسیحی۔ سکہ: ایسٹ کریبین ڈالر۔ مقننہ دو ایوانوں ایوان نمائندگان (15 ارکان) اور سینٹ 13 ارکان) پر مشتمل ہے۔ تقریباً سارا علاقہ کوہستانی ہے۔ معیشت کا انحصار زراعت پر ہے۔ ناریل، کیلا اور چینی اہم برآمدی اشیاء ہیں۔ ملکی ضرورت کے لیے چاول اور مکئی کاشت کی جاتی ہے۔ ساحل پر گیس اور تیل کے ذخائر دریافت ہوئے ہیں۔

گرینیڈا کے اصل باشندے آرواک انڈین تھے جنہیں کولمبس کے یہاں آنے (1498ء) کے فوراً بعد آدم خور انڈینوں (کرب) نے یہاں سے مار بھگایا۔ 1609ء میں یہاں انگریزوں نے قدم جمانے کی کوشش کی، لیکن فرانسیسیوں نے ان کی یہ کوشش ناکام بنا دی۔ 1650ء سے 1762ء تک یہ علاقہ فرانسیسیوں کے زیر تسلط رہا۔ اس کے بعد انگریزوں کے زیر نگیں آ گیا اور تقریباً دو سو سال تک انہی کے قبضے میں رہا، سوائے ایک مختصر سے عرصے کے (1779-83) جب، امریکی انقلاب کے دوران، فرانسیسیوں نے انگریزوں پر غلبہ حاصل کر لیا تھا۔ 1833ء میں یہاں غلامی ممنوع قرار دے دی گئی۔ 1974ء میں انگریزوں نے اسے آزاد کر دیا اور یہ ملک اقوام متحدہ کا ممبر بن گیا۔

مرسلہ: زرین فیاض، کراچی

☆☆☆

''وجاہت سعادی کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے، کسی اجنبی شخص کی کال آئی تھی میرے پاس تم کہاں ہو۔ مجھے بے حد گھبراہٹ ہورہی ہے۔'' اس کے پاس نغمہ کی کال آئی۔

''آپ پریشان نہ ہوں۔ گھر پر رہیں میں آتا ہوں۔'' اس نے کہا اور باہر نکلنے لگا۔

ماریہ نے اسے صحن میں کھڑے بغور دیکھا۔ سب کچھ لٹا دینے کا ملال اس کی ذات سے صاف ظاہر ہورہا تھا۔ وہ اپنے گھر والوں کا انتظار کرنے لگی۔ اس نے خود اپنی زندگی میں آگ لگائی تھی۔ اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ ''سعادی کس اسپتال میں ہیں، ایکسیڈنٹ ہوا کہاں ان کا؟'' نغمہ نے اسے دیکھتے ہی کئی سوالات کیے وہ بے حد مضطرب نظر آرہی تھی۔

وجاہت کے دماغ میں سرگوشی گونجی۔ وہ شخص تو اس قابل بھی نہیں تھا کہ کوئی اس کے لیے پریشان بھی ہو۔ اسے نغمہ پر بے تحاشہ افسوس ہوا کہ وہ کیسے سعادی کے ہاتھوں اتنے سالوں سے بے وقوف بنتی چلی آرہی تھی۔ وہ بے حد معصوم اور سادہ تھی تب ہی اتنے سال بعد بھی شوہر کی بدکرداری کو پکڑ نہ سکی۔ اسے دیکھتے ہی اس کے سوچ کے پرندے کہیں اور پرواز کرنے لگے۔ ''آپ بیٹھیے میں ساری بات بتاتا ہوں آپ کو۔ ماریہ اور سعادی کا افیئر تھا نجانے کب سے آج ان دونوں کو میں نے موقع پر ہی رنگے ہاتھوں پکڑ لیا۔ وہ مارے شرمندگی اور ڈر کے بھاگنے لگا تو راستے میں یہ حادثہ پیش آگیا۔ اس کی موت تو یقینی تھی میرے ہاتھوں یا قدرت کے ہاتھوں اس معاملے میں آج قدرت نے میرا بھرپور ساتھ دیا۔ ماریہ کو میں نے اپنی زندگی سے الگ کردیا۔ مجھے گھن آرہی تھی اس کے وجود سے میری نظر میں غلاظت کا ڈھیر ہے وہ عورت جس کا کردار مضبوط اور پاک نہ ہو۔ ایسی عورت کو عورت کہنا، عورت ذات کی توہین ہے۔ عورت تو وفا کی دیوی ہوتی ہے، عورت تو سچائی کی مورت ہوتی ہے۔'' اس نے نغمہ کو تمام تر تفصیلات سے آگاہ کیا۔

''یا اللہ! اتنا بڑا دھوکا۔ کتنے گھٹیا لوگوں کے ساتھ ہم اب تک اپنی زندگی گزار رہے تھے۔ ان لوگوں نے اپنے رشتوں کا بھی لحاظ نہ رکھا۔ اسے سعادی کے مرنے کا ذرا بھی دکھ نہ ہوا بلکہ اسے مسرت ہوئی کہ معاشرے سے ایک بڑے ناسور کا وجود خاک میں مل گیا۔

☆☆☆

نغمہ شام کی چائے پی رہی تھی۔ آسمان پر پرندے بڑی آزادی سے اپنی پرواز میں مگن تھے۔ اسے کھلے آسمان تلے بیٹھنا اچھا لگ رہا تھا۔ سعادی کے جانے کے بعد وہ خود کو بھی ان ہی پرندوں کی مانند آزاد محسوس کرنے لگی تھی۔ وہ اس کم ظرف شخص کے بغیر بے حد خوش اور آسودہ تھی۔ سعادی کے ساتھ وہ ایک رینٹ کے فلیٹ میں رہتی تھی۔ سعادی کے بعد اسے فلیٹ خالی کرنا پڑا اور وہ اپنے میکے آگئی۔ اس کی کالج کی جاب جاری و ساری تھی۔ اس کم ظرف انسان نے اسے کوئی بھی معاشی سہارا نہ دیا تھا۔

''نغمہ!'' رخسانہ بیگم نے سوچوں میں گم بیٹی کو متوجہ کیا۔

''جی امی! آپ کب آئیں مجھے کمرے میں بلا لیتیں۔ آپ کے گھٹنوں کا درد نہ بڑھ جائے۔ آپ چلیں اندر میں مالش کردیتی ہوں۔'' اس نے ماں کو محبت سے دیکھتے ہوئے اپنے برابر والی کرسی پر انہیں بٹھاتے ہوئے کہا۔ ایک یہی رشتہ تو خالص اور سچا تھا اس کے پاس۔ اتنے بڑے دھوکے کے بعد رشتوں پر سے اس کا اعتبار ختم ہوگیا تھا لیکن ماں کی محبت کے سائے تلے وہ خود کو خاصہ پُرسکون محسوس کرنے لگی تھی لیکن ماں تو وہ ہستی ہے جو اولاد کو ایک نظر دیکھ کر ہی بھانپ لیتی ہے کہ اس کی اولاد خوش ہے یا غم سے نڈھال ہے۔ وہ ان کی بڑی ہی پیاری اولاد تھی۔ وہ اسے اس حال میں دیکھ کر بے حد کڑھتی رہتی تھیں۔

''تم بیٹھو آرام سے کمرے میں، مجھے گھٹن محسوس ہورہی تھی اس لیے چلی آئی تمہارے پاس۔ تم سے باتیں کرنی ہیں۔'' انہوں نے آہستگی سے کہا۔

''کہیں امی!'' اس نے کپ ٹیبل پر رکھتے ہوئے ان کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

''میری ایک بات مانوں گی بیٹا! تم اپنا گھر بسالو۔'' انہوں نے بے حد مان بھرے لہجے میں کہا۔

اس نے اپنی بوڑھی ماں کا چہرہ بغور دیکھا۔ وہ جانتی تھی اسے اس حال میں دیکھ کر اس کی ماں کے دل پر کیا گزرتی ہوگی۔ ''تمہیں خوشحال دیکھ کر میں سکون سے مرسکوں گی۔''

''دل نہیں چاہتا امی کہ اب کسی بھی انسان پر بھروسا کروں، بے حد خوف محسوس ہوتا ہے۔ ڈرتی ہوں کہیں دوبارہ کچھ برا ہوا تو میں زندہ نہیں رہ پاؤں گی۔ دوبارہ دھوکا

کھانے کا حوصلہ اور ہمت نہیں ہے مجھ میں۔ میں خوش ہوں یہاں آپ کے پاس۔'' اس نے ان کا ہاتھ تھام کر لبوں سے لگاتے ہوئے اپنے تمام تر خدشات ظاہر کیے۔

انہوں نے آنسو بہاتی اپنی بیٹی کو بغور دیکھا۔

''تمہاری بات ٹھیک ہے بیٹا لیکن ضروری تو نہیں کہ ایک واقعے کے بنا پر تم اپنی پوری زندگی کو ہی منفی سوچوں کی نظر کردو۔ تمہارا ماضی ایک برا خواب تھا۔ اسے بھول جاؤ۔ اور آگے .... بڑھو اپنی زندگی میں، میں تمہارے ساتھ عمر بھر نہیں رہ سکتی۔ میری دعا ہے تمہاری زندگی میں ایک اچھا اور نیک انسان ضرور آئے گا۔'' انہوں نے اسے ساتھ لگاتے ہوئے دعا دی۔

کہتے ہیں کہ ماں کی دعا تو عرش تک جاتی ہے۔ شاید یہی وقت قبولیت کا وقت تھا۔ جب اللہ نے اس کے لیے ایک اچھے شخص کو چن لیا تھا۔ جو اس کی زیست کو خوشیوں کا گہوارہ بنانے والا تھا۔

☆☆☆

رات کے دس بج رہے تھے۔ وہ عشاء کی نماز سے فارغ ہوکر سونے کی تیاری کررہی تھی کہ بیڈ پر پڑا سیل فون گنگنانے لگا۔ اس نے دیکھا۔ وجاہت کالنگ۔ اس نے فون کان سے لگایا۔

''جی کہیں۔'' اس نے کہا۔ اس وقت اس کی کال اسے خاصی عجیب لگی۔

''کیسی ہیں آپ؟'' اس نے پوچھا۔

''ٹھیک ہوں۔'' اس نے اختصار سے کام لیا۔

''میں کل پانچ بجے آپ کے گھر آؤں گا۔ ضروری باتیں کرنی ہیں آپ سے۔'' اس نے کال کرنے کی وجہ بتائی۔

''ہوں۔ آفس کی تمام فائلیں تو میں نے پہلے ہی آپ کے حوالے کردی ہیں۔ آپ کے دوست کی کوئی بھی چیز میرے پاس موجود نہیں ہے۔'' وہ سمجھی کہ وہ اس سے سعادی کے متعلق کوئی بات کرنا چاہ رہا ہے۔

''ارے آپ گھبرائیں نہیں۔ روحان بھی آپ سے ملنے کے لیے خاصہ بضد ہورہا ہے۔ اسے بھی ملوادوں گا آپ سے۔'' اس نے کہا۔

''روحان ٹھیک ہے۔'' اس نے فکرمندی سے پوچھا۔

''بہت گم صم ہوگیا ہے کبھی لگتا ہے کہ میں نے اس

## گاندھی جی

ہندوستان کے سیاسی وروحانی رہنما (1869-1948ء) موہن داس کرم چند گاندھی کاٹھیاواڑ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم راجکوٹ میں حاصل کرکے بیرسٹری پاس کرنے کے لیے ولایت گئے۔ واپسی پر کچھ عرصہ ممبئی (بمبئی) میں وکالت کی مگر کامیابی نہ ہوئی... پھر آپ ایک مسلمان تاجر کے وکیل بن کر 1893ء میں جنوبی افریقا گئے، جہاں آپ کو پہلی بار معلوم ہوا کہ ہندوستان سے باہر ہندوستانیوں کے ساتھ کیسا حقارت آمیز سلوک کیا جاتا ہے۔ ایک دفعہ آپ سڑک پر جارہے تھے کہ ایک سپاہی نے ٹھوکر مار کر سڑک سے نیچے پھینک دیا۔ ہندوستانیوں کی یہ حالت دیکھ کر آپ کو دلی صدمہ ہوا اور کچھ مدت کے بعد آپ نے ستیہ گرہ تحریک کا آغاز کیا۔ یعنی پُرامن رہتے ہوئے قوت وظلم کا مقابلہ کرنا۔ 1914ء میں پہلی جنگِ عظیم چھڑنے پر گاندھی جی نے ہندوستان آکر انگریزوں کی مدد کا بیڑا اٹھایا۔ آپ کا خیال تھا کہ حسن سلوک سے انگریزوں کو متاثر کیا جائے اوران سے درجہ نوآبادیات حاصل کرلیا جائے، مگر جنگ کے خاتمے پر رولٹ ایکٹ اور حادثہ جلیانوالہ نے آپ کو بالکل مایوس کردیا۔ تاہم یہ امر قابل ذکر ہے کہ کانگرس میں پورن سوراج یا مکمل آزادی کے حامی نہرو اور بوس رہے۔ مہاتما گاندھی عملاً ہمیشہ نوآبادی درجہ کے طلب گار تھے۔

مرسلہ: ظاہر شاہ، پشاور

سے اس کی ماں کو چھین کر اس کے ساتھ بے حد زیادتی کی ہے... پھر خیال آتا ہے کہ ماں تو بچے کی پہلی درس گاہ ہوتی ہے۔ وہ تربیت کیا کرتی اس کو خود تربیت کی اشد ضرورت تھی۔''

''ہوں خیال رکھیں روحان کا۔'' اس نے گہری سوچ میں ڈوب کر کہا۔

''او کے پھر کل ملتے ہیں۔'' وہ دن بھر کی تھکی ہوئی تھی ...سونے کے لیے لیٹ گئی۔ مگر نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ مسلسل روحان کے متعلق سوچے جا رہی تھی۔ اسے بے حد افسوس ہو رہا تھا۔ کتنے خود غرض تھے وہ دونوں جنہوں نے معصوم فرشتہ صفت بچے کے متعلق بھی نہیں سوچا۔ سوچتے سوچتے ہی وہ نیند کی گہری وادیوں میں اتر گئی۔

☆☆☆

دروازے پر دستک ہوئی۔ ''آجائیں۔'' اس نے کتاب رکھتے ہوئے کہا۔ ''نغمہ بیٹی! بڑی بی بی آپ کو ڈرائنگ روم میں بلا رہی ہیں۔ وجاہت بیٹا اور روحان بابا آئے ہوئے ہیں۔'' ملازمہ نے اپنی بات مکمل کی۔

''آپ جائیں میں آتی ہوں۔'' اس نے کہا وہ بے حد تھک گئی تھی۔ کالج میں بچوں کے ایگزام ہو رہے تھے، وہ کالج سے آکر کھانے کے بعد آرام کر رہی تھی۔ اس نے وال کلاک پر نظر ڈالی۔ شام کے پانچ بج رہے تھے۔ اس نے بیڈ پر پڑا دوپٹا اوڑھا اور واش روم میں جا کر منہ پر پانی کے چھینٹے مارے اور آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر اپنے بال بنانے لگی۔ اس نے خود کو کئی ہفتوں بعد بغور دیکھا تھا۔ وہ بے حد سادہ رہنے لگی تھی۔ سعادی کی رفاقت میں تو وہ ہفتوں میں تیار بھی ہو جاتی تھی لیکن یہاں آنے کے بعد وہ بے حد سادہ رہا کرتی۔ کہتے ہیں عورت کا بناؤ سنگھار تو اس کے مجازی خدا کے لیے ہوتا ہے۔ اس کے لبوں پر پھیکی مسکراہٹ در آئی۔

''اسلام علیکم!'' اس نے کمرے کے اندر داخل ہوتے ہوئے سلامتی بھیجی۔ اس نے روحان کو دیکھا جو باپ کے برابر بڑی ہی خاموشی سے بیٹھا ہوا تھا۔ وجاہت رخسانہ بیگم سے ہلکی پھلکی گفتگو کر رہا تھا۔ اسے بچے پر بے تحاشہ پیار آیا۔

''کیسے ہو بیٹا؟'' اس نے اس کے برابر والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے مسکراتے ہوئے استفسار کیا۔

''ٹھیک ہوں آنٹی۔'' اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''اسکول جا رہے ہو؟''

''جی آنٹی پاپا اتنا گندا ناشتا بناتے ہیں کہ کیا بتاؤں؟'' روحان نے اس کے کان میں آہستگی سے کہا۔ بے ساختہ مسکراہٹ نے اس کے لبوں کو چھو لیا۔ مسکراتے ہوئے وجاہت نے اسے بغور دیکھا تھا۔

''بیٹا میں ذرا چائے کا بول دیتی ہوں۔ تم بیٹھو۔'' رخسانہ بیگم نے اٹھتے ہوئے کہا اور روحان کا ہاتھ پکڑ کر کمرے سے باہر جانے لگیں۔

''امی آپ بیٹھیں میں لے آتی ہوں۔'' اس نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

''نہیں تم بیٹھو وجاہت کو تم سے ضروری باتیں کرنی ہیں۔'' وہ کہتے ہوئے کمرے سے چلی گئیں۔

اس نے حیرت سے وجاہت کو دیکھا۔ ''ایسی کون سی بات ہے جو ضروری ہونے کے ساتھ ساتھ، امی کو بھی پتا ہے۔'' اس نے کہا۔

''نغمہ میں آپ سے نکاح کرنے کا خواہشمند ہوں۔ مجھے آپ جیسی مخلص ساتھی کی بے حد ضرورت ہے۔ آپ میرے بچے کے لیے ایک بہترین ماں ثابت ہوں گی۔ مجھے یقین ہے۔ میں نے آنٹی سے بھی بات کر لی ہے وہ اس رشتے پر رضامند ہیں لیکن میں آپ سے آپ کی مرضی جاننا چاہتا ہوں کہ آپ کیا چاہتی ہیں؟'' اس نے نغمہ کو دیکھتے ہوئے اپنی بات مکمل کی۔ ''بولیں آپ خاموش کیوں ہیں میں آپ کی خاموشی کو کیا سمجھوں؟'' اس نے سنجیدگی سے استفسار کیا۔ اسے لگا وہ نہیں مانے گی۔ وہ مایوس ہو کر کرسی سے اٹھنے لگا۔

''میں اپنی امی کی کوئی بات بھی نہیں ٹالتی ہوں۔'' اس نے ہولے سے کہا۔

''میں جلد ہی آؤں گا آپ کو لینے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس کے کاندھوں سے اکیلے پن کا بوجھ ختم ہونے لگا وہ خود کو بے حد ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔

''میں انتظار کروں گی۔'' اس نے کہا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس نے اس کے چہرے پر ایک پیاری سی مسکان دیکھ لی تھی۔ اسے اپنی زندگی مکمل اور آسودہ دکھائی دے رہی تھی۔

++

# پون صدی بعد

محترم ایڈیٹر سرگزشت
السلام علیکم!

یہ سچ بیانی بڑی مشکل سے قلمبند ہوئی ہے۔ اسے لکھتے ہوئے میرا قلم بار بار کانپتا رہا ہے۔ آنسو بہہ رہے ہیں۔ لوگ قیامِ پاکستان کے وقت مچی غدر، مارکات، ظلم اور زیادتی کو بھلا چکے ہیں اس بات کو بھی بھول بیٹھے ہیں کہ یہ ملک ہمیں پلیٹ میں سجاکر نہیں ملا ہے۔ اس کے لیے مسلمانوں نے کیسی کیسی قربانیاں دی ہیں کیسے کیسے سانحات سے گزرے ہیں جن کو قلم بند کرنا آسان نہیں۔ پاکستان کا قیام جنہیں منظور نہ تھا وہ آج بھی اسی سازش میں لگے ہوئے ہیں۔ اجتماعی اور انفرادی طور پر قیامِ پاکستان کا انتقام لیتے ہیں زیرِنظر سچ بیانی بھی اسی کا تسلسل ہے۔

عنائشہ چوہدری
(لاہور)

اس کہانی کا تعلق اسلامی جمہوریہ پاکستان کے قلب کہے جانے والے شہر 'لاہور' سے ہے۔ لاہور کے مضافات میں ترقی اور گنجان آبادی کا عجب عالم ہے۔ فیروز پور روڈ سے دائیں ہاتھ مڑکر چلتے جاؤ تو ٹریفک کا اژدہام' دھواں اگلتی گاڑیاں' دورویہ سڑک کے کناروں پر واقع بازار آگے بین الصوبائی بس سروس کی رونقیں۔ ان رونقوں' اشیائے خورونوش کے مختلف اسٹالز سے کنی کتراتے تھوڑا اور آگے جاؤ تو بائیں ہاتھ پر ایک بغلی گلی دکھائی دیتی ہے۔ یہاں

رکشوں اور گاڑیوں کا داخلہ ممنوع قرار دینے کے لیے چارفٹ کے دو آہنی ستون مناسب فاصلے پر نصب کیے گئے ہیں۔ یہ علاقہ 'ڈھولن وال' کہلاتا ہے۔ اس گلی میں آگے بڑھتے جاؤ تو دائیں سمت میں پانچواں مکان اپنی قدیم آرائش کی بدولت فوری طور پر ہی نظروں میں آجائے گا۔ اس مکان کو ہرے رنگ کے روغن سے سجایا گیا ہے۔ چوبی دروازے کی بھی اپنی ہی ایک بہار ہے۔ دیمک' گرد اور بدنمائی کا کہیں کوئی نشان نہیں۔ اس گھر کی دید آنکھوں کو ایک عجیب سی تراوٹ اور فرحت عطا کیا کرتی۔ پندرہ ستمبر دو ہزار پندرہ کے اس پرجس روز شام سات بجے ایک عورت اسی مکان کے باہر کھڑی بڑی گہری نظروں سے ہر ایک شے کا جائزہ لے رہی تھی۔ اس عورت کی عمر ساٹھ سال سے زیادہ ہی تھی لیکن حیران کن بات یہ تھی کہ وہ اڑتالیس سے زائد محسوس ہی نہ ہوتی۔ اسے دیکھ کر ذہن میں پہلا تاثر یہی ابھرتا تھا کہ اس نے اپنی ذات اور ظاہری ہیئت پر بڑی محنت کی ہے۔ بالوں کو کسی بہترین ہیئر کلر نے سیاہ رنگ دے رکھا تھا۔ گندمی رنگت پر جھریوں کی تعداد خاصی کم تھی۔ جسمانی طور پر بھی وہ خاصی چست محسوس ہو رہی تھی۔ سیاہ اور سفید سوتی ساڑی میں خاصی باوقار دکھائی دینے والی اس عورت کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا سفری بیگ تھا جس میں زیادہ سے زیادہ دو جوڑے کپڑوں' تولیہ یا پیسٹ برش کی گنجائش ہی نکل سکتی تھی۔ ساڑی کی وجہ سے وہ کچھ الگ نظر آرہی تھی۔ وہ کئی لمحوں تک خالی الذہنی کے عالم میں وہاں کھڑی رہی لیکن کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ اس بظاہر سپاٹ کیفیت کے پس پردہ دل و دماغ میں کیسا انتشار برپا ہے۔

اس کی سماعت اندرونی جانب سے سنائی دینے والی مختلف آوازوں پر مرکوز تھی۔ صحن میں کہیں قریب ہی موٹر چل رہی تھی۔ موٹر کے علاوہ پریشر ککر کی سیٹی کی مخصوص آوازوں نے فضا کو مرتعش کر رکھا تھا۔ پڑوس میں کسی گھر سے بھارتی فلمی گانوں کی آوازیں بھی اسی ماحول کا حصہ تھیں۔ عورت تذبذب کے عالم میں کچھ دیر وہیں کھڑی رہی۔ اس کا ہاتھ ڈور بیل کی طرف بڑھتے ہوئے رک سا جاتا۔

''کیا بات ہے بہن جی؟ کس سے ملنا ہے آپ کو؟'' اسے اپنے بائیں جانب آواز سنائی دی۔ وہ یکدم محتاط ہوگئی۔

''کیا آمنہ کا گھر یہی ہے؟'' اس نے شائستگی سے پوچھا۔

''جی ہاں! یہی ہے' لیکن آپ کون؟'' بھوری شلوار قمیص اور سفید جالی دار گول ٹوپی میں ملبوس اس شخص نے بتایا۔ اس کے بائیں ہاتھ میں دودھ دہی کے شاپر زجبکہ دائیں ہاتھ میں تسبیح کرنے والا ٹیلی کا ؤنٹر تھا جسے وہ انگوٹھے کی جنبش سے متحرک رکھے ہوئے تھا۔

''یہ میں انہی کو بتاؤں گی۔ آپ پلیز انہیں بلا دیجیے۔''

''معاف کیجیے گا خاتون! حالات اور ماحول بے حد خراب ہیں۔ ایسے ہی تو کسی کے بھی کہنے پر اپنی اہلیہ کو باہر نہیں بلوا سکتا۔'' عبداللہ نامی اس شخص نے تحمل سے کہا۔

''انہیں کہیے کہ 'منی' ملنا چاہتی ہے۔ اگر وہ پہچان لیں تو ٹھیک ورنہ میں یہیں سے لوٹ جاؤں گی۔'' عورت کے انداز میں ایک عجیب وقار اور بے نیازی تھی۔ عبداللہ بھی یہ نام سنتے ہی چونک گیا اور عجلت میں اندر بڑھ گیا۔

چند ہی لمحے گذرے تھے کہ پہلے موٹر کے سماعت شکن شور کا خاتمہ ہوا پھر پریشر ککر کی آواز بھی ایک تیز سیٹی میں منتقل ہو کر پُرسکون ہوگئی۔ دروازے کے قریب تر آتی چپل گھسیٹنے کی آوازیں بھی کافی نمایاں تھیں' منی نامی اس عورت نے مضطرب ہو کر آنکھیں موند لیں۔ اس کے بدن پر ہلکی سی لرزش طاری ہونے لگی۔

''منی..... آپ نے یہی نام لیا تھا ناں خاتون؟'' اس نے دہلیز پر ایک ہیجانی آواز سن کر آنکھیں کھول دیں۔

''جی ہاں! کہا تو یہی تھا سیتا دیوی!'' وہ نرمی سے بولی۔ نووارد کے چہرے پر تلاطم پیدا ہوگیا۔

''مونی..... یا خدایا..... میں..... یہ..... مجھے اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں آرہا۔ یا اللہ! تیرا شکر ہے..... کتنا یاد کرتی تھی میں تمہیں۔'' آمنہ ایک سانس میں کہتی گئی۔ مونی کی نظریں اس کے سراپا پر ہی گڑی تھیں۔ وہ سرخ و سفید رنگت کی مالک تھی لیکن چہرے پر جھائیاں زیادہ نمایاں تھیں۔ آنکھوں پر سنہری فریم کا چشمہ جسم قریب' قد درمیانہ۔ اس نے فالسئی رنگت کی شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ سفید رنگ کا دوپٹا نماز کے انداز میں اوڑھنے کے باوجود سرخی مائل بال اپنا عکس دکھا رہے تھے۔ غالباً وہ کسی خضاب یا ہیئر کلر کی بجائے مہندی کا استعمال کرتی تھی۔

''یاد تو میں بھی تمہیں بہت کرتی تھی سیتا! کوئی دن ایسا نہ گذرا جب مجھے تمہارا خیال نہ آیا ہو۔'' مونی مسکرائی۔

''آئے ہائے! میرا ابھی دماغ خراب ہوگیا ہے۔ اتنی

گرمی میں تمہیں یہاں لے کر کھڑی ہوں۔ اندر آؤ ناں!'' اس کی خوشی اور جوش دیدنی تھا۔ مونی نے مسکراتے ہوئے قدم آگے بڑھا دیئے۔ آمنہ اسے لیے ایک صحن سے گذرتی کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ صحن میں دو مرد اور دو ہی خواتین تھیں جن کے بشروں سے تجسس کافی عیاں تھا۔ مونی کے اندازہ کے مطابق قدرے ادھیڑ عمر شخص سیتا کا بیٹا ہوسکتا تھا۔ اس کے نقوش میں عبداللہ کی جھلک کافی نمایاں تھی۔ دوسرا شخص یقیناً اس کا پوتا تھا۔ اس کے نقوش صحن میں ہی کھڑی تقریباً چالیس سالہ عورت سے مماثل تھے۔ ان سبھی افراد میں سب سے حیران کن شخصیت اس انیس سالہ لڑکی کی تھی جو قدرے نروٹھے انداز میں ایک کونے میں رکھی پلاسٹک کی کرسی پر بیٹھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں جدید ماڈل کا موبائل اور کانوں میں ہینڈز فری لگی تھیں۔ اسے دروازے پر ہونے والے اس سارے ہنگامہ میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

''بہو! جلدی سے ٹھنڈے کا انتظام کرو۔ میری مونی گرمی میں جانے کہاں سے سفر کر کے آئی ہے۔'' آمنہ نے حکم جاری کیا اور مونی کا ہاتھ پکڑ کر اپنے کمرے میں چلی گئی جہاں روم کولر کی ٹھنڈک کافی فرحت بخش تھی۔

''یہ بیگ مجھے دو اور سکون سے بیڈ پر بیٹھو!'' وہ بڑی محبت سے بولی۔ مونی نے بیگ دروازے کے ایک جانب رکھی کرسی کے نیچے رکھ دیا۔

کمرے کی سجاوٹ میں سادگی اور سفید پوشی کا عنصر غالب تھا۔ ڈبل بیڈ کے دونوں جانب تپائیاں موجود تھیں جن پر مختلف ادویات کی شیشیوں نے زیادہ جگہ گھیر رکھی تھی۔ اس کے علاوہ چند اسلامی کتب دکھائی دے رہی تھیں۔ مشرقی کونے میں ایک الماری تھی جس کے اوپر کچھ ٹرنک وغیرہ پڑے تھے۔ روم کولر مغربی کھڑکی میں نصب تھا۔ مجموعی طور پر یہاں کافی سکون اور فرحت تھی۔ مونی کو اپنی تھکاوٹ اور کسلمندی غنودگی میں تبدیل ہوتی محسوس ہونے لگی۔ تھوڑی ہی دیر میں شمائلہ شیشے کے نفیس گلاسوں میں ٹھنڈی بوتل لے آئی۔ مونی کی پیاس یکدم شدید ہوگئی۔ اس نے بلاتکلف ہاتھ بڑھا کر وہ گلاس تھام لیا۔

''امی جی! آپ بھی لیجیے ناں!'' شمائلہ نے کہا۔

''میری شوگر آج پھر ہائی ہے۔ میں نہیں پیوں گی۔'' اس نے منہ بنایا۔

''مجھے ہی دے دو بیٹی! میں پی لیتی ہوں۔'' مونی نے اسے مخاطب کیا اور چند ہی لمحوں میں دونوں گلاس خالی کر کے اسے تھما دیئے۔ شمائلہ پسندیدہ نظروں سے اسے دیکھتی واپس چلی گئی۔

''مجھے اب بھی یقین نہیں آرہا کہ تم میرے سامنے بیٹھی ہو۔ تم نے میرا ایڈریس کیسے ڈھونڈا؟'' وہ خوشی سے بے حال تھی۔

''اور مجھے اس بات کا وشواس نہیں ہو رہا کہ تم نے نہ صرف مجھے پہچان لیا ہے بلکہ اتنی خوش بھی ہو رہی ہو۔''

''کیوں؟ ایسا بھلا کیوں سوچا تم نے؟'' وہ نروٹھے سے انداز میں بولی۔

''پتا نہیں کیوں سوچا؟ لیکن اکثر ایسا ہی محسوس ہوتا تھا کہ اگر کبھی زندگی نے ہماری ملاقات کروائی تو شاید تم مجھے پہچاننے سے بھی انکار کر دو گی۔'' مونی نے صاف گوئی سے کہا۔

''بہت غلط محسوس ہوتا تھا تمہیں۔ تم میرا ماضی ہو۔ میرے بچپن اور جوانی کی حسین یادوں کا اہم ترین حصہ۔ ماضی بھول کر بھلا کوئی کیسے زندہ رہ سکتا ہے؟''

''ہاں یہ تو تم نے ٹھیک ہی کہا سیتا! ماضی ہمیں زندہ رکھتا ہے۔'' مونی نے ٹھنڈی آہ بھری۔

''سیتا بھی میرا ماضی ہی تھی مونی! اب میں آمنہ ہوں۔'' وہ نرمی لیکن دوٹوک انداز میں بولی۔ مونی یکدم خاموش ہوگئی۔

''میرا ایڈریس تمہیں کیسے ملا مونی؟ کیسے کھوجا تم نے مجھے؟'' آمنہ ایک بار پھر متجسس ہوئی۔

''دھیرج رکھ سکھی! دھیرج رکھ۔ سب کچھ ایک ہی بار جان لے گی کیا؟'' وہ تحمل سے بولی۔ ''میں ابھی یہیں تیرے پاس ہی ہوں۔ رات بھر دونوں سکھیاں باتیں کریں گی۔ پھر سب کچھ کہہ سن لیں گے۔ ابھی تو مجھے بہت بھوک لگ رہی ہے۔ اگر بھوجن کا انتظام ہو جائے تو...'' وہ بے تکلفی جتاتے ہوئے بھی تکلف برت جاتی۔

''بس تھوڑی دیر انتظار کر لے۔ گرما گرم کھانا تیار ملے گا۔ بلکہ مجھے یقین ہے کہ شمائلہ نے میرے کہے بغیر ہی بہترین انتظام کر لیا ہوگا۔'' آمنہ نے فخر سے بتایا۔ ''اب یہ مت کہنا کہ کھانا تم اندر کمرے میں کھاؤ گی۔'' اس کے کامل اندازہ پر مونی کھسیا گئی۔

''ہم سب اکٹھے کھانا کھائیں گے۔ میں تمہیں اپنی فیملی سے ملواؤں گی۔ وہ تو خیر تم سے واقف ہی ہیں۔'' آمنہ نے خوشدلی سے بتایا۔

''کیا واقعی؟ وہ میرے بارے میں پہلے سے ہی جانتے ہیں۔'' مونی حیران ہوئی۔

''ہاں تو اور کیا؟ میں نے انہیں اپنے بارے میں بھی سب کچھ تفصیل سے بتا رکھا ہے۔ اگست' ستمبر میں تو خاص طور پر ہمارے ماضی کا تذکرہ چھڑا رہتا ہے۔''

''کیا وہ سب بھی.....'' مونی کے لیے اس کا انکشاف حیرت انگیز تھا۔

''ہاں میری سکھی! سب کچھ سے مراد سبھی کچھ ہے۔'' آمنہ کی آنکھوں میں نمی پیدا ہونے لگی۔ ان دونوں ہی کے درمیان اب خاموشی کی دیوار حائل ہوگئی تھی۔ کچھ لمحے سرکنے کے بعد شائلہ انہیں بلانے چلی آئی۔ وہ لب ولہجہ اور انداز سے تعلیم یافتہ محسوس ہوتی تھی۔ آمنہ اپنے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ مونی نے ہچکچاتے ہوئے اس کی تقلید کی۔

☆☆☆

ڈائننگ ٹیبل پر سبھی اہلخانہ موجود تھے۔ مونی کو مکمل 'پروٹوکول' دے رہے تھے۔ کھانا شائلہ نے ہی لگایا۔ آلو گوبھی' دال چنا' چاول اور کچومر سلاد کے علاوہ رائتہ بھی کافی خوش رنگ دکھائی دے رہا تھا۔ کھانے کے یہ سبھی لوازمات' مونی کے پسندیدہ تھے۔

''اکیلی کیوں لگی ہوئی ہو بھئی؟ بسمہ کہاں ہے؟'' آمنہ نے دریافت کیا۔

''وہ کہہ رہی ہے بھوک نہیں۔ سردرد کی وجہ سے اندر ہی لیٹی ہے۔'' شائلہ نے نظریں چرائیں۔

''خالی پیٹ سردرد نہ ہو تو اور کیا ہوگا؟ بلاؤ اسے باہر۔''

''دادو! آپ کو پتا تو ہے کہ وہ کس بات پر خفا ہے۔ پھر بھی یہ سب کیوں پوچھ رہی ہیں۔'' اس کے پوتے نے بے نیازی سے کہا۔ مونی یہ ساری باتیں بہت دلچسپی سے سن رہی تھی۔

''ہاں جانتی ہوں۔ اسلام آباد ٹرپ پر نہ جانے کی تکلیف اٹھی ہوئی ہے۔'' آمنہ غصہ سے بولی۔

''کیوں بچی کو تڑا رہی ہو آمنہ؟ اگر اس کا اتنا ہی من ہے جانے کا تو بھیج دو ناں؟'' مونی نے بے ساختگی سے کہا اور پھر خود ہی شرمندہ ہو کر بولی۔ ''شما چاہتی ہوں مجھے تمہارے پریوار کے معاملوں میں بولنے کا کوئی ادھیکار نہیں۔ بس وہ بچی میرے دل کو پہلی ہی نظر میں اتنا بھائی کہ میں اسے نراش نہ دیکھ سکی۔'' مونی نے شائلہ کے ہاتھ سے پلیٹ تھامی۔

''ارے مونی آنٹی! یہ اپنی دادو بھی ناں عجیب ضد لگا کر بیٹھی ہیں۔ بھئی اگر چند ہفتے پہلے کسی ٹرپ کی بس حادثہ کا شکار ہوگئی ہے تو کیا ہر بس کے ساتھ ایسا ہی ہوگا؟ اب تو خیر سیزن بھی آف ہے۔ اتنا مسئلہ نہیں ہوگا۔ اب جانے یا نہ جانے کی صورت میں چارجز لازمی دینے ہی تھے تو بہتر ہے بندہ چلا ہی جائے۔'' حیدر نے ایک بار پھر سابقہ انداز میں ہی جواب دیا۔

''تم اتنی ڈرپوک تو کبھی نہیں تھیں۔ یہ خوامخواہ کے وہم کیوں؟'' مونی نے حیرت سے پوچھا۔

''میں اب بھی ڈرپوک نہیں ہوں۔ وہ تو بس یونہی.....'' آمنہ نے خود اس کی پلیٹ میں سالن نکالتے ہوئے جواب دیا۔

''میں جانتی ہوں سکھی! مجھ سے زیادہ تیری دلیر فطرت سے کون واقف ہوگا؟'' مونی نے روٹی کا پہلا لقمہ اس کے منہ میں رکھا۔ محبت اور خلوص کا یہ انداز وہاں موجود سبھی افراد کو متاثر کر رہا تھا۔

''شائلہ! بلوا لو اسے اندر سے..... کہہ دو کہ اپنی بھوک ہڑتال ختم کردے اور پیکنگ کرے ٹرپ کے لیے۔'' آمنہ نے بھی روٹی کا نوالہ مونی کو کھلایا۔ عبداللہ' حیدر اور نوید کے چہروں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔

''واہ مونی آنٹی! آپ نے تو آج کمال کردیا۔ زندہ باد۔'' حیدر کے اس بے تکلف انداز پر مونی مسکرا دی۔

''ویسے مجھے تو یہ سب ایک فینٹسی کی طرح لگ رہا ہے۔ اتنے سال بعد دادی کی کسی بچھڑی سہیلی کا گھر آنا..... ان دونوں کی محبت..... رئیلی انٹرسٹنگ۔ سب کچھ کتنا فلمی سا لگ رہا ہے ناں؟''

''فلمیں بھی تو انسان کی زندگی پر ہی بنتی ہیں ناں پیارے لڑکے! ان کا سبجیکٹ بھی اسی سوسائٹی سے لیا جاتا ہے لیکن ہماری ٹریجڈی یہی ہے کہ ہم ہر مختلف چیز کو فلمی بنا دیتے ہیں۔'' مونی کے تجزیہ پر سبھی کی خاموشی تائیدی تھی۔

''آپ رہتی کہاں ہیں مونی آنٹی؟'' حیدر نے وہ سکوت توڑا۔

''ناروال میں۔'' وہ اطمینان سے بولی۔

''آپ کو ہمارا ایڈریس کیسے ملا؟'' نوید نے پہلی بار اس گفتگو میں حصہ لیا۔

''ڈھونڈنے سے تو بھگوان بھی مل جاتا ہے۔ یہ

تو صرف ایک ایڈریس تھا۔'' موہنی نے بے نیازی سے جواب دیا اور پھر شمائلہ سے مخاطب ہوکر بولی۔'' دال کا ڈونگہ مجھے دینا ذرا! بہت سواد ہے تمہارے ہاتھ میں۔ ایسا ٹیسٹی کھانا بہت عرصہ بعد کھایا ہے۔'' اس کی تعریف پر شمائلہ کا چہرہ کھل گیا۔ اس نے بڑے جوش و جذبہ سے پلیٹ میں دال اور چاولوں کا ایک انبار لگا دیا۔ اسی اثناء میں بسمہ نے بھی اپنی کرسی سنبھال لی تھی۔ اس کے چہرے پر پہلے جیسا تناؤ تو نہیں تھا البتہ دادی یوتی میں ایک ہلکی سی سرد مہری کی دیوار واضح محسوس ہو رہی تھی۔ موہنی نے بقیہ وقت کھانے سے انصاف میں گذارا۔ اس پر کھلندی کی طاری ہو گئی تھی۔

''موہنی آج میرے ساتھ ہی سو گی۔ آپ بچوں کے کمرے میں ہی لیٹ جائیے گا۔'' آمنہ نے عبداللہ کو مخاطب کیا۔ اس کے انداز میں ایک تحکم سا نمایاں تھا۔

''ٹھیک ہے! اگر جلد نیند آ گئی تو میں لاؤنج میں ہی سو جاؤں گا۔'' اس نے بے پروائی سے جواب دیا۔ کھانے کے بعد آمنہ اسے اپنے کمرے میں لے آئی۔

''تم اکیلی کیوں آئی ہو موہنی؟ کوئی فیملی ممبر ساتھ کیوں نہیں ہے؟''

''کچھ سفر انسان کو اکیلے ہی طے کرنے پڑتے ہیں۔ میں بھی یہ سفر تنہا ہی کرنا چاہتی تھی۔''

''پھر بھی۔ کسی کو تو لے آتی ساتھ۔ تمہارا شوہر؟'' آمنہ نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

''مجھ میں تم جیسا حوصلہ نہیں ہے سکھی! میں نے کسی کو بھی بیتے سمے کے متعلق کچھ بتایا ہی نہیں۔'' اس کے دوٹوک اور بے نیاز لہجہ نے آمنہ کو ساکت کر دیا۔

''کتنے برس بیت گئے بھلا؟'' آمنہ نے سرگوشی کی۔

''پچاس برس ہو گئے سکھی!'' موہنی کی ہنسی میں کرب تھا۔

''نہیں رے! کل کی ہی بات لگتی ہے۔''

''لگتا ہے کبھی آئینہ نہیں دیکھا تو نے۔ تیری کسی ہوئی بے داغ جلد اور جسم بغیر استری شدہ کپڑے جیسا ہو گیا ہے۔'' موہنی ہنسی۔

''جوانی تو تجھ پر بھی نہیں رہی۔ لکیروں نے جال تو تیرے چہرے پر بھی پھینکا ہے۔'' آمنہ برجستہ بولی۔

''یہ سارا کھیل لکیروں کا ہی تو تھا۔ ہماری زندگی اس ایک لکیر نے ہی تو برباد کی تھی۔ صرف ایک لکیر نے۔'' موہنی تلخ ہوئی۔

''ہمارا قصور کیا تھا موہنی؟ آخر ہمارے ساتھ ایسا کیوں ہوا؟'' وہ رنجیدہ ہوئی۔

''بٹوارہ..... ہمارا سب سے پہلا قصور بٹوارہ تھا۔ اس کے بعد ستمبر میں لگنے والی جنگ نے ہمیں آندھی کی طرح بکھیر کر رکھ دیا۔'' اس کی آنکھوں میں ماضی بڑی شدت سے اترا۔ آمنہ کی کیفیت بھی کم و بیش ایسی ہی تھی۔

☆☆☆

وہ دونوں ایک گھٹن زدہ عمارت کی رہائشی تھیں۔ اس عمارت کا رقبہ تو کافی وسیع و عریض تھا لیکن تعمیر کی عجیب ہیئت سے وہاں گھٹن اور نیم تاریکی کا راج رہتا۔ جھاڑ جھنکاڑ سے اٹے پلاٹ کے درمیان ایک چوکور ساخت کا ہال تھا۔ دیواریں سپاٹ پتھروں سے بنی تھیں۔ کہیں کوئی خلاء یا روشندان بھی نہ تھا۔ دیواروں پر مضبوط کیلوں کے ذریعہ شرقاً غرباً دو لائٹینیں ٹنگی رہتیں جن کی روشنی بصارت کے لیے رحمت کی بجائے زحمت ہی ثابت ہوا کرتی تھی۔ اس ہال نما عمارت میں موہنی اور سیتا کے علاوہ بھی درجن بھر افراد رہتے تھے جن میں سے تین لڑکیاں اور نو لڑکے تھے۔ ان سب میں ایک ہی بات مشترک تھی کہ وہ یتیم اور بے سہارا تھے۔ ان کے والدین اور اہل خانہ سن سنتالیس کے تاریخی فسادات کے نتیجہ میں اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ وہ سبھی اس 'گنڈاسکھ والا' سے تعلق تو نہ رکھتے تھے البتہ گردونواح کی آبادیوں میں کسی بھی ہندو خاندان کے بے سہارا اور لاوارث بچے کو یہیں منتقل کر دیا جاتا۔ عمارت کا کرتا دھرتا چترویدی نامی ایک شخص تھا۔ اس کی عمر پچپن برس کے قریب تھی۔ وہ گیروے رنگ کی دھوتی میں ملبوس رہتا۔ بالائی دھڑ عموماً طور پر عریاں ہی رہتا۔ نیم شفاف سر پر عقبی سمت میں چوٹی لٹکی رہتی۔ اس کی آنکھیں ہمیشہ نیم خوابیدہ ہی رہتیں۔ ان آنکھوں میں ایک عجیب قوت پنہاں تھی۔ کوئی بھی بچہ براہِ راست اس کی نظروں میں جھانکنے کی جسارت نہ کر پاتا۔ ایک بے عنوان سا خوف انہیں گھیر لیا کرتا۔

آمنہ کے ذہن میں پہلی یاد ستمبر انیس سو پچپن کی ایک شام تھی جب وہ ان بچوں کو سامنے بٹھائے کسی تفتیش میں مشغول تھا۔ آمنہ (سیتا) کی عمر اس وقت تقریباً آٹھ سال تھی۔ اس نے ہوش سنبھالتے ہی اس آشرم کے در و دیوار کو اپنی پناہ گاہ پایا تھا۔ اپنی ذات کے متعلق اسے صرف اتنا علم تھا کہ بٹوارے کے وقت اس کے والدین یہاں سے منتقلی

کرتے ہوئے کسمپرسی کی حالت میں تھے۔ ان کے قافلہ نے کسی زہریلے کنوئیں کا پانی پی لیا تھا۔ اس زہریلے پانی کے متعلق اسے یہی بتایا گیا تھا کہ علاقہ کے مسلمانوں نے اسے زہر آلود کیا تھا۔ سیتا کی والدہ اتفاقی طور پر ہی دردزہ میں مبتلا تھیں۔ انہوں نے وہ پانی تو نہ پیا البتہ تخلیق کے کربناک مراحل کو برداشت نہ کر پائی اور اسے جنم دے کر اپنے شوہر و خاندان کے عقب میں ہی پرلوک سدھار گئی۔ اسی وقت سے وہ چترویدی کے ساتھ اس آشرم میں پرورش پا رہی تھی۔ ان کی دیکھ بھال کے لیے ایک عمر رسیدہ عورت بھی آشرم میں موجود تھی۔ ہر بچہ اور بچی کے متعلق معلومات اسی نے فراہم کی ہوئی تھیں۔

''آج کی کمائی کا حساب دو بالکو!'' چترویدی کی آواز سماعت میں پڑی۔ اس نے ہر بچہ کے ذمے مختلف کام سونپ رکھے تھے۔

''میں نے آج چندے کے ڈبے سے پچاس روپے چوری کیے ہیں۔'' بارہ سالہ راجوان بھی کا غیر آئینی سرغنہ اور دلیر ترین بچہ تھا۔

''شاباش میرے شیر! کسی کو شک تو نہیں ہوا۔'' چترویدی کی آنکھوں میں چمک لہرائی۔

''نہیں گروجی! آج تک کسی کو مجھ پر شک ہوا ہے جو اب ہوگا۔'' راجو نے فخر سے جواب دیا۔ اس کا یہ فخر کچھ بے جا بھی نہ تھا۔ اس نے کئی بار مسجد کے چندے میں کامیاب سیندھ لگائی تھی۔

''تم نے آج کیا کام کیا ہے شیام؟'' چترویدی دوسرے لڑکے کی طرف متوجہ ہوا۔

''گروجی! شما چاہتا ہوں۔ میں نے زیادہ بڑا ہاتھ نہیں مارا۔ بس اسلم اور احمد کو اپنے ساتھ کھیل کود اور باتوں میں لگا کے رکھا۔ آج ان کی دو نمازیں میرے ساتھ رہنے سے چھوٹ گئیں۔'' شیام قدرے شرمندہ دکھائی دے رہا تھا۔ چترویدی کے چہرہ پر تحسین کے تاثرات ابھر آئے۔

''یہ کام بھی آسان نہیں ہے۔ شاباش! زیادہ سے زیادہ مسلمان لڑکوں سے دوستی کرو۔ ان کو کھیل کود میں لگا کے رکھو۔'' اس کے چہرے پر کمینگی عکس دکھانے لگی۔ ''سیتا! تم نے میرا دیا ہوا کام کیا کہ نہیں؟'' وہ سب لڑکوں کو چھوڑ کر اس کی جانب متوجہ ہوا۔ سیتا کی حالت غیر ہونے لگی۔ چترویدی نے اسے علاقہ کے ایک گھر سے گائے کا پیشاب کسی برتن میں لانے کا حکم دیا تھا لیکن جانوروں سے خوفزدہ رہنے والی سیتا یہ کام نہیں کر پائی تھی۔

''سمجھ گیا..... دھرم کی سیوا میں بھی ڈر لگتا ہے تجھے۔ آج تجھے ایسی بھیانک سزا دوں گا کہ اس کا ڈر ہی تیرے باقی ہڑدر کا علاج ہوگا۔ بس! بہت ہوگئی۔'' اس کی غراہٹ نے وہاں موجود ہر بچے کو سہما دیا۔ وہ ترس بھری نظروں سے سیتا کی جانب دیکھنے لگے۔

''شما کر دیجیے گروجی! اگلی بار.....'' وہ کسی خوفناک سزا یا مار پیٹ کے خیال سے ہی ادھ موئی ہونے لگی۔

''خاموش..... خاموش ہو جا!! اور تم سب بھی میری بات کان کھول کر سن لو۔ خبردار اگر کسی نے اسے تین دن تک کھانا دیا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔'' اس نے سزا کی پہلی شق کا اعلان کیا اور بقیہ بچوں سے کارکردگی دریافت کرنے لگا۔ سیتا اس کے حکم پر ہال کے ایک کونے میں جا کھڑی ہوئی۔ اس تفتیش سے فارغ ہوتے ہی لکشمی موسی نے سب کو کھانا پروس دیا جو حسب سابق چند چمچ چاول 'دال' آدھی پتلی سی روٹی اور ترکاری پر مشتمل تھا۔ کھانے کے بعد وہ وہیں فرش پر لیٹ جاتے اور لالٹینیں بجھا دی جاتیں۔ ہال کا دوسرا حصہ چترویدی کی رہائش گاہ تھا جسے ایک پردہ لگا کر باقی رقبہ سے الگ کیا گیا ہوا تھا۔ یہاں آنے کی کسی کو اجازت نہ تھی۔

لالٹین بجھتے ہی چترویدی اسے بازو سے دبوچ کر پردے کی اوٹ میں لے گیا۔ اس نے وحشت کے عالم میں درندے کی طرح اسے بھنبھوڑنے کا آغاز کر دیا۔ آٹھ سالہ سیتا کے لیے وہ لمحات کسی خوفناک خواب سے کم نہ تھے۔ اس کی کربناک چیخوں کی راہ روکنے کے لیے چترویدی نے اپنا بھاری ہاتھ اس کے منہ پر جما دیا۔ جبر' کرب' اذیت اور روح کو ریشہ ریشہ کر دینے والے ان لمحات میں اسے اندازہ ہوا کہ پردے کے عقب سے گھٹی چیخوں' سسکیوں اور کربناک آہوں کی اصل وہ درحقیقت کیا تھی؟ وہ جبر و وحشت کے یہ مراحل جھیلتی بے سدھ ہوگئی۔ گزشتہ رات کے فاقے نے اسے مزید ادھ موا کر دیا تھا۔ چترویدی نے ٹھوکر رسید کر کے اسے پردے کے عقب سے باہر پھینکا اور خود چند ہی لمحوں میں گہری نیند سو گیا۔ دیوار کے پاس گٹھڑی کی صورت میں پڑی نیم جان سیتا کو اپنے کندھے پر کسی نرم سے لمس کا احساس ہوا۔ وہ بری طرح بدک گئی۔

''ڈرو نہیں! میں تمہیں کوئی نقصان پہنچانے نہیں آئی۔'' اسے مونی کی سرگوشی سنائی دی۔

''یہ لو! پہلے اسے کھا لو۔ میں نے تمہارے لیے بچائی

تھی۔'' مونی نے روٹی اسے تھمائی۔ سیتا کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے روٹی کا ٹکڑا تھاما اور بے تابی سے کترنے لگی۔ چند نوالوں پر مشتمل روٹی ختم ہوتے ہی مونی نے اسے پیار سے تھام کر اٹھا دیا۔

''چلو میں تمہارے زخموں پر مرہم لگا دوں۔ گرودیو سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ دوپہر سے پہلے نہیں اٹھیں گے۔'' بھنگ پی کر سوئے ہوں گے۔ سیتا کو اس کے زخمی لہجہ اور انداز سے یہ بھیانک ادراک ہوا کہ وہ بھی اسی سزا کا نشانہ بن چکی ہے۔ مونی اسے لیے ہال کے دوسرے کونے میں چلی آئی جہاں لکشمی موسی سویا کرتی تھی۔

''غلطی تیری اپنی ہی ہے سیتا! گرودیو نے جو کام دیا تھا وہ کیوں نہ پورا کیا؟'' لکشمی نے پیار سے کہا۔ اس وقت ان کے ننھے دماغوں کو اس حقیقت کا ادراک نہ تھا کہ اس کی دلجوئی کے عقب میں کیسے شاطرانہ مقاصد ہیں۔

''میں ڈر گئی تھی موسی!'' ورم زدہ ہونٹوں سے آواز بمشکل نکل پا رہی تھی۔

''ہم ایک دشمن دیش میں رہتے ہیں سیتا! پہلے ہم سب کتنے خوش تھے۔ انہی مسلمانوں کی ہٹ دھرمی سے پہلے بٹوارہ ہوا اور پھر انہوں نے ہم سب پر ظلم کی انتہا کر دی۔ تجھے روتے ہوئے جب اٹھایا تھا گرودیو نے تو تیرے ماتا پتا اور پریوار والوں کی لاشیں گدھ نوچ رہے تھے۔ یہ اپنی مونی تو خیر تین سال کی تھی جب یہاں آئی۔ اس کے پریوار کو بھی ڈاکوؤں نے لوٹ کر مارا تھا۔ گرودیو کو بعد میں علم ہوا تھا کہ وہ مسلمان ڈاکوؤں کا ٹولہ ہے جو بٹوارے کے بعد یہاں رہ جانے والے ہندوؤں سے انتقام لینا چاہتے ہیں۔ یہ گرودیو ہی ہیں جنہوں نے ہمیں شرن دے رکھی ہے ورنہ مسلمان ہمیں زندہ ہی نوچ کر کھا جائیں۔ میرا ہنستا کھیلتا پریوار بھی اسی بٹوارہ کی بھینٹ چڑھ گیا تھا۔'' لکشمی طے شدہ کہانی سناتے ہوئے رونے لگی۔ ''ہمیں یہاں رہنا ہے تو اپنے طریقہ سے ہی رہنا ہوگا ورنہ مسلمان دیش کی طرح یہ گھر بھی چھین لیں گے۔ گرودیو ہمارے ان داتا ہیں۔ انہیں خوش رکھنا اور مسلمانوں سے انتقام لینا ہی ہمارا دھرم ہے۔ اگر تم اپنا دھرم پورا کرو گی تو بھگوان بھی تم سے بہت خوش ہوں گے۔'' لکشمی نے اسے مزید سمجھایا۔ سیتا نے سر ڈال دی۔ لکشمی اسے اور مونی کو ایک منصوبہ کے بارے میں سمجھانے لگی۔

☆☆☆

''میں اندر آجاؤں دادو؟'' دروازے پر دستک اور بسمہ کی آواز نے ان کے گرد بچی یادوں کی سبھا یکدم برخاست کر دی۔ اب وہاں زخم خوردہ سیتا تھی نہ ہی اسے اپنی آغوش میں سنبھالے بیٹھی مونی۔ سیتا کی سسکیاں تھمیں نہ ہی لکشمی کے جھریوں زدہ چہرے کی تشویش۔

''آجاؤ بیٹی! ہم جاگ ہی رہے ہیں۔'' آمنہ نے صدا دی۔

''وہ تو مجھے پتا تھا کہ جاگ ہی رہی ہوں گی دونوں۔ اتنے سالوں بعد ملنے والی سہیلیوں کی باتیں جلدی ختم تھوڑی ہو جائیں گی۔'' بسمہ کا مزاج خوشگوار ہو چکا تھا۔ ''خیر! مجھے آپ کا ٹرالی بیگ چاہیے۔ لے لوں؟'' بسمہ نے پوچھا اور جواب سنے بغیر کیے بغیر گھٹنوں کے بل جھک کر بیڈ کے نیچے سے ایک بیگ نکال لیا۔

''جانے سے پہلے کسی مسجد میں پیسے ڈال دینا۔ اللہ پاک کرم کرے گا۔ خیر سے سفر کٹے۔'' آمنہ نے اسے مخاطب کیا۔ بسمہ جواب میں اسے کچھ کہنے لگی۔ مونی کو اس کی آواز کہیں دور سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ ذہن ایک بار پھر بھٹک کر کئی دہائیوں کا سفر لمحہ بھر میں ہی طے کر گیا۔ منظر میں اب آمنہ اس کا کمرا، روم کولر کی ٹھنڈک اور بسمہ کی خوشگواریت کہیں بھی نہ تھی۔ اب گنڈاسنگھ والا کا گرد آلود راستہ، تاروں بھرے آسمان تلے رات کے مخصوص سناٹے میں جھینگروں کی آواز اور دم سادھے کھڑی وہ دو لڑکیاں تھیں۔ ان کی متجسس نظریں سامنے موجود مسجد میں جاتے نمازیوں پر تھیں۔ عشاء کی باجماعت نماز کا وقت ہو گیا تھا۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں بالٹیاں تھیں جسے انہوں نے بڑی مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ دبے قدموں چلتی ہوئیں مسجد میں داخل ہو گئیں۔ داخلی راستے کے چند گز بعد ایک کھلا صحن تھا جہاں درجنوں نمازی سجدہ کی حالت میں نظر آرہے تھے۔ مونی نے سیتا کی جانب دیکھا۔ وہ بالکل تیار نظر آرہی تھی۔ آنکھوں میں مخصوص اشارے ہوئے اور دونوں نے پوری قوت سے بالٹیوں میں موجود سیال دوسرے سجدے میں جانے والے نمازیوں پر الٹایا اور سرپٹ واپس دوڑ لگا دی۔ آشرم میں پہنچتے ہی انہوں نے گھاس اور جھاڑیوں سے اٹے ایک گڑھے میں بالٹیاں پھینکیں اور گڑھا دوبارہ انہی جھاڑیوں سے برابر کر دیا۔ اس روز چترویدی آشرم کے لڑکوں کے ہمراہ کہیں گیا ہوا تھا۔ پانی پینے کے بعد حواس بحال ہوئے تو وہ دونوں اپنے بستر میں جا لیٹیں۔ کچھ دیر بعد چترویدی لوٹ آیا اور اس کے کچھ

ہی پل بعد مسجد کے امام چند معززین کے ہمراہ چلے آئے۔ وہ سبھی کافی برافروختہ دکھائی دے رہے تھے۔

''دھنے بھاگیہ ہمارے! امام صاحب کیا سیوا کریں آپ کی؟'' چترویدی کی زبان سے شہد ٹپک رہا تھا۔

''یہ تمہارے لونڈوں نے کیا حرکت کی ہے؟ یہاں ایسا واقعہ تو تقسیم سے پہلے بھی پیش نہ آیا تھا۔'' امام صاحب شدید دکھی تھے۔

''ایسا کیا کر دیا ان چھوکروں نے؟'' چترویدی کی حیرت فطری تھی۔

''انہوں نے ہمارے نمازیوں پر گائے کا گوبر ملا پانی پھینک کر مسجد میں ہر جگہ بدبو اور ناپاکی پھیلا دی ہے۔ کوئی مسلمان تو ایسی غلیظ حرکت کرنے سے رہا۔'' ایک معزز شخص نے غصہ سے بتایا۔

''سید صاحب! میرے لونڈے پچھلے کئی گھنٹوں سے ابھی تک چوہدری صاحب کی حویلی میں موجود ہیں۔ ان کے بیٹے کی شادی کی تو آپ کو بھی جانکاری ہوگی۔ انہوں نے آشرم کے بچوں کو وہاں کام کرنے کے لیے بلا رکھا ہے۔ اب اگر آپ چاہیں تو کسی کو بھی بھیج کر چوہدری صاحب سے پتا کروالیں کہ میرا ایک بھی چھوکرا وہاں سے اِدھر اُدھر ہوا ہو۔ اگر کسی کا جرم ثابت ہو گیا تو جو چور کی سزا وہ میری۔'' چترویدی کا لہجہ اب بھی شیریں ہی تھا۔ امام صاحب نے دیگر معززین کے ساتھ صلاح مشورہ کے بعد سید صاحب کو حویلی روانہ کر دیا جو بیس منٹ بعد ہی چہرے پر ڈھیروں تشویش لیے لوٹ آئے۔

''یہ شخص ٹھیک کہہ رہا ہے۔ آشرم کا کوئی لڑکا وہاں سے نہیں نکلا۔'' اس انکشاف پر سب کے چہرے ست گئے اور پیشانیوں کے بل مزید گہرے ہو گئے۔

''ہے رام! ستیہ ہے۔ تو نے میری لاج رکھ لی۔'' چترویدی کی آنکھوں میں آنسو چمکے۔

''ہم معذرت خواہ ہیں، لیکن اگر تم ہماری جگہ ہوتے تو تم بھی شاید ایسا ہی سوچتے۔'' امام صاحب نے ندامت کا اظہار کیا۔

''آپ بادشاہ لوگ ہیں۔ یہ آپ کا دیش ہے۔ یہاں آپ کا راج ہے۔ آپ جس پر جو چاہیں الزام لگا سکتے ہیں۔ ہم مجبور لوگ سب کچھ سہنے کے لیے ہی تو ہیں۔ کیا کریں؟ ہمارا کوئی اور ٹھکانا جو نہیں۔'' اس کی آہ وزاری بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ معززین کی پیشانیاں ندامت سے عرق آلود ہو گئیں۔

''ایسا نہیں ہے چترویدی! یہ ملک جتنا ہمارا ہے اتنا تمہارا بھی ہے۔ تمہیں اور ان سب بچوں کو بھی جینے کے اتنے ہی حقوق حاصل ہیں۔ اس تکلیف کا ازالہ کرنے کے لیے ہمارے لائق کوئی خدمت ہو تو ضرور بتانا۔'' پنچایت کے سربراہ حسن شاہ نے بڑے خلوص سے کہا اور دیگر افراد کے ساتھ واپس روانہ ہو گیا۔ ان کے باہر نکلتے ہی چترویدی کے چہرے پر چھائی مسکینیت' عاجزی اور گریہ زاری پل بھر میں ہی غائب ہو گئی۔ اس کی جگہ خشونت' نخوت اور کروفر نے لے لی تھی۔ اس نے فوری طور پر لکشمی کو اپنے پاس طلب کیا۔

''وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا کہ اس کام میں کوئی مسلمان شامل نہیں ہو سکتا۔ یہ مہان کام آشرم واسی سے ہی ہوا ہے۔ ان کے آنے پر تیری اڑی رنگت نے بھی بتا دیا تھا کہ تجھے اصل بات کی جانکاری ہے۔ سچ بتا! کس کا کام تھا یہ؟''

''موہنی اور سیتا کا گرودیو!'' لکشمی نے ہاتھ جوڑے۔ ''میں نے ہی انہیں ایسا کرنے کا کہا تھا۔''

''واہ..... واہ..... یہ تو کمال کر دیا چھوریوں نے۔ ان کی حالت دیکھ کر میرا دل خوشی سے جھوم رہا ہے۔ ذہن میں ایک اور خیال نے جنم لیا ہے۔'' وہ خوشی سے نہال تھا۔ اس کے ذہن میں علاقہ کے معززین کی ندامت دیکھ کر ایک نئے منصوبہ نے جنم لیا تھا۔ کچھ دن بعد اس نے امام صاحب اور سرپنچ سے کہہ سن کر علاقہ کے خوشحال گھروں سے ایک وقت کا کھانا لینے کے لیے آشرم کی لڑکیوں کو بھیجنے کی اجازت لے لی۔ ان لڑکیوں کے لباس میں کوئی نہ کوئی ایسی بوتل ضرور موجود ہوتی جس میں کسی نہ کسی نجس جانور کا پیشاب موجود ہوتا۔ لڑکیاں موقع دیکھتے ہی وہ سیال گھروں میں موجود پانی کے ذخائر اور خصوصی طور پر وضو خانہ میں ملا دیتیں۔ مسلمانوں کی عبادت بھرشٹ کرنے کے خیال سے چترویدی کی خوشیاں دیدنی ہوتیں۔ اس کا مزاج آشرم کے رہائشیوں پر براہِ راست اثر انداز ہوتا تھا۔ گذرتے وقت کے ساتھ ان سبھی بچوں نے اس بات پر جبری سمجھوتا کر لیا تھا کہ راتوں میں گرودیو کی طلبی ان کے لیے کسی خوش قسمتی سے کم نہیں۔ آشرم سے باہر مسلمان لٹیروں کی صورت میں موجود ہیں۔ وہ انہیں زندہ بھی نہیں رہنے دیں گے۔ کربناک صورتِ حال اس وقت پیدا ہوتی تھی جب علاقہ کے کسی مسلمان پر غصہ کی وجہ سے چترویدی کا طیش اور ابال کا اخراج ان بچوں پر ہوتا۔ وہ ہمہ وقت یہی دعا کرتے کہ

# ملک بھر میں جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت
ملنے میں اگر دشواری ہے تو مندرجہ ذیل نمبرز پر ہمارے نمائندوں سے رابطہ کیجیے۔

| | | | |
|---|---|---|---|
| کراچی | 03002680248 | گجرات | 03016215229 |
| لاہور | 03004009578 | وزیرآباد | 03456892591 |
| ملتان | 03006301461 | لالہ موسیٰ | 03216203640 |
| حیدرآباد | 03213060477 | خان پور | 03337472654 |
| سرگودھا | 03447475344 | کوہاٹ | 03325465062 |
| پشاور | 03005930230 | ساہیوال | 03446804050 |
| کوئٹہ | 03337805247 | پاک پتن | 0300694678 |
| فیصل آباد | 03006698022 | مظفرآباد | 03469616224 |
| راولپنڈی | 03335205014 | بوروالہ | 03347193958 |
| نواب شاہ | 03003223414 | وہاڑی | 03136844650 |
| سکھر | 03009313528 | تونسہ شریف | 03346712400 |
| رحیم یار خان | 03009672096 | ڈیرہ غازی خان | 03336481953 |
| بہاولپور | 0622730455 | بہاولنگر | 03336320766 |
| گوجرانوالہ | 03316667828 | بنوں شہر | 03329776400 |
| جہلم | 03235777931 | رائے ونڈ | 03004719056 |
| سیالکوٹ | 03008711949 | ہڑپہ | 03317400678 |
| جھنگ | 0477626420 | ڈیرہ اسماعیل خان | 03349738040 |
| بھکر | 03337979701 | چشتیاں | 03348761952 |

| | | | |
|---|---|---|---|
| منڈی بہاؤالدین | 0331-7619788 | منڈی بہاؤالدین | 03460827027 |
| مانسہرہ | 0333-5021421 | سیالکوٹ | 0524568440 |
| ڈسکہ | 0300-9463975 | میرپور AK | 03460397119 |
| سمبڑیال | 0333-8604306 | اٹک سٹی | 057210003 |
| کوٹ رادھا کشن | 03004992290 | دیپالپور | 03004059957 |
| مٹن کوٹ | 0301-7681279 | لیہ | 03002373988 |
| ایبٹ آباد | 03349738040 | قصبہ ڈنگہ | 03083360600 |
| ایبٹ آباد | 0992335847 | عارف والا | 03008758799 |
| چترال | 03454678832 | لورالائی | 03023844266 |
| | | کوٹلہ ارب علی خان | 03016299433 |
| | | جلالپور پیروالا | 03338303131 |
| | | ہری پور | 03321905703 |
| | | چکوال | 03348761952 |
| | | وہوا | 03346383400 |
| | | حافظ آباد | 03006885976 |
| | | کوہاٹ | 03325465062 |
| | | پتوکی | 03454678832 |


جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
3589531 Fax: 63 C
E-mail:jdpgroup@hotmail.com

گرودیو کا مزاج خوشگوار رہے اور اس مزاج کو معتدل رکھنے کے لیے وہ اس کا تفویض کردہ ہر کام دل و جان سے کیا کرتے۔ مونی اور سیتا نے بھی ان حالات سے مکمل سمجھوتا کر لیا تھا لیکن اپنے لہولہان قلب و روح کا کہیں کوئی درماں نہ ڈھونڈ پائی تھیں۔

☆☆☆

''آمنہ! آمنہ بیگم!! ذرا میری بات سنیے گا۔''

دروازے پر دستک کے بعد عبداللہ کی آواز سنائی دی۔ مونی کے خیالات کی سبھا یکدم تحلیل ہوگئی۔ وہ دہائیوں پر محیط اس مسافت سے عجیب سی تھکاوٹ محسوس کرنے لگی تھی۔

''کیا ہوگیا بھئی؟ بستر وغیرہ تو شائلہ نے لگا ہی دیا ہوگا آپ کو؟'' آمنہ عادتاً بآواز بلند بولی۔ عجلت، جھنجلاہٹ اور بلند آواز اس کی فطرت ثانیہ میں رچی بسی معلوم ہوتی تھی۔ وہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھے اٹھی اور جوتی گھسیٹتی دروازے سے باہر چل دی۔ مونی کی نظریں ایک بار پھر کمرے میں موجود اشیاء میں بھٹکنے لگیں۔ آمنہ کو گئے زیادہ دیر ہوئی تو اس نے تپائی پر رکھا ریموٹ کنٹرول اٹھایا اور ٹی وی آن کرلیا۔ اسکرین پر ایک بھارتی فلم کے مناظر اجاگر ہوگئے۔ مونی کا ارتکاز اب اسی فلم کی جانب تھا۔ چند ثانیوں بعد آمنہ دوبارہ اندر داخل ہوئی اور مسکراتے ہوئے بستر پر بیٹھ گئی۔

''میری وجہ سے بور ہوگئی ہو ناں سکھی؟'' وہ بڑی محبت سے بولی۔

''نہیں رے پگلی! بوریت کیسی؟ مجھے تو تیرے پاس آکر بڑی اپنائیت محسوس ہو رہی ہے۔ ایسا لگ رہا ہے کہ وہ سب کہیں دوبارہ زندہ ہوگیا ہے۔''

''کاش کہ ایسا ممکن ہو پاتا۔ وقت کی یہی بات تو بڑی ظالم ہے کہ وہ پلٹ کر کبھی واپس نہیں آتا۔ مختلف روپ اور شکلوں میں کئی بار اپنی جھلک دکھاتا ضرور ہے لیکن کم بخت واپس نہیں آتا۔'' آمنہ کے چہرے پر رنجیدگی طاری تھی۔ وہ بھی اپنے ماضی کے ان کربناک شب و روز کو مونی ہی کی طرح محسوس کر رہی تھی۔ اسی لمحہ اس کی نگاہ ٹی وی پر چلنے والی فلم کی جانب اٹھی۔ یہ اس سال کی خاصی مشہور فلم تھی جس میں انسان دوستی، مذہب، رنگ و نسل سے بالاتر ہو کے انسانیت سے محبت کا درس تھا۔

''میں نے یہ فلم کئی بار دیکھی ہے اور ہر بار میرے ذہن میں ایک ہی سوال پیدا ہوا ہے کہ کیا حقیقی زندگی میں کبھی ایسا ممکن ہو پائے گا؟'' آمنہ نے کہا۔

''تم نے یہ بھی تو دیکھا ہوگا کہ اس میں دھرم اور برابری کی بات کرنے والا اس دنیا کی مخلوق ہی نہیں۔ وہ کسی اور دنیا سے آیا ہے۔ یعنی فلمیں بنانے والے بھی یہ بات مانتے ہیں کہ یہاں دھرم اور نفرت کا کاروبار ہوتا ہے۔'' مونی تلخی سے بولی۔ اس کی نظریں اسکرین پر دکھائی دینے والے منفی کردار پر مرکوز تھیں۔ اس کا جسم گٹھا ہوا قد پستہ، رنگت گہری اور سر بالوں سے یکسر بے نیاز تھا۔ اس نے سفید رنگ کا مخصوص لباس پہن رکھا تھا۔

''اس کا چہرہ اور انداز دیکھ کر مجھے پتا ہے کون یاد آتا ہے؟'' مونی کی پُرسوچ نظریں اسکرین پر ہی مرکوز تھیں۔

''ہاں! مجھے علم ہے تمہیں کون یاد آتا ہوگا؟'' آمنہ افسردگی سے مسکرائی۔ ''میں نے اس کی پہلے بھی کئی فلمیں اور ڈرامے دیکھ رکھے ہیں لیکن بخدا اس کردار میں تو یہ ہو بہو اسی کا عکس ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ ایک بار پھر مجسم روپ دھار کر سامنے آگیا ہے۔''

''گووند داس۔'' مونی کے لبوں سے برآمد ہونے والی یہ آواز کسی سسکی سے مشابہ تھی۔

مناظر ایک بار پھر تبدیل ہوگئے۔ کمرا، ٹی وی، فلم اور کردار تحلیل ہو کر سن انیس سو پینسٹھ کے ماہ اگست میں جا سموئے۔ مونی اور سیتا اب بھرپور جوان ہو چکی تھیں۔ شباب نے ان پر ایک فسوں خیز نکھار پیدا کر رکھا تھا۔ دونوں ہی قیامت خیز سراپے کی مالک تھیں۔ گذرے وقت میں آشرم نے بہت سی تبدیلیاں دیکھی تھیں۔ لکشمی موسی کا انتقال ہو چکا تھا۔ تمام تر سابقہ لڑکے یکے بعد دیگرے آشرم سے فرار ہو کر جانے کن علاقوں میں جا بسے تھے۔ خوراک کی قلت اور چترویدی کی جانب سے جسمانی استحصال نے لڑکوں میں باغیانہ جذبات پیدا کر دیئے تھے۔ لڑکیاں البتہ یہیں رہنے پر مجبور تھیں۔ بیرونی دنیا میں اس سے بھی شدید خطرات کا سامنا کرنے کی تاب ہی نہ تھی۔ چترویدی ان گذشتہ دس برسوں میں مختلف جسمانی عوارض کا شکار ہوگیا تھا لیکن اس کا کروفراب بھی جوں کا توں برقرار تھا۔ اس کی شر پسندی اور تخریب کاری رتی بھر ماند نہ پڑی تھی۔ اس نے علاقہ کے مسلمانوں کو درون پردہ ایسے آزار میں مبتلا کر رکھا تھا کہ انہیں خود بھی کبھی کسی بات کا اندازہ نہ ہو پایا۔ اس عرصہ میں آس پاس کے کم عمر یتیم لڑکے آشرم کا حصہ بنے تھے لیکن چترویدی کو اب بھی پہلے لڑکوں پر بے حد طیش رہتا۔ لڑکیوں پر اس کا خوب زور چلتا۔ انہیں کسی کام کے بغیر صرف آشرم

کی حدود میں ہی رہنے کی اجازت تھی۔ بسا اوقات وہ جھاڑ جھنکاڑ سے اٹے رقبہ میں گھوم پھر کر ہی خوش ہو لیتیں۔ اس روز بھی مونی اور سیتا وہیں موجود تھیں۔ یوم آزادی کی وجہ سے چتر ویدی کا مزاج آتشیں تھا۔ وہ اندر جانے سے شدید خائف تھیں۔

''مونی! کل رات تو کہاں غائب تھی؟'' سیتا کو یکدم یاد آیا۔

''کہیں بھی نہیں۔ تیرے پاس ہی تو لیٹی تھی۔'' مونی نے کہا۔

''اب تو جھوٹ بھی بولے گی میرے ساتھ؟ میں کل رات کتنی ہی دیر تجھ سے باتیں کرتی رہی پھر پتا چلا کہ تو تو بستر میں موجود ہی نہیں۔''

''کہاں جا سکتی ہوں؟ تجھے پتا تو ہے گرو دیو.....'' مونی نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ سیتا الجھ کر خاموش ہو گئی۔

رات کے آخری پہر چتر ویدی نے اسے اپنی شدید جنسی حیوانیت کا نشانہ بنایا تھا۔ اگر اس نے مونی کے ساتھ بستر شینی کی ہوتی تو اس قدر حیوانیت کا مظاہرہ نہ کرتا۔ سیتا کے دل میں کئی روز سے پنپنے والا خیال پختہ ہونے لگا کہ مونی اس سے کچھ چھپا رہی ہے۔ تھوڑی دیر مزید بے مقصد گفتگو کے بعد وہ آشرم کے اندر چلی گئیں جہاں گووند داس کی آمد ہوئی تھی۔

''کتنے برس بیت گئے تجھے دیکھے ہوئے؟ تو نے تو ایسا کوچ کیا کہ واپس آیا ہی نہیں۔ گنڈ اسنگھ والا سے حسینی والا اتنا دور تو نہ تھا کہ تو مجھ سے ملنے نہ آ سکتا۔'' چتر ویدی اس شخص کو دیکھ کر جذباتی ہو گیا تھا۔ سیتا اور مونی کے لیے اس جیسے سفاک شخص کی یہ کیفیت خاصی حیران کن تھی۔ انہوں نے اپنی حسیات مزید چوکنا کر لیں۔

''کیا کرنے آتا یہاں؟ بٹوارے کے بعد سب کچھ تو ختم ہو گیا تھا اس لیے میں ہندوستان چلا گیا۔'' گووند نے منہ بنایا۔

''سب کچھ اتنی آسانی سے ختم نہیں ہوا کرتا گووندے! فرنگیوں کی کمزوری نے ہمارا ہی دیش ہمارا نہ رہنے دیا۔ یہ سب اتنی آسانی سے کیسے برداشت کر لیں؟ تجھے بتایا تھا ناں کہ میں نے یہاں کیسا غدر مچا رکھا ہے۔ ان مسلمانوں نے بڑے دعوے سے اپنے دیش کا نام پاکستان رکھا تھا۔ ان کے نیتا کہتے تھے کہ یہ پاک لوگوں کے رہنے کی بھومی ہوگی۔ میں نے ان کے وجود ہی ناپاک کر دیئے ہیں۔'' چتر ویدی نفرت سے بولا۔

''غدر تو اب مچے گا پیارے! غدر تو اب مچے گا۔'' گووند نے اپنی بات پر زور دیا۔ ''بٹوارے کا انتقام لینے کا سمے آ گیا ہے۔ ان گذرے برسوں میں ہم ہندوستانی خاموش یا ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھے رہے۔ ہم نے بھی بڑی تیاریاں کی ہیں۔ اکھنڈ بھارت کا سپنا پورا کرنے کا سمے آ گیا ہے۔ بڑا غدر مچے گا یہاں۔''

''ایسا کیا ہونا ہے گووند؟ تیرے پتروں میں بھی ایسے کئی اشارے موجود تھے۔ آج کھل کر بتا ہی دے مجھے۔''

''پتروں میں اشارے سے بتانا میری مجبوری تھی۔ یہاں سے بھارت جانے والا ہر پتر کھول کر پڑھا جاتا ہے تو اواشیہ ادھر والے بھی ایسا ہی کرتے ہوں گے۔ تو بس یہ جان لے کہ.....'' گووند داس کا لہجہ دھیما ہو گیا۔ مونی اور سیتا کے اس کے الفاظ سمجھ نہ آ سکے۔ وہ الجھ کر ایک دوسرے کا منہ دیکھ کر رہ گئیں۔

''کیا واقعی؟ تو سچ کہہ رہا ہے۔ یہ تو میں نے کبھی سوچا ہی نہ تھا۔ ہے بھگوان! اگر ایسا ہو گیا تو میرا بہت بڑا سپنا پورا ہو جائے گا۔'' چتر ویدی کی آواز جوش کے باعث بلند ہو گئی۔

''تو نے کیا یہاں کے کسی بھی ناگرک نے ایسا نہیں سوچا ہوگا۔ وہ الگ دیش لے کر بہت خوش ہیں۔ نیتاؤں کی بے فکری اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ کرسی کے پیچھے اپنے پچھلے دعوے بھول گئے ہیں۔ یہ سمے ہمارے لیے بہترین ہے۔ اکھنڈ بھارت کا خواب پورا ہو کر رہے گا۔ گووند کے ارادے سننی خیز تھے۔

''میرے لائق کوئی سیوا ہو تو ضرور بتانا!'' چتر ویدی بھی اس خواب کے سحر میں مکمل طور پر جکڑ چکا تھا۔

''اواشیہ بتاؤں گا؛ اسی لیے تو میں خود یہاں آیا ہوں۔ تم اور یہ آشرم ہمارے بہت کام آ سکتے ہیں۔''

''یہ فیصلہ اگر تم لوگوں نے کچھ سے پہلے لیا ہوتا تو میں تمہیں ایسے سپاہی دیتا کہ اس دیش کے لیے ایک کی نفرت کئی سو پر بھاری ہوتی۔ لیکن وہ لونڈے ذرا قد نکالتے ہی ادھر اُدھر غائب ہو گئے ہیں۔'' چتر ویدی نے دانت پیسے۔

''میں نے سینا سے ہٹ کر ایک سینا بنانے کا سوچ رکھا ہے۔ کچھ لوگ ادھر سے اپنے ساتھ لاؤں گا۔ کچھ یہاں سے اکٹھے ہو جاتے تو اندر خانے ان پاکستانیوں کو ایسے زخم لگاؤں گا کہ بٹوارے کے بھی دکھ دور ہو جائیں گے۔''

''میں تیرے ساتھ ہوں گووندے! ہر طرح سے

تیری سہائتا کے لیے بھی تیار ہوں۔'' اس کے جوش وجذبہ نے گووند کو خوش کر دیا۔ وہ دھیمے سے لہجہ میں چتر ویدی کے ساتھ کسی نئے منصوبہ پر بات چیت کرنے لگا۔ سیتا اور موہنی سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئیں۔ انہیں یہ معاملہ کافی خطرناک اور پُراسرار معلوم ہو رہا تھا لیکن کوئی بھی سوال پوچھنے کی جسارت ان میں سے کسی میں بھی نہ تھی۔

اگلے دو ہفتے اسی خاموشی میں بیت گئے۔ اس کے بعد گووند یہاں کا مستقل مکین بن گیا۔ وہ بھی چتر ویدی کی طرح خاصا بوالہوس اور نفس پرست انسان تھا۔ آشرم کی لڑکیاں خصوصی طور پر سیتا اس کے بستر کی زینت بنتیں۔ دوسرا غیر معمولی امر یہ تھا کہ آشرم میں نت نئے چہروں کی آمد ہونے لگی۔ وہ سب مقامی لباس میں ہی ملبوس ہوتے تھے لیکن ان کے چہرے مہرے اور انداز واطوار کہیں نہ کہیں اجنبیت کی چغلی کھا جاتے۔ ان کے پاس کوئی نہ کوئی پیٹی موجود ہوتی جسے نہایت رازدارانہ انداز میں آشرم کے باہر جھاڑ جھنکاڑ اور خفیہ گوشوں میں منتقل کر دیا جاتا۔ نئے مہمانوں نے بھی ان لڑکیوں کو اپنی ہوس کا باربار نشانہ بنایا۔ سیتا کی ذہنی حالت نہایت دگرگوں ہو چکی تھی۔ اس پر مستزاد موہنی کا رات کے پچھلے پہر غائب ہو جانا اسے مزید الجھانے لگا۔ اس نے اس معاملہ پر موہنی سے بات بھی کی لیکن وہ ہر دفعہ کی طرح یہ کہہ کر ٹال گئی کہ چتر ویدی' گووند یا کسی مہمان کی طلبی پر جانا پڑا تھا۔ سیتا کی اذیت حد سے سوا ہو چکی تھی۔ وہ بارہا اپنی زندگی ختم کر دینے کے متعلق بھی کئی بار سوچ چکی تھی۔ اسی کشمکش میں چھ ستمبر کا وہ ہنگامہ خیز دن طلوع ہو گیا۔ اس روز ناشتے سے فارغ ہوتے ہی گووند داس نے حسبِ سابق ریڈیو چلا دیا۔ پچھلے کئی دنوں سے اس کی حرکات وسکنات میں شدید اضطراب محسوس کر رہا تھا۔ ریڈیو کے مختلف بٹنوں سے چھیڑ چھاڑ کرتے وہ ایک مقام پر ساکت ہو گیا۔ ریڈیو پر ایک تقریر نشر ہو رہی تھی جس میں بھارت کے پاکستان پر حملہ کا بتانے کے بعد پاکستانی افواج کی جانب سے منہ توڑ جواب کے عزم کا اظہار تھا۔

''وہ مارا.....'' گووند داس خوشی سے چلّا اٹھا۔

''بھارت ماتا کی جے ہو!'' چتر ویدی بھی پُرجوش ہوا۔ ''یہ تو بہت بڑا چمتکار ہو گیا۔'' آشرم کے سبھی افراد کے چہروں پر ایسی چمک پیدا ہو گئی تھی گویا فتح بالکل ہاتھ میں ہو۔ کچھ ہی دور موہنی اور سیتا بیٹھی تھیں۔ سیتا کا ذہن تقریر کے الفاظ اور جنرل کے انداز میں الجھا تھا۔ اس کے دل میں جانے اتنے خدشات اور خوف نے کیسے سیندھ لگائی تھی۔

''موہنی! مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔''

''ہمم.....ٹھیک کہہ رہی ہے تو۔''

''تجھے اس بندے کے الفاظ اور شبدھوں میں کچھ انوکھا محسوس نہیں ہوا کیا؟ وہ کہہ رہا ہے دشمن جانتا نہیں ہے کہ اس نے کس قوم کو للکارا ہے۔ ایک عجیب سی دھاڑ تھی اس کی آواز میں۔''

''ہمم.....ٹھیک کہہ رہی ہے تو۔'' موہنی نے ایک بار پھر سابقہ انداز میں کہا۔ سیتا کو اچھنبا ہونے لگا۔

''موہنی مجھے لگتا ہے کہ تو سٹھیا گئی ہے یا کوئی نشہ وشہ کرنے لگی ہے۔''

''ہمم.....ٹھیک کہہ رہی ہے تو۔'' اس جواب پر سیتا نے گھور کر اس کی جانب دیکھا۔ وہ بازو آنکھوں پر رکھے کسی اور ہی سوچ میں گم نظر آ رہی تھی۔

''میرا دیہانت ہو گیا ہے موہنی! میں اس وقت پر لوک سے بات کر رہی ہوں۔''

''ہمم.....ٹھیک کہہ رہی ہے تو۔'' یہ فقرہ سن کر سیتا پھٹی پھٹی نگاہوں سے موہنی کو دیکھنے لگی۔ وہ مزید کوئی بھی بات کرنے کے قابل ہی نہ رہی تھی۔ اس کے ذہن میں موہنی کے حوالے سے بے شمار خدشات کلبلانے لگے۔ اس کے مزاج میں کچھ عرصہ سے تبدیلیاں تو محسوس ہو رہی تھیں لیکن وجوہات جاننے اور سمجھنے سے بالکل قاصر تھی۔ آج کی یہ کیفیت تو تابوت میں آخری کیل ثابت ہوئی تھی۔ اس لمحہ سیتا نے اس کے مکمل تعاقب اور جاسوسی کرنے کی ٹھان لی اور دوبارہ اپنے حالیہ خدشات میں غلطاں ہو گئی۔ اسے اندازہ ہی نہ تھا کہ یہ دھڑکے اور واہمے کچھ ہی دنوں میں کیسی ہولناک صورت اختیار کر کے ان سب کے سامنے مجسم ہونے والے ہیں۔

☆☆☆

جنگ کا آغاز ہوئے تقریباً دو ہفتے بیت چکے تھے۔ آشرم کی پُراسرار سرگرمیاں جوں کی توں برقرار تھیں۔ فرق صرف اتنا پڑا تھا کہ چتر ویدی' گووند داس اور مقامی لباس میں اجنبیوں کے چہروں پر تشویش اور جھنجلاہٹ نے مستقل جگہ بنا لی تھی۔ ان کی پیشانیوں کے بل کم ہونے کے ہی نہ دیتے۔ رات گئے خفیہ گوشوں میں رکھی پیٹیاں جانے کہاں پہنچا دی جاتیں۔ کچھ روز پہلے کا اعتماد شدید خفت اور جھنجلاہٹ میں ڈھل چکا تھا۔ وہ اکثر ریڈیو کے گرد مجمع

لگائے بیٹھ جاتے۔ اس دن مایوسی ان کے ہر ایک انداز سے جھلک رہی تھی۔

''یہ سب کیا ہو رہا ہے گووندے؟ کیا یہی تیاری لے کر آئی تھی بھارتی سینا؟ کیا اسی دن کے لیے تو نے مجھے اتنے سپنے دکھائے تھے۔'' چترویدی نے تلخی سے دریافت کیا۔

''مجھے تو خود سمجھ نہیں آرہی کہ یہ سب ہو کیا رہا ہے؟ ادھر والوں کی تیاری میں کوئی کمی نہیں تھی۔ ہم تو انہیں چیونٹی کی طرح مسل کر رکھ سکتے تھے۔''

''رکھ سکتے تھے۔ لیکن رکھا تو نہیں۔ یہاں کے لوگ ایسے جوش سے بھرے بیٹھے ہیں کہ مجھے خوف آنے لگا ہے۔ کہتے ہیں ہماری سینا ہی نہیں ہم بھی آخری جام' آخری گولی تک لڑیں گے۔ سنگینیں نہ رہیں تو خالی ہاتھوں سے لڑلیں گے۔ دشمن کو چیر پھاڑ دیں گے لیکن اپنے دیش کی زمین کا ایک انچ بھی دشمن کے ناپاک قدموں تلے نہیں رہنے دیں گے۔'' چترویدی شدید ذہنی اذیت میں مبتلا تھا۔

''ہماری سینا لاہور میں کافی آگے چلی آئی تھی۔'' سیتا نے سریش نامی ایک مہمان کی آواز سنی۔ ''ہڈیارہ کے گاؤں پر قبضہ بھی کرلیا تھا۔''

''تو جواب میں کیا ملا ہمیں؟'' اجے جھنجلا کر بولا۔

''انہوں نے جوابی کارروائی میں برکی کے محاذ پر ہماری فوج کو نو گھنٹے تک روکے رکھا۔ یہ کوئی کم ذلت ہے؟''

''بی آربی نہر بہت بڑی تباہی ثابت ہوئی ہے۔'' سریش نے جواب دیا۔

''اور وہ جو فرسٹ انڈین آرمرڈ ڈویژن تھی۔ اس سے یہ اُمید نہیں تھی۔ فخر ہند کہتے تھے ہم اس ڈویژن کو۔ لیکن کیا حاصل ہوا؟'' اجے نے بھارتی ٹینکوں کا حوالہ دیتے ہوئے اپنے بال نوچ لیے۔

''جب ان ٹینکوں کی سیالکوٹ میں بڑھنے کی خبر سنی تھی تو مجھے پورا وشواس تھا کہ اب ان پاکستانیوں کی تباہی نشچت ہے۔ لیکن.....'' گووند داس نے اضطراب سے اپنے ہاتھ مسلے۔

''لیکن یہ کہ چونڈہ سیکٹر ان بھارتی ٹینکوں کا قبرستان بن گیا۔'' چترویدی ہسٹریا کا شکار ہونے لگا۔ ''یہ..... مسلے اپنے سینوں پر بم باندھ کر ان ٹینکوں کے آگے لیٹ گئے۔'' اس نے محض گوئی کرتے ہوئے کہا۔ ''لے آؤ! پورا ہندوستان لے آؤ! ایک ناخن کے برابر پاکستان نہیں سنبھالا جارہا تم لوگوں سے۔''

''دھیرج رکھیں چترویدی صاحب! ہم نے لاہور پر تیرہ اور سیالکوٹ پر پندرہ بڑے حملے کیے ہیں۔ آگے بھی حملے جاری رہیں گے۔ وچے ہماری ہی ہوگی۔'' راج ویر نے گفتگو میں حصہ لیا۔ وہ اب بھی کافی پُرامید نظر آرہا تھا۔

''کس بھرم میں جی رہے ہو تم؟'' چترویدی تلخ ہوا۔

''اگلے آبدوز غازی میں آئے اور گجرات کے قریب 'دوارکا' میں موجود ریڈار سسٹم تباہ کر گئے۔ جنگی بحری جہاز 'ککری' کو مٹا گئے۔ مجھے سینے دکھانے چھوڑ دو۔ چھوڑ دو بس۔''

''ڈوگرائی ہڈیارہ میں ہماری سفلتا کیوں بھول رہے ہو چترویدی؟'' راج ویر سفاکی سے بولا۔ ''وہاں کے سب دیہاتیوں کا قتل عام کردیا ہے ہماری سینا نے۔ وہاں سے نکلتے ہوئے کنوؤں کے پانی میں زہر بھی ڈال گئے ہیں۔ سالوں تک موت کا فرشتہ وہاں چکر لگاتا رہے گا۔ یہ کھیل ہم نے بٹوارے کے وقت بھی یہاں کھیلا تھا۔ اب بھی یہی کریں گے۔ انہیں کوئی نہ کوئی زخم لگا کر ہی جائیں گے۔''

راج ویر کی اس بات نے سیتا کا ذہن بھک سے اڑا دیا۔ وہ ایک بے نام سی خلش اور اضطراب محسوس کرنے لگی تھی۔

''لاہور پر قبضہ ہو جاتا تو بازی ہمارے ہاتھ آجاتی۔'' گووند نے کہا۔ ''افسران کہتے تھے کہ وہ لاہور جم خانہ میں شراب پئیں گے۔ اس شہر کو موج مستی کرتے ہوئے روند دیں گے۔ پھر جانے کیا گمبھیر تا پیش آگئی ہے؟''

''راوی کا پل سب سے بڑی سمسیا ہے داس صاحب!'' سریش نے لقمہ دیا۔ ''بھگوان قسم! میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ سفید کپڑوں میں کوئی شخص ہماری سینا کے سامنے پھینکے گئے بم اپنے ہاتھوں میں پکڑ لیتا اور واپس سینا کی طرف اچھالتا تو وہ فوراً پھٹ جاتے۔''

''تم اس وقت دارو کے نشے میں ہو گے۔ ایسا سمبھو ہی نہیں ہے۔'' چترویدی نے منہ بنایا۔

''گنگا ماں کی قسم! سچ کہہ رہا ہوں۔'' سریش نے اپنے حلق کو دو انگلیوں سے مخصوص انداز میں پکڑتے ہوئے کہا۔

''مجھے تو شرم آنے لگی ہے۔'' گووند نے گہری سانس بھری۔ ''ایک طرف یہاں کی سینا کے جوان ہیں جنہوں نے بم باندھ کر ہمارے سینکڑوں ٹینک تباہ کردیئے۔ ان کے رضا کار اپنی جان ہتھیلی پر لیے پھر رہے ہیں۔ ایسے ایسے کارنامے کر رہے ہیں کہ ہماری سینا نقصان پر نقصان اٹھا رہی ہے۔ دوسری اور ہمارے یہ جوان ہیں جنہیں بھوت پریت نظر آنے لگے ہیں۔ ہے بھگوان! یہ دن دیکھنے سے

پہلے تو نے مجھے اٹھا کیوں نہیں لیا؟ کیا ہماری قوم اتنی ہی بانجھ ہوگئی ہے۔ کیا ہم میں اپنی جان ہتھیلی پر رکھنے والا کوئی بھی نہیں رہا۔'' اس کی آہ وزاری بڑھتی ہی گئی۔

''یہ کام میں کرنے کے لیے تیار ہوں۔'' سیتا نے بہ آواز بلند کہا۔ وہ سب چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔

''حیران نہ ہوں۔ میں سچ کہہ رہی ہوں۔ میں کسی بھی مسلمان عورت کے لباس میں ایک کیا درجن بم بھی لے جانے کے لیے تیار ہوں۔ عورت ہونے کے ناتے کوئی شک بھی نہیں کرے گا۔ جو تباہ کروانا ہے کروالو۔ راوی کا پل' کوئی فوجی چھاؤنی' فوجی گاڑی' مسجد' بستی یا کچھ بھی۔ میں دھرم کے لیے اپنی جان دینے کے لیے تیار ہوں۔'' اس کی آواز اور آنکھوں میں جنون جھلک رہا تھا۔ گذشتہ عرصہ سے ہر رات مختلف مردوں کی حیوانیت کا نشانہ بنتے رہنے کے بعد وہ ذہنی اور روحانی طور پر شدید ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکی تھی۔ جنگ کے دوران ان سب کے تبصرے اور رائے سنتے رہنے سے اس کے ذہن میں اپنے مستقبل کی بہت بھیانک تصویر بنتی تھی۔ وہ بچپن سے ایک کٹی ہوئی پتنگ یا ڈولتی ناؤ کی مانند زندگی گذار رہی تھی۔ اس لمحہ ایسے مقام پر آپہنچی تھی کہ زندگی کا بوجھ اتار پھینکنے کی کوئی اور راہ نہیں سوجھ رہی تھی۔

''بہتر ہوتا یہ کام آشرم کا کوئی لڑکا کر لیتا۔'' گووند نے دبے لفظوں میں کہا۔

''میں نے کچھ دن پہلے یہ کوشش بھی کر کے دیکھی ہے۔'' سیتا نے بتایا۔ ''کائر ہیں وہ سب کے سب۔ رامو کہتا ہے کہ ہمیں تو سمجھ ہی نہیں آتی اس طرح کے حملوں سے فائدہ کیا ہوگا؟ یہ سینا کا کام ہے۔ وہی کرے تو اچھا ہے... اور وہ وجے..... آشرم میں کھاپی کر ہاتھی جیسا جسم بنا لیا ہے لیکن کچھ کرنے کا وقت آیا تو کہنے لگا اسی دیش کا کھا رہے ہیں اتنے سالوں سے۔ اب اسے الٹا نقصان کیوں پہنچائیں؟'' وہ تلخ ہوئی۔

''ان سالوں کو ایک لائن میں کھڑا کر کے گولیوں سے اڑا دینا چاہیے۔'' چترویدی بھڑک اٹھا۔

''آپ مان لیں گرودیو کہ ہماری قوم اس معاملہ میں بنجر ہوگئی ہے۔ انہوں نے شاستری جی کے کہنے پر یہاں چڑھائی تو کر دی ہے لیکن معاملات ہاتھ سے بہت زیادہ نکل گئے ہیں۔ نقصان سوچ سے کہیں زیادہ ہوا ہے اور بدلے میں پاکستانیوں کو کوئی نقصان نہیں ہو رہا ہے۔ جب دیش کے مرد کمزور پڑ جائیں یا ہاتھوں میں چوڑیاں پہن لیں تو عورتوں کو ہی میدان میں نکلنا پڑتا ہے۔'' سیتا کی باتیں اور انداز ان سب کو حیران کر رہا تھا۔

''بہت بڑی ذمے داری اٹھانے کی بات کر رہی ہو سیتا!'' اس کے قریب بیٹھی موہنی کی آواز لرزنے لگی۔

''اسے میری ضد سمجھ لو لیکن! دھرم کی سیوا کے لیے میری جان بھی حاضر ہے۔ ہماری طرف سے ان پاکستانیوں کو ایک بھی زخم لگ گیا تو سمجھ لوں گی کہ اپنے ماتا پتا کا بدلہ لے لیا۔ گرودیو کے احسانوں کا قرض چکا دیا۔''

''ہری اوم..... ہری اوم.....'' چترویدی کی آنکھیں فخر و خوشی سے جگمگانے لگیں۔ وہ سب سیتا کو کسی مقدس دیوی کی طرح دیکھ رہے تھے۔ ان کے ذہن میں شیخ چلی کی طرح کئی منصوبے پنپنے لگے۔

''سیتا! یہ تو نے کیا فیصلہ کیا ہے؟ مجھے تو بتایا ہوتا۔ کوئی بات تو کی ہوتی۔'' موہنی اب بھی اس کا فیصلہ ذہنی طور پر قبول نہیں کر پا رہی تھی۔

''جیسے تم تو مجھے سب کچھ بتاتی ہو موہنی! رات کو چھپ چھپ کر کس سے ملنے جاتی ہو مجھ سے کبھی بات کی؟'' سیتا نے جوابی شکوہ داغا۔

''میں تمہیں بتانا چاہتی تھی..... وہ بس.....'' موہنی گڑبڑا گئی۔ سیتا نے زخمی نظروں سے اس کی جانب دیکھا اور منہ موڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

☆☆☆

''میں اندر آجاؤں دادو! کہیں سو تو نہیں گئیں آپ؟'' دروازے پر دستک کے ساتھ بسمہ کی آواز سنائی دی۔ آمنہ پچاس برس کی جست پل بھر میں ہی لگا گنڈا سنگھ والا کے آشرم سے ڈھولن وال کے اس گھر میں پلٹ آئی۔

''ارے نہیں! آج میری سکھی آئی ہے۔ نیند بھلا کیسے آسکتی ہے؟'' اس نے خوشدلی سے جواب دیا۔ نگاہیں بستر پر چت لیٹی موہنی پر ہی مرکوز تھیں۔ بسمہ اندر چلی آئی۔

''میں حیدر کے ساتھ گھر سے روانہ ہونے لگی تھی۔ سوچا آپ سے مل لوں۔'' اسے گیارہ بجے کالج پہنچنا تھا جہاں سے طالبات کو ایک بس پر سوار کروا کے اسلام آباد کوچ کیا جاتا۔

''پروردگار تمہیں اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ کوئی غلط سلط چیز مت کھانا وہاں۔'' آمنہ نے اسے دعائیں دیں۔ بسمہ کنکھیوں سے خوابیدہ موہنی کو دیکھتی کمرے سے باہر نکل گئی۔

# انتباہ

ادارہ جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کی جانب سے تنبیہہ کی جاتی ہے کہ جو ویب سائٹس ہمارے ادارے کا نام لے کر ''آفیشل پیج'' کی اصطلاح استعمال کر رہی ہیں ان سائٹس سے ادارے کا کوئی تعلق نہیں، اسے فوری ترک کیا جائے تاکہ ہمارے معزز قارئین کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔ ایسی تمام ویب سائٹس اور سوشل میڈیا گروپس کو مرتب کرنے والے منتظمین جو اپنے سطحی مفادات کی خاطر ادارے سے شائع ہونے والے ماہناموں کے مضامین، افسانے اور کہانیاں بلا اختیار اور غیر قانونی طور پر اَپ لوڈ کر کے ادارے کو سنگین مالی نقصان پہنچانے کے ساتھ ادارے کی ساکھ متاثر کر رہے ہیں، انہیں خبردار کیا جاتا ہے کہ اس قبیح فعل کو فوری ترک کردیں، بصورت دیگر ادارہ، سائبر کرائمز کے قانون

PREVENTION OF ELECTRONIC CRIMES ACT 2016

اور

COPYRIGHT ORDINANCE 1962/2000

کے تحت کسی بھی قسم کی کارروائی کا حق رکھتا ہے۔ ایف آئی اے اور دیگر متعلقہ اداروں میں بھی ان افراد/ اداروں کے خلاف شکایات درج کرائی جائیں گی۔

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

**جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز**

C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

فون: 35804200-35804300

''موہنی! سوگئی کیا؟'' آمنہ نے بے ساختہ اسے مخاطب کیا۔ ''ابھی تو مجھے تم سے بہت سی باتیں کرنی تھیں۔ تمہارے راجو کے بارے میں، اپنے اس پرخطر سفر کے بارے میں، اپنے بعد آشرم میں پیش آنے والے واقعات کے بارے میں۔ تمہاری فیملی کے بارے میں بھی تو پوچھنا تھا۔ ابھی تو یہ بھی دریافت کرنا تھا کہ تم اچانک میرے پاس کیسے چلی آئیں؟ تقدیر ہم پر کیسے مہربان ہوگئی؟ بہت کچھ پوچھنا اور بتانا تھا۔ لیکن خیر صبح سہی۔'' بے خیالی میں اس کی آواز سرگوشی سے کافی بلند ہوگئی تھی۔ لمحہ بھر کے لیے اسے موہنی کی پلکوں میں خفیف سی لرزش کا احساس ہوا لیکن پھر ایسا ہی محسوس ہوا کہ تھکاوٹ اور بوجھل طبیعت کے باعث وہ غنودگی میں ہے۔ آمنہ کا دل ماضی جیسی محبت سے لبریز ہو گیا۔ وہ بھی کروٹ کے بل لیٹ گئی۔ گمان یہی تھا کہ لیٹتے ہی نیند آنکھوں میں ڈیرے جمالے گی لیکن ماضی کا آسیب زیادہ طاقتور تھا۔ وہ ایک بار پھر پوری قوت سے اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔ آمنہ خود کو اس پُرجبل رات میں گنڈا سنگھ کی حدود کے اختتام پر کھڑی محسوس کر رہی تھی۔ ذہن میں موہنی کے انکشاف گونج رہے تھے جو اس نے اپنے اور راجو کے متعلق کیے تھے۔ کچھ عرصہ قبل آشرم سے فرار ہونے والے راجو نے سائیکلیں اور گاڑیاں ٹھیک کرنے کا کام سیکھنا شروع کر رکھا تھا۔ وہ دربدری اور نفرت کے اس بیوپار سے اوب چکا تھا۔ موہنی اسے بچپن ہی سے بہت اچھی لگتی تھی۔ وہ دل و جان سے اسے اپنانے کا خواہشمند تھا۔ جان ہتھیلی پر رکھ کر رات گئے اس سے ملنے آیا کرتا۔ ان دونوں نے موقع دیکھ کر شادی کا منصوبہ بھی بنالیا تھا۔ سچی محبت کا خمار، آسودگی کا تصور اور ممکنہ محفوظ مستقبل نے موہنی کے اعصاب مخمور کر رکھے تھے۔ اس کے علاوہ چترویدی کا خوف بھی کنڈلی مارے ذہن میں بیٹھا تھا۔ سیتا یہ سب کچھ جان کر بہت خوش ہوئی تھی۔ اسے اپنی سہیلی کا بہترین مستقبل خاصا مطمئن کر گیا۔ وہ اس سے بغلگیر ہو کر کتنی ہی دیر آنسوؤں کے درمیان اپنی خوشی اور محبت کا اظہار دعاؤں کے ذریعہ کرتی رہی۔

''تو آج ہی راجو کے ساتھ چلی جاموہنی! یہاں زیادہ دیر رہی تو یہ درندے تجھے نوچ کھائیں گے۔'' اس نے خلوص سے مشورہ دیا۔

''تو مجھ سے ناراض تو نہیں ہے ناں سکھی؟'' موہنی نے پوچھا۔ ''میں تجھے پہلے بھی بتانا چاہتی تھی لیکن ڈرتی تھی۔ تو گرودیو سے اتنی سہمی ہوئی رہتی تھی کہ مجھے ڈر تھا تیری کوئی بھی غلطی مجھے پکڑوا نہ دے، لیکن تیری اس بہادری نے تو مجھے حیران کر دیا ہے۔''

''تو نے شاید ٹھیک ہی کیا۔ اب ہماری ملاقات اگلے جنم میں ہی ہوگی۔ بس پرارتھنا کرنا کہ اس وقت ہمیں آشرم کی بجائے کسی اچھی جگہ رہنا نصیب ہو۔'' سیتا کی آنکھوں میں نمی چمک اٹھی۔ موہنی نے بھی روتے ہوئے اسے گلے لگا لیا۔ اس کے بعد چترویدی اور گووند داس نے اس سے خصوصی ملاقات کی۔ چترویدی نے اس کے سابقہ کارناموں کی بھی دل کھول کر تعریف کی۔ سیتا کا خون مزید جوش مارنے لگا۔ گووند داس نے اسے علاقہ کی صورتِ حال اور راستے اچھی طرح ذہن نشین کروا دیئے۔ ان کا ہدف علاقہ سے باہر مسجد میں قائم شدہ رضا کاروں کا ایک خصوصی کیمپ تھا جہاں خون دینے کے خواہشمند افراد کے علاوہ فوجیوں کو محاذ پر پہنچانے کے لیے مقدس آیات کے وردشدہ خشک چنے لاکر رکھے جاتے تھے۔ وہ ذہنی تناؤ اور نفسیاتی دباؤ کی اس سطح پر پہنچ چکے تھے کہ پاکستان کو کوئی ایک ناقابل فراموش زخم لگانے کے لیے کسی بھی حد تک جانے کے لیے تیار تھے۔ گووند نے اسے شراب کے دو جام پلا دیئے جس کے بعد اس کے اعصاب بالکل روئی کی مانند ہلکے پھلکے ہوگئے۔ دل میں تمناؤں کا سمندر موجزن تھا۔ آج اس نے اپنے والدین سمیت لاکھوں افراد کے قاتل اور ان کی موجودہ حالت کے ذمے داروں سے بدلہ چکانا تھا۔ ان کو ملنے والی اذیت کا تصور فرحت بخش تھا۔ وہ اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ چکی تھی۔ اس کے ارادوں یا قدموں میں کہیں کوئی لغزش نہ تھی۔ آنے والے لمحات کا تصور ہی سنسنی خیز تھا کیونکہ اسے اپنی کامیابی کا پورا یقین تھا۔ چند قدم چلتے ہی اسے اپنا دایاں بازو کسی مضبوط گرفت میں جکڑا محسوس ہوا۔ سیتا بری طرح بدک گئی۔ اس مقام پر کسی کی بھی نظروں میں آنے کا مطلب المناک ناکامی کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس نے نظریں ترچھی کر کے نووارد کی جانب دیکھنا چاہا لیکن اس سے قبل ہی الفاظ سماعت میں دھماکا ثابت ہوئے۔

''یہاں سے واپس چلی جاؤ سیتا؟'' وہ ساکت ہو گئی۔ کسی اجنبی کی زبان سے اپنا نام سننا ایک ہولناک تجربہ تھا۔

''چترویدی اپنی حدود پھلانگ چکا ہے اور کائنات میں ہر حدود پھلانگنے والوں کا انجام یقینی ہے۔'' سیتا کو ریڑھ کی ہڈی میں شدید سنسناہٹ محسوس ہوئی۔ اس کے سامنے

بھی ایک اجنبی موجود تھا۔ وہ سرتاپا سفید براق لباس میں ملبوس تھا۔ چہرے پر ایک انوکھی چمک جو اس نے پہلے کہیں نہیں دیکھی تھی۔ سینے سے قدرے اوپر داڑھی نظروں کو بہت بھلی لگ رہی تھی۔ اس کے چہرہ پر سب سے منفرد شے آنکھیں تھیں۔ سنہری مائل، گہری، اندر تک اترتی ہوئیں۔ ان آنکھوں سے سرخی بھی جھلک رہی تھی۔ حیران کن بات یہ تھی کہ یہ سرخی دل و دماغ کو ناگوار نہیں گذرتی تھی بلکہ اس میں ایک عجیب سا سکون پنہاں تھا۔

''واپس لوٹ جاؤ سیتا! تم اپنے لوگوں کو سمجھا سکتی ہو کہ اللہ جب رسی کھینچتا ہے تو ظالم منہ کے بل آ گرتا ہے۔ چترویدی کے گناہوں کا گڑھا تو ویسے ہی اب لبریز ہو چکا ہے۔ ہماری آنکھیں سوتی نہیں ہیں ہمہ وقت جاگتی رہتی ہیں۔'' پُرسکون، گمبھیر اور پُرسوچ سی وہ آواز بھی نہایت اثر انگیز تھی۔ سیتا کا اپنے اعصاب سے قابو ختم ہونے لگا۔ اس کے باوجود مزاحمت کی لہر کہیں نہ کہیں اپنا وجود برقرار رکھے ہوئے تھی۔

''نہیں! میں واپس نہیں جاؤں گی۔'' اس نے ذہن پر چھانے والی دھند ہٹانے کے لیے سر زور سے جھٹکا۔ ''مر جاؤں گی لیکن واپس نہیں جاؤں گی۔''

''انسان جو کچھ سوچتا ہے پروردگار نے اس سے کہیں بہتر سوچ رکھا ہوتا ہے۔ تمہارے لیے کچھ اور فیصلے ہوئے ہیں۔'' ہیولا نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ سیتا لرز کر رہ گئی۔ اس کے اعصاب منتشر ہو گئے۔ ذہنی دباؤ حد سے بڑھ گیا۔ اسے یوں لگا کہ سارا خون دماغ میں جمع ہو گیا ہے۔ وہ ایک سحر کے عالم میں چلتی مسجد کی طرف روانہ ہو گئی۔ ایک جانب کچھ افراد مختلف کاموں میں مصروف تھے۔ وہ اسے دیکھ کر چونک گئے۔

''کون ہو بی بی تم؟ یہاں کیسے چلی آئیں؟''

''یہ لے کر آئے ہیں مجھے۔'' اس نے اپنے دائیں اور بائیں اطراف میں اشارہ کیا۔ وہاں موجود لوگ حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔

''یہ نہیں نشہ میں تو نہیں ہے۔ اتنے سخت حالات میں یہاں آئی کیسے؟'' ایک ادھیڑ عمر آدمی اس کی طرف بڑھا۔ سیتا کے اعصاب بالکل بے قابو ہو چکے تھے۔ دائیں بائیں سمت سے مقدس نفیس اور اپنی طرز کی انوکھی خوشبو ذہن کو مکمل طور پر اپنے سحر میں گرفتار کر چکی تھی۔

''میں آشرم سے آئی ہوں۔ یہ مسجد تباہ کرنی تھی۔

## سید عبدالوحید رضوی

(1889ء...1964ء)

سید عبدالمجید کے فرزند سید عبدالوحید رضوی کا قلمی نام ''وحید رضوی'' تھا۔ محلہ پیرزادہ امروہہ میں آپ کی ولادت 1889ء میں ہوئی۔ امروہہ کے مشہور بزرگ شاہ ابن چشت کی اولاد سے آپ کا تعلق ہے۔ تحصیل علم کے بعد ملازمت اختیار کی۔ صوبہ بہار کے ضلع راچی، ہزار باغ میں ملازمت کے بعد ریاست سروہی راجستھان میں بحیثیت منصرم خدمات انجام دیں۔ ریٹائر ہونے کے بعد آپ نے اپنے خاندان کے بزرگ ''بدر چشت'' کے عرس کے موقع پر ایک رسالہ ''درِ مقصود'' 1919ء میں جاری کیا۔ جو تاحال پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔ اپنے خاندان کے حالات پر آپ کی تصنیف ''صحیفۂ رضویہ'' کے نام سے ہے۔ آپ کا مجموعۂ کلام ''اسرارِ بدر چشت'' کے نام سے طبع ہوا جبکہ ''مثنوی سید محمود مالا بال کرمانی'' کراچی سے شائع ہو چکی ہے۔ آپ کا انتقال 13 جنوری 1964ء کو کراچی میں ہوا۔

پاکستانیوں کو یہ بتانا تھا کہ سینوں پر بم باندھ کر صرف وہی نہیں لیٹ سکتے۔ ہم بھی ایسا کر سکتے ہیں۔''

''ایسا ثابت کرنے کے لیے ایک عورت بھیجی گئی ہے۔ بھئی واہ! کیا بات ہے ہمارے پڑوسیوں کی۔'' ایک اور باریش شخص نے ہنستے ہوئے کہا۔

''وہ سب آشرم میں تمہیں مار دیں گے۔ تم سب مارے جاؤ گے۔ وہاں بہت سے ہتھیار ہیں..... بہت سا بارود..... پاکستان نہیں رہے گا..... بھارت ماتا کی جے!'' سیتا کا ذہن بے قابو تھا۔

''سن چھوکری! پاکستان ایک نور ہے۔ ہمارے رب کی دین ہے۔ اس کا کوئی بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔'' ایک نوجوان دھاڑا۔

''آشرم..... ہتھیار..... بارود..... گرو دیو.....'' وہ بے ربط انداز میں کہتی بے ہوش ہو گئی۔

سیتا کو ہوش آیا تو وہ ایک انجان جگہ پر موجود تھی۔ نیم پختہ گھر میں ایک چارپائی پر لیٹی وہ اپنے بدن میں کافی تکلیف محسوس کر رہی تھی۔ وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھی۔ اس کے تن

سے سابقہ لباس اور بارودی مواد ہٹ چکا تھا۔ مقامی طرز کی شلوار قمیص دیکھ کر اس کے ذہن میں سب سے پہلے اپنی آبروریزی کا خیال پیدا ہوا تھا۔

''گھبراؤ نہیں بیٹی! تمہارا یہ لباس میں نے ہی تبدیل کیا تھا۔ مگر لباس میں بارود وغیرہ کچھ نہ تھا۔'' اس کے دائیں سمت میں رکھی چارپائی پر ایک اور عورت موجود تھی جسے سیتا نے پریشانی کے باعث دیکھا ہی نہ تھا۔

''میں یہاں کیسے؟ جنگ..... آشرم..... گرودیو۔'' وہ بے ربطگی سے بولی۔

''جنگ تو ختم ہوگئی بیٹی۔ سترہ روز میں ہی دشمن کے حوصلے پست ہوگئے۔ آشرم کے متعلق مجھے صرف اتنا علم ہے کہ وہاں چند رضا کاروں نے فوجیوں کا روپ لے کر حملہ کیا تھا۔ کافی مقدار میں ہتھیار بھی پکڑے۔''

''اور آشرم واسیوں کا کیا ہوا؟ وہ کہاں گئے؟'' سیتا شل ہوئی۔

''مرد تو سب کے سب مارے گئے۔ عورتوں کو دارالامان بھیج دیا تھا۔'' وہ خاصی باخبر معلوم ہوتی تھی۔

''موہنی..... میری سکھی موہنی کہاں ہے؟ مجھے اس سے ملنا ہے۔'' وہ ایک بار پھر تڑپی۔

''جو لڑکیاں آشرم سے ملی تھیں ان میں سے کسی کا نام بھی موہنی نہیں تھا۔'' عورت کی اس بات نے سیتا کے ذہن سے منوں بوجھ اتار دیا۔ وہ سمجھ گئی کہ موہنی ضرور راجو کے ساتھ فرار ہوگئی ہوگی۔ اس کے ساتھ ہی اپنے مستقبل کے بارے میں تفکرات نے اسے گھیر لیا۔ عورت کا لب ولہجہ اور انداز شاہد تھا کہ وہ کسی مسلمان کے گھر موجود ہے۔

''میں تمہاری دلی کیفیت سمجھ رہی ہوں بیٹی! میرے گھر میں کوئی مرد نہیں رہتا۔ میرا شوہر بٹوارہ میں اور بیٹا رضا کار کے فرائض سرانجام دیتا شہید ہوگیا۔ تم چاہو تو میرے ساتھ بے فکری سے رہ سکتی ہو۔'' فاطمہ نامی وہ عورت شہد میں ڈوبے لہجے میں بولی تھی۔ سیتا ایک عجیب سی تھکاوٹ محسوس کر رہی تھی۔ اس کے سامنے ایک طویل زندگی تھی لیکن منزل تھی نہ ہی کوئی راہ گزر۔ اس نے اپنے آپ کو تقدیر کے سپرد کر دیا۔ فاطمہ کا سلوک اس کے ساتھ بہت اچھا رہا۔ مذہب کے معاملہ پر بھی کبھی کوئی بات نہ ہوئی۔ فاطمہ نے اسے اردو اور انگریزی پڑھانے کا آغاز کر دیا۔ کئی سال اسی طرح دبے قدموں بیت گئے۔ فاطمہ کے ساتھ رہتے ہوئے اس نے مسلمانوں کا وہ روپ دیکھا جس سے آج تک آشنائی نہ تھی۔ اکہتر کی جنگ میں ملک کے ایک بازو سے محروم ہونے کے بعد بھی جب فاطمہ کے رویہ میں اس کے لیے کوئی تبدیلی نہ آئی تو وہ ایک طویل کشمکش سے آزاد ہو کر اسلام قبول کرنے کے لیے تیار ہوگئی۔ اس روز فاطمہ کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ اس نے علاقہ بھر میں مٹھائی تقسیم کی۔ حالات نے ایسا پلٹا کھایا تھا کہ وہ خود بھی یقین نہیں کر پا رہی تھی۔ تبدیلی مذہب کے بعد علاقہ کے امام صاحب نے اپنے بھانجے کا رشتہ پیش کر دیا۔ انہیں سیتا کے داغدار ماضی کی کوئی پرواہ نہ تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ دائرہ اسلام میں داخل ہوتے ہی اس کی سابقہ زندگی سے اب کوئی سروکار نہیں۔ آمنہ کا پورا پورا تشکر میں بھیگنے لگا تھا۔ عبداللہ سے شادی کے بعد اس کی تین اولادیں بھی ہوئیں۔ بڑا بیٹا حمید بیرونِ ملک ملازمت کرتا تھا۔ اس کا خاندان بھی وہیں مقیم تھا۔ پاکستان آمد شاذ و نادر ہی ہوتی۔ دوسری بیٹی کی شادی مقامی شخص سے ہی ہوئی تھی لیکن وہ بھی بعد ازاں بیرونِ ملک منتقل ہوگئے۔ اب ان دونوں کا قیام چھوٹے بیٹے نوید کے ساتھ تھا۔ گزشتہ برس وہ حج کی ادائیگی بھی کر آئے تھے۔ زندگی سے اب کوئی تمنا نہ رہی تھی لیکن زندگی نے خود ہی کسی مہربان سکھی کی طرح اس کے دل میں برسوں سے دبی خلش کا خاتمہ کر دیا۔ آج موہنی اس سے ملنے چلے آئی تھی۔ جانے کیسے پہنچی تھی اس تک؟ آمنہ کا منتشر اور ماضی میں بھٹکتا ذہن غنودگی محسوس کرنے لگا۔ پلکوں پر بوجھ زیادہ ہوا تو اس نے کمرے میں لائیٹ کی پرواہ کیے بغیر ہی نیند کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ نیند کی وادی میں قدم رکھنے سے اک ذرا سی دیر پہلے اسے اپنے سینے میں انگارا دہکتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ تڑپ گئی۔ آنکھیں کھلتے ہی سامنے موہنی کھڑی نظر آئی۔ اس کے ہاتھ میں جدید ساخت کا پسٹل تھا۔

''موہنی..... یہ..... سب کیا ہے..... سکھی؟'' وہ اذیت سے بولنے کے قابل ہی نہ رہی تھی۔

''تو نے میرے ساتھ جو کیا تھا اس کے بدلہ میں یہ بہت تھوڑی سزا ہے۔'' موہنی نے اس کے چہرہ پر تھوک دیا۔

''میں..... نے..... کیا..... کیا؟'' وہ کرب سے بولی لیکن موہنی اس کی بات ان سنی کر کے باہر نکل گئی۔ پسٹل اس کے ہاتھ میں ہی تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ فاتحانہ انداز میں اندر آئی اور اس کی طرف دیکھ کر سفاکی سے بولی:

''مار دیا ہے تیری اولاد اور شوہر کو بھی۔ سیدھی بھیجے میں گولیاں ماری ہیں۔ تجھے سینے میں اس لیے ماری کہ یہ

خبر سننے سے پہلے زندہ رہ سکے۔'' اس نے اپنا بیگ نکالا اور نفرت سے اس کی طرف دیکھتی باہر نکل گئی۔ آمنہ کے بدن کو جھٹکا لگا اور روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

☆☆☆

بسمہ اپنے والدین کے کمرے میں گھٹنوں کے بل فرش پر جھکی تھی۔ کچھ دیر پہلے اس کے البلحانہ کی تدفین ہوئی تھی۔ وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ کالج ٹرپ سے بھرپور لطف اندوز ہوئی تھی۔ ٹرپ صرف ایک روزہ تھا۔ اسی رات انہیں لاہور کے لیے روانہ ہونا تھا۔ سارا دن سہیلیوں کے ساتھ تصویریں لیتے اس نے گھر والوں سے رابطہ کا بالکل خیال نہیں رکھا۔ یہ گمان بھی پیدا نہ ہوا کہ گھر والوں میں سے کسی کا فون کیوں نہیں آیا؟ کالج لوٹی تو حیدر کو فون کرنے کی کئی بار کوشش کی لیکن کسی نے فون نہ اٹھایا۔ وہ پہلی بار تشویش میں مبتلا ہوئی۔ رکشا لے کر واپس لوٹی تو اس کے گھر پر ایک قیامت گذر چکی تھی۔ وہ سب سے پہلے والدین کے کمرے میں ہی گئی۔ ناقابل برداشت منظر نے اسے بالکل ڈھا دیا تھا۔ دادا' دادی اور بھائی کو دیکھ کر وہ اپنے ہوش وحواس سے بالکل ہی بے گانہ ہوگئی۔ کچھ روز اسی بے ہوشی میں گذر گئے۔ اس کے تایا اور پھپھی کو سانحہ کی اطلاع دی جا چکی تھی۔ تایا کی طبیعت اس قدر بگڑی کہ اسے فوری طور پر اسپتال منتقل کرنا پڑا۔ وہ دل کے دورے سے جانبر تو ہوگیا لیکن سفر کی ممانعت کر دی گئی۔ اس کی پھپھی البتہ دوسرے روز آ پہنچی تھی۔ نورین نے بسمہ کی کافی دیکھ بھال کی۔ اسے دنیاداری کی طرف واپس لاتے کئی ہفتے بیت گئے لیکن پھر ایک واقعہ ایسا ہوا کہ بسمہ اپنے ہوش وحواس بالکل ہی کھو کر ذہنی امراض کے اسپتال منتقل ہوگئی۔

طبیعت سنبھلتے ہی اس نے موبائل فون پر سوشل میڈیا کا استعمال بحال کیا تو اسے ایک انجان آئی ڈی سے ایک طویل پیغام موصول ہوا۔

''کیسی ہو بسمہ پیاری؟ تمہیں آن لائن دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ بالکل ایک کمینی سی خوشی۔ تم میری توقع پر پوری اتری ہو۔ مجھے یقین تھا کہ اس حادثہ کے بعد تم ضرور زندہ بچ جاؤ گی۔ تم حیران ہو رہی ہوناں کہ میں نے تمہیں آن لائن کیسے پہچان لیا؟ میں تو تمہاری آئی ڈی میں ایڈی نہیں۔ تو میری بھولی بسمہ! تم درجنوں کے حساب سے جن گروپس میں شامل ہو میں بھی انہی میں سے ایک کا معمولی 'سلیپر زیل' ہوں۔ تمہاری پوسٹ دیکھ کر علم ہوگیا کہ واپسی ہوگئی ہے۔

## گرلز گائیڈ (Girls Guide)

لڑکیوں کا وہ نظام جو اسکاؤٹ لڑکوں کے نظام کے متوازی ہے۔ اس کو 1910ء میں لارڈ بیڈن پاؤل (B.Powell) اور اس کی بہن ایگنس (Agnes) نے مرتب کیا اور یہ تحریک بہت جلد تمام دنیا میں پھیل گئی۔ اس میں 7 سال سے لے کر 21 سال تک کی لڑکیاں بھرتی کی جاتی ہیں اور یہ نظام تین حصوں (براؤنی گائیڈز (7 تا 11 سال)، رینجر گائیڈ (14 تا 20 سال) اور بالغ گائیڈ (21 سال سے اوپر) پر مشتمل ہے، اور ان کو اچھا شہری اور مفید رہنما بننے کی تربیت دی جاتی ہے۔ امور خانہ داری، انتظام خانہ اور ان سے متعلقہ سامان مہیا کرنا خاص طور پر سکھایا جاتا ہے اور بیرون خانہ مشاغل اور کیمپ کی زندگی سے بھی روشناس کرایا جاتا ہے اس کے بھی گروپ ہوتے ہیں، جن کے اوپر گروپ ماسٹر اور ڈسٹرکٹ ماسٹر ہوتے ہیں۔ پاکستان میں اس تحریک کا آغاز قائد اعظم محمد علی جناح کے کہنے پر محترمہ فاطمہ جناح کی سرپرستی میں 29 دسمبر 1947ء کو ہوا۔ 1948ء میں سوسائٹی ایکٹ XXI مجریہ 1860ء کے تحت اس کو رجسٹرڈ کروایا گیا۔ بعد ازاں 1960ء میں فیلڈ مارشل محمد ایوب خان، صدر پاکستان کے ایک آرڈی ننس کے ذریعے ایسوسی ایشن کو مزید تحفظ فراہم کیا گیا اور حکومت کی جانب سے گرلز گائیڈ ایسوسی ایشن کو قومی غیر سرکاری انجمن کا درجہ دیا گیا۔ گرلز گائیڈ تحریک کی بنیاد مذہب پر بھی رکھی گئی ہے اور کسی بھی مذہب کی پیروکار لڑکیاں اس تحریک کی رکن بن سکتی ہیں۔

مرسلہ: نائیلہ انجم، زوب بلوچستان

اچھا میری بچی! زیادہ کنفیوژ نہ ہو! میں اپنا تعارف کروا دیتی ہوں۔ میرا نام موتی ہے۔ تمہاری مرحومہ دادی کے بچپن کی سکھی موتی۔ یاد آگیا ناں؟ تم نے اپنی دادی سے تو ماضی کے سارے قصے سنے ہوں گے۔ آج میں تمہیں تصویر کا دوسرا رخ دکھاتی ہوں۔ ہم دونوں ایک آشرم میں پلی بڑھیں۔ بچپن ایک آسیب تھا۔ گرودیو کی ہوس کا آئے روز نشانہ بننا آسان تو نہ تھا۔ میں نے سیتا کو ہمیشہ ایک بہن کی طرح سہارا دیا۔ اس کی خاطر گرودیو کی مار بھی سہی۔ کیا کہا تم نے؟ ان سب باتوں سے تم واقف ہو۔ ہاں بھئی! واقف ہی ہو گی۔ تمہاری مرحومہ دادی بہادر ہی اتنی تھی کہ اس نے اپنا بھیانک ماضی بھی بڑے فخر سے سب کے ساتھ شیئر کر رکھا تھا۔ چلو! میں تمہیں کچھ نیا بتاتی ہوں اور یہ بتاتی ہوں کہ میں تمہارے گھر آخر پہنچی کیسے تھی؟

تو سنو میری پیاری! جس رات سیتا اپنے جسم پر بارود باندھ کر روانہ ہوئی تھی اسی رات میں نے راجو کے ساتھ آشرم سے فرار ہونا تھا۔ راجو..... میری پہلی محبت۔ مجھے زندگی کی خوبصورتی سے آشنا کرنے والا پہلا اور آخری مرد۔ ہم دونوں نے ایک ساتھ بہت سے سپنے دیکھے تھے۔ شادی کے سپنے، اولاد اور خوشحالی کے سپنے۔ وہ سب سپنے بس کچھ ہی دیر کی تو دوری پر تھے۔ پھر ہم ایک ہو جاتے اور سب کچھ حاصل کر لیتے۔ پگاڑ تو اس وقت پیدا ہوا جب آشرم پر پاکستانی فوجیوں نے حملہ کر دیا۔ گرودیو اور گووند داس حیران تھے کہ یہ حملہ آخر ہوا کیوں؟ لیکن اس وقت کسی بھی حیرانی سے زیادہ اپنا بچاؤ اہم تھا۔ میرا دل بہت ڈر رہا تھا۔ مجھے پتا تھا کہ میرا راجو باہر کسی نہ کسی کونے میں میرا انتظار کر رہا ہے۔ آشرم کا ہر کونا ہی تو ہمارا راز دار تھا۔ ہم نے حماقت یہ کی تھی کہ آشرم سے باہر کبھی جگہ پر نہیں ملے۔ کوشش یہ ہوتی تھی کہ گرودیو کی کسی بھی پکار یا کسی بھی غیر متوقع صورتِ حال پر فوراً آشرم کے اندر پہنچ سکوں۔ خدشات اور دھڑکے تو شروع سے ہی میرے دل اور دماغ میں پلتے تھے لیکن اس روز میرا ہر ڈر گھڑی کی گھڑی پورا ہوتا رہا۔ فوجیوں کی چلائی گئی گولیاں ویسے تو بہت نپی تلی ہوتی ہیں لیکن اس روز ایک چوک ہو گئی۔ نہ جانے کس فوجی کی گولی راجو کو جا لگی۔ وہ گولی کے نشانہ پر کیسے آیا مجھے یہ بھی نہیں پتا۔ بس یاد ہے تو وہ منظر جب گولیوں کی دھائیں دھائیں میں میرے راجو کی چیخ بھی سنائی دی۔ میں جل بن مچھلی کی طرح تڑپ کر رہ گئی۔

''یہ سب ہو کیا رہا ہے؟ کیسے آ مرے یہ ادھر؟''

گووند چلایا۔

''مجھے کیا پتا ہو؟ میں خود کو ان کے حوالے کبھی نہیں کروں گا۔'' اس نے اپنی رعشہ زدہ ٹانگ کو دیکھا جو فرار کے بالکل قابل نہ تھی اور ایک جنون میں بندوق سے اپنے سر میں گولی مار لی۔

''لعنت ہو! مجھے لگتا ہے کہ وہ اُلو کی پٹھی سیتا پکڑی گئی ہے یا ماری گئی ہے۔ اسی کی بو سونگھتے یہ سب یہاں چلے آئے ہیں۔'' گووند نے اندازہ لگایا۔ میرے ذہن میں بھی یہی نکتہ تھا۔ سیتا مسلمانوں سے جس قدر نفرت کرتی تھی وہ ہماری مخبری بھی نہ کرتی۔

''مجھے ایک راستے کا علم ہے۔ اسی کائر چتر ویدی نے بتایا تھا۔ نکل چلتے ہیں یہاں سے۔'' گووند نے اپنے ساتھیوں سے کہا جو مقابلہ کرتے ہوئے اپنی درجن بھر تعداد سے آدھے رہ گئے تھے۔

''مجھے بھی لے چلیں ساتھ۔ میرا اب یہاں کون ہے جس کے لیے اس مسلمان دیش میں رہوں۔'' میں نے گووند داس سے کہا۔ اس نے میرا ہاتھ تھاما اور آشرم کے بیت الخلاء کے ایک سالخوردہ دروازہ سے نکل کر جھاڑیوں سے الجھتا جانے کن رستوں پر چلتا رہا۔ میں ایک زومبی کی طرح اس کے ساتھ تھی۔ مجھے نہیں علم کہ وہ اپنے کس ساتھی کے گھر کچھ دن پناہ میں رہا۔ جنگ ختم ہو گئی۔ میری طرح قوم کے سپنے بھی چور چور ہو گئے۔ گووند داس کو خاموشی نے گھیر رکھا تھا۔ ایک روز اس نے مجھے اپنے ساتھ ہندوستان چلنے کے لیے کہا۔ اس کے ذہن میں شاید کچھ نئے منصوبے تھے۔ میں تو ایک لاش تھی۔ جہاں چاہتا مجھے لے جاتا۔ ہم جیسلمیر والا پہنچ گئے اور وہاں میرا نیا جنم ہوا۔ جیسلمیر والا سے ایک بڑے شہر میں جا کر میری تعلیم کا بندوبست کیا گیا۔ مجھے مسلم طور طریقے بھی سکھائے گئے۔ دھیرے دھیرے مجھے ان کا کھیل سمجھ آنے لگا۔ وہ ایک خطرناک فوج تیار کر رہے تھے۔ یہ ان کے ترپ کے پتے بھی تھے۔ انہیں اچھی طرح تیار کر کے پاکستان کے مختلف علاقوں میں نیچرز بھرتی کیا جاتا۔ اس کے لیے ہونا تھا تمہیں اچھی طرح علم ہے۔ میں تفصیل بتا کر اپنا وقت کیوں برباد کروں؟ تمہارے لیے بس اتنا جاننا ہی کافی ہے کہ موتی ایک نئے نام سے تمہارے ہی ملک میں بیٹھی سالوں سے تمہاری نئی نسل کی جڑیں زہریلی کر رہی ہے۔ میں جانتی ہوں کہ اب تمہارے پیٹ میں یہ مروڑ اٹھ رہے ہوں گے کہ میں تمہارے گھر تک کیسے پہنچی۔ تو اس کا

جواب بہت سادہ تھا۔ ہمارا رویہ۔ اس ملک میں برس ہا برس اپنا فرض پورا کرنے کے دوران میں ماضی کیسے بھول سکتی تھی اور اب ماضی نہ بھولی تھی تو سیتا کو فراموش کرنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ یہاں رہ کر میں نے ٹیکنالوجی کا استعمال سیکھا اور سوشل میڈیا پر بھی خوب مستعد رہی۔ اب میں تو ایک سیدھی سادی سی مسلم پاکستانی ٹیچر تھی۔ میرا حلقہ احباب اس ملک اور دین سے متعلقہ گروپس تھے۔ نئی نسل کا رجحان دیکھتے رہنا بھی بہت ضروری جو تھا۔ اس سال اگست میں کسی گروپ میں ایک مقابلہ ہوا جس کا عنوان تھا 'پاکستان ہمیں کن قربانیوں سے ملا؟' کچھ یاد آیا؟ ہاں بالکل وہی مقابلہ جس میں تم نے بھی حصہ لیا تھا اور اپنی بہادر دادی کے کارنامے بتا کر سب کو خوب جذباتی کیا تھا۔ میں سب سے پہلے تمہاری پروفائل پر لگی تصویر دیکھ کر چونکی تھی۔ تم بھی پاکستان کی ان پچانوے فیصد لڑکیوں کی طرح ہی تھی جو اپنی تصویر تو لگا نہیں سکتیں اس لیے کسی اداکارہ یا پھر دادی نانی کی تصویر لگا کر خوش ہو لیتی ہو۔ سیتا کی تصویر دیکھ کر میں خوش بھی تھی اور حیران بھی۔ لیکن جب تمہارا آرٹیکل پڑھا تو میرا دماغ کسی ہانڈی کی طرح ابلنے لگا۔ تم نے بتایا تھا ناں کہ سیتا نے اپنی جان پر کھیل کر آشرم کی مخبری کی تھی بلکہ وہ اس حملہ کے وقت خود بھی آشرم سے باہر ہی موجود تھی۔ وہ اپنے جسم پر بارود باندھ کر مسجد تباہ کرنے گئی تھی۔ لیکن اصل میں یہ سب اس نے آشرم کی تباہی اور پاکستان کی محبت کے لیے کیا تھا۔ وہ سوچتی تھی کہ ساری زندگی اس وطن نے کھلایا ہے تو اس مشکل وقت میں ملک کا ساتھ کیوں چھوڑا جائے؟ اسے آخری روز گرودیو کی باتوں سے ہی اندازہ ہوا تھا کہ پاکستان سے جاتے ہوئے کنوؤں میں زہر ہندوؤں نے ہی ملایا تھا۔ پھر راستے میں دو اجنبی بزرگ مل گئے۔ انہوں نے سیتا کی کایا ہی پلٹ دی۔ ساری باتیں سولہ آنے سچی تھیں۔ آشرم کے دن رات بھی ویسے ہی بتا رکھے تھے جیسے ہم کرب و اذیت میں گزارا کرتے تھے۔ اس روز میری پہلی محبت کا درد پھر سے زندہ ہو گیا۔ اس روز مجھے اس نئے جنم میں کیے گئے عہدوں نے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ مجھے انتقام لینا تھا۔ اپنی محبت کا انتقام..... اپنی قوم کے دکھوں کا حساب..... اپنے راجو کی موت کا حساب..... اپنے خوابوں کے اجڑنے کا انتقام..... مجھے اس پون صدی کا انتقام لینا تھا۔ تمہاری بہادر اور جانباز دادی کی اس داستان کو سینکڑوں لوگوں نے پسند کیا۔ تم مقابلہ میں تیسرے نمبر پر آئی۔ ہر ایک پل میرے

## گلوکوز Glucose

گلوکوز یا انگور کی کھانڈ، ادویات کے طور پر عام استعمال میں آنے والی چیز۔ بچوں، کمزوروں اور بیماروں کو گلوکوز کا شربت بنا کر پلایا جاتا ہے جو فرحت بخش ہونے کے علاوہ طاقت بھی دیتا ہے چونکہ اس کا ذائقہ میٹھا ہوتا ہے اس لیے چھوٹے بچے بھی خوشی سے پی لیتے ہیں۔ گلوکوز ہر قسم کے نشاستہ یا اسٹارچ کا جزو ہوتی ہے، لیکن انگور میں سب سے زیادہ پائی جاتی ہے۔ صنعتی مقاصد کے لیے بڑے پیمانے پر اسٹارچ سے حاصل کی جاتی ہے۔ اسٹارچ کو پانی میں ملا کر گاڑھی سی لئی بنالی جاتی ہے، پھر اس میں گندھک کا تیزاب (سلفیورک ایسڈ) ملا کر اچھی طرح ہلانے کے بعد گرم کیا جاتا ہے۔ اسے مسلسل گرم کرتے جاتے ہیں اور کبھی کبھی تھوڑی سی لئی نکال کر اس پر آیوڈین کا اثر دیکھتے رہتے ہیں۔ جب تک کہ تمام اسٹارچ حرارت کے سبب تبدیلی اختیار نہیں کر لیتی۔ اس وقت تک آیوڈین کا رنگ اس کے عمل سے نیلا ہوتا رہے گا۔ جب معلوم ہو جاتا ہے کہ اب تمام اسٹارچ تبدیل ہو چکی ہے اور آیوڈین کے ساتھ کوئی اثر ظاہر نہیں کرتی تو اس گرم محلول میں کیلشیم کاربونیٹ ڈال دیا جاتا ہے، تاکہ تیزاب (سلفیورک ایسڈ) کی تعدیل (Neutralization) ہو جائے۔ اس کے بعد محلول کو فلٹر کر لیا جاتا ہے، اور خشک کر کے ٹھوس گلوکوز حاصل کر لی جاتی ہے، یہ گلوکوز بالکل صاف نہیں ہوتی، بلکہ اس کا ہلکا بھورا رنگ ہوتا ہے۔ محلول کو اگر خشک کرنے سے قبل حیوانی کوئلا Animal charcoal کے ساتھ ملا کر جوش دے لیا جائے، تو رنگت بالکل اڑ جاتی ہے اور حاصل شدہ گلوکوز بالکل صاف اور بے رنگ ہوتی ہے۔ خالص گلوکوز سفید قلمی ٹھوس ہوتی ہے، جو 144 درجہ سینٹی گریڈ پر پگھلتی ہے یہ پانی میں کافی حل پذیر ہوتی ہے۔ محلول بنتا ہے تو کچھ ٹھنڈک بھی پیدا ہوتی ہے یہ کاربن ہائیڈروجن اور آکسیجن کا نامیاتی مرکب ہوتی ہے، اور دوسرے نامیاتی محلل مثلاً الکحل یا ایتھر میں بھی اسے آسانی سے حل کیا جاتا ہے گلوکوز کا ذائقہ خاصا میٹھا ہوتا ہے، لیکن اس کی مٹھاس گنے کی شکر سے کم ہوتی ہے۔ گلوکوز کی تخمیر سے سرکہ اور شراب بھی بنائی جاتی ہے۔ بہت سی کیمیائی اشیا کی تیاری میں نیز شربت اور مربے بنانے میں گلوکوز کا خاصا استعمال ہوتا ہے۔

مرسلہ: سہیل آفندی، ملتان

ناسور کو مزید گہرا کر رہا تھا۔ سیتا نے یہ میرے ساتھ کیا دغا کیا تھا؟ اس کی وہ مسلمانوں سے نفرت اور دشمنی پریم میں کیسے بدلی مجھے یہ جاننے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ سانپ گذر چکا تھا۔ لکیر کیوں پیٹتی میں؟ مجھے تو بس اس غدار سے انتقام لینا تھا۔ میں ایک نئی آئی ڈی سے تمہارے پاس ایڈ ہوئی۔ تمہیں یہ بتایا کہ میں تمہاری دادی کی جدوجہد سے بہت متاثر ہوئی ہوں۔ تمہاری خود پسندی کا غبارہ پھول گیا۔ باتوں باتوں میں تم سے گھر کا محل وقوع اگلوانا میرے جیسی پختہ کار کے لیے کیا مشکل تھا۔ تم کل کی بچی تھیں۔ میرے ہاتھوں آسانی سے استعمال ہوگئیں۔ میں تمہارے گھر پہنچ گئی۔ ہتھیار اپنے بدن پر باندھ رکھا تھا۔ سیتا حسب توقع مجھے دیکھ کر اداکاری کا مظاہرہ کرتی رہی جیسے میرے آنے سے بہت خوش تھی۔ میں نے اسے اس کی خوشی میں خوش ہونے کی جوابی اداکاری کی۔ ہم دونوں ہی اپنے نئے جنم میں ایک دوسرے سے مل رہی تھیں۔ وہیں مجھے تم نظر آئیں۔ سیتا کی نوجوانی کا ہو بہو عکس۔ اس گھر میں گذارے گئے چند گھنٹے میرے لیے کسی عذاب سے کم نہ تھے۔ مسلمانوں سے نفرت کرنے والی سیتا اب خود ایک مسلمان تھی۔ اس کے پاس پیار کرنے' خیال رکھنے والا' جان وارنے والا شوہر تھا۔ اولاد تھی۔ گھر بار تھا۔ وہ سب کچھ تھا جس کے خواب میں نے راجو کے ساتھ دیکھے تھے۔ میرے راجو کی قاتل کس قدر آرام وسکون سے رہ رہی تھی۔ میری قوم کے قاتلوں کے ساتھ کیسے رعب سے رہتی۔ اس کے بعد کی کہانی کا تمہیں علم ہی ہے۔ تمہیں ٹرپ کی اجازت دلوانا بھی میرا ایک مقصد ہی تھا ورنہ تمہارا شکریہ کیسے ادا کرتی۔ اب تمہیں میری طرح جینا ہوگا۔ محبتوں سے بچھڑ کر تنہا زندگی کا مزہ لینا ہوگا۔ میں نے پون صدی کی اذیت اور کرب کا انتقام لے لیا۔ مجھے ڈھونڈنے کا کوئی فائدہ نہیں پیاری! میں نے اپنے پیچھے کوئی سراغ نہیں چھوڑا۔ کوئی آئی ڈی! ایکسپرٹ میرے ان مصنوعی سہاروں کے ذریعہ مجھ تک نہیں پہنچ سکتا۔ نفرت اور انتقام کی یہ کڑی بڑی طویل ہے۔ تم پاکستانی اور ہم ہندوستانی اس کا تاوان ادا کرتے ہی رہیں گے۔ ہاں! آج بہت سے لوگ دونوں قوموں میں محبت اور دوستی کی باتیں کرتے ہیں۔ نئی نسل پچھلی تلخیاں بھول کر ایک نئی زندگی کا آغاز کرنا چاہتی ہے۔ میرے نزدیک یہ لوگ نرے احمق ہیں۔ ہمارے درمیان خون کا رشتہ ہے۔ وہ خون جو بٹوارے میں بہا۔ وہ خون جو جنگوں میں بہا۔ یہ رشتہ کبھی ختم نہیں ہوسکتا۔ مجھ جیسے ہزاروں لوگ' ہمارے سربراہ ایسا کچھ بھی نہیں ہونے دیں گے۔ ہمارے درمیان ایک آخری معرکہ ضرور ہوگا جس میں فتح ہماری ہی ہوگی۔ جانتی ہو کیوں؟ کیونکہ ہمیں تو اپنے دشمن کا علم ہے۔ تم لوگوں کو اپنے اندر' اپنی جڑوں میں بیٹھے دشمن کا کوئی اندازہ نہیں۔ ہم پھر ملیں گے پیاری! اس وقت جب میں فاتح قوم کی نمائندہ بن کر اپنی مفتوح کے سامنے آؤں گی۔ تب تک کے لیے اپنا بہت سا خیال رکھنا۔''

مونی کا یہ طویل پیغام ختم ہو چکا تھا۔ بسمہ کے ہاتھوں سے موبائل چھوٹ کر نیچے جا گرا۔ آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا تھا۔

''کیا ہوا بسمہ؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' نورین اس کی نچڑی ہوئی رنگت دیکھ کر ہول گئی۔

''میں..... ذمے دار ہوں..... میں ...'' وہ ہذیانی انداز میں بولی۔ ''ایک ذرا سا جھوٹ ہی تو بولا تھا۔ داستان میں مزید اثر پیدا کرنے لیے..... ایک ذرا سا جھوٹ..... میں ذمے دار ہوں۔'' بسمہ یکدم اٹھی اور اپنے سر سے دیواروں میں ٹکریں مارنے لگی۔

''میں ذمے دار ہوں..... میں ذمے دار ہوں..... نفرت جیت گئی..... میں ذمے دار ہوں۔'' وہ اس قدر زور سے چلائی کہ حلق میں خراشیں پڑ گئیں۔ نورین اسے سنبھالتے ہوئے بے حال ہو چکی تھی۔

☆☆☆

''میڈم جی! ذرا جلدی چلیے۔ آپ کی فوری ضرورت پیش آ گئی ہے۔'' میری معاون نے کمرے کے دروازے پر دستک دے کر کہا۔

''کیا ہو گیا بھئی؟ کسی مریض کو کوئی مسئلہ تو نہیں بنا؟'' میں نے دریافت کیا۔ اکثر مریض یکدم اس قدر شدید دماغی دورے میں مبتلا ہوتے تھے کہ سنبھالنا مشکل ہو جاتا۔

''جی ہاں! بیڈ نمبر پینسٹھ کی مریضہ پر دورہ پڑا ہے۔'' معاون نے مجھے بسمہ کے متعلق آگاہ کیا تو میں گہری سانس لیتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس جواں سالہ لڑکی کا تایا پاکستان آنے سے قاصر تھا اور پھپھی ساتھ لے کر جانے سے۔ وہ یہیں رہتی اور جب دورہ شدید ہوتا تو زور زور سے چلانے لگتی۔

''پون صدی کی نفرت جیت گئی..... نفرت جیت گئی..... ایک ذرا سا جھوٹ ہی تو بولا تھا..... ایک ذرا سا جھوٹ۔''

++